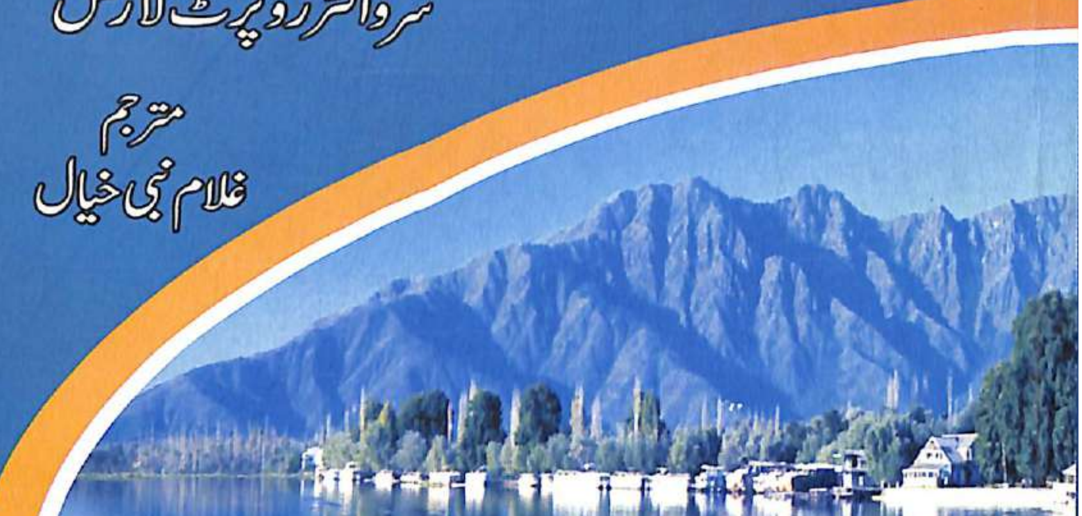
کشمیر کی وادی

مصنف
سر والٹر روپرٹ لارنس

مترجم
غلام نبی خیال



قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

کشمیر کی وادی

مصنف

سر والٹر روپرٹ لارنس

مترجم

غلام نبی خیال

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی ـ 110025

پہلی اشاعت : 2014
تعداد : 550
قیمت : -/217روپے
سلسلۂ مطبوعات : 1808

Kashmir Ki Waadi
Author: Sir Walter Ropert Lawrance
Translated by: Ghulam Nabi Khayal

ISBN: 978-93-5160-023-7

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی110025، فون نمبر: 49539000، فیکس:49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8 آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066
فون نمبر:26109746، فیکس:26108159
ای۔میل:urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ:www.urducouncil.nic.in
طابع: جے۔ کے۔ آفسیٹ پرنٹرز، بازار مٹیا محل، جامع مسجد دہلی۔006 110
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

انیسویں صدی عیسوی میں کشمیر کے ڈوگرہ حکمران مہاراجہ پرتاپ سنگھ کو خیال آیا کہ وادیٔ کشمیر اور ملحقہ علاقوں میں زراعتی زمین کے جو لاتعداد خطے موجود ہیں اُن کے بندوبست کا کام ایک جدید طرز پر عمل میں لایا جائے۔ اس غرض کے لیے مہاراجہ نے ایک مغربی مستشرق اور ماہر ارضیات سر والٹر لارنس کی خدمات حاصل کیں جنھوں نے کئی سال تک کشمیر میں رہ کر یہ صبر آزما کام پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔

اراضیٔ کشمیر کی جمع بندی کے دوران لارنس کو اُن مفاد پرست سرکاری اہل کاروں کے ہاتھوں زبردست مزاحمت اور مخالفت کا سامنا کرنا پڑا جو کشمیری کاشت کاروں کی بکھری ہوئی زمین کی فصلوں کا بیشتر حصہ خود ہضم کر کے سرکاری خزانے کو بھی دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے تھے۔

ان عناصر نے کئی بار لارنس کشمیر سے واپس جانے کی دھمکیاں بھی دیں اور انھیں جسمانی گزند پہنچانے کا بھی ارادہ ظاہر کیا، لیکن ایک پرعزم اور عوام پرور لارنس نے مہاراجہ کے پاس یہ شکایت لے جانے کے برعکس نہایت ہی شجاعت اور ہمت کے ساتھ یہ کام جاری رکھا اور بالآخر وہ اس میں سرخ رو ہو گیا۔

اپنے صبر آزما کام کی ایک مفصل رپورٹ مہاراجہ کو پیش کیے جانے کے ساتھ لارنس نے کشمیر چھوڑنے کا عزم کیا۔ اگر چہ مہاراجہ نے انھیں یہیں پر قیام پذیر ہونے کی تلقین کی تا کہ اس کہنہ مشق مستشرق کی خدمات ایسے ہی کسی اور سود مند کام کے لیے وقف رکھی جائیں لیکن لارنس کا دل

غالباً بھر چکا تھا اور وہ بالآخر رخت سفر باندھ کر واپس اپنے وطن چلا گیا۔

اپنے قیام کے دوران لارنس کو کشمیر میں گاؤں گاؤں قریہ قریہ گھومنے کا موقعہ ملا جہاں انھوں نے وادی کی سماجی، سیاسی، مذہبی، ماحولیاتی، زراعتی، اقتصادی اور ثقافتی زندگی کے گونا گون پہلوؤں کا بھرپور مشاہدہ کر کے اس تجزیاتی عمل کو موجودہ کتاب کی شکل دی۔

'کشمیر کی وادی' کو اس موضوع پر درجنوں مغربی دانشوروں اور سیاحوں کی تخلیق کردہ تصانیف میں اس لیے اولین مقام حاصل ہے کہ اس میں مصنف نے انتہائی ایمانداری اور حقیت پسندی کے ساتھ ہر موضوع کو چھیڑ کر اس کی حیران کُن حد تک تشریح و توضیح کی ہے۔

'کشمیر کی وادی' انگریزی میں لکھی گئی اور اس کی اولین اشاعت 1895 میں ہوئی۔ مغربی قلم کاروں اور دانشوروں کی تحریر کردہ تصانیف میں اس کتاب کو یہ شرف حاصل ہے کہ کشمیر کا سارا خواندہ طبقہ اس کے مصنف کے نام سے واقف ہے جسے اہل کشمیر پیار سے لارن صاحب کے نام سے آج بھی یاد کرتے ہیں۔

جناب غلام نبی خیال صاحب کا تعلق ریاست جموں و کشمیر سے ہے۔ یہ اس صوبے کے پختہ مشق اور برگزیدہ شاعر، ادیب، محقق اور مترجم ہیں۔ اپنی 55 سالہ ادبی زندگی میں انھیں کئی اعزازات واکرامات سے نوازا گیا ہے جو انھیں اردو، کشمیری اور انگریزی زبانوں میں تحریر کردہ دو درجن سے زیادہ مطبوعات میں سے چند ایک کو دے گئے ہیں۔

اردو دنیا کے لیے اس عدیم المثال کتاب کا ترجمہ کشمیر کے حوالے سے کوائف اور واقعات وحالات سے آگہی حاصل کرنے کا ایک خوبصورت ذریعہ ہے اور اس کام کو خیال صاحب نے سالہا سال کی محنت کے بعد بحسن وخوبی انجام دیا ہے۔

امید ہے کہ اردو دانوں کے لیے یہ ترجمہ ایک تحفۂ بیش بہا ثابت ہوگا۔

ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

ڈائرکٹر

مندرجات

مقدمہ

انیسویں اور بیسویں صدی میں مغربی ممالک سے کئی ایسے دانشور، سیاح اور تاریخ داں کشمیر آئے جن میں سے اکثر و بیشتر نے سرزمین کشمیر کے بارے میں اپنے تاثرات قلم بند کیے۔ ان کی تحریروں میں یہ خوش آئند بات ہر صفحے پر جھلکتی ہے کہ انھوں نے تذکرۂ کشمیر کے حوالے سے ہر بات کو ایک صحیح تناظر میں دیکھ کر اُس پر اپنے ضمیر کی روشنی میں خیال آرائی کی۔ اس عمل میں اگرچہ انھیں کئی مقامات پر اہل کشمیر کی ان خامیوں اور کوتاہیوں کو بھی منظر عام پر لانا پڑا جو آج بھی اُن میں موجود ہیں لیکن اس ''چرب دست، تر دماغ اور نجیب'' قوم کی خوبیوں اور اچھائیوں کو بار بار دہرانے سے بھی انھوں نے کسی بخل سے کام نہیں لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بالخصوص تاریخ کشمیر کے تعلق سے آج بھی اہل کشمیران ہی مستشرقین کی تصانیف کو قدر و منزلت کی نظروں سے دیکھتے ہیں اور مقامی طور پر یا ہندوستان میں تحریر کردہ کشمیری ناموں میں تعصب، تنگ نظری اور لاعلمی کی بھرمار کے پیش نظر در خور اعتنا نہیں سمجھتے۔

زیرنظر کتاب کے مصنف سر والٹر لارنس نے اگرچہ نیو اور وگنے کی کشمیر پر تصانیف کی سراہنا کی ہے لیکن اُن کی اپنی کتاب ''کشمیر کی وادی'' ہمارے خیال میں کشمیر اور کشمیریوں کے رہن سہن، عادات و اطوار اور ان کی سیاسی، سماجی اور ثقافتی زندگی کی ایک دلکش آئینہ دار ہے۔

لارنس 9 فروری 1857 کو مورٹین کورٹ انگلستان میں پیدا ہوئے اور 1944 میں لندن کے قریب ایک علاقے میں انتقال کر گئے۔ لارنس کی وفات کے سلسلے میں اگرچہ ان کے آبائی وطن

برطانیہ میں کسی خاص غم واندوہ کا اظہار نہیں کیا گیا اور نہ ہی کشمیر میں اُن کے قیام اور کام کی مسلمہ حیثیت کو مقامی طور پر دہرایا گیا لیکن برطانیہ ہی کے ایک کثیر الاشاعت اخبار ''لندن ٹائمز'' نے لارنس کا جو تعزیت نامہ شائع کیا وہ اس ممتاز ماہر علومیات اور نباض قلم کار کو ایک لافانی حیثیت بخشنے کے لیے ایک اہم دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔ واضح رہے کہ ''لندن ٹائمز'' کی روزانہ اشاعت اس وقت 4لاکھ سے زیادہ ہے۔ یہ اخبار لارنس کو خراج عقیدت ادا کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''سر والٹر لارنس ایک قابل شخص تھے جس نے اپنی طویل اور اعلیٰ سرکاری زندگی کے دوران بہت سے اہم عہدوں پر اپنی خدمات قابلیت اور امتیاز کے ساتھ سرانجام دیں۔ انڈین سول سروس میں انھوں نے ایک بندوبست کے کمشنر کی حیثیت سے اپنی قابلیت کا شاندار مظاہرہ کیا اور اگر وہ واپس انگلستان نہ آجاتے تو انھیں یقیناً کسی ہندوستانی صوبے کا سربراہ بنایا جاتا۔ لارنس کا پرانا دوست لارڈ کرزن وائسرائے ہند مقرر ہونے کے بعد انھیں اپنا پرائیوٹ سکریٹری بنا کر واپس ہندوستان لے گیا۔ کشمیر میں بندوبست اراضی سے فارغ ہونے کے بعد اگر انھیں اپنے ہمہ جہت کام میں سے کسی بھی شغل سے فرصت اور تسکین حاصل ہوئی تو ٹائمز میں کئی سال تک ہندوستان میں اپنے تجربات کے بارے میں مضامین لکھنے سے ہی ہوئی جس سے بہتر اس موضوع پر کسی اور اہل قلم نے ہمارے لیے بہتر مضامین نہیں لکھے''۔

1885 میں جب مہاراجہ پرتاپ سنگھ کشمیر میں تخت نشین ہوا تو اس نے دیکھا کہ ریاست کا مالیاتی نظام بکھرا ہوا تھا۔ اس نظام میں رشوت ستانی اور نا اہلی کے عناصر داخل ہو چکے تھے۔ جنھوں نے اسے ناکارہ اور کسی حد تک بے کار بنا کے رکھ چھوڑا تھا۔ جہاں تک زمینوں کا تعلق ہے اس سلسلے میں ایسا ریکارڈ اور نقشہ جات ناپید ہی تھے جن سے یہ معلوم ہو جاتا کہ کس شخص کے پاس کتنی زمین اس کی اپنی ملکیت کی شکل میں موجود ہے۔ بقول بامزئی جب کوئی پٹواری یا دیہات کا منشی کسی بھی گاؤں میں داخل ہوتا تو اس کے پاس پھٹے پرانے کاغذ کے پرزوں یا بھوج پتر پر اس گاؤں کے مکینوں کی زمینوں کی تفصیلات درج ہوتیں جنھیں وہ اپنے پھرن کی گہری جیبوں میں چھپا کر رکھتا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ پٹواری عام طور پر اس قسم کے تین کاغذات اپنے پاس رکھتے۔ ایک اپنے لیے جو قریب قریب صداقت پر مبنی تھا۔ دوسرا کاغذ تحصیل دار کے لیے رکھا جاتا تھا اور تیسرا کسانوں کو دکھایا جاتا تھا۔ اس زمین کی حد بندی صحیح طریقے پر نہیں کی جاتی بلکہ اس کے رقبے کا اندازہ اس بات سے

لگایا جاتا تھا کہ کس زمین میں کاشت کے لیے کتنا بیج درکار ہے؟ اس ناقص نظام کا ایک افسوس ناک پہلو یہ بھی تھا کہ اثر ورسوخ والے کاشت کاروں کی زمینوں کے لیے کم مقدار کی بیج کا اندراج کیا جاتا کہ وہ کم فصل کے بدلے میں بہت ہی کم ٹیکس کی ادائیگی کرتے جبکہ اُن کے نادار اور غریب ساتھیوں کو اس لیے زیادہ مالیہ ادا کرنا پڑتا کیونکہ ان کے نام بیج کی اچھی خاصی مقدار درج کی جاتی جس کے معنی یہ ہوئے کہ زیادہ بیج حاصل کرنے والے کے پاس زیادہ زمین ہے اور زیادہ زمین پر زیادہ فصل اُگنے کی صورت میں سرکار کو زیادہ مالیہ یا مجوزہ ادا کرنا ضروری ہے۔

اس ساری صورت حال کے ہوتے ہوئے 1889 میں ریاست جموں وکشمیر دیوالیہ ہو چکی تھی، زیادہ فصل دینے والی زمین کو بغیر کاشت کے نظر انداز کیا گیا تھا اور فوج فصل کی کٹائی کے وقت کاشتکاروں کی زمینوں پر ٹڈی دل کی طرح ٹوٹ پڑتی اور کھڑی فصلوں کا اچھا خاصہ حصہ ہڑپ کر جاتی۔ نتیجتاً غریب اور محکوم کسان کے پاس مشکل سے پیٹ بھرنے کی خاطر تھوڑا بہت اناج باقی رہتا جو جاڑے کی جان توڑ سردیوں میں ان کے پاس مشکل سے موجود ہوتا۔

اُسی سال سر والٹر لارنس کو وادیٔ کشمیر میں بندوبست کا کام تفویض کیا گیا۔ ابھی انھوں نے کام شروع ہی کیا تھا کہ انھیں سرکاری اہلکاروں اور تن آسان شہریوں کی طرف سے زبردست مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔

اگر چہ یہ کام دو سال قبل ہی اے ونگیٹ کے سپرد کیا گیا تھا لیکن سازشوں اور مخالفت کی بڑھتی ہوئی شورش کے پیش نظر انھوں نے اس کام سے اپنا دامن کھینچ لیا۔ لارنس نے اس بہت بڑے فریضے کو بہر حال چار سال کے عرصے میں مکمل کر لیا اور ایسا کرنے میں انھوں نے عزم صمیم کا بھرپور مظاہرہ کیا۔

لارنس کے کام کا جائزہ لیتے وقت جب مہاراجہ کو اس بات کا علم ہوا کہ اس کی بدولت ریاست کو مالی لحاظ سے کس قدر فائدہ ہوا ہے تو اس نے اپنے درباریوں کی مخالفت کے باوجود زمینی مالیہ کی 31 لاکھ روپے کی بقایا رقم معاف کر دی۔

اُن دنوں کشمیر میں بیگار کی بدعت جاری تھی جس کی رُو سے ہزاروں بے کس کشمیریوں کو گلگت کے دُور دراز علاقوں میں مسلح افراد کے لیے بغیر کسی معاوضہ کے رسد اور دیگر ساز وسامان پہنچانے کے لیے جبری طور پر اس جان لیوا سفر پر ہر سال جانا پڑتا تھا۔ لارنس نے اس غیر انسانی

سلسلے کی تفصیلات جان کر اسے بند کرنے کی ٹھان لی۔ ان کے کہنے پر جبری اور بغیر اُجرت کے مزدوری کو بند کیا گیا لیکن اسے مکمل طور پر ختم نہیں کیا گیا کیونکہ انتظامیہ کی طرف سے مزدوروں کی باقاعدہ جماعت موجود نہیں تھی۔ جبکہ لارنس کی ایما پر ایک ہزار باقاعدہ مزدوروں اور دوسو ٹچروں کو کام پر لگایا گیا اور اس طرح سے ایک مزدور کی ماہانہ مزدوری پانچ روپے مقرر کی گئی۔

اصل میں اس سے قبل ہی حکومت ہندوستان نے مہاراجہ کو اس بات کی تاکید کی تھی کہ وہ ریاست میں زمینی اصلاحات کا طریقہ رائج کرے تاکہ کاشت کار اور سرکار دونوں کو اس ناگفتہ بہ حالت سے نجات دلائی جائے جو سرکار کے ہر محکمہ پر حاوی تھی۔

لارنس نے اگرچہ دل وجان سے بندوبست اراضی کا تاریخی کام سرانجام دیا لیکن وہ نظامِ حکومت بہت حد تک جوں کا توں رہا جو ایک شخصی راج کا خاصہ ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لارنس کی پیش کردہ عوام پرور سفارشات پر جب موثر طور پر عمل درآمد نہیں ہوا تو ریاست کے لاکھوں عوام معاشی بدحالی اور اقتصادی پسماندگی کی زندگی گذارتے رہے۔ اس حالت میں کشمیری دیہاتوں میں رہنے والے 80 فیصد سے زیادہ لوگ قرض کے بوجھ تلے دبتے ہی گئے۔ اکثر مواقع پر کاشت کار کی زمین فصل کاٹے جانے سے پہلے ہی قرضدار کے حق میں وڈ داری کے عمل کے نتیجے میں منتقل ہو چکی تھی۔

کشمیر آنے سے پہلے ہی سر والٹر لارنس کو اپنے احباب نے تنبیہ کی تھی کہ وہ کشمیر جانے کا ارادہ بدل دے کیونکہ اس سے قبل کشمیر ہی میں غلام کشمیریوں کے ایک ہمدرد اور حبیب رابرٹ تھورپ کو سرکاری کارندوں نے اس جرم کی پاداش میں ہلاک کروایا تھا کہ اُس نے محکوم ومظلوم اہل کشمیر کا حالِ زار انگلستان کے اخباروں میں بیان کیا تھا اور ایک مختصر سی مگر ایک عہد ساز کتاب Kashmir : Misgovernment تحریر کر کے حکومتی عتاب کو دعوت دی تھی اور اپنی جان عزیز کا نذرانہ بے کس اور بے بس کشمیریوں کو پیش کر کے کشمیر کی تحریکِ حریت کے شہید اوّل کا مرتبہ حاصل کر لیا تھا لیکن لارنس کا ارادہ قائم رہا۔ اس سلسلے میں وہ اپنی کتاب India, We Served میں وہ لکھتا ہے: "میرے احباب نے مجھ سے کہا کہ پہاڑوں کے اُن بادلوں میں جن کے پس پردہ ایک خوش کن وادی موجود ہے، مجھے آنکھوں سے بھی اُترنا پڑے گا اور دل سے محو ہونا پڑے گا۔ میں اگرچہ اس ملک یعنی کشمیر کی صورتحال سے واقف نہیں تھا پھر بھی میں کشمیر کے نام

پر ہی اس حد تک عاشق ہوگیا کہ میں نے وہاں کا رخ کرنے کا حتمی فیصلہ کرلیا اور احباب سے کہہ دیا، خواہ کچھ بھی ہو میں بالآخر کشمیر، ہاں ہاں کشمیر جا رہا ہوں''۔

لارنس اگرچہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے کہنے پر ہی کشمیر آیا تھا لیکن بالآخر انھیں یہ دیکھ کر دکھ ہوا کہ بالخصوص بیگار کی بدعت کے خاتمے کے لیے انھوں نے جو سفارشات کی تھیں ان سب ہی پر مہاراجہ کے جاہ پرست، عیاش اور راشی درباریوں اور بے ایمان خوشامدیوں کی مداخلت سے عمل نہیں ہو سکا اور اس سلسلے میں خود مہاراجہ کی عجیب وغریب طرزِ زندگی اور عادات واطوار کا دخل بھی تھا۔

مہاراجہ پرتاپ سنگھ ایسی ایسی عادات اور خصائل کا غلام تھا کہ اُن کا ذکر یہاں پر کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ یہ ڈوگرہ مہاراجہ خطرناک حد تک ایک کٹر مذہب پرست ہندو تھا۔ اس نے زندگی میں کبھی انگلستان یا کسی اور غیر ملک کا دورہ نہیں کیا کیونکہ سمندری سفر کرنا اس کے خیال میں دھرم کے خلاف تھا۔ عام طور پر وہ اپنی پوجا سے پہلے کسی غیر ہندو یا مسلمان کا منہ دیکھنا پسند نہیں کرتا بلکہ اس کے برعکس ایک گائے کے درشن کرنا اُسے قبول تھا۔ اگر کوئی مسلم اُس کے قالین کے کونے پر اپنے پاؤں رکھتا تو وہ اپنا حقہ توڑ دیتا۔

پرتاپ سنگھ سادھوؤں اور برہموں کا مربی تھا۔ اس نے نہ صرف یہ کہ کئی بار ہردوار کے درشن کیے بلکہ اس زمانے میں جب آمد و رفت کے ذرائع محدود تھے اور کشمیر میں امرناتھ گپھا برف کی چادر تلے دبی ہوئی رہتی تھی، اس نے امرناتھ کے درشن کے لیے بھی اس دشوار گذار پہاڑی راستے کو عبور کرلیا۔

اُس کے عہد میں کسی بھی برہمن کو موت کی سزا دینا ممنوع تھا اور اگر وہ کسی مجرم کی سزائے موت کے کاغذ پر دستخط کر لیتا تو اُس دن وہ دن بھر کچھ نہیں کھاتا۔

مہاراجہ ایک زبردست قسم کا پیٹو شخص تھا۔ اس کی کھانے کی میز پر چالیس اقسام کی ضیافتیں سجائی جاتیں۔ وہ خمیری روٹی کا دلدادہ تھا اور اس کے ساتھ وہ پوری اور چاول بھی کھاتا تھا۔ اس کے کھانے میں ملائی، دہی اور اچار کا بھرپور استعمال ہوتا تھا۔ وہ دن کا کھانا ایک سے دو بجے کے درمیان کھاتا تھا۔ 5 بجے کے بعد دوپہر وہ ایک سیر دودھ اور ڈھیر سارا میوہ ہضم کرتا تھا۔ اس کے عشائیہ کا وقت رات گئے دو بجے ہوتا تھا۔ جوانی میں اگرچہ وہ گوشت خور تھا لیکن بعد میں اُس نے

گوشت کھانا ترک کرلیا۔ کہا جاتا ہے کہ گوشت کھانے سے اسے ذاتی معالج حکیم مہدی نے منع کیا۔ حقہ کا وہ اس قدر عادی تھا کہ ایک بار کلوروفارم یعنی بے ہوشی کی دوا کے دو گھنٹے بعد ہی اُس نے حقہ طلب کیا اور آرام سے اس کے کش پر کش لگاتا رہا۔ 1894 میں ایک تجربہ کار ڈاکٹر نے والٹر لارنس سے کہا کہ مہاراجہ اب دو ماہ سے زیادہ زندہ نہیں رہے گا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اس کے بعد برابر 30 سال تک جیا۔ ''کشیر'' کے مصنف ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی نے یہاں پر اس قابل تعریف حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ اگرچہ تینوں ڈوگرہ مہاراجوں نے اپنے لیے تین تین، چار چار رکھیلیں رکھی تھیں لیکن وہ اپنی رعایا کے ننگ و ناموس کے بارے میں بے حد محتاط تھے۔ انھوں نے کبھی ایسی کوئی کوشش نہیں کی کہ لوگوں کے گھروں سے کسی لڑکی کو اُٹھا کر لائیں۔ اس تعلق سے انھوں نے دیگر ریاستوں کے حکمرانوں کے لیے ایک مثال قائم کرلی۔ آخری ڈوگرہ مہاراجہ ہری سنگھ سے وابستہ یہ واقعہ بھی یہاں پر یاد دلائیں کہ جب ایک تقریب پر مہاراجہ کے ایک غیر کشمیری دوست نے ایک کشمیری خاتون پر بُری نظر ڈالی تو مہاراجہ نے فوراً اسے کشمیر سے باہر چلے جانے کا حکم دیا اور دوبارہ اس کے کشمیر آنے پر پابندی عائد کردی۔

مہاراجہ پرتاپ سنگھ 40 سال سے زائد عرصہ تک حکمرانی کرنے کے بعد 75 سال کی عمر میں 23 دسمبر 1925 کو سرینگر میں انتقال کر گیا۔ جب اس کا دَم نکلنے ہی کو تھا تو اسے محل کے بالائی کمرے سے فوراً نیچے لایا گیا تا کہ اُس کی جان دھرتی ماتا یعنی زمین پر نکل جائے۔ اس کے ساتھ بیرون ریاست سے ایک برہمن کو بلایا گیا جس کے سر سے پیر تک بال مونڈے گئے۔ مہاراجہ کی ساری ذاتی اشیا اسے دی گئیں اور مہاراجہ کی وفات کے بعد اسے ریاست بدر کردیا گیا تا کہ وہ دوبارہ اِدھر کا رُخ نہ کرے کیونکہ وہ اپنے ساتھ مہاراجہ کے تمام گناہ لے کر گیا تھا۔

سر والٹر لارنس کو اگرچہ ایک سرکاری کام کی انجام دہی کے لیے کشمیر بلایا گیا تھا لیکن اس مغربی صاحب دل اور انسان نواز دانشور نے اہل کشمیر کے بارے میں ایک ایسی بے مثال تخلیق دُنیا کے سامنے پیش کی جس کی وجہ سے آج بھی لارنس کو کشمیریوں کے جگری دوست اور مخلص حبیب کا مرتبہ حاصل ہے۔

اہلِ کشمیر کے بارے میں جو غلط بیانات اور تبصرے چند غیر ملکیوں نے وقتاً فوقتاً مشتہر کیے لارنس نے ان کی نفی میں وادیٔ کشمیر کے عوام کی اصلیت اور انسانی خصائص کا تفصیلی ذکر کر کے ان

بے بنیاد باتوں کی تردید کردی۔

لارنس اگر چہ اپنے وقت کے مہاراجہ کشمیر پرتاپ سنگھ کی خصوصیات اور اوصاف کی تعریف کرنے میں کسی بخل سے کام نہیں لیتا لیکن مہاراجہ کے وقت میں جن مصائب اور مشکلات سے کشمیری عوام گذر رہے تھے اُن کی بھی اُنھوں نے بھرپور وضاحت کرکے ارباب اقتدار کو اس کا ذمہ دار گردانا ہے۔ایسا لگتا ہے کہ لارنس ایک بے خوف اور نڈر قسم کا شخص تھا جو کسی لگی لپٹی کے بغیر اپنے ضمیر کی آواز بلند کرکے ہی دم لیتا تھا اور اس آواز کا مقصد اگر چہ حاکم اعلیٰ کی تنقید اور حرف گیری بھی تھا تو وہ اسے بیان کرنے میں ایک بہادر اور ایماندار قلم کار کی طرح عمل کرتا لیکن یہاں یہ بات بھی قابل ستائش ہے کہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے اس حق گوئی کے باوجود لارنس کو کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچائی بلکہ کشمیر کے بندوبستِ اراضی میں انھیں تمام سہولتیں فراہم کیں۔

بندوبست اراضی کے سلسلے میں والٹر لارنس کو کشمیر میں اُن بارسوخ عناصر کی طرف سے قدم قدم پر مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا جو اس بندوبست کے نتیجے میں عام کشمیری دیہاتیوں کے استیصال کا غیر انسانی عمل جاری نہیں رکھ سکتے تھے لیکن لارنس نے بہرصورت ان اوچھے حربوں کے سامنے کسی قسم کی کمزوری کا مظاہرہ نہیں کیا۔اس طرح رفتہ رفتہ وہ کشمیری عوام میں اُن کے محسن اور نجات دہندہ کی شکل میں روز بروز مقبولیت حاصل کرتے گئے اور پھر انھیں پیار اور احترام سے ہر جگہ ''لارن صاحب'' کے نام سے پکارا جانے لگا۔

لارنس نے اپنی کتاب کی اوّلین اشاعت یعنی 1895 میں وادیٔ کشمیر سے متعلق کئی تصاویر شامل کی ہیں جو اُس تصنیف کے لیے مصنف کے فوٹوگرافی کرنے والے احباب میجر ہیپرن، کیپٹن اُلسن، کیپٹن گوڈفرے اور عالم چند شامل ہیں۔ عالم چند ریاست کا سرکاری فوٹوگرافر تھا۔ لارنس نے اپنے ابتدائیہ میں ان سبھی کا شکریہ بھی ادا کیا ہے۔ چونکہ یہ تصاویر آج سے زائد از سو سال قبل کھینچی گئی تھیں اور ان میں اُس وقت کی مروج تکنیک کا استعمال کیا گیا تھا جو آج عکس بندی کے زبردست ارتقا کے مقابلے میں بے جان سی لگتی ہیں۔لارنس کی کتاب میں شامل تصاویر کو اسی لیے ہم نے اس ترجمہ میں شامل نہیں کیا ہے کیونکہ نہ تو وہ آج کی رائج الوقت فوٹوگرافی کے مقابلے میں کوئی تاثر پیدا کرسکتیں اور نہ ہی بدقسمتی سے اُن ناشروں نے ان نادر تصاویر کو نئی تکنیکی کاوشوں سے بہتر بنانے کی سعی کی ہے جنھوں نے ''کشمیر کی وادی'' کے کئی ایڈیشن غیر قانونی اور غیر اخلاقی

طور پر شائع کیے ہیں۔

اسی طرح لارنس نے اپنی ضخیم کتاب میں چند ایک جگہوں پر ایسے گوشوارے اور اعداد وشمار کے نقشے شامل کتاب کیے ہیں جن کا خاص تعلق کشمیری عوام، ان کی زبان اور ان کے رہن سہن کے مختلف پہلوؤں کے ساتھ ہے۔ ان گوشواروں میں اُردو داں دُنیا کو کسی قسم کی دلچسپی ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لہٰذا ان اوراق کو بھی ترجمے سے الگ رکھ کے انھیں اسی کتاب کے کشمیری ترجمے کے لیے موزوں خیال کیا۔ واضح رہے کہ زندگی نے ساتھ دیا تو یہ کشمیری ترجمہ بھی جلد ہی وادی کے عوام کو تحفتاً پیش کیا جائے گا جو ہم ریاست جموں وکشمیر کی کلچرل اکادمی کی فرمائش پر کر رہے ہیں۔ کتاب کے مطالعہ میں قارئین کی توجہ کسی حد تک برقرار رکھنے کے پیش نظر سبھی حوالہ جات ترجمے کے اخیر پر متعلقہ ابواب کے تحت درج کیے گئے ہیں البتہ اُن غیر ضروری، طویل اور حاشیہ کے ذریعہ خواہ مخواہ کی داستان گوئی کا رنگ بھرنے کی غرض سے مندرج حوالوں کو حذف کیا گیا ہے جو قاری کی توجہ کتاب کے اصل موضوع سے ہٹا کر اُس کے ذہنی تذبذب کا باعث بن سکتے ہیں۔

اُردو ترجمہ میں لارنس کی جو تصویر شامل کی گئی ہے وہ غالباً ان کی واحد تصویر ہے جو ہمارے پاس موجود ہے اس کے علاوہ سرینگر کے زنانہ کالج مولانا آزاد روڈ میں ان کا ایک سنگی مجسمہ بھی موجود ہے جس میں لارنس کا چہرہ اب صاف نظر نہیں آتا۔

''کشمیر کی وادی'' اُن بے شمار تصانیف میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہے جو مغربی دانشوروں نے اس خوبصورت وادی کے بارے میں وقتاً فوقتاً تخلیق کیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ کتاب لارنس کی اس گہری نظر شناسی کا ماحصل ہے جس کی بدولت انھوں نے اہل کشمیر کی رگ رگ کو پہچان لیا تھا اور ان کی زندگی کے مختلف رنگوں کو جانچا اور پرکھا تھا۔

چند سال قبل جوتشور پٹھک نام کے ایک شخص نے بھی اس کتا کا اردو ترجمہ کیا جس میں ورق ورق پر زبان و بیان، گرام اور لسانیات کے حوالے سے فاش غلطیاں موجود تھیں۔ مترجم نے کئی اسمائے خاص کا یا تو عجیب وغریب ترجمہ کیا یا ان کی سمجھ میں یہ الفاظ نہیں آسکے۔ مثال کے طور پر انھیں یہ بھی معلوم نہیں کہ constantinople کو اردو میں قسطنطنیہ کہتے ہیں۔ وہ خود کہتے ہیں۔ 'عین ممکن ہے کہ اشاعت کے بعد اس ترجمہ کو قارئین کی طرف سے بھاری تنقید کا شکار ہونا پڑے۔'

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اس ترجمے کو کوئی پذیرائی حاصل نہیں ہو سکی۔ یہاں تک کہ جب یہ ترجمہ ہمارے ایک ادیب دوست کو برائے تبصرہ بھیجا گیا تو اس نے یہ کہہ کر اسے واپس کیا کہ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ سکا ہے۔

جو تشور پٹھک کے مجموعی طور پر ناقص ترجمے میں پھر بھی ان اسمائے خاص کے تراجم کو من وعن درج کیا گیا ہے جن کا ترجمہ ایک ہی صورت میں ہو سکتا ہے۔ مزید برآں خاص کر چرند و پرند کے ناموں کی بھی بعینہٖ نقل ناگزیر ہے۔ عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ جب کسی ایک کتاب کے کئی تراجم دوسری زبانوں میں موجود ہوں تو ان میں جملوں اور عبارات کی تکرار خود بخود ہو جاتی ہے جسے بہر حال نقل نہیں کہا جا سکتا۔ مثال کے طور پر اگر ارسطو کی بوطیقا کے وہ اردو تراجم زیر مطالعہ لائے جائیں جو عزیز احمد، جمیل جالبی اور شمس الرحمٰن فاروقی نے کیے ہیں تو ان میں بھی ہمیں صفحوں کے صفحے بعینہٖ تکرار کی شکل میں نظر آئیں گے لیکن اس کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ جالبی یا فاروقی کی علمی اور فنی استعداد پر حرف گیری کی جائے۔

زیر نظر ترجمے میں چرند و پرند سے متعلق ابواب میں پٹھک کے صحیح ترجمے سے کہیں کہیں استفادہ کیے جانے کے امکانات کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ اسی تناظر میں یہ کہاوت برحق ہے کہ:

نقلِ کفر کفر نہ باشد

اس لحاظ سے بھی صحیح زبان کے حامل ایک نئے اور معتبر ترجمے کی ضرورت محسوس ہوئی جس کی اشاعت کے لیے میں قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، حکومت ہند کا سپاس گزار ہوں۔

امید ہے کہ ''کشمیر کی وادی'' کا یہ ترجمہ اُردو دنیا میں ایک دلچسپ اضافے کی حیثیت میں قبول کیا جائے گا۔

غلام نبی خیال
15۔ راولپورہ ہاؤسنگ کالونی
سرینگر۔190005 (کشمیر)



سر والٹر لارنس **(1857-1940)**



موقلم سے انیسویں صدی کے
ایک کشمیری دیہات کی تصویر کشی کا منظر۔



سرینگر کا مشہور دریا جہلم جو صدیوں سے
شہر کے بیچوں بیچ بہتا آرہا ہے۔



سرینگر کی مشہور عالم ڈل جھیل جس پر شکارے
تیرتے نظر آرہے ہیں۔



جھیل ڈل کے جنوبی کنارے واقع سرینگر شہر کی
بیرونی حدود میں پری محل کی یہ پُر اسرار عمارت
مغل شہزادے دارا شکوہ نے تعمیر کروائی تھی جہاں
انہوں نے اپنے استاد ملا آخون شاہ کے لیے
ایک رصدگاہ بھی بنوائی۔ حکایت کے مطابق اس
سے پہلے اس جگہ پریوں کا مسکن تھا۔

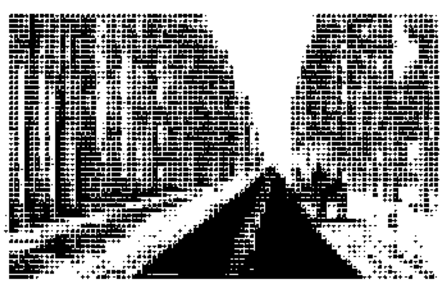


جنوبی کشمیر میں ویری ناگ نام کا نیلگوں پانی سے بھرا ہوا
چشمہ جو دریائے جہلم کا منبع ہے۔



کشمیر میں موسم بہار میں بادام کے درخت شگوفوں سے
لدے ہوئے ہیں۔





کشمیر میں زمستان کے دلکش مناظر۔



انیسویں صدی کے سرینگر شہر کی ایک تصویر۔



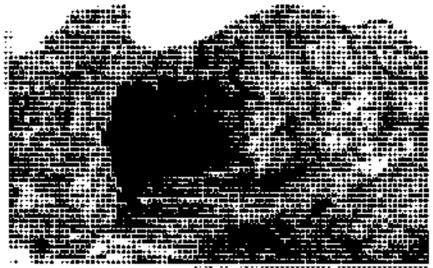
دریائے جہلم پر تعمیر شدہ چوتھا پل جسے فتح کدل کہتے ہیں۔



چودھویں صدی میں سری نگر کے آر پار تعمیر کردہ نالہ مار کنال کی ایک دل نشین منظر کشی۔
یہ نالہ سارے شہر کے لیے آبی ٹرانسپورٹ اور آمدورفت کا واحد ذریعہ تھا۔



سرینگر کے قدیمی علاقے میں تعمیر کی گئی پتھر مسجد۔ (اوپر)
اور مغلوں کے زمانے کا لگایا ہوا چشمہ شاہی کا خوبصورت باغ۔ (نیچے)



میں گھری ہوئی ہندوؤں کے تیرتھ استھانوں میں مشہور
ترین امرناتھ کی گپھا جہاں لاکھوں ہندو ہر سال جون اور
جولائی کے مہینوں میں بھگوان شیو کے درشن کے لیے جمع ہو
جاتے ہیں۔

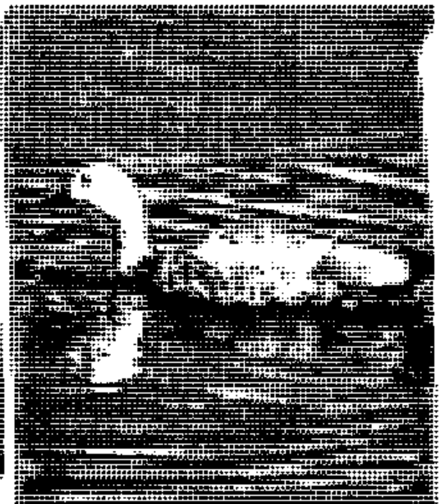




صرف کشمیر میں پایا جانے والا بارہ سنگھا جسے
مقامی زبان میں ہانگل کہتے ہیں۔



میں تین سو سال کا عرصہ درکار ہوتا ہے۔ موسم خزاں میں
اس کے سارے پتے سرخ ہو جاتے ہیں۔ مغل بادشاہ
جہاں گیر کے مطابق اُس نے ایک ایسا چنار کا درخت
دیکھا جس کے تنے میں ساٹھ سے بھی زیادہ لوگ پناہ
لے سکتے تھے۔



ڈل جھیل میں تیرتی ہوئی کشمیری بطخ۔



مارتنڈ کا یہ تاریخی منظر جسے کشمیر کے عہد پارینہ کے کھنڈرات میں اہم ترین مقام حاصل ہے۔



اونتی پورہ کے مشہور مندر کے کھنڈرات جو روایتی طور پر مہادیو کے نام وقف تھا۔



اسی تاریخی مندر کے آثار کی ایک اور تصویر



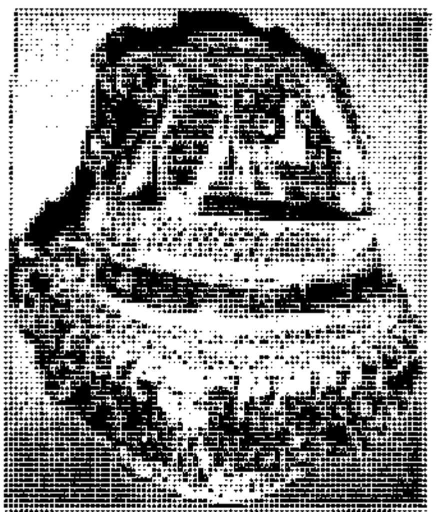
تخت سلیمان جسے ہندو شنکرا چاریہ مندر کے نام سے پکارتے ہیں، کشمیر کے تمام مندروں میں قدیم ترین ہے جسے 370 ق م میں تعمیر کیا گیا۔



سلطان زین العابدین بڈشاہ (1420-1470) کا قبرستان جو قدیم سرینگر کے زینہ کدل علاقے میں واقع ہے۔ یہ عظیم الشان اور عدیم المثال گنبد نما عمارت اس مقبولِ عام اور عوام پرور بادشاہ نے اپنی والدہ کے لیے تعمیر کروایا تھا۔



[illegible]
کے بعد اس کی گھاس دیگر استعمال کے لیے گھر لے جا رہا ہے۔



کشمیری کانگڑی جو پرانی وضع کے مٹی کے برتن کے ارد گرد بید کی تیلیوں سے تیار کی جاتی ہے۔ اس کا استعمال کشمیر میں سردی کے موسم میں کیا جاتا ہے۔ اس میں جلتے ہوئے کوئلے ڈالے جاتے ہیں اور اسے کشمیری چوغے (پھیرن) کے نیچے سرکا دیا جاتا ہے۔



سرینگر سے 40 کلومیٹر شمال میں واقع کشمیری ہندوؤں کی دلپسند دیوی کھیر بھوانی کا مندر جہاں کے چشمے کا پانی مقدس ترین خیال کیا جاتا ہے۔ کشمیری ہندو اس دیوی کا میلہ ہر سال جولائی کے مہینے میں مناتے ہیں۔



سرینگر میں شنکر اچاریہ کا قدیم منظر جس کا پرانا نام ساندھی مان پربت تھا۔



کشمیر کی ایک گوجر لڑکی۔



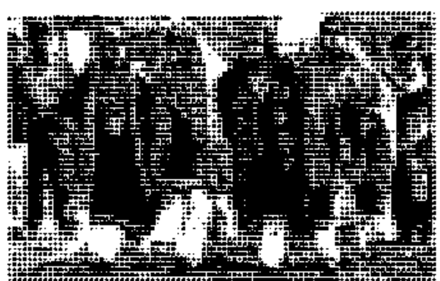
سرینگر کے مشرق میں واقع پانپور کے قصبے میں وادی کے مشہور عالم زعفران کی کاشت ہوتی ہے جو اس علاقے کی مخصوص مٹی کی وجہ سے وہیں پر پیدا ہوتی ہے۔ اس وقت اس انتہائی بیش قیمت زعفران کے ایک کلو کی قیمت دو لاکھ روپے ہے۔



اپنے مخصوص روایتی لباس میں ایک کشمیری پنڈتانی (ہندو عورت)۔



کشمیری ہندو گھرانے کی شادی کا ایک منظر جس میں دلہے کی ماں اسے بدھائی دے رہی ہے۔





کشمیری مسلم گھرانے میں شادی کے مناظر۔ اوپر کی تصویر سرینگر شہر اور نیچے کی دیہات سے تعلق رکھتی ہے۔ ان دونوں تصاویر میں خواتین شادی کا مخصوص گیت ونہ وُن قطار باندھ کر گا رہی ہیں۔

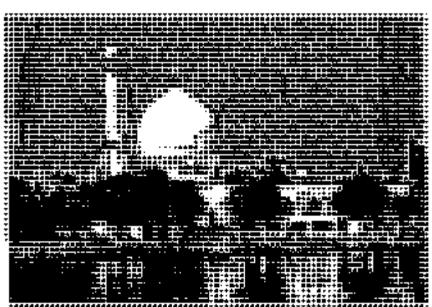


جامع مسجد وسطی سرینگر میں سلطان سکندر نے 1400ء
میں بنوائی۔ یہ مسجد تین بار نذر آتش ہوئی۔ مضبوط
دیودار کی لکڑی سے تعمیر کردہ اس مسجد میں 370
ستون ہیں۔ اس میں 33,333 لوگ بیک وقت
نماز ادا کر سکتے ہیں۔



سرینگر میں کوہ ماران کے جنوبی دامن میں حضرت
سلطان العارفین مخدوم صاحب کی مشہور درگاہ۔





سرینگر میں جھیل ڈل کے مغربی کنارے پر حضرت بل
کی قدیم درگاہ (اوپر) اور نئی تعمیر شدہ زیارت گاہ
(نیچے)۔ کشمیر کی اس مقدس ترین درگاہ میں
آنحضورؐ کے موئے مقدس محفوظ ہیں۔

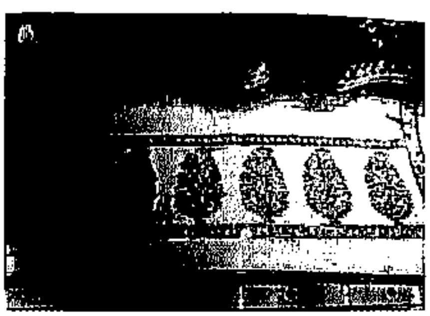


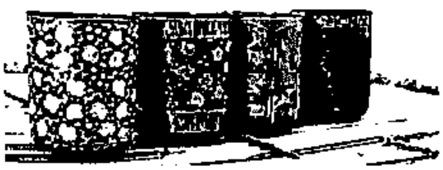


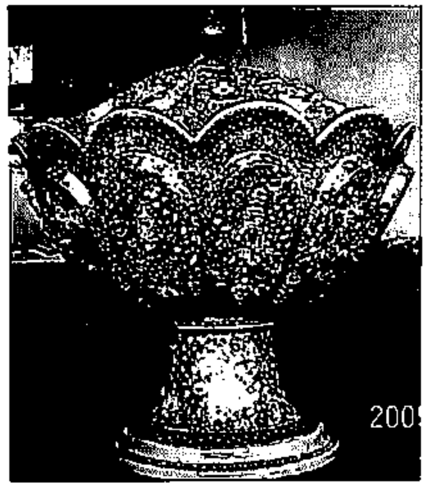
سرینگر کی ڈل جھیل میں مقامی سبزی اگانے والے
گاہکوں کے انتظار میں۔



انیسویں صدی کے کشمیری شال باف جو پشمینہ کی
شالوں پر گل بوٹے کھلانے میں مصروف ہیں۔اس
وقت اُن کی یومیہ آمدنی ڈیڑھ روپے سے بھی کم
تھی۔(نیچے) کشمیری رنگ شال کا نمونہ جو سارے کا
سارا ایک انگوٹھی میں سے گذارا جاسکتا ہے۔







کشمیری پیپر ماشی کے خوبصورت اور بیش قیمت نمونے۔



کشمیر کی مشہور گھریلو صنعت ووڈ کارونگ یعنی اخروٹ کی لکڑی
پر عمدہ نقش نگاری کا ایک شاہکار۔

پہلا باب

ابتدائیہ

اس رپورٹ میں جو میں نے پنجاب گیزٹیئر کی طرز پر قلم بند کی ہے۔ خاص طور پر کشمیر خاص کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اگرچہ ہمارے نظام بندوبست کا دائرہ گلگت اور جموں کی سرحدوں تک بھی پھیل چکا تھا لیکن یہ ہمارے لیے ضروری بن گیا کہ ان علاقوں کے متعلق معلومات کو اس رپورٹ میں جگہ نہ دی جائے اگرچہ کشمیر کے ساتھ بھی ان کا تعلق تھا۔

ہمارے لیے یہ فیصلہ کرنا ایک مشکل امر بن گیا تھا کہ کن واقعات کو ورطۂ تحریر میں لایا جائے اور کن کا ذکر نہ کیا جائے۔ تاہم ہم نے ان پندرہ تجزیاتی رپورٹوں کو دہرانے سے احتراز کیا ہے جو کشمیر کے بارے میں پیش کی گئی ہیں۔ ان میں الگ الگ ارضیات کی زمرہ بندی اور تخمینہ جات کی شرحوں کے علاوہ ماضی میں مالیاتی انتظام سے وابستہ امور سے متعلق معلومات فراہم کی گئی تھیں۔

چنانچہ میں اس رپورٹ میں عام دلچسپی کے معاملات کو زیر بحث لاؤں گا لہٰذا میں اس بات کے لیے معذرت چاہتا ہوں کہ سرزمین کشمیر میں چھ سال تک اپنی مدت کار کے دوران جو باتیں میں نے لکھی تھیں ان میں سے نصف معلومات کا استفادہ کرنے کی مہلت بھی مجھے نہیں مل سکی۔

اس اولین باب میں میں نے اُن باتوں کو چھوڑ دیا ہے جن کی وضاحت میں نے اپنی رپورٹ کے دیگر ابواب میں کی ہے اور میں نے ایسی تجاویز پیش کی ہیں جن سے ملک کے مستقبل

کی انتظامیہ کو آسانی میسر ہوگی۔

جہاں کشمیر اپنی مخصوص قومیت، کردار، زبان، پوشاک اور رسوم و رواج کی وجہ سے بے حد دلچسپ حقائق کے سامان پیدا کر لیتا ہے وہاں اس کی منفرد تاریخ اور نرالی انتظامیہ کا مطالعہ بھی باعث دلچسپی ہے۔

یہ پرکشش وادی سالہا سال سے یورپی باشندوں کے لیے آسودگی کا مسکن رہی ہے اور اس پر کئی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ کشمیر کے بارے میں جو کتب میرے زیر مطالعہ رہی ہیں ان میں سے بہتر تخلیق ڈریو کی جموں و کشمیر ہے اگرچہ اس میں وادی اور اس میں رہنے والے لوگوں کے بارے میں بہت کم معلومات درج ہیں۔

کشمیر کے بارے میں تحریر کردہ بہت ساری کتابوں میں وگنے کی طرف سے فراہم کردہ معلومات میں کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں کیا گیا ہے۔ اس مملکت کی دولت، عوامی کردار اور انتظامیہ کی طرز کے بارے میں عجیب و غریب اور موہوم تاثرات موجود رہے ہیں جن کی وہ لوگ تصدیق یا تردید کر سکتے ہیں، جنھیں کشمیر میں دیہاتی عوام اور سرکاری اہلکاروں سے وابستہ پڑا ہے۔ مجھے ابتدا ہی سے یہ بات معلوم ہے کہ کشمیر کے دیہاتی جب الاؤ جلا کر بیٹھ جاتے ہیں تو وہ خوب باتیں کرتے ہیں۔ وہ کافی باتونی ہوتے ہیں اور خاموش نہیں رہتے۔ سرکاری اہل کاروں کو بھی کافی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

جب 1887 میں مالی بندوبست کی ابتدا ہوئی تو کشمیر کو بجا طور پر ایک مکمل سلطنت کہا جا سکتا تھا۔ اگر کہیں پر اقتدار کی آمریت کا وجود تھا تو وہ تھا کشمیر جہاں مہاراجہ کو براہِ راست مختار کل مانا جاتا تھا۔ شخصی راج کی خواہشات کا مرکز صرف ایک ہی ذات تھی اور عوام مایوسی اور پریشانی کا شکار تھے۔ جب طاقت کا سرچشمہ راہیں بدل بدل کر بہت سے اطراف سے گزرتا ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

کشمیر میں مہاراجہ کی ترجمانی گورنر کرتا ہے۔ وہ بے پناہ طاقت اور صلاحیت کا بھی مالک ہے اور خواہ کوئی بھی محکمہ ہو یعنی پولیس یا جنگلات، ان سب کا مکمل انتظام اُسی کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اگر اس بات کو آسانی کے ساتھ سمجھا جائے تو کشمیر کا نظم و نسق چلانا آسان بن جائے گا۔ کشمیر ایک چھوٹی مملکت ہے جہاں گورنر کسی بھی گاؤں تک ایک دن کی گھوڑسواری سے پہنچ سکتا ہے۔

کشمیر کے ناقص انتظامی امور کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ جب میں پہلی بار 1889 میں کشمیر آیا تو میں نے ایسے بے شمار عیوب اس انتظامیہ میں موجود پائے۔ لوگ مایوسی اور بے بسی کے پنجے میں کسے ہوئے ہیں۔ وہ شکوک وشبہات کے بھی شکار ہیں۔ انھیں کئی سالوں سے یہ سکھایا گیا تھا کہ وہ غلام اور بے یارو مددگار ہیں جن کے پاس کوئی حقوق نہیں سوائے اس کے کہ اُن کے حصّے میں صرف مجبوریاں آئی ہیں۔ انھیں ظلم پرست کہا جاتا ہے۔ سپاہی انھیں کھیتوں میں ہل چلانے اور بیج بونے پر مجبور کرتے ہیں اور یہی سپاہی فصل کی کٹائی کے وقت موجود رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب گلگت تک بار برداری مقصود ہوتی ہے تو انھیں کھینچ کر اپنے گھروں سے باہر لایا جاتا ہے اور سپاہی کو ان سے کام لینے اور ان کی جایداد پر مکمل حق حاصل ہوتا ہے انھیں حقیقت معلوم نہیں تھی۔ یُس کرہ گونگُن ئے کرہ کراو، یعنی جو بوئے گا وہی کاٹے گا۔ اُن کی حالت انقلاب فرانس سے قبل ٹائیرس اسٹیٹ سے بھی بدتر تھی۔ جہاں دیہاتی عوام اس قدر خستہ حالی کا شکار تھے وہاں شہری علاقوں کے لوگ خوشحال تھے۔ بندوبست کی ابتدا سے قبل کشمیر کی جو حالت تھی اس کا اندازہ ہیزلٹ (Hazlitt) کی ''سوانح نپولین بوناپارٹ'' کی مندرجہ ذیل سطور سے ہو جاتا ہے:۔

> ''کسانوں سے حد سے زیادہ کام لیا جاتا اور اس کے عوض پیٹ بھر کھانا بھی نہیں دیا جاتا۔ ان کے ساتھ بدزبانی کی جاتی انھیں مکے مارے جاتے، ان پر مسلسل جبر کیا جاتا اور ہر قسم کے مظالم ان پر توڑے جاتے......جبکہ شہروں میں ناپاک اور فضول قسم کے کاروبار کو ترقی دی جاتی اور ادنیٰ لوگ عیش کرتے یا اعلیٰ افراد کی عیش وتمکنت کے لیے وہ انتظامیہ چلانے کا کام کرتے تھے''۔

یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ زراعت اور کاشت کی مصیبت سے قدرے راحت اور نجات حاصل کرنے کے لیے کسان ایک سے دوسرے گاؤں تک مارے مارے پھرتے۔ ایک کشمیری تضادات کا مرقع ہے، وہ بزدل ہوتے ہوئے بھی ثابت قدم ہے۔ پست حال ہے مگر دانشورانہ صلاحیت کا مالک ہے۔ اس کے تئیں دیہی زندگی کو بہت کم اہمیت حاصل ہے۔ اس کا واحد مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اُن بے گار لینے والوں سے بچ سکے جو اس سے گلگت تک بار برداری کا کام لینے کے لیے آتے ہیں اور جب مالیہ وصول کرنے والے آتے ہیں کہ خریف کی فصل کا اپنا حصہ وصول

کریں تو وہ اپنے کندھوں کا بوجھ اسی پڑوسی پر ڈالنے سے بھی گریز نہیں کرے گا جو اسے بیگار سے بچانے کے لیے کسی تن آسان شخص کا سہارا لے کر دوسرے گاؤں بھیجنے میں ناکام رہا ہو۔ وہ اپنے سوائے کسی کو پسند نہیں کرتا۔

ہوسکتا ہے ان صفحات میں، میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ صحیح ہو۔ مگر یہ کہنا کافی ہے کہ انتظامیہ اس قدر زوال پذیر ہو چکی تھی کہ عوام بددل ہو چکے تھے۔ مملکت افراتفری اور غیر یقینیت کا شکار تھی اور مالیہ بھی بہت کم وصول ہو رہا تھا۔ جن کے ہاتھوں میں طاقت تھی وہ ہر قسم کی لوٹ کھسوٹ میں مصروف تھے۔

میرا یقین ہے کہ کشمیر میں ایک مضبوط شخصی حکومت ہی اچھی ثابت ہوسکتی ہے اور جب مہاراجہ سردی کے موسم میں سرمائی راجدھانی جموں میں قیام پذیر ہو تو اس کے لیے ذاتی طور پر ہر ایک کی نگہداشت ایک مشکل کام ہے۔ کسانوں نے اپنی مصیبتوں کے لیے اُن سرکاری اہلکاروں کو ذمہ دار ٹھہرایا جن کے ذریعے مہاراجہ اپنی حکومت چلاتا تھا۔ انھوں نے ہمیشہ یہ بات مان لی کہ حکمرانوں کی ان کے ساتھ ہمدردی ہے اور وہ ان کی خوشحالی چاہتے ہیں۔ مگر سرکاری اہلکار کبھی اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ مہاراجہ کو کسانوں کی اصل صورت حال کا پتہ چل سکے یا انھیں معلوم ہو کہ ریاست کی آمدنی میں کمی واقع ہو رہی ہو۔ اگر کشمیر کے گورنر دیانت دار اور باعمل نہیں ہوتے تو سارے سرکاری نظام میں اوپر سے نیچے تک بے ایمانی کا دور دورہ ہوتا۔

جرم کا اگرچہ وجود نہیں ہے
مگر دنیا کی گردش اور مخالف گردش کی تبدیلی
اسی صورت میں ظاہر ہوتی ہے
اس کے باوجود یہ جرم سرزد ہو جاتا ہے۔

اگر کسی گورنر میں تھوڑی سی کمزوری یا رشوت ستانی موجود ہوتی تو اس کی صدائے بازگشت ساری وادی میں سنائی دیتی۔ یہ بات نہیں تھی کہ صرف سرکاری اہلکار ہی رشوت خور تھے بلکہ کسان اور ان کے سربراہ بھی اپنے آقا کے خزانے کو لوٹ رہے تھے۔

ہز ہائنس مہاراجہ پرتاپ سنگھ جی۔ سی۔ ایس۔ آئی نے اس بات کو محسوس کیا کہ ان کوتاہیوں

کو مناسب ریکارڈ کی موجودگی اور اعداد و شمار کی فراہمی کے بغیر دور نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اپنی مملکت کا مالیاتی بندوبست خود مرتب کرائے۔ اس سلسلے میں پہلی بات یہ تھی کہ لوگوں کو اس بات کے لیے راضی کرنا مشکل تھا کہ بندوبست اراضی ایک حقیقت بن جائے اور دوسرا یہ کہ نظم و نسق میں کس قسم کا تسلسل ہوگا۔ یہ اعتماد رفتہ رفتہ قائم ہوتا گیا۔

1889 میں زمین کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی مگر اب عوام کے سبھی طبقے اس کی تلاش میں ہیں۔ کاشتکاری کو وسعت اور بہتری حاصل ہوئی ہے۔ مکانات کی نئی تعمیر ہوئی ہے، کھیتوں کی باربرداری ہو رہی ہے۔ باغات زیر کاشت لائے گئے ہیں اور سبزیوں کے کھیتوں میں بھی اب بھرپور فصل ہوتی ہے۔ اب عورتیں کھیتوں میں محنت کرتی نظر نہیں آتیں بلکہ اب ان کے مرد ہی کھیتی باڑی کے لیے موجود رہتے ہیں اور گلگت کی مشکل مسافت اب بھولی جا چکی ہے۔ جب فصل تیار ہو جاتی ہے تو کسان اسے مناسب موقع پر کاٹتا ہے اب کوئی بھی سپاہی گاؤں میں وارد نہیں ہوتا اور قدیم مقولہ

بتہ بتہ تہ پیادہ پتہ

جس کے معنی یہ ہیں کہ ایک طرف ہم کھانا مانگتے ہیں لیکن دوسری طرف سپاہی ہماری جان کے پیچھے پڑا ہے۔ اب کہیں سنائی نہیں دیتا۔ 1887 سے کسان کبھی کبھار ہی اپنی پسندیدہ خوراک چاول کی لذت اٹھا پاتے تھے لیکن اب وہ سبھی چاول کھاتے ہیں اور انھیں نمک اور چائے کی سہولت بھی حاصل ہے۔ دیہاتوں میں چھوٹی چھوٹی دکانیں نظر آ رہی ہیں جہاں تین برس پہلے میں نے کسی کسان کے گھر میں کوئی برتن بھی نہیں دیکھا وہاں اب پیتل کے برتن نظر آ رہے ہیں۔

کشمیریوں کے رہن سہن میں بھی زبردست تبدیلی واقع ہوئی ہے مگر سرکار کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ دیہاتیوں کے اعتماد کو قائم رکھنے کی ہر طرح سے کوشش کی جانی چاہیے۔ اگر بندوبست کے وقت کیے گئے چند دعوؤں سے منہ موڑا گیا تو یہ مملکت دوبارہ افراتفری میں مبتلا ہو سکتی ہے۔ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ وہ بھوکے درمیانہ دار جنھیں اس بندوبست کی وجہ سے باہر نکال دیا گیا ہے اب بھی موقع کی تاک میں بیٹھے صورتحال پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ یہ بات بھی یاد رکھنا لازمی ہے کہ بد دل اور بے کس کشمیری چند سالوں کے اندر ہی خوددار اور عزیم صمیم والے لوگ نہیں بن سکتے،

وہ نرم اور بزدل لوگ ہیں۔ وہ شہری ذمہ داریوں کے لیے ابھی تیار نہیں۔ اور وہ آسانی کے ساتھ چالاک اور مکار درمیانہ داروں کا سہارا لے سکتے ہیں اور درمیانہ داروں اور اہلکاروں کے چنگل میں پھنس سکتے ہیں۔

وقت گزرنے کے ساتھ ممکنہ حفاظتی تحفظ نے عوام میں اپناز بردست کرشمہ دکھایا ہے اور اس میں سب سے زیادہ مثبت اثر عوام کے دلوں پر بیگار سے نجات نے ڈالا ہے۔ گلگت جانے والی سڑک کی تعمیر اور ٹرانسپورٹ کی سہولتوں کے اہتمام سے استحصال کے بدترین واقعات ختم ہو چکے ہیں۔ اگر چہ مہاراجہ نے خود بھی اپنے جی حضوریوں کے مطالبات کو کم کرنے کی مثال قائم نہ کی تو انتظامیہ کی بہم رسانی پھر طول پکڑ سکتی ہے۔ بیک وقت 300 بھیڑ جمع کرنا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ ان کے عوض کچھ بھی ادا نہیں کیا جاتا، مگر اب رسد کی تمام اشیا کی قیمت ادا کی جاتی ہے۔ اگر لین دین کا یہ سلسلہ ایمانداری سے دس سال تک جاری رہا تو کشمیری ایماندار شخص بن جائے گا جس کے بارے میں اس وقت الٹی سیدھی باتیں کہی جاتی ہیں۔

کشمیر ایک بہت قدیم ملک ہے اور یہاں کے لوگ قدامت پرست ہیں جن لوگوں نے یہاں تاریخ کا مطالعہ کیا ہے اُن کا کہنا ہے کہ عوام میں ہندوراجاؤں کے دورِحکومت سے لے کر موجودہ وقت تک کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے۔ عین ممکن ہے کہ کشمیریوں کے بارے میں جو سخت کلامی کی جاتی ہے وہ سب ان کے چال وچلن کے بارے میں سرکاری تجزیہ نگاروں کا کام ہو یا وہ لوگ جو غیر مسلکی ہوں اور جنھوں نے غیر ہمدردانہ طریقے سے ان کا مطالعہ کیا ہو۔ مغل صوبے داروں، پٹھان سرداروں، سکھ اور ڈوگرہ گورنروں، سب ہی نے نظامِ حکومت چلانے کے تمام تر مشکلات اور اپنے آقاؤں کی طرف سے جاری ہونے والے ہمدردانہ مشوروں کو سراسر نظرانداز کر دیا اور اہلِ کشمیر کو بے ایمان، سازشی اور ظلم پرست قرار دیا۔ کتے کو گالی دینے کا واقعہ ایک پرانی کہانی ہے اور مجھے یہ بات ماننے میں قطعی عار نہیں کہ اپنے کام کے پہلے ہفتے کے دوران میری بھی یہی رائے تھی۔ مگر جیسے جیسے میں کشمیریوں کو سمجھتا گیا تو مجھے معلوم ہوا کہ ان کے کردار میں روشن اور تاریک دونوں پہلو پوشیدہ ہیں۔ کسان کو کھیتوں میں ہل چلانے اور اپنے لیے خود گرم کپڑا بننے کے لیے تنہا چھوڑ دیا گیا ہے۔

اور یہی اس کا المیہ ہے۔ حکام اور اہلکار بار بار دوروں پر آتے ہیں اور ان کے یہ دورے سارے متعلقین کے لیے خوشگوار ہوتے ہیں اور ان سے یہ اہلکار دیہاتیوں کی نبض کو بجا طور پر محسوس کرتے ہیں اور جو لوگ گھسے پٹے راستے پر نہیں چلتے ہیں وہ خوش رہتے ہیں۔ ایک کشمیری کی شخصیت کا تاریک پہلو اس وقت نمایاں ہو جاتا ہے جب وہ سرکاری اہلکاروں اور حاکموں کے درمیان گھرا ہوتا ہے۔ ان سے بداعتمادی اور نفرت کرنے کی معقول وجہ اس کے پاس موجود ہے اور ان کے خلاف فریب کاری اس کا واحد ہتھیار ہے۔ اس کا روشن پہلو اس وقت نمایاں ہوتا ہے جب وہ اپنے کھیت یا گھر کے اندر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ہم ایک کشمیری کاشت کار کے اپنے گاؤں کے دکان دار کے ساتھ تعلقات کو لیں۔ دکاندار ایک مسلمان (وانی) ہوتا ہے اور وہ سودخوری نہیں کرتا وہ ایک طریقے کے تحت کسانوں کو قرضہ دیتا ہے جسے وڈ کہا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص پچاس روپے کا قرض لے تو وہ اس کی ادائیگی ایک سال کے اندر، کمبلوں، گھی اور غلے کی صورت میں کرتا ہے۔ وانی ایک کمبل کے لیے تین روپے کی قیمت مقرر کرتا ہے جب کہ وہ اس کی قیمت بازار میں تین روپے آٹھ آنے یا چار روپے وصول کرتا ہے۔

قرض دار کو کسی قسم کی دستاویز یا اقرار نامے پر دستخط نہیں کرنے پڑتے جب کہ اس کا اندراج صرف وانی کے روزنامچہ یا بہی کھاتے میں ہوتا ہے۔ مجھے جب بھی کوئی دیہاتی دکان نظر آتی تو میں وانی طبقے سے ضرور بات چیت کرتا ہوں۔ وہ سب ہی یک زبان ہو کر کہتے ہیں کہ ان کا قرضہ کبھی نہیں ڈوبتا اور انھیں کسی قرض دار کے خلاف مقدمہ بازی نہیں کرنی پڑتی لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ کشمیری کسان بددیانت نہیں ہے۔

اس کتاب میں اعداد و شمار کے باب میں یہ حقیقت نمودار ہوگی کہ کشمیر میں جرم کا تقریباً نام ونشان تک نہیں ہے میں نے مختلف دیہاتوں میں اپنے چھ سال کے قیام کے دوران کسانوں کی طرف سے کسی قسم کی چوری کے کسی معاملے کے بارے میں نہیں سنا۔ اس سے یقیناً یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جیسا کہ تاثر دیا جاتا ہے کہ کشمیری لوگ بددیانت نہیں ہیں۔

1840 سے سرینگر اور اس سے ملحقہ دیہات میں تمام زمینوں سے متعلق سارے مقدمے مختلف عدالتوں سے نکال کر میرے سپرد کیے گئے تاکہ میں ان پر اپنا فیصلہ صادر کرسکوں۔

میرا طریقۂ کار یہ رہا ہے کہ میں اسی گاؤں میں جا کر مقدمے کی سماعت کرتا ہوں جہاں زمین سے متعلق دعویٰ دائر کیا گیا ہو اور میں موقعے پر ہی اپنا فیصلہ سناتا ہوں۔ ایک چنار کے درخت کے نیچے جمع شدہ دیہاتیوں میں سے مدعی اپنا دعویٰ پیش کرتا ہے اور مدعی علیہ اپنا جواب دیتا ہے اس گاؤں کے بزرگ اور آس پاس کے دیہاتی سربراہ مقدمے کے بارے میں اپنی رائے دیتے ہیں۔ اس طرح میری طرف سے ایک مختصر سے اندراج کے بعد مقدمے کا حتمی فیصلہ ہو جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اراضی کے مقدمات حل کرنے کے لیے یہ ایک بے ہنگم اور فوری طریقہ تصور کیا جائے مگر آج تک کسی بھی شخص نے میرے فیصلے کے خلاف اپیل دائر نہیں کی ہے۔ اگر کوئی مدعی سرینگر کی کسی عدالت میں گیا بھی تو اس کے کردار کا تاریک پہلو اجاگر ہوا۔ وکلا اور عدالتی اہلکاروں اور کارندوں نے اس کا سیدھا سادا دعویٰ آمیزش کی نظر کر دیا اور اس طرح مدعی علیہ بھی اصولوں اور حقائق کا دامن چھوڑ کر اپنے ہمسایوں کی شہ پر نہایت بے جا طریقوں کا سہارا لے کر دروغ گوئی کرتا ہے۔

مقدمات کے موقعے پر سماعت کاری کا سلسلہ پانچ سال تک جاری رہا اور میری رائے میں دیہاتوں میں اب جو خوشحالی کا دور دورہ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مقدمہ بازی میں اب نہ تو روپیہ پیسہ خرچ ہوتا ہے اور نہ ہی عوام کے درمیان کوئی بدگمانی پیدا ہوتی ہے۔ میرا طرزِ عمل دیہاتی پنچایت کا پُرانا طریقۂ کار ہے۔ معمولی سے معمولی عقل کا مالک دیہی عوام کے چہروں کو دیکھ کر یہ بات کہہ سکتا ہے کہ میرا یہ دعویٰ درست ہے اور مدعی اور مدعی علیہ دونوں کی ہوشیاری کی بدولت اب وہ اس حقیقت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ کشمیر کے لیے یہ طرزِ عمل آسان کُن اور ممکنات میں شامل ہے یہ بات میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ وادیٔ کشمیر کے کسی بھی گاؤں تک رسائی کے لیے محض ایک دن کا سفر کرنا پڑتا ہے۔

اس طریقے کو اپنانے کے پس پردہ میری یہ رائے کارفرما ہے کہ کشمیری کسان بددیانت نہیں ہے۔ اگر بیان کردہ تاثر کے مطابق وہ جھوٹے ہیں تو میں کبھی ان مقدمات اور دعوؤں کا فیصلہ نہیں کر پاتا جو میرے سامنے پیش کیے گئے۔

اگر کسی کشمیری کے سامنے دوسرے دیہاتی لوگ موجود ہوں تو وہ کبھی جھوٹ بولنے کی جرأت نہیں کرے گا مگر جب وہ عدالتوں کے آلودہ ماحول میں داخل ہو جاتا ہے تو وہ لازمی طور پر جھوٹ

سے کام لیتا ہے۔

ضابطۂ تحفیفہ کو رائج کرنا شاید میرے لیے ممکن نہ ہوتا اگر حکومت نے 1889 میں میری تقرری کشمیریوں کی اراضیات کا انتقال یا ان کے اختیار کے انسداد کی خاطر نہ کی ہوتی۔ آئندہ جب بھی آبادی میں اضافہ ہوگا اور مواصلات کے ذرائع بہتر ہوں گے تو حکومت مسلمان مزارعوں کو انتقال اراضی کا مناسب تحفہ دے گی اور مجھے یقین ہے کہ ان کے قطعات کا کچھ حصہ جو دو ایکڑ آبپاشی اور چار ایکڑ خشک اراضی ہو سکتا ہے نا قابل انتقال ہو جائے گا۔ مجھے امید ہے کہ مقدمات اراضی میں وکلا کو دخل دینے کی اب اجازت نہیں دی جائے گی اور اس قسم کے مشورے کو 1892 کی طرح رد کیا جائے گا۔ اگر کشمیریوں پر مقدموں کا بوجھ لادا جائے گا تو دیہاتوں کی خوشحالی کے عمل میں رکاوٹ پیدا ہو جائے گی۔

زمینوں کا بندوبست ایک مشکل اور دشوار کام ہے۔ مفاد خصوصی رکھنے والے طاقتور عناصر ہمارے خلاف کام کرتے ہیں۔ اگر ہنر ہائینس مہاراجہ اور اس کے مشیروں کی ہمیں متواتر اور ایماندارانہ حمایت حاصل نہ ہوتی تو ہمارے لیے بندوبست کا کام ناممکن بن جاتا۔ ہمارے مخالف مندرجہ ذیل مفادات خصوصی رکھنے والے عناصر سرگرم عمل تھے۔

1۔ سرکاری طبقہ اور وہ پنڈت جو زمینوں پر مراعاتی شرطوں قابض تھے۔

2۔ دیہات کے نمبردار۔

3۔ شہر سرینگر۔

جہاں تک سرکاری اہلکاروں کا تعلق ہے اب نہایت خوشگواری کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ان کی زبردست مخالفت اب دوستانہ تعاون میں بدل چکی ہے۔ مالیاتی نظم ونسق کی ذمہ داری بنیادی طور پر تحصیلداروں پر عائد ہوتی ہے جن کی تعداد اب پندرہ سے کم ہو کر گیارہ رہ گئی ہے۔ ان میں سے ماسوائے ایک کے تمام افراد کا تعلق کشمیر کے پرانے حکومتی نظام کے ساتھ رہا ہے اور گیارہ تحصیلداروں میں صرف ایک پنڈت تحصیلدار ہے۔ کشمیر میں عارضی اصلاحات پر عمل کرنا اُس صورت میں آسان ہو جاتا اگر پنجاب سے تربیت یافتہ تحصیلداروں کو یہاں تعینات کرنے کی اجازت ملتی جیسا کہ ایک مرحلے پر مشورہ دیا گیا تھا۔ ماسوائے اس کے کہ بے انصافی اور

غیر مقبولیت کے اس اقدام کی بدولت غیر کشمیری افراد کی طرف سے رائج کی گئی یہ اصلاحات ابدی صورت اختیار کر لیتیں۔ کشمیر کے بہترین اہلکاروں کو تحصیل دار بنا کر، ان کی تنخواہوں میں اضافہ کر کے اور انھیں عزت بخشنے سے میری رائے میں مالیاتی نظام کے آکۂ کار یہ لوگ اب بندوبست اراضی کو ہمدردی سے دیکھنے لگے ہیں۔ اب وہ فضول قسم کے اہلکار جو مالی گدھوں کی طرح منڈلایا کرتے تھے غائب ہو چکے ہیں اور جابر اور سپاہی مجبوراً دوسرے پیشوں کی تلاش میں سرگردان ہیں یہ ایک خوش کن بات ہے کہ اس مملکت میں چاندی جیسی دھات پہنچ جانے اور اندرونی تجارت میں سرعت پیدا ہونے سے بہت سے کام چور افراد کو ذریعۂ معاش حاصل ہو گیا ہے۔ جہاں تک زمینوں کے مالکوں کا تعلق ہے ان کے ساتھ اب پیار بھرا سلوک کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور آئندہ دس برسوں تک انھیں یہ مراعات حاصل ہوتی رہیں گی۔ اگرچہ ان کا مالیہ بڑھا کر اس حد سے زیادہ کر دیا گیا ہے جس کے وہ عادی تھے دیہاتوں کے سربراہوں نے بھی بندوبست کی بدولت واقعہ شدہ تبدیلی کو اب قبول کر لیا ہے اور اس کی مخالفت ترک کر دی ہے۔ اب وہ بھی کاشتکاروں کی طرح ہی اپنی زمینوں کے لیے مالیہ ادا کرتے ہیں لیکن ان کا سماجی درجہ بہرصورت بہتر ہے۔ اب انھیں مالیہ کی جمع شدہ رقم کا پانچ فیصد حصہ دیا جاتا ہے جب کہ پہلے ان کے حصے میں کچھ بھی نہیں آتا تھا۔

پرانے زمانے سے ہی شہری عوام اور دیہاتوں کے مفادات میں فطری طور پر تضادات موجود رہے ہیں۔ شہریوں کی یہ خواہش رہی ہے کہ انھیں غلہ اور دیگر پیداوار اصل لاگت سے بھی کم قیمت پر حاصل ہو۔ ''جسے آنکھ بھی نہیں دیکھتی اسے دل بھی محسوس نہیں کرتا۔'' حکام بھی شہریوں کی یہ بات سنتے آئے ہیں اور دیہاتی لوگ ان کے لیے آنکھ سے اوجھل پہاڑ کی مانند ہیں۔ ایک اور باب میں، میں نے جنس کی صورت میں مالیہ وصول کرنے کی حقیقی تفصیل بیان کی ہے۔

1894 میں گذشتہ کئی برسوں کے مقابلے میں بنیادی غذا چاول کی قیمتیں گر گئیں، دھان فروخت کرنے والی دشواریوں کے ساتھ ساتھ 1893 کے آخر میں بارہ مولہ سے سرینگر تک بیل گاڑی سڑک کھل جانے سے حکومت کی طرف سے خوش خرید دھان بھی پہنچ گیا۔ اب شہر سرینگر میں چاندی کے رواج میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔ شال بافوں اور پنڈتوں کی طرف سے مزدور حاصل

کرنے کی بڑھتی ہوئی خواہش سے بالآخر سرینگر میں ایک نیا دور طلوع ہوا اور وہ دن اب دور نہیں جب دیانتداری سے صنعت کو بڑھاوا دینے کا بول بالا ہوگا اور حکومت اور اس کی خیرات پر انحصار کرنا ایک پرانی بات رہ جائے گی۔

میں نے حکام پر زور دیا ہے کہ وہ تکنیکی اسکول قائم کریں، حکومت نے غیر ضروری طور پر گرمائی دارالخلافہ کی آبادی کو خستہ حال بنایا ہے جب کہ ایک شہر باش کی خود کفالت اور محنتی شہری کے طور پر اس کا مرتبہ بلند کرنے کے لیے ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔

دسویں باب میں، میں نے قومی کردار کے چند بے حد اہم پہلو بیان کرنے کی کوشش کی ہے اور جب مزید اختلافات کے بارے میں سوچا جائے تو ان پہلوؤں کو ذہن میں رکھا جانا چاہیے۔ ایک صاحب فہم شخص کو اس وقت کسی حد تک بے اطمینانی ہوگی جب اسے معلوم ہوگا کہ کشمیری ان تبدیلیوں کے خلاف ہیں جن کا مقصد بنیادی طور پر عوام کی بہبود ہے۔ بہر حال اس بات کو یاد رکھنا چاہیے کہ اگر ان کا مزاج قدامت پسند نہ ہوتا تو مغل، پٹھان، سکھ اور ڈوگرہ جیسی بہتر اور مضبوط قوموں نے ان کی نمایاں قومیت کو تحلیل کر دیا ہوتا۔ یہ کہنا کوئی مبالغہ نہیں ہوگا کہ ان پے در پے آنے والے حملہ آوروں نے ان کے قومی کردار پر تاثر نہیں چھوڑا ہے۔ عام طور پر نظم ونسق کے مختلف تجربات کے باوجود کشمیری لوگ آج بھی وہی ہیں جو اس وقت تھے جب مغلوں نے انھیں فتح کرنے کے بعد وادیٔ کشمیر کو ہندوستان کے ساتھ ملحق کر دیا تھا۔

چنانچہ یہ بات لازمی بن جاتی ہے کہ اس موقعے پر صبر سے کام لیا جائے اور اگر اہل کشمیر ترقی کے فوائد کی مخالفت کرتے ہیں تو اس کی مذمت یا نکتہ چینی کرنا غلط ہوگا۔ عوام گہری عقل وفہم کے مالک ہیں اور کسی قسم کے تغیر اور تبدیلی کے لیے ان کی مخالفت کی وجہ سے یہاں پر انتظامی تجربے کرنا بے حد دشوار کام ہے۔ بندوبست کی وجہ سے کئی تبدیلیاں عمل میں لائی گئی ہیں اور یہ تبدیلیاں عوام کے کردار اور خیالات کے محتاط تجزیے کے بعد کی گئی ہیں۔ پرانے ارادوں کو نئے تقاضوں کے مطابق ڈھالا گیا ہے اور اگر اصلاحات کو اسی طریقے سے نہیں چلایا گیا تو آئندہ کی بھی اصلاحات بے سود ثابت ہوں گی مگر پرانے اداروں کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ عوام کی رسوم ورواج کو سمجھا جائے، ماضی کی خامیوں کی وجہ یہی رہی ہے کہ حکام نے کشمیریوں کے بارے میں یہ خیال کیا

کہ وہ اس قابل نہیں جن کے بارے میں کوئی مطالعہ کیا جائے۔

میرا تجربہ یہ رہا ہے کہ اس قسم کے لوگوں کے ساتھ رواداری تب تک کوئی معنی نہیں رکھتی جب تک کہ یہ نہ سمجھا جائے کہ ان کا ذہن کیسے کام کرتا ہے۔ مثال کے طور پر جاسوسی کے پرانے رواج یا سرینگر میں کسی بھی طرف سے آنے والی خبر پر آنکھیں بند کر کے یقین کرنے کے رواج کو ہی لیجیے۔ ایک کشمیری کے ہوا بین ہونے کا اپنا ہی ایک مخصوص انداز ہے اور اگر افواہ بازی کے اس چلن کو ختم کیا جائے تو اس پر بہت شور غوغا ہوگا اسی لیے یہ چلن اب تک برابر جاری ہے۔ زینہ کدل یا چوتھا پل ایک ایسا مقام ہے جہاں جھوٹی افواہیں گڑھی جاتی ہیں مگر اب خبر ساز پہلے پل یعنی امیرا کدل تک آپہنچے ہیں۔ اگر چہ دانشوروں کو یہ معلوم ہے کہ یہ خبر زینہ کدل جھوٹی اور بے بنیاد ہے مگر عوام کی اکثریت سیدھے سادے لوگوں کی ہے اور شہر سے شروع ہونے والی ایسی خبروں سے دیہاتی عوام کو کافی تکلیف ہوتی ہے۔

کشمیری نہایت کمزور حس کے ذہین ہوتے ہیں اور وہ افواہوں پر یقین کر لیتے ہیں۔ وہ جذباتی قسم کے لوگ ہیں اور یہی جذباتیت ان پر غالب ہے۔ ان دریائی راستوں اور ان کے کناروں پر وہ بہت اچھا کام کریں گے اگر ان کی تھوڑی سی تعریف یا خوش آمد کی جائے یا انھیں چھوٹے موٹے تحفے دیے جائیں۔ اگر انھیں پورے دن کی اجرت حاصل ہو تو وہ بہت کم کام کریں گے۔ اپنے حاکم کے پختہ ارادے کے وہ قائل ہیں۔ وہ صرف اتنا چاہتے ہیں کہ انھیں بار بار حاکم تک رسائی حاصل ہو اور ان کی بات سنی جائے۔ باتیں کرنے میں وہ بہت مہارت رکھتے ہیں لیکن جب انھیں کسی کاغذ پر تحریری طور پر کوئی بات ماننے کو کہا جائے تو وہ خوف زدہ ہوتے ہیں۔ ان کی نظروں میں کسی معاملے کو کاغذ پر تحریر کرنا ایک جال کے مترادف ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر انھیں مالیاتی نظم و نسق پسند ہے اور چند لوگ ان لچک دار جائزوں کو پسند نہیں کرتے اور عدلیہ کے ضوابط کے مغربی طرز اور خیالات سے انھیں نفرت ہے۔

میں نے اپنی طرف سے بے حد کوشش کی ہے کہ کشمیر کے مالیاتی نظام کو نہ چھیڑا جائے اور جہاں بھی ممکن ہوا میں نے بھاری بھر کم قواعد اور ضوابط کو لاگو کرنے سے اعتراض کیا۔ ایسی تدریسی کتابوں کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا جن کی تشریح حکومت کے اہل کار کریں۔ حکومت اپنی زرعی آبادی

کے لیے صرف اتنا کر سکتی ہے کہ اسے اپنے ہی حال پر چھوڑ دیا جائے۔اس وقت آبادی ناکافی ہے اور اسے بڑھانے کے لیے ہیضہ اور چیچک کا خاتمہ کیا جانا چاہیے۔

کشمیر کی آبادی پنجاب کے مقابلے میں کئی نسلیں پیچھے ہے اور پنجاب میں جو بات اچھی اور ضروری سمجھی جاتی ہے اس خطۂ ملک میں اسے خطرناک اور غیر ضروری سمجھا جاتا ہے۔ جب میں نے ایک دانشور کے ساتھ اس بارے میں بات کی تو اس نے الزام لگایا کہ پولیس ظلم و جبر کر رہی ہے۔میرے ایک سوال کے جواب میں اس نے کہا کہ پولیس بلاشبہ ہمیں تنگ کرتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ انھیں اسی مقصد کے لیے ملازمت میں لیا گیا ہے۔مملکت میں جرائم کا نام و نشان بھی نہ ہو اور پولیس کو کرنے کے لیے کچھ کام تو چاہیے۔

یہ بات بلاشبہ کہی جا سکتی ہے کہ شہروں اور قصبوں میں اور سڑکوں پر پولیس کے لیے کام تو ہے مگر مجھے اس بات کا شک ہے کہ دیہاتوں میں ان کی موجودگی ضروری ہے۔چونکہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ انسانی فطرت ہر جگہ ایک جیسی ہوتی ہے لہٰذا پولیس کی ضرورت کشمیر کے دوسرے ضلعوں میں بھی لازمی تصور کی گئی۔ میں نے پولیس کا ذکر مثال کے طور پر کیا ہے جس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ کشمیر ایک پیچیدہ مملکت ہے اور اس پر برطانوی طرز کے حکومتی نظام کی ضرورت نہیں ہے۔

جہاں انتظامیہ کا یہ مقصد ہونا چاہیے کہ عوام کو اپنے حال پر چھوڑا جائے اور ایک زبردست حکومت کے اندھیرے سے انھیں باہر نکالا جائے۔اس حوالے سے مشاورت کے ذریعے ہی اچھا کام کیا جا سکتا ہے۔

اس وقت کشمیر پر روایت پرستی کی حکومت ہے اور جو لوگ مملکت کے آئین کے فرماں بردار ہیں وہ ہندوستان کے دوسرے لوگوں سے الگ ہیں۔اُن کے پاس بھیڑ اور مویشی پالنے کے لیے کا ہچرائی کی کافی زمین ہے۔ جاڑے کے موسم کے لیے ایندھن ہے۔ اچھے اور گرم کپڑے اور کاشتکاری کے لیے انھیں وافر مقدار میں کھاد میسر ہے۔ وہ فضول خرچ نہیں ہے لہٰذا شادی بیاہ اور ایسے ہی موقعوں پر وہ بہت کم خرچ کرتے ہیں۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ جیسے ہی کشمیر کی خوشحالی بڑھتی جائے گی تو کشمیر کے لوگ ہندوستان کے باقی لوگوں کی طرح شادی بیاہ پر اخراجات میں اضافہ کر دیں۔ لہٰذا اگر حکومت مداخلت کر کے ایک حکم جاری کرے کہ شادی بیاہ کے اخراجات میں کوئی

اضافہ نہ کیا جائے تو لوگ بھی خوشی خوشی اُس کی تعمیل کریں گے۔ یہ لوگ فرماں بردار ہیں اور قدامت پسند رجحان کے احکامات کی تعمیل کرتے رہتے ہیں انھیں اس بات کا احساس ہے کہ آبپاشی، نہری نظام اور دیہات کے مابین آمد و رفت کو برقرار رکھنا ان کی ذمہ داری ہے اور اگر انھیں اس سے سبکدوش کیا گیا تو وہ ایک بہت بڑی غلطی ہوگی۔

دیہاتوں کے بندوبست اور کشمیر کے مالیاتی نظام میں معاونت کے علاوہ میں نے ابریشم، باغبانی، پوست اور شیشہ سازی کے شعبوں کی ذمہ داری بھی سنبھالی تھی۔ ان موضوعات پر کسی اور جگہ بحث کی جائے گی مگر یہاں پر اس بات کا ذکر کرنا لازمی ہے کہ اگر چہ ان میں سے آخری تین مدوں سے ریاست کو بھاری فائدہ ہوا ہے مگر تب تک ان کی اہمیت پوری طرح اجاگر نہیں ہو سکتی ہے جب تک کہ اس معاملے کو نجی سرمایہ داروں کی تحویل میں نہ دیا جائے۔ میرے خیال میں یورپ کے لوگ یہاں پر عام کاشتکاروں اور نو آباد کاروں کے طور پر آباد ہو سکتے ہیں۔ اگر وہ کشمیر میں آباد ہوئے اور نجی سرمایہ داری اور محنت کو فروغ دے کر شراب، پوست، ڈبہ بند اور خشک پھلوں، سبزیوں اور پشم کی پیداوار میں اضافہ کر سکیں تو اس سے ان کی اپنی ترقی اور مجموعی طور پر حکومت کی بہبود ممکن ہوگی۔ انگور کی کاشت کو سری نگر اور اس کے قریبی گرد و نواح میں بھاری پیمانے پر وسعت دی جا سکتی ہے۔ باغبانی کو اپنے بل بوتے پر فروغ حاصل ہو سکتا ہے اور شہتوت کے درختوں کے پھیلاؤ سے اب ریشم کی صنعت کا میدان ہموار کیا جا سکتا ہے۔

اگر چہ ایک ناپختہ ذہن کے چھ سالہ تجربے کو کوئی اہمیت حاصل نہیں مگر جن آرا کا اب میں اظہار کر رہا ہوں اُن کی بنیاد شیشہ گری، شراب سازی اور ابریشم کے میدانوں میں عملی تجربات اور مہارت پر مبنی ہے۔ جہاں تک بھنگ کی کاشت کا تعلق ہے اس کا واحد معیار مالی نتائج کو مانا جا سکتا ہے۔ اگر ان خاص صنعتوں میں نجی اداروں کو کام کرنے کی اجازت دی جائے تو اس سے سری نگر کے باشندوں کو روزگار اور مزدوری کے مواقع میسر ہو سکیں گے۔

ہز ہائینس مہاراجہ پرتاب سنگھ جی سی ایس آئی اور ان کے برادر راجہ امر سنگھ نے ہمیشہ میری جو معاونت اور حوصلہ افزائی کی ہے اس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔ ان کے علاوہ حکومت کے مشیر مال پنڈت سورج کول سی آئی ای نے مشرقی کردار کے بارے میں مجھے اپنی بیش بہا

معلومات سے آگاہ کر کے وہ غلطیاں کرنے سے بچایا جن سے جلد بازی کے عالم میں کوئی غلط قدم اٹھانے کا احتمال تھا۔ بندوست کے معاملے میں بھی انھوں نے جس گہری دلچسپی کا اظہار کیا اس سے اور ان کی ذاتی مہربانی اور کرم فرمائی سے میرا کام آسان اور خوش گوار بن گیا۔ کشمیر کے ڈوگرہ حکمرانوں کے دلوں میں اپنی رعایا کے لیے بہبود کا جو جذبہ موجود ہے میرے پاس نہ تو اس کا کوئی بہت بڑا ثبوت ہے اور نہ ہی میں اسے غلط طور پر تسلیم کر سکتا ہوں۔

کرنل پیری بیسنت سی آئی ای، کرنل پیڈ راکس اور کرنل بار کا بھی میں ممنون ہوں جو اس دوران کشمیر میں ریذیڈنٹ کے عہدے پر فائز رہے۔ جب بندوبست کا کام چل رہا تھا۔ انھوں نے مجھے مناسب مشورہ اور مدد بہم رکھنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی اور میری اس سرگرمی میں مختلف طریقوں سے میری امداد کی۔

جیولاجکل سروے آف انڈیا کے ڈائرکٹر ڈبلیو کنگ نے اراضی سے متعلقہ باب کی نظر ثانی کر کے میری معاونت کی، میں ان کا بھی ممنون ہوں۔ کشمیر کے بارے میں علمی جنگلات کے باب کی ترتیب میں ڈاکٹر اینچی سن سی آئی ای ایف آر ایس لندن اور اڈنبرا نے ایک مشفقانہ انداز میں میری مدد کی جبکہ شمالی ہندوستان کی بوٹانیکل سوسائٹی کے ڈائرکٹر مسٹر ڈوتھے نے میری تحقیق کی تکمیل کے لیے مجھے پودوں کی فہرست فراہم کی۔ چرند و پرند سے متعلقہ باب میں حیوانات کی نسل کے بارے میں جو معلومات درج ہیں وہ کرنل اے وارڈ کی مرہون منت ہیں۔ کرنل انون نے میری فوری اطلاع پر محنت اور جانفشانی کے ساتھ پرندوں کی فہرست مرتب کی اور سیاسی تاریخ سے متعلق باب کی نظر ثانی سنسکرت عالم ڈاکٹر اسٹائین نے کی۔

سماجی زندگی، قبیلوں، ذاتوں اور زراعت سے متعلق ابواب کو میرے کئی دوستوں نے پڑھا اور انھوں نے مجھے مفید مشورے دیے۔ حوالہ جات میں تحریر کردہ یہ رپورٹ بے ربط اور بوجھل معلوم ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ میں نے وہ بہت سارا مواد حذف کر دیا ہے جو زیادہ کارآمد اور فائدہ مند ثابت ہو سکتا تھا مگر کشمیر کے بارے میں تازہ ترین معلومات فراہم کرنے کے لیے میں نے اپنی طرف سے بھرپور کوشش کی۔

●❁❁❁●

دوسرا باب

بیانیہ

ہز ہائنس مہاراجہ جموں و کشمیر کی حکومت کے ماتحت جو علاقہ ہے اس پر اگر ایک نظر ڈالی جائے تو وہ ایک ایسے سفید نقش پا کی طرح نظر آئے جو کالے پہاڑوں کے بیچ میں موجود ہو۔ یہ کشمیر کی وادی ہے جسے یہاں کے لوگ کشیر کے نام سے پکارتے ہیں۔ یہ وادی ہمالیائی پہاڑوں کے سلسلے میں اونچے پہاڑوں کی سطح سمندر سے چھ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ رقبے کے لحاظ سے اس کی لمبائی چوراسی میل اور چوڑائی بیس سے پچیس میل تک ہے۔ اس کے پاسبانوں میں شمال مغرب اور مغرب میں ایک سے بڑھ کر ایک پہاڑ ایستادہ ہے جبکہ جنوب کی جانب 50 سے 75 میل تک چٹانی حدود اسے پنجاب سے الگ کرتی ہیں۔

یہ وادی ان مہم جو تاجروں کی آرام گاہ ہے جو وسط ایشیا اور یارقند کی دور دراز منڈیوں تک بیوپار کے لیے جاتے ہیں۔ شمال اور شمال مشرق کی شاہی حکومت کے جنگلی اور جنگ باز قبیلوں کے ساتھ لڑنا مقصود ہو تو اس کے لیے فوجی کارروائی کے لیے یہ ایک بنیادی علاقہ ہے۔ اس سے آگے مشرق میں بلتستان یا تبت کوچک کا علاقہ ہے جہاں سیدھے سادے اور شریف بلتی لوگ اپنی زندگی خشک اور سرد آب وہوا میں گزارتے ہیں۔

کشمیر اور 8873 فٹ کی بلندی پر واقع اسکردو کے درمیان بلتیوں کا گڑھ، 13,400 فٹ

اونچے دیوہیکل پہاڑوں کے میدان اور اس کے مشرق میں دراس کی اونچی گھاٹی آتی ہے جہاں سے سڑک لیہہ اور یارقند کی طرف سڑک جاتی ہے۔

کشمیر سے چندروز کا سفر مسافر کو ایسے ملکوں میں لے جاتا ہے جہاں وہ نئی زبانوں، رواجوں اور مذہبوں سے دوچار ہوتا ہے۔ علم نفسیات اور لسانیات کے ماہر کو قدیم شناکے لوگوں میں دلچسپی ہوگی جو بلند و بالا ننگا پربت کے پشتوں پر رہتے ہیں۔ یہی چھوٹے تبت کا وہ منگولیائی بلتیوں کا علاقہ ہے جہاں شریف النفس لداخی، بودھ اور کئی بیویاں رکھنے والے لوگ رہتے ہیں۔

وادیٔ کشمیر کے جنوب میں اونچے اونچے پہاڑوں کے درمیان انسانی علوم کے ماہر کو چروا ہے ملیں گے اور اگر مقامی تاریخ دانوں پر بھروسہ کیا جائے تو کشتواڑی ہندوؤں اور کشمیریوں کی قدیم رسومات سے بھرپور رواجوں کا بھی مشاہدہ کیا جاسکتا ہے کیونکہ کشمیر کے باشندوں میں اسلام قبول کرنے سے پہلے یہی رسم ورواج موجود تھے۔

یہ کوہستانی سلسلہ شمال مشرق میں 18,000 فٹ کی بلندی تک جاتا ہے اور جنوب میں 9,000 سے چندفٹ زیادہ تک نیچے آجاتا ہے جہاں سے درۂ بانہال کے راستے وادی سے باہر جاتے ہیں۔

مئی کے آخر تک اور کبھی کبھی اکتوبر کی ابتدا تک وادی کے آس پاس برف موجود رہتی ہے۔ جاڑوں کی برف موسم گرما میں پگھل جاتی ہے اور موسم بہار اور گرمیوں کی بارش کا پانی دریائے جہلم کولبریز کرتا ہے اور وادی میں اس دریا کی سطح بلند ہو جاتی ہے۔ کشمیر کی وادی میں بارش کا مخصوص جنگلاتی علاقہ 116 میل کے رقبے پر پھیلا ہوا ہے جس کی چوڑائی کئی مقامات پر 40 سے 75 میل ہے جس سے کشمیر کی تقریباً 3,900 میلوں پر پھیلی شہہ رگ میں بارش حاصل ہوتی ہے۔

وادی سے پانی کے نکاس کا واحد راستہ بارہ مولہ کی تنگ ندی ہے جہاں سے دریائے جہلم ہموار اور سبز کناروں سے الگ ہوکر ٹیڑھے میڑھے چٹانی راستے سے ہوتا ہوا تیزی سے پنجاب کے میدانی علاقوں میں بہہ جاتا ہے۔

وادی کو ایک پہاڑی سلسلہ کوہ سے گھرے ہوئے ایک گول میدان کے طور پر بیان کرنا ایک رواج سا بن گیا ہے مگر ایسا کوئی انداز بیان ہمیں نظر نہیں آیا جو کشمیر کی اصل وادی اور ان وادیوں کی

اصلی تصویر پیش کرتا ہو (1) جن کے درمیان خوبصورت وادی کشمیر واقع ہے۔اس خوبصورت ملک کے بارے میں یورپی باشندوں نے بہت کچھ لکھا ہے برنیئر نے اسے اس کشمیر کا نام دیا ہے جو ہندوستان کی جنت بےنظیر ہے۔(2)اسی طرح لسانیات کے مشرقی ماہرین کشمیر کو دیکھ کر اس قدر متاثر ہوئے کہ وہ یہاں کے نظاروں کی ستائش کیے بغیر نہیں رہ سکے حالانکہ ان میں سے چند افراد کشمیر کے نظاروں کی خوبصورتی کے قائل نہیں ہیں۔ان ماہرین لسانیات نے اپنی زبان میں اس وادی کو موتیوں سے جڑے زمرد سے تشبیہ دی ہے جو جھیلوں کی سرزمین،صاف وشفاف ندیوں،سر سبز گھاس،خوبصورت درختوں اور بلند قامت پہاڑوں کی صورت میں موجود ہیں اور جو یہاں کی خوبصورتی کو چار چاند لگانے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے لیے کوشاں ہیں۔بہ الفاظ دیگر یہ وادی چٹانوں سے گھرے ہوئے ایک قید خانے کی طرح ہے جہاں سے زمانہ قدیم سے فرار ہونا ناممکن تھا۔بلند قامت پہاڑوں کا وجود کشمیریوں کے لیے بے کسی اور مجبوریوں کے سوا کچھ نہیں تھا کیونکہ ان کی موجودگی میں ظلم وجبر سے بھاگنا ناممکن تھا۔وادی کے مختصر بیان کی جو میں کوشش کروں گا اس میں دیگر ممالک کے ساتھ اس کا تقابلی مطالعہ اچھی خاصی مدد دے سکتا ہے مگر اس کے بلند قامت پہاڑوں،خشک آب وہوا اور پر تجسس چرند و پرند جہاں مشرق ومغرب کا حسین امتزاج ہے وہاں یہ کام ناممکن سا بن جاتا ہے۔

ایشیا میں کشمیر کا طول بلد پشاور،بغداد اور دمشق کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے اور مراتش میں فیض اور امریکہ میں جنوبی کرولینا کی مثال پیش کی جا سکتی ہے لیکن کشمیر میں ان ممالک کی کوئی خصوصیت موجود نہیں ہے۔بعض افراد نے اس کی آب وہوا کا موازنہ مئی کے آخر تک سوئٹزرلینڈ کے ساتھ کیا ہے اور جولائی اور اگست کے دوران یہ جنوبی فرانس کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے مگر میں اس بات کو صاف کرنا چاہوں گا کہ کشمیر کے بارے میں یہ کہنا ناممکن ہے کہ یہاں کی آب وہوا کسی خاص نوعیت یا چند مخصوص اوصاف کا مرقع ہے یہاں تو ہر سوفٹ کی بلندی کے بعد آب وہوا اور بالیدگی کا نیا منظر پیش آتا ہے مثلاً 30 میل کی مختصر گھوڑ سواری کے بعد،نامساعد گرمی کے بعد خوشگوار سرد آب وہوا میسر ہوگی یا اس دوران برسات کی تکان سے خشک اور دھوپ بھرے ماحول کا احساس ہو سکتا ہے۔

اگر چہ یہ رپورٹ ریاستی انتظامیہ کے لیے اعداد وشمار کے اندراج کی خاطر تحریر کی گئی ہے مگر اس میں چند ایسے نکتوں پر بحث کرنا برمحل ہوگا جن میں یورپ کے باشندوں یا کشمیر کے حکمرانوں کو دلچسپی ہوسکتی ہے۔ مجھے ان حقائق کا حوالہ دینے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی کہ پہلے تو یورپی باشندوں کے دوروں سے کشمیر کی مملکت کو فائدہ ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی مہاراجہ کشمیر کی یہ دیرینہ خواہش رہی ہے کہ وہ تمام لوگوں کی کسی حد تک خاطر تواضع کریں اور ان کی ہرممکن مدد کریں جو اپنے ایک مشن کے تحت علاقوں کا دورہ کرنے کے لیے آتے ہیں۔ یہاں یہ ضرور کہوں گا کہ میں نے کسی بھی دوسرے مقام پر سرکاری اہلکاروں میں اس قدر خوش خلقی، عاجزی اور ہمدردی کا جذبہ نہیں دیکھا جتنا کہ کشمیر میں موجود ہے۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کے اس قول پر اب بھی عمل کیا جاتا ہے کہ اس کی نظروں میں ایک محکوم برطانوی بھی بادشاہ کے برابر ہوتا ہے۔ مغربی نقطۂ نظر سے اس وادی میں وہ سب کچھ موجود ہے جس سے انگریزوں کی زندگی پرلطف بن جاتی ہے۔ یہاں پر دلفریب مناظر ہیں۔ کوہ پیائی کے لیے پہاڑ ہیں، ماہر حیاتیات کے لیے پھول ہیں، ماہر اراضیات کے لیے میدان عمل اور ماہر آثار قدیمہ کے لیے شاندار کھنڈرات موجود ہیں۔ ایک شکم پرور شخص کو یہاں پر پھل اور سبزیاں دنیا کے کسی حصے کے مقابلے میں سستے نرخوں پر دستیاب ہیں جبکہ ایک سیاح اپنے پرکیف شب و روز ہاؤس بوٹوں میں گزار سکتا ہے جو چناروں کے درختوں تلے پانی کی سطح پر موجود ہوتے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کشمیر جیسی طرح طرح کی آب و ہوا کہیں اور میسر نہیں ہوگی۔ یہاں ہوا اور پانی کی تبدیلی اُس کی وہ صحت بحال کردے گی جو ہندوستانی میدانوں کی گرمی کی تپش سے گر چکی ہو۔ دوین میں گندھک کے چشمے ہیں جو سری نگر سے آسانی کے ساتھ قابل رسائی ہیں۔ میں اس وقت کا تصور کرتا ہوں کہ جب کشمیر محض اینگلو انڈین لوگوں کے لیے ہی نہیں بلکہ دنیا کے تمام خطوں کے باشندوں کے لیے ایک صحت بخش مقام بن جائے گا۔ کشمیر کے قدرتی حسن یا اس کی کشش یا وادی کی پرکیف آب و ہوا کے بیان کے معاملے میں میں نے کسی قسم کی مبالغہ آمیزی سے کام نہیں لیا ہے اور یہ کہ وادی میں ہر برس کا قیام میرے لیے نئی کشش اور نئی دلچسپی کے منظر بے نقاب کرتا ہے۔

کوہسار

جن پہاڑوں نے کشمیر کے ارد گرد اپنا ڈیرہ ڈال رکھا ہے وہ کسی بھی لحاظ سے بدزیب نہیں ہیں جبکہ ان کی رنگا رنگی کی بدولت ایک فنکار انھیں اپنے تصورات کی زینت بنا سکتا ہے۔ شمال کی طرف نظر ڈالنے سے پہاڑوں کا ایک طویل سلسلہ ایک وشال سمندر کی طرح دکھائی دے گا جو تہہ دار لہروں کی صورت میں بکھرا ہوا معلوم ہوتا ہے اور ننگا پربت (26,620) فٹ کی راس میں الجھاؤ پیدا کرتا ہے۔ اس کے مشرق میں ہرموکھ (16,903) فٹ کا ہیبت ناک پہاڑ وادیٔ سندھ کی حفاظت کرتا ہے۔ ایک حکایت کے مطابق یہاں پر برف باری سال میں صرف جولائی کے دوران محض ایک ہفتے کے لیے بند ہو جاتی ہے اور لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اس پہاڑ کی چوٹی پر سبز گوہروں کی موجودگی کے سبب یہاں کے سانپوں کا زہر بے ضرر ہوتا ہے۔ اس سے آگے مہادیو ہے جو ہندوؤں کے لیے ایک مقدس پہاڑ ہے یہاں سے سری نگر بالکل نیچے دکھائی دیتا ہے اور پھر جنوب میں سلسلہ کوہ گاش براری (17,800) فٹ ہے اور امرناتھ (17,321 فٹ) کے زائرین کے لیے وہ چوٹی ہے جو شام کے سورج کی روشنی میں ایک دلکش نظارہ پیش کرتی ہے۔ اس کے جنوب مغرب میں پیر پنچال (3) جس کی (15000 فٹ) چوٹی کے ساتھ پنجاب سے آنے والے مسافر پوری طرح واقف ہیں۔ اس کے آگے شمال میں توسہ میدان (16000 فٹ) سے گزر کر لوگ پونچھ کی مملکت میں داخل ہوتے ہیں۔ یہاں شمال مغرب میں برف پوش، قاضی ناگ (12,125 فٹ) کی چوٹی ابھرتی ہے جو مارخور کا مسکن ہے۔ یہاں ہر ایک میل کے فاصلے پر کوئی نہ کوئی ایسی پہاڑی چوٹی نظر آتی ہے جو اپنے اندر مختلف جنگوں، حاکموں اور ہاتھیوں کی داستان چھپائے ہوئے ہے۔ یہاں جیسے ہی دھان کی کٹائی کا موسم قریب آتا ہے تو پیر پنچال کاشتکاروں کے مفادات کو نقصان پہنچاتا ہے کیونکہ پہاڑی چوٹیوں پر جلدی برف باری اور سرد ہواؤں سے فصلوں کو بہت نقصان پہنچتا ہے۔

مغرب میں پنجاب کی طرف سے آنے والی گرم ہواؤں کو جب یہاں قیام حاصل ہوتا ہے جو (70) میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتی ہیں تو یہاں پر چیل اور صنوبر کے سرسبز جنگلات نمودار ہوتے ہیں۔ ان جنگلات کے ڈھلوانوں سے پہاڑی ندی نالے (4) نیچے گرتے ہیں۔ جن کی

سفید جھاگ خالص ترین معدنیات کے تالابوں سے گزرتی ہے۔ جب قد آور جنگل ختم ہو جاتے ہیں تو جنگلات کی زمین نظر آتی ہے اور ندی نالوں کے کنارے یاسمین، جنگلی گلاب اور کئی قسم کے پھولوں کی چمک دمک سے روشن ہوتے ہیں۔ جنگلی میدانوں کی سرسبز گھاس ایک ایسے سنورے ہوئے سبزہ کی طرح ہے جسے کانٹے دار جھاڑیوں اور خوبصورت درختوں سے سجایا گیا ہو۔ کشمیر کے پہاڑوں پر نظر آنے والے مختلف رنگ اور ان کا بیان ایک مشکل کام ہے۔ وہ صبح سویرے زعفرانی آسمان کے پس منظر میں نیم شفاف بنفشی معلوم ہوتے ہیں جن کی جلد پر بخارات جمے رہتے ہیں۔ سورج کے چمکنے کے بعد ان کے سائے گہرے ہو جاتے ہیں جن سے ندی نالوں میں کانسی اور نیلگوں رنگ کے خدو خال ابھرتے ہیں بعد ازاں عمودی دھوپ کی چمکتی روشنی میں برف پوش چوٹیاں اور برج نیلے اور ارغوانی معلوم ہوتے ہیں۔ دو پہر میں بنفشی رنگ گہرا اور زرد تانبے کی طرح ہو جاتا ہے جو رفتہ رفتہ زردی اور بنفشی مائل گلابی اور پیازی رنگ میں بدل جاتا ہے اور جب سورج کی آخری کرنیں نظروں سے دور ہو جاتی ہیں تو پہاڑوں کا رنگ سرخی مائل قرمزی ہو جاتا ہے اور برف کی تہہ زردی مائل سبز دکھائی دیتی ہے۔ وادی کے پہاڑوں سے اگر نیچے کی طرف دیکھا جائے تو دھوپ کی روشنی میں زردی مائل سرخ کریوے دکھائی دیتے ہیں جن پر سرسبز دھان کی نئی پود روشنی میں چمکیلی نظر آتی ہے اور دھوپ کی روشنی میں درختوں کی قطاریں گہرے سایوں کی مانند معلوم ہوتی ہیں۔ اس طرح سے پانی کی بوندوں اور ہلکی نیلی دھند سے رنگوں کا جو امتزاج پیدا ہوتا ہے وہ ایک گوہر کے مانند چمک دار دکھائی دیتا ہے۔ کشمیر کے پہاڑوں کی خوبصورتی پوری طرح سے بیان کرنے کے سلسلے میں اس رپورٹ میں انصاف کرنا ممکن نہیں ہے اور اگر اس میں خصوصاً اُن جنگلی میدانوں کا شمار کیا جائے۔ جن میں شاذ و نادر ہی چند لوگ پہنچ سکے ہیں۔

کشمیر کے بارے میں رہنمائی کرنے والی دو بہترین کتابیں موجود ہیں ان میں سندھ اور لیدر وادیوں کے حسن یا لولاب کی خوبصورتی کا ذکر تو ہے مگر ان میں سے کسی میں بھی کشمیر کے مغربی حصے کی خوبصورتی کا ذکر نہیں کیا۔ پیر پنچال سلسلہ کوہ، کوثر ناگ کی جھیل اور گہرے سبز پہاڑوں سے زیادہ پرکشش نظارے شاید ہی کسی اور ملک میں مل سکیں۔ یہاں سے ہو کر پانی وادی میں اہرہ بل کے آبشار میں جاتا ہے اور رخ بدلتے گھاس کے اس میدان کو توسہ میدان کہا جاتا ہے۔ یہاں سے

رائیار کا پانی سکھ ندی میں گرتا ہے۔ اس ندی کا بھر پور جھاگ دار پانی پہاڑوں سے نیچے آتا ہوا یوسمرگ میں رک جاتا ہے۔ اور آگے جاکر اس پانی سے ایک گہری اور خوبصورت جھیل نیل ناگ (5) کی یاد آتی ہے۔ گھنے جنگلات میں واقع اس جھیل کا منظر بے حد قابل دید ہے۔ کشمیر کے پہاڑوں کی خوبصورتی اور درجۂ حرارت کے یہ پہاڑ یہاں کے عوام کے لیے بے حد اہمیت کے حامل ہیں۔ ان پہاڑوں سے آبپاشی کے لیے پانی، لکڑی، ایندھن اور کاہ چرائی کے لیے زمین میسر ہوتی ہے۔ جیسے ہی موسم گرما شروع ہوتا ہے تو مویشیوں کے لیے ریوڑ وادی سے ہانک کر جنگلاتی میدانوں میں لائے جاتے ہیں اور سورج کی گرمی میں وہ مرگوں اور مرغ زاروں پر پہنچ جاتے ہیں۔ یہ مرغزار (6) گھاس کے وہ خوبصورت ارضی قطعات ہیں جو بڑے بڑے جنگلات کو گھیرے ہوئے ہیں۔ یہ مرغزار 7,000 سے 9,000 فٹ کی بلندی پر واقع ہوتے ہیں اور بہترین چراگاہیں اُن ہی بلندیوں پر دستیاب ہوتی ہیں جہاں چیر کے جنگلات ختم ہوجاتے ہیں اور بھوج پتر کے درخت دکھائی دیتے ہیں۔ بلندی پر واقع اس رقبے کو فلاک (7) کہا جاتا ہے۔ یہ علاقہ گڈریوں اور چرواہوں کا گرمائی مسکن ہوتا ہے۔ اگرچہ بہت ساری مرگوں پر یورپی باشندے بھی پہنچ جاتے ہیں جن میں سونمرگ، گل مرگ اور ناگ مرگ گرمیوں کی چھٹیاں منانے کے لیے دل فریب مقامات کا درجہ رکھتے ہیں۔ گڈریوں کا گاؤں پہلگام بھی شاید ایسا مقام ہے جو کافی مدت سے دوسری مرگوں کا ہم پلہ رہا ہے۔ دریائے لیدر کے سرے پر واقع یہ مقام چیر کے سرسبز و شاداب جنگلات سے بھرپور ہے۔ ایسی ہی دوسری جگہ گریز ہے جو ولر جھیل کے کنارے پر آباد بانڈی پورہ سے 35 میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ خوبصورت گریز 8000 فٹ کی بلندی پر واقع 5 میل پر پھیلی ہوئی ایک وادی ہے جہاں سے دریائے کشن گنگا ہوکر گزرتا ہے اور اس کے دونوں طرف پھیلے ہوئے پہاڑ ایک جادوئی منظر پیش کرتے ہیں۔ جس راستے سے ہوکر مسافر گریز میں داخل ہوتے ہیں اس کے دائیں بائیں سفیدے کے درختوں کی قطاریں ایک حسین نظارہ پیش کرتی ہیں۔ یہاں کی آب و ہوا ہلکی اور خشک ہے جس سے بہترین انگریزی سبزیوں کی کاشت ہوتی ہے اور یہاں کی کشمش اور رس بھری نہایت لذیذ ہے۔

ہمہ جہت وادیاں

پہاڑی میدانوں سے نیچے اترنے کے بعد فوراً ہی قابل کاشت علاقہ شروع ہوتا ہے۔ جنگلات کے بیرونی رقبوں تک فائدہ مند مکئی کی کاشت کے علاوہ یہاں اخروٹ کے درختوں کی بھی بہتات ہے۔ اس سے تھوڑا سا نیچے 7,000 فٹ کی بلندی پر کھردرے چاول کی پیداوار ہوتی ہے اور سایہ دار میدان نمودار ہوتے ہیں۔ اس سے نیچے کی سطح اعلیٰ قسم کے چاول کی کاشت کے لیے موزوں ہے۔ ندی نالوں کے کناروں پر بید کے درخت ملتے ہیں۔ وادیٔ کشمیر سے ہوکر جن طوفانی وادیوں تک پہنچا جا سکتا ہے ان کی اپنی ہی اپنی منفرد کشش اور جاذبیت ہے مگر ان کے چند مناظر مشترکہ بھی ہیں۔ وادی کے منہ پر زرخیز زمین کا ایک وسیع دہانہ ہے جہاں پر مختلف رنگوں کے دھان، میدانی درخت، شہتوت اور بید کی بہت کاشت ہوتی ہے۔ اس سے ذرا اوپر کی زمین زینے کی طرح ہے جہاں چاول کی بھی کاشت ہوتی ہے اور ڈھلوانوں پر جنگلی نیل کے پودوں کی دمک ہے۔ تقریباً 7,000 فٹ کے میلوں تک میدانی درختوں کے بجائے اخروٹ کے درخت اور دھان کے کھیت ملتے ہیں جو پہاڑ کے بائیں کناروں پر کم گھنے جنگلات سے نیچے کی وادی سے لے کر پہاڑ کی چوٹی تک پھیلتے چلے گئے ہیں۔ دائیں کنارے پر جس کسی کونے پر ہندوستان کی تیز دھوپ اور گرم ہواؤں سے بچاؤ کے لیے چیر اور چیل کے درخت اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں وہاں وادی سے ذرا اوپر گرجتا ہوا دریا اونچی چٹانوں سے ٹکراتا ہوا دریا نیچے کی طرف سرگرم سفر ہے۔ اس کے طاس کے دونوں طرف شاہ بلوط اور میپل ملتے ہیں، سفید اور پیازی باجرے کی جگہ مختلف قسم کی گندم اور تیتی جو ملتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی بھوج پتر کا فائدہ مند درخت ظاہر ہوتا ہے اور پھر اس کے بعد گھاس اور برفانی تودے نظر آ جاتے ہیں جو گڈریوں کا علاقہ ہے۔

وادی

جہاں تک وادی کا تعلق ہے اس کا بیان شاید جھیل کا فلسفہ بہترین طور پر کر سکتا ہے۔ اس کی ڈھلوانیں کشمیر کو ایک خاص مقام عطا کرتی ہیں جہاں پر استادہ پہاڑ نہیں ہیں اور بنجر چوٹیاں پنکھوں کی صورت میں پھیلی ہوئی ہیں وہاں سے ننگے درخت وادی کی طرف بڑھتے ہیں جنھیں کریوہ کہا جاتا ہے۔ بسا اوقات یہ زمین کے خشک قطعات وادی کے درمیان الگ تھلگ کھڑے معلوم ہوتے

ہیں۔خواہ وہ الگ تھلگ ہوں یا پہاڑوں کے ساتھ ہوں یہ کریوہ جات بنجر ہوتے ہیں اور وادی میں سیدھی کھڑی دیواروں کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ان میں پہاڑی ندیاں آتی ہیں جو دریاؤں میں شامل ہو جاتی ہیں۔کہا جاتا ہے کہ ایک میدان آخر کار جھیل کی تہہ کی صورت میں نمودار ہوگا اور باقی ماندہ تمام مرغزار بھی یہی شکل اختیار کر لیں گے۔

اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہ کشمیر کی وادی کسی وقت ایک جھیل تھی جس کا پانی اس وقت خارج ہو گیا جب اسے بارہ مولہ سے نکاس حاصل ہوا۔کریوہ جات کا بیان اس زمینی سمندر سے کیا جا سکتا ہے جس کے کنارے طاق شدہ کناروں کے برابر ہیں اور قدیم شہروں کے باشندوں کے نشان پہاڑی ڈھلوانوں کے بلند ٹیلوں پر ملتے ہیں۔ان کے پاس دوسرا کوئی چارہ نہیں تھا کیونکہ ان دنوں یہ زرخیز وادی پانی کی الگ الگ قسم کی مقدار میں ڈوبی ہوئی تھی۔

دریا اور پہاڑی ندی نالے

کریوؤں سے نکل کر دریائے جہلم کی طرف آہستہ آہستہ اُترا جا سکتا ہے جہاں کی مٹی دریا کے بہاؤ کی وجہ سے جمع ہوتی ہے۔زمانہ قدیم میں اس کا نام ہیڈس پس اور ہندوؤں کے لیے وتستا تھا۔کشمیری لوگ اسے ویتھ کہہ کر پکارتے ہیں۔جب بارہ مولہ کے مقام پر یہ دریا کشمیر سے دور ہو جاتا ہے تو اس کا نام کاشر دریا پڑ جاتا ہے اور کشن گنگا کے ساتھ شامل ہونے کے بعد اسے دریائے جہلم کہا جاتا ہے۔بارہ مولہ سے کھنہ بل تک اس دریا کو بغیر کسی رکاوٹ کے عبور کیا جا سکتا ہے۔اسلام آباد کے ساحل تک اس کا فاصلہ 102 میل ہے (8)۔زمانہ حال تک اس مملکت کی زیادہ تر آمدورفت اسی راستے سے ہوتی تھی۔سپاٹ تلے والی کشتیوں کو رسا باندھ کر دریا کی چڑھائی کی طرف رفتار کے ساتھ چلایا جاتا ہے جو ڈیڑھ میل فی گھنٹہ ہوتی ہے۔سڑکوں اور پہیہ دار گاڑیوں کی عدم موجودگی میں اس سست رفتار دریا نے یہاں کے لوگوں کے کردار پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ایک کشمیری کے لیے وقت کوئی معنی یا مقصد نہیں رکھتا۔

ایک بے کراں ولر جھیل کو دریائے جہلم کا دہانہ تصور کیا جاتا ہے۔کھنہ بل سے اس دریا کے دہانے تک یہ 165 فٹ نیچے گرتا ہے۔پہلے دریا 30 میل تک 55 فٹ نیچے آتا ہے جبکہ مزید 24 میل کے فاصلے پر دریا کی سطح بہت ہی پست ہے۔ولر سے بارہ مولہ تک دریا کا بہاؤ نہایت

معمولی ہے دسمبر کے مہینے میں جب دریا کی رفتار سب سے سست ہوتی ہے تو اس کا پاٹ اوسطاً 210 فٹ ہو جاتا ہے جبکہ دریا کی گہرائی صرف 9 فٹ رہ جاتی ہے۔ ایک عام دیکھنے والے کو یہ معلوم ہوگا کہ کھنہ بل سے اوپر جنوب سے پہاڑی ندیاں اور ساندرن، برنگ کھنبار، کوکرناگ اور اچھہ بل کے چشمے اس دریا میں شامل ہو جاتے ہیں۔ کھنہ بل سے ذرا نیچے جہلم کے دائیں کنارے سے اسے بہترین معاون ندی مل جاتی ہے جسے لیدر یا لنگوری کہتے ہیں۔ تارسر کی جھیل بروقت موجود برفانی پانی سے مالا مال رہتی ہے۔ اسی طرح آگے نیچے کی طرف جہلم اپنے دائیں کنارے پر ارہ پل ناگ کا پانی اپنے اندر لے جاتا ہے اور واسترون اور ترال کے بالائی پہاڑوں اور پانپور کے زرعی نالوں کا پانی بھی اس میں شامل ہو جاتا ہے جہلم کے معاون دریاؤں میں ممتاز درجہ رکھنے والا دریائے سندھ شادی پور کے نزدیک اس کے ساتھ مل جاتا ہے جہاں ان دونوں دریاؤں کا ملن ہو جاتا ہے ولر جھیل سے گزرنے اور بارہ مولہ پہنچنے سے پہلے دریائے جہلم پہرو ندی کا پانی حاصل کر لیتا ہے۔ یہ ندی لولاب وادی کو صاف کر کے ڈبہ گام میں اصل دریا کے ساتھ مل جاتی ہے۔ بائیں کنارے پر جہلم کو پہاڑی نالوں سے معاونت حاصل ہوتی ہے جن میں اہمیت کے لحاظ سے سندھ اور لولاب کے دریا سرفہرست ہیں۔ بائیں کنارے کی اہم ندیوں میں وشو، رنبی آرہ روмш اور دودھ گنگا ہیں جو سری نگر کے ذیلی کناروں پر اس دریا میں شامل ہو جاتی ہیں سکھ ناگ اور فیروز پور نالے دریا کے کناروں کے دلدل میں کھو جاتے ہیں جبکہ تنگی نالہ ولر کے پانی سے جا ملتا ہے۔ بادبانی کشتیوں کے لیے یہ ایک موزوں جگہ ہے۔ ان ندیوں میں پہرو سندھ اور وشو کچھ دوری تک کشتی بانی کے قابل ہیں۔ (9)

پچھلے زمانے میں دریا کے ساتھ واقع دیہاتوں میں عام انسان کو مجبوراً منصوعی کنارے بنا کر رہنا پڑتا تھا۔ پہاڑی ندیوں کے پانی کے نکاس کے لیے سیلابی دروازے موجود ہوتے تھے تاکہ دریا کے کناروں کی مرمت کی جا سکے۔ اس طرح ان سیلابی دروازوں کی بدولت دریائے جہلم طغیانی سے محفوظ رہ سکتا تھا مگر اب کافی عرصہ سے اس عمل کو ترک کیا گیا ہے۔

میری نگرانی میں سری نگر کے نچلے کناروں کی مرمت کی گئی اور 1892 میں آنے والے سیلاب کو خوش اسلوبی کے ساتھ روک دیا گیا۔ سری نگر کے اوپری کناروں کا کام تھوڑا مشکل ہے

کیونکہ اس سے شہر کا وجود خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ موجودہ مقام پر شہر سری نگر کو تعمیر کیا جانا ایک بدقسمت اقدام ہے کیونکہ اس شہر کو نہ صرف سیلابوں کا مسلسل خطرہ لگا رہتا ہے بلکہ یہ بجائے خود سیلاب کا ایک سبب ہے کیونکہ یہاں نالیوں کا نکاس محدود ہے۔ اس سلسلے میں ہندو کافی دانا تھے جنھوں نے شہر کی آبادی کے لیے بلندی پر واقع زمینوں کا انتخاب کیا۔ اولین مغل حکمران اکبر نے ہاری پربت کی ڈھلوانوں کا انتخاب کیا اور وہاں ناگر نگر آباد کیا۔ اس کے بعد ان حکمرانوں نے مستقبل کی کوئی پرواہ نہیں کی اور جھیل ڈل کو جہلم کے سیلابی پانی کے لیے بند کر دیا اور اس طرح سے سیلابوں کے دوران پانی کے نکاس کا ایک راستہ بند ہو گیا۔ اس کے بعد پٹھانوں نے جہلم کے کنارے پر ایک محل تعمیر کروا کر مغرب کی طرف پانی کے نکاس کا راستہ مسدود کر دیا۔ چنانچہ سیلاب کے پانی کو دریا کے پتھریلے کناروں کی تنگ گزرگاہ سے ہو کر جانا پڑا۔ دریا کی روانی کو ان کناروں کے سبب تنگ کر دیا گیا، ناجائز قبضوں اور 7 پلوں کے خوبصورت ستونوں کی وجہ سے یہ روانی مزید مسدود ہو کر رہ گئی۔ شہر سری نگر کے نچلے کناروں پر قدیم طرز تعمیر نے متوقع نتائج فراہم کیے جبکہ بائیں کنارے کی سطح اب شہر کی باقی زمین سے بلند ہے۔

بائیں جانب کے پہاڑوں پر بارش کے سبب پانی نیچے کو بہہ رہا ہے اور جہلم کی طرف ماسوائے موسم سرما یا خشک سالی کے دوران اس کا کوئی نکاس نہیں۔ اس بات نے حالات کو مزید پیچیدہ بنا دیا ہے اور دریائے جہلم کے دہانے جھیل ولر کی تہہ میں اب ریت اور دلدل جمع ہو رہے ہیں۔ عظیم بادشاہ زین العابدین نے جھیل ولر میں جنوب کی طرف عشم اور سنبل کے درمیان ایک جزیرہ تعمیر کیا جو جھیل کے عین وسط میں واقع تھا۔ اب یہ جزیرہ جھیل کا ایک کنارہ ہے اور عشم اور سنبل خستہ حال ہو چکے ہیں۔ جو لوگ جھیل ولر کی معلومات رکھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ پچھلے 26 برسوں کے دوران جھیل کے بیچوں بیچ تین میل چوڑی ایک پٹی نمودار ہوئی ہے۔ میرا یقین ہے کہ یہ پٹی دن بدن بڑھتی چلی جائے گی اور مستقبل میں اس سے مشکلات پیدا ہو سکتے ہیں۔

سیلابوں کے موضوع پر تاریخی مادیت کے باب میں بحث کی جائے گی۔ یہاں پر صرف یہ کہنا کافی ہوگا کہ رواں دواں دریائے جہلم یہاں کے لوگوں کے لیے اگرچہ ایک آبی راستے کے طور پر فائدہ مند رہا ہے مگر ساتھ ہی یہ لوگ اسے ایک محو خواب شیر سے تعبیر کرتے ہیں۔

جھیلیں

کشمیر میں پہاڑی تالابوں، خوبصورت جھیلوں اور نمیالے نمکین پانی کی جھیلوں کی بہتات ہے۔ ان میں سے ولر، ڈل اور مانسبل کی جھیلیں بے حد خوبصورت اور دلکش ہیں۔ اس کی وجہ اُن پہاڑوں کا جاذب نظر پس منظر بھی ہے جو ان کے اردگرد کھڑے ہیں۔ ان میں ولر جھیل سب سے بڑی ہے جو 12.5 میل طویل اور پانچ میل چوڑی ہے۔ شمال اور شمال مشرق میں بلند پہاڑ اس کی پاسبانی کرتے ہیں۔ بوہ نار، مدہ متی اور ارن ندیاں اس جھیل میں آکر گرتی ہیں جبکہ جنوب میں جھیل کے راستہ بارہ مولہ تک دریائے جہلم کی گزرگاہ ہے۔ ولر کے اردگرد زمینیں کبھی محفوظ نہیں رہتیں کیونکہ یہاں بسا اوقات سیلاب آتے ہیں اور چوبیس گھنٹے کی بارش اور پگھلتی ہوئی برف کا پانی اس علاقے میں دور دور تک پھیل جاتا ہے (10) مقامی باشندوں کا کہنا ہے کہ جب کبھی پُہر وندی میں سیلاب آتا ہے تو اس کا سبب ولر جھیل اور دریائے جہلم ہے۔ پہرو کی وجہ سے جھیل کے پانی کا اضافی بہاؤ قابو میں رہتا ہے۔ شمال مشرق کے کونے پر عظیم بادشاہ زین العابدین کا قائم کردہ جزیرہ ہے۔ جس کے کھنڈر بتا رہے ہیں کہ کسی وقت یہ جگہ نہایت خوبصورت رہی ہوگی۔ کہتے ہیں کہ بادشاہ نے اس جزیرے کی تعمیر اس لیے کروائی تاکہ کشتی بانوں کو جھیل میں آنے والے طوفان کے دوران اس میں پناہ حاصل ہو سکے۔ کشمیر کے کشتی رانوں پر جھیل ولر کا زبردست اثر ہے جب ارن ندی اور بانڈی پورہ کے راستے تیز ہوائیں چلتی ہیں اور گہرے پانی پر بابا شکور الدین کی پہاڑی کی جانب سے طوفانی ریلا آتا ہے تو جھیل کی خاموش سطح ایک طوفانی سمندر کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور اس علاقے کی ہموار تہہ والی کشتیاں خطرے میں پھنس جاتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جس مقام پر اب جھیل کا نیلا پانی موجود ہوتا ہے وہاں پر بداعمال لوگوں کے ایک شہر کو زلزلے نے نیست و نابود کر دیا تھا جس تباہی کا عمل سیلاب نے پورا کیا۔ ولر کے لغوی معنی غار یا گپھا ہے (11) قصوں اور کہانیوں کے مطابق اس بداعمال شہر کے باقیات اور کھنڈرات کو کشتی رانوں نے دیکھا ہے۔

مانسبل کی خوبصورتی اس جھیل کے صاف و شفاف پانی اور اس میں پائے جانے والے کنول کے گلابی پھولوں سے مرتب ہے۔ اس جھیل کے پس منظر میں اونچے پہاڑوں کا عکس اس ہلکے رنگ کی جھیل کی خوبصورتی کو دوبالا کرتا ہے۔ مانسبل کا پانی ایک نہر کی صورت میں جہلم سے باہر کی

طرف بہتا ہے۔

سری نگر کے لوگ اگر اس جھیل کی سیر بھی کشتیوں میں کرتے ہیں مگر ان کے لیے ڈل اور ولر جھیل کے مقابلے میں مانسبل کی زیادہ قدر و قیمت نہیں ہے کیونکہ ان جھیلوں میں قدرتی پیداوار کی بہتات ہے جبکہ جھیل مانسبل کے اندر گرم پانی کے چند ایسے چشمے ہیں جن سے یہ موسم سرما کے دوران بھی جمتی نہیں ہے۔

جھیل ڈل 24 میل لمبے اور ساڑھے بارہ میل چوڑے رقبہ پر پھیلی ہوئی ہے اور شاید یہ دنیا کے سب سے خوبصورت مقامات میں سے ایک ہے۔ اس جھیل کے پانی میں پہاڑی مینڈوں کا گونا گوں عکس جھلکتا ہے۔ اس بات کو وثوق سے کہنا ناممکن ہے کہ یہ جھیل کس وقت کس قدر زیادہ خوبصورت ہوتی ہے۔ موسم بہار کے دوران پہاڑوں اور درختوں کا سبزی مائل عکس آنکھوں کو تازگی بخشتا ہے۔ اکتوبر کے دوران جھیل کے رنگ نہایت پُرکشش ہوتے ہیں۔ جب بید کی شاخوں کا رنگ سبز سے تبدیل ہو کر نقرئی مائل بھورا اور شاخوں پر سرخ ہو جاتا ہے ان رنگوں کا عکس جھیل کے پانی میں جھلکتا ہے اور گہرے زیتونی اور زردی مائل سبز رنگوں میں تیرتے اجسام اس کے برعکس تاثر دیتے ہیں۔ جھیل کے چنار سرخ اور قرمزی معلوم ہوتے ہیں اور سفیدے کے درخت فلک شگاف طلسمی ستونوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ پہاڑوں کی جانب درخت سرخ اور سنہرے بن جاتے ہیں اور یہ منظر بہت ہی پیارا دکھائی دیتا ہے۔ دنیا بھر میں جھیل ڈل کے مقابلے میں کوئی بھی مقام زیادہ خوبصورت اور دلنشین نہیں ہے۔ اگر کسی کی نظر پہاڑوں پر پڑے تو وہ گویا اپنے اندر عجائبات سمیٹے ہوئے ہیں۔ اس جھیل کے بائیں جانب تخت سلیمان کی پہاڑی ہے اور دائیں طرف عہد رفتہ کی منفرد شان و شوکت کا حامل ہاری پربت ہے۔ ان دونوں پہاڑیوں کے بیچوں بیچ سری نگر واقع ہے۔ یہاں سے مغرب کی جانب خاصی دوری پر کشمیر کے برف پوش پہاڑ ہیں۔ جھیل ڈل کا پانی صاف اور شفاف ہے اور لوگوں کا کہنا ہے کہ کشمیر کے شالوں کی عمدہ شکل و صورت کا زیادہ تر دارومدار جھیل ڈل پر ہے جہاں کے ہلکے پانی میں ان شالوں کو دھویا جاتا ہے۔ جو لوگ پینے کے لیے بہتر پانی لانے کا شوق رکھتے ہیں وہ گگری بل جاتے ہیں جو ڈل کا جنوب مشرقی حصہ ہے۔ اس پانی سے جہلم کے پر کثافت پانی کی وجہ سے پھیلنے والی ہیضے کی بیماری سے بچا جا سکتا ہے۔

قدرت نے کشمیر کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ مگر مغل بادشاہوں نے اپنے دور حکومت میں جو کچھ کیا اس کے مقابلے میں کسی اور نے اس سے زیادہ کوئی اچھی کوشش نہیں کی۔ اس جھیل کی قدرتی خوبصورتی میں اضافہ کرنے کے لیے جہانگیر اور شاہ جہاں نے کیاریوں والے باغات بنوائے جس پر سرو کے درختوں کی دیدہ زیب قطاریں نصب کروائیں جن کے درمیان سے سرکتا پانی جھیل ڈل کے سرے پر آ گرتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان باغات اور مناظر کا ایک یورپی ماہر زیادہ قدردی نہ ہو مگر ہموار سطح پر (12) نصب شدہ چنار کے درختوں کے باغ کو نسیم باغ یا ہواؤں کا باغ کہا گیا ہے۔ یہ باغ عہد اکبری میں بنوایا گیا اور گزرے ہوئے زمانے کے شاہی باغات میں سے یہ خوبصورت ترین باغ ہے مگر جب کبھی کوئی جھیل ڈل کی طرف کسی نئے زاویے سے دیکھتا ہے تو اس مقصد کے لیے پری محل کے کھنڈرات سے زیادہ مناسب کوئی دوسری جگہ نہیں جو زبرون پہاڑ کے ایک ٹیلے پر واقع ہیں اور ایک مغل عالم کی یادگار ہے۔ پری محل کی تعمیر داراشکوہ نے اپنے استاد ملا شاہ کے لیے کرائی جس کا مزار وادی سندھ کے داخلی دروازے کے نزدیک ملہ شاہی باغ میں واقع ہے۔ پری محل میں موجود ایک مکروہ جادوگر کے بارے میں عجیب وغریب قصے کہانیاں بیان کی جاتی ہیں جس نے شہزادیوں کی آنکھوں کی نیند حرام کر دی تھی۔ ایک ہندوستانی شاہزادی نے اپنے باپ کے مشورے سے چنار کے درخت کا ایک پتا لایا جس سے اس جادوگر کی جائے پناہ کا سراغ مل گیا۔ ہندوستان کے تمام بادشاہوں کو اس پر بہت غصہ آیا اور انھوں نے مل کر اس جادوگر کو پکڑلیا۔

لوگوں کا کہنا ہے کہ اس جھیل کی تہہ میں ریت اور مٹی جمع ہو رہی ہے۔ اس بات میں شک نہیں کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جھیل ڈل کو پانی فراہم کرنے والی آرہ ندی اب سے زیادہ کھوکھلی ہو جائے گی کیونکہ درگجن کے مقام پر یہ تنگ ندی ڈل کا واحد نکاس ہے اور دریائے جہلم کا پانی اسی راستے اس جھیل میں آ کر طغیانی سے تحفظ عطا کرتا ہے۔ تیرتے ہوئے باغات کی بڑھتی ہوئی تعداد کے بارے میں بھی احتیاط برتی جانی چاہیے ورنہ مغل باغات کی طرف جانے والے چھوٹے چھوٹے آبی راستے اور بھی تنگ ہو جائیں گے اور کشتیوں کی آمد مشکل ہو جائے گی۔

چشمے

کشمیر میں سانپوں (ناگ) کی پرستش کے ساتھ وابستہ پرانے چشموں کی فراوانی ہے۔

عام لوگ اس بات کا ذکر کرتے ہیں کہ ان چشموں کا پانی موسم گرما میں ٹھنڈا اور موسم سرما میں گرم ہوتا ہے۔ ان کے اور دیگر آبی نظام کے بارے میں بھی بہت سارے دلچسپ قصے کہانیوں کا بھی کشمیر میں چلن ہے۔ یہ چشمے آبپاشی کے معاملے میں پہاڑی ندیوں کی مدد کرتے ہیں۔ اور بعض اوقات پانی کا واحد منبع بن جاتے ہیں۔ جنوب میں اچھہ بل، ویری ناگ اور کوکر ناگ اور مشرق میں ارپال کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔

ان چشموں میں سب سے خوبصورت اچھہ بل کا چشمہ ہے۔ جو سوسن دار پہاڑی سے نکلتا ہے۔ بادشاہ جہانگیر نے اسے خوبصورتی اور دادعیش کے مقامات کی اپنی فہرست میں فوری طور پر شامل کر لیا۔ کہا جاتا ہے کہ دریائے برنگ جو چونے کی دراڑوں میں غائب ہو جاتا ہے اصل میں اچھہ بل چشمے کا منبع ہے۔ جموں جانے والی شاہراہ پر چشمہ ویری ناگ ہے۔ اپنے نیلگوں پانی کی وجہ سے یہ چشمہ خاص اہمیت کا حامل ہے جو ایک پہاڑی پشتے کے نیچے سے نکلتا ہے۔ یہاں پر بھی جہانگیر نے گرمیوں کے لیے آرام کدہ کی شکل میں باغ عشرت تعمیر کروایا۔ اسلام آباد یا اننت ناگ بے شمار چشموں کا مقام ہے جہاں سے بہت سی ندیاں بھی نکلتی ہیں۔ ملکھ ناگ گندھک کے پانی کا چشمہ ہے جس کی باغوں کی کاشت میں بہت ہی قدر و قیمت ہے۔ یہ چشمے مقدس مچھلیوں سے بھرے پڑے ہیں جو ایک ممنوعہ شئے ہے۔ کشمیر کے لوگ پانی سے اچھی واقفیت رکھتے ہیں (13) اور وہ مختلف چشموں کی خصوصیات میں فرق بتا سکتے ہیں مگر پینے کے پانی کے طور پر سبھی لوگ کوکر ناگ کو خصوصی مقام دیتے ہیں۔ (14) مگر اس میں شک نہیں کہ اپنی اعلیٰ خصوصیات کی وجہ سے جھیل ڈل پر واقع چشمہ شاہی سر فہرست ہے اور شہر سری نگر کے امرا اور رؤسا یہاں سے پانی حاصل کرتے ہیں۔

سڑکیں

کشمیر آنے والے کسی بھی شخص کو یہ بات کھٹکتی ہے کہ یہاں پہیہ دار گاڑیوں کی آمد رفت کے لیے سڑکوں کا فقدان ہے۔ جھیل ولر کے ارد گرد پھیلی ہموار زمین پر غلے کی ڈھلائی کے لیے قدیم طرز کی پہیہ دار گاڑی موجود نہیں ہے۔ اگر چہ ایسی سڑکیں موجود ہیں جن پر خوشگوار موسم میں ٹٹو اور بھینسیں چل سکتی ہیں مگر دوسرے ملکوں میں سڑکوں سے جو معنی لیے جاتے ہیں وہ یہاں پر موجود

نہیں ہیں۔

اس وقت سری نگر کو اسلام آباد، وہری ناگ اور درۂ بانہال (9,200) فٹ کے ذریعے جموں کے ساتھ ملاتی ہے۔اس کے ساتھ ہی شوپیان، بمبر اور پنجاب میں گجرات کے درمیان رابطہ بھی پیر پنچال (11,400) فٹ کے راستے سے قائم ہے۔سندھ وادی کے دہانے گاندربل اور لداخ کا رابطہ درۂ زوجیلا (11,300) فٹ اور بانڈی پورہ اور گلگت کا راستہ راحد پاٹکن (11,700) فٹ اور بُرزل (13,500) فٹ یا کمری (13,101) فٹ بارہ مولہ کے ساتھ رابطہ فراہم کرتے ہیں جبکہ بارہ مولہ کے راستے جہلم وادی سے ہوتی ہوئی ایک بیل گاڑی سڑک پنجاب تک جاتی ہے۔ خوشگوار موسم کے دوران کسی بھی مسافر کے لیے وادی کے اندر آمدورفت آسان ہے۔مگر جب تیز بارشیں اور برف باری ہوتی ہے تو نقل وحمل کا عمل نہایت مشکل بن جاتا ہے۔ جب طرفین کی ندیوں پر کمزور پلوں کو طغیانیاں بہا کر لے جاتی ہیں۔وادی میں سڑکوں کی تعمیر کوئی دشوار نہیں ہے اور جب بارہ مولہ سے سری نگر تک ٹھیلا سڑکوں کی تعمیر کا کام مکمل ہوگا تو دوسری ٹھیلہ سڑکوں پر بھی تعمیری کام شروع ہوگا۔ان سڑکوں کی تعمیر نہ صرف دیہاتی لوگوں کے لیے سودمند ثابت ہوگی بلکہ اس سے سری نگر کے عوام کو بھی آسانی ہوگی اور انھیں کشتی رانوں کے رحم وکرم پر نہیں رہنا ہوگا کیونکہ جب غذائی اجناس گھاٹوں پر پہنچتی ہے تو یہ دیہاتی ان میں ملاوٹ کرنے کے لیے کافی ہوشیار ہیں۔ان سڑکوں کے علاوہ تحصیل صدر مقامات تک جانے والی دیگر سڑکوں اور ہر گاؤں کا اپنے ارد گرد کے دیہاتوں کے ساتھ ایک ہی راستے کے ذریعے رابطہ قائم ہے جس کے درمیان آبپاشی کی ایک نہر بہتی ہے۔ یہ راستے تھکان سے پُر ہیں اور کبھی کبھی ان پر توازن برقرار رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ چند راستوں کے کناروں پر سایہ دار درختوں کی بہتات ہے جہاں ایک تھکا ماندہ مسافر اخروٹ کے درختوں کے نیچے آرام کرسکتا ہے اور بے شمار چشموں کے پانی سے اپنی پیاس بجھاتا ہے۔اس موقعے پر اسے رسمی کھانوں کی ضرورت نہیں رہتی، کیونکہ ان راستوں پر شہتوت، سیب، ناشپاتی اور اخروٹ کثرت سے دستیاب ہیں۔ یہ پھل کھانے والے راہگیروں کے ساتھ کسی کو کوئی عداوت نہیں مگر وقت بدلتا رہتا ہے اور موجودہ وقت بھی برقرار نہیں رہے گا جب کشمیریوں کو ان پھلوں کی قدر وقیمت کا صحیح اندازہ ہوگا۔

درخت

کشمیر کے درختوں کے بارے میں کسی اور جگہ بحث کی جائے گی مگر یہاں پر میں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ وادی کے درخت وادی کے لیے بہت کشش رکھتے ہیں۔ ہموار سطح پر خوش نما درخت، عمدہ اخروٹ اور بے شمار بید، سفیدے اور سیب، ناشپاتی اور خوبانیوں کے باغات وادی کو ایک بھرپور جنگلی پارک کی صورت عطا کرتے ہیں۔ یہاں پر مشرق اور مغرب کا امتزاج ہے۔ فصلیں بلا شک مشرقی ہیں۔ گول شکل کے درخت، دریا، ندی نالے اور سرسبز گھاس کے کنارے اور بید بھی مغرب کی یاد دلاتے ہیں۔ بے شمار میوہ دار درختوں سے بھرا ہوا لولاب اور اس کے دیہات جن کے راستوں پر ایلم کے سایہ دار اور دیودار کے درختوں سے بھرپور پہاڑ ہیں ایک ایسا نظارہ پیش کرتے ہیں جس میں کچھ بھی مشرقی نہیں۔

آب وہوا

بہت ساری کتابوں میں کشمیر کی آب وہوا کے بارے میں الگ الگ حالات بیان کیے گئے ہیں۔ چونکہ اس بارے میں کافی اختلاف رائے موجود ہے لہٰذا میں نے صرف کشمیر بلکہ وادی کے گردو پیش کی تفصیلات حکومت ہند کے موسمیاتی رپورٹر مسٹر جان ایلیئر سے حاصل کی ہیں۔

اب تک صرف سری نگر کے بارے میں ہی موسموں کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں جس کا طول بلد (34.5) جنوب اور مغرب میں وادی کی حدود کو 30 سے 70 میل چوڑے پہاڑی سلسلے کے ذریعے پنجاب سے الگ کیا گیا ہے۔

وادی کے مغرب میں واقع پہاڑ ہندوستان سے آنے والی برسات کا آخری حصہ ہی پاتے ہیں مگر بجائے خود وادی میں بھی اس کا اثر ظاہری طور پر گہرا نہیں ہے۔ پنجاب کی جانب واقع شمالی سلسلے میں ہونے والی بارش وادی کی بارش کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی۔ آئین اکبری میں کہا گیا ہے کہ بارش یہاں ان ہی موسموں میں ہوتی ہے جب تاتار اور فارس میں ہوتی ہے اور جب ہندوستان میں موسمی بارشیں ہوتی ہیں تو کشمیر کے وادی میں بھی ہلکی بارش اور بوندا بوندی ہوتی ہے۔ سری نگر کے بارے میں دستیاب تفصیلات کی روشنی میں اس بات کو ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ یہاں ایک دن کی مسافت کے بعد ہی آب وہوا مختلف ہو جاتی ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ جب

وادی کے جنوبی حصے میں مسلسل بارشیں ہوتی ہیں تو سری نگر اور کشمیر کے شمالی حصے خشک سالی کا شکار ہوتے ہیں۔ بارشیں خواہ کم ہوں یا کشمیریوں کی زبان میں بہت زیادہ، کشمیر کے جنوب مشرق پہاڑوں میں کونشر نائگ اور شمالی کشمیر میں جھیل ولر پر بادل جمع ہوتے ہیں تو کشمیری لوگ وثوق کے ساتھ یہ پیشین گوئی کرتے ہیں(15) کہ وادی میں عام طور پر بارش ہوگی۔ اس حالت میں پہاڑی ندیوں کے پاٹ آمد ورفت کے لیے ناقابل بن جاتے ہیں اور کمزور پل دریا کی نذر ہو جاتے ہیں۔ مگر خوش آئند بات یہ ہے کہ بارش پورے 24 گھنٹوں تک شاذ و نادر ہی ہوتی ہے۔ 12 گھنٹے کی بارش کے بعد جب دھوپ کھلتی ہے تو زمین خشک ہو جاتی ہے۔ موسم بہار کے دنوں میں بارش عموماً ہوتی رہتی ہے اور جب جون میں گرمی بڑھ جاتی ہے تو ایک بہت بڑا طوفان آئندہ کئی دنوں تک ہوا کو ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ جولائی اور اگست کے مہینوں میں ایک کسان کو ہر پندرہ روز کے بعد بارش کی توقع رہتی ہے لیکن بعض اوقات اسے مایوس بھی ہونا پڑتا ہے۔ ستمبر کی ابتدا میں کئی بار بارشیں ہوتی ہیں جنھیں لوگ کامبار کا کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ بارشیں آئندہ سال کی ربیع فصل کے لیے خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ عام طور پر ستمبر، اکتوبر اور نومبر کے مہینے خشک ہوتے ہیں مگر ماہ دسمبر میں آسمان ابر آلود ہو کر دھند میں لپٹ جاتا ہے اور کرسمس تک برف باری شروع ہو جاتی ہے۔ ایک کشمیری کے لیے یہ ایک معمول کا سال ہوتا ہے مگر بدقسمتی سے بارشوں کا رجحان معمول کے خلاف ہوتا ہے۔ موسم بہار کے دوران زیادہ بارش ہوتی ہے جبکہ گرما کے موسم میں بارش میں کمی رہتی ہے کبھی یہ معاملہ اس کے برعکس بھی ہوتا ہے۔

1889 کے دوران موسم بہار میں بہت زیادہ بارش ہوئی جس کے بعد گرمیوں میں کشمیر میں خشک سالی پیدا ہوئی۔ موسم سرما کے دوران دھوپ تھی۔ مطلع صاف تھا اور برف باری بھی معمولی تھی جبکہ گرمیوں میں اچھی خاصی بارش ہوئی اور آب و ہوا اور یہ برف باری گذشتہ 50 برسوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ اور مختلف تھی۔ 1891 کے موسم بہار میں بارشوں کی کمی رہی جبکہ گرمیوں میں بھی کم مگر پیہم بارشیں ہوئیں اور موسم سرما کے دوران برف باری نہیں ہوئی۔ 1892 میں موسم بہار میں بارش نہیں ہوئی مگر گرمیوں میں بہت زیادہ برسات ہوئی لیکن بہرحال دھان کی فصل بچ گئی۔ اس برس پہلی برف باری 17 دسمبر کو غیر معمولی طور پر شدید تھی۔

1893 کے دوران موسم بہار کی بارشیں معمولی تھیں مگر موسم گرما میں بارشوں کی شدت سے تباہ کن سیلاب آئے۔

وادی کے بزرگوں کا کہنا ہے کہ موسم میں تبدیلیاں ہوتی ہیں جو ایک مثبت رجحان ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اب وہ سردیاں نہیں ہوتیں جوان کے لڑکپن کی یادوں کو تازہ کرتی ہیں۔

مہاراجہ گلاب سنگھ کے وقت میں اتنی برف باری ہوئی کہ برف انسان کے کندھوں تک پہنچ گئی۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دورِحکومت میں برف کی سطح انسانوں کے گھٹنوں تک تھی۔ مگر سردیاں برف باری کے بغیر ہی گزر گئیں۔ جو شخص اب موسم کی بات کرتا ہے تو اس کی یہی رائے ہوتی ہے کہ کشمیر کی وادی میں اب ماضی کے برعکس بہت کم پانی دستیاب ہے۔ ان کے بقول پہاڑی چشموں میں کمی واقع ہورہی ہے اور وادی کی آب و ہوا پنجاب کی طرح گرم و تر ہوتی جارہی ہے۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق پانی کی مقدار میں کمی اور پیداوار کا کم ہونا اس بات کی علامت ہے کہ ہم کل یگ میں رہتے ہیں۔ مجھے یہ معلوم نہیں کہ اس بات میں کس حد تک صداقت ہے۔ مگر 91-1890 کے موسم سرما میں جب وادی میں چار فٹ گہری برف تھی اور درجہ حرارت صفر سے نیچے گر گیا تھا تو اس کا یہ مطلب تھا کہ اب شہنشاہ سردیوں میں بھی کشمیر آتا ہے اور 1893 کی جنوری اور فروری کا سردیوں کے دوران جھیل ڈل پر پھلنے کا کھیل جلدی بھلایا نہیں جاسکتا۔ کشمیر میں موسم سرما حیوانوں کے لیے دشوار وقت ہوتا ہے۔ ان دنوں لکڑی اور کوئلہ کی گرانی کی وجہ سے کشمیریوں کی حالت قابل رحم ہو جاتی ہے۔ سردیوں کے بعد جب فوری طور پر زمینی تمازت کی مہک اور خوبصورت رنگوں کا ظہور ہوتا ہے تو ایک خوشگوار منظر سامنے آتا ہے۔

کشمیر کے عام لوگ موسم بہار کا خیر مقدم کرتے ہیں اور بادام کے باغوں میں جمع ہوتے ہیں اور پھولوں کی کیاریوں کی مہک سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ یہ ان کی رنگ اور حسن سے محبت کا نتیجہ ہے جو اُنھیں اس طرح راغب کرتی ہے اور وہ اس بات پر اطمینان کا اظہار کرتے ہیں کہ سرما کی تکالیف اور برف باری کی مردنی آخر ختم ہوگئی، زندگیاں از سر نو سانس لینے لگیں اور کھلے ہوئے پھول اچھے اچھے میوہ لے کر آ گئے۔ اگر بہار کا موسم کشمیر میں جلدی سے آ جائے تو دن میں دھوپ اور گرمی بھی ساتھ لاتی ہے۔ جون، جولائی اور اگست کے مہینوں میں اگر بارش نہ ہو تو سائے میں

درجہ حرارت 19 ڈگری سلسیس ہوتی ہے اور اس کے بعد دو مہینوں کے دوران سری نگر کی آب و ہوا اور گھٹن سے بھر جاتی ہے پھر مچھر نمودار ہوتے ہیں۔ درجہ حرارت میں اضافے کے ساتھ ہی دھند پھیل جاتی ہے۔ پنجاب کے میدانوں سے آنے والی دھول اور مٹی سے پہاڑ نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ طلوع آفتاب کے بعد ہی دھوپ چمکنے لگتی ہے اور آفتاب غروب ہونے تک دوپہر کا سا سماں رہتا ہے۔ ہوا میں خشکی اور سیلاب زدہ کھیتوں سے ظاہر ہونے والی روشنی میں کام کاج کرنا آنکھوں کے لیے مشکل بن جاتا ہے۔ میں نے 25 اگست کو ہی اخروٹوں پر ابھرنے والے موسم خزاں کی علامتیں دیکھی ہیں۔ اکتوبر اور نومبر تیاری کے مہینے ہوتے ہیں جب دن کو خوشگوار دھوپ چمکتی ہے اور راتیں سرد ہو جاتی ہیں۔ ہندوستان بھر میں اکتوبر کا مہینہ غیر صحت مند ہوتا ہے جبکہ وادی میں یہ مہینہ شاید سب سے زیادہ فرحت بخش ہوتا ہے۔ بارش کی کیفیت کی طرح درجہ حرارت کا بھی یہی حال ہوتا ہے۔ ایک مختصر سی گھوڑ سواری کے بعد ایک یورپی باشندہ ناخوشگوار آب و ہوا سے معتدل آب و ہوا تک فرحت حاصل کر سکتا ہے۔ یہاں پر 30 میل کے سفر کے بعد 8,000 فٹ کی بلندی آتی ہے جہاں پر اوسط درجہ حرارت کبھی 60 ڈگری فارن ہائیٹ سے تجاوز نہیں کرتا۔ سخت سردیوں کے دوران سردی کی شدت سے جب دریائے جہلم کبھی جم جاتا ہے۔ تو اس اہم ترین دریائی راستے کے بند ہو جانے سے سری نگر کے لوگ زبردست مشکلات سے دوچار ہوتے ہیں۔ اس سے زیادہ مصیبت ''کھُوکوش'' کے آنے کی وجہ سے نازل ہو جاتی ہے جب ہوا کا مرطوب ماحول جم جاتا ہے جس سے درختوں اور انڈوں کو بھی نقصان پہنچتا ہے۔ برفانی دیواروں اور منجمد جھیلوں کی وجہ سے کشمیر ایک بڑا سرد خانہ معلوم ہوتا ہے۔ مسٹر جان ایلیٹ کی طرف سے فراہم کردہ مواد اور اعداد و شمار کا مطالعہ کرنے کا مجھے بھی شرف حاصل ہوا۔ مری اور لیہہ کے بارے میں حالات مسٹر بلینڈ فورڈ کی کتاب (Climate and Weather of India) سے لیے گئے ہیں اور باقی کیفیات مسٹر ایلیٹ کی تحریر کردہ ہیں جو 1892 اور 1893 کے دوران اُن کے سری نگر کے بارے میں مشاہدے پر مبنی ہیں۔

مری

یہ مغرب کا ایک کلیدی سینیٹوریم ہے جس طرح مشرقی پنجاب میں شملہ ہے۔ یہ ایک پہاڑی

مینڈ کی چوٹی پر واقع ہے وادیٔ جہلم کو پنوار اور پہاڑ اور میدان سے الگ کرتی ہے۔ میدان کی طرف کے بغیر سبھی اطراف کے پہاڑ گھنے جنگلوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ مری کے آس پاس کے پہاڑوں میں کسی پہاڑ کی بلندی اس بلندی سے زیادہ نہیں ہے جس پر مری واقع ہے۔ لارینس اسلیم پر مشاہدہ گاہ 1875 میں قائم کی گئی تھی جو سطح سمندر سے (7500) فٹ اونچائی پر ہے مگر مری کے مقام سے یہ بلندی (1000) فٹ کم ہے اور یہ ایک ایسے پشتے پر واقع ہے جہاں کی ڈھلوان میدان تک چلی جاتی ہے۔ یہاں کا اوسط درجہ حرارت مری سے کہیں زیادہ ہے کیونکہ یہاں ہوا شمالی مینڈ سے چھن کر آتی ہے۔

ہمالیہ کے بیرونی پشتے پر واقع یہاں کی آب وہوالیہہ اور کوئیٹہ سے بالکل مختلف ہے۔ اگرچہ یہ مسوری اور نینی تال سے خشک اور جنوب مشرق میں واقع ہونے کی وجہ سے نیچے کی طرف واقع قریب ترین میدانوں کی نسبت بہت زیادہ مرطوب ہے۔ سالانہ اور روزمرہ کا درجۂ حرارت معمولی تبدیلیوں کے ماتحت ہوتا ہے۔ اس مشاہدہ گاہ کا اوسط درجہ حرارت پچاس ڈگری ہوتا ہے۔ جنوری اور فروری کے دوران یہ حرارت 39 ڈگری اور جون کے دوران اکہتر ڈگری ہو جاتا ہے۔ ستمبر میں 65 ڈگری تک پہنچنے کے بعد یہ سال کے اخیر تک بتدریج کم ہوتا جاتا ہے۔ اس کا کم سے کم اندراج 34 ڈگری ہوتا ہے۔

1886 کے دوران کم سے کم درجۂ حرارت 16 اعشاریہ 7 ڈگری ہونے کا ریکارڈ موجود ہے۔ گرمیوں کی بارش کے ہلکے پن کے سبب جب جون سے ستمبر تک کا درجہ حرارت دیگر پہاڑی مقامات کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے تو بلندیوں سے قطع نظر چھاؤں میں نصب تھرمامیٹر جون میں 90 ڈگری تک پہنچ جاتا ہے۔ 1880 کے بے حد خشک برس کے دوران درجہ حرارت 98.7 ڈگری تک پہنچ گیا۔ سال بھر کے دوران یہاں دن کے درجہ حرارت میں فرق ہوتا ہے۔ سردیوں کے دوران یہ نسبتاً کم ہوتا ہے اور اگست کے مہینے میں سال کے دیگر حصوں کے مقابلے میں سولہ ڈگری تک آ جاتا ہے۔ خشک ترین مہینوں میں یہ فرق سب سے زیادہ ہو جاتا ہے یعنی اپریل سے جون تک 17 ڈگری سے زیادہ نہیں بڑھ سکتا۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ موجودہ کیفیت چند مشاہدہ گاہوں سے تعلق رکھتی ہے مگر عام انسان کو اس میں بہت بڑا فرق محسوس ہوگا۔

جون سے نومبر تک شملہ یا کسی بیرونی ہمالیہ کے پہاڑی مقام کی نسبت ہوا زیادہ خشک ہوتی ہے مگر فروری میں یہ ظاہری طور پر زیادہ مرطوب ہو جاتی ہے۔ موسم سرما اور موسم بہار کے باقی مہینوں میں اس کی نوعیت میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ اگست کے دوران رطوبت 80 فی صد کی سطح پر بھرپور ہوتی ہے۔ مارچ کے مہینے میں آسمان بارش کے دنوں کے طرح ہی ابر آلود ہو جاتا ہے۔ مارچ سے مئی تک موسم بہار کے مہینوں میں ایک دن میں اوسطاً تین بار بارش ہوتی ہے اور اپریل کے دوران اس بارش میں شدت آ جاتی ہے۔ جب بارش ہر دن ہوتی ہے تو اس کی سطح 1/12 انچ ہوتی ہے۔ جون میں کم بارش ہوتی ہے جبکہ اس کے نصف عرصے کے دوران برسات ہوتی ہے جو موسم بہار سے زیادہ ہوتی ہے۔ 1880 کے دوران 74 دنوں تک برسات ہوئی جبکہ 1885 میں یہ تعداد 123 تک پہنچ گئی۔ اول ذکر میں 39 عشاریہ ایک اور آخر ذکر سال میں 71 عشاریہ 8 انچ بارش ہوئی۔

اکتوبر اور نومبر کے دوران مطلع سب سے زیادہ صاف رہتا ہے مگر اس دوران خاص کر مئی تک شملہ کے مقابلے میں زیادہ بادل ہوتے ہیں۔ دوسری طرف جولائی اور اگست میں شملہ یا دوسری مشرقی جگہوں کے مقابلہ میں کم بادل ہوتے ہیں اور بارش کا بھی فقدان رہتا ہے۔

لیہہ

یہ کوئٹہ سے مزید 4 ڈگری شمال میں واقع ہے اور مزید چھ ہزار فٹ بلند ہے یہاں کی آب و ہوا کی خصوصیات مغربی تبت کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے یہاں کی مشاہدہ گاہ سطح سمندر سے (11,500) فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ ایشیا میں یہ مقام سب سے زیادہ بلندی پر واقع ہے۔ یہاں اب بارہ برس کا اندراج دستیاب ہے۔

لداخ صوبے کا یہ قریبی قصبہ لیہہ وادی سندھ کے بالائی حصے میں واقع ہے جو وادی تبتی مرغزار کے دونوں طرف چالیس پچاس میل کے علاقے میں بند ہے۔ سطح سمندر سے اس کی بلندی اوسطاً (16,000) فٹ ہے اور یہاں ہمالیہ پربت کا بلند ترین کوہستانی سلسلہ واقع ہے۔ دریا کے کنارے میدانوں اور کیاریوں میں کاشت ہوتی ہے اور یہاں کے بے شمار دیہات آباد ہیں۔ کھیتوں اور پہاڑی کے دامن میں دونوں طرف ایک میل کے علاقے کو چھوڑ کر ریت، باجری اور

کنکر کے علاوہ بڑے بڑے پتھر ہیں جو بلوچستان کے مقابلے میں بہرحال ہیئت میں کم ہیں مگر لیہہ میں ان کی بہتات ہے۔ لیہہ کا قصبہ پہاڑوں سے ڈھکا ہوا ہے جہاں دریا سے چار میل اوپر وادی کے شمال میں ایک طویل مگر ہلکی پتھریلی ڈھلوان ہے۔

وادی کا ماحول نہایت صاف ستھرا ہے۔ سورج کی گرمی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ کھلی دھوپ میں تھرمامیٹر اور چھاؤں میں درجہ حرارت میں 60 ڈگری کا فرق ہے اور بسا اوقات یہ فرق بڑھ کر 90 ڈگری تک پہنچتا ہے۔ ان صفحات میں یہ درج ہے کہ ڈاکٹر کیلے نے پانی کو فقط دھوپ میں رکھ کر ابالنے میں کامیابی حاصل کی۔ یہ کام انھوں نے ایک بوتل کی باہری سطح کو سیاہ کر کے سرانجام دیا اور دھوپ سے بچاؤ کے لیے اس میں صاف شیشے کا ایک ٹکڑا ڈال دیا۔ یہ عمل لیہہ میں 191 ڈگری یا 192 ڈگری پر ہوگا جو سطح سمندر کے درجہ ابال سے کافی کم ہے۔

لیہہ کا اوسط سالانہ درجہ حرارت چالیس ڈگری ہوتا ہے جبکہ جنوری اور فروری کے سرد ترین مہینوں میں یہ منفی 18 ڈگری اور 19 ڈگری تک گر جاتا ہے مگر فروری سے جولائی تک درجہ حرارت میں بتدریج اضافہ ہوتا ہے جب جولائی کے مہینے میں درجہ حرارت 62 ڈگری تک پہنچ جاتا ہے۔ جولائی اور اگست کے دوران صبح اور دوپہر کے درجہ حرارت کا اوسط فرق 29 یا 30 ڈگری ہوتا ہے۔ گذشتہ 12 برسوں کے دوران سال کا زیادہ سے زیادہ درجہ حرارت 90 ڈگری تک پہنچ گیا جو عام طور پر 84 ڈگری سے 92 ڈگری تک رہتا ہے۔ دوسری جانب موسم سرما کا درجہ حرارت صفر ڈگری فارن ہائیٹ سے نیچے گر جاتا ہے جو 1878 میں 17 ڈگری منفی تک نیچے آیا تھا۔ ریکارڈ شدہ درجۂ حرارت کا مجموعی احاطہ ایک سو دس ڈگری سے کم نہیں ہے۔ کوئٹہ کی طرح یہاں بھی ہوا خشک ہے اور یہ حالت ہمیشہ ایسی ہی رہتی ہے۔ جون کے خشک ترین مہینے میں اوسط رطوبت سیری کا 37 فی صد ہے اور نمی والے مہینوں یعنی جنوری اور فروری میں یہ رطوبت 61 فی صد ہوتی ہے۔ ان حالات میں آسمان زیادہ تر ابر آلود رہتا ہے اور کسی بھی مہینہ کے دوران بادلوں کا تناسب کل مصرف کا 6/10 ہے۔ بارش اور برف باری نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے جو سال بھر میں 2.7 انچ ہے۔ 1879 میں برف اور بارش کا سب سے زیادہ ریکارڈ درج کیا گیا جو پانچ انچ سے زیادہ تھا جبکہ کم از کم ریکارڈ 1876 کے دوران نصف انچ سے بھی کم دیکھا گیا۔ جنوری اور فروری کے

دوران بہت برف باری ہوتی ہے مگر برف کی تہہ ہلکی ہونے کی وجہ سے فوراً غائب ہو جاتی ہے۔ جولائی اور اگست میں اکثر برسات ہوتی ہے جو اوسطاً دس دنوں میں ایک بار ہوتی ہے جس سے ان دو مہینوں کے دوران روزانہ ایک انچ کا 2/10 حصہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اس علاقے میں زراعت کا تمام دارومدار کلی طور پر آبپاشی پر ہوتا ہے۔ یہاں ہوائیں عام طور پر ہلکی ہوتی ہیں۔ کھر دونگ درہ کے داخلی دروازہ لیہہ میں دن کے وقت جنوب سے مغرب کی طرف ہوا کا رخ ہوتا ہے جو رات کے وقت شمال سے مشرق کی طرف چلتی ہے۔ یہ بات خاص طور پر سال کے آخری مہینوں میں نظر آتی ہے۔ جنوری اور فروری میں ہوا عام طور پر خاموش ہوتی ہے جبکہ اپریل اور مئی میں یہاں سب سے زیادہ ہوائیں چلتی ہیں۔

سری نگر

یہ شہر وادیٔ کشمیر میں واقع ہے اور اس کی بلندی (5,200) فٹ ہے۔ وادی کے ہر طرف پہاڑ ہی پہاڑ ہیں جن کی بلندی 15,000 فٹ یا اس سے زیادہ ہے۔ اس طرح سے یہ وادی مکمل طور پر ایک طرح سے محصور ہے اور پنجاب اور مغربی ہمالیائی علاقوں سے آنے والی ہواؤں کے ساتھ یہاں کی ہواؤں کا کوئی اشتراک نہیں ہے۔ اصل میں یہ ہوائیں جنوب اور مشرق سے آتی ہیں اور عام طور پر یہ دریاؤں کی وادی سے آتی ہیں۔ یہاں مشاہدہ گاہ کا قیام 1891 میں کیا گیا مگر وہ مشاہدے بہت کم ہمارے پاس ہیں جن سے ہم اہم پہلوؤں سے متعلق معلومات حاصل کر سکتے۔ یہاں اوسطاً سالانہ درجہ حرارت 25 ڈگری ہوتا ہے جنوری اور فروری سرد ترین مہینے ہوتے ہیں جب درجہ حرارت 36 یا 37 ڈگری تک آ جاتا ہے۔ جولائی اور اگست کے مہینوں میں اس میں اضافہ ہو کر یہ 72 ڈگری تک پہنچتا ہے اور بعد میں سال کے آخر تک اس میں کمی آ جاتی ہے۔ اگست اور ستمبر کے سوائے سری نگر پورے سال مری سے زیادہ سرد ہوتا ہے۔ دن کے وقت درجہ حرارت کا اضافہ صاف موسم کے دوران مری کے موسم کے مقابلے میں کافی زیادہ ہوتا ہے۔ جنوری اور فروری کے ابر آلود موسم میں یہ 15 ڈگری تک پہنچتا ہے جو مری کے درجہ حرارت کے برابر ہے۔ اپریل، مئی اور جون میں اس میں اوسطاً 25 ڈگری کا اضافہ ہوتا ہے جو مری کے درجہ حرارت کے مقابلے میں 8 ڈگری زیادہ ہے۔ جولائی سے ستمبر تک 3 مہینوں کے دوران اس میں

21 ڈگری کی کمی ہوتی ہے۔ اکتوبر اور نومبر میں جب مطلع صاف ہوتا ہے تو یہ 32 ڈگری تک پہنچتا ہے جو مری کے درجہ حرارت کے برابر ہے۔ اور ہندوستان کے میدانوں کے درجہ حرات کے ساتھ یکساں ہو جاتا ہے۔ دسمبر میں ابر آلود موسم کی واپسی کے ساتھ ہی یہ درجہ حرارت بھی گر کر 19 ڈگری ہو جاتا ہے۔ مری کے مقابلے میں سری نگر کی ہوا نم ہے۔ اس میں آبی بخارات کا اوسط دباؤ سال بھر میں 30 یا 34 فیصد ہوتا ہے جو مری سے زیادہ ہے۔

1893-94 کے دو برسوں کی اوسط رطوبت 87 انچ تھی جبکہ مری میں یہ صرف 57 انچ تھی۔ سری نگر کی زائد رطوبت اس کے عظیم دریا کے کنارے پر واقع بند وادی کا حصہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ سری نگر میں مری سے زیادہ بادل ہوتے ہیں۔ پچھلے دو برسوں کے دوران ان بادلوں کی کل مقدار 4.6 تھی جبکہ مری میں یہ مقدار 3.7 ہے۔ چنانچہ رطوبت سے بھری ہوئی یہ آب وہوا مری سے زیادہ انگلینڈ کے قریب تر ہے۔ سری نگر کا سب سے نمایاں پہلو اس کی ہوا میں خاموشی ہے۔ سرینگر میں صبح آٹھ بجے ہوا کے (731) مشاہدات 94-1893 میں کیے گئے۔ ان میں سے 34.5 خاموش پائے گئے باقی 386 مشاہدات میں سے (198) جنوب یا جنوب مشرق کی سمتوں کے تھے۔ جبکہ (81) مخالف سمت یا شمال مشرق کی طرف کے تھے۔

مغربی ہمالیہ کے پہاڑی علاقوں میں بخارات فقط دو ہی اوقات میں بے حد مشکل حالات میں نمودار ہوتے ہیں۔ ان میں اہم اوقات دسمبر سے مارچ یا اپریل کا سرد موسم اور جولائی سے ستمبر تک جنوب مشرقی برسات کا دورانیہ ہوتا ہے۔ درمیانی عرصہ یعنی اپریل سے جون تک کبھی کبھار گرج چمک کے ساتھ چھینٹے پڑتے ہیں اسے موسم گرما کی برسات کہا جاتا ہے اور اس کی اہمیت نسبتاً کم ہوتی ہے۔ موسم سرما کی بارش بنیادی طور پر پیچیدہ نوعیت کے طوفان کی وجہ سے ہوتی ہے۔ 20,000 کی فٹ کی بلندی پر بخارات کی مقدار شاید زیادہ ہوتی ہے۔ دوسری طرف جنوبی مغربی برسات کشمیر کے ان پہاڑوں کے دامن میں سب سے زیادہ ہوتی ہے جن کا رُخ پنجاب کی طرف ہے۔ اور جیسے جیسے بلندی بڑھتی جاتی ہے یہ کم ہوتی جاتی ہے۔ لداخ اور گلگت وغیرہ میں اس برسات کی بہت کم اہمیت ہے۔ اگر چہ کشمیر میں سال کے ان دو اوقات میں بارش ہوتی ہے مگر جموں اور کشتواڑ میں جنوب مغربی مانسون غالب ہے جبکہ لداخ اور گلگت میں سرد موسم کے دوران

بخارات بھاری ہو جاتے ہیں اور بھاری اہمیت بھی رکھتے ہیں۔ یہ عمل اسی وقت رونما ہو جاتا ہے جب وادیٔ کشمیر کے پہاڑوں پر برف گرتی ہے اور شدید سردی میں اونچے پہاڑوں پر برف 40 سے 60 فٹ تک ہوتی ہے۔ کشمیر کے درمیانہ پہاڑوں میں سال کے سال بارش ہوتی رہتی ہے۔

جموں میں بنیادی طور پر بارش برسات کے دوران ہی ہوتی ہے۔ کشتواڑ میں بھی شاید بارش کا یہی موسم ہے اور یہاں جموں کی نسبت بارش کی تقسیم زیادہ مساویانہ ہے۔

وادی سندھ میں لیہہ کے مقام پر ہمیشہ بہت کم بارش ہوتی ہے مگر اس وادی کے ڈھلوانوں کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ بھی ہوتا ہے۔ دو برسوں کی تفصیلات اور اعداد وشمار کے مطابق اسکردو میں لیہہ سے چار گنا بارش ہوتی ہے۔ لیہہ، اسکردو اور وادی سندھ کے اونچے علاقوں میں عام طور پر سردیوں کے موسم میں بارش ہوتی ہے جو دسمبر سے اپریل یا مئی تک جاری رہتی ہے۔ جموں میں دسمبر تک یا تو بہت کم بارش ہوتی ہے یا بالکل ہی نہیں ہوتی۔ مقدار کے اعتبار سے گلگت میں لیہہ سے کم بارش ہوتی ہے۔ سردیوں کے دوران بارش کا نہ ہونا موسم کا ایک روشن پہلو ہے جبکہ بارش بنیادی طور پر اپریل سے ستمبر تک بکھری ہوتی ہے۔ آس پاس کے پہاڑوں پر سردیوں میں اکثر برفباری ہوتی ہے اور برف پگھلنے کے ساتھ ہی کاشتکاری کا جاری رہنا ممکن بن جاتا ہے۔ سری نگر میں بارش کی تقسیم تمام سالوں کے دوران ہوتی ہے۔ دسمبر سے مارچ تک اچھی خاصی بارش ہوتی ہے۔ مئی اور جون ہلکی بارش کے مہینے ہیں یا ان میں گرج چمک کے ساتھ چھینٹے پڑتے ہیں اور جولائی کے مہینے سے ستمبر کے وسط تک برسات اپنے جوبن پر ہوتی ہے۔

صحت

جو لوگ اس ملک کا سفر کرتے ہیں اُن کو وادی میں ایک ایسی آب وہوا کا تحفہ نصیب ہوتا ہے جو دوسرے مقامات پر نایاب ہے۔ جولائی اور اگست کے دوران سری نگر میں دلدل پیدا ہو جاتی ہے جو صحت کے لیے مضر ہوتی ہے۔ عام حالات میں دیکھا جائے تو یہ وادی بیماریوں سے پاک ہے۔ یہاں ملیریا، بخار، جگر کی بیماریاں اور دیگر امراض کی شکایتیں شاذ ونادر ہی ملتی ہیں جبکہ کہا جاتا ہے ٹائفائیڈ یعنی میعادی بخار کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا مگر بدقسمتی سے چند بیماریاں عام ہیں۔ اکتوبر کے مہینے میں سردیوں کا چیچک نمودار ہوتا ہے جس سے بہت سارے بچوں کی موت

واقع ہو جاتی ہے۔اس بیماری کا ٹیکہ یہاں پر رائج نہیں ہے۔1892 کے جاڑے میں وادی کے دیہاتوں اور شہر سری نگر میں چیچک کی تباہ کاریوں کی وجہ اس سال ہیضے کی وبا بچوں کے لیے زیادہ جان لیوا ثابت ہوئی۔(16) گل ہٹ کی بیماری عام طور ان دیہاتی لوگوں میں پائی جاتی ہے جو ایسے علاقوں میں رہتے ہیں جہاں پینے کا پانی، چونا، میگنیشم یا چونے کے پتھر کی چٹانوں پر سے بہہ کر آتا ہے۔ چیرات تحصیل کے دیہات کے ایک طبقے کو گیڈر کہا جاتا ہے۔اس مناسبت سے اس دیہات کے تقریباً سبھی لوگ گیگھے کی بیماری میں مبتلا ہیں۔

جو کاشتکار ٹھنڈے پانی میں جھک کر کام کرتے ہیں ان میں کمر درد اور کھانسی کی شکایت عام پائی جاتی ہے۔کشمیر کے لوگ تھوک کر گلہ صاف کرنے کے عادی ہیں جبکہ ایک نازک گلے والا ہندوستانی مکھن یا گھی نہیں کھائے گا کیونکہ وہ اپنے منہ اور گلہ کی صفائی کے لیے چائے اور نسوار استعمال کرتا ہے۔مسلمانوں میں ذہنی گھٹن کی بیماری عام ہے اور بچوں کو عام طور پر آنکھوں کی بیماری ہوتی ہے مگر کشمیریوں کے لیے سب سے بڑا عذاب ہیضے کی وبا ہے اگر یہ ایک مرتبہ پھوٹ پڑے تو عوام کی بہت بڑی تعداد لقمہٴ اجل بن جاتی ہے۔وادی کی سیلابی سرزمین میں ہیضے کو پنپنے میں موافق ماحول حاصل ہوتا ہے۔جبکہ سری نگر جیسے گندے شہر میں اسے بہت نشو ونما حاصل ہوتی ہے اور اس طرح سے یہ صورت حال اس مقولے کی مثال پیش کرتی ہے کہ خدا نے گاؤں بنائے اور آدمی نے شہر بنائے۔

1824 سے لے کر وادیٴ کشمیر میں ہیضہ کی وبا دس بار پھوٹی ہے مگر انسانی یادداشت میں شاید سب سے بڑی وبا 1892 کے موسم گرما میں پھوٹی جب کشمیر کے چیف میڈیکل آفیسر کی اطلاع کے مطابق سری نگر اور دیہات میں 1,21,712 لوگ جان بحق ہو گئے۔عوام میں گھبراہٹ اور افراتفری کا یہ عالم تھا کہ موت کے اندراج کا کام بھی پورا نہیں ہو سکا۔میرا ذاتی اندازہ یہ ہے کہ دیہات میں اموات کی تعداد 5,931 بیان کی گئی تھی مگر اصل تعداد اس سے زیادہ کہیں ہوسکتی ہے۔1892 میں پھوٹنے والی اس وبا سے وادی میں لقمہٴ اجل ہونے والوں کی تعداد 18,000 سے کسی طرح کم نہیں تھی۔میں ہیضے کی اس وبا کے دوران دیہات میں خیمہ زن تھا اور میں نے عوام کی بے کسی اور درد کا ایک دلدوز منظر دیکھا۔سارا کام معطل ہو کر رہ گیا تھا اور

دیہاتی دن بھر قبرستانوں میں بیٹھے رہتے تھے۔ علاج و معالجہ سے ان کا یقین اٹھ گیا تھا مگر انھیں سرسبز اور کھٹے انگور کے اکسیر ہونے اور دیہاتی حجام کے ہاتھوں خون نکالنے پر یقین تھا۔ سری نگر میں ہیضے کی وبا پر بہت کچھ تحریر کیا گیا ہے مگر سب کی یہی رائے ہے کہ اس سلسلے میں کوئی نہ کوئی تدبیر ممکن تھی۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ کشمیر کے قصبوں اور بڑے بڑے دیہاتوں میں صحت وصفائی کی اصلاح کی بہت ضرورت ہے۔

وادی کی تصویر کو بیان کرنے سے قبل یہ لازم ہوتا ہے کہ اس عظیم شہر کے بارے میں بھی بات کی جائے جسے بہت سے لوگ سری نگر کے نام سے جانتے ہیں اور وادیٔ کشمیر کے کاشتکار اسے شہر آفتاب یا برکتوں کا شہر کہتے ہیں۔ سری نگر وادی کشمیر کا دارالخلافہ 960 عیسوی میں بنا۔ جھیلوں کے آلودہ پانی اور زیریں علاقوں کے دلدل کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس کا ایک افسوس ناک حال بیان کیا جاسکتا ہے کہ سری نگر شہر کی تعمیر میں زیادہ بلندی پر واقع صحت بخش علاقے کا انتخاب نہیں کیا گیا۔ یہ شہر 22,448 مکانات پر مشتمل ہے جو دریائے جہلم کے کناروں پر نہایت بے ترتیبی اور بے ہنگم طریقے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ دریائے جہلم سری نگر شہر کے بیچوں بیچ بل کھاتا ہوا بہتا ہے جس کا پاٹ 80 گز کا ہے۔ اس دریا کے دونوں کناروں پر مکانات تین میل کی لمبائی اور ڈیڑھ میل کی چوڑائی پر پھیلے ہوئے ہیں۔ پنڈت فرقے کے امرا کے پکی اینٹوں کے مکانات سے لے کر تین منزلہ عمارات کے علاوہ وہ چھوٹے گھر بھی شامل ہیں جو تین کمروں پر مشتمل ہیں جن کی تعمیر دھوپ میں سکھائی گئی اینٹوں سے کی گئی ہے۔ ان چھوٹے مکانات میں غریب شالباف اپنی بدحال زندگی گزارتے ہیں اور شدید سردی کے موسم میں ٹھٹھرتے ہیں جبکہ پنڈت رئیسوں کی ایک حویلی میں 500 افراد تک رہ سکتے ہیں اور موسم سرما کے دنوں میں انھیں گرم رکھنے کے لیے حمام تعمیر کیے گئے ہیں۔ چھوٹے مکانات نہایت کمزور ہوتے ہیں جن کی اینٹ کی دیواریں بڑے بڑے چوکھٹوں کے ذریعے یکجا رکھی جاتی ہیں۔ اگرچہ ان کی یہ کمزوری ہی زلزلوں سے ان کا تحفظ کرتی ہے مگر لکڑی کی دیواروں اور گھاس پھوس کی چھتوں کے سبب یہ مکان آسانی سے آتش زدگی کا شکار ہوتے ہیں جو وقتاً فوقتاً اس شہر میں ہوتی رہتی ہے۔ اگر نئی تعمیرات کے سلسلے کو کسی منصوبہ بندی کے بغیر آگے بڑھایا جائے تو یہ شہر بدزیب اور بدصورت بن کے رہ جائے گا۔ ان 22,448 مکانوں میں ایک

1,18,960 لوگ کھاتے سوتے اور مرجاتے ہیں۔1892 کے دوران ہیضے کی وبا کے بارے میں کشمیر کا چیف میڈیکل آفیسر جو ایک بنگالی تھا اور جس نے کشمیر میں کئی سال تک کام کیا تھا کشمیر کے غیر صحت مند ماحول کے بارے میں جو کچھ لکھتا ہے ذاتی مشاہدے کی بنا پر میں اس کے اس تجزیے کی تصدیق کرتا ہوں۔اس کے بقول ''کشمیری لوگ ناپاکی کے لیے بدنام ہیں اور وہ ذاتی صفائی کی قطعاً پرواہ نہیں کرتے۔ چھ مربع میل کے علاقے میں 1,18,960 لوگوں کی آبادی رہتی ہے جن کے مکانات پست، گندے اور بے ترتیب ہوتے ہیں۔راستے اور گلیاں دشوار گذار ہیں اور اس شہر میں ہوا کے نکاس کا نظام نامکمل ہے۔صرف چند مکانوں کے اندر بیت الخلا ہیں جبکہ باقی لوگ چھوٹی چھوٹی گلیوں اور کوچوں کا استعمال کرتے ہیں۔میونسپلٹی نے فضلہ وغیرہ کی صفائی کے لیے 2 سو خاکروب کام پر لگائے ہیں مگر اتنی آبادی کی ضرورتوں کے پیش نظر یہ تعداد بہت ہی کم ہے۔نالیاں کہیں موجود نہیں۔گندگی اور فضلہ صرف سیلاب کا پانی ہی دریا اور نالہ مار تک پہنچاتا ہے جہاں سے شہر کو پینے کے پانی کی بہم رسانی ہوتی ہے موسم سرما میں برف باری اور موسم بہار کے دوران بارش نہ ہونے سے دریا کا پانی کم ہو جاتا ہے۔نالہ مار کے طاس کی سطح گر جاتی ہے اور یہ نالہ چھوٹی چھوٹی گندی نالیوں کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔عوام کثافت بھرے ماحول میں پھنس جاتے ہیں۔ان کی بیماریوں کی ذمہ داری زیادہ تر اس گلے سڑے خمیر زدہ مواد پر ہوتی ہے جو بے شمار گھروں اور تنگ گلیوں،اور ان راستوں اور کونوں میں جمع ہو جاتا ہے جو شہر کے بیچوں بیچ گزرتے ہیں یہ سب وبا کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور ہیضے کے جراثیم مضبوطی سے پھیل جاتے ہیں۔''

اس شہر آفتاب میں سینٹری آفیسر کی چندیا چمکتی ہے۔جب دریا مسلمان بادشاہوں کی طرف سے نصب شدہ پتھروں اور ہندوؤں کی پتھروں کی مورتیوں کے درمیان سے رواں دواں ہوتا ہے اور جب اس مربوط شہر میں پل پانی کو لگ بھگ چھو لیتے ہیں تو گھروں کے مٹی کے چھت پھولوں اور سرسبز جڑی بوٹیوں سے ڈھکے رہتے ہیں۔اس طرح وہ دنیا کے سب سے خوبصورت مقام کا نظارہ پیش کرتے ہیں۔

ایک ہزار فٹ بلندی پر واقع تخت سلیمان کی پہاڑی اور ایک پہاڑی مینڈ پر اکبر کا تعمیر کروایا ہوا ہاری پربت کا قلعہ ایک اور دل افروز منظر ہے۔ان پہاڑیوں سے دور بڑے بڑے پہاڑ شہر کے

گردوپیش میں کھڑے ہیں جن میں سے ایک کا دامن دریا کے ریگ زار تک پہنچتا ہے۔ مکانوں کی تعمیر اور وقوع کے سلسلے میں ترتیب اور سلیقے کی غیر موجودگی اور ان کی جھکی ہوئی چھتیں اس دلکش منظر کو چار چاند لگاتی ہیں۔ یہ سب مناظر مل کر شہر سری نگر کو ایک خوبصورت شہر کی شکل دیتے ہیں اور اس طرح سے یہ شہر زندگی کی رنگینیوں اور قدیم کھنڈرات کا خوبصورت امتزاج پیش کرتا ہے۔ مکانات کے لیے خوشنما مناظر دریائے جہلم اور نالہ ماروں کے کناروں پر ان کی موجودگی سے ان کو میسر ہیں۔ نالہ مار شہر کے اندر سے گزرتی ہوئی سانپ نما نہر بہت اہمیت کی حامل ہے۔ یہ نہر شہر کو آنچار اور وادئ سندھ کے ساتھ ملاتی ہے۔ اس نہر پر پتھروں کے بنے ہوئے پل بے حد دیدہ زیب ہیں مگر اس نہر میں غلاظت کے سبب جگہ جگہ پیدا شدہ رکاوٹیں اور شدید بو نالہ مار کی خوبصورتی کو چھپا لیتی ہے۔

لوگ اپنی کھڑکیوں اور دریچوں سے جھانک جھانک کر ایک گونا گوں زندگی کا نظارہ کر سکتے ہیں۔ گھاٹوں پر غلے سے لدی ہوئی قطار بند کشتیاں دکھائی دیتی ہیں اور سبزیوں سے بھری ہوئی کشتیوں کو کشتی ران اپنی مضبوط بانہوں سے کھینچتے ہیں اس کے علاوہ حکومتی اہلکاروں، تاجروں اور مسافروں کی کشتیاں بھی نظر آتی ہیں۔ اب آخر میں اسلام آباد یا بارہمولہ تک کشتی کے ذریعے روزانہ سفر بھی شروع کیا گیا ہے۔ اگر ان کشتیوں میں کثیر تعداد میں سواریاں بیٹھ جائیں تو کشتی پانی میں کافی دھنس جاتی ہے اور ہر آدمی دوسرے کے پہلو میں بیٹھ جاتا ہے۔ یہ لوگ یا تو کسی آستانے کے زائرین ہوتے ہیں یا سیر سپاٹے کی غرض سے کشتی میں سفر کرتے ہیں۔ نہانے کے حوض لوگوں سے بھرے ہوتے ہیں جن میں لوگ آرام کے ساتھ نہاتے، باتیں، اشارے اور حرکتیں کرتے ہیں۔ موسم سرما کے دوران منظر بدل جاتا ہے۔ دریا کا پاٹ تنگ ہو جاتا ہے اور پانی کی سطح کم ہو جاتی ہے۔ دریچوں اور کھڑکیوں کو کاغذ سے ڈھک دیا جاتا ہے اور ضروری کام کاج کے سوا کوئی شخص دریا کی طرف نہیں جاتا ہے۔ دریا کے بہت اوپر بائیں کنارے اولین پل امیرا کدل پر شیر گڑھی ہے جہاں ہز ہائینس مہاراجہ کے محل اور سرکاری دفاتر واقع ہیں۔ یہ دلکش محل جو سنہرے مندر سے آگے واقع ہے مہاراجہ رنبیر سنگھ نے تعمیر کروایا تھا اور یہ ڈوگرہ دیس کی ایک یادگار ہے۔ اب ایک اور طرز کے نئے محلات تعمیر ہو رہے ہیں اور وہ دن دور نہیں جب شیر گڑھی بڑی بڑی

عمارتوں کا ایک گڑھ بن جائے گی۔ دریا کے پار سری نگر میں ایک عمدہ ترین گھاٹ بسنت باغ ہے جس کی پتھروں سے بنی ہوئی سیڑھیاں حسن آباد کی مسجد سے اٹھا کر لائی گئی ہیں۔ پرانے زمانے میں بسنت باغ سے محل تک ایک مضبوط رسی باندھی جاتی تھی اور اس موٹی رسی کے ذریعہ مہاراجہ گلاب سنگھ کے ہال تک عرضیاں سماعت کے لیے لائی جاتی تھیں۔ دریا کے کنارے پر چاندی کی طرح چمکتے ہوئے ہندو مندر پھیلے ہوئے ہیں۔ تیسرے پل فتح کدل کے نیچے دائیں کنارے پر شاہ ہمدانؒ کی خوبصورت مسجد ہے۔ اس کے نیچے دریا کے کنارے ایک غسل خانہ ہے جہاں پر مسلمان نماز ادا کرنے سے پہلے وضو کرتے ہیں۔ اس کے قریب ہی پتھر مسجد ہے جسے کٹر مسلمانوں نے اس لیے مسترد کر دیا تھا کیونکہ وہ اس کی بنیاد سے نفرت کرتے تھے۔ اب اس مسجد کو ریاست میں غلہ کے ایک گودام میں تبدیل کیا جا چکا ہے چوتھے پل زینہ کدل کے نیچے کشمیر کے عظیم شہنشاہ زین العابدین کا مقبرہ ہے۔ دائیں کنارے پر مہاراج گنج ہے جہاں شہر کے فن کے نمونے فروخت کے لیے موجود رہتے ہیں۔ چھٹے پل نوا کدل کے نیچے ایک مشہور کشمیری پنڈت رام جُو کا بنایا ہوا مندر ہے۔ سب سے آخر میں صفا کدل یعنی رخصت کا پل آتا ہے۔ یہ پل اگرچہ کم لاگت میں تعمیر ہوا ہے لیکن یہ بہت ہی خوبصورت اور پرکشش ہے اور اس کی تعمیر سلیقے سے کی گئی ہے۔ پل کے ستونوں کی بنیاد قائم کرنے کے لیے منتخب جگہوں پر پرانی کشتیوں میں پتھر ڈال کر ان کو ڈبو دیا گیا۔ پتھروں کے ڈھیر لگائے گئے اور مزید کشتیاں ڈبو دی گئیں۔ جب پانی کی سطح سے اوپر تعمیر مکمل ہوئی تو پل کے ڈھانچے تعمیر کیے گئے جن کے لیے کھردرے کھمبے زاویہ قائمہ پر نصب کیے گئے۔ جب یہ ڈھانچہ اس اونچائی تک پہنچ گیا کہ اس کے نیچے سے ہاؤس بوٹ گزر سکے تو ستونوں کے درمیان کا فاصلہ کم کرنے کے لیے بڑے بڑے درختوں کو گرڈروں کے بجائے استعمال کیا گیا۔ کھلے پتھروں کی بنیادوں کی حفاظت کے لیے دریا کے اوپر پاٹ پر تختے لگا کر پانی کا کٹاؤ قائم کیا گیا۔ ان پلوں کی مضبوطی کا سبب شائد ان کے ستون ہیں۔ سیلابوں کے دوران بھاری مقدار میں پانی آتا ہے اور یہ ستون اس کی مزاحمت کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ 1892 کے سیلاب میں سات میں سے چھ پل دریا میں بہہ گئے اور ان خستہ پلوں کے ٹوٹنے کی وجہ سے پانی کی روانی میں رکاوٹ پیدا ہو گئی کیونکہ دریا کا پاٹ تنگ تھا۔ مگر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ان پرانے پلوں نے

طغیانی کاڈٹ کر مقابلہ بھی کیا ہے۔

ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا کہ حبہ کدل اور زینہ کدل کے پل اور ان کے دائیں بائیں دکانوں کی قطاریں لندن کی یاد دلاتی تھیں مگر ان دکانوں کو بنا دیا گیا ہے اور اب کھنڈرات میں تبدیل ہوئی خستہ سیڑھیوں کے ذریعے آدمی پانی تک جا سکتا ہے۔ ان ہی سیڑھیوں کا استعمال کر کے لوگ دریا میں نہاتے ہیں، اپنے کپڑے دھوتے ہیں اور پینے کا پانی حاصل کر لیتے ہیں۔ مقامی بولی میں ان گھاٹوں کو یارہ بل یعنی دوستوں کی ملاقات کی جگہیں کہا جاتا ہے۔ گرمیوں میں انگور کی بیلوں اور دوسرے درختوں کے پتے ایک عجیب انداز سے ان پتھروں پر گرتے ہیں جو دریا کے کناروں پر قطار بند ہیں۔ جب لوگ پانی میں تیرتے تیرتے چپ چپ کرتے ہیں تو شہر کے راستوں پر ایک دلنشین نظارہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ شہر اس وقت اپنے فطری حسن کو کھو دیتا ہے جب برف پوش پہاڑوں سے پہاڑیاں نظر آتی ہیں اور ان سے بل کھا کھا کر گرتے ندی نالے ان میں پھنس جاتے ہیں۔ شہر کے مشرق اور جنوب میں اونچے سفیدوں سے بھر پور راستے ہیں۔ یہ درخت ایک پٹھان گورنر عطاء اللہ خان نے لگوائے تھے اور یہ راستے تخت سلیمان کے دامن تک جاتے ہیں۔ اب یہ درخت مرجھا رہے ہیں اور لوگ سفیدوں کی ان پژمردہ درختوں کی چھال کاٹ رہے ہیں۔ ایک لمبے اور سنئے راستے پر وزیر پنوں نے 1864 میں اس سڑک کے دونوں طرف سفیدے لگوائے تھے جو شوپیان میں سات میل تک چلی گئی ہے۔ ایک اور راستہ شیر گڑھی سے دودھ گنگا کے پل تک پھیلا ہوا ہے۔ اسی طرح تخت سلیمان اور دریا کے کنارے پر ایک اور راستہ منشی باغ تک موجود ہے۔ یہاں بہت عرصہ پہلے منشی ترلوک چند نے پھلوں کے باغ لگوائے تھے۔ اس حصے میں زیادہ تر یورپی لوگ قیام کرتے ہیں۔ منشی باغ کے مغرب میں ریذیڈنسی ہے۔ اس سے ذرا آگے ڈاک خانہ اور یورپی باشندوں کے لیے اشیا کی خریداری کی دکانیں موجود ہیں۔ دریا کے بائیں کناروں پر راجوں کے باغات ہیں۔ ان باغوں اور امیرا کدل کے درمیان لال منڈی اور سرکاری ہسپتال واقع ہیں۔ لال منڈی ایک خوبصورت عمارت ہے جہاں حکومتی ضیافتوں اور عوامی دلچسپی کی تقریبات کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ امیرا کدل کے پار سفیدے کے دو رویہ درختوں سے بنا ایک ذیلی راستہ دودھ گنگا تک چلا گیا ہے۔ شوپیان کی سڑک کے ساتھ ساتھ کشمیری فوج کی چھاؤنی

ہے۔ دودھ گنگا کے پار اور دریا کے درمیان وسیع پریڈ گراؤنڈ ہے۔ شہر سری نگر کی حدود کے اندر کئی باغات اور میدان پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایک جائزے کے دوران ہم نے اپنی پیمائش کے حساب سے دیکھا کہ باغات اور قابل کاشت رقبہ 1621 ایکڑ ہے۔ جس میں زیادہ تر رقبہ ممنوعہ اور باغاتی فصلوں پر مشتمل ہے۔

شہر سری نگر کے اس مختصر تذکرے میں مجھے تنگ دامانی کی وجہ سے وہ بہت کچھ حذف کرنا پڑا جو کسی تاریخ دان یا آثار قدیمہ کے ماہر کی دلچسپی کا باعث بن سکتا ہے۔ اگر چہ اس شہر کا ذکر اس طرح سے کیا گیا ہے کہ بے شار نہروں، مندروں اور مسجدوں کی ان دلچسپ تفصیلات کو غیر ضروری سمجھ کر چھوڑ دیا جو یہاں تذکرہ کے مستحق تھیں۔ میں اس کتاب کے دیگر ابواب میں عوام کے مختلف پیشوں اور ان کی تفصیلات کو زیر تذکرہ لاؤں گا۔ یہ بات ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ دیہاتیوں کی طرف سے شہر کو کشمیر کا نام دینے کے پس منظر میں گہرے معنی پوشیدہ ہیں۔ کیونکہ لوگوں نے نسل در نسل دیکھا ہے کہ کشمیری حکمرانوں کی توجہ زیادہ تر سری نگر کی طرف ہی رہی ہے اور دیہاتوں اور کاشتکاروں کے مفادات شہر کی بہبود کے تابع رکھا گیا ہے۔ یہ امر قدرتی طور پر باعث رشک بن سکتا ہے۔

مختصر میں یہی کہوں گا کہ سری نگر حقیقی طور پر کشمیر کے معنوں میں استعمال ہوتا رہتا ہے۔

●❀❀❀●

حوالہ جات

(1) کشمیر کے بارے میں بہترین تصویر کشی آئین اکبری میں کی گئی ہے۔ سوائے اس کے کہ یہاں کے مکین جھیلوں میں فیری لگانے کی غرض سے چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں اس کام سے لطف نہیں لیتے نہ ہی شکار کے لیے چیتوں کو تربیت دیتے ہیں، یہ تصویر کشی ہم عصر زمانے میں بھی بالکل برمحل لگتی ہے۔

(2) راج ترنگنی میں اپنے پیش نامہ میں کلہن پنڈت وادیٔ کشمیر کے بارے میں کہتا ہے کہ یہاں سورج کی دھوپ نرم ہے۔ یہ ایک ایسی جگہ ہے جسے کشیپ نے اپنی شان کے لیے تخلیق کیا ہو۔ مدارس کی اونچی اونچی عمارتیں، زعفران، یخ بستہ پانی اور انگور۔ جو جنت میں بھی نصیب نہیں ہو سکتے، یہاں عام طور پر ملتے ہیں۔ کیلاش تینوں کائناتوں میں بہترین مقام ہے۔ ہمالیہ کیلاش کا بہترین حصہ ہے اور کشمیر ہمالیہ میں ایک بہترین جگہ ہے۔

(3) پیر ایک ڈوگری تلمیح ہے جس کے معنی پہاڑی چوٹی ہے۔ پانڑال کشمیری لفظ ہے۔ پیر پنچال ان دو الفاظ کی بگڑی ہوئی شکل ہے اور اب تلمیحات کی نقل در نقل کی صورت میں موجود ہے۔

(4) ایک پہاڑی ندی جو گھن گرج کے ساتھ ڈھلوانوں سے نیچے اُترتی ہے۔ اسے کشمیری میں اہرہ کہا جاتا ہے اور جب یہ میدانی علاقے میں سست رفتار ہو جاتی ہے تو اسے چوپ کہا جاتا ہے۔

(5) اس جھیل کو مقدس تسلیم کیا گیا ہے۔ بہت سارے قدامت پرست اپنے جسد خاکی کو اس کے کنارے نذر آتش کرنا چاہتے ہیں۔ (آئین اکبری)

(6) مُرغ زار فارسی زبان کا لفظ ہے اور مرغ زار ایک پھولوں بھری وادی کو کہتے ہیں لیکن کشمیری زبان میں اس مقام کے معنے اُس جگہ کے لیے مخصوص ہے جو انسانی آبادی سے فاصلے پر واقع ہو مثلاً

گل مرگ، یوس مرگ، سونہ مرگ وغیرہ۔

(7) مصنف نے یہاں اس جگہ کے لیے اُلک کا لفظ استعمال کیا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ دراصل یہ کشمیری لفظ بہک ہے جہاں گوجر چرواہے اور بھیڑ بکری پالنے والے بکروال گرمیوں میں اپنے مویشیوں کو چرانے لے جاتے ہیں۔

(8) ویری ناگ سے بارہ مولہ کے نیچے کچھ بامہ کے مقام تک کل فاصلہ ایک سو دو میل ہے جہاں سے دریا وادی سے باہر چلا جاتا ہے۔ یہ فاصلہ ایک سو بائیس میل ہے۔

(9) ان ندیوں میں تنگلی، سوکھ ناگ اور سندھ کا پانی پینے کے لیے بہترین سمجھا جاتا ہے۔ پٹھان گورنر عطاءاللہ خان ہر روز پینے کے لیے تنگل سے سرینگر منگواتا تھا۔

(10) اس بارے میں کشمیر کی جھیلوں کے بارے میں یہ تفصیلات غالباً دلچسپی کا باعث بن سکتی ہیں۔ عام حالات میں جھیل ولر تقریباً بارہ میل لمبا اور پونے سات میل چوڑا ہوتا ہے۔ اس جھیل کا رقبہ 78 مربع میل سے زیادہ ہے۔ سیلابوں کے دوران جیسا کہ 1893 میں دیکھنے میں آیا کہ اس کی لمبائی ساڑھے تیرہ میل، چوڑائی پونے آٹھ میل اور رقبہ ایک سو تین میل تک پھیل جاتا ہے۔ مانسبل جھیل پونے چار میل لمبی اور ڈھائی میل سے زیادہ چوڑی ہے۔ اس کے تحت تقریباً دس مربع میل کا رقبہ آ جاتا ہے۔ جھیل ڈل لمبائی میں پونے چار میل اور چوڑائی میں ڈھائی میل سے زیادہ زمین کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس کا رقبہ تقریباً دس میل تک پھیلا ہوا ہے۔ اس رقبے میں سے زمین کے 1890 ایکٹر قائم زراعت اور بہتے ہوئے چھوٹے چھوٹے زرعی کھیتوں میں آ جاتے ہیں۔ اس طرح سے کل ملا کر جھیل کے سات میل سے زیادہ رقبہ سبزی اُگانے کے کام میں لایا جاتا ہے۔ آنچار جھیل طوالت میں ساڑھے تین میل سے زیادہ ہے اور اس کی چوڑائی سوا دو میل ہے۔ اس کے تحت ساڑھے سات مربع میل کا علاقہ آ جاتا ہے۔

(11) ڈاکٹر بوہلر کا بیان ہے کہ اس کا سنسکرت نام الَولا (یعنی جھیل) ہے جس میں سے بلندیوں کو چھونے والی لہریں اٹھتی ہوں۔

(12) آئین اکبری میں ہموار سطح پر نصب ان درختوں کا ذکر ملتا ہے۔ شاید بیدم پور بیہوت میں واقع ہے جس کے کناروں پر ہموار سطح کے درخت نصب ہیں۔ اس قصبے میں بیہوت اور سندھ کے دریا آ کر مل جاتے ہیں۔ 1664 میں برنیر نے کشمیر کا دورہ کیا مگر اُس وقت اس نے اس قسم کے ہموار سطح پر نصب درخت نہیں دیکھے۔

(13) جولوگ پانی کے سوا کچھ اور نہیں پیتے وہ فطری طور پر ستائش کار ہیں۔ وہ پانی کی مقدار کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ بھاری (یا کھاری) پانی چند مشکلات کے لیے فائدہ مند ثابت ہوتا ہے اور ہلکا صاف پانی صحت کے معاملات میں دوسری طرح کارآمد ہے۔

(14) ایک چشمے کا نام کوکرناگ ہے جس کے پانی سے پیاس اور بھوک دونوں مٹ جاتی ہیں۔ یہ پانی بدہضمی کے لیے ایک علاج ہے۔ (آئین اکبری) ۔آئین اکبری کے مصنف کا کہنا ہے کہ کوکرناگ ہی میں کسوٹی کا پتھر مل جاتا ہے۔

(15) اہل کشمیر موسموں کے لحاظ سے کافی ہوشیار ہیں اور وہ ہندوستان کے لوگوں کی طرح پیشین گوئیاں نہیں کرتے۔ وہ اس مقولے میں یقین رکھتے ہیں کہ:

رات کی سرخ روشنی چرواہے کی خوشی

صبح کی سرخی چرواہے کے لیے تنبیہ

یعنی او برس ہیوتن ناریعنی بادلوں میں شام کے وقت آگ لگ گئی جو خوشگوار موسم کا پیش خیمہ ہے اور بیمہ ذو۔ یعنی اگر سرخی مائل ہو تو بارش ہوتی ہے۔ سفید بادلوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ یقیناً بارش لائیں گے۔ کالے بادل بارش یا ہلکی پھوار کے بھی معنی نہیں رکھتے۔

(16) اب ریاست کی سرکار نے ٹیکے لگانے کا کام ہاتھ میں لیا ہے۔ اس سلسلے میں شاندار شروعات 1893 کے اختتام پر کی گئیں اور اگلے سال اس میں مزید بہتری حاصل کی گئی۔

●❀❀❀●

تیسرا باب

ارضیات

کشمیر کی وادی کے بارے میں جو ارضیاتی معلومات موجود ہیں انھیں رچرڈ لیڈیکر نے اپنی یادداشت میں قلمبند کیا ہے (1) اس کی یہ سرگذشت کشمیر اور آس پاس کے علاقوں میں اس کے گزارے ہوئے چھ موسموں اور اس کی اپنی معلومات پر مبنی ہے۔ لیڈیکر نے ان تمام دوسرے ارضیاتی ماہروں کے علم میں اضافہ کیا ہے۔ جنھوں نے وادیٔ کشمیر کا دورہ کیا ہے لیڈیکر نے جس وسیع رقبے کا احاطہ کر کے ارضیات سے متعلق تفصیلات بیان کی ہیں وہ 68,000 مربع میل پر پھیلا ہوا ہے جس کا کشمیر ایک بہت ہی چھوٹا سا حصہ ہے لیکن ارضیاتی نقطۂ نظر سے اسے کوئی اہمیت حاصل نہیں۔

حوالہ جات کی سہولیات کے ساتھ دستیابی کے پیش نظر میں اس باب میں لیڈیکر کی سرگذشت سے وہ اہم اقتباسات پیش کروں گا جن کا تعلق کشمیر کی وادی کے ساتھ ہے۔

جھیلیں

جھیلوں یا تالابوں نے وادیٔ کشمیر کو گھیر کے رکھا ہے اور عام طور پر ان ہی کو اصلی چٹانی طاس کہا جاتا ہے۔ مگر یہ کہنا ذرا مشکل ہے کہ کیا واقعی وادی کی جھیلیں چٹانی طاس ہیں۔ مانسبل کی جھیل کی گہرائی سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بارہ مولہ میں یہ دریائی چٹان سے بھی نیچے واقع

ہے مگر لیڈ یکر کے مطابق وادی کے اصلی داخلے کو سیلابی مواد نے تباہ کر دیا ہے تاکہ اس کی سطح معلوم نہ ہو سکے۔ چنانچہ مانسیل کے مطالعے میں چٹانی طاس کا فلسفہ ثابت نہیں ہو سکتا ہے۔ جہاں تک وادی کی دوسری جھیلوں کا تعلق ہے وہ سیلابی مادے سے اس قدر بھری ہوئی ہیں کہ ان کی بنیادی نوعیت کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیڈ یکر نے صرف وادی لیدر میں واقع بارون کے نزدیک مشہور غاروں کے بارے میں بھی لکھا ہے۔ ان میں سے ایک کا دہانہ زمین سے 40 فٹ اوپر ہے اور یہ صرف (210) فٹ کی لمبائی تک ہی جاتا ہے۔ مگر لگتا ہے کہ یہ اس سے بھی لمبا غار ہے۔ دوسرے غار کا دہانہ زمین سے سو فٹ اوپر ہے۔ ان غاروں کے فرش پر چونے کی موٹی تہیں چڑھی ہوئی ہیں۔ مسٹر لیڈ یکر نے ایسے حقائق بیان کیے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر میں ہمالیہ کے برفانی تودے ماضی میں اپنی موجودہ ہیئت کی نسبت موجود بڑے بڑے برفانی تودے کے لحاظ سے دوسرا مقام رکھتے ہیں۔ یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ جن سطحوں اور ضلعوں میں یہ برفانی تودے موجود تھے وہاں اب ان کا نام ونشان بھی نہیں ہے۔ ڈریو کا خیال تھا کہ بھورے رنگ کی ریت کا ابھار دراصل سیلابی کریوہ جات کی شکل میں برفانی تودوں کی دلدل ہے اور پروفیسر لیتھ ایڈمس نے بارہ مولہ کے چند کنکروں کو برفانی تودے قرار دیا۔ جن سے اشارہ ملتا ہے کہ وادی میں برفانی تودوں کا وجود پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر ہے مگر لیڈ یکر کو اس بات میں شک ہے اسی لیے وہ لکھتا ہے "مشکوک حالات کو چھوڑ کر ایسے بھی معاملات ہیں جہاں اس مثال کے صادر آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ڈریو نے لکھا ہے کہ پیر پنچال کے سلسلۂ کوہ میں بے شمار پہاڑی تالاب ملتے ہیں جو ماضی میں تودوں کے ظہور کی واضح علامات ہیں۔ ان میں چٹانی جھری، روغن شدہ اور چمک دار اور دراڑ والے پتھر شامل ہیں۔ اس سلسلۂ کوہ میں کشمیر کی طرف ان چٹانوں سے ٹکراتی ہوئی کئی متوازی وادیاں ہیں جنھیں مقامی زبان میں مرگ کہا جاتا ہے۔ ان کے ارد گرد ڈیٹرائیل مواد جمع ہے اور راقم کی بلا تامل رائے میں ان کا آغاز برفانی تودوں میں مضمر ہے۔ مرغزار گرما کے مقام گل مرگ میں صاف طور پر عیاں ہوتے ہیں جن کی ڈھلوان سات سو فٹ تک جاتی ہے۔ ڈریو کے مشاہدے کے مطابق کشمیر کے شمالی حصے وادئ سندھ میں کورن گاؤں کے نزدیک ایک چمکتا چٹانی پہاڑ ہے جس کی بلندی سطح سمندر سے 6,500 فٹ پر سری نگر سے 1600 فٹ ہے۔ مفقود برفانی

تودوں کے دوسرے نشانات اسی مقام پر وادی سندھ میں ذرا اوپر سونہ مرگ کے گرمائی مقام پر ملتے ہیں جس کی بلندی 9,000 فٹ ہے اور یہ لہریں کھاتی ہوئی وادیاں قدیم مرغزاروں سے 2,000 فٹ کی بلندی پر ہیں۔ سونمرگ کے مقام پر اب بھی برفانی تودے پائے جاتے ہیں۔"

مقدس امر ناتھ گپھا کے تودے ظاہر ہونے کے بارے میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اس گپھا اور اس کی ہیئت کو تودوں کے ظہور کا ماحصل قرار نہیں دیا جا سکتا۔

یہ گپھا تقریباً 16,000 فٹ کی بلندی پر واقع ہے جو ایک بے ترتیب سفید ڈولامائٹ چٹان کا نصف قطر والا خول ہے۔ اس چٹان کی پشت پر چند منجمد چشمے ہیں جن سے غار کی لپٹی دیوار کے ساتھ برف کا مقبرہ نما مجسمہ بن جاتا ہے۔ ہندو لوگ اسے مقدس سمجھ کر اس کا احترام کرتے ہیں اور یہ موسم کے لحاظ سے تبدیلی اختیار کر لیتا ہے۔

پلازکوزائیک اور پھر ایوسین زمانوں میں اس بات کی واضح شہادت موجود ہے کہ کشمیر کے ہمالیائی خطے میں آتش فشانی چٹانوں میں اب تک آتش فشانوں کے باقیات تلاش کیے گئے ہیں مگر ایوسین عہد کے بعد اب تک کچھ بھی عیاں نہیں ہوا۔ بہرکیف بھاپ کے متعدد چشموں کے نمودار ہونے کے سبب ضدی حرارتی عمل کے بار بار ظہور کا اشارہ ملتا ہے۔ ان میں سے چند چشمے ہیئت میں کافی بڑے ہیں(2)

یہاں پر میں یہ بات بھی کہنا چاہوں گا کہ وادی میں بہت سے گندھک کے چشمے ہیں اور کشمیریوں کا دعویٰ ہے کہ یہ اصلی ناگ ہیں جن میں تھپد چشمے کے اوصاف موجود ہیں یعنی جو موسم سرما کے دوران گرم اور گرمیوں میں سرد رہتے ہیں۔

مرحوم ڈاکٹر فالکو نے اس عمل کا مشاہدہ کیا ہے اور لیڈیکر نے بھی اس کا حوالہ دیا ہے۔ میرے خیال میں وہ وادی کے شمال مغرب میں سویام میں واقع ہے۔ اس آتش فشاں کے باقاعدہ امر کو ڈاکٹر فالکنر نے درج کیا۔ اس کا کہنا ہے کہ میں نے کشمیر میں نہایت آتش فشاں کرۂ ارض دیکھا ہے اور جہاں تک میرے مشاہدے کا تعلق ہے یہ سیلابی خطہ اس طرح ابھرا ہوا ہے اس کی مثال اور کہیں نہیں ملتی۔ بالائی سطح تک اس کی تیزی پختہ اینٹ کی مانند معلوم ہوتی ہے مگر یہاں سے لاوا خارج نہیں ہوتا اور یہ کرۂ ارض دائرہ نما 33 برس قبل (یہ قطعہ 1837 میں لکھا گیا اور اس کے

مطابق تاریخ 1804 بنتی ہے) زمین اس قدر گرم تھی کہ کشمیر کے ہندو چند انچ تک زمین کی کھدائی کر کے اس کے اندر مادے کی گرمی سے چاول گرم کر سکتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس زمین کے اندر کسی چمکیلے مادے کی موجودگی ہوگی مگر یہ بھی عجیب بات ہے کہ یہ اوپری سطح تک نہیں پہنچ پایا۔

سویام کا خطۂ ارض گاؤں نچہامہ مچھی پورہ میں واقع ہے۔ یہ زمین 1875 میں گرم ہوئی اور یہ گرمی تیرہ مہینوں تک اس قدر شدت کی حامل رہی کہ ہندو لوگ اس کرامت کو دیکھنے کے لیے آئے تھے اور جلتی ہوئی زمین پر کھانا پکاتے تھے۔ یہ مٹی جل کر اینٹ کی طرح سرخ ہوگئی جن پر پتوں کی چھاپ موجود ہے۔ 1876 سے تقریباً چھبیس برس پہلے زمین پھر گرم ہوگئی مگر یہ عمل صرف دو ماہ تک جاری رہا۔ عام لوگوں کا اعتقاد ہے کہ یہ واقعہ ایک قرن یعنی چند مخصوص مدتوں میں قدرتی طاقت کی غیر معمولی نمائش ہے اور انھیں پورا اعتماد ہے کہ سویام پھر ایک مرتبہ 1911 میں ابل پڑے گا۔ جیولاجکل سروے آف انڈیا کے ڈاکٹر ڈبلیو کنگ نے میری تحریروں کو پڑھنے کی مہربانی کی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر فالکنر کے مشاہدات کی روشنی میں وہ پھر سے رقم طراز ہیں۔

''اس بات کو فراموش نہیں کیا جانا چاہیے کہ یہ علاقہ خاص طور پر متاثرہ ہے۔ ٹیر بری کوئلے کی پرتوں میں آگ لگ جانے کی وجہ سے مذکورہ بالا مادے کا ظہور ہوا۔ مندرجہ صدر معاملہ اس کی واضح مثال ہے۔

1882 کے دوران اپنی تحریر میں لیڈیکر نے شاذ و نادر آنے والے زلزلوں کے معاملے کو نظر انداز کر دیا جو اس ماخذ کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہ ضدی طبعی عمل رفتہ رفتہ ختم ہو رہا ہے۔ اس کے دو سال بعد ایک بھیانک زلزلے نے وادی کو ہلا کر رکھ دیا جس میں دیہی مکان اور مویشی تباہ ہو گئے اور 3,000 افراد ہلاک ہوئے۔ 1875 کے بعد شاید ہی کوئی ایسا سال گزرا ہو جب کشمیر میں زلزلے کے شدید جھٹکے محسوس نہ کیے گئے ہوں۔ اس لیے یہ بھی ممکن ہے کہ یہ عمل ختم نہیں ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ اگر مقامی باشندوں پر اعتماد کیا جائے تو ان کا کہنا ہے کہ جن چشموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سارے چشمے وادی میں موجود ہیں۔ 1875 کے زلزلوں کے مایوسیزل اور اولین ایشوسیزمل خطوں نے سری نگر اور مشرقی بارہ مولہ میں خلیجی صورت اختیار کر لی اور یہ مغربی نقطہ کے مرکز کے طور پر نمودار ہوئی۔ یہ بات کہ بارہ مولہ میں یہ قوت شدید طور پر

بے قابو ہے اس خیال کی تصدیق کرتا ہے کہ وادی کا ظہور ایک بھونچال کی صورت میں ہوا جس سے بارہمولہ ندی سے جھیل کے پانی کا نکاس ممکن ہو سکا۔

1885 میں جو زلزلہ آیا اس سے کافی شور پیدا ہوا اور اتنے بڑے شگاف پیدا ہوئے جن میں سے ریت اور گندھک کا بو والا پانی باہر بہہ نکلا۔ آبپاشی کے کام آنے والے بہت سارے چشمے غائب ہو گئے اور بارہمولہ کے جنوب میں وسیع پیمانے پر زمین کھسکنے کا عمل پیدا ہوا۔ جھیل ولر سے 15,000 فٹ کی بلندی پر لاوی ڈورہ کا ڈھلوان پر زمین کھسکنے کا جو عمل پیدا ہوا وہ اپنے پیچھے سخت مٹی چھوڑ گیا۔ اس میں سے ملے ہوئے سنگھاڑوں کے بہت سے نمونے میرے پاس موجود ہیں۔ اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ شاید قدیم زمانے میں کشمیر کی جھیل کا بہت سارا پانی لاری پورہ کے مقام پر موجود تھا اور یہ کہ وادی کی آب و ہوا موجودہ زمانے کے مقابلے میں کسی حد تک معتدل تھی۔ یہ بات تحقیق طلب ہے کہ کیا لاری پورہ کی موجودہ بلندی پر سنگھاڑے اُگائے جا سکتے ہیں۔

ارضیاتی تشکیل

کشمیر کے ساتھ وابستہ بہت سے ارضیاتی حقائق میں اس سے زیادہ دلچسپ اور کوئی حقیقت نہیں ہو سکتی کہ کشمیر کسی وقت ایک وسیع جھیل کے پانی سے ڈھکا ہوا تھا۔

سیلابی نظام

کشمیر کے بارے میں بہت سے پہلے اس بات کا علم ہونا لازمی ہے کہ یہ واضح طور پر ایک طاس نما خطہ ہے جس کی لمبائی تقریباً 84 میل اور چوڑائی مختلف جگہوں پر 20 اور 25 میل کے درمیان ہے۔ کم سے کم بلندی 5,200 فٹ جبکہ سطح سمندر سے اوسط بلندی 6,000 فٹ ہے۔ پیر پنچال کے کوہستانی سلسلے میں پست ترین بانہال کا درہ ہے جو اس کی بیرونی سرحد بن جاتا ہے اور وادی کی سطح سے 3,000 فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ اپنی روانی کے دوران اسلام آباد سے نیچے دریا ایک میدان سے ہو کر بہتا ہے جسے ایک سیلابی سطح کہا جا سکتا ہے۔ اس میدان کی چوڑائی مختلف مقامات پر 2 سے 15 میل کے درمیان ہے پہلے 30 میل کے اندر دریا کی سطح کم ہو کر 165 فٹ رہ جاتی ہے مگر اگلے 24 میل کے اندر یہ کمی صرف 25 فٹ تک محدود ہو جاتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سیلابی خطہ دریا میں سیلاب کی وجہ سے پیدا ہوا اور اسے مقامی طور پر محسوس کیا

گیا۔ اگر چہ قدرتی ایجنسیوں کی کارروائیوں کو مصنوعی کناروں نے مسدود کر دیا۔

کلیدی طور پر یہ لوم اور خاک کا مرکب ہے۔ اس وقت وادی کی جھیلوں میں جو ذخیرے بنتے جاتے ہیں ان میں سے اگر چہ یہاں مذکور موخر الذکر تہوں سے پیدا ہوا۔ لیکن اس بات کو دکھانے کی کوئی شہادت موجود نہیں ہے کہ سیلاب مادے کے جمع ہونے سے کوئی تغیر پیدا ہوا ہو جو ان برتنوں اور فن کے نادر نمونوں میں پایا جاتا ہے جو نسبتاً جدید عہد کے ہیں۔

حال کے سیلاب سے نمودار وسیع میدانی علاقے کی سرحدوں پر یا اس میں ابھرے ہوئے جزیروں کی صورت میں ایک سیلابی یا تہہ دار مادے سے پیدا شدہ علاقے نے وادی کے بہت بڑے رقبے کو اپنے گھیرے میں لیا ہے۔ اسے مقامی طور پر کریواہ کہا جاتا ہے۔ یہ نام عام طور پر جمع شدہ مواد کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ان کریوؤں کی بلندی پر واقع ہونے کی وجہ سے یہاں آبپاشی عام طور ممکن نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ موسم گرما کے دوران کاشت کی فصل سے محروم ہی رہ سکتا ہے۔ وادی کے مرکزی حصوں میں کریوہ جات لوم یا لوئی مٹی سے بنتے ہیں۔ مگر ہموار سطحوں سے پیدا ہوئی تہوں کے بھی یہاں نشانات ملتے ہیں۔ یہ کریوہ جات منقسم اور عام طور پر پٹیوں کی صورت میں ہوتے ہیں یعنی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے درمیان 100 سے 200 فٹ تک گہرے ندی نالے بہتے ہیں۔ ان کے اردگرد زمین نسبتاً پست ہوتی ہے۔ عام طور پر یہ ندی نالے پہاڑوں سے منسلک ہوتے ہیں جنھوں نے وادی کو گھیر رکھا ہے۔ کریوہ جات اور انھیں تقسیم کرنے والی ندیاں وادی کے جنوب مغرب میں 8 سے 16 میل چوڑی ہیں اور شوپیان سے سوپور اور بارہ مولہ کے درمیاں علاقے تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ سوپور سے شمال مغرب کی طرف کا علاقہ بھی کریواز مین ہے۔ وادی کے شمال مشرق علاقے میں بھی کریوے موجود ہیں جو دریا کے دائیں کنارے پر واقع ہیں۔ چند حالات میں یہ کریوے پہاڑیوں کی ڈھلوانوں کے ساتھ مل جاتے ہیں اور دیگر صورتوں میں یہ پشتوں سے ابھر کر آتے ہیں۔ جو کریوا جات پہاڑوں کے ساتھ منسلک ہیں وہ کم ہوتی ڈھلوانوں کی طرح جھکے ہوتے ہیں۔ وادی کے جنوب مشرقی حصے میں کریوا جات 6,500 فٹ تک بلند ہیں یعنی دریا کی سیلابی سطح کے زیریں حصے سے یہ کریوا جات 1300 فٹ اوپر ہیں۔

سپاٹ سطح والے کریواجات کی تہہ ہمیشہ افقی ہوتی ہے جو اسلام آباد کے نواحی علاقے میں 300 تک موٹی ہو جاتی ہے۔ مسٹر ڈریوز نے کریواجات کے ایک حصے کا نمایاں پہلو مندرجہ ذیل سطور میں واضح کیا ہے۔

خورد مٹی یا بھوری ریت جس میں چھوٹے کنکر شامل ہیں	20فٹ
نفیس نرم بھوری ریت	3
سخت مگر نفیس دار ریت	15
نیلی ریتلی مٹی	5
نفیس نرم ریت	5
خورد ریت جس کی ہیئت بالائی ترین تہہ سے مشابہت رکھتی ہے	2

خورد ریت بسا اوقات سخت ہو کر پتھر کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور چند مقامات پر یہ بادامی رنگ کے ڈھیر کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ اس کے بارے میں مسٹر ڈریوز کا خیال ہے کہ یہ سیسہ دار چٹانوں یا برفانی تودوں کے گھلنے کے عمل سے بن جاتی ہے۔

پیر پنچال کوہستانی سلسلے کے اطراف میں ڈھلوانی کریواجات کا بہترین مطالعہ کیا گیا ہے جہاں یہ جنوب مغرب میں شلورا سے لے کر جنوب مشرق میں شوپیان تک ایک پیہم سلسلہ قائم کرتے ہیں۔ بارہمولہ کے نواحی علاقوں میں یہ زردی مائل مٹی، ریت اور کنکروں کے ساتھ مل کر شمال مشرق میں دس ڈگری کی ڈھلوان اختیار کر لیتے ہیں۔ ان مرکبات میں کنکروں کا نصف قطر بھی کبھی تین یا چار انچ سے زیادہ نہیں ہوتا۔ یہ پیر پنچال سلسلۂ کوہ پر چٹانوں کی قدیم تشکیل پر مبنی ہیں جس کی ڈھلوان مختلف جگہوں پر 5 سے 20 ڈگری تک ہے اور جو جنوب میں سخت نیلی مٹی اکثر زرد تلوں کے ساتھ مل گئی ہے۔ کرنل گارڈول آسٹن (3) نے ان تسطوں کی موٹائی 1400 فٹ سے اوپر قائم کی ہے اور یہ موٹائی زمین کے اقسام اور تازہ پانی کے خولوں سے پیدا ہوتی ہے جو ظاہری طور پر پودوں اور چھوٹی مچھلیوں کے باقیات کے ساتھ مل کر زندہ و جاوید صورت میں موجود رہتے ہیں۔ زمین کی پرانی سطحیں اور پرتوں سے ظاہر ہوتی ہے جن کی موٹائی 1 سے 3 انچ کے درمیان ہوتی ہے۔

ایک دوسری تحریر (4) میں یہی مصنف ان جھکے ہوئے تلاؤں کو ہیر پور سلسلے سے موسوم کرتا ہے جو پیر پنچال کے راستے پر شوپیان کے نزدیک ایک گاؤں ہے۔ بہر حال اس نام کو اس جگہ کے لیے قبول نہیں کیا جانا چاہیے۔ بارہ مولہ کے جنوب میں تقریباً شوپیان کے مساوی فاصلے پر ان ذخائر کے پست ترین تلے مذکورہ بالا نیلی سخت مٹی پر مشتمل ہیں مگر یہ مرکبات ہیر پور کے مقام پر دوبارہ عیاں ہو جاتے ہیں۔ ان تیلوں کا ایک حصہ وادی کے وسط میں گل مرگ کے گرمائی مقام سے دارالخلافہ سری نگر تک دیکھا جا سکتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جیسے جیسے پیر پنچال سے فاصلہ کم ہو جاتا ہے یہ تلے بھی بتدریج کم ہو جاتے ہیں اگر چہ یہ بات نا قابل فہم ہے۔ اس کے ساتھ ہی نیلی مٹی اور ریت کے سپاٹ سطح والے کریوے ظاہر ہو جاتے ہیں۔ اس سے یہ بات بہت کم عیاں ہوتی ہے کہ اس سلسلے کے تیلوں میں مشابہت کی علامات نہیں ہیں اگر چہ اکثر مقامات پر فرضی تلے پیدا ہوتے ہیں مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ان کا تعلق ایک پیہم مشکل کے ساتھ ہے۔ زیریں تلوں کو زیریں کریواجات اور بے خلل تلوں کو بالائی کریواجات کہا جاتا ہے۔

اسلام آباد کے قریب ہی بالائی کریواجات کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر ڈریوز کا پھر یہ مشاہدہ ہے کہ قصبہ کے پیچھے بالائی کریواجات کی طرف دیکھتے ہوئے بہت سارے تلے تمام ہیئتوں کے گول کنکروں اور چونے کے مرکبات یہ زاویہ دار ٹکڑوں کا مجموعہ ہے، یہ تلے چٹان کی طرح جھکے ہوئے ہیں اور افق کے ساتھ 7 سے 15 ڈگری کا زاویہ بناتے ہیں، چونے کے کنکروں کے ساتھ ریت ملا ہوا ہے۔ بہر حال ان تلوں اور بالائی کریواجات کے درمیان رشتہ ظاہر نہیں ہوتا ہے۔

وادی سندھ کے دہانے پر کشمیر کے جنوب مشرقی حصے میں ریت اور باجری کے بہت بڑے ذخیرے موجود ہیں جن کا ہلکا سا جھکاؤ وادی کشمیر کے مرکز کی طرف ہے۔ مگر بالائی کریوہ جات کے ساتھ ان کا کوئی تعلق ظاہر نہیں ہوتا۔

اسلام آباد اور سندھ کے مرکبات کی پیر پنچال کے ساتھ یکسانیت سے اس بات کا امکان نظر آتا ہے کہ ان کا تعلق کریوؤں کے نچلے گروپ کے ساتھ ہے۔

ان ذخائر کی تشکیل کے سلسلے پر غور کرنے سے پہلے دو باتوں کو ذہن میں رکھنا ہوگا۔ اول یہ کہ

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرکبات کی زیادہ تر نشو ونما نالیوں کے نظام کے موجودہ خطوط پر عمل میں آتی ہے۔ اسی لیے یہ پیر پنجال درے سے رواں دواں ندی پر ہیر پور کے مقام پر بھاری مقدار میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ بارہ مولہ میں اس مقام پر جہاں سے وادی سندھ کے دہانے پر دریا وادی سے باہر نکل جاتا ہے تو دریائے لیدر پر اسلام آباد کے مقام پر بھی ان کی قوت موجود ہے۔ دوم وادی کشمیر کی زیریں سرحد ہے۔ اس وقت دریائے جہلم وادی سے باہر قلعہ بارہ مولہ سے کچھ فاصلے پر نیچے سے ایک تنگ چٹانی ندی سے ہو کر نکلتا ہے جو اس دریا کے وادی سے نکاس کا حقیقی راستہ معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ اس ندی کے بائیں طرف جنوب مشرق میں پہلے سلیٹی پتھر کی ایک پہاڑی ہے اور اس کے بعد نیچے کریووں کے ذخیرے ایک طرف جھکے ہوئے ہیں جن پر سے راستہ گزرتا ہے جو ایک اور کھائی کو مسدود کر کے وادی کی موجودہ سرحد کو تشکیل دیتا ہے۔

ان ذخائر کی نچلی تہہ کا پتہ نہیں چل سکا ہے مگر یہ ممکن ہے کہ اگر انھیں ہٹا دیا جائے تو چٹانی تلا جہلم دریا کے موجودہ طاس سے نیچے ہوگا۔ بارہ مولہ مینڈ کے نیچے چند میل تک کچھ ذخائر کے نشانات موجود ہیں۔ اس کیفیت سے یہ بات فوری طور پر واضح ہو جائے گی کہ جب تک بارہ مولہ مینڈ کے زیریں کریوہ جات کی گہرائی معلوم نہ ہو جائے کہ کشمیر حقیقی طور پر ایک چٹانی طاس ہے یا ایک مسدود دریا کی وادی ہے مگر مصنف کی رائے میں موخر الذکر بات درست ہو سکتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ آیا اس امر کو زیر غور لایا جائے جن کے تحت یہ کریوہ جات تشکیل پا چکے ہیں۔ زیریں کریوہ جات سے جنھیں وادی کے اطراف کے ساتھ ساتھ پایا گیا ہے اور جو سلسلہ کوہ کے ساتھ جھالر کی صورت میں نمایاں ہیں اور شاید وادی سے باہر جاتے ہیں، بیرونی پہاڑیوں کے بلند تر شوالک سلسلے تک یہ عین ممکن ہے کہ یہ دونوں سلسلے یکساں مواد کے ذخائر ہیں۔ شوالک کے معاملے میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ یہ تلے لیکسٹرائن بنیاد کے نہیں ہیں بلکہ دریائی عمل یعنی طوفانوں اور بارشوں سے قائم ہوئے ہیں۔ انھیں آسانی کے ساتھ کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔

بالائی کریوہ جات کے بارے میں اس بات کا تصور مشکل ہو جاتا ہے کہ مکمل طور پر افقی جیسے ریت اور مٹی کے یہ ذخائر کس طرح جمع ہو سکے جو ایک وسیع تر اور کھلی وادی میں دور دور تک پھیلے

ہوئے تھے خاص طور پر جبکہ اس وقت کوئی کوئی باندھ نہیں بنایا گیا تھا جس سے وادی کے نیچے جانے والا پانی بھرا جا سکتا ہو۔ چنانچہ کریوہ جات کی تشکیل کی بس یہی وضاحت ہے کہ ماضی میں کشمیر ایک جھیل کے پانی میں رہا اور موجودہ جھیلیں اس کی باقیات ہیں۔ مسٹر ڈریو کا اندازہ ہے کہ یہ جھیل ایک وقت وادی کی موجودہ سطح سے 200 فٹ اونچی رہی ہوگی۔

بہرحال یہ تخمینہ بہت زیادہ ہے کیونکہ اس میں پیر پنچال کے وہ ڈھلوانی کریوہ جات شامل ہیں جن کی بنیاد کافی طور پر لیکسٹرائن نہیں ہے اور اگر ایسا ہو بھی تو وہ جمع ہونے کے وقت افقی تھے اور موجودہ سطح سے کافی نیچے واقع تھے۔

اس سوال کا جواب ابھی تک نہیں مل سکا ہے کہ اس جھیل کو کس قسم کی پیش بندی نے نیست و نابود کر دیا۔ جب تک کہ اس بات کا حتمی فیصلہ نہ ہو سکے کہ آیا بارہ مولہ کے زیریں کریوہ جات واقعی لیکسٹرائن ہیں۔ اگر یہ اول الذکر ہیں تو قدیم جھیل کو بارہ مولہ مینڈ سے دور بھی جاری رہنا تھا۔ مگر جیسا کہ امکانی صورت میں نظر آتا ہے وہ موخر الذکر ہیں اور یہ مینڈ جھیل کی سرحد کے طور پر نمودار ہوئی ہوگی۔ موخر الذکر کو سچ ماننے کی صورت میں ایسا ہو سکتا ہے۔ اس کا تعلق پیر پنچال سلسلہ کوہ کی ساری لمبائی کے ساتھ ایک ایسا علاقہ عام طور پر ابھرا ہو۔ اس کے سبب ہی وادیٔ کشمیر کی تشکیل ہوئی ہے۔ اس سے قبل ایک کھلے دریا کی وادی ہو جو بارہ مولہ کے نواح میں شیاری سرے پر مسدود ہو کر بلند سطح اختیار کر چکی ہو اور اس طرح جو طاس پیدا ہوا ہو اس میں ذخائر کی بدولت اوپر کے کریوہ جات وجود میں آئے اور ان کے جنوبی سرے ظاہری طور پر نچلے کریوہ جات کے جھکے ہوئے تلوں پر آرام کے ساتھ ٹکے ہوئے ہوں۔ بعد میں یہ طاس بارہ مولہ کے موجودہ چٹانی نالے پر دریا کے کٹاؤ کے سبب پیدا ہوا ہو۔ اگر یہ وضاحت صحیح ہو تو بالائی کریوہ جات کے نچلے تلوں پر جھکاؤ کے نشانات کو تلاش کیا جانا چاہیے۔

اگر یہ بات ہے کہ زیریں کریوہ جات لیکسٹرائن بنیاد کے ہیں تو اس بات کو فرض کرنا ضروری ہوگا کہ یہ رکاوٹ بارہ مولہ سے نیچے موجود تھی اور اس واقعہ کے ظہور کے ساتھ شاید نوشہرہ سے کچھ فاصلے پر نیچے رام پور کا کھڈ ہوگا۔ بہرحال یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ اول الذکر بات صحیح ہو۔ اس بات پر بحث کرنا بے محل ہوگا کہ رام پور کے مقام پر اس پیش بندی کی کیا صورت ہوگی جس کا کہیں سرے

سے ہی وجود نہیں تھا۔

بہرحال اس سوال پر مزید روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے اور یہ کام اس مشاہد کو کرنا ہوگا جو ذخائر کے مطالعے میں ماہر ہو۔ اس پیش بندی کے بارے میں نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں اور اس کے متعلقہ وقت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جس نے اس جھیل کو نیست و نابود کر دیا۔

جہاں تک کریوہ جات کی عمر کا تعلق ہے ان کی ارضیاتی عمر کا ان کے جھکے ہوئے زیریں تلوں کو اور جھکا کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ اس سے بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ دریائے جہلم کے سیلابی مادے اور اس کے کٹاؤ کا کس طرح واقعہ رونما ہوا ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا گیا ہے کہ نچلے کریوہ جات اور بیرونی پہاڑیوں کے شوالک میں یکسانیت ہے جو ایک ہی طرف جھکے ہوئے ہیں اور شمال مغرب ان کی سمت ہے۔ بیرونی پہاڑیوں میں گرد و غبار کا سلسلہ بالائی شوالک تک نہیں گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خلل بیرونی پہاڑیوں کے بالائی شوالک اور کشمیر کے زیریں کریوہ جات میں واقعہ نہیں ہوا ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ پیر پنجال کی بلندی کریوہ جات کے جھکاؤ کی وجہ سے ممکن ہوئی اور یہ عمل نچلے کریوہ کے عہد کے آخری حصے میں واقع ہوا۔ اس طرح سے بالائی کریوہ جات جھکے ہوئے تلوں کی اندرونی سرحدوں کے مطابق ہی جمع ہوئے۔ لیکسٹرائن اور کے معاملے میں عموماً دشواریوں اور پیچیدگیوں کے آثار برفانی تودوں کے عہد میں پائے گئے جیسا کہ ممکن دکھائی دیتا ہے۔ اگر برفانی تودوں کے قبل کے عہد کے دوران یہ سمجھنا محال ہے اگر وادیٔ کشمیر کبھی برف سے ڈھکی ہوئی تھی بہرکیف یہ مشکل اس صورت میں حل ہو سکتی ہے کہ جب اس بات پر غور کیا جائے کہ جب وادیٔ کشمیر کی سطح پر برفانی تودے نمودار ہوئے اور ان میں برف موجود نہیں تھی۔ یہی امر اس مسئلے کا راستہ ہے اس میں شک نہیں کہ اس راستے میں یہ نتیجہ بھی کارآمد ثابت ہوگا کہ برفانی تودوں کے عہد میں یہ علاقہ اس قدر سخت نہیں تھا جیسا کہ کبھی کبھی فرض کیا جاتا ہے وادیٔ کشمیر کی تشکیل اور اس کے ذخیروں کا خلاصہ مسٹر آر ڈی اولڈہام نے مینول آف جیالوجی آف انڈیا 1893 کی دوسری اشاعت میں کیا ہے۔

''ان تلوں (کریوہ جات) کی بہترین تفصیل کرنل گورڈون آسٹن اور مسٹر ڈریو نے مہیا کی ہے۔ ان دونوں نے اس کی بنیاد لیکسٹرائن بیان کی ہے اور یہی رائے مسٹر لیڈیکر نے اختیار کی ہے

مگراس بات کو پوری طرح سے ماننا مشکل ہے۔اس بات کا بھی امکان موجود ہے کہ جن اچھے تلوں والے اور دانے دار ذخیروں کی تفصیل کرنل گورڈون آسٹن نے دی ہے وہ ساکن پانی میں جمع ہوئے ہوں مگر کنکروں اور ریت کے تلوں میں بسا اوقات تغیر اور ایک سے 3 انچ تک کثافت کی پرتوں سے تشکیل کے نیم ہوائی حالات کا اشارہ ملتا ہے۔ یہاں تک کہ حقیقی لیکسٹرائن ذخیروں کی موجودگی ثابت نہیں کرتی کہ کشمیر کے تمام تر طاس پر کبھی جھیل کا پانی تھا۔اس چٹانی طاس کی بتدریج تشکیل زمین کی پرت مسخ ہونے کی وجہ سے عمل میں آنے کا امکان ہے۔اس طرح سے جو خول پیدا ہوا اس کی بھرائی ہوگئی۔

ہوسکتا ہے کہ یہ اس وقت نہ ہوا ہو جب اس کی تشکیل ہوئی ہوگی۔موجودہ دور میں حقیقی لیکسٹرائن ذخیرے وادی کے ان شمالی سرحدوں پر تشکیل پارہے ہیں جہاں ذخیرے نہ ہونے کی وجہ سے خول رہ گئے ہیں اور ان میں پانی بھر گیا ہے۔ یہ بات بھی عین ممکن ہے کہ جو حالات آج واقع ہو رہے ہیں وہی عمل وادئ کشمیر کے تمام تر ارضیاتی تاریخ کے دوران واقع ہوا ہے یعنی حقیقی لیکسٹرائن ذخائر پر مشتمل چھوٹے سے علاقے کے نیم ہوائی ذخیروں کا چھوٹا علاقہ شامل ہوا ہو اور سیڈمنٹ تیار ہو رہا ہو۔

یہ بھی ممکن ہے کہ کریوہ جات کے قدیم تلے بالائی شوالک کے ہم عصر ہوں مگر اب تک جو مدفون (Fossil) پائے گئے ان کا تعین نہیں ہوسکا ہے۔مچھلیوں کے اجسامی باقیات اور آبی خول بھی کا تعلق جاندار مخلوقات کے ساتھ ہے۔"

زانکار نظام

وادی کی ارضیات میں زانکار نظام ایک اہم جزو ہیں۔ جہاں تک زانکار کی اصطلاح اور یورپی ناموں کے ساتھ ان کے باہمی رشتے کا تعلق ہے اس بارے میں مسٹر لیڈیکر قارئین کو واقف کرتا ہے کہ یہ باہمی رشتہ نہایت اہم معنی میں لیا جاتا ہے۔

اس کا یہی مطلب ہے کہ عضویاتی ہیئتوں کے عام رشتوں کا نظام یکساں رہا ہے مگر ہمالیائی تشکیل بھی اپنے یورپی ہم نام کے ساتھ یکساں رہی ہے جیسا کہ ذیل میں دکھایا جائے گا۔وادئ کشمیر میں مدفون خصوصیات کی پرتوں اور یورپ کے چونے کے پہاڑوں میں کسی رکاوٹ کا پتہ نہیں چلا

ہےاور بالائی اورزیریں پرتیں بالترتیب Silirian اور Trais کے حوالے سے دی گئی ہے۔
یہ بات عیاں ہے کہ یہ ان یورپی ہیئتوں سے میل نہیں کھاتی جن کے ساتھ انھیں موسوم کیا گیا ہے۔ مگر مجموعی طور پر یورپ کے Silirian۔ڈیونین اَپر اور Lower Carboniferous-Perinian اور Trais کے معالے Homotaxial کے معنوں میں لیے جا سکتے ہیں۔مزید برآں کشمیر کے Carboniferous کی موٹائی چندفٹ ہے جن میں ایک عرصے کے آخری حصے کے اوصاف موجود ہیں۔وادی کی تشکیل اس بادی یورپی نظام کے متوازی حیثیت نہیں رکھتی اور نہ ہی یورپ کو Carboniferous تاریخ کے برابر کوئی شے پیش کر سکی ہے۔
گولڈن آسٹن اور درچیرے کی طرف سے چیدہ نشانوں والے موجود مدفون کوزیون کے تکوں سے موسوم کیا گیا ہے۔ یہ تمام Carboniferous صورت کے ہیں اور ان پر مزید بحث ذیل میں کی جائے گی۔ان سے اشارہ ملتا ہے کہ جن تلوں کے نیچے 40فٹ سے لے کر اوپر کی طرف 300فٹ موٹائی والے بے جان پتھر ہیں ان کو لازمی طور پر Carboniferous قرار دیا جانا چاہیے۔ بعد میں یہ ثابت کیا جائے گا کہ ان کا تعلق ڈاکٹر شالز کے کولنگ سلسلے کے ساتھ ہے۔ کھنموہ کے دریا میں چونے کی چند قسموں پر(1) کا نشان لگایا گیا ہے۔موجودہ مصنف نے بہت سارے میگالوڈن نمونوں کو کرنل گوڑون آسٹن کے اسی عظیم سلسلے سے حاصل کیا جس کا حوالہ "GONIATITES" میں دیا گیا ہے جبکہ مندرجہ ذیل دیگر متعدد مدفون ڈاکٹر ورچیرے نے حاصل کیے۔اس ضلع میں کولنگ اور سُپر کولنگ سلسلوں کی حد بندی مشکل کام ہے کیونکہ دونوں ایک دوسرے کے اندر بے ہنگم طریقے سے گزرے ہیں۔ وادی سندھ میں چونے کے تلے پر ایک خاص Triassic مدفون پایا گیا ہے جو مندرجہ بالا حصے کے متوازی نمبر ایک کے ڈولومائٹ سے وابستہ ہے۔ یہ مناسب سمجھا گیا ہے کہ کولنگ کو فقط ایک زمرے کے طور پر پیش کیا جائے اور ان ہی تلوں کو سپر کولنگ سلسلے میں شامل کیا جائے جن میں Carboniferous مدفون ہیں۔
جیسا کہ مشاہدہ کیا گیا ہے کہ ضلع وہوہ میں AMYGDALOIDAL اور دیگر Trap وسیع پیمانے پر پائے جاتے ہیں جو خود بخود اس وقت Fossiliferous تلوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں جب کم مضبوطی سے حاصل کیا ہوا تلے کا Quartiziet بالترتیب ہو کر اوپر کی طرف آ جاتا ہے۔اس

لیے یہ ممکن ہے کہ Shales کے ساتھ وابستہ کمین گاہیں Trap واقعی Carboniferous عہد
کے ہوں۔ وجوہ کی Carboniferous چٹانوں کو وادی آرا کے شمال میں تلاش کیا جاتا ہے۔ یہ
وادی سری نگر کے شمال مشرق میں ہے یہاں سے شمال مشرق میں گھوم کر مہادیو کے سروس اسٹیشن
تک جاتی ہے۔ بہر حال وادی آرا میں عام طور پر مدفون نہیں پائیں گے اور کولنگ سلسلے کی بالائی
سرحدیں ایک اندازے سے ہی متعین کی گئی ہیں۔ کولنگ سلسلے کے تلے، سپر کولنگ چٹانیں اور بعد
ازاں قدیم تر ستال رویک چٹانیں اپنے اوصاف میں زیادہ پرت دار ہیں۔ زانکار علاقے کے ان
علاقوں کی شمالی سرحد ترال وادی کے بالائی حصے میں مغرب کی طرف اور اس کے آگے دور دوہ تک
جاتی ہے جو اونتی پورہ کے اوپر مغربی چوٹی کے مغرب کی طرف واقع ہے۔ اس سرحد کے ساتھ ساتھ
نمایاں اوصاف والی کاربنافریس مدفون ہیں جو خاص طور پر پرون گام کی بلند مینڈ اور منڈ کپال کے
جنوب مشرق میں فراوانی سے پائی جاتی ہیں۔ اس طرح کی کولنگ چٹانیں عام طور پر سیاہ اور
بھورے رنگ کے Carboniferous Shales Cherts اور نیلے رنگ کے چونے کے
پتھر پر مشتمل ہیں اور یہ مختلف تناسب میں پائی جاتی ہیں۔ ان Shales پر جب تازہ رنگ چڑھایا
جاتا ہے تو اس سے ایک شدید بو آتی ہے۔ منڈ کپال کے نزدیک ہی Cherty کے تلے عموماً سکا
والی نیلی یا سفید چٹانوں تک چلے جاتے ہیں جن کی مشابہت عموماً فنٹ یا Checlee,
Dony سے ہوتی ہے۔ اس سرحد کے ساتھ ساتھ جنوب سے شمال کی جانب نیچے کے چٹانوں کے
اوصاف خاطر خواہ طور پر بدل جاتے ہیں۔ جو وسترون چوٹی پر پوری طرح چھائے ہوئے ہیں۔
ان پر سپر کولنگ تلوں کی پرت چڑھی ہوئی ہے۔ جو اسی چوٹی کے شمال مغربی حصوں میں تلاش کی
جاسکتی ہیں۔ اس چوٹی کے جنوب اور اونتی پورہ کے شمالی کولنگ سلسلے کی ایک چھوٹی سی پرت ہے جو
اس پشتے پر قائم ہے جہاں چٹانوں کے تلے کمین گاہوں میں مخصوص قسم کے مدفون ہیں۔ پرت وار
کولنگ چٹانوں اور ان کے تلے کمین گاہوں کے درمیان تعلق بہت گہرا ہے اور مدفون عام طور پہ
کمین گاہوں کے آمنے سامنے پائے جاتے ہیں۔ کھلی چٹانوں کو توڑنے سے یہ دیکھا گیا کہ
Fossilferous پرت انھیں اس طرح تقسیم کرتی ہے کہ یہ نیچے کی کمین گاہوں اور دوسرے
بالائی Shales کے ساتھ قائم رہے۔ عام طور پر مدفون ایسے تلوں میں پائے جاتے ہیں جن کا

Sedimentory شدہ تبدیل یا جزوی حالانکہ دیتا دکھائی نہیں ہوتا الگ سے گاہوں سیٹن
Detratal چٹانوں یا راکھ کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ زانکار اور پیر پنجال نظام کے درمیان اس لہر سے تعلق کا تجزیہ بعد میں کیا جائے گا۔

وہوہ کے ہونے کے چشمہ یا وادی کے دیگر مقامات کی چٹانیں دلکش نظاروں پر مشتمل ہیں اور خاص طور پر ان کا وہ ہلکا نیلا رنگ جو قدیم سلیٹ اور Traps کی بھوری لہروں کے برعکس ہوتا ہے۔ چونے کے پتھر کے تلے، عام طور پر پتھریں ہوتے ہیں اور مختلف پرتوں کو تقسیم کرنے والے باریک Shales ہوتے ہیں جن سے ان کی شکل خاص قسم کی پیٹیوں کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ وہوہ کے مقام پر مختلف لہروں اور تہوں کے سبب ان کا نظارہ اور بھی زیادہ خوبصورت ہوتا ہے۔ وادیٔ کشمیر کے جنوب مشرقی حصے میں پائے جانے والی کھڑی چٹانوں کی بنیادوں سے بے شمار چشمے پھوٹتے ہیں جو جہلم کا منبع بن جاتے ہیں۔ ان میں سب سے بڑے چشمے باون، اسلام آباد، اچھہ بل اور ویری ناگ میں ہیں۔ ان چشموں کا پانی صاف وشفاف ہوتا ہے جو بھاری مقدار میں باہر آتا ہے اور جس کا درجۂ حرارت عام پانی سے تھوڑا زیادہ ہوتا ہے۔

زنکار چٹانوں کی اصلی نشو ونما وادی لیدر میں دیکھی گئی ہیں جہاں پر ایسی چٹانیں پہلگام میں پائی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ پہلگام اور اسلام آباد کے راستے پر بھی یہ چٹانیں ملتی ہیں۔ موخر الذکر چٹانوں کی بیرونی پرتوں کی شروعات بیضوی شکل میں عیش مقام کے گاؤں سے ہوتی ہے جو وہوہ چٹانوں کے ساتھ ٹکراتی ہیں اور دریا کے سب سے موٹے حصے سے پیدا ہو کر رفتہ رفتہ ختم ہو جاتی ہے۔ اس تفصیل کو مزید وضاحت کے ساتھ بیان کرنے کے لیے پہلگام سے وادیٔ لیدر کے ایک حصے کا ذکر کریں گے۔ پہلگام کے مقام پر چونے کے پتھر اور سپر کولنگ سلسلے کی ڈولا مائٹ کی باریک پرتیں موجود ہیں۔ ان کے نیچے کولنگ پتھر Shales اور چونے کے پتھر کی باریک سی پٹی ہے جن میں مدفون کی موجودگی حقیقت کے مطابق ہے۔ یہ چٹانیں بتدریج پنجال نظام کی بھاری جسامت تک پہنچ جاتی ہیں جن میں اونچے تلوں پر پرت داری کی علامات ملتی ہیں مگر نیچے کی طرف ان کی جسامت بھاری ہے۔

وادی کے لگ بھگ آٹھ میل نیچے بٹہ کوٹ گاؤں کے پاس کولنگ چٹانوں کی تہہ

میں Trappen چٹانوں کے مدفون ہیں۔جن میں فلپس بیا ساخت کے نرلوبایٹ غالباً یورپ کے Carboniferous
P-Semnifere سے مطابقت رکھتے ہیں جنھیں مصنف نے 1880 میں حاصل کیا۔اس کے بدلے یہ کولنگ چٹانوں کے نیچے پنجال پہاڑی کے سلسلے کی سیاہ سلیٹ اور ہلکی رنگ کے Quirtzite موجود ہیں۔اس کے بعد کولنگ چٹانوں کی پٹی ہے جس کے بعد پنجال سلیٹ اور Quirtzite ہے۔عیش مقام تک پہنچتے پہنچتے۔ان کولنگ چٹانوں کے نیچے دوبارہ کولنگ چٹانوں کی پٹی آجاتی ہے اس کے بعد چونے کے پتھر،ڈولائٹ اور سبز اور بنفشی رنگ کی پتھریلی سلیٹیں موجود ہیں۔ان میں سے چند ظاہری طور پر سپر کولنگ سلسلے کے نمائندہ ہیں۔ان کے نیچے پھر کولنگ سلسلے کی چٹانیں اور ان کے مخصوص مدفون موجود ہیں۔عیش مقام کے نیچے پنجال کی سلیٹی چٹانوں کا ایک اور نیا سلسلہ ہے جو جنوب میں اسلام آباد کے زانکار نظام پر اوندھی پڑی ہیں۔بعد کے باب میں لیدر حصے کے مزید نتائج اخذ کیے جائیں گے مگر یہاں پر اتنا کہنا کافی ہوگا کہ اس حصے میں ایک سلسلے کے وسیع حصے کا اوندھا پن ظاہر ہوتا ہے جس کی پرتیں نہایت پیچیدہ ہیں۔اس بات کی نشاندگی ملحقہ حصے میں کی گئی ہے۔

اس کے جنوبی اور جنوب مغربی سرحد پر زانکار کی چٹانیں کولنگ سلسلے پر مشتمل ہیں جن کو یہ سلسلہ ڈھک لیتا ہے اور ان کی انڈے کی طرح جسامت پیدا ہوتی ہے۔دریائے لیدر کے دونوں شاخوں پر پھیلے ہوئے اس سلسلے کی کل لمبائی آٹھ میل ہے۔ممکن ہے کہ کولنگ چٹانیں اس انڈانما علاقے کے ساتھ ساتھ موجود ہوں۔شیش ناگ کے راستے پر دریا کے مشرقی حصے سے لے کر یہ پرت شمال کے ساتھ ٹکراتی ہے اور مغرب میں ڈوب جاتی ہے۔زانکار نظام کی چٹانوں کے نیچے پنجال نظام چٹانوں کے ٹرپس موجود ہیں اس خطے پر کولنگ سلسلے کا نام ونشان علاقوں کی چٹانی ٹریکس نے مٹادیا ہے جو کسی دیگر معاملے میں بھی دکھایا جائے گا۔

کشمیر کی وادی کے جنوب مشرقی محور پر قابض زانکار چٹانوں کی آدھی بیضوی ہیئت کی بات کرتے ہوئے پہلے ہی کہا گیا ہے کہ یہ چٹانیں اسلام آباد میں موجود تھیں جہاں پر قصبے کے عقب میں یہ ایک الگ تھلگ چٹان کی صورت میں موجود ہے جو شمال مشرق کی طرف جھکی ہوئی ہے اور یہ چونے کے پتھر اور ڈولامائٹ کی پتھریلی خولدار دیوار کی مانند ہے۔کریوں کے ذخیروں کی ایک پٹی

ان چٹانوں نے شمالی حصے کو چھپا لیتی ہے جہاں سے آگے باون گاؤں میں یہ دوبارہ نمودار ہو جاتی ہے جہاں پر یہ زیریں وادی لیدر کی چٹانوں پر اوندھی پڑی ہے۔ اوندھی تنہ بگ سرحد کے ساتھ ساتھ ادھر اُدھر مدفون معمول کے کولنگ پتھر Shales میں تلاش کیے جا سکتے ہیں۔

ڈولا مائٹ اور چونے کے پتھر پر مشتمل Shale کولنگ کی سلسلے کی زانکاری چٹانیں پائی جاتی ہیں جو پنچال چٹانوں تک جنوب مغربی ڈھلوانوں تک چلی گئی ہیں۔ موخر الذکر کے معاملے میں اس ڈھلوان کا چند برس قبل اندراج کیا گیا تھا جو شمال مشرق کی مخالف سمت تک چلی گئی ہے۔

زانکار نظام کی بیضوی چٹانوں کا مرکز کلیدی طور پر سپرا کولنگ سلسلے سے متعلق ہے۔ ہلکے رنگ کے ڈولا مائٹ اور چونے کے پتھروں کی باریک پرتوں کا پایا جانا ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ درۂ ماربل سے ساگام تک خط ایک منعوئی محور کی صورت میں موجود ہے جس میں سلسلہ کولنگ کے آبی اور پتھریلی مصنوعات Cherts Products اور Shales اور سپر فر کی اقسام غالب ہو جاتی ہے۔ بہر حال تاوں کے اپنے Petralogical کردار کے ساگام میں مدفون کی عدم موجودگی کے سبب کولنگ سلسلے کی صحیح سرحدوں کا پتہ چلانا مشکل ہوتا ہے۔ اس سے یہ بات ممکن ہو سکتی ہے کہ سلسلہ پنچال کی چٹانیں سامنے آ سکیں۔

وادی کے شمال مغرب کی طرف جاتے ہوئے سپر کولنگ چونے کا پتھر پیر پنچال سلسلۂ کوہ کے دونوں طرف '' چھوٹی بیرونی فصلوں کی صورت میں بیروہ کے مقام پر پایا جاتا ہے۔ چونے کے ان پتھروں کی ڈھلوان نچلی اور شمال مشرق کی جانب ہے۔

شاہ آباد کے بعد بیضوی چٹانوں سے ٹکراتی ہیں۔ ممکن ہے کہ ان چٹانوں کا زبیر کریوہ کے ساتھ کوئی تعلق ہو۔

وادی کی مخالف سمت میں جھیل ولر کے آس پاس زانکار چٹانوں کے تین چھوٹے قطعات موجود ہیں۔ ان میں پہلا قطعہ مانسبل کے گاؤں کے پاس ملتا نظر آتا ہے۔ چنانچہ ان سے اس چھوٹی سی جھیل کا کنارہ بن جاتا ہے اور نواح کے دونوں پہاڑوں کی طرف اونچی اونچی بلندیاں قائم ہو جاتی ہیں۔

وادیٔ سندھ کے دہانے کے قریب یہ چٹانیں زردی مائل نیلے رنگ کی چونے کے پتھر کی پٹی

قائم کیے ہوئے ہیں جس سے Amygdloidal نریپ کی سیاہ مائل چٹانوں نے ڈھانپ کر رکھا ہے۔ یہ چٹانیں کچھ فاصلے تک صفاپور Trignamometerial اسٹیشن تک وسعت اختیار کیے ہوئے ہیں۔ اس جھیل کے جنوب میں مزید Amygdloidal نریپ گندم نما صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ پیلا کوز انیکس چٹانوں کے نیچے موجود ہے جس کی کان کنی سیمنٹ بنانے کے لیے کی جاتی ہے۔

ان چٹانوں میں Crinodis اور ماضی کے دھندلکوں میں کھوئے ہوئے باقیات کی فراوانی ہے مگر جو مدفون یہاں محفوظ طریقے سے حاصل کیا گیا ہے وہ خاص طور ناقابل یقین Orthocias کا خول ہے۔ یہ خول مسٹر ڈبلیو تھیو بالڈ نے حاصل کیا ہے۔

مانسبل کی چٹانیں زیادہ Controted ہے اور یہ چٹانیں اپنے ہلکے رنگوں کی دھاری دار شبیہ کی وجہ سے نمایاں نظر آتی ہیں۔ یہ چٹانیں وادی کے دوسرے حصوں کی سپر کولنگ چٹانوں کی مانند ہی ہیں مگر جن Traps پر وہ ٹکی ہوئی ہیں ان میں اب تک سپرا کولنگ سلسلے کے نیچے Cabonica Cous Shales اور کوئی آبی نشانات موجود ہیں۔ اس انحراف کی ممکنہ وضاحت یہ ہے کہ یہاں اور دیگر مقامات پر ان ٹریپس پر چونے کے پتھر کی بالائی پرت پر مداخلت کے نشانات موجود نہیں ہیں۔ ان چٹانوں کی لازمی طور پر جو ہم عصر حقیقت موجود ہے وہ کولنگ سلسلے کے ذخیرہ ہونے کے وقت باہر نکل آئی ہوگی اور اس میں اس قسم کی تبدیلی پیدا ہوئی ہوگی کہ اس کی شناخت نہ ہو سکے۔ یہاں پر بالائی چٹانوں اور دوسرے علاقوں میں جو حالات پائے جاتے ہیں ان کے مطابق لازمی طور پر ان کا تعلق زانکار نظام کے ساتھ ہونا چاہیے۔

مگر یہ بات پہلے بھی کہی جا چکی ہے کہ اس سارے تذکرے کو پنجال نظام کے ساتھ شیرازہ بند کرنا زیادہ آسان ہوگا۔ زانکار چٹانوں کا ایک اور چھوٹا سا قطعہ مانسبل کے شمال میں حاجن گاؤں کے نزدیک پایا جاتا ہے اور دوسرے قطعات اس کے گردونواح میں ملتے ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے قطعات ہمیں اس بڑی جسامت تک لے جاتے ہیں جو جھیل ولر کے شمال مغربی سرے پر بانڈی پور گاؤں میں واقع ہے۔ اس مقام پر زانکار کی چٹانیں ایک بے ترتیب مثلث کی صورت والے علاقے پر مشتمل ہیں جو بانڈی پور نالے کے بائیں کنارے پر واقع ہیں اور باقاعدگی کے ساتھ

شمال کی جانب ڈھلوان اختیار کرتا ہوا پرانی چٹانوں تک چلا جاتا ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر ماتسبل پر چٹانوں کا اوندھا پن اس بات کا شاہد ہے کہ یہاں پر زانکار اور پنچال کے نظام خلل پذیر ہوئے ہیں۔ زیریں تلے ریتیلے آبی Chret اور چونے کے پتھر پر مشتمل ہوتے ہیں جن پر بعض مقامات پر پتھریلی Shaly دھاریں ہوتی ہیں۔ جبکہ اونچے تلوں پر ہلکے رنگ کے ڈولا مائٹ چونے کی پتھروں کی پرتیں اکثر ملتی ہیں۔ جن میں بہت سے Crinoids اور Corals موجود ہوتے ہیں۔ ان چٹانوں کا زیادہ تر حصہ سپر کولنگ سلسلے سے تعلق رکھتا ہے مگر یہ بات تب تک یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی کہ آیا کولنگ سلسلہ واقعی اس کی بنیاد میں بھی موجود ہے۔ اس بات کا قطعی تعین ہونا چاہیے کہ آیا یہ تلے معمول کی حالت میں ہیں یا اوندھے پن کا شکار ہیں۔

وادی کشمیر کے انتہائی شمال مغرب سرے پر ترہگام کے گاؤں میں زانکار نظام سے وابستہ چٹانیں ملتی ہیں۔ یہ چٹانیں عام طور پر چونے، پتھر اور ڈولا مائٹ پر مشتمل ہیں۔ اول الذکر کا رنگ عموماً گہرا نیلا ہوتا ہے اور موٹائی عام طور پر دو فٹ ہوتی ہے۔ ظاہری طور پر یہ پنچال چٹانوں کے Synclind پر ٹکی ہوئی معلوم ہوتی ہیں اور وادیٔ کشن گنگا کی مینڈ سے دور نہیں جاتیں۔ ان چٹانوں کا زیادہ تر حصہ سپر کولنگ سلسلہ سے وابستہ ہے مگر شمال اور مشرقی تلوں میں چونے کے خاکی رنگ کے پتھر کی آمیزش ہے جس سے لازماً انھیں سپر کولنگ سلسلے کی نمائندہ تصویر کہا جا سکتا ہے حالانکہ ان سے اب تک مدفون برآمد نہیں ہوئے ہیں۔ ان کھلے مقامات کی مغربی سرحد پر بنیادی تلے عام طور پر سیلابی مادے اور ملبے سے ڈھکے ہوئے ہیں۔

وادیٔ کشمیر میں زانکار چٹانوں کی موجودگی کا نقشہ یہ باور کراتا ہے کہ اس وادی کی تشکیل جدید تر پیلازویک اور میسوزویک چٹانوں کے Synclinal کے خط پر ہوئی ہے اور حقیقی نقشے کو Fauttering یا دوسرے محرکات کی وجہ سے جزوی طور پر تباہ کیا گیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جو علاقہ اس وقت سیلابی اور کریوں کے ذخیروں سے ڈھکا ہوا ہے اس کے نیچے زانکار نظام کی چٹانیں موجود ہیں۔

پیر پنچال کا نظام

پنچال نام ایک مقامی اصطلاح ہے۔ زانکار کی طرح اس اصطلاح کا استعمال کولنگ لور

کارنیفرس ظاہر کرنے کے لیے کیا گیا ہے اور یہ پیناماڑس سے بالاتر ہے۔ اس کی چٹانیں بنیادی طور پر سیاہ سلیٹ، ریتیلے پتھروں، Quarzeite، مرکبات اور آتش فشاں چٹانوں پر مشتمل ہیں۔

سری نگر اور مانسبل کے نواح میں نیچے کی تہہ میں موجود پیر پنچال کی Amygdaloidal چٹانیں بھاری اہمیت کی حامل ہیں اور چند صورتوں میں یہ کونگ سلسلے کی مخصوص نوعیت کی چٹانوں کو پوری طرح مٹا کر رکھ دیتی ہیں۔ سری نگر کے نزدیک الگ تھلگ پہاڑی چٹانیں ہیں جس پر ہاری پربت کا قلعہ اور جس کے عقب میں تخت سلیمان کی پہاڑی ہے۔ موخر الذکر کے شمال مشرقی حصے میں نشاط باغ سے جھیل ڈل کا راستہ پھسلن بھری اچھی سیٹوں پر مشتمل ہے جن کے اندر آمی گڈلائیڈل چٹانوں کے اندرونی تہہ موجود ہیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر حصہ اور خلاء جس کے درمیان سے یہ راستہ گزرتا ہے جھیل ڈل کے شمالی مینڈ وادی آرا کی بیرونی سرحد قائم ہوتی ہے اس کی بنیاد میں نشاط باغ میں چند لیکریس ریتیلے پتھر موجود ہیں۔ ہوسکتا ہے کونگ سلسلے کی نمائندگی کرتا ہو۔ مذکورہ بالا مینڈ کے آمی گڈلائیڈل چٹان پیہم وادی سندھ کے دہانے مانسبل اور جھیل ولر تک جاری رہتے ہیں۔

اس نواح میں یہ آمی گڈلائیڈل اور ملحقہ چٹانیں سبزی مائل یا سیاہ مائل رنگ کی ہیں۔ بعض اوقات ان میں Armygdule پائے جاتے ہیں جن کی لمبائی دو یا تین انچ تک ہوتی ہے۔ یہ تشکیل کسی قسم کی پرت داری Stradification کے واضح نشانات سے عاری ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ پیر پنچال کے بہت سارے علاقوں میں اونتی پورہ کے آس پاس یہ چٹانیں نیچے کی طرف واقع آرگیلس اور آرناکس چٹانوں کی طرف چلی جاتی ہیں۔

وادیٔ کشمیر کی چٹانوں میں جو خصوصیات پائی جاتی ہیں ان میں ٹھوس سیاہ ٹریپ سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے جس میں بعض جگہوں پر سفید اجتماع کے چھوٹے چھوٹے کرسٹل شعاؤں کی صورت میں پائے جاتے ہیں جنھیں ڈاکٹر ورچارے نے Sulaimanite کا نام دیا ہے اور تخت سلیمان کے علاقے میں پائے جاتے ہیں۔

متذکرہ بالا مشاہدات سے یہ بات یقینی طور پر سمجھ میں آتی ہے کہ کشمیر کی آرے گائیڈل چٹانیں آتش فشانی بنیاد کی ہیں اور غالباً وہ چٹانیں ٹریپ Rock اور دوسری چٹانوں کے ساتھ مل گئی

ہیں جن سے ان کے ذخیروں کی بنیاد پیدا ہوتی ہے اور بعد میں صورت کی تبدیلی کے عمل میں یہ Sedimentary چٹانوں میں جذب ہوگئی ہے اور اب ان میں فرق کرنا ناممکن ہے۔ ان کی عرضیات کی عمر اور اصل بنیاد وغیرہ سے متعلق تفصیلات گذشتہ باب میں دی جا چکی ہیں کہ یہ چٹانیں مداخلت نہیں کر سکتیں کیونکہ یہاں پر آتش فشانی کی اصطلاح ایک بے ضرر عمل کے طور پر استعمال کی گئی ہے اور اس کا حقیقی آتش فشان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

وادیٔ کشمیر کی زینہ دار چٹانیں Traps اور کولنگ سلسلے کے درمیانی انتہائی قریبی رابطہ ہونے کی وجہ سے نیم آبی بنیاد پر قائم ہیں اور اس میں شک نہیں کہ اس طرح کی چٹانیں سمندر کی سطح کے نیچے جمع ہوئی ہوں گی۔ جہاں تک نیم آبی لاوے کا تعلق ہے پروفیسر گا نیکی کا تجزیہ ہے کہ یہ لاوا زمین پر فقط کم نمایاں صورت میں نمودار ہوا اور اس میں ماسوائے لاوا اور مشینی طور پر نمودار عام پرت کا خاک اور ریت کے ساتھ امتزاج کا رجحان موجود رہا ہے۔ اس کے بیرونی پہلو اور اندرونی ڈھانچے کے درمیان کوئی خاص فرق معلوم نہیں ہوتا۔ نیم ہوائی اور نیم آبی لاوہ جات کے مابین فرق بھی ابھی قائم کیا جاتا ہے۔ شکوک سے بالاتر چند لاوہ جات بھاری Scoriaceous اور ہلکے Scoriae سمندر کی گہرائی کے دباؤ میں جمع نہ ہو۔ غیر لاوے پر مبنی مواد کشمیری چٹانوں Traps اور نیم آبی اور آتش فشان چٹانوں کے ساتھ میل کھاتے ہیں۔

اس عمل کے دوران جزوی طور پر تبدیل شدہ یہ آتش فشان چٹانیں زیادہ تبدیل شدہ اگمذلائڈل اور ان Tufaceous آتش فشاں چٹانوں کے ساتھ پوری مطابقت رکھتی ہیں جو کاربن انیفرس چٹانوں کے نیچے ڈیون شاعر کے Devenoion میں موجود ہیں۔ ان کی شکل وصورت اس قدر بدل گئی کہ انھوں نے آرم گڈلائیڈل میں Schistose ڈھانچہ پیدا کر دیا جو کشمیر کی چٹانوں میں نہیں ملتا ہے۔ ڈیورشاعر کی چٹانوں کی جو جزوی طور پر لاوے والے اور آتش فشاں مادے کے ٹکڑے اور جزوی طور پر Tufaceous پرتیں ہیں جو اس طرح سے مل جل گئی ہیں جس طرح کشمیر کی Palaeozoic آتش فشاں چٹانیں ہیں۔

ان چٹانوں کے مطالعہ سے حاصل نتائج کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ عین ممکن ہے کہ عہد پنجال میں جو لاوا کاربن انیفرس کے بعد آیا ہے بہت بھاری مقدار میں لاوا پیدا ہوا ہو اور راکھ نکلی ہو۔ یہ بھی

ممکن ہے کہ ان آتش فشانوں سے یہ اخراج چند مخصوص سوراخوں سے وقت کے مخصوص وقفوں کے بعد ہوا ہو۔ اس عرصے میں یہ اخراج جاری رہا ہوگا اور سمندر کی تہہ میں معمولی پرت دار Deterital مواد جمع ہو گیا ہو۔ ہوسکتا ہے کہ یہ مادہ آتش فشان چیزوں کے ساتھ اچھی طرح مل گیا ہو اور اب اس ذخیرے کے بنیادی محرکات کو الگ کرنا مشکل ہوسکتا ہے جبکہ بعد کے تغیراتی عمل نے بنیادی شکل کا نام ونشان تک مٹانے میں کردار ادا کیا ہو۔ وادیٔ کشمیر میں مانسبل کے چند مقامات پر کولنگ یالور کاربن انیفرس عہدوں کے درمیان آتش فشان مادہ پیدا کرنا جاری رہا ہو اور اس میں نمایاں طور پر Sedimantry چٹانوں کو مکمل طور پر ناقابل شناخت بنا کر رکھ دیا ہو۔

تغیراتی نظام

نظام پنجال سے متعلقہ باب میں لیڈیکر نے چھوٹی Gneiss کی اچھی خاصی موٹی تہہ کو جمع ہوتے دیکھا ہے جس کا تعلق بھوری ریت اور چونے کے پتھروں کے تلوں کے ساتھ رہا ہو جن میں سے چند قلم داری صورت میں ہوں گے یا کچھ اور نیلے ہوں گے اور ان میں مشکل سے کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہوگی۔ اس قسم کی چٹانیں وادیٔ سندھ میں کنگن کے مقام پر پائی جاتی ہیں اور وانگت کی وادی کے دونوں طرف موجود ہیں۔ مسٹر لیڈیکر لکھتا ہے "کنگن Gneiss کے عہد کا تعین آسانی سے نہیں کیا جاسکتا۔ اگر ان چٹانوں کے Traps کی روشنی میں وضاحت کی جائے تو یہ ظاہر ہوگا کہ نظام پنجال میں یہ نہایت بلندی پر موجود ہیں مگر گردونواح میں اس قسم کی چٹانیں ایسی حالت میں نہیں ملیں گی۔ ہو سکتا ہے چٹانوں کا مقام خلل انداز نہیں ہوا ہو اور پنجال کی یہ Gneiss جسامت خود پنجال ہی ہو"۔

یہ بات بھی ممکن ہے کہ صرف تغیرات اور قلمی Crystalline نظام کی ایما پر ہی وادیٔ کشمیر کی چٹانیں لیڈیکر کے اسی گوشوارے کے متوازی ہیں۔

اگر یہ اسی قسم کی ثابت ہوں تو یہ بات ممکن ہے کہ Granitoid Gneiss اور پنجال چٹانوں میں یا تو زبردست خلل واقع ہوا ہو یا اوپر کے تلے نچلے تلوں کے اوپر چڑھ گئے ہوں۔ کیونکہ پنجال چٹانیں اور ملحقہ Gneiss اس نظام کے بلند آتش فشان حصے سے وابستہ ہیں۔

اقتصادی ارضیات

اگر چہ منظم طور پر اس سلسلے میں کوئی تلاش نہیں ہوئی ہے مگر مسٹر لیڈ یکر کا خیال ہے کہ کشمیر ہمالیہ کی قیمتی دھاتوں کی ایک پیداوار کا اہم مرکز بن سکتا ہے۔ 1882 میں پاڈر علاقے میں قیمتی نیلم کی تلاش سے یہ امید پیدا ہو سکتی ہے کہ ہز ہائنس مہاراجہ جموں و کشمیر کے ماتحت علاقوں میں اور بھی زیادہ قیمتی دھاتیں اب بھی مل سکتی ہے۔ مگر میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ جموں و کشمیر جیسی ریاست میں اس علاقے کے لوگ ان قیمتی خزینوں کا پتہ بتا سکیں یا وہ خود باصلاحیت کا ممکن ثابت ہوں۔ لوگ زراعت اور کاشتکاری میں مشغول رہتے ہیں اور ان کا تجربہ انھیں یہ بات سکھاتا ہے کہ کانوں کی تلاش کا انجام بیکار ہی ہوتا ہے اور انھیں بھاری تعداد میں افسروں اور سرکاری اہلکاروں کی خدمت کا بار اٹھانا پڑتا ہے۔ نیلم کی کانوں پر اپنے نوٹ میں مسٹر لانیچ، مسٹر لیڈ یکر کے ساتھ متفق ہے۔ لانیچ لکھتا ہے:

''اب تک کشمیر کے برے بڑے معدنیاتی ذخیروں کے بارے میں بہت کچھ کہا جا چکا ہے اور کسی نتیجے پر پہنچتے ہوئے اس موضوع پر چند الفاظ کہے جا سکتے ہیں۔ معدنیاتی دولت کی مناسب تلاش کرتے ہوئے یہ بات زیر نظر رکھی جا سکتی ہے کہ اس سرزمین کے باشندوں کو سالہا سال سے یہ موقعہ حاصل رہا ہے کہ ان پہاڑوں میں جو بھی معدنیات موجود ہیں وہ ان کی خود تلاش کریں۔ اصولی طور پر انھوں نے ثابت کیا ہے کہ وہ ان موقعوں سے فائدہ اٹھانے کے اہل ہیں۔ میرے خیال میں یہ بات غلط نہیں ہے۔ چند صورتوں میں مختلف علاقوں میں مقامی باشندوں کو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ یہاں پر کسی زمانے میں معدنی خاک کارآمد رہی ہوگی۔ اس طرح سے یہ غیر شائستہ پہاڑی قبیلے اپنے پہاڑوں میں پوشیدہ معدنی ذخیروں سے بے خبر ہی رہے ہیں۔ آسٹریلیا کے سیاہ فاموں اور جنوبی افریقہ کے Bushmen کے حالات کسی طرح مختلف نہیں جن کے یورپی مالکوں نے ان کی صلاحیتوں کو کام میں لانے کے لیے موقعہ فراہم کیا۔

اس معاملے میں واحد مثال آسام کے کھاسی قبیلوں کی ہے جنھوں نے موجودہ صدی شروع ہونے تک مغربی تہذیب کے اثرات کو بہ مشکل محسوس کیا تھا اور وہ اپنے استعمال کے لیے فولاد کی معدنی خاک، میگنائٹ کے چھوٹے چھوٹے دانوں سے حاصل کرتے تھے۔ بہت سارے تربیت

یافتہ یورپی ماہرین ارضیات اس قسم کی فولادی معدنی خائی گرینائٹ سے حاصل کرنے کے خلاف تھے کیونکہ ان کے خیال میں یہ چٹان اس مقصد کے لیے بالکل بے سود ہے۔ اس کے باوجود کھاسی لوگوں نے اس دھات کو تلاش کیا اور کوڑے کرکٹ کے پرانے ڈھیروں میں سے پیداواری لوہا حاصل کر کے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی کہ انھوں نے اپنی تلاش کا صحیح استعمال کیا ہے۔ اس عمل میں انھوں نے جو کچھ حاصل کیا وہ طباع اور سائنٹفک ہے۔ درحقیقت آبی کانکنی کا عمل جدید طریقوں سے مطابقت رکھتا ہے جن کی رو سے کیلفورنیا میں سونا حاصل کیا گیا تھا۔ کیا اس بات میں شک ہے کہ ان پہاڑوں میں اور بھی زیادہ فائدہ مند دھاتیں موجود ہیں اور کم اہمیت والی دھاتیں بھی ہیں مگر اس معاملے میں پہلے ہی کام ہو چکا ہے یہاں تک کہ کوئلہ اور فولاد جیسی دھاتیں بھی زیادہ مقدار میں نہیں ملی ہیں اور جہاں یہ دھاتیں دستیاب ہیں ان کی ساخت نہایت گھٹیا ہے جیسا کہ نیلم کے معاملے میں دیکھا گیا ہے۔ اب کوئی حادثہ ہی چند نایاب دھاتوں کو باہر نکال سکتا ہے اور ممکن ہے کہ باصلاحیت تلاش کرنے والوں کو بھی ان پہاڑوں میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے کئی سال گزارنے پڑیں۔

مجھے بے حد عاجزی کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے اور ایسا کہنے کی میرے پاس خاص وجوہات ہیں کہ کشمیر میں جب بھی کوئی قیمتی دھات ملتی تھی تو یہاں کے باشندے یہ سمجھتے تھے کہ ان کے لیے کوئی ناگہانی آفت آ گئی ہے۔ میں نے لوہے کی کانکنی کے معاملے پر دیہاتوں سے تبادلۂ خیال کیا ہے جو موصوف کے نزدیک رہتے ہیں اور اس بارے میں ان کے خیالات وادی کے عام لوگوں کی طرح ہی ہیں۔ یہ کہنا کوئی مبالغہ نہیں ہوگا کہ کشمیر کے لوگ کانکنی کے کام سے نفرت کرتے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ جہاں لوہا پایا جاتا ہے وہاں وادی کے چند افراد کے نظریے کو میں نے سنا ہے وہ اس بارے میں میرے ساتھ بات کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اور اپنے علاقے اور پیداوار کے بارے میں کھل کر بات کرتے ہیں مگر معدنیات کے بارے میں بات کرنے میں وہ جھجک محسوس کرتے ہیں۔

کوئلہ

مسٹر لیڈیکر کا مشاہدہ ہے کہ وادیٔ کشمیر میں زانکار کی چند چٹانیں کہیں کہیں کوئلے کی حامل

ہیں مگر اس کے بیان کے مطابق اس علاقے میں اس بات کا ذرا بھی امکان موجود نہیں کہ کوئلہ کشمیر کے علاقوں میں مل سکے گا۔ میں نے کشمیر کے آہنگروں کو مدفون ریزے (Pate) استعمال کرتے ہوئے دیکھا ہے اور ان کا کہنا کہ اس سے زیادہ گرمی پیدا ہوتی ہے۔

ریزے

سری نگر سے نیچے دریائے جہلم کے کناروں کے دونوں طرف کی نچلی سطح پر واقع زمین سے ریزے نکالے جاتے ہیں جن کا استعمال برتن ساز (کمہار) کرتے تھے۔ اگر ان ریزوں کو خشک موسم میں جمع کر کے ان کا انبار لگا دیا جائے تو یہ بہترین ایندھن کے طور پر کار آمد ثابت ہوتے ہیں۔ میں نے موسم سرما میں کشمیر میں دو بار اس کا استعمال کیا ہے اور لکڑیوں کے ساتھ ملانے کے بعد یہ بہترین ایندھن ثابت ہوا ہے۔ یہ ریزے آبی پودوں کی باقیات سے پیدا ہوتے ہیں اور اس وقت یہ بھاری مقدار میں دستیاب ہیں۔ کشمیر میں اسے ڈیمبہ ژکھ کہا جاتا ہے۔

گندھک

وادی کشمیر میں دوین، اسلام آباد، سدرہ کوٹ اور دیگر مقامات پر گندھک کے چند نمونے مسٹر لیڈیکر کو دکھائے گئے مگر اب یہ وادی میں تیار نہیں ہوتا اور گندھک کی فراہمی لداخ میں پوگا سے ہوتی ہے۔

سونا

کشمیر کی وادی کے دور دراز علاقوں میں جو لوگ رہتے ہیں وہ اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ دسترون کے پہاڑوں میں سونا پایا گیا ہے۔ عام عقیدے کی طرح یہ بھی ایک قصہ ہے کہ ہرموکھ پہاڑی کی پرت میں زمرد کی کان ہے۔

تانبا

کہا جاتا ہے کہ تانبا اس پہاڑ سے نکالا جاتا ہے جہاں وادی لیدر میں عیش مقام واقع ہے۔ قدیم تاریخ میں درج ہے کہ عظیم بادشاہ زین العابدین اپنے ذاتی اخراجات کی ادائیگی تانبے کی ان کانوں سے حاصل ہونے والی دولت سے کرتا تھا جو اس نے خود تلاش کی تھیں۔

لوہا

وادیٔ کشمیر میں مختلف مقامات پر لوہے کی تلاش کا کام کیا گیا ہے اور سوف میں اس پر بہت زیادہ کام ہوا ہے۔ 1892 میں ایک انگریز نے سوف کے خزینوں کی تلاش میں کچھ وقت صرف کیا۔ اس کا یہ نظریہ تھا کہ معدنی خاک کی فراہمی نا قابل اختتام ہے اور صنوبر کے درختوں سے سر انجام دیا جا سکتا ہے۔ لوہے کے بارے میں اس کی یہ رائے تھی کہ لوہا فولاد کی طرح نرم ہے۔ اپنے ابتدائی عمل کے نتیجے میں اس نے یہ رائے بھی قائم کی کہ کشمیر میں لوہے کی صنعت کا مستقبل روشن ہے۔ کشمیریوں کی رائے میں سوف سے حاصل ہونے والا لوہا ہندوستان سے درآمد کیے جانے والے لوہے سے زیادہ بہتر ہے جس سے آلات کشاورزی تیار کیے جا سکتے ہیں آہنگر بھی اس کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ فی الحال سوف کی دیگر کانوں سے اور گذشتہ برسوں کے تجربے سے اشارہ ملتا ہے کہ حکومت لوہے کی ان کانوں کا کام اچھی طرح سرانجام نہیں دے سکتی۔ درآمد کیے جانے والے لوہے کی نقل و حمل پر آنے والی بھاری لاگت کی وجہ سے غالباً کشمیر میں کانکنی کا کام اچھی طرح سے سرانجام دیا جا سکتا ہے بشرطیکہ اس کا انتظام مناسب ہاتھوں میں دیا جائے۔ ایندھن پر آنے والی لاگت کسی بھی طرح اس صنعت کے لیے رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ 1881 میں اپنی ایک تحریر میں مسٹر لا ٹچ سوف کی کانوں کے بارے میں لکھتا ہے:

''میں نے وادیٔ کشمیر میں سوف میں آہنگری کے کام کا بھی دورہ کیا جہاں معدنی خاک کیلیکریس چونے کے پتھر سے حاصل کی جاتی ہے جو اچھہ بل کے مشرق میں چونے کے پتھر کی چٹانوں کے ساتھ Interacted ہیں۔ اس کا تلا صرف دو یا تین فٹ موٹا ہوتا ہے اور یہ پہاڑی کے اندر 30 ڈگری کے زاویے میں دھنسا ہوا ہے اور پہاڑی کے ساتھ دو میل تک وسعت اختیار کر چکا ہے۔ یہاں کی معدنی دولت ان بھٹیوں کے لیے سالہا سال تک کافی ہوگی جو یہاں کے باشندوں کو فراہم کی جائے گی جب تک یہاں لوہے کی مانگ موجود رہے۔ یہاں انگریزی طرز کی بڑی بلاسٹ بھٹی لگانا مناسب نہیں ہوگا۔''

نمک

وادی میں کسی قسم کا نمک نہیں ملتا مگر ہرنوں کے رہنے کی جگہوں کے ساتھ چشموں میں نمک

کی چند تہیں موجود ہیں۔

قلمی شورہ

قلمی شورے کے چند چھوٹے چھوٹے سوراخ وادی کے بالائی کریوہ جات میں پائے جاتے ہیں۔

ابرق

کشمیری عوام میں اس کو تیچھ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ بارہمولہ سے آگے ایک مقام پر اسے بھاری مقدار میں حاصل کیا جاتا ہے جو دریائے جہلم کے دائیں کنارے پر واقع ہے۔ جھیل مانسبل کے اوپر واقع اکھہ نگ کے پہاڑ پر بھی ابرق پایا جاتا ہے۔

چونے کا پتھر

اب تک چونے کے پتھر کا سب سے بڑا ذخیرہ اکھہ نگ کے چونے کے پہاڑ میں موجود ہے۔ جھیل ولر کے اجس کے مقام پر بھی چونا نکالا جاتا ہے اگر چہ مزید آسان ذرائع کا پتہ جھیل ڈل اور دریائے جہلم کے کناروں پر بھی لگایا گیا ہے۔ بہت سارے کریوں میں دستیاب کنکر سفیدی کا چونا بنانے کے کام آتا ہے۔ درزی کے چاک سے ملتا جلتا چاک سری نگر کے قریب سپار نام کے کریوے میں ملتا ہے۔

عمارتی پتھر

لیڈیکر کے مطابق نظام زانکار سے وابستہ چونے کا نیلا پتھر چند علاقوں میں پایا جاتا ہے جو پرانی اور نئی عمارتوں کے لیے بنیادی مواد کا کام کرتا ہے۔

چونے کی اس پتھر کو زخیم (Free Stone) کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے اور اس مقصد کے لیے بہت بڑے بلاک کان کنی سے حاصل کیے گئے ہیں۔ جن بڑی بڑی عمارتوں کی تعمیر میں ان کا استعمال کیا گیا ہے ان میں وادی کے تمام حصوں میں موجود قدیم مندر ہیں جن میں سے اہم مندر اسلام آباد کے نزدیک مارتنڈ، اونتی پورہ اور سری نگر کے نزدیک پاندرٹھن پانچ شامل ہیں۔ سری نگر میں تخت سلیمان کی چوٹی پر واقع قدیم عمارت بھی اسی پتھر سے بنائی گئی ہے۔ شہر کے اندر بھی مہاراجہ کے محل کے ساتھ دریا کے کنارے پر واقع گھاٹ بھی اسی پتھر سے تعمیر شدہ ہے۔

اس کے علاوہ جھیل ڈل کے کناروں پر واقع مغل عمارات بھی زیادہ تر چونے کے اسی پتھر سے بنائی گئی ہیں اور شالیمار باغ کی بالا دری کے پایوں کی تعمیر میں بھی سیاہ اور بھورے رنگ کے مدفونی سنگ مرمر کے خوبصورت ستون ہیں۔

سری نگر کی عمارتوں میں چونے کا جو پتھر استعمال کیا گیا ہے اس کا ذریعہ غالباً وہوہ کی زانکار چٹانیں ہیں مگر یہ افسوس کی بات ہے کہ جدید عمارتوں کی تعمیر میں استعمال شدہ پتھر کانکنی کے بجائے قدیم عمارتوں کو مسمار کر کے حاصل کیا جاتا ہے۔ وادی میں زانکار چٹانوں کی تقسیم اس طرح ہوئی ہے کہ جہاں بھی چاہیں عمارتوں کی تعمیر آسان بن سکتی ہے۔

سلیٹ

سلیٹ بارہمولہ سے حاصل کیا جاتا ہے۔ حال ہی میں جھیل ڈل کے کنارے پر واقع برین گاؤں کے نزدیک سلیٹ کی ایک کان قائم کی گئی ہے۔

بارہ مولہ کا سلیٹ حماموں کے فرش پر استعمال کیا جاتا ہے جو سنگِ فرش کے طور پر مشہور ہے۔

مٹی

وادیٔ کشمیر میں مٹی کی جو مختلف النوع اقسام کے ذخیرے ملتے ہیں وہ برتن سازوں (کمہاروں) کے لیے کافی موافق ہیں۔ برتن سازی کے معاملے میں چند کاوشیں بھی کی گئی ہیں اور اعلیٰ قسم کے برتن بنانے کے لیے چند اقسام کی مٹی کو نہایت نفاست سے ڈھالا جاتا ہے۔ انگلینڈ میں برتنوں کی چند مشہور اقسام سے واقف ایک انگریز کو میں نے مٹی کے چند نمونے ارسال کیے۔ اس نے کہا کہ مٹی کے ان نمونوں کی بھاری قدر و قیمت ہے۔ وادیٔ کشمیر کے جنوب میں چند مخصوص علاقے اعلیٰ ساخت کی مٹی کے لیے مشہور ہیں مگر فی الحال کشمیری برتن ساز کا اس سے زیادہ کوئی نشانہ نہیں کہ وہ پانی نکالنے کے لیے گھڑے اور سادہ نوعیت کے کھانا پکانے کی ہانڈیاں اور دیگر برتن تیار کریں۔ میں نے کسی دیگر باب میں یہ اشارہ دیا ہے کہ وادیٔ کشمیر میں دھاتوں کا خانگی مقاصد کے لیے شاذ و نادر ہی استعمال کیا جاتا ہے اور کشمیری کسانوں کی تمام ضروریات مٹی کے برتنوں سے پوری ہوتی ہیں۔

پن چکیوں کے پتھر

پیر پنجال کے آس پاس کے دائرے میں ریت کے پتھر موجود ہیں۔

کندہ پتھر

بیش قیمت کندہ پتھر (دکاک) بدخشان، بخارا اور یارقند سے درآمد کیا جاتا ہے جس میں سرخ پتھر، کارین، بلور، گارنٹ، لیس لازرٹ، اورنیکس، اوپل، راکھ، کرسٹل اور فیروزہ وغیرہ شامل ہیں۔ مقامی ساخت کے بھی چند پتھر موجود ہیں جنھیں زیورات اور بٹن وغیرہ تیار کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے یہ پتھر نہایت نرم ہوتے ہیں اور ان پر اعلیٰ قسم کا روغن نہیں کیا جاتا۔ عام طور پر پائے جانے والے پتھر مندرجہ ذیل ہیں۔

دیسی نام	رنگ	علاقہ
تخت سلیمان	سفید دھاریوں والا سیاہ	کوہ وستروَن
سنگِ موسیٰ	سیاہ	کھریوہ
بلور	سفید قلمی کرسٹل	وانگت
سنگِ سماک	نیلا بنفشی	//
سنگِ شالہ مار	سبز	//
سنگِ رتیل	چاکلیٹ (نسوار)	//
سنگِ نادر	کافی جیسا سیاہ رنگ	//

اس کے علاوہ قیمتی پتھر بھی جسے چقماق بندوق میں استعمال کیا جاتا ہے کوہ وسترون سے لایا جاتا ہے۔ اسی علاقے سے ایک قسم کا کائی یشب بھی حاصل کیا جاتا ہے۔

پرچ اور پیالیاں ایک پتھر سے تیار کی جاتی ہیں۔ جس کا نام سنگِ نلچان ہے، یہ پتھر اس قدر ملائم ہوتا ہے کہ اسے لکڑی کی مانند کاٹا جا سکتا ہے۔ یہ پتھر صابن نما پتھر، بھوری، زرد اور سبز رنگوں والی مختلف قسموں کا ہوتا ہے۔

سنگ والم

ویری ناگ کے نزدیک ایک مقام سے حاصل کیا جا سکتا ہے جسے زرگر استعمال کرتے ہیں۔

سنگ باسوتری

سنگ باسوتری ایک زرد پتھر ہے جس کا استعمال ادویات میں ہوتا ہے۔

●✲✲✲●

حوالہ جات

(1) جیالوجی آف چھچھ ٹیری ٹیریز اینڈ برٹش ڈسٹرکٹ آف کھاگان۔ رچرڈ لیڈیکر۔ بی اے (کینٹب) ایف بی ایس۔ ایف زیڈ۔ ایس۔ سابقہ جیالوجکل سروے آف انڈیا۔

(2) ایسا چشمہ موسم سرما کے دوران گرم اور گرمیوں میں ٹھنڈا ہوتا ہے۔ ایک ایسا ہی چشمہ ڈل جھیل کے کنارے واقع تھید کے گاؤں میں موجود ہے۔

(3) سہ ماہی رسالہ جیالوجکل سوسائٹی۔ جلد 20، ص:383

(4) برٹش ایسوی ایشن رپورٹر۔

●❋❋❋●

چوتھا باب

نباتات

عام معلومات

میں اس باب میں فقط ان پودوں اور درختوں کا ذکر کروں گا جو وادیٔ کشمیر میں اور اس کے کناروں پر موجود ہیں۔ اس حد بندی کے باوجود یہ باب ان حصاروں کے اندر رہے گا جن کی اس باب میں ضرورت محسوس کی گئی ہے۔ کشمیر کے اندر پیدا ہونے والی ہر شے میں ادویاتی اوصاف موجود ہیں۔ شروع میں مجھے ان کی زمرہ بندی کرنے میں کچھ دقت محسوس ہوتی ہے اور اس مرحلے پر یہ فیصلہ کرنا آسان کام نہیں کہ موجودہ باب کو کون سا عنوان دیا جائے۔

چنانچہ میں نے اخروٹوں اور شاہ بلوط کو زراعت کے زمرے میں رکھا ہے کیونکہ ان پودوں کے لیے ایسی کارروائیاں کی جاتی ہیں جو زراعت کے ساتھ مطابقت رکھتی ہیں۔ اس کے باوجود میں اس معاملے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ آیا کشمیر کے پودوں کی اپنی پودوں کی ہیئتی یا ماحولیات کے مطابق زمرہ بندی کی جائے۔ چنانچہ میں نے یہ طے کرلیا کہ وادی کو اس کے پہاڑی علاقوں، میدانوں، جھیلوں اور تالابوں میں زمرہ بند کیا جائے۔ مگر مختلف مقامی پودوں اور پیڑوں کی زمرہ بندی کرتے وقت ان کے مختلف اقتصادی اوصاف، خصوصیات اور فائدے بھی ذہن میں رکھنا ہوں گے۔ میں مندرجہ ذیل بیان میں اس زمرہ بندی پر قائم رہنے کی کوشش کروں گا اور جہاں

نہیں ممکن ہوا!ان کے یو۔ پی اور کشمیری معنی بھی دیے جائیں گے۔

1	مصالحے	2	دوائیاں
3	رنگ وغیرہ	4	دھاگے
5	گھاس چارہ	6	خوراک اور پھل
7	بال دھونے کی جڑی بوٹیاں	8	ادویات
9	زہر	10	خوشبو عطر
11	صابن اور سجی	12	چوب
13	خمیر	14	آمیزشات

زیرے کی کاشت

مصالحہ جات

مصالحوں میں اہم ترین مصالحہ سیاہ زیرہ ہے۔ یہ پودا کشمیر کے کریوؤں میں اس وقت پیدا ہوتا ہے جب اس زمین میں گندم اور جو کی کاشت ہوتی ہے۔ اس کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ کسی زمین میں تب تک سیاہ زیرہ نہیں اگایا جا سکتا جب تک زمین کو ہل چلا کر قابل کاشت نہ بنایا جائے۔ پرانے دنوں میں سیاہ زیرے پر ٹیکس عائد ہوتا تھا جو ٹھیکیدار کو ادا کرنا پڑتا تھا۔ مزید ایکUmbellifrousپودے،(Daucus Cartota) کے بیج کشمیر میں مورمجھ کے نام سے مشہور ہیں اور سیاہ زیرے میں حقیقیCarraway کے طور پر آمیزش کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ سیاہ زیرے کی کاشت کے لیے کبھی کوشش نہیں کی گئی۔

ریشے

جڑی بوٹیاں

بھنگ یہ پودا دریائے جہلم اور وشو کے کناروں پر بہتات سے اُگایا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے یہ رواج تھا کہ دریائے جہلم کے دونوں کناروں پر 15 گز زمین محفوظ رکھی جاتی تھی جہاں ریشے کا بیج بویا جاتا تھا چنانچہ ایک مرتبہ ریشے دار جڑی بوٹیاں اور دھاگہ جمع کرنے سے 25,000 روپے وصول کیے گئے۔ ریشہ دار جڑی بوٹیاں وادی کشمیر میں بہت کم پیسہ کماتی ہیں۔ پچھلے پانچ سال میں

اس رقم کی اوسط 6,200 روپے رہی ہے۔ کشمیریوں کے کہنے کے مطابق وادی میں نشہ آور دوا ایک ریشہ دار پودے چرس سے تیار کی جاتی ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ وادی میں گانجا پیدا نہیں کیا جاتا ہے۔ وادی میں اُگنے والی چرس یارقند کی بوٹی سے کم تر مگر کابل اور بخارا کی چرس سے بہتر ہے۔ وادیٔ کشمیر کے جنوب میں کاشت کی جانے والی گرد، بھنگ یا چوراچرس ایک مادہ پودے سے نکالی جاتی ہے۔ جن ہندوستانیوں نے اس کا استعمال کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ اصلی گانجا ہے اور یارقندی چرس سے الگ تھلگ ہے۔ یہ سری نگر میں بھی دستیاب ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اس نام نہاد گانجا کی سالانہ پیداوار 70 من ہے اور تقریباً 400 من ریشے ہر برس جمع کیے جاتے ہیں۔ سری نگر سے نیچے دستیاب پودوں سے کسی قسم کی ادویات حاصل نہیں ہوتی ہیں جبکہ اس علاقے میں ہر سال تقریباً 600 من ریشہ جمع کیا جاتا ہے۔ کشمیر میں نشہ آور جڑی بوٹیوں کی پیداوار اور مقامی مصرف دونوں میں یکسانیت ہے۔ کشمیری لوگ ریشہ دار چورے کو سگریٹ نوشی یا پینے کے لیے استعمال نہیں کرتے جب کہ وہ اس سے ایک معجون تیار کرتے ہیں جسے کچھ حد تک کھایا جاتا ہے۔ اگر کشمیری جڑی بوٹی گانجا نہیں چرس ہے تو یہ حیرانی کی بات ہے۔ میرے پاس ایک اہلکار کی طرف سے ریشہ دار جڑی بوٹیوں کے بارے میں بیان کردہ کیفیت میں جانچ پڑتال کے لیے چند نکتے موجود ہیں۔ اس تجارت میں مصروف دوسرے لوگ یہ کہتے ہیں اور میری سمجھ کے مطابق بات یہ ہے کہ گانجا حمل کے بغیر کسی مادہ پودے سے حاصل نہیں کیا جا سکتا مگر کشمیر میں مادہ پودے کو حاملہ کیا جاتا ہے اور اس سے جو ریشہ دار بیج تیل کی صورت میں نکلتے ہیں وہ چرس کی طرح ہوتے ہیں اور اس تیل کو نشہ پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

کشمیر میں ٹیٹھہ وین ایک عام پودا ہے جسے کشید کر کے عرق نکالا جاتا ہے جو ابساتھن کہلاتا ہے۔ یہ اصطلاح یونانی سے اپنائی گئی ہے۔ یہ جڑی بوٹی بھاری مقدار میں پنجاب کو برآمد کی جاتی ہے۔ ابساتھن کشمیر کی حدود میں پیدا نہیں ہوتا ہے مگر میں نے اسے Narthex Assfoddtida تحصیل میں دویاں کے نیچے دیکھا ہے۔ اس کے چند پودے میں نے ڈاکٹر ایکشن سے حاصل کیے تاکہ کشمیر میں اس کی تجربہ کی کاشت کا جائزہ لیا جا سکے۔ جہاں تک میری واقفیت ہے کاروباری طور پر ابساتھن کی کاشت استور میں نہیں ہوتی ہے۔ مقامی باشندے اس پودے کا مصرف کھانا پکانے

کے لیے کرتے ہیں۔اس پودے سے جو دودھیا رس نکلتا ہے اس کی بو پنچ پھلی کی باس ہوتی ہے جو Fdurila. Jaesckeana کی خوشبو کے بالکل برعکس ہوتی ہے۔

رنگ اور چمڑا رنگنے والے پودے

رنگ سازی میں جو رنگ استعمال ہوتے ہیں۔ ان کے بارے میں تفصیلات بیان کرنے سے لوگ ہچکچاتے ہیں۔ جن دنوں کشمیر میں شال بافی کا کاروبار اپنے عروج پر تھا اُن دنوں ہر کارخانے میں ایک ہنر مند رنگریز ملازم ہوا کرتا تھا جو اس علاقے کی سبزیوں کے رنگ ملا کر ہلکے سے ہلکے رنگ کی جھلک پیدا کرتا تھا۔ Datisca Cannabina ایک زرد رنگ دیتا ہے جو سرخ اور گہرے نیلے رنگوں کے بغیر تمام رنگوں کے ساتھ ملایا جا سکتا ہے۔ Rubia, Cardifolia اور اس سے زیادہ عام متبادل Geranium, Nepalense دونوں موزیت کے نام سے جانے جاتے ہیں اور انھیں گلابی، سنہری اور کریم رنگوں کے ساتھ ملایا جا سکتا ہے۔ پھر زالن اور ریوند کو نارنجی رنگ کے لیے سرخ، سنہری اور ہرے رنگ کے ساتھ ملایا جاتا ہے۔ اخروٹ کے بیرونی چھلکوں کے تنوں سے بھورا رنگ حاصل کیا جاتا ہے۔ خوبانی اور شہتوت کے پھلوں میں بھی رنگوں کے اوصاف موجود ہیں۔

چمڑا رنگنے کے مواد میں دیودار، جرمن صنوبر، خوبانی، ایلڈر اور انار کے چھلکے شامل ہیں۔

تار یا ریشے

ریشوں یا تاروں کے معاملے میں کشمیر کافی زرخیز ہے اور مقامی لوگ اُن کا بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ جب ہندوستان کے ساتھ یہاں کے مواصلات میں بہتری پیدا ہو تو تاروں اور ریشوں کے کاروبار میں بہتری پیدا ہوگی اور ہر گزرنے والے برس کے ساتھ قیمتی ریشے والے پودوں کی پیداوار بڑھتی جائے گی۔ کشمیر کے کشتی رانوں کو اچھی ساخت کے ریشے چاہیے اور کہا جاتا ہے کہ رسے باندھنے کے لیے سوتی ریشوں کو بہترین مواد کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

کریشم یا دریا کے کناروں پر پایا جانے والا پھول آیرس پیدا ہوتا ہے۔ اس پھول کا رنگ دریا کے نیلگوں پانی کے رنگ سے ملتا ہے۔ اس کا ریشہ اگرچہ زرعی مقاصد کے لیے بنانے کے لیے

استعمال کیا جاتا ہے مگر یہ ریشہ زیادہ مضبوط نہیں ہوتا۔

بھنگ ایک بہترین ریشہ ہے جس سے مضبوط ریشے تیار کیے جاسکتے ہیں۔ اس پودے کی ڈنٹھل سے باغات کے ارد گرد باڑ برداری کی جاتی ہے اور موسم سرما میں مکانوں کی کھلے چھتوں کے سروں کو اس کے ڈنٹھلوں سے ڈھکا جاتا ہے۔ ماضی میں کشمیر کاغذ کے لیے بہت مشہور تھا۔ قرآن شریف کی تحریر کے لیے استعمال کیا جانے والا اعلیٰ قسم کا کاغذ ہمیشہ بھنگ کے گودے سے تیار کیا جاتا تھا۔ گھکر نچلی سطح پر واقع نم اور زرخیز زمین پر اگتا ہے۔ رسے، چٹائیاں، بستر اور کلتاس تیار کرنے کے لیے یہ بہترین ریشہ ہے۔ اس پر پانی کوئی اثر نہیں کرتا۔ Ablition Avicennae ریشہ ہندوستانی پٹسن سے بہتر قرار دیا گیا ہے اور یہ فیلا کے ریشوں سے بہتر ہے۔

وندل جس کے لغوی معنی بساطی کی رسی ہے۔ ڈوری تیار کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور دکاندار پارسل باندھنے کے لیے اس کا استعمال کرتے ہیں۔

پیژ

یہ دلدل میں پیدا ہونے والا ایک پودا ہے جو چٹائیاں بنانے کے کام آتا ہے۔ یہ کشمیر کے بہت سے دلدلی علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ یہاں کشتیوں کی چھتیں بھی پیژ کی چٹائیوں سے ڈھکی ہوئی ہوتی ہیں۔ یہ چٹائیاں عام طور پر گھروں میں فرش کے طور پر بچھانے کے کام آتی ہیں۔ چٹائیاں بنانے کے کام میں بہت سارے لوگوں کو روزی روٹی میسر ہوتی ہے۔ سرینگر کے جنوب میں لجن گاؤں کے باشندے بہترین چٹائیاں بنانے کے لیے مشہور ہیں۔

بُرزہ

بُرزا کاغذ (بھوج پتر) 9,000 سے 13,000 فٹ کی بلندیوں پر پایا جاتا ہے۔ کشمیریوں کے لیے یہ بھاری اہمیت رکھتا ہے۔ چھلکا بھوج پتر کے نام سے جانا جاتا ہے اور اُس سے کھردرے کاغذ کا کام لیا جاتا ہے۔ سماج میں اونچے درجے کے لوگوں کے مکانوں اور خانقاہوں کی چھتیں بُرزے کی بنی ہوئی ہوتی ہیں جن پر مٹی کی ایک موٹی تہہ بچھائی جاتی ہے۔ حقوں کی نلیوں پر بھی باریک برزہ کو لپیٹا جاتا ہے۔ دیہاتی دکاندار اسے لکھنے کے کاغذ کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس بھوج پتر کی پڑیوں میں کھانڈ اور چائے لپیٹی جاتی ہے۔ بہت سارے قلمی قدیم مسودے

برزہ یا تنوں پر لکھے گئے ہیں۔ ہندوستان میں جوفن کے نادر نمونے بھیجے جاتے ہیں انھیں اسی مواد میں بند کیا جاتا ہے جو مضبوط اور پائدار ہوتا ہے اور پانی اس پر اثر نہیں کرتا۔ چھتوں کے لیے یہ ایک بہت ہی بہترین مواد ہے مگر افسوس یہ ہے کہ اس کارآمد درخت کا تحفظ نہیں کیا گیا ہے جسے گڈریے تباہ و برباد کر رہے ہیں۔ اس درخت کا چھلکا نکالنے کے لیے ٹین کاٹنے کا آلہ استعمال ہوتا ہے۔ اسے اوپر سے نیچے تک کاٹا جاتا ہے۔ ایک درخت پر چھال کی سات تہیں ہوتی ہے۔ اُس کے بعد چھلکا اتار لیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں اگر چھلکا نکالنے کا عمل سات تہوں تک ہی محدود رہے تو درخت دوبارہ بحال ہوتا ہے اور اس پر نئی چھال پیدا ہوتی ہے۔

کوڈ

یہ دھان کے کھیتوں کے مُندوں پر پیدا ہوتا ہے۔ زراعتی مقاصد اور چپلیں تیار کرنے کے لیے یہ ایک مفید ریشہ ہے۔ جب کشمیری ہندو کے یہاں کوئی پیدا ہوتا ہے یا مر جاتا ہے تو اُس کے نیچے کوڈ گھاس بچھائی جاتی ہے۔

فکل

فکل کو بنیادی طور پر آبپاشی بندھوں کے کھمبوں کو آپس میں جوڑنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو پانی کے بہاؤ کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

برمن

Elln جیسے بہترین ریشے کا استعمال کھُر درے مگر مضبوط طرح سے تیار کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔

کٹس

کٹس وادی کے تمام حصوں میں نشو ونما پاتا ہے۔ لون اور پوہ کے ساتھ اِس کی نرم شاخیں بے حد کارآمد ہیں۔

کریل

کریل کو مرغی خانوں کی باربرداری کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ کانگر یا کشمیر کے

Chauffemain کی بیرونی پوشش عام طور پر پوگ یالون سے کی جاتی ہے۔

ویر

ویر یا بید کا درخت وادی کے ہر گاؤں میں اگتا ہے جہاں کہیں پانی یا پانی کی نمی موجود ہے وہاں اس کا اگنا بے حد آسان ہوتا ہے۔ اس درخت کی لچکدار شاخوں کی ہر سال بربادی ہوجاتی ہے کیونکہ گھاس چارے کے لیے اِن کی چھوٹی چھوٹی چھڑیاں (سوہ) کاٹ دی جاتی ہیں اور کاٹنے کے بعد ان کے پتے ایندھن کے طور پر جلائے جاتے ہیں۔ میرا یہ مشورہ ہے کہ ایک کشمیری کو انگلینڈ بھیجا جانا چاہیے تا کہ وہ ٹوکریاں تیار کرنے کی صنعت میں تربیت حاصل کرے۔ کشمیر میں ٹوکریاں اور کرسیاں بنانے کے لیے اتنا مواد موجود ہے کہ یہاں سے یہ چیزیں سارے ہندوستان کو برآمد کی جاسکتی ہیں۔

گھاس چارہ

وادیٔ کشمیر کے لوگ اپنی سہولت کے لیے زیادہ تر دودھ اور اُون پر دارومدار رکھتے ہیں۔ وہ سخت سردی میں بل چلاتے ہیں اور گائیوں اور بھیڑوں کا دودھ دہوتے ہیں جنھیں وہ اپنے گھروں کی سب سے نچلی منزل میں باندھ کے رکھتے ہیں۔ دھان کی زراعت اور مکئی کے ڈھیروں میں وہ چارہ بھی شامل ہے جس کی موسم سرما میں سخت ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ بھیڑوں کو خوراک فراہم کرنے کے سلسلے میں قدرت مہربان رہی ہے۔ ستمبر کے مہینے میں لنگڑے درختوں کو کاٹ دیا جاتا ہے اور موسم سرما کے لیے درکار چارہ جمع کیا جاتا ہے جن درختوں کا چارے کے لیے استعمال ہوتا ہے وہ یوں ہے۔

ویر

ویر بھیڑوں کے لیے بہترین چارہ ہے۔ ویر ہر جگہ پیدا ہوتا ہے اور بھیڑوں کے لیے گھاس چارہ فراہم کرتا ہے۔ بید کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں مگر حیوانوں کے چارے کے لیے پہاڑوں پر پیدا ہونے والا بید نہایت قیمتی ہے۔

ہندوستانی گری

رنگ Hawthorh اور پھرئیس (Poplars) موسم سرما کے دوران بھینسوں کو دل پسند

خوراک پہنچاتے ہیں۔گھاس کی پیداوار کے لیے بھی کشمیر کی زمین کافی زرخیز ہے۔ چاول کے کھیتوں کی حدود سے ہر سال اچھی فصل حاصل ہوتی ہے۔اس گھاس کو موڑ کر لمبے رسے تیار کر کے درختوں پر لٹکائے جاتے ہیں۔اس سے گھاس ناموافق موسم سے بچتی ہے۔ بلندترین مقامات پر گھاس کے لیے الگ کھیت بنائے جاتے ہیں۔گھاس کو انگریزی طرز پر تیار کر کے اس کے ڈھیر لگائے جاتے ہیں۔گھاس کی بہترین قسموں میں بے رنگ، لنڈن، مبطخ، Clover اور میتھی ہے۔ کھنگی نام کا یہ گھاس گھوڑوں اور دیگر مویشیوں پر نشے کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔اگر اس کا علاج نہ کیا جائے تو حیوان کی موت واقع ہو سکتی ہے۔اس کے لیے دو قسم کے علاج ہیں۔یا تو جانور کا سر گھنے دھویں پر رکھا جائے اور اگر یہ علاج کارگر ثابت نہ ہو تو پھل، تیزاب اور بنفشہ حیوان کو کھلائے جاتے ہیں جس سے اسے راحت ملتی ہے۔دیہاتی علاقوں کے مویشی اس گھاس کے زہریلے اثرات سے واقف ہیں چنانچہ وہ اسے چھونے سے بھی گریز کرتے ہیں۔کشمیر کے دلدلی علاقوں میں گھاس کے چند نادر پودے ملتے ہیں اور موسم گرما کے دوران خچر پانی میں اُتر کر دلدلی پودوں سے چارہ حاصل کرتے ہیں۔دلدلی گھاس میں بہت سے نادر ایک قسم کی سرکنڈہ تری ہے جو یا تو سبز رنگ میں ہی کھائی جاتی ہے جاڑوں کے لیے اس کا ذخیرہ کیا جاتا ہے۔گھوڑوں کے لیے اسے بہترین خوراک مانا جاتا ہے اور سرکاری اصطبل اس کے بغیر کوئی دوسری گھاس استعمال نہیں کرتے۔

کھوڑ

یہ ایک گول پتوں والا دلدلی پودا ہے اور گائیوں کے لیے نہایت بیش قیمت ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کے کھانے سے دودھ کی پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے۔

تاری گھاس بھی گھوڑوں کے لیے ایک قیمتی چارہ ہے نمبل گھاس نہایت عام ہے اور اسے نہایت عمدہ چارا مانا جاتا ہے۔گھاس کی دوسری قسموں میں ادنی قسم کا چاول ہامہ شامل ہے جس پر زراعت کے باب میں تذکرہ ہوا ہے۔اس قسم کی گھاس کھانے سے گھوڑے کا موٹاپا بڑھتا ہے۔

درہامہ کو زہریلا تصور کیا جاتا ہے مگر جب یہ پودا چھال کی صورت میں کھلتا ہے تو اس کی زہریلی خاصیت ختم ہو جاتی ہے اور یہ کسانوں کے لیے ایک بہترین چارہ ثابت ہوتا ہے۔

رنی گندم کے کھیتوں میں اگنے والا ایک جنگلی گھاس ہے جسے چارے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات اسے چھت پر ڈالنے کے لیے گھاس حاصل کرنے کے مقصد سے اگایا جاتا ہے۔ چوہے اس کے نزدیک نہیں جاتے۔ اس گھاس کو فرانسیسی گندم سے موسوم کیا جاتا ہے۔

پھل اور خوراک

اس عنوان کے تحت میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آبی سنگھاڑوں اور اخروٹوں کا ذکر نہ کروں کیونکہ اُن پر زراعت سے متعلق باب میں تذکرہ کیا جائے گا۔ میں نے اس باب میں یہ بھی بیان کیا ہے کہ جھیل ڈل کے جنگلی پودوں سے کس طرح خوراک کی نادر دولت حاصل ہوتی ہے۔ یہ پودے دیگر دلدلی تالابوں اور جھیلوں میں بھی پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں یہاں پر ان کی تفصیلات پھر سے بیان کرنا چاہوں گا۔ میں صرف اتنا کہوں گا کہ خوراک کے لیے جو پودے کام میں لائے جاتے ہیں اُن سبھی کا ذکر کرنا ممکن نہیں ہے۔ میں صرف ان ہی پودوں کا ذکر کرسکتا ہوں جو عام استعمال میں آتے ہیں جو دلدل اور جنگلات میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے ہیں مگر قحط سالی کے دوران جنھیں لوگ بے تحاشہ کھاتے ہیں۔ کشمیر میں ایک تو ہم پرستی دیکھی گئی ہے کہ کامبئے میں (Solanum, Nigrum) تریر، کیونہ اور کریری کی طرح پودے 79-1877 کے دوران عام طور پر کھائے گئے۔ کہتے ہیں کہ یہ پودے اسی وقت پیدا ہوتے ہیں جب قحط سالی کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔ اس ہیبت ناک قدرتی آفت کے دوران جو تجربات کیے گئے ہیں اُن میں ان پودوں کا اہم کردار رہا ہے۔ براری نام کے ایک پودے کی وجہ سے کافی اموات واقع ہوئی ہیں۔ کرالہ منڈی، برجی، تھرو اور بہت سارے غیر شناخت شدہ پودوں کو فاقہ کشی کے شکار لوگ نہایت لالچ کے ساتھ کھا گئے۔

سنگاڑہ کے بارے میں زراعت کے باب میں تفصیلات بیان کی جائے گی۔ جیوار سے نرم اور میٹھا بیج حاصل ہوتا ہے جسے کچا یا بھون کر کھایا جاتا ہے۔ بُمبہ پوش اپنے سفید خوشبودار پھول سے مہکیلی شربت دیتا ہے اور اس کے تنے سے ایک ذائقہ دار سبزی حاصل ہوتی ہے۔ پمپوش کی گری نہایت میٹھی ہوتی ہے جب کہ اس کے تنے سے ندرُو حاصل ہوتا ہے جسے کشمیر کے لوگ گوشت کے ساتھ پکاتے ہیں۔ پٹس اور ڈل نابد کے دانوں سے ایک مٹھائی تیار کی جاتی ہے جب

کہ پٹس کی جڑیں بھی کھائی جاتی ہیں۔

ندیوں میں ایک یگانہ سلاد آبی ناگہ بیر پایا جاتا ہے۔ ہر کھیت میں پھول ہند پوش دیکھا جاسکتا ہے اور لوگ اسے سبزی کے طور پر قدر کرتے ہیں۔ یہ پودا اکثر باغات میں اگایا جاتا ہے اور عمدہ ترین جڑیں فراہم کرتا ہے جو اکثر کاشت کی جائیں تو مولی کا مقابلہ کریں گی۔ اس کی بیرونی پرت آسانی سے اتاری جاسکتی ہے جب کہ اس کے اندر مولی کی خوشبو ہوتی ہے۔ اندر کا حصہ دودھیا سفید رنگ کا ہوتا ہے اور کھانے میں ذائقے دار ہوتا ہے۔ یہ بادام سے ملتا جلتا ہے۔

پمبہ ہاک بلندی سطحوں پر اگتا ہے اور اس سے ریوند چینی حاصل ہوتی ہے جو میری رائے میں کافی زیادہ لذیذ ہے اور کاشت کردہ ریوند کی نسبت لذیذ ہوتی ہے۔ سہہ برگی کو اگر سات قسم کی پتی کے ساتھ ملا دیا جائے تو اس میں ذائقہ پیدا ہوتا ہے اور تیزابی قسم کی چٹنی بن جاتی ہے۔

ژو کہ لڈر اور ردماچ عمدہ ترین انگریزی ریوند کی طرح ایک سبزی فراہم کرتے ہیں اور اس میں زیادہ تیزابی مادہ نہیں ہوتا ہے۔ مزید ایک Rumex غالباً (سکوتری) کو تیزابی سبزی کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ سُرخ پوست کے وجاں سال پودے (گلالہ) سبزی کے طور پر بہت پسند کیے جاتے ہیں۔ انہیں تُیال (کیو) سے موسوم کیا جاتا ہے اور گڈریوں میں گاجر کا عمدہ ترین متبادل تصور کیا جاتا ہے۔ جنگلی پیاز (پران) ولیکوٹ جوقوی سبزی (کرم ساگ) سے مطابقت رکھتی ہے۔ (ہوگل) اور پامسال اور ذن روہن کے پتے عموماً کھائے جاتے ہیں۔ وتہ کرم سے عمدہ ترین Potherbs تیار ہوتا ہے۔ شلغم کی شاخوں والے زردگوگل سے ایک گرم غذا حاصل ہوتی ہے۔ چون چورو سبزی کے طور پر نہایت تُرش ہوتی ہے۔ دراب کو اُبلے ہوئے دودھ کے ساتھ کھایا جاتا ہے۔ چاری ہاک ایک گرم Potherb ہے۔ سدابہار درخت پکو کے چھلکے پوش تھل اور بہت عرصہ قبل وادی میں چائے کو ایک عشرت سمجھا جاتا تھا اور چند ہی لوگ اس سے لطف اندوز ہوتے تھے تب کشمیری لوگ پوش تھل کا استعمال چائے کے متبادل کے طور پر کرتے تھے۔ یہ پوش تھل بھاری مقدار میں لداخ کو بھی برآمد کیا جاتا تھا۔ قحط سالی کے دوران اِس چھلکے کو پیس کر آٹے کی طرح مصرف میں لایا جاتا تھا۔

دنیا ایک شیریں جڑی ہے جو پیپرمنٹ کی طرح ہوتی ہے اور ہندو اسے تُلسی کے متبادل کے

طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ہماری گچھی (ہیڈر) اور نازک کنہ گچ پہاڑوں میں فراوانی سے پایا جاتا ہے اور ہندوستان کو برآمد کرنے کے لیے مشہور ہے۔ یہ گچھی سبزیوں اور سالنوں میں بھی ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ حیرانی کی بات ہے کہ یورپی سیاح اس کا بکثرت استعمال کرتے ہیں۔

Aricus Flammis فقط Elm کے چھلکوں میں ملتا ہے جب کہ Hydonum Coralloides سڑی گلی غذا کے سوختہ خراب خولوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اخروٹ، صنوبر اور شہتوت کے درختوں پر جو مکھیل پایا جاتا ہے اُس کا وزن کبھی کبھی دو پونڈ تک بڑھ جاتا ہے۔ فون میں سے دید کو خشک کر کے موسم سرما کے دوران کھایا جاتا ہے۔ اسے اچھی اور صحت مند غذا تصور کیا جاتا ہے۔ کشمیر کے پھلوں میں مندرجہ ذیل مقامی میوے ہیں اور وادی کے تمام حصوں میں پائے جاتے ہیں۔ یہ پھل اُگائے گئے درختوں کے مانند عمدہ نہیں ہیں مگر ان سے دور بھی نہیں رہا جا سکتا۔ اگرچہ کشمیری ہمیشہ جنگلی پھلوں کا ریچھ کی خوراک (ہاپت کھنن) کا تذکرہ کرتے ہیں مگر وہ سیب اور ناشپاتی کھانے سے گریز نہیں کرتے۔

شہتوت	ٹل
ترشی گلاس	اَلچہ
پلم	اُر
سیب	ژونٹ
ناشپاتی	ننگ
انگور	دَچھ
اخروٹ	ڈوُن
انار	داَن

جہاں تک پھلوں کا تعلق ہے، میں فقط اتنا کہوں گا کہ میری رائے میں رس بیری اور کشمش یورپ میں کاشت شدہ اقسام کے ہم پلہ ہیں۔ سیاہ کشمش یورپ کی سیاہ کشمش کے ہم پلہ ہے۔ سرخ کشمش خوشبو میں یکساں ہے مگر بیروں کی ترتیب میں بجا طور پر فرق ہوتا ہے۔

میں نے چھوٹے سائز کے ہیزل نٹس دیکھے ہیں مگر مسافروں کا کہنا ہے کہ پیر پنچال کی

ڈھلوانوں میں انھیں نفیس ترین فلمرٹس دیکھے ہیں۔

بالوں کے صابون

کشمیر کے لوگ بالوں کے بارے میں کافی حساس ہیں۔ اپنے بال سنوارنے کے لیے وہ مکھن اور تیل کے علاوہ چند خاص پودوں کا بھی استعمال کرتے ہیں۔

اپنے بالوں کو مضبوط بنانے کے لیے وہ ایک سفوف کا استعمال کرتے ہیں جو زنیر کے نام سے مشہور ہے۔ اسے مکھن کے ساتھ ملایا جاتا ہے۔ جوؤں کو تباہ کرنے کے لیے ہربی اور منیرہ داغ سے بنے صابن کا استعمال کرتے ہیں۔ اپنے زلفوں کو گھونگر والی بنانے کے لیے وہ (Corydalis, Falconeri) سے بنے صابن کا استعمال کرتے ہیں۔

ادویات

کشمیر کے حکیم اور مقامی معالج ہر ایک پودے کے ساتھ کسی نہ کسی وصف کو منسوب کرتے ہیں۔ جب میں نے ان مختلف جڑی بوٹیوں کے بارے میں دریافت کیا جو پہاڑیوں کی طرف پائی جاتی ہیں تو مجھے ہمیشہ بتایا گیا کہ وہ گرم ہیں اور سرد تاثیر کا علاج کرتی ہیں اور جو سرد ہیں وہ گرم تاثیر کے لیے موافق ہیں۔ اسی طرح خشک جڑی بوٹیاں نمی کی تاثیر کے لیے موزوں اور نم والی بوٹیاں خشک تاثیر کے لیے سازگار ہیں۔ میرے محکمہ میں ملازم پنجابی لوگ حالانکہ تمام کشمیری طور طریقوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے مگر وہ بھی یہاں کے حکیموں کی قدر ومنزلت کرتے تھے۔ انھوں نے مجھے بتایا تھا کہ وادی کی جڑی بوٹیوں سے حیرت کن علاج ممکن ہے۔

حالیہ برسوں میں کشمیر کی جڑی (Datura, Stramonion) کے پودے کافی مقدار میں برآمد کیے گئے ہیں اور پنجابی تاجر ان پودوں کو پانچ روپے فی من کے حساب سے خریدتے ہیں۔ بہر کیف میں اس بات کا پتہ نہیں لگا سکا کہ یہ بیج کس مقصد کے لیے برآمد کیے جاتے ہیں۔

عطر اور خوشبوئیں

کشمیر میں پودوں کی عطر اور خوشبوؤں کی کافی قدر کی جاتی ہے۔ اچھی خوشبو کا حاصل پودا کستوری 1100 فٹ کی بلندی پر پیدا ہوتا ہے۔ اس کی خوشبو دلفریب ہوتی ہے۔

گوگل دھوپ زیادہ تر ہندوستان کو برآمد کیا جاتا ہے جہاں اسے ہندو استعمال کرتے ہیں۔

کاندچیر یا حاندچ کے پودوں کی لداخی لوگ بخورات کے طور پر قدر کرتے ہیں۔

کشمیر کے اہم ترین خوشبودار پودوں میں کوٹھ کا شمار ہوتا ہے۔ یہ پودا 8000-9000 فٹ کی بلندی پر پیدا ہوتا ہے اور وادی کے شمالی سروں کے پہاڑوں میں اس کی فراوانی ہے۔ اس کی خوشبو ابرسان کی طرح ہوتی ہے اور اس میں بنفشی امتزاج بھی ہوتا ہے۔ اسے عام طور پر گڈریے اور چرواہے موسم گرما میں نکالتے ہیں۔ حکومت کی طرف سے ہر سال کوٹھ کی بھاری مقدار کا تقاضا کیا جاتا ہے اور دیہاتوں کو مقررہ وزن میں کوٹھ لانا ضروری ہے۔ فی الحال چوب کوٹھ کی اجارہ داری ہے جس سے 45000 روپیہ سالانہ آمدنی ہوتی ہے جب کہ حکومت 4 روپے فی خروار کے حساب سے معاوضہ ادا کرتی ہے اس کی جڑ جو چوب کوٹھ کے نام سے مشہور ہے ہندوستان کو برآمد کی جاتی ہے۔ جب یہ خشک ہو جاتی ہے تو اس کا وزن بھی گھٹتا ہے۔ مگر کہتے ہیں کہ بمبئی میں اس کی واجب قیمت وصول ہوتی ہے۔ جب اسے چین تک برآمد کیا جاتا ہے تو اس سے اچھا خاصا منافع حاصل ہوتا ہے۔ چین میں اس جڑی کا مصرف ابرسا جوس گھروں میں استعمال ہوتی ہے اور ہندوستان میں اسے کنویں صاف کرنے کے مصرف میں لایا جاتا ہے۔ دوائی کے طور پر اس کے مختلف النوع اوصاف ہیں۔ اسے خوشبوؤں، ٹانگ اور نشہ آور دوائی کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ہیضے کی دوائی میں اسے نشہ آور جز کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ دردِ دندان اور گٹھیا کے امراض میں بھی اس کا استعمال کیا جاتا ہے۔ بمبئی سے اس کی جڑیں کو لکاتا اور وہاں سے چین کے چوب کوٹھ کی فروخت سے 9000 روپے حاصل ہوتے ہیں۔ مگر باور کیا جاتا ہے کہ اس کی قیمتوں میں کمی واقع ہوئی ہے۔ اور کوٹھ اب بھاری تعداد میں ہندوستان کو افغانستان سے درآمد ہوتی ہے۔ چوب کوٹھ کے بیجا استعمال سے یہ پودا اب کشمیر کی پہاڑی ڈھلوانوں پر ختم ہونے لگا ہے اور اس کی ازسرنو کاشت کے لیے کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ اگرچہ ماہرین کا یہ خیال ہے کہ اس کی فوری کاشت نہایت آسان ہے اور اُس سے بھاری نفع حاصل ہوسکتا ہے۔

بریڈ مشک کے پھولوں سے عطر یا تیل نکالا جاتا ہے جو بے حد خوشبودار ہوتا ہے۔ گزرے ہوئے زمانے میں کشمیر میں عطر تیار کرنے کے لیے گلابوں کا استعمال ہوتا تھا۔ مغلیہ عہد کے دوران جھیل ڈل کے کناروں پر واقع باغات میں پیدا ہونے والے بریڈ مشک اور گلاب سے سالانہ

100000 روپے کی آمدنی ہوتی تھی۔ کئی بار کسی امیر ہندو کی چتا پر صندل کی لکڑی (ٹرنڈن) جلائی جاتی ہے اور بہت سے کشمیریوں کا کہنا ہے کہ کشمیر میں صندل کی لکڑی پیدا ہوتی ہے جو ناممکن ہے وادی میں استعمال ہونے والی صندل کی لکڑی باہر سے درآمد کی جاتی ہے۔

صابن اور القلیات

سہور اور کرنش اون کو دھونے کے لیے استعمال کی جاتی ہے جب کہ صابن تیار کرنے کے لیے صنوبر اور گنبار کی القلیاتی راکھ کو زیادہ استعمال میں لایا جاتا ہے۔ اس راکھ سے جو مادہ پیدا ہوتا ہے اسے سز کہا جاتا ہے جب اسے گوشت کی چربی اور ماش کی دال کے آٹے کے ساتھ ملایا جاتا ہے تو اس سے کشمیر میں صابن تیار ہوتا ہے۔

لوبیا کی سُرخ فلیوں کو دھونے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور اس سے اونی کپڑے صاف ہوتے ہیں۔

لکڑی

کشمیر میں جنگلات کا وسیع تر خزانہ موجود ہے جس سے کئی قسم کی لکڑی دستیاب ہوتی ہے۔ اس میں سب سے زیادہ قیمتی لکڑی دیودار کی ہے اگر چہ یہ زیادہ رقبے پر نہیں پھیلی ہوئی ہے۔ دیودار کے تمام جنگلات وادیٔ کشمیر کے شمال مغربی حصے میں واقع ہیں۔ جنگلات کی کاشت کو ٹھیکہ داروں کے حوالے کرنے کی وجہ سے دریا کے نزدیک بہت سے جنگلات کو نقصان پہنچا ہے۔ اور جو قطعات ٹھیکہ داروں سے بچے ہوئے ہیں اُن کے درختوں کو دوسرے لوگ اپنے چارے کی خاطر کلہاڑیوں سے جزوی طور پر کاٹ دیتے ہیں۔ یہ ایک افسوس ناک منظر ہوتا ہے کہ بھاری تعداد میں درختوں کو گرا کر انھیں سڑنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں کشمیر میں جنگلات سے متعلق پرانا انتظامیہ بے رہروی اور کم نظری کا شکار رہا ہے۔ چونکہ ایک سرسبز درخت کے مقابلے میں خشک درخت کا کاٹنا مشکل ہے لہٰذا ٹھیکہ دار بہت ساری لکڑی کو استعمال میں لانے کے لیے تازہ درخت کاٹ دیتے ہیں۔ ایک یورپی فارسٹ افسر کے ماتحت اب ایک نیا محکمہ قائم کیا گیا ہے اور توقع کی جاتی ہے کہ اب جنگلات کی تباہی اور بربادی کا عمل ختم ہوگا۔ کشمیر میں جہاں مکانوں کی تعمیر میں اور ایندھن کے لیے بھی زیادہ سے زیادہ لکڑی کا استعمال ہوتا ہے یہاں کے جنگلات ایک اہم نوعیت

کے حامل ہیں۔ یہ ایک خوش آئند بات ہے کہ جنگلات کے بے تحاشہ کٹاؤ کی وجہ سے لکڑی میں جو زبردست قلت پیدا ہوئی ہے اسے کم کرنے کے لیے شاید درختوں کے بچاؤ کی پھر سے کوششیں کی جائیں۔ یہاں اس بات کو ذہن نشین کرنا چاہیے کہ جنگلات زرعی طبقے کی ضروریات کے تابع ہوتے ہیں اور کوئی بھی ایسا عمل جو کسانوں کے لیے لکڑی کو مہنگا کردے گا لازمی طور پر بے اثر ہو کر رہ جائے گا۔ یہ ایک پُرتجسس بات ہے کہ وادی اور پہاڑوں میں شاہ بلوط کا درخت پیدا نہیں ہوتا۔ ہمالیہ کی سدابہار پہاڑیوں میں، میں نے کبھی کانٹے دار پتوں والے درخت نہیں دیکھے۔

(1) ریاست میں جو بہترین لکڑی پیدا ہوتی ہے وہ دیودار کی لکڑی ہے۔ گھروں، کشتیوں اور پلوں کی تعمیر کے لیے اس کی بھاری مانگ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پانی اس پر اثر نہیں کرتا۔ پرانے عہد کی قدیم زیارتیں دیودار سے تعمیر کردہ ہیں۔ سرینگر کی عظیم جامع مسجد کے اونچے ستون دیودار لکڑی سے ہی ہیں جسے تاشوان کے جنگلوں سے کاٹا گیا تھا۔ تاشوان کا جنگل وہ علاقہ ہے جو موجودہ فتح کدل اور زینہ کدل پلوں کے درمیان واقع ہے اور اب شہر کا حصہ ہے۔ یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ وادی کے بہت سارے حصوں میں نچلی بلندیوں پر دیودار کے درخت اب بھی ملتے ہیں جو لبنان کی کیل کی طرح ہیں۔ ممکن ہے کہ زمانہ قدیم میں دیودار کے درخت شہر کے تمام حصوں میں موجود ہوں گے مگر شہر کی عمارتی ضرورتوں کے پیش نظر ان کو کاٹ کر ختم کردیا گیا ہو۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس وقت وادی کے شمال مغرب کے بغیر ندیوں کے راستوں پر کوئی بھی دیودار موجود نہیں ہے۔ یہ سبھی درخت یا تو کاٹ دیے گئے ہیں یا انھیں پنجاب برآمد کیا گیا ہے۔ دیودار کے مضبوط ستونوں کی کشتی رانوں کی طرف سے زبردست مانگ رہتی ہے۔ گذشتہ دنوں میں انھیں دیودار کے ستون (ہمہ تلی) فراہم کیے جاتے تھے۔ دیودار کی جڑوں سے گندہ بیروزہ نکالا جاتا ہے جسے گڈریے اپنے بھینسوں کے مرہم کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ جن اوکھلوں (کنز) میں دھان کوٹا جاتا ہے وہ دیوار کی لکڑی کے بنے ہوتے ہیں۔

(2) نیلا صنوبر یا کائر کی مکانات کی تعمیر کے لیے بہت قدر و قیمت ہے کیونکہ یہ لکڑی بہت مضبوط ہوتی ہے۔ صنوبر کا سفید بیروزہ (کنگلان) مقامی باشندوں کی طرف سے زخموں پر لگانے اور طبی مقاصد کے لیے مصرف میں لایا جاتا ہے۔ اس درخت کی جڑوں سے ایک قسم کا سیاہ مادہ نکالا

جاتا ہے جسے کلم کہا جاتا ہے۔ کلم کو مرد کاشتکار شالی کے کھیتوں میں کام کرتے وقت اپنی ٹانگوں اور بازؤں پر لگا لیتے ہیں تاکہ وہ موذی آبی کیڑوں سے محفوظ رہ سکیں۔

(3) بھیڑوں پر بھی کلم کے نشانات لگائے جاتے ہیں۔ بلندی پر واقع یار سے روشنی کی جاتی ہے اور ہر گھر میں صنوبر ایک مقدار میں ذخیرہ کیا جاتا ہے تاکہ اُس سے مشعلیں (لش) تیار کی جاسکے۔ صنوبر کے بہت سارے درخت مشعلیں تیار کرنے کے لیے گرائے جاتے ہیں۔ اگر کسی درخت میں خاصی مقدار میں تیل موجود نہ ہو تو اُسے سڑنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یار سے بہترین قسم کا کوئلہ تیار کیا جاتا ہے جسے کشمیر کے آہنگر استعمال میں لاتے ہیں۔

(4) رائیل یا کچھل سے لکڑی حاصل ہوتی ہے جو مکانات کی تعمیر میں استعمال ہوتی ہے۔ اس لکڑی کو اگرچہ زیادہ تر چھتیں بچھانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ کیونکہ جب اسے گیلا کیا جائے تو اس کی مضبوطی کم ہو جاتی ہے۔ اس صاف ستھری لکڑی کے کونوں سے ایک دوائی تیار کی جاتی ہے جسے گز پچل کہا جاتا ہے۔

بُدحل کشمیریوں کے لیے اچھی لکڑی ہے۔ اس پر کام کرنا آسان ہوتا ہے کیونکہ اس پر گانٹھیں نہیں ہوتی۔ چھت کی کڑیوں کے لیے یہ نہایت مفید لکڑی ہے۔ رائل اور بُدحل دونوں قسم کی لکڑی کافی بلندی پر پیدا ہوتی ہیں ان کے درخت 110 فٹ اونچے ہوتے ہیں جن کا گیر 16 فٹ ہوتا ہے۔ عام لوگوں کا خیال ہے کہ جس زمین پر بُدحل کا درخت پیدا ہوتا ہے وہاں پر کوئی مفید کاشت نہیں ہوسکتی۔

(5) پوشہ تھل سے گھروں کی تعمیر نہیں ہوتی ہے مگر چھوٹے چھوٹے کاموں مثلاً پلنگ وغیرہ بنانے کے لیے یہ لکڑی کارآمد ہے۔

(6) 7000 فٹ کی بلندی تک دریا کے کناروں پر سرویا کنزل کا درخت اگتا ہے۔ جس کی لکڑی بہترین فرنیچر بنانے کے کام آتی ہے۔ اس سے ہل بھی بنائے جاتے ہیں اور اچھا ایندھن بھی حاصل ہوتا ہے۔ اس کے ریشے پُل بنانے کے لیے رسوں کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں اور اس کا چھلکا رنگریزی اور چمڑا رنگنے کے کام آتا ہے۔

(7,8) برمن 900 فٹ کی بلندی پر پایا جاتا ہے اور زیارت گاہوں کے لیے یہ نہایت موثر

درخت ہے اس کی بلندی بھی کافی ہوتی ہے اور اس کا گھیراؤ بھی پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ حمل کے گاؤں روہامہ میں، میں نے برن کے دو درختوں کی پیمائش کی۔ زمین سے 5 فٹ کی بلندی پر ایک درخت کا گھیراو 33.6 فٹ اور دوسرے کا 33.1 انچ تھا۔ ہندو لوگ برن کو گنپتی کے تئیں مقدس سمجھتے ہیں جب کہ مسلمان اس درخت کا استعمال طشتریاں (ٹھل) ہل اور عمارتیں بنانے اور ایندھن کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ سوکھے ہوئے برن میں القلی اوصاف پائے جاتے ہیں۔ اس درخت کی نئی شاخیں بھینسوں کی خوراک بنتی ہیں۔ یہ ذائقے دار ہوتا ہے اور یہ بادام سے ملتا جلتا ہے۔

(9) زونب کا استعمال چرخے تیار کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔

(10، 11) بوم سے مضبوط اور کار آمد لکڑی حاصل ہوتی ہے جسے کاشتکار اپنے ہلوں کے دستے اور دیگر آلات کشاورزی تیار کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ کشتی ران چپو بنانے کے لیے اس کی لکڑی کام میں لاتے ہیں۔

(12) اخروٹ کی لکڑی فرنیچر، بندوق کے خولے، ہل اور چرخے تیار کرنے کے لیے کام میں آتی ہے۔ اخروٹ کی سیاہ دانے دار لکڑی حاصل کرنا کافی مشکل ہے۔ اخروٹ کا درخت 5500 فٹ سے 7000 فٹ کی بلندی پر ہر گاؤں میں پایا جاتا ہے مگر بہت سے مقامات پر پرانے درخت خستہ حالی کی علامت ظاہر کرتے ہیں اور لوگ ان کے از سر نو کاشت کے لیے کوئی کوشش نہیں کرتے۔ اخروٹ کے درخت کے بارے میں مزید تفصیلات زراعت کے باب میں بیان کی جائے گی اور یہاں پر یہ تذکرہ برمحل ہوگا کہ جنگلی اور مقامی اخروٹ سے جو گری حاصل ہوتی ہے اسے ابالنے کے بعد تیل نکالا جاتا ہے۔

کشمیر کی سرزمین اخروٹ کی کاشت کے لیے بہت موافق ہے اور لوگوں پر پرانے درختوں کو تبدیل کرنے کے لیے پیہم دباؤ ڈالنا ضروری ہے۔

اہالو خود کو اخروٹ کے ساتھ وابستہ رکھتا ہے اور لوگ اس کو الگ کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ ان کا کہنا ہے کہ بلبل کو اس کی دل پسند خوراک سے محروم کرنا ظالمانہ ہوگا۔ اخروٹ کا درخت بھاری بھرکم ہوتا ہے۔ ٹکر کے گاؤں میں زمین سے 5 فٹ کی بلندی پر تین درختوں کا محیط بالترتیب 14 فٹ 11 انچ، 15 فٹ 2 انچ اور 16 فٹ 4 انچ تھا۔ میں نے گوگلوسہ میں ایک

درخت کی پیائش کی تو معلوم ہوا کہ اس کا محیط 18 فٹ 10 انچ تھا۔

(13) بان کی لکڑی کافی مقدار میں فرنیچر، جوتے اور چرخے تیار کرنے میں کام میں لائی جاتی ہے۔

(14) وِرن کا استعمال چرخے اور چمچے تیار کرنے میں استعمال کیا جاتا ہے۔ ڈوئی چمچہ جس سے چائے نکالی جاتی ہے ہمیشہ وِرن سے تیار کیا جاتا ہے۔

(15) برِج کا درخت قبرستانوں اور زیارت گاہوں میں پایا جاتا ہے۔ کبھی کبھی یہ بہت اونچا ہو جاتا ہے میں نے اردوہامہ لولاب میں ایک درخت کی پیائش کی جس کا محیط زمین سے 5 فٹ کی بلندی پر 9 فٹ 3 انچ تھا۔ اس کی لکڑی ہلوں کے طوق کے لیے استعمال کی جاتی ہے کیونکہ یہ نرم اور ٹھنڈی ساخت کی لکڑی ہوتی ہے۔

(16) رنگ کو تیل نکالنے کے لیے پریس میں روڑروں کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور وہ ڈنڈے تیار کیے جاتے ہیں جن سے دھان او کھلی میں کوٹا جاتا ہے۔ اس کی لکڑی بہت سخت ہوتی ہے۔

(17، 18) سفیدے کا درخت (Poplor) کی لکڑی کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی ہے، پھر بھی غریب لوگ خاص کر شہروں میں اس کا استعمال کرتے ہیں۔ سفیدے کا درخت 5000 فٹ سے 5500 فٹ کی بلندی پر اگتا ہے۔ کشمیر کے لوگ اس درخت کو میدانوں کے شاہی درختوں کا وزیر مانتے ہیں۔ کشمیر میں اس درخت کی بہت قسمیں ہیں جن میں کابلی پھرلیس بے حد خوبصورت ہوتا ہے جس کا تنا سفید اور پتے چاندی کی طرح ہوتے ہیں۔ سرینگر، اسلام آباد اور بارہ مولہ کے پاس سفیدے کے درخت کی کئی ارضی قطعات ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس درخت کی ترویج یہاں پر مغلوں نے کی۔ زیارت گاہوں کے نزدیک کابلی پھرلیس ہمیشہ پایا جاتا ہے۔ وادی گریز میں داخل ہوتے ہی سفیدے کے درختوں کا جھنڈ ایک دلفریب نظارہ پیش کرتا ہے۔ گریز کا سفیدہ دودہ پھرلیس ہوتا ہے جو کافی بلندی تک پہنچتا ہے۔ ایک سفیدے کی پیائش سے پتہ چلا کہ اس کی بلندی 197 فٹ اور محیط 14.5 فٹ ہے۔

(19) کنز بلند علاقوں میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کی لکڑی ہل بنانے اور ایندھن کے لیے کام

میں لائی جاتی ہے۔ مگر ابھی تک اس درخت سے سیکرل نہیں نکالا گیا ہے۔ میں کشمیر میں کھانڈ سازی کے لیے کنز کی ترویج کا ذکر نہیں کروں گا۔ بلند سطحوں پر کنز اور دیگر درختوں کے آبی قطعات سیاہ مائل سبز رنگ کے شمشاد درختوں کے ساتھ خوبصورت فضا پیش کرتے ہیں۔

(21،20) بید کا درخت لکڑی نہیں دیتا اور کشمیر میں بید کی قیمتی شاخوں کو زیادہ تر ضائع کیا جاتا ہے۔ اس کا مواد کرسیاں اور ٹوکریاں بنانے کے لیے بہت مقدار میں موجود ہے۔

(22) بُرزہ کا درخت انسانی آبادیوں سے دور اگتا ہے۔ اس کی نرم لکڑی اب تک مصرف میں نہیں لائی گئی ہے اور اس سے بہترین ایندھن حاصل ہوتا ہے۔

(23) پوہ سے سخت لکڑی حاصل ہوتی ہے اور اس کے سخت موٹے ڈنڈوں سے چاول کوٹا جاتا ہے۔ پوہ کے ستونوں کا استعمال مکانوں کی تعمیر میں بھی کیا جاتا ہے۔ دیوار کے ستونوں کی عدم موجودگی میں میں نے جو کے کھیتوں میں پوہ کا استعمال دیکھا ہے۔

(24) بُونی یا چنار ایک شاہی درخت ہے اور اخروٹ کی طرح یہ حکومت کی ملکیت ہے۔ کئی برس گزر جانے کے بعد مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ لوگوں نے دیہاتوں میں بے شمار چنار اگائے ہیں۔ اس درخت کا سایہ بے مثال ہوتا ہے۔ جب زمین موافق ہو تو اپنے جڑوں کے نزدیک پانی کے حصول سے یہ بہترین شکل وصورت اختیار کرلیتا ہے۔

عمر رسیدہ ہونے پر چنار خستہ ہوتے ہیں۔ نسیم باغ کے بہت سارے اچھے چنار کھوکھلے ہو چکے ہیں۔

کشمیریوں کے خیال میں ایک چنار کی عمر کی حد 300 برس ہے۔ مگر جب چنار سب سے اونچائی تک جاتا ہے تو اس کے بعد اس کے گھیرے میں سوراخ پیدا ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ چنار کے بہترین درخت چنار باغ میں لنگر بُونی کے مقام پر پائے جاتے ہیں۔ میں نے لولاب میں ایک ضخیم چنار کی پیائش کی جس کا محیط زمین سے 5 فٹ کی اونچائی 63.5 فٹ تھا۔ چنار کی لکڑی کا استعمال خاص طور پر تیل لگانے کے بیلن بنانے کے کام آتا ہے۔ فرنیچر تیار کرنے کے لیے بھی یہ لکڑی موزوں ہے۔ اس کی لکڑی اور اس سے تیار کردہ کوئلے کو کشمیر میں بہترین ایندھن تصور کیا جاتا ہے۔ چنار کے بہت سارے درخت بیج نہیں دیتے مگر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ چند درختوں

نے اچھے بیج پیدا کیے ہیں۔

دریائے جہلم کے کنارے پر بارہ مولہ سے دو دن کی مسافت کے بعد سے چنار دکھائی دیتے ہیں جن کا بیج دریا اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا ہے۔ اسی قسم کا عمل سرینگر گلمرگ راستے پر ماگام اور ریرم کے درمیان دیکھا جا سکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ سفیدے کی طرح چنار کو بھی مغلوں نے کشمیر میں لایا۔

(25) شہتوت کی لکڑی کا استعمال مقامی لوگ زیارت گاہوں کے دروازے اور ہل بنانے کے لیے کرتے ہیں۔ یورپی باشندوں نے اس لکڑی کا استعمال کشتیاں تیار کرنے کے لیے کیا ہے۔ لچکدار ہونے کی وجہ سے یہ لکڑی مُڑھا ہوا فرنیچر تیار کرنے کے لیے موزون ہے۔ اس سے بہترین ایندھن حاصل ہوتا ہے مگر شہتوت کے درخت کو شاید کاٹا نہیں جاتا کیونکہ ابریشم کاری کے لیے اس کا تحفظ کیا جاتا ہے۔ اس درخت کی ابریشمی صلاحیت کے پیش نظر یہ پابندی خوش آئند اقدام ہے۔ جب کہ عام آدمی کے مویشیوں اور بھیڑوں کے لیے یہ درخت بھاری مقدار میں غذا فراہم کرتا ہے۔ شہتوت کا درخت کافی لمبی عمر پاتا ہے۔ اندر ہامہ لوالاب میں ایک درخت کی پیمائش سے زمین سے 5 فٹ کی بلندی پر اس کا محیط 30 فٹ دیکھا گیا ہے۔

(27،26) سیب کے درخت سے ہل تیار کرنے کے علاوہ اول درجے کا ایندھن بھی حاصل ہوتا ہے۔

(28) لیون سے بہترین اون حاصل ہوتا ہے۔

(29) چول ایک نایید درخت ہے جو 6000 فٹ سے 7000 فٹ کی بلندی پر پیدا ہوتا ہے۔ اس سے بہترین قلم دان بنائے جاتے ہیں اور سلیٹوں کے بجائے تکیاں بنانے میں یہ معاون ثابت ہوتا ہے۔

(30) برِی سے سرخ رنگ کی سخت لکڑی حاصل ہوتی ہے اور کشمیر کے امیر لوگ اس سے کرسیاں، سروں اور بالوں کی کنگھیاں بنانے کے معاملے میں اس کی کافی قدر کرتے ہیں۔ بہت سی زیارت گاہوں کی تہہ بندھیاں اسی درخت کی ہوتی ہے۔ یہ درخت سرینگر میں درگجن میں پیدا ہوتا ہے مگر یہ عام طور پر نہیں ملتا۔

(31) ارکھور اس زہر آلود درخت کو کوئی بھی نجار ہاتھ لگانے کی جرت نہیں کرے گا کیونکہ اگر سرسبز ارکھور کو چھوا جائے تو اس سے خطرناک آبلے پیدا ہو جاتے ہیں۔ جاپان میں اس درخت کی رس بیری سے موم بتیاں تیار کی جاتی ہیں مگر کشمیر میں اس کا کوئی فائدہ نہیں۔

(32) وتل کے درخت کی سرخ رس بیریاں ہوتی ہیں اس سے چمچے اور کنگھے تیار کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

(33) خمیر، اجوائن یا سے عام طور پر خمیر بنایا جاتا ہے اور پانپور کی مشہور و معروف روٹی اسی خمیر سے بنائی جاتی ہے جسے انتہائی پوشیدہ رکھا جاتا ہے۔

(34) آمیزشات۔ سدا بہار درخت کے چھلکے اور سٹرابیری کی جڑوں کو چائے کے لیے آمیزش یا متبادل طور پر مصرف میں لایا جاتا ہے۔

(35) یتک پتر کے خشک پتوں کو گل کے ساتھ ملا کر چھینک مارنے کے عمل کو تیز کیا جاتا ہے۔

(36) مور مُجھ کے بیج میں بیجوں کی آمیزش کی جاتی ہے۔ اقتصادی فائدوں کے حامل پودوں کی مکمل فہرست اور نہیں بڑھائی جاسکتی۔ میں نے ان پودوں کا ذکر کیا ہے جن کے بارے میں دیہاتی لوگوں نے مجھے بتایا۔ ایسے بہت سارے اور بھی پودے ہوں گے جن میں ماہر نباتات کو دلچسپی ہوگی۔

وادی کے درختوں اور پودوں کا تذکرہ بہت سی کتابوں میں موجود ہے مگر میں صرف ان پودوں کے بارے میں جانتا ہوں جن کی فہرست ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے۔ میرے دوست جے پی ڈوتھے ڈائرکٹر آف باٹنیکل سروے آف انڈیا کی مہربانی سے میں ان پودوں کی فہرست شائع کر سکا ہوں جو گلمرگ کے آس پاس پائے جاتے ہیں۔ اس فہرست میں عام قسم کے ان چند پودوں کا ذکر موجود نہیں ہے جو گلمرگ اور وادی کے دیگر مرغزاروں میں موجود ہیں۔ میرا یہ تذکرہ مستقبل کی تحقیق کے لیے ایک اچھی بنیاد ثابت ہوسکتا ہے۔

●❋❋❋●

پانچواں باب

حیوانات

کشمیر کی وادی ان لوگوں کے لیے بے حد دلکشی کے سامان فراہم کرتی ہے جو شکار میں دلچسپی رکھتے ہوں۔ یہاں پر حیوانات کی کئی قسمیں موجود ہیں۔ اگر چہ آمد و رفت کی سہولتوں اور سیاحوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کی وجہ سے ماحول پر منفی اثرات پڑے ہیں لیکن جو لوگ شکار کی خواہش رکھتے ہیں وہ ان دور دراز علاقوں میں جا کر شکار کریں جو دور دراز علاقے ہنر ہائینس مہاراجہ کے زیر انتظام ہیں۔

1890 میں بڑے شکار کی تعداد میں کمی ہونے کی وجہ سے حکومت کو بارہ سنگھا، پہاڑی بکرے اور کستوری ہرن کی حفاظت کے لیے کچھ ایسے قانون بنانے کی ضرورت پڑی جو مہاراجہ رنبیر سنگھ کے بعد ملتوی کیے گئے تھے۔ جہاں تک حکومت کا سوال ہے وہ صرف چند خاص علاقوں کی نگرانی کر سکتی ہے جن میں عام لوگوں کو خاص اجازت کے بغیر شکار کرنے کی ممانعت ہے۔ شکار میں کمی کی یہ بھی وجہ ہے کہ موسم سرما میں مادہ آہو کا قتل عام ہوتا رہا ہے جب سردیوں میں برف کی تہہ موٹی ہو جاتی ہے تو مادہ آہو موسم کی سختی سے بچنے کے لیے دیہاتوں کی طرف ہجرت کرتی ہے تا کہ وہاں اسے آسانی سے خوراک مل سکے۔ لیکن کشمیر کے لوگ ہرن کے لذیذ گوشت کے لالچ میں تمام قواعد کو بالائے طاق رکھ کر انھیں ہلاک کر دیتے ہیں یورپی لوگوں کو اگر چہ اس کا زیادہ

احساس ہونا چاہیے تھا مگر وہ بھی برف پر ایک کرسی پر بیٹھ کر بارہ سنگھوں کی سواری کرتے ہیں حالانکہ یہ ممنوع ہے۔ امید کی جاسکتی ہے کہ کشمیر کے خوبصورت بارہ سنگھوں کو نقل مکانی سے بچایا جاسکتا ہے۔ چند سال قبل اس تعلق میں ایک معاملہ منظر عام پر آیا کہ ایک شخص نے برف پر بارہ سنگھوں کے ساتھ اپنی کرسی باندھ کر اس پر سواری کی اور چودہ بارہ سنگھوں کو ہلاک کر ڈالا۔ حکومت کشمیر نے اب جو قواعد تیار کیے ہیں ان کے سبب ان کی حفاظت بھی ہو سکے گی۔ حالانکہ شکار کے قابل حیوانات کے تحفظ کے مفادات کے مقابلے میں ریاستی حکومت تعاون دینے کی متمنی ہے اور اسے اس امر کا بجا طور پر احساس ہے کہ اسی شوق کے سبب یورپی سیاح کشمیر کی طرف مائل ہوتے ہیں جن کی خاطر و مدارات کر کے ہنر ہائینس ان کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ مگر میں نہیں سمجھتا کہ شکار کے تحفظ کے معاملے میں جب تک کوئی اطمینان بخش بنیاد ہوگی جب تک شکار کے قابل جانوروں پر کنٹرول کے لیے کسی انجمن کا قیام عمل میں نہ آئے تو ایک صحت مند رائے عامہ تیار ہوگی۔ جس سے ایک تو شکار کے مجموعی قتل عام کا انسداد ہوگا دوسرے غیر واجب رجحانات پر قابو پایا جا سکے گا۔ یہ سوال اس لیے بھی خاص اہمیت کا حامل ہے کیونکہ کشمیر اور اس کے نواحی پہاڑوں کے تئیں ان برطانوی آفیسروں کے لیے بھاری کشش ہے جو ہندوستان میں ملازمت کر رہے ہیں اور یہ ایک افسوس ناک امر ہوگا کہ چند متوالے شکاریوں کے خود غرض اور بے شعور رویے کی وجہ سے شکار غائب ہو جائے۔ کشمیر کے پہاڑوں میں شکار کی پناہ گاہیں، جو ایک سپاہی کے آرام و سکون کی خاطر نہایت موافق ہے، اوراق پارینہ بن کر رہ جائیں گی۔

یہی کیفیت چکور کے معاملے میں صادر آتی ہے۔ مقامی باشندے ہمیشہ اس سن و سال کا حوالہ دیتے ہیں جب چکور کو وسیع پیمانے پر تباہ کرنے والا عنصر کشمیر میں وارد ہوا اور اسی وقت سے وادی میں چکوروں کا فقدان رہا ہے۔ بہر حال انصاف کے تقاضوں کے مدنظر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ بڑے شکار کی طرح چکور کے معاملے میں بھی مقامی شکاری اور پونچھ کے بلا اجازت آنے والے چرواہے اس شکار کی تخفیف کے ذمہ دار ہیں۔ موسم سرما کے دوران چکور نرم نرم برف کی طرف دھکیل دیے جاتے ہیں اور ان کو کمبلوں میں ڈھک کر دبوچ لیا جاتا ہے۔ عام طور پر انھیں دانے پھیلا کر راغب کیا جاتا ہے۔ اور تب ان پر گولی چلائی جاتی ہے جس سے چند چکور ہلاک اور

بہت سارے مجروح ہو جاتے۔ اگر ان پر گولی باری یکم ستمبر کو شروع ہو تو بہتر ہے جب کہ اس وقت یہ گولہ باری 12 یا 15 اگست کو شروع ہوتی ہے۔ جب پرندے اناج کی پکتی ہوئی فصلوں کے اندر ہوتے ہیں جب مادہ پرندہ اوپر اٹھتا ہے تو اسے گولی ماردی جاتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو سنبھال نہیں سکتی اور لومڑیوں کی شکار ہو جاتی ہے۔ دوسرے معاملات کی مانند شکار کے معاملے میں بھی اخلاق کے تقاضوں کو مدنظر رکھنا لازمی ہے کہ بارہ سنگھوں اور دوسرے حیوانات کے قلع قمع کے عمل کو بند کیا جائے۔ فی الحال ریاست اور نواحی ریاستوں کے جنگلات سے خاص طور پر جہاں تک شکار کا تعلق ہے حکومت کو کوئی آمدنی حاصل نہیں ہوتی مگر جیسے جیسے وقت گزرتا جارہا ہے اور مواصلات میں بہتری کے ساتھ کشمیر ہندوستان اور یورپ کے نزدیک تر آتا جارہا ہے عین ممکن ہے کہ کشمیر میں واقع ایک 'نالہ' تک بھی کرایہ طلب کرے جیسا کہ اسکاٹ لینڈ میں ایک دلدل سے حاصل ہوتا ہے۔ فی الحال کشمیر کے حکمران کے ذہن میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ یورپی لوگ جب تک کشمیر میں رہیں کم از کم خرچ میں اور زیادہ سے زیادہ آزادی کے ساتھ لطف اندوز ہوں۔ مگر شکاریوں کی بڑھتی تعداد اور شکار کے دن بدن فقدان کے سبب کشمیر کی بارونق شکارگاہیں چاند ماری کے لیے کرایہ کے میدان بن کر رہ جائیں گی۔ بہرحال اس بات کو ملحوظ خاطر رکھنا جانا چاہیے کہ موجودہ حالت میں ایک 'نالہ' بھی اطمینان بخش سرمایہ کاری کے لیے محفوظ نہیں ہوگا جیسے جیسے ایک بکروال اپنے ریوڑوں کو ان تنگ گھاٹیوں سے ہانکتا ہے، جہاں موسم گرما میں بارہ سنگھے قیام کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ کہا گیا ہے کہ بارہ سنگھے اب کشتواڑ، بھدرواہ اور یہاں تک کہ دور دراز چمبہ کے علاقوں کی طرف جارہے ہیں۔ اگر کشمیر میں شکار کے تحفظ اور باقاعدگی کے لیے انجمنوں کا قیام ہوگا تو شکاریوں کو لگام ڈالنے کے معاملے میں کچھ نہ کچھ کیا جاسکتا تھا۔ فی الحال برگزیدہ اور تجربہ کار شکاریوں کو جعل سازی کی طرف سے پس پردہ دھکیلا جارہا ہے۔ وہ مقامی ایجنٹوں اور سرینگر کے ساہوکاروں کی مٹھی گرم کرکے ملازمت حاصل کرلیتے ہیں اور اب وہ ہر شخص جو پٹیاں اور کمربند باندھ کر ادھار کی اسناد کا ایک بنڈل جمع کرلیتا ہے شکاری کے طور پر ملازمت حاصل کرسکتا ہے۔ نئے فیشن کے شکاری اس مملکت میں طاعون کی مانند ہیں۔ وہ اپنے آقاؤں کو لوٹتے ہیں، دیہاتوں کو لوٹتے ہیں کیونکہ رسدات کے لیے انھیں وہ شاذ و نادر ہی قیمت ادا کرسکتے ہیں۔ یہ شاید اتفاق

ہی ہوگا کہ اپنے مالکوں کے سامنے وہ اپنے معاملات کا مظاہرہ کر سکیں۔ میں نے شکاریوں کے ساتھ اس سوال پر بحث کی ہے۔

یورپی ہو یا مقامی، سبھی اس امر پر متفق ہیں کہ شکاری کو ایک کمیٹی کی طرف سے اہل قرار دے کر اس کا اندراج کیا جانا چاہیے۔ جہاں تک شکار کے تحفظ کا سوال ہے، اس سے زیادہ سہل کوئی بات نہیں ہوسکتی کہ ہر کشمیری اپنے اپنے ہمسایہ کی بابت اطلاعات فراہم کرتا ہے۔ اپنے ہمسائے کے ہاں ہرن کے گوشت کی دعوت دیکھ کر وہ کمال کی سرعت کے ساتھ پولیس کے پاس اس کی اطلاع بہم پہنچاتا رہے۔ چنانچہ اس قسم کی انجمن پر زیادہ اخراجات درکار نہیں ہوں گے اور اس سے حکومت کو بھاری آمدنی حاصل ہوگی، اگر ہر تین برس کے بعد مُشک آہو کے شکار اور ان کے مال کی فروخت کی اجازت دے دی جائے تو اور بھی اچھی خاصی آمدنی ہوگی۔

کشمیر میں پائے جانے والے دودھ پلانے والے جانوروں کی فہرست اب میں ذیل میں پیش کرتا ہوں۔ اس رپورٹ میں دیگر ابواب کی طرح وادیٔ کشمیر کے احاطے میں کلیدی وادی کے علاوہ طرفین کی وہ وادیاں شامل ہیں جن کا پانی بارہمولہ سے اوپر دریائے جہلم میں گرتا ہے۔ معقولاتی نشانات کے درمیان دیے گئے نوٹس کے لیے میں کرنل اے وارڈ کا ممنون ہوں جو کشمیر اور پہاڑی شکار کے معاملے میں ایک اتھارٹی ہیں۔

جنس لنگور

بنگالی بندر، کشمیری پونر 8000 فٹ سے 9000 فٹ کی بلندی تک چڑھتا ہے مگر اکثر اوقات 6000 فٹ یا اس کے نیچے پایا جاتا ہے۔ بلینڈفورڈ اس بندر کو کشمیری میں واند رکھتا ہے جب کہ بہت سارے شکاری اسے لنگور کے نام سے پکارتے ہیں پونزوادی کشمیر کے شمال مغرب میں عام طور پر پایا جاتا ہے جہاں بندروں کی فوج فصلوں کو بھاری نقصان پہنچاتی ہے، یہ کافی نڈر اور بےخوف ہوتے ہیں۔

(2) ہمالیائی لنگور غالباً وہ بیرونی ہمالیہ میں 6000 فٹ سے تب تک نیچے نہیں اترتے جب تک کہ موسم کے دباؤ کے سبب انھیں مجبور نہ ہونا پڑے۔ یہ Entellus سے قدرے مختلف ہے جسے ایک قسم تصور کیا جاتا ہے، میں نے موسم سرما میں سندھ اور لدر اور وندوار میں بھاری تعداد میں

ہمالیائی لنگور دیکھے ہیں۔

میں نے وادیٔ سندھ میں جو لنگور دیکھے ہیں وہ شملہ میں دیکھے گئے لنگوروں کی نسبت قدرے چمکدار اور سرخی مائل رنگ کے مالک ہیں۔ مقامی لوگ ہمیشہ انھیں ولقد رکبہ کر پکارتے ہیں اور ان کی جارحیت کے قصے سناتے ہیں۔ عموماً دو یا تین سے زیادہ لنگور اکیلے شخص پر یلغار کرتے ہیں۔

کنبہ بلی

1۔ چیتا کشمیری ببہ نے ان پہاڑیوں میں انسانی گوشت کھانا شروع کر دیا ہے۔ میری دانست میں اس قسم کے دو واقعات رونما ہوئے۔ ایک نہایت ضدی قسم کے وحشی جانور نے لدر میں بہت سارے لوگوں کو ہلاک کر دیا اور دوسرا واقعہ سندھ میں پیش آیا۔

2۔ پہاڑی یا برفانی چیتا کشمیری لوگ اسے سفید چیتے کے نام سے پکارتے ہیں۔ چند لوگوں نے اسے ببہ کا نام دیا ہے۔

جس علاقے کے بارے میں یہ کیفیت بیان کی جا رہی ہے وہاں پہاڑی چیتا بہت کم پایا جاتا ہے۔ براری آنگن سے لے کر اوپری سندھ تک محض چند ایسے مقامات ہیں جہاں مجھے اس کی موجودگی کے بارے میں واقعہ معلوم ہے۔ لدروٹ میں میرے سامنے ایک کھال لائی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شکار تارسر کے نزدیک مارا گیا تھا۔

یہ خوراک کے لیے بھیڑوں کو ہلاک کرتا ہے مگر چیتے کے برابر خونخوار نہیں ہوتا۔ دو ایک پہاڑی چیتے نرستان کی پہاڑیوں پر دیکھے گئے ہیں۔ قدرتی طور پر وہ پہاڑی بکروں کا شکار کرتے ہیں۔ ایسے پہاڑی بکرے براری آنگن میں بچے کھچے رہ گئے ہیں۔

نر پہاڑی چیتا 4 فٹ لمبا ہوتا ہے اور اس کی دُم 3 فٹ ہوتی ہے اور ہاگسن کی F. Partichra نمائندگی کرتی ہے۔ میں نے اس کے صرف دو نمونے دیکھے ہیں اور سرینگر میں فروخت کی جانے والی ان حیوانات کی کھالیں وادیٔ کشمیر کے حیوانات کی نہیں ہوتیں۔ جنگلی بلی وادی میں پائی جاتی ہے اور اس کی کھالیں سرینگر میں فروخت ہوتی ہیں اس کی ہیئت مختلف قسموں میں مختلف ہوتی ہے اور وزن 12 سے 18 پونڈ ہوتا ہے۔ Waved Cat میری دانست میں واحد قسم ہے جو سر اوینٹ جان کو ملی تھی۔ اس کا رنگ اوپر سے بھورا اور نیچے سے بادامی بھوررا ہوتا ہے۔ مگر

ی لنڈ فورڈ کا کہنا ہے یہ مختلف النوع ہے۔

کنبہٴ کاتستان

کلیدی وادی میں ہندوستان کی ساخت کا چھوٹا نمس (کشمیری زبان میں نول) وادی میں عام طور پر پایا جاتا ہے۔

کنبہ سگ

بھیڑیا کرنل وارڈ نے کشمیر میں کبھی بھی کہیں بھیڑیا نہیں دیکھا تاہم اس کا خیال ہے کہ یہاں بھیڑیے پائے جاتے ہیں(1)۔ چند انگریزوں نے مجھے بتایا کہ انھوں نے بھیڑیے دیکھے ہیں او رگڈریوں نے مجھے بتایا کہ بھیڑیوں کو کشمیری میں رامہ ہُون کہا جاتا ہے۔ وہ بہت حد تک ناپید ہیں مگر جب کبھی پہاڑوں میں وہ ان کے ریوڑوں پر یلغار کرتے ہیں تو بھاری نقصان پہنچاتے ہیں۔

تبت اور لداخ میں Canis Laniger عام طور پر پایا جاتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ یہ C.Lupus کی ایک قسم ہو۔ سیاہ قسم کی کمی نہیں ہے۔ گیدڑ (کشمیری زبان میں شال) کشمیر میں عام طور پر پایا جاتا ہے۔ گیدڑ کی بہت ساری اقسام جب بھیڑوں کو دیکھتی ہیں تو وہ انھیں ہلاک کر دیتی ہیں۔ اس قسم کی ہلاک شدہ بھیڑیں میں نے گاندربل، شادی پور، بجبہاڑہ کے علاقہ کو تسو(لدر) میں دیکھی ہیں۔

جنگلی کتا، بلتھ اور جیرڈن کے (کشمیری رامہِ ہُون)۔ میں نے اسے چرس کے کھیتوں کے قریب دیکھا ہے جب کہ دوسروں کو ہمل میں پایا ہے۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ مغربی وادی میں اس قسم کی کئی اقسام ہیں۔ دُور دراز نالوں میں یہ عام طور پر پائے جاتے ہیں۔

عام طور پر ان کا وزن 25 سے 30 پونڈ ہوتا ہے۔ مجھے معلوم ہوا کہ ایک ہی جنگلی کتا ایک بھیڑ کو ہلاک کر دیتا ہے مگر اس پر میں نے کچھ فاصلے تک سواری کی مگر نالہ آنے پر کھینچ لیا گیا۔

عام لومڑی بلتھ کی ایک قسم ہے۔ چند برس پہلے کی نسبت اب لومڑیاں کشمیر میں ناپید ہیں۔ یہ نہایت راسخ دماغ شکاری ہے اور بھاری تعداد میں چکوروں کو مار ڈالتی ہے اس کی لمبائی 2 فٹ ہے اور بالوں کے سمیت دُم 19 انچ ہے۔

کشمیر میں لومڑی کو لوہ کے نام سے جانا جاتا ہے جس کی شاندار چمڑی ہوتی ہے۔ جس کا

برش اچھا ہوتا ہے۔لومڑی پھل، بیر، پرندے اور چھوٹے جانور کھاتی ہے۔

شجرۂ قطب شمالی

ہندوستانی نیولا چیڑوں میں پایا جانے والا نیولا بہت چست درختوں پر چڑھ جانے والا اور بہت خطرناک ہوتا ہے۔ایک بار میں نے اسے کاج ناگ میں مشک آہو کا شکار کرتے ہوئے اور دوسری بار گڑھوال میں دیکھا۔

سفید ابابیل درحقیقت میں نے اس قسم کا نیولا کشمیر میں نہیں دیکھا مگر اس کی کھال دیکھی ہے جو کشمیر سے حاصل کی گئی تھی۔لداخ، بلتستان اور کماؤں میں یہ عام طور پر پائی جاتی ہے اور یہ بات باور کرنے کی وجہ نہیں کہ وادی کے نواح میں یہ نہیں پائی جاتی۔

سفید ناک والا نیوالا میں نے اسے آڑو کے اوپر مسجد نالا میں پایا۔اس کے علاوہ دوسرے نمونے بھی دیکھے۔

کتی کلبہ اصغر

سیاہ ریچھ (کشمیری ہاپُت) اس کا قدیم نام ہے جس کو غلطی سے سیاہ ریچھ تصور کیا جاتا تھا مگر تبت میں سیاہ ریچھ موجود نہیں ہوتا۔

میں نے لمبے سے لمبا سیاہ ریچھ 16.5 فٹ دیکھا ہے مگر لوگوں کا عقیدہ ہے کہ ریچھ کا زیادہ شکار نہیں کیا جاتا ہے۔سیاہ ریچھ پہاڑیوں کے مخصوص مقامات پر جا کر بس گیا ہے جب کہ عمر رسیدہ مادہ ریچھ بلند مقامات پر دیکھے گئے ہیں۔میں نے اپریل 1892 میں لدروٹ کے مقام پر ایک سیاہ ریچھ پر گولی داغ دی۔

سیاہ ریچھ (بومبا ہاپُت) بہت عام ہے اور خاص طور پر وادی لولاب میں پایا جاتا ہے۔سرخ ریچھ کے مقابلے میں یہ زیادہ خوف ناک ہوتا ہے اور دیسی مکئی والے کھیتوں میں اکثر یہ دیہاتیوں پر دھاوا بول دیتا ہے۔سرخ ریچھ کی مانند یہ ریچھ جزوی طور پر گوشت کھاتا ہے مگر زیادہ تر یہ ریچھ مکئی اور چاول کے علاوہ اخروٹ،شہتوت، جڑیں اور بیری کھاتا ہے۔ریچھ سے متعلق کشمیریوں کے پاس بہت سارے محاورے ہیں جن کی تمام تر بنیاد اس حیوان کی حماقت پر ہے مثلاً (ہاپت یارز) ریچھ کے ساتھ دوستی کر کے آدمی ہمیشہ مصیبت کا شکار ہوتا ہے کیونکہ اس کا دوست (ریچھ) غلطی

کرتا ہے۔ ظاہراً سیاہ ریچھوں کی تعداد میں زیادہ کمی واقع نہیں ہوئی ہے اور ان کی کمی کی وجہ سے فصلوں کو بھاری نقصان پہنچا ہے۔ 1871 میں ایک رجمنٹ کے چار افسر 80 کھالیں لے گئے جن میں سے نصف جانور انسان کی طرف سے چلائی گئی بندوقوں کے شکار ہوئے۔ مگر بہت سارے ایسے ریچھوں پر دیہات کے نزدیک گولی داغی گئی جن کا دماغ ٹھیک نہیں تھا۔ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ بعض اوقات سیاہ ریچھ عورتوں کو اٹھا کر جنگل میں لے جاتا ہے۔ وہ لوگ اس کی بہترین تدبیر سازی کے قصے بیان کرتے ہیں۔ حملہ تیار کرنے کے لیے وہ کس طرح جھاڑیوں کو باندھتا ہے اور کئی بار کس طرح وہ اپنی مادہ ریچھوں کو باندھ دیتا ہے۔

بھورا یا سرخ ریچھ (کشمیری شکاریوں کا ووڑل ہاپُت) کافی حد تک ناپید ہو چکا ہے مگر اب بھی مانوس نہیں ہے۔ عمر رسیدہ ریچھ قدرے شرمیلے ہوتے ہیں اور جب تک سورج غروب نہ ہو جائے سامنے نہیں آتے۔ بڑے مادہ جانور کی لمبائی 7 فٹ ہے۔

یہ جانور کشمیر میں عام طور پر پایا جاتا ہے اور اسے کنہ ہاپُت کہتے ہیں۔ ریچھ خوشبو کا متوالا ہوتا ہے مگر اس کے ساتھ کوتاہ بین بھی ہے۔ جزوی طور پر یہ جڑی بوٹیاں کھاتا ہے مگر یہ جانور گوشت خور بھی ہے۔ سرخ ریچھ ہر سال بہت سارے مویشیوں کو ہلاک کر دیتے ہیں۔ اس کی لمبائی 7 فٹ سے قدرے زیادہ ہے۔ اونچائی 3 فٹ 4 انچ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سرخ اور سیاہ ریچھ باہمی طور پر نسل کشی کرتے ہیں۔

کلبہ موش

بھورا مشک چوہا اور آبی چوہا چند اطراف کی وادیوں میں پایا جاتا ہے۔ میں نے ایک چوہا آڑو دریا میں مارا مگر بدقسمتی سے مزدور نے اسے ضائع کیا۔ جرڈن ہمالیائی آبی چوہے کو دارجلنگ اور بلینڈفورڈ اسے جنوب مشرقی ہمالیہ سے وابستہ بیان کرتا ہے۔ میں نے کشمیر کے بہت سارے حصوں میں آبی چوہے دیکھے ہیں۔

شجرۂ پروازی حیوانات

پروازی لومڑی (چمگادڑ) میں نے اس چمگادڑ کو باہری خطوں میں دیکھا ہے۔ اس کا مقامی نام دڑھ گگر ہے اور وادیٔ سندھ میں یہ عموماً پایا جاتا ہے۔ اس کی نرم اور ہلکی پشم ہوتی ہے، جس سے

کمبل تیار ہوتے ہیں۔

کشمیر میں بہت سارے کرم خور چمگادڑ ہیں مگر میں نے ان کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ کشمیر کے غاروں میں رہنے والی چمگادڑ یا جو یورپ کی عام چمگادڑ ہیں اور دوسروں کا تذکرہ خاص طور پر Fauna of British India کے کشمیر سے آئے حیوانات میں کیا گیا ہے مگر چمگادڑوں کے بارے میں اس کے سوائے میں کچھ نہیں لکھوں گا جو مجھے کتابوں سے حاصل ہوا ہے۔ مزید معلومات کے لیے جرڈن اور بلینڈفورڈ کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

کلبہٴ گلہریاں

پرواز کرنے والی سُرخ گلہری کشمیر کی گلہری ہے یہ عام طور پر پائی جاتی ہیں اور ماہ اکتوبر میں جنگلوں میں اخروٹ کے درختوں کے درمیان انھیں جھاڑیوں میں آسانی سے گولی ماری جا سکتی ہے۔

میں نے پیر پنچال میں ایک سیاہ گلہری کو دیکھا مگر یہ اس قدر بڑی تھی کہ اسے S.Alboniger بھی نہیں کہا جا سکتا ہے۔

کلبہٴ موش

کشمیر میں دُور دُور تک چوہے اور چوہیاں دوڑتے پھرتے ہیں۔ عام ہندوستانی چوہا، بھورا ہوتا ہے۔ میں نے اسے صرف بار ہمولہ کے نزدیک دیکھا ہے۔ گھروں کے اندر پایا جانے والا چوہا ہر جگہ موجود ہے۔ ہر دریا کے کنارے چوہوں کے بلوں سے بھرے پڑے ہیں۔ آبی چوہا بھی عام ہے جب کہ خشک چوہا بھی ملتا ہے۔ گلمرگ کے مقام پر میں نے بڑے بڑے کرم خور دیکھے۔ تمام قسم کے چوہوں کو گگر اور چوہیوں کو کھر ینو کہا جاتا ہے۔ وہ گندم اور جو کی فصلوں کو بھاری نقصان پہنچاتے ہیں۔

Royle's Vole کو عام طور پر عام ہمالیائی چوہا کہا جاتا ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے دیگر ہمالیائی چوہے عموماً دراڑوں میں پائے جاتے ہیں۔ لداخ کے مسافروں کو بلتھ کے چوہوں سے بجا طور پر واقفیت ہوگی۔

بڑے پروں والے جانور کا شجرہ

خار پشت عام نہیں ہے۔ مجھے بھی بڑے پروں والے جانور نہیں ملے۔ میں نے کشمیر میں ان

کا زندہ نمونہ کبھی نہیں دیکھا۔

کنبہ خرگوش

میں نے اسے عموماً یہاں پر دومیل کی جگہ کے نزدیک دیکھا ہے۔لداخ میں اس کی دوسری قسم پائی جاتی ہے۔ وادی میں خرگوش موجود نہیں ہے۔شاید یہ بات یہاں آب پاشی سہولیات کی موجودگی کے لیے ذمہ دار ہے۔

شجرہ سم

بیل کا کنبہ

جنس، جست لگانے والے حیوان

اب ہم دلچسپ ترین دودھ پلانے والے جانوروں کی طرف آتے ہیں جو کشمیر کی پہاڑیوں اور نواحی اضلاع میں آنے والوں کی اچھی خاصی تعداد کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔

مارخور بدقسمتی سے پیر پنچال میں یہ ختم ہو چکا ہے اور کاج ناگ بھی اسی زمرے میں آتا ہے۔ 1884 میں ملمگان کی کھڑی چٹان پر 59 انچ اور 54 انچ کے سر جمع کیے گئے جن کا وزن غیر معمولی طور پر 240 پونڈ تھا اور بہت کم کشمیری مارخور اتنے وزن کے ہوتے ہیں۔

مقامی باشندے کنائی اور دوسرے نالوں کو چلانے کے لیے کتوں کا استعمال کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس قسم کے نفیس بکروں کی تعداد تیزی کے ساتھ کم ہوتی جارہی ہے۔موسم سرما کے دوران مارخور کا رنگ بھورا ہوتا ہے اور گرما کے دوران بھورا مائل سرخ ہو جاتا ہے۔

مادہ مارخور ایک معمولی سا جانور ہے جس کے سینگ 10 سے 11 انچ تک ہوتے ہیں اور کسی بھی حالت میں ان پر گولی نہ ماری جانی چاہیے۔ مارخور ستمبر میں حاملہ ہوتی ہے اور جون میں اس کے بچے پیدا ہوتے ہیں۔

آبادی، پیر پنچال، کاج ناگ اور شمس بری کوہسار

مارخور کے لیے بہترین زمین مشہور و معروف کاج ناگ پربت ہے جو وادی کے شمال مغرب میں واقع ہے۔ مارخور (یعنی سانپ خور) ایک بہت بڑا بکرا ہے جس کے سینگوں کے دو یا کبھی کبھی تین گول چکر ہوتے ہیں۔ کاج ناگ کے ایک نالے میں ایک شکاری نے چند دنوں کے اندر ہی

52، 55 اور 59 انچ سینگوں والے تین مارخور جمع کیے۔ کامیابی کے ساتھ مارخور کا تعاقب کرنے کے لیے ایک اچھا پہاڑی آدمی ہونا لازمی ہے کیونکہ یہ جانور عام طور پر خطرناک اور ناقابل رسائی زمینوں سے ہو کر گذرتا ہے۔ مارخور جھنڈوں کی صورت میں نقل وحرکت کرتے ہیں۔ مارخور مادہ اور بچوں کے ساتھ دسمبر کے دوران اکٹھے رہتے ہیں اور موسم بہار کے دوران دوبارہ الگ ہو جاتے ہیں۔ ریکارڈ کے مطابق نفیس ترین سینگ کی لمبائی 61 انچ ہے۔ مارخور پیر پنجال میں پایا جاتا ہے مگر اس علاقے کے مارخور اتنے اچھے نہیں جیسے کہ کاج ناگ کے مارخور ہوتے ہیں۔

پہاڑی بکرا کشمیری زبان میں کیل اب بھی کشمیر میں پایا جاتا ہے۔ اگرچہ اب ان کی مانگ نہیں، کیونکہ بہت سارے افراد دُور افتادہ شکار گاہوں کی طرف جاتے ہیں۔ زوجیلا پہاڑیوں میں میں نے 1881 میں اس کا 50 انچ کا سینگ حاصل کیا مگر میں نے اس سے زیادہ بڑا بکرا نہیں دیکھا۔ درحقیقت میں ان مقامی شکار گاہوں کو نظر انداز کر رہا ہوں جو 54 انچ اور 56 انچ ہیں اور ان کا ریکارڈ کسی اور باب میں درج ہے۔ وارڈون سے حاصل کیے گئے وسیع ذخیرے کے طول وعرض یوں ہیں:

شانے پر اونچائی	جسم کی لمبائی	دُم	وزن
نر — 37 انچ	50 انچ	8 انچ	188 پونڈ
مادہ — 32 انچ			104 پونڈ

مارخور کی طرح پہاڑی بکرا موسم سرما میں اچھی خاصی بلندی پر گذارتا ہے مگر موسم بہار کا سبزہ زار اُسے نیچے کی طرف راغب کرتا ہے۔ میں نے 1892 میں آزو سے دو میل کے فاصلے پر پہاڑی بکروں کا ایک چھوٹا سا ریوڑ دیکھا۔

پہاڑی بکرا (کیل) لولاب کے شمال کی طرف پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ سندھ اور لدروادی میں بھی پایا جاتا ہے۔ اب شکاری لوگوں کو لداخ، بلتستان اور واڑون کے دُور افتادہ کوہساروں میں بھی تلاش کرنا پڑتا ہے۔ موسم سرما اور موسم بہار کے دوران پہاڑی بکرا ڈھونڈنا آسان ہوتا ہے مگر موسم گرما کے دورن یہ کافی بلندیوں پر پہنچ جاتا ہے اور وسیع علاقے میں گھومتا پھرتا ہے۔ پہاڑی بکرا ایک جھنڈ کے ساتھ رہنے والا جانور ہے۔ اس کی تخم ریزی ماہ نومبر میں شروع ہوتی ہے اور بچے ماہِ جون کے آخر تک پیدا ہوتے ہیں۔ یورپی پہاڑی بکرے کی نسبت کیل

بڑا ہوتا ہے۔اس کے سینگ زیادہ لمبے ہوتے ہیں، وہ مڑے ہوئے اور زیادہ نوکیلے ہوتے ہیں۔
بلتستان میں پہاڑی بکرے کے نچلے بالوں سے عمدہ ترین گھریلو بُنائی ہوتی ہے جسے کیل پھمب کہا جاتا ہے۔

جنس ہمی ٹریکس

Hemitragus Jemlaicus (کشمیری زبان میں طہر جگلہ) اس کتاب کے احاطے میں پیر پنچال ہی واحد مقام ہے۔ میں نے ان علاقوں میں کوئی خاص نمونے نہیں دیکھے ہیں مگر مہاراجہ کی سلطنت میں دیگر نالوں میں نہایت عمدہ جانور ملے ہیں۔ جب کسی کھڑی چٹان پر کوئی نر حیوان کھڑا ہوتا ہے تو یہ منظر کافی دل فریب ہوتا ہے۔ یہ ایک نہایت چوکس جانور ہے اور دھیرے دھیرے چلتا ہے اور اکثر اوقات ناہموار زمین پر چلتا ہے۔ وزن 200 پونڈ، سینگوں کی زیادہ سے زیادہ لمبائی 14 انچ۔ کشمیر اس جانور کی شکارگاہ نہیں ہے۔اس کی نسل کشی کا موسم دسمبر ہے۔

جنس حیوانات برفانی

کشمیری زبان میں 'سیرو' رامو' کشمیر میں بھاری تعداد میں پایا جاتا ہے مگر اسے حاصل کرنا محال ہے۔ کشمیر میں جو چند حیوانات مارے گئے مگر وادیٔ گنگا کے نواح میں جن عمدہ ترین جانوروں کو میں نے مارا وہ یوں ہیں:

	شانے پر اونچائی	وزن	سینگ
نر	37انچ	190پونڈ	12انچ
مادہ	33انچ	120پونڈ	10انچ

شالیمار کے اوپر اب بھی سیرو موجود ہیں۔
جنس سیمس یا بلتھ اور جرڈن کے مطابق گورل میں آتا ہے Memorhaedus یا Cemus کشمیری زبان میں 'رنج' پیر پنچال کے سوائے کشمیر میں عام نہیں ہے۔ سندھ اور ڈنڈ واور وغیرہ سے مندرجہ ذیل تفصیل موصول ہوئی ہے۔

شانے پر اونچائی	وزن	سینگ کی لمبائی
28انچ	55 سے 65پونڈ	6 سے 8انچ

مادہ کے سینگ باریک ہوتے ہیں جن کی لمبائی 5فٹ ہے۔ نر اور مادہ دونوں ایک جیسے دکھائی دیتے ہیں اور پہاڑوں پر کھڑے حیوانوں کی جنس کی تمیز کرنا محال ہے۔ اگرچہ کچھ حد تک ان میں یکسانیت ہے مگر اسی پہاڑی پر دوسری اقسام بھی پائی جاتی ہے۔

جنس سرویلس

Cervulus Aureus یا بلینڈفورڈ کے مطابق Cerulus Muntjac میں نے کشمیر میں اس جنس کا صرف ایک ہی نمونہ دیکھا ہے جو 1885 میں اچھ بل میں پایا گیا۔ وہاں کیسے پہنچا؟ میں اس کی بابت کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ پیر پنچال کی بیرونی ڈھلوانوں پر پایا جاتا ہے۔ گڑھوال یا دوسرے علاقوں میں شکار کیے گئے پسلی نما چہرے والے ہرن یا Barking Dear کی تفصیلات بیان کرتا ہوں۔

شانے کی اونچائی	وزن	سینگ کی لمبائی
26انچ	38 سے 42 پونڈ	5 سے 8انچ

اس حیوان کی ہیئت میں بھاری تفاوت ہے۔ شوالک میں پائے جانے والے ہرن چھوٹے ہوتے ہیں۔ بلینڈفورڈ کے مطابق ان کی اونچائی 22انچ ہے جو یقینی طور پر کافی چھوٹی ہے۔

جنس آہو

بارہ سنگھا۔ یہ عمدہ قسم کا بارہ سنگھا وادئ سندھ اور لولاب میں دیکھا جاسکتا ہے اور جیسے ہی موسم سرما کی آمد ہوتی ہے تو وادی کے بہت سارے حصوں میں یہ جانور پایا جاتا ہے۔ اس وقت یہ پہاڑوں میں قیام کرتا ہے۔ ماہ مارچ کے آخر میں بارہ سنگھا اپنے سینگ چھوڑ دیتا ہے اور خطۂ جنگلات سے دُور پہاڑوں کی بلندیوں کو اپنا مسکن بنالیتا ہے اور تب تک وہاں سے واپس نہیں آتا جب تک موسم خزاں میں اس کے نئے سینگ پیدا نہیں ہوجاتے۔ ستمبر اور اکتوبر کے مہینوں کے دوران شکاریوں کے لیے بہترین موقع دستیاب ہوتا ہے۔ وانگت، کھمو ہ اور ترال کے حکومتی تحفظات میں بارہ سنگھے ہمیشہ دستیاب ہوتے ہیں اور موسم سرما کے دوران یہ حکومتی جنگل اچھ بل اتر آتے ہیں۔ کشمیری عوام بارہ سنگھے کو ہانگل کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ نام اسے اس لیے حاصل ہوا کیونکہ اسے شاہ بلوط کافی پسند ہیں۔ مقامی شکاری مجھے بتاتے ہیں کہ بارہ سنگھا دریائی پرندے کا

کافی دلدادہ ہے۔ کشمیری لوگ بارہ سنگھے کے گوشت کی کافی قدر کرتے ہیں اور اس کے سینگوں کو مختلف مقاصد کے لیے استعمال میں لایا جاتا ہے۔ شاہی محلات میں ان کا استعمال شمع دانوں کے طور پر کیا جاتا ہے۔ اس کے سینگ کے ٹکڑے دیسی کاٹھیوں کو جوڑنے کے مصرف میں لائے جاتے ہیں۔

میں نے شاید یہ کہا تھا کہ یہ جانور اب نا پید ہے اگر شکار کے اصولوں پر سختی سے کاربند رہا جائے تو ہمیں اس اچھے جانور کی کشمیر میں فراوانی ملے گی۔ جب تک بکریوں کے ریوڑ پہاڑوں پر گھومتے پھرتے رہیں گے اور یہ ان کونوں تک گھستے رہیں گے جہاں سینگوں کے بغیر بارہ سنگھے رہنا پسند کرتے ہیں، تب تک ہمیں ماضی کی طرح تعداد میں بارہ سنگھے نہیں ملیں گے۔

اس کی تخم ریزی کا موسم 20 ستمبر سے 20 اکتوبر تک ہے۔ بارہ سنگھوں کو عموماً اس وقت گولی ماری جاتی ہے جب وہ اس عمل میں محو ہوتے ہیں۔ ورنہ فروری یا مارچ کے مہینوں کے دوران ان کا شکار کیا جاتا ہے جب گھاس کی تلاش میں یہ پہاڑوں سے نیچے آجاتے ہیں۔ قریباً تمام حیوانات کے سینگ ماہ اپریل میں تیار ہوتے ہیں۔ جب کہ مئی اور جون میں شاذ و نادر ہی ان کے سینگ نمودار ہوتے ہیں۔ ان کے سینگوں کی زیادہ سے زیادہ پیمائش یوں ہے:

شانے پر اونچائی	وزن	سینگوں کی لمبائی
94.5 انچ	400 پونڈ	47 انچ

دس بارہ سنگھے ایک عام تعداد ہے۔ اچھے اور شاہی بارہ سنگھے نا پید ہیں۔ ایک حیوان کی آزمائش کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کا وزن کیا جائے۔

جنس مشک آہو

مشک آہو کشمیری زبان میں رؤس چھوٹا سا جانور نا پید ہوتا جا رہا ہے۔ اب یہ وادی میں شاذ و نادر ہی دیکھا جاتا ہے۔ ان کی تخم ریزی نہایت چھوٹی عمر ہی میں ہوتی ہے۔ یہ تیزی کے ساتھ اپنی تعداد میں اضافہ کرتے ہیں بشرطیکہ شکار کے قواعد کو ختم ہونے سے روکا جائے۔

نافہ اس کے اندر ایک ملائم بھورا مائل مادہ ہے جو بیش قیمت مشک ہے۔ اس کی زیادہ سے زیادہ مقدار ایک تولہ (12 گرام) ہے اور اس کی قیمت آسمان کو چھوتی ہے۔ کشمیری بھاری خطرہ

اٹھا کر اس کو حاصل کرتا ہے ۔ یہ ہرن موسم گرما کے دوران بنیادی طور پر پتے کھاتا ہے۔مشک آہو 6000فٹ سے 13000فٹ کی بلندی پر پایا جاتا ہے۔

کشمیر میں پایا جانے والا مشک آہو ہمالیائی ہرن کے مقابلے میں چھوٹا ہوتا ہے۔کندھے کی نسبت اس کا پشتی حصہ زیادہ اونچا ہوتا ہے۔

اونچائی	وزن
22انچ	20 سے 25پونڈ

چھوٹے مشک آہو کی پیٹھ اور دونوں اطراف پر نشان ہوتے ہیں۔یہ خوبصورت جانور ہے اور اسے قابو میں لایا جا سکتا ہے۔اسے مختلف قسم کے خوراک درکار ہوتے ہیں۔چنانچہ موسم سرما کے دوران اسے محفوظ رکھنا محال ہے۔

کنبہ سوئیڈ

جنگلی سور وادی کشمیر میں عام طور پر پایا جاتا ہے ۔ موسم سرما کے دوران عام طور پر سور 6000فٹ سے کم بلندی پر دکھائی دیتا ہے مگر موسم گرما کے دوران یہ 8000فٹ سے زیادہ بلندی پر چلا جاتا ہے۔

جنگلی سور کو کشمیری لوگ بد کہتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ اسے مہاراجہ گلاب سنگھ کے عہد حکومت میں افزائش حاصل ہوئی ۔ ریاست میں یہ جانور عام طور پر پایا جاتا ہے اور وادی کے مشرقی حصے میں پہاڑوں کے دامن اس کے لیے حکومتی تحفظات ہیں ۔سور کی تعداد میں کافی اضافہ ہوتا ہے اور یہ فصلوں کو بھاری نقصان پہنچاتا ہے ۔ ڈوگرے اور سکھ جنگلی سور کے گوشت کو نہایت عمدہ کھانا مانتے ہیں۔

گلہری کشمیر سے گلگت اور لداخ کے راستے میں بلندی پر واقع دروں میں گلہریاں پائی جاتی ہیں ۔ان کو درن کہتے ہیں جس کی پشم سرخی مائل زرد رنگ کی ہوتی ہے ۔جس سے عمدہ قسم کے کمبل تیار ہوتے ہیں ۔ایک مسافر کے قریب آنے پر گلہری پرندے کی طرح تیکھی آواز نکالتی ہے ۔ یہ بہت تیز رفتار ہوتی ہے اور سرعت کے ساتھ چٹانوں کے سوراخوں میں غائب ہو جاتی ہے۔

خرگوش گلمرگ میں پایا جاتا ہے۔

پرندے

پرندوں کی بابت ایک کشمیری کو بہت کم معلومات ہیں ۔ وہ ان سبھی کو جانور کہہ کر پکارتا ہے۔ وہ گانے والے پرندوں میں دلچسپی لیتا ہے۔ اس کو ابابیل کے بارے میں معلوم ہے جسے وہ تِج کہتا ہے اور پوش نُول کی بابت معلوم ہے کیونکہ یہ پرندے موسم بہار کے آنے کا پیش خیمہ ہوتے ہیں مگر اس نے کبھی کوئل کی بے لوث عادات کی طرف توجہ نہیں دی۔ کشمیری عوام پرندوں کے تئیں مہربان ہیں اور موجودہ دور تک پرندوں کا شکار کرنے والا صیاد ہندوستان میں اس قدر عام ہے کہ وادی میں اس کے پاؤں نہیں پڑتے ہیں ۔ کوئی کشمیری لڑکا انڈے جمع نہیں کرتا۔ پرندے اس خوبصورت وادی میں خوش ہیں اور بے فکری کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ نیلا، بگلہ، ہرن، بز گیک اس قدر عام ہے کہ پلہالن، نارہ بل، کولگام اور دیگر مقامات پر عمدہ قسم کے بگلے پائے جاتے ہیں۔ پرانے وقتوں کے لوگ اعلیٰ رتبے کے بگلے کے پَر (گونَد) سجاتے تھے اور شادی بیاہ کے موقعوں پر دولہا میاں کے سر پر بھی لٹکائے جاتے تھے۔ پروں کو صندوق کے اندر نہایت احتیاط کے ساتھ سنبھال کر رکھا جاتا ہے اور وراثت کے طور پر اسے اگلی نسلوں کو سونپا جاتا ہے مگر اب یہ رواج ختم ہوتا جارہا ہے۔ پروں کو جمع کرنے کا حق قائم کردیا گیا ہے۔ 1893 کے دوران ایک کسان نے حکومت کو 268 روپے اور 2,999 پر ادا کیے۔ ایک بوڑھے آدمی نے ایک دفعہ منت سماجت کی کہ اسے اس ٹھیکے سے آزاد کیا جائے اور اپنی قسمت پر نالاں ایک جنگلی بگلے کو لے کر وہ ناؤ کھینچتا رہا اور اس کی پرورش زندہ مچھلیوں کے ساتھ کرتا رہا اور وہ کہتا رہا کہ اسے کھیتی باڑی کرنے کی اجازت دی جائے۔

پرندوں کی زمرہ بندی ڈاکٹر بوڈلر شارپ کی اس رپورٹ پرمبنی ہے جو اس نے 1891 میں بوڈاپیسٹ میں منعقد دوسری انواع پرندگان مجلس کانگریس میں پیش کی۔ اس کی اور ای۔ ڈبلیو اوٹیز کی اصلاحات کو اس میں اپنایا گیا ہے۔

شجرۂ-شکار کے گھریلو پرندے
کثی شجرہ تشکلی
کنبہ تشکلی - چکور

1۔ برفانی تیتر (گلگت میں کورلیش) میں نے صرف یہی تیتر گلگت میں ایک چٹان کی مینڈھ

پر 14,500 کی بلندی پر دیکھا ہے ۔ بہرکیف ڈاکٹر ایڈمنز نے اسے واڈون اور وادیٔ لدر کے درمیان پایا۔ چنانچہ میں اسے فہرست میں شامل کررہا ہوں۔

2۔ ہمالیائی برفانی چکور شکاریوں کے لیے رام چکوری (کشمیر زبان میں گُرکہ کاو) کشمیر کے بیشتر بلند ترمینڈوں پر خطۂ برفانی کے قریب پایا جاتا ہے۔ عام طور پر یہ چکور دس اور بیس کے جھنڈ میں ملتے ہیں ۔ یہ اونچی ، صاف اور طویل سیٹی بجاتا ہے۔ یہ سیٹی وہ اس وقت تک بجانا شروع کرتا ہے جب بیٹھا ہوتا ہے۔ جب یہ پرواز کرنے لگتا ہے تو سیٹی کی آواز بتدریج تیز ہوجاتی ہے مگر زمین پر اس کی آواز تیز نہیں ہوتی ۔ میں نے ایک چھوٹا سا چکور جولائی میں اُس وقت پکڑا جب میں ایک آوارہ پہاڑی بکرے کا تعاقب کررہا تھا۔ میں نے ایک برفانی تودے کے سر پر ایک پتھر کے تلے اس کا گھونسلہ دیکھا جہاں زرد بھورے زیتونی رنگ کے آٹھ انڈے تھے۔ اس پر ہلکے نیلے رنگ کی تہہ تھی اور نچلے سرے پر نکتے اور ہلکے بھورے رنگ کے نشان تھے ۔ ان کی لمبائی ½ 6، 8/16 اور چوڑائی 1.5 انچ تھی ۔ ایک عمر رسیدہ پرندہ ان کے نہایت قریب بیٹھا ہوا تھا اور جیسے ہی اس مادہ چکور نے اڑان بھری میں نے اُسے تقریباً پکڑ ہی لیا۔

(3) چکور (کشمیری کَکُو) یہ چکور، چٹان اور ریت کی اراضی سے تعلق رکھتا ہے ۔ چٹانی پہاڑیوں کے نزدیک یہ چکور عام طور پر پایا جاتا ہے اور یہ چکور اکثر چٹانی اور جھاڑی دار ڈھلوانوں پر آتے جاتے رہتے ہیں اور جھاڑیوں کی پناہ گاہ میں آرام اور تحفظ کے ساتھ بیٹھ جاتے ہیں ۔ جب تک کہ ان کے معمول میں خلل نہ پیدا کیا جائے ۔ میں نے انھیں دھان کے کھیتوں میں اس وقت دیکھا ہے جب فصل کاٹ لی گئی ہوتی ہے جہاں یہ بچے کھچے دانے چن رہے ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں پہاڑیوں کے دامن میں باجرے کے کھیت ان کے دل پسند مسکن ہیں۔ ازدواجی زندگی کا عمل ماہ مارچ کے دوران شروع ہوتا ہے جب یہ پرندے موسم گذارنے کے لیے پہاڑوں میں جاکر آرام کرتے ہیں ۔ موسم گرما یہاں تک کہ ماہ اکتوبر کے دوران چکور 9,000 فٹ سے زائد بلندی پر دیکھا جاسکتا ہے ۔ بہت سارے چکور موسم گرما کے ٹھکانوں پر تخم ریزی کرتے ہوئے دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان پرندوں کا شکار ستمبر کے اوائل میں کیا جاتا ہے۔

حالیہ برسوں کے دوران چکوروں کی تعداد میں بھاری کمی واقع ہوئی ہے اس کی وجہ ان

سالوں میں شدید سردی ہے اور مقامی لوگ تخم ریزی کے موسم کے دوران اس پرندے کا ناجائز طور پر شکار کرتے ہیں کیونکہ انگریز سیاح اسے اپنی میز کی سجاوٹ تصور کرتے ہیں اور شکاری اس پرندے کو بے رحمی کے ساتھ ہلاک کر دیتے ہیں کیونکہ ان میں اپنے مفاد کے سوا کسی چیز کی پروانہیں ہوتی۔ حکومت کشمیر نے اس سال کے دوران شکار کھیلنے کے جو قانون مرتب کیے ہیں ان کے طفیل ان حالات میں اصلاح کی توقع کی جاسکتی ہے مگر شرط یہ ہے کہ وہ مناسب طور پر نافذ العمل ہوں۔ اگر اس معاملے میں ذراسی بھی انصاف پسندی سے کام لیا جائے تو اس پرندے کی تعداد پہلے کے برابر ہو جائے گی۔

(4) بھورے رنگ کا بڑا تیتر مئی کے دوران کم تعداد میں کشمیر وارد ہوتا ہے اور جولائی اور اگست تک کشمیر میں قیام کرتا ہے۔ میں نے ان مہینوں میں وادی میں اسے دیکھا ہے اور اگست 1881 کے دوران سونہ مرگ میں اسے مرغیوں کے چارے کی فصلوں (ترونبہ) کے درمیان پایا ہے۔ یہ پرندہ یہاں کچھ حد تک تخم ریزی کر سکتا ہے۔ اس ضمن میں میری دانست میں بہترین موسم 1887 اور 1894 رہے ہیں جب آٹھ سے دس جوڑوں کا بیک وقت شکار کیا گیا۔

(5) پہاڑی دراج (کشمیر میں نرل سونل یا سونہ مرگ! مادہ ہوم) یہ پرندہ بالائی جنگلات میں بجا طور پر منقسم ہے اور اس کی تعداد زیادہ نہیں ہوتی ہے۔ اگر چہ ایک دن کے سفر کے دوران بارہ سے پندرہ پرندوں کو ڈھونڈ نکالا جاسکتا ہے۔ عموماً اس سے نصف بھی دستیاب نہیں ہوتے۔ اس سے قبل ان پرندوں کی فراوانی تھی۔ اکتوبر 1846 میں بونار اور بندزار کے دوران لوشکاٹ ٹیکری کی جنوبی ڈھلوان پر میں ایک بارہ سنگھے کے پیچھے میں دوڑ رہا تھا تو مجھے اس قسم کے پرندے ملے جن میں زیادہ تر مرغیاں تھیں۔ وہ خشک گھاس سے اچھل کر سرو اور صنوبر کے درختوں پر چڑھ جاتیں اور اگر انھیں اس وقت گولی ماری جاتی تو دس سے پندرہ مارے جاسکتے تھے۔ اس ڈھلوان پر اب تین چار پرندے ہی حاصل ہو سکتے ہیں۔

(6) شملہ سینگوں والا دراج (کشمیری زبان میں رنگہ راول اور ہزارہ میں ریار) نام کا پرندہ کشمیر میں ناپید ہے۔ میں نے ان پرندوں کا ایک غول وادی کے سندھ کے لدر علاقوں میں دیکھا۔ ان میں سے چند پرندے ڈھلوان میں پائے جاتے ہیں جہاں شکاری ان سے واقف ہیں۔

20 مئی 1884 کو ایک ایسے ہی پرندے کو ہائی ہامہ لولاب میں ایک پٹھان زمیندار نے گولی ماری۔ آس پاس کے لوگوں نے کہا کہ انھوں نے آج تک اس پرندے کو نہیں دیکھا ہے۔ شاید یہ پرندہ کاج ناگ اور شمس بری پہاڑوں سے ہوتا ہوا یہاں آپہنچا تھا کیونکہ اُن علاقوں میں یہ پرندہ عام طور پر پایا جاتا ہے۔

(7) کشمیر کا تیتر یا دراج ۔ اسے عام طور پر کوکلاس کہتے ہیں۔ وادئ کشمیر کے تمام جنگلوں میں یہ پرندہ اکیلے یا الگ الگ غولوں میں دیکھا گیا ہے۔ طلوعِ آفتاب کے وقت اس کی اونچی آواز شاید پرندوں کی پہلی چہچہاہٹ ہوتی ہے۔ Monaul کی طرح یہ پرندہ بھی زیادہ تعداد میں نہیں ملتا جس سے شکاری مطمئن ہوسکیں۔ نومبر 1893 میں لار کے نزدیک چکور کا شکار کرتے ہوئے ایک شکاری نے اسے ایک خاردار جھاڑی میں ڈھونڈ نکالا۔ اس نے اوپر کی پہاڑیوں سے ایک بنگلے کے نیچے پھینک دیا تھا۔

ڈاکٹر جرڈون کا خیال ہے کہ Pucrasia, Castanca کشمیر میں پایا جاتا ہے۔ دراج کی دیگر قسموں کے بارے میں مجھے کوئی واقفیت نہیں ہے۔ اگرچہ بیرونی علاقوں میں چک Catreus Wallichii-Chick اور سفید پروں والے کلیج کے علاوہ Monaul اور کوکلاس بھی پایا جاتا ہے۔

(8) کنبہ ریگستانی تیتر

یہ بڑا ریگستانی تیتر شکل وصورت سے کشمیری پرندہ نہیں کہلایا جاسکتا۔ نومبر 1889 کے اواخر میں میں نے پانپور کے نزدیک کریووں میں کئی مرتبہ اس کی آواز سنی مگر وہ کبھی میری بندوق کا نشانہ نہیں بنا۔

(9) کنبہ حقیقی کبوتر

یہ خوبصورت پرندہ کشمیر کے جنگلوں میں 7,000 سے 9,000 فٹ کی بلندی پر اچھی خاصی تعداد میں پایا جاتا ہے۔ میں نے ایک نر کبوتر کو 11000 فٹ کی اونچائی سے اچھی طرح سے دیکھا۔ بنفشی اور ترمذی رنگ کے اس پرندے کے پروں پر سفید رنگ کے نشان ہوتے ہیں۔ اس کا سر خاکی رنگ کا ہوتا ہے اور گردن سفید بنفشی رنگ کی مائل بھوری ہوتی ہے۔ اس کی لمبائی 15 انچ

سے 26 انچ تک ہوتی ہے۔

مادہ پرندہ کسی حد تک چھوٹا ہوتا ہے۔اس کا سر سیاہی مائل ہوتا ہے جس پر سفید نشان ہوتے ہیں۔اڑتے وقت اس پرندے کے پر ایک بڑے کوّے کی طرح کالے نظر آتے ہیں۔میں نے کشمیر کے مختلف علاقوں میں کبوتر دیکھے ہیں اور وانگت نالہ میں ان کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔یہاں میں نے کئی پرندوں کا شکار کیا جو نمک والی چٹانوں پر آ کر بیٹھے تھے، میں گھنی جھاڑی میں چھپا ہوا تھا۔پرندوں کے لیے نمک بہت بڑی کشش رکھتا ہے،اسی لیے وہ وہاں جمع ہو رہے تھے ورنہ اس چوکس پرندے کو بار بار گولی مارنے میں مجھے ہرگز کامیابی نہ ملتی۔

(10) ہمالیائی جنگلی کبوتر قسم کا یہ کبوتر کشمیر میں نہیں بلکہ پونچھ میں پایا جاتا ہے۔ایسے ایک دو کبوتر میں نے ڈنڈوار میں دیکھے۔یہ پرندہ انگریزی جنگلی کبوتر سے مختلف ہے۔یہ نیلگوں مائل بھورا ہوتا ہے۔اس کی گردن پر سفید کی جگہ بادامی یا سرخی مائل نشان ہوتا ہے۔اس کی لمبائی 17 انچ ہے۔اس کی چونچ کا سرا زعفرانی رنگ کا ہوتا ہے۔نچلا حصہ سفیدی مائل اور پاؤں سرخ ہوتے ہیں۔

(11) نیلا چٹانی کبوتر

کشمیر میں اس قدر جانا پہچانا ہے۔اس کے بارے میں کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔کشمیر اور ہندوستان میں یہ عام طور پر پایا جاتا ہے۔ان کے بڑے بڑے غول خاص طور پر خزاں کے دوران کاشت شدہ علاقوں کے ارد گرد منڈلاتے ہوئے دیکھے جا سکتے ہیں۔یہ بات قابل غور ہے کہ برٹش میوزیم کے کیٹلاگ میں ان کا تعلق کشمیر کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

(12) سفید چونچ والا کبوتر

یہ شکاریوں میں برفانی کبوتر کے نام سے مشہور ہے۔یہ پرندہ عام طور پر بلند مقامات یا جنگلاتی خطوں کی اوپری چراگاہوں اور تنگ گھاٹیوں میں پایا جاتا ہے۔اسے عام طور پر دو یا چار کے گروہوں میں بھیڑوں کے ریوڑوں کے درمیان گھاس چرتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔میں نے دیکھا کہ یہ پرندہ موسم بہار اور موسم خزاں کے طوفانی موسم میں نچلی سطحوں پر آ جاتا ہے مگر موسم سرما کے دوران یہ کہیں نظر نہیں آتا۔اس موسم میں یہ پرندہ نقل مکانی کر کے بلند جگہوں پر برف پر چلا جاتا ہے۔میں نے اس پرندے کو زیادہ شرمیلا نہیں پایا۔یہ جنگلی کبوتروں کی بہ نسبت بہت کم چالاک

ہے۔اس کی چونچ سیاہ، اس کے پرزرد اور ٹانگیں سرخ ہوتی ہیں۔اس کی لمبائی 13 انچ اور 14 انچ کے درمیان ہوتی ہے۔

(13) تحتی ذیلی کنبہ پھوے

سرخ فاختہ طرفین کی تنگ گھاٹیوں میں بڑی تعداد میں پائی جاتی ہے مگر کشمیر میں اس کی تعداد قدرے کم ہے۔ کاشت شدہ علاقوں کے جنگلوں اور کھلے اور ہموار سطح کے میدانوں اور دیہات میں اسے دیکھا گیا ہے۔ یہ 9,000 سے 10,000 فٹ تک اڑتا ہے۔ بعض اوقات آسمان میں 50 یا 60 فاختائیں بیک وقت اڑتی نظر آتی ہیں۔ عام طور پر ان کا رنگ اوپر سے سرخ اور سرنیلگوں بھورا ہوتا ہے۔ اس کی چونچ سیاہ اور ترمذی رنگ کی ہوتی ہے اور پاؤں پوری طرح سرخ ہوتے ہیں۔ اس پرندے کی لمبائی 12 انچ سے 13 انچ کے درمیان ہوتی ہے۔

(14) ہندوستان کی عام فاختہ موسم گرما کشمیر میں گذارتی ہے۔ اپریل کے دوران یہ کشمیر آکر خزاں میں واپس جاتی ہے۔ صرف چند آوارہ پرندوں کو نومبر تک کشمیر میں دیکھا گیا ہے اور یہ بات خاص طور پر مشرقی علاقوں میں دیکھی گئی ہے۔

شجرۂ چیل و خشکی پرندے

(15) گنجی مرغابی (کشمیری زبان میں کولر) جھاڑوں میں جھیل ولر اور اس کے قریبی کناروں پر دیکھی جاسکتی ہے۔ میں نے ایک بار ان مرغابیوں کا غول جھیل ولر کے کنارے پر اپنی پسندیدہ گھاس پھوس کی طرف جاتے ہوئے دیکھا جو ساتھ ہی تیرنے والے دوسرے پرندوں کی چونچ سے گھاس پھوس چھین کر کھا رہی تھیں۔

چونکہ مرغابی غوطہ خور نہیں ہے لہٰذا وہ اپنے لیے گھاس پھوس حاصل نہیں کر سکتی مگر پانی کی سطح پر اس کی زیادہ حرکت کی وجہ سے یہ دوسری مرغابیوں کو لوٹنے کے قابل ہے۔

(16) آبی مرغابی (کشمیری زبان میں ٹیچ) کو موسم گرما میں جھیلوں اور بانسوں کے تلوں پر عام طور پر دیکھا جاتا ہے۔ جرڈن کے بیان کے مطابق مادہ پرندوں کا رنگ بھورا پروں کا رنگ کانسی اور زیتونی ہے۔ عام طور پر سیاہی مائل پروں، ماتھے پر سرخ ڈھال اور ہلکے سبز رنگ کی ٹانگوں کے ساتھ گھٹنوں کے اوپر سنتری رنگ کا گھیرا اس پرندے کی پہچان میں مدد دیتا ہے۔ مادہ پرندے کی

لمبائی 13.5 انچ جب کہ نر پرندے کی لمبائی 13.75 انچ ہوتی ہے۔ یہ ان شاذ و نادر پرندوں میں سے ایک ہے جن کی مادائیں رنگ دار ہوتی ہیں۔

(17) مشرقی تیتر۔ یہ پرندہ بانسوں کے تلوں اور گھاس پھوس کے ڈھیروں میں رہتا ہے۔ یہ سکڑ کر لیتا ہے اور اسے ڈھونڈ نکالنا محال ہے۔

غوطہ خور پرندے

(18) چھوٹا غوطہ خور پرندہ (کشمیری زبان میں پند) جھیلوں اور تالابوں میں پایا جاتا ہے اور شدید سردی کے دوران کئی بار دریائے جہلم کے کھلے پانی میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ موسم گرما کے دوران یہ پرندہ گھاس پھوس کے ڈھیروں اور بانسوں کے تلوں میں پناہ لیتا ہے جہاں پر یہ تخم ریزی کا عمل سرانجام دیتا ہے۔ سردیوں کے مقابلے میں اس کے پر سیاہی مائل رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ ایک پرانی قسم کا عجیب پرندہ ہے جو ہمیشہ کسی تلاش میں رہتا ہے۔ جنگلی تالابوں میں جب مرغابیوں کا شکار کیا جاتا ہے تو میں نے چھپ چھپ کے دیکھا کہ یہ پرندہ ان مرغابیوں کو دیکھنے کے لیے آیا اور ایک جنگلی تالاب پر زور زور سے چونچیں مارنے لگا۔

کنبہ آبی پرندے

(19) ہنسنے والی بطخیں (کشمیری زبان میں کرید) سردیوں میں جھیلوں اور پانی میں بھاری تعداد میں پائی جاتی ہیں۔ اس موسم میں یہ پرندے وتلب کے نزدیک جھیل ولر کے چٹانی ساحل پر پائے جاتے ہیں۔ سر اور نچلا حصہ سفید ہوتا ہے۔ اس کی لمبائی 15 سے 16 انچ ہوتی ہے۔ ایڈمس کے بیان کے مطابق اس پرندے کی نشو ونما لداخ کی جھیلوں میں ہوتی ہے اور موسم سرما کے دوران یہ کشمیر میں آتا ہے۔

(20) چھوٹی بطخ

یہ بطخ موسم گرما میں دلدلی جوہڑوں اور دلدلوں میں بہتات کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ جرڈن کے مطابق یہ پرندہ ہندوستان میں نہایت عام ہوتا ہے اور گنگا کے علاقوں اور چند دیگر بڑے دریاؤں میں بھی پایا جاتا ہے۔

(21) یورپی عام بطخ (کشمیری زبان میں کریز) کو گرمی کے موسم میں جوہڑوں اور دلدلی

زمینوں میں دیکھا گیا ہے۔ اس کا سر اور سینہ سیاہ ہوتے ہیں اور پروں کا رنگ زرد بھورا ہوتا ہے۔
ایڈمس نے اس پرندے کو کشمیر میں دیکھا۔

پلوور اور کترنے والے پرندے

(22) عام طور پر پائے جانے والے Thick-Knee کا ایک جوڑا میں نے اگست 1889 میں دریائے وشو کے کنارے پرنہامہ کے نزدیک دیکھا۔ مگر اس کا نمونہ حاصل نہیں کر سکا۔ اس کے بعد میں نے اسے کبھی کشمیر میں نہیں دیکھا در اصل یہ ہندوستان کا مستقل پرندہ ہے۔

پلور

میں نے کشمیر میں بھورے یا سنہرے رنگ کے پلور نہیں دیکھے مگر ان کے کشمیر آنے کی توقع ہمیشہ رہتی ہے۔ ہندوستان میں یہ پرندہ موسم سرما میں پایا جاتا ہے۔

(23) The Lesser Rigned Plover یعنی Aediklitis,Gubius گاندربل کے نزدیک ریتلی گھاس میں چٹانوں اور پتھریلی کناروں پر پایا جاتا ہے۔ یہ نہر یا دریائے پوہرو پر بھی ملتا ہے۔ جرڈن کے مطابق اس کے پر ہوتے ہیں جب کہ اس کی ٹانگیں زرد مائل خاکی ہوتی ہیں۔ میں اس پرندے کا گھونسلہ تلاش کرنے میں ناکام رہا۔ اس پرندے کی آواز بنسری کی مدھم آواز جیسی ہوتی ہے جو رات کے وقت اونچی سنائی دیتی ہے۔ میں نے اس پرندے کا ایک نمونہ 2 جون 1894 کو حاصل کیا۔

24: سنہری کبوتر موسم خزاں اور موسم سرما کے دوران دیکھا جاتا ہے۔ یہاں پر اس کی نسل کی کوئی اطلاع موجود نہیں۔ یہ پرندہ گیلی چراگاہوں اور دلدل میں عام طور پایا جاتا ہے۔

25: سرخ کبوتر عام طور پر پایا جاتا ہے۔ میں نے یہ پرندہ سال کے ہر موسم میں دیکھا ہے۔ اس کی افزائش نسل یہیں پر ہوتی ہے۔ اس کے انڈے زیتونی مائل زرد رنگ کے ہوتے ہیں جن پر سیاہی مائل بھورے رنگ کے دھبے ہوتے ہیں۔

26. کنبہ گاور

یہ خوبصورت پرندہ موسم گرما میں کشمیر کی جھیلوں اور اور جوہڑوں میں دیکھا جاتا ہے۔

اس کے پاؤں اور پنجے نہایت باریک اور پروں کا رنگ بھورا ہوتا ہے۔ اس کی گردن کے اوپر سنہرے رنگ کا ایک نشان ہوتا ہے اور پروں کا نچلا حصہ اور دم سیاہ ہوتی ہے اس پرندے کو آبی پودوں پر گھومتا ہوا دیکھا گیا ہے اور یہ جھنڈ کی صورت میں دلدلی زمین سے خوراک حاصل کرتا ہے۔ اس پرندے کی بھونکنے کی جیسی آواز رات کے علاوہ دن کو بھی سنی جاتی ہے۔ میں نے اس کا سیاہ رنگ کا خشک گوشت دیکھا ہے جسے جرڈن نے عمدہ ترین کہا ہے۔

27: پن ککڑی یا چونچ دار مرغابی (کشمیری زبان میں کولر) کے بارے میں کشمیر کے لوگ کہتے ہیں کہ یہ پرندہ بہت عام ہے۔ میں نے اس پرندے کو نانگل میں سرما کے دوران ولر کے کناروں پر دیکھا ہے جب کہ ستمبر 1893 میں میں نے تین پرندوں کے جھنڈ میں سے ایک کو دریائے وشو پر گولی ماری تھی۔

28: **سرخ چونچ والا پن ککڑی**۔ یہ خوبصورت پن ککڑی شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آیا ہے۔ یہ اس کنکری ریت میں پایا جاتا ہے جہاں پہاڑی دریاؤں کا پاٹ کھلا ہے کبھی کبھی یہ پرندہ دو یا تین کے جھنڈ میں بھی اس علاقے میں پایا گیا ہے۔ میں نے یہ پرندہ وارڑون انشن میں دیکھا جب میں پہلگام میں ٹھہرا تھا۔ میں نے انھیں وادی لدر میں آتے دیکھا ہے جہاں وہ تخم ریزی کر رہے تھے مگر میں ان کا گھونسلہ تلاش کرنے میں ناکام رہا۔ اس پرندے کے بال و پر اوپر سے خاکی زیتونی، نیچے سے سفید ہوتے ہیں اور چھاتی پر چوڑا سا گلوبند ہوتا ہے۔ اس کے پروں پر ایک سفید پٹہ ہوتا ہے۔ چونچ کا رنگ قرمزی اور ٹانگوں کا رنگ ارغوانی ہوتا ہے اور یہ 16½ انچ لمبا ہوتا ہے۔

29: **پرندہ** ماہ مارچ کے دوران جھنڈ کی صورت میں دیکھا جاتا ہے۔ یہ پرندہ عام طور پر دلدلی کناروں اور گھاس والی زمینوں میں دیکھا جاتا ہے۔ یہ پرندہ صرف جاڑوں میں ہی دیکھا گیا ہے۔ مادہ پرندے میں Ruff کے اوصاف نہیں ہوتے اور یہ پرندہ زیادہ عام بھی نہیں ہے۔

30: **Wood Sand pipper** یہ پرندہ موسم سرما کے دوران پایا جاتا ہے اور اِکا دکا یہ گرمیوں میں بھی دیکھا جاتا ہے۔ اس کی افزائش غالباً یہیں پر ہوتی ہے۔

31: **پرندہ** موسم خزاں اور سرما میں عام طور پر پایا جاتا ہے۔ یہ ستمبر میں کشمیر میں وارد ہو کے اپریل تک یہاں ٹھہرتا ہے۔ یہ بہت پیٹو جانور ہے۔

32: یہ پرندہ بھی دیگر پرندوں کی طرح وادی میں عام نہیں ہے۔

کنبہ کھکھوا۔جھا

33: پرندہ جنگلی جھا یعنی یہ پرندہ کشمیر کے تمام علاقوں کے جنگلات میں نشو ونما حاصل کرتا ہے۔موسم گرما میں غروب آفتاب کے وقت یہ پرندہ کھلے مقامات پر قطاروں کی صورت میں اڑتا ہوا دیکھا جا سکتا ہے۔اس پرواز کے دوران یہ پرندہ بھاری سیٹی کی آواز نکالتا ہے۔اس کے پہلے یہ گرُگرُ کی آواز نکالتا ہے جو تب تک نہیں سنی جا سکتی جب تک یہ پرندہ بہت نزدیک نہ آئے۔ اس پرندے کا کشمیری نام زریچ ہے۔اس پرندے کی کثرت سے افزائش وادئ کشمیر میں ہی ہوتی ہے مگر موسم سرما کے دوران اس کی نقل مکانی لازمی ہے۔میں نے ماہ جنوری کے دوران ایک پرندے کا اونتی پورہ کے چکور میدان میں شکار کیا۔اس کے علاوہ بھاری تعداد میں ان پرندوں کے غول وانگت اور برنگن لامر میں دیکھے گئے۔موسم سرما کے دوران بھاری تعداد میں ان پرندوں کا شکار بھی کیا جاتا ہے۔ان میں سے چند پرندے موسم گرما کے مہینوں کے دوران جنگلات میں واقع گرم پانی کے چشموں کے نزدیک دیکھے جاسکتے ہیں مگر اس پرندے کی ایک بڑی اکثریت کہاں جاتی ہے؟ یہ ایک معمہ ہے۔

34: پرندہ Himalayan Solitary Snipe وادی میں کہیں کہیں نظر آتا ہے۔میں نے لدر وادی میں کانسوندی پر نومبر کے آخر میں ایک پرندے کا شکار کیا۔اس کے علاوہ دیگر علاقوں میں بھی اس پرندے کو دیکھا ہے۔اس کی آواز ایک عام snipe سے ملتی جلتی ہے مگر یہ آواز کم وقت تک جاری رہتی ہے اور قدرے خشک ہوتی ہے۔

35: عام جھا یعنی Gallinago Scolopacinus وادی میں نہایت عام ہے اور اسے ماہ ستمبر سے مارچ تک کثیر تعداد میں دیکھا ہے۔کشمیری لوگ انھیں گھوڑوں کے بالوں کے پھندے سے پکڑتے ہیں۔میں نے ایک ایسا شخص دیکھا جس نے اس پرندے کا دریائے سندھ کے ولدلی نالے میں شکار کیا۔اُس نے اس مقصد کے لیے ایک لمبی بندوق کا استعمال کیا جس میں اعلیٰ قسم کی بجری کو گولی کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔

36: پرندہ Jack-Snipe وادئ کشمیر میں عام طور پر پایا جاتا ہے۔

37: رنگ دار Painted Snipe وادی میں عام نہیں ہے مگر یہ کشمیر میں موجود ہے۔ یہ پرندہ عام میدانوں اور دھان کے کھیتوں میں افزائش پاتا ہے۔

کنبہ لق لق

38: کولنگ (پنجاب میں کونج) وادی میں باقاعدگی سے آنے والا پرندہ ہے۔ جھیل ولر کے گردونواح میں سپاٹ زمین پر اور سوپور کے نزدیک کمراز کے کاشت کے میدانوں میں عام طور پر کولنگ پایا جاتا ہے۔ یہ شاذونادر شادی پور اور سرینگر میں پایا جاتا ہے۔

موسم سرما کے دوران کھلے موسم میں یہ عام طور پر موجود رہتا ہے مگر سخت سردی کی شروعات کے بعد میں نے شاید ہی یہ پرندہ دیکھا ہو۔ میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ بھاری برف باری اسے جنوب کی طرف جانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ فروری کے آخر میں اس پرندے کے جھنڈ نقل مکانی کے لیے جمع ہوتے ہیں جبکہ میں نے ڈیڑھ سو یا اس سے زیادہ پرندوں کا جھنڈ دیکھا ہے۔ یہ اجس اور سرنور کے مقامات پر دائروں کی صورت میں پرواز کرتے ہوئے پہاڑیوں کی چوٹیوں کی سطح تک پہنچ جاتے ہیں ان پرندوں کی یہ بات قابل غور ہے کہ کشمیر میں اس کا وارد ہونا اور یہاں سے باہر جانا نسبتاً سکونت کرنے والے پرندوں کے موسم میں بالترتیب بعد از اں اور پہلے ہونا چاہیے۔

کنبہ بگلے

39: نیلا بگلہ (کشمیری برگ) یہ پرندہ ساری وادی میں عام طور پر پایا جاتا ہے اور پہاڑی دریاؤں پر 7000 فٹ کی بلندی پر پرواز کر جاتا ہے۔ جب شام ہو جاتی ہے تو نیچے اُتر کر اپنی قیام گاہ پر واپس آجاتا ہے۔ بگلے کو لگام اور بہت سارے مقامات پر پائے جاتے ہیں۔ یہ پرندہ اپنے گھونسلے بنانے کے لیے چنار کے درختوں کا انتخاب کرتا ہے۔ بگلہ کشمیر کا شاہی پرندہ ہے۔ جو لوگ اس پرندے کو موسم کے دوران پر جھاڑتے ہوئے دیکھتے ہیں وہ اس کے سر کے پروں پر اپنا حق جتاتے ہیں۔ لوگ بگلوں کو اس لیے بھی پالتے ہیں کیونکہ یہ بگلے جب پانی میں کھڑے ہوتے ہیں تو وہ انھیں اپنے پھندے میں پھنسا لیتے ہیں مگر اب بگلے پالنے کا رواج مفقود ہو رہا ہے کیونکہ ان کے پروں کی اب بہت کم مانگ ہے۔

40: چھوٹا بگلہ موسم سرما کے دوران جھیل ولر اور دلدلی زمینوں پر جمع ہوتا ہے۔

41: تالابی بگلہ دھانی پرندہ دھان کے کھیتوں میں اور درختوں کے جھنڈوں کے درمیان ملتا ہے۔ موسم سرما کے دوران لاہور [illegible] ہندوستان میں نقل مکانی کرتا ہے کیونکہ اس موسم میں یہ پرندہ کشمیر سے غائب ہو جاتا ہے۔

42: زرد بگلہ جھیل ڈل اور ایسے ہی علاقوں پر گھاس اور زرد پودوں کے درمیان ملتا ہے۔ یہ بید اور بانس کی جھاڑیوں کے درمیان چھپ کر رہتا ہے۔ میں نے یہ پرندہ موسم گرما یعنی مئی اور ستمبر کے درمیان دیکھا ہے۔ اس کی لمبائی 14 سے 15 انچ ہے۔

43: یورپ کا چھوٹا بگلہ یعنی زرد بگلے کے ساتھ ایسے ہی مقامات پر پایا جاتا ہے۔ اس کی لمبائی 14 انچ ہے۔

44: چھوٹا بگلہ یعنی کشمیر میں شاذ و نادر ہی دیکھا جاتا ہے۔ غالباً یہ بات جزوی طور پر اس پرندے کی شبانہ عادات کی وجہ سے ہے اور جزوی طور پر ان جوہڑوں کی ناقابل عبور نوعیت ہے۔ میں نے اس قسم کا ایک پرندہ نومبر 1893 میں اجس کے نزدیک جھیلوں میں دیکھا مگر یہ بندوق کی گولی کی حد سے بہت دور تھا۔

کلبۂ بگلے

45: میں نے مختلف اوقات پر کشمیر میں بگلے دیکھے ہیں مگر ان کی شناخت کی فرصت مجھے کبھی نہیں ملی۔ میں نے مارچ 1886 میں سفید گردن والے بگلے جیسا ایک غول دیکھا جو تخت سلیمان کے آس پاس چکر لگاتا ہوا پرواز کر کے اس پہاڑی کی مینڈ تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بظاہر وہ نقل مکانی کر رہے تھے۔ میں نے ایک دُور بین کے ذریعے ان کا معائنہ کیا اور باور کرتا ہوں کہ یہ مندرجہ بالا اقسام ہوں گی مگر اس پرندے پر گولی داغنے کا میرے پاس کوئی سامان نہیں تھا۔

تختی کنبہ، راج ہنس

46: بھورا ہنس یعنی (کشمیری اُنز) موسم سرما کے دوران جھیل ولر پر بھاری جھنڈوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ پرندہ اکتوبر کے آخری نصف میں وادی میں داخل ہوتا ہے اور اپنی شمالی قیام گاہوں تک مارچ میں روانہ ہو جاتا ہے۔ صرف یہی ایک جنگلی ہنس ہے جسے میں وادی میں پہچان سکا۔ حالانکہ میں نے سامنے کے سفید حصے والا ہنس شاید جھیل ولر پر دیکھا۔ یہ ہنس اپنا زیادہ تر وقت اس

عظیم جھیل کے کناروں پر گذارتے ہیں۔موسم خزاں کے دوران کم پانی میں جو خشک دلدلی قطعات رہ جاتے ہیں ان پر وہ سوتے اور خوراک حاصل کرتے ہیں۔بہت سارے ہنس اپنا زیادہ تر دن جھیل پر ہی گذارتے ہیں جہاں مقامی بندوقچی ان پر گولیوں کی برسات کر دیتے ہیں مگر دلدلی قطعات پر وہ عملی طور پر محفوظ ہوتے ہیں۔حالانکہ میں نے ان قطعات پر غروب آفتاب کے بعد چند ہنسوں کا شکار کیا ہے جو اپنے دوسرے رفقا کا انتظار کر رہے تھے کیونکہ اندھیرا اس قدر تھا کہ وہ مجھے نہیں دیکھ سکتے تھے۔خراب موسم کے دوران یہ پرندے خود کو اندر کی طرف دھکیل دیتے ہیں جو جھیل اور دلدل پر منڈلاتے ہوئے دیکھے جاسکتے ہیں۔انھیں اپنی حفاظت کی فکر رہتی ہے۔کہیں بھی جنگلی ہنس میں اتنا چوکس ہونے کا وصف کشمیر سے زیادہ موجود نہیں ہے۔بعض اوقات چند اِکا دُکا پرندے بندوق کی گولی کی حد سے ہوتے ہوئے جھیل کی طرف چلے جاتے ہیں مگر عموماً وہ ایسے وقت کا انتخاب کرتے ہیں جب آپ اس کی امید تک نہیں کرتے۔ایک مرتبہ استور سڑک پر سونمرگ کے مقام پر میں نے ایک پرندے پر گولی ماردی جہاں اس وقت بھاری برف باری ہو رہی تھی۔یہ نومبر کے اوائل کا موقع تھا جب کہ یہ پرندے بلاشک نقل مکانی کر رہے تھے۔اس کی لمبائی 30 انچ سے 32 انچ ہے۔ڈاکٹر جرڈن کا بیان ہے کہ اس کا وزن 9 سے 12 پونڈ ہے۔مگر میں نے کوئی بھی پرندہ 7 پونڈ سے زیادہ نہیں دیکھا ہے جبکہ بہت سارے پرندوں کا وزن بہت ہی کم ہے۔شاید یہاں پر انھیں دستیاب خوراک ہندوستان کے مقابلے میں نہایت گھٹیا قسم کی ہوتی ہے۔

تختی کنبہ بطخیں،مرغابیاں

47: چکور۔ یہ برہمنی مرغابی زیادہ عام نہیں ہے۔زیادہ تر یہ پرندہ موسم سرما کے اختتام اور بہار کی شروعات میں دیکھا جاسکتا ہے۔اس وقت یہ پرندہ نقل مکانی کر رہا ہوتا ہے۔اس پرندے کی افزائش لداخ میں ہوتی ہے۔

48: چینا بطخ موسم سرما کے دوران عام طور پر ملتی ہے۔اس کی چمچہ نما چونچ کی وجہ سے اسے آسانی سے پہچانا جاسکتا ہے۔اس کے پَر نہایت خوبصورت ہوتے ہیں۔اس کی مدھم آواز چک چک زیادہ دور تک سنائی نہیں دیتی۔کشمیری زبان میں اس پرندے کا نام ہونگ ہے۔

49: جنگلی بطخ کشمیری زبان میں اس پرندے کو نیلج کہتے ہیں جبکہ اس کی مادہ نسل کو تھج

کہا جاتا ہے۔ یہ پرندہ ماہ اکتوبر کی ابتدا میں وارد ہوتا ہے اور مارچ میں خیر باد کہہ جاتا ہے۔ میں نے ایک مرتبہ ماہ مئی میں سنبل کے نزدیک ایک مادہ پرندے کا شکار کیا، شاید اس پرندے کے جوڑے یہاں پر تخم ریزی کرتے ہیں مگر ان کی اکثریت یقینی طور پر نقل مکانی کر جاتی ہے۔ تاہم The Game Birds of India میں درج بیان کی تصدیق میں میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے کہ اس پرندے کی بھاری پیمانے پر افزائش کشمیر میں ہوتی ہے اور اس پرندے کے انڈے بھاری تعداد میں سرینگر میں بیچے جاتے ہیں۔ اس پرندے کے جسم پر واقع چار موڑوں والے گھنگھرالے پروں کی فروخت کی بھاری گنجائش ہے۔ اگر دن بھر کے شکار کے بعد ان کی حفاظت نہ کی جائے تو ہمیشہ کشتی ران انھیں چرا کر لے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ عورتیں ان پروں کا استعمال اپنے بالوں کو سجانے سنوارنے کے لیے زیورات کے طور پر کرتی ہیں۔

50: (کشمیری زبان میں بُو دان) پرندہ کبھی کبھی موسم سرما کے دوران کثرت سے دیکھا گیا ہے۔ جب کہ چند مرتبہ یہ ناپید ہوتا ہے۔ شکار اور کھانے کی میز پر یہ ایک بہترین ضیافت ہے۔ جس موسم کے دوران بُو دان بھاری تعداد میں پیدا ہوں وہ بطخوں کے شکار کے لیے بہترین موسم ہوتا ہے۔

51: دُم دار بطخ یعنی کشمیری زبان میں (سوکھ پچھن) ایک نہایت خوبصورت بطخ ہے اور چند بطخوں کے ماسوائے وادی کشمیر میں جب تک موسم سرما شدت نہ اختیار کر جائے تب تک شاذ و نادر ہی دکھائی دیتی ہے اور فروری کے اواخر میں بھاری تعداد میں یہ یہاں پہنچ جاتی ہے۔ شاید شمال کی طرف سے یہ پرندہ نقل مکانی اختیار کرتا ہے۔ ان موقعوں پر جھیلیں ان پرندوں سے بھری پڑی ہوتی ہیں اور شکار کے بہترین مواقع فراہم کرتی ہیں۔ ان کی آواز مدھم ہوتی ہے اور اکثر سنائی نہیں دیتی۔ جب جھنڈوں کی صورت میں یہ پرندے کثیر تعداد میں جمع ہوتے ہیں تو یہ سیٹی دہرائی جاتی ہے۔ موسم بہار میں یہ پرندہ نقل مکانی کر جاتا ہے۔ اس پرندے کی افزائش یہاں پر نہیں ہوتی ہے۔

52: جنگلی بطخ (کشمیری زبان میں شیروٹی بُو دَن) یہ پرندہ عام طور پر نہیں دیکھا گیا ہے اور اس کا شکار شاذ و نادر ہی کیا جاتا ہے مگر ہر موسم سرما کے دوران جھیل ولر اور دوسری جھیلوں پر دوسرے جنگلی مرغوں کے ہمراہ دیکھا جاتا ہے۔ نر پرندوں کی سیٹی دار آواز اور مادہ اس بات کا اعلان کرتی

ہے کہ جنگلی بطخوں کے جھنڈ میں یہ پرندہ بھی موجود ہے۔ نربطخوں کی پیشانی ایک بادامی رنگ کے تاج کی مانند ہوتی ہے۔ سر اور گردن شاہ بلوط کی مانند پشت بھوری اور اس پر سفید اور سیاہ رنگ کی دھاریاں ہوتی ہیں' پروں کا ڈھلہ جس کے کنارے سیاہ ہوتے ہیں ۔ زیریں حصہ سفید، گردن اور سینہ سفید اور سرخی مائل، چونچ نیلی شرابور، پاؤں بھورے۔ مادہ عام طور پر سرخی مائل زرد، شہ پروں پر سبز چمک نہیں ہوتی، رنگ سیاہی مائل بھورا ہوتا ہے۔ لمبائی 18.5 انچ اس کی افزائش یہاں پر نہیں ہوتی۔

53: عام جنگلی بطخ (کشمیری زبان میں کیئس) کشمیر کی جھیلوں پر یہ پرندہ عام طور پر پایا جاتا ہے۔ ماہ اگست میں کشمیر میں وارد ہو کر یہاں موسم بہار کی آمد تک رہتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ موسم کی شروعات میں جو جھنڈ آتے ہیں ان میں چھوٹی مادہ سے نربطخوں کی تعداد بھاری ہوتی ہے۔ اس پرندے کی آواز بانسری نما سیٹی کی صورت میں ہوتی ہے اور یہ آواز پرواز کے دوران ہی سنائی دیتی ہے۔

54: نیلے پروں والی جنگلی بطخ یا (کشمیری زبان میں کُل کالر) نسبتاً ناپید ہے حالانکہ اس کے جھنڈ ماہ مارچ اور اپریل کے دوران دیکھے جاتے ہیں۔ چند آوارہ پرندوں کا میں نے فروری میں شکار کیا ہے۔ جنگلی بطخ کو اس کے بھورے سر اور گردن تک چلی گئی سفید پلکوں، فرانسیسی بھورے رنگ کے پروں اور بھورے مائل سبز نچلے حصے سے پہچانا جاسکتا ہے۔ اس کی لمبائی 15.5 انچ ہوتی ہے جب کہ عام جنگلی بطخ کی لمبائی 14.5 انچ ہوتی ہے۔

تحتی کنبہ غوطہ خور بطخیں (جن کے پاؤں پر جال نما گھیرا ہے)

55: سرخ پرت والی یورپی بطخ (کشمیری زبان میں طور) یہ خوبصورت بطخ جاڑے میں جھنڈوں کی صورت میں پائی جاتی ہے۔ اپنا دن ڈلر پر گذارنے کے بعد رات کو اپنی پسندیدہ جھیلوں پر جاتی ہیں اور اگر انھیں وہاں خلل نہ ڈالا جائے تو اگلے روز دوپہر تک وہیں پر رہتی ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ چمٹی ہوئی یہ بطخیں جھنڈوں کی صورت میں تیرتی ہیں اور ایک ماہر بندوقچی کے لیے ایک اچھا موقعہ فراہم کرتی ہیں۔ انھیں چند جھیلوں سے لگاؤ ہے جہاں سے انھیں دل پسند گھاس ملتی ہے۔ جسے کیے بعد دیگر غوطہ خوری کے بعد حاصل کیا جاتا ہے۔ ان کا سر ریشمی اور پرت دار چمکیلا شاہ بلوط رنگ کا ہوتا ہے پشت بھوری، نیچے سے سیاہ، چونچ سرخ اور نوک سفید ہوتی ہے۔

56: سرخ والی یورپی بطخ کشمیر میں یہ پرندہ ناپید ہے۔ میں نے صرف ایک یا دو کا شکار کیا۔ان کی تفصیلات یوں ہیں کہ مادہ، سر اور گردن شاہ بلوطی رنگ کے سرخ پرت والے نمونے سے زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ پست، پروں کا اندرونی حصہ، شانہ پٹی سفید ہوتے ہیں جن پر بھاری تعداد میں سیاہ لکیریں ہوتی ہیں جن سے چاندی اور بھورا تاثر ملتا ہے۔دُم سیاہ ہوتی ہے، جو نیچے سے سیاہ پیٹ پر گندمی رنگ کی لکیریں ہوتی ہیں۔ٹانگیں نیلگوں بھوری ہوتی ہیں۔لمبائی 19انچ، آگے کی چونچ 2انچ، ٹخنے کی ہڈیاں 1.5انچ۔مادہ کا سر، گردن اور بالائی سر سرخی مائل بھورے ہوتے ہیں، پشت نر پرندے ہی کی طرح ہوتی ہے مگر اس کی لکیریں زیادہ نمایاں نہیں ہوتیں۔ گلے اور گردن کا اگلا حصہ سفید ہوتا ہے جس کے ساتھ سرخی مائل رنگ ملا ہوتا ہے۔سینہ سرخی مائل بھورا ہوتا ہے جس پر سفید دھبے ہوتے ہیں۔(جرڈن جلد iii صفحہ 812)۔

57: سفید آنکھوں والی بطخ (کشمیری زبان میں ہاروت) یہ پرندہ نہایت عام ہے اور اس کی یہاں زیادہ سے زیادہ افزائش نسل ہوتی ہے۔ میں نے ہر موسم میں یہاں بطخیں دیکھی ہیں اور اگست کے دوران ان کا شکار کیا ہے۔ماہ مئی کے دوران عمر رسیدہ پرندوں کو اپنی چونچ میں خشک گھاس لیے پرواز کرتے ہوئے نائد کھئے میں پھوس کی بچوں پر دیکھا ہے اس کی پرواز بہت عمدہ ہے اور شکار کرنے میں مزہ آتا ہے مگر بطخوں کی دوسری قسم کے مقابلے میں یہ کمتر ہے اس کی آواز بھی غالباً مدھم ہوتی ہے۔لمبائی 16انچ: عام رنگت گہری نسواری، پروں کا ڈھلہ اور پیٹ سفید چونچ نیلگوں بھوری ہوتی ہے۔

58: پرندہ Tufted Duck موسم سرما کے دوران ولر اور دوسری جھیلوں پر پایا جاتا ہے اور موسم کے آخر میں یہ عام طور پر چھوٹے چھوٹے جھنڈوں کی صورت میں ملتا ہے۔ افزائش کے مہینوں کے دوران میں نے کبھی اس کا مشاہدہ نہیں کیا۔عام طور پر اس کے بالائی سطح اور گردن پر سیاہ بال و پر ہوتے ہیں۔اس کا سینہ اور پیٹ سفید ہوتے ہیں ایک لمبا آویزہ اور نر کے سر پر سیاہ پرت ہوتی ہے۔اس کی چونچ سکے کے رنگ کی ہوتی ہے۔

59: سفید چہرے اور سخت دُم والی بطخ یہ پرندہ نہایت ناپید ہوتا ہے۔سال 91-1890 کے موسم سرما کے دوران شکاریوں نے اس پرندے کی چھ قسموں کا جھیل ولر کے قریب شکار کیا۔سخت

نوک دار دم اس پرندے کے اوصاف ہیں ایک یا دو موقعوں پر پنجاب میں اس کا شکار کیا گیا۔

کنبہ ماہی خور بطخیں

60: تیز چونچ والی بطخ، میں نے اس خوبصورت پرندے کو موسم سرما کے دوران جوڑوں یا چھوٹے گروہوں کی صورت میں دیکھا ہے۔نر، سر، پرت اور بالائی گردن چمکیلی اور سیاہ مائل سبز۔ زیریں گردن سفید، بالائی پشت سیاہ، زیریں پشت اور دُم کا اندرونی حصہ خاکی، دُم خاکی، بھوری، سینہ اور پیٹ، سفید چمکیلا، سنگتری بادامی یا سامن مچھلی رنگ کا ہوتا ہے۔ پروں کا اندرونی حصہ اور بالائی پر شوخ سنگتری، چونچ گہری سرخ، اوپر سے خاکی، گلہ نیچے سے سفید گندی ہوتا ہے۔ (جرڈن جلد ii صفحہ 817)

61: مچھلی خور بطخ (کشمیری زبان میں گگر) یہ موسم سرما میں ولر خاص طور پر وٹلب کے مقام پر چٹانی پہاڑی کے دامن میں بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ جہاں پر بابا شکر الدینؒ کی درگاہ ہے۔نر: سر اور پشت سر کی پرت سفید، آنکھوں کے اردگرد اور چونچ کی بنیاد پر ایک سفید ٹکڑا اور سر کی پشت پر دوسرا سفید ٹکڑا طول بلد کی صورت میں موجود رہتا ہے۔ پشت، چھوٹے پروں کا اندرون اور بنیادی رنگ سیاہ ہوتا ہے۔ اندر سے تمام تر سفید، چھاتی پر دو سیاہ دھاریاں ہوتی ہیں ۔ اس کی چونچ نیلگوں، بھوری، شیشے جیسی ہوتی ہیں۔اس پرندے کی لمبائی 16 سے 17 انچ ہے۔مادہ: سر، پرت اور پشت سر سرخی مائل نسواری، سفید اور دُم بھوری ہوتی ہے۔گلہ، گردن اور پیٹ سفید، چونچ اور ٹانگیں گہری بھوری اور نر کے مقابلے میں بہت چھوٹی ہوتی ہیں۔

کنبہ کھاڑ

62: چھوٹا کھار (کشمیری مؤنگ) اس پرندے کی افزائش کشمیر میں نہیں ہوتی اور اسے اکثر اوقات نقل مکانی کے موسموں یعنی بہار اور خزاں کے دوران دیکھا جاتا ہے۔ عام طور پر دریاؤں کے اوپر یا نیچے کی جانب اُڑتا دکھائی دیتا ہے ۔یہ دھوپ میں دلدل کے کناروں یا درختوں پر بیٹھا رہتا ہے۔

کنبہ-باز، پرندے

63: خلیجی کرگس یہ پرندہ زیادہ تر پہاڑوں اور بہت کم تعداد میں وادی میں پایا جاتا ہے حتیٰ

کہ مردار وغیرہ اسے اپنی جانب راغب نہ کرلیں۔ کرگس کشمیر میں اتنے عام نہیں جتنے ہندوستان میں پائے جاتے ہیں۔

64: لمبی چونچ والا بھورا کرگس بسااوقات کشمیر میں دیکھا گیا ہے یہ عام طور پر سرینگر کے گرد ونواح میں ملتا ہے۔ یہ کرگس عام نہیں ہے۔

65: ہندوستانی خاکروبی کرگس Neophron Ginginianus سرینگر میں عام طور پر دریائے جہلم کے ساحلی علاقوں میں ملتا ہے۔ مگر پہاڑی علاقوں اور بلندیوں پر ناپید ہے۔

تحتی کنبہ۔شاہین ماں

66: شکاری شاہین مرغی کشمیر میں عام طور پر موجود رہتی ہے مگر ہندوستان میں اس قدر عام نہیں ہے۔ نر کے مقابلے میں مادہ نسل زیادہ عام ہوتی ہے۔

67: دلدلی شاہین موسم سرما کے دوران کثیر تعداد میں جوہڑوں وغیرہ پر آتے جاتے رہتے ہیں جہاں پر یہ جنگلی مرغوں کے مسلسل دباؤ میں رہتے ہیں اور ایک ایک کر کے جھیل میں ہل چل مچاتے ہوئے بطخوں کے ساتھ اڑتے ہیں مگر اچانک بسیرے کی تلاش میں گر پڑتے ہیں اور صیاد انھیں اِدھر اُدھر بھگاتے رہتے ہیں۔ جب شکاری کی طرف سے زخمی بطخیں چھپتی پھرتی ہیں تو یہ مرغ بتاتا ہے کہ شکار کہاں گرا ہے۔ اس کی آواز تند اور چیخ بھری ہے اور عام طور پر پرواز کے دوران سنائی دیتی ہے۔

68: یورپی چڑیا شاہین کشمیر میں بسا اوقات اس قسم کے بہت سارے پرندوں کو دیکھا گیا ہے۔ مادہ پرندہ ہندوستان کی باشا ہے اور مقامی لوگوں کی طرف سے سارے تیتر مارنے کی تربیت دیتے ہیں۔ اس کے شکار سے ہزارہ میں تیتر کے بہت سارے میدان تباہ کیے جا چکے ہیں۔ خوش قسمتی سے چکور کے معاملے میں کشمیری لوگ باشا کے اس استعمال سے ابھی تک بے بہرہ ہیں۔

تحتی کنبہ شکر

69: عام شکر: میں اس بات کے لیے شرمندہ ہوں کہ میں نے کشمیر میں اس پرندے کی موجودگی کو شک کے دائرے میں رکھا۔ میں نے اسے گلمرگ اور کئی دوسرے مقامات پر دیکھا ہے جو غالباً B.Plumipes ہوسکتا ہے۔ یہ وہاں پر گھونسلہ بنا کر رہتا ہے اور صنوبر کے جنگلات میں

اس کے چلانے کی مخصوص آواز سنائی دیتی ہے۔

70: لمبی ٹانگوں والا شکرا: یہ پرندہ اپنے بال و پر نکالنے کے تمام مرحلوں سے اکتوبر سے دسمبر تک گذرتا ہے۔ مگر جب برف باری ہوجاتی ہے تو میں نے اس پرندے کو نہیں دیکھا ہے۔

تختی کنبہ عقاب

71: پرندہ Laemmergier عام طور پر پہاڑوں اور کم اونچائی والی پہاڑیوں میں دیکھا گیا ہے جو مرداروں اور ہڈیوں کی تلاش میں رہتا ہے۔ اس پرندے کو ہڈی پھوڑ یعنی ہڈی توڑنے والا کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ پرندہ بہت بڑی ہڈی کو بھی اٹھا کر بلندی پر لے جاتا ہے اور بعد ازاں اس ہڈی کو چٹان پر ٹپک کر توڑ دیتا ہے۔ میں نے ایک پرندے کو یہ عمل سرانجام دیتے ہوئے دیکھا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس قسم کی بڑی بڑی ہڈیوں کو یہ پرندہ آسانی سے توڑ نہیں سکتا ہو۔ میں نے ایک پرندے کے پیٹ میں ایک بڑے بکرے کا ٹخنہ دیکھا جس میں پنڈلی اور بازو کی ہڈیاں تھیں۔ جسے اس کے چھوٹے بچے نے گوشت دار ہڈیوں کو آسانی سے ہضم کرلیا مگر بکرے کے گوشت والی ٹانگ کے اوپر ہڈی اس کے گلے میں پھنس گئی جسے اس نے چبا چبا کر حلق کے نیچے اُتارا۔ اس کے چمکیلے بال و پر مل کر پرواز کے دوران ایک خوبصورت منظر کا ایک حصہ دکھتے ہیں۔ یہ پرندہ خوبصورت دکھائی دیتا ہے۔ یہ پرندہ مردار خور ہے اور اس کی خاکروب Neophron کے ساتھ قربت کے سبب یہ کپڑے کے ٹکڑے اپنے گھونسلے کے لیے استعمال میں لاتا ہے اور اس کے انڈوں پر سرخی مائل زرد جھلی کی پرت ہوتی ہے۔

72: سنہری عقاب: اس قسم کے عقاب یقینی طور پر Kashmir Reptores میں شامل کیے جاسکتے ہیں۔ یہ پرندہ عام نہیں ہے۔ درحقیقت یہ کہیں بھی نہیں پایا جاتا مگر میں نے موسم خزاں کے اواخر اور موسم سرما کے دوران دو یا تین بار یہ پرندہ دیکھا ہے۔ یہ پرندہ لداخ میں بھی رہتا ہے اس قسم کا ایک پرندہ میں نے روپل نالہ میں دیکھا جو ایک چٹان پر سے ایک مرغے پر لالچ بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ گھنے جنگلوں میں پورے موسم کے دوران تلاش کرنے کے بعد یہ بات ثابت ہوگئی کہ اس پرندے کی افزائش یہاں پر ہوتی ہے۔ میں نے ہزارہ میں ایک گھونسلہ دیکھا یہ بھیڑ کے میمنوں، جنگلی مرغے اور چھوٹے ہرن کا شکار کرتا ہے جو جلدی سے اس کے قابو میں آسکتے

ہیں۔اس پرندے کی طاقت کا امریکہ کی Harry Eagle کے سوائے کوئی بھی پرندہ مقابلہ نہیں کرسکتا۔

73: پرندہ Imperial Eagle وادی کشمیر میں موسم خزاں اور موسم سرما کے دوران عام طور پر پایا جاتا ہے۔

74: Steppe Eagle موسم سرما کی ابتدا میں وادیٔ کشمیر میں درختوں اور تنوں کے نچلے حصوں میں بیٹھا ہوا پایا جاتا ہے۔میرے خیال میں یہ پرندہ کشمیر میں پایا جانے والا سب سے عام عقاب ہے۔یہ چوہوں وغیرہ کا شکار کرتا ہے اور گلا سڑا گوشت کھانے سے بھی باز نہیں آتا۔ اس پرندے کی عادتوں میں ہمت اور شجاعت نہیں۔میں نے ایک مرتبہ دیکھا کہ ایک عقاب بلی کا تعاقب کررہا ہے مگر جب وہ پہلے ہی مرتبہ جھکا تو ناکام رہنے کے بعد اس نے یہ خیال ہی چھوڑ دیا اور بلی اس میدان سے بچ کر گاؤں کی طرف چلی گئی۔میں ایک بڑے سیاہ رنگ کے عقاب کا ذکر کرتا ہوں جو میرے آس پاس کھڑی چٹانوں پر میرے اردگرد منڈلاتے ہوئے چکر کاٹ رہا تھا۔

75: پرندہ Pallas Sea Eagle موسم بہار، گرما خزاں اور سرما کے دوران جہلم اور جھیل ولر کے علاقوں میں عام طور پر پایا جاتا ہے۔1889 کے کرسمس کے روز میں نے ایک عقاب کو حاجن کے مقام پر دیکھا جو نہایت بلندی پر ایک چنار پر بیٹھا تھا اور اس کے پروں سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ ایک چھوٹا سا پرندہ تھا۔ڈاکٹر ایڈمز نے ایک ایسا ہی پرندہ کشمیر میں دیکھا۔

76: پرندہ The Common Pariahkite تمام موسموں میں 15,000 فٹ تک کی بلندیوں پر پایا جاتا ہے۔یہ پرندہ میلی کچیلی چیزیں اور گندگی مزے سے لے لے کر کھا جاتا ہے۔لوگ چھوٹی مرغیوں کو ان عقابوں سے بچانے کے لیے چلاتے ہیں۔اس کی بہت ساری اقسام جنگلوں اور تنہا مقامات پر پائی جاتی ہیں۔مؤخرالذکر چیل کو میں نے کشمیر میں دیکھا ہے جو عام طور پر پہاڑوں میں ملتی ہے۔

کنبہ حقیقی باز

77: پرندہ Peregrine Falcon کے بارے میں میرے پاس وہ حقائق نہیں جو ثابت کرتے ہوں کہ کشمیر میں اس عمدہ باز کی افزائش ہوتی ہے مگر میں نے سبھی موسموں میں اسے

دیکھا ہے اور یہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اس پرندے کی افزائش یہاں پر ہوتی ہے۔ میں نے نومبر 1886 میں ایک پرندے کا شکار جھیل ڈل پر کیا۔ یہ پرندہ ایک کھمبے پر بیٹھا ہوا تھا جو اس مقام پر ایک کھیت کے لیے گاڑا گیا تھا۔ ہندوستان میں باز کو 'بھیاری' کہا جاتا ہے۔ ہندوستانی شاہین بازوں کا شاہین میں نے کبھی کشمیر میں نہیں دیکھا۔

78: پرندے The Hobby کا شکار میں نے واڈون میں کیا ہے اور اسے اس علاقے کے بہت سارے حصوں میں دیکھا ہے۔ میرے خیال میں اس کی افزائش یہاں پر ہوتی ہے اور موسم سرما کے دوران یہ ہندوستان چلے جاتے ہیں۔

79: پرندہ Indian Hobby ہی ایک ایسا باز ہے جو میں نے 30 نومبر 1893 کو سنبل میں دیکھا ہے۔ اس موسم خزاں کے دوران اس پر بھرپور بال و پر تھے۔

80: چھوٹا باز عام طور پر دیکھا جاتا ہے۔ اس پرندے کی موجودگی یہاں پنجاب کی طرح عام نہیں ہوتی ہے۔

ذیلی کنبہ بحری عقاب

81: بحری عقاب۔ یہ کشمیر میں مختلف بلندیوں پر پایا جاتا ہے۔ میں نے یہ پرندہ جھیل ڈل، جہلم اور سندھ دریاؤں پر اور پہلگام سے اوپر دریائے لدر کی آڑ میں دیکھا ہے۔ دریائے جہلم پر یہ پرندہ میں نے ہری سنگھ باغ کے متصل دیکھا جو ایک مچھلی کو بار بار پانی میں پٹک رہا تھا اور اسے پاس ہی چلنے والی کشتیوں کی قطعی پروا نہیں تھی۔

کنبہ حقیقی اُلو

82: Rock Horned Owl زیریں چٹانی پہاڑیوں میں پایا جاتا ہے جن میں سرینگر میں تخت سلیمان اور وادی میں اسی قسم کے دیگر علاقے شامل ہیں۔ یہ اُلو چٹانوں اور شاذ و نادر درختوں پر بیٹھا رہتا ہے۔ چٹانوں کے درمیان شگافوں اور دراڑوں میں یہ اپنا گھونسلہ بناتا ہے۔ جہاں پر مادہ پرندہ دو یا تین انڈے دیتی ہے۔ جب یہ الو بے حس و حرکت بیٹھا ہوتا ہے تو یہ اپنے کانوں کی وجہ سے مخصوص و منفرد معلوم ہوتا ہے۔ یہ ایک پرندے کے برعکس بلی معلوم ہوتا ہے۔ اس کی سنگتری رنگ کی چمکیلی آنکھیں کافی بڑی ہوتی ہیں۔

83: Pigmy Collared Owlet ایک نہایت چھوٹا الّو ہوتا ہے۔ جو پہلے الّو سے تھوڑا بڑا ہوتا ہے۔ ہندوستانی پہاڑیوں پر یہ اس قدر زیادہ نہیں پایا جاتا ہے کہ اسے کشمیر کے چرند و پرند میں شامل کیا جائے۔ یہ زیادہ تر وادی میں پیر پنچال کے علاقے میں پایا جاتا ہے۔ یہ گہرے جنگلوں میں رہتا ہے اور شاذ و نادر ہی دن کے وقت دکھائی دیتا ہے۔ رات کے وقت اس کی ایک گہری سیٹی آواز رُک رُک کر دو دو بار ''ٹنک ٹنک'' کے الفاظ کی مانند سنائی دیتی ہے۔ یہ آواز جنگلات میں سنی جاسکتی ہے۔

84: ڈاکٹر جرڈن کے مطابق بڑے کانوں والا الو یعنی Asio Otus کشمیر میں بہت کم پایا جاتا ہے۔

85: ہمالیائی جنگلی الو شاید (S. Biddulphi) یا اس سے بہت ملتا جلتا اُلو وادی کے جنگلات میں 6,000 سے 10,000 فٹ کی بلندی پر دیکھا گیا ہے۔ دن کے وقت یہ کبھی کبھی ہی دکھائی دیتا ہے۔ مگر رات کے وقت اس کی آواز ہر مقام پر سنی جاسکتی ہے اور بعض مقامات پر ایک دوسرے کے قریب تر ایک درجن یا اس سے زیادہ اُلو جمع ہوتے ہیں۔ اس کے چیخنے کی آواز نہایت بھدی ہوتی ہے اور شکاریوں کا دعویٰ ہے کہ یہ آواز مادہ الوؤں کی ہے۔

شجر، لوٹن کبوتر اور بگلے وغیرہ

86: یورپی لوٹن کبوتر (کشمیری زبان میں نیلہ کراُ ش) اپریل سے ستمبر تک مہینوں میں نہایت عام ہوتا ہے۔ میں نے اسے اسلام آباد، کولگام، سندھ اور لدر کے نچلے کناروں کے علاوہ لولاب اور کامراج (کمراز) میں بھی دیکھا ہے۔ میں نے کبھی C.Indica نہیں دیکھا جو کشمیر میں ہندوستان کا نام نہاد ''بحری پرندہ'' ہے۔

تختی شجرہ۔ بگلے

87: عام ہندوستانی بگلہ Alcedo Bengalensis کشمیر میں تمام ندی نالوں میں عام ہے اور اپنی عادتوں سے نہایت پالتو ہے۔ یہ کشتیوں کی چھتوں پر اکثر کشتی رانوں کے چند قدم کے فاصلے پر بیٹھا رہتا ہے۔ یہ سال بھر کشمیر میں ہی قیام کرتا ہے اور دریا کے کناروں پر واقع سوراخوں میں اس کی افزائش ہوتی ہے

دیکھا ہے اور یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اس پرندے کی افزائش یہاں پر ہوتی ہے۔ میں نے نومبر 1886 میں ایک پرندے کا شکار جھیل ڈل پر کیا۔ یہ پرندہ ایک کھمبے پر بیٹھا ہوا تھا جو اس مقام پر ایک کھیت کے لیے گاڑا گیا تھا۔ ہندوستان میں باز کو 'بھیاری' کہا جاتا ہے۔ ہندوستانی شاہین بازوں کا شاہین میں نے کبھی کشمیر میں نہیں دیکھا۔

78: پرندے The Hobby کا شکار میں نے واڑون میں کیا ہے اور اسے اس علاقے کے بہت سارے حصوں میں دیکھا ہے۔ میرے خیال میں اس کی افزائش یہاں پر ہوتی ہے اور موسم سرما کے دوران یہ ہندوستان چلے جاتے ہیں۔

79: پرندہ Indian Hobby ہی ایک ایسا باز ہے جو میں نے 30 نومبر 1893 کو سنبل میں دیکھا ہے۔ اس موسم خزاں کے دوران اس پر بھرپور بال و پر تھے۔

80: چھوٹا باز عام طور پر دیکھا جاتا ہے۔ اس پرندے کی موجودگی یہاں پنجاب کی طرح عام نہیں ہوتی ہے۔

ذیلی کنبہ بحری عقاب

81: بحری عقاب۔ یہ کشمیر میں مختلف بلندیوں پر پایا جاتا ہے۔ میں نے یہ پرندہ جھیل ڈل، جہلم اور سندھ دریاؤں پر اور پہلگام سے اوپر دریائے لدر کی آڑ میں دیکھا ہے۔ دریائے جہلم پر یہ پرندہ میں نے ہری سنگھ باغ کے متصل دیکھا جو ایک مچھلی کو بار بار پانی میں پٹک رہا تھا اور اسے پاس ہی چلنے والی کشتیوں کی قطعی پروا نہیں تھی۔

کنبہ حقیقی اُلّو

82: Rock Horned Owl زیریں چٹانی پہاڑیوں میں پایا جاتا ہے جن میں سرینگر میں تخت سلیمان اور وادی میں اسی قسم کے دیگر علاقے شامل ہیں۔ یہ اُلّو چٹانوں اور شاذ و نادر درختوں پر بیٹھا رہتا ہے۔ چٹانوں کے درمیان شگافوں اور دراڑوں میں یہ اپنا گھونسلہ بناتا ہے۔ جہاں پر مادہ پرندہ دو یا تین انڈے دیتی ہے۔ جب یہ الو بے حس و حرکت بیٹھا ہوتا ہے تو یہ اپنے کانوں کی وجہ سے مخصوص و منفرد معلوم ہوتا ہے۔ یہ ایک پرندے کے برعکس بلی معلوم ہوتا ہے۔ اس کی سنگتری رنگ کی چمکیلی آنکھیں کافی بڑی ہوتی ہیں۔

83: Pigmy Collared Owlet ایک نہایت چھوٹا الو ہوتا ہے۔ جو پہلے الو سے تھوڑا بڑا ہوتا ہے۔ ہندوستانی پہاڑیوں پر یہ اس قدر زیادہ نہیں پایا جاتا ہے کہ اسے کشمیر کے چرند و پرند میں شامل کیا جائے۔ یہ زیادہ تر وادی میں پیر پنچال کے علاقے میں پایا جاتا ہے۔ یہ گہرے جنگلوں میں رہتا ہے اور شاذ ونادر ہی دن کے وقت دکھائی دیتا ہے۔ رات کے وقت اس کی ایک گہری سیٹی آواز رُک رُک کر دو دو بار ''ٹنک ٹنک'' کے الفاظ کی مانند سنائی دیتی ہے۔ یہ آواز جنگلات میں سنی جاسکتی ہے۔

84: ڈاکٹر جرڈن کے مطابق بڑے کانوں والا الو یعنی Asio Otus کشمیر میں بہت کم پایا جاتا ہے۔

85: ہمالیائی جنگلی الو شاید (S. Biddulphi) یا اس سے بہت ملتا جلتا اُلو وادی کے جنگلات میں 6,000 سے 10,000 فٹ کی بلندی پر دیکھا گیا ہے۔ دن کے وقت یہ کبھی کبھی ہی دکھائی دیتا ہے۔ مگر رات کے وقت اس کی آواز ہر مقام پر سنی جاسکتی ہے اور بعض مقامات پر ایک دوسرے کے قریب تر ایک درجن یا اس سے زیادہ اُلو جمع ہوتے ہیں۔ اس کے چیخنے کی آواز نہایت بھدی ہوتی ہے اور شکاریوں کا دعویٰ ہے کہ یہ آواز مادہ الوؤں کی ہے۔

شجر، لوٹن کبوتر اور بگلے وغیرہ

86: یورپی لوٹن کبوتر (کشمیری زبان میں نیلہِ کراُش) اپریل سے ستمبر تک مہینوں میں نہایت عام ہوتا ہے۔ میں نے اسے اسلام آباد، کولگام، سندھ اور لدر کے نچلے کناروں کے علاوہ لولاب اور کامراج (کمراز) میں بھی دیکھا ہے۔ میں نے کبھی C.Indica نہیں دیکھا جو کشمیر میں ہندوستان کا نام نہاد ''بحری پرندہ'' ہے۔

تختی شجرہ۔ بگلے

87: عام ہندوستانی بگلہ Alcedo Bengalensis کشمیر میں تمام ندی نالوں میں عام ہے اور اپنی عادتوں سے نہایت پالتو ہے۔ یہ کشتیوں کی چھتوں پر اکثر کشتی رانوں کے چند قدم کے فاصلے پر بیٹھا رہتا ہے۔ یہ سال بھر کشمیر میں ہی قیام کرتا ہے اور دریا کے کناروں پر واقع سوراخوں میں اس کی افزائش ہوتی ہے

88: شکاری بگلہ کشمیر میں تمام موسموں میں یہ عام ہوتا ہے۔ یہ بگلہ پرواز کر کے شکار کی تلاش میں رہتا ہے۔ یہ پانی کی سطح پر منڈلاتے ہوئے مچھلیوں کے شکار کے لیے چونچ مارتا ہے جبکہ دوسرے بگلے کچھ فاصلے پر کھڑے ہوکراس کی طرف دیکھتے ہیں اور جو مچھلی انھیں پسند آتی ہے وہ اسے لے اُڑتے ہیں۔

ذیلی شجرہ یورپی بگلہ

89: یورپی بگلہ موسم بہار اور گرمیوں کے دوران بہت زیادہ عام ہوتا ہے۔ دیواروں اور درختوں کے اندر چھیدوں میں اس کی نسل کشی ہوتی ہے۔ جرڈن کے مطابق اہل اسلام اس کی بہت قدر و منزلت کرتے ہیں کیونکہ یہ پرندہ شاہ سلیمان کا پسندیدہ پرندہ تھا۔ یورپی بگلوں کی کثیر تعداد کشمیر سے موسم خزاں کے دوران غائب ہو جاتی ہے مگر وہ یقینی طور پر یہیں قیام کرتی ہے۔ میں نے ایک ایسا یورپی بگلہ دیکھا ہے جو موسم سرما کی طرف راغب ہوا اور جنوری 1891 میں اس وقت اس کی مدھم سی آواز سنی گئی جب صبح 3 بجے برفانی طوفان جاری تھا۔ یہ آواز کسی چنار کے درخت کے خول سے آتی معلوم ہو رہی تھی۔

ذیلی شجرہ۔ شہد کی مکھی خور پرندہ

90: شہد کی مکھی خور یورپی پرندہ ماہ اپریل میں بہت بڑی تعداد میں وادی میں نمودار ہوتا ہے۔ جھنڈ کی صورت میں ایک دن تک صلاح و مشورہ کرنے کے بعد وہ افزائش کے لیے الگ الگ ہو جاتے ہیں اور اکثر انھیں برقی تاروں پر بیٹھے قطاروں کی صورت میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد لگ بھگ اُسی وقت ان کی نقل مکانی شروع ہو جاتی ہے اور ماہ ستمبر تک شاید ہی کوئی شہد کی مکھی خور پرندہ باقی رہتا ہے۔ ستمبر 1891 کے اوائل میں ایک جھنڈ نے گلمرگ کو عبور کر کے جنوب مغرب کی جانب جاتے ہوئے دیکھا گیا۔

ذیلی شجرہ۔ بکری کا دودھ پینے والی ابابیل

ظاہراً بکری کا دودھ پینے والی ابابیل کا کوئی بھی نمونہ اب تک وادیٔ کشمیر میں نہیں ملا اور ہیوم کے مجموعے میں بھی پرندہ شامل نہیں ہے۔ شاید Caprimulgus Unwini وادی کشمیر میں تلاش کیا جاسکے۔

ذیلی شجرہ۔ چھوٹا گرگٹ (ابابیل)

91: پرندہ Hodgson's Spine-Tailed Swifts ۔ میں نے اس خوبصورت گرگٹ کو پہاڑوں میں 8000 فٹ سے 10,000 فٹ کی اونچائی پر دیکھا ہے۔ عام طور پر اس کے جھنڈ ایک ساتھ ہوتے ہیں۔ جو کسی بلند مینڈ یا چراگاہ پر منڈلاتے ہوئے ملتے ہیں۔ اس پرندے کی آواز نہایت تیز اور طاقتور ہوتی ہے۔ میرا یقین ہے کہ کوئی بھی پرندہ اس قدر تیز رفتاری کے ساتھ ہوا میں پرواز نہیں کر سکتا ہے۔ جلدی ہی آپ ان پرواز کرنے والے پرندوں کے ہجوم کو دیکھیں گے جو آپ کے اردگرد دوبارہ منڈلاتے رہے ہوں گے اگر اس وقت پھرتی کے ساتھ بندوق داغی جائے تو ایک شکاری کو ایک پرندہ حاصل ہوسکتا ہے اور آئندہ پیش آنے والی گڑبڑ کے احتمال کو دور کرنے کے لیے میں ان پرندوں کا ذکر کرتا ہوں جو اس پرواز میں پیچھے رہ گئے۔

ان کا سر، کاٹھی، دم کی بالائی تہہ، پچھلا حصہ، پر اور دُم سیاہ رنگ کے ہوتے ہیں گردن سفید، نچلی گردن، سینہ اور پیٹ، دھوئیں دار نسواری، چونچ سیاہ، پاؤں نیگوں قرمزی ہوتے ہیں۔ اس کی لمبائی 18.5 انچ ہوتی ہے جب کہ یہ پروں کو 20 سے 21 انچ تک پھیلا سکتا ہے۔ دُم، ریڑھ کی سخت ہڈی میں جا کر ختم ہوتی ہے۔

92: پہاڑی گرگٹ اسے کشمیر کے پہاڑوں پر دیکھا گیا ہے اس کی تیز پرواز C.Nudipes کے ہم پایہ نہیں۔ لمبائی 9 انچ اور پھیلے ہوئے پر 19 انچ ہوتے ہیں۔

93: زرد گرگٹ ایڈمز کا بیان ہے کہ گرگٹ کشمیر میں عام طور پر پایا جاتا ہے جو چٹانی ندی نالوں پر بسا اوقات آتے ہیں اور میں نے خود بھی چند علاقوں میں دیکھے ہے۔ دیگر قسم کے جو گرگٹ کشمیر میں پائے جاتے ہیں وہ یوں ہیں۔

عام ہندوستانی گرگٹ

سفید جبڑوں والا گرگٹ

ہندوستانی، چھوٹا گرگٹ

شجرۂ کوئل

اس خاندان کی بابت بیان کرتے وقت ڈاکٹر جرڈن کی مشہور کتاب میں سے مندرجہ ذیل

اقتباس قابل مطالعہ ہے:

''دوسرے پرندوں کے گھونسلوں میں انڈے دینے کی اس کی عادت بیان کرتے ہوئے کہ کوئل اپنے سوتیلے بھائیوں کو گھونسلوں سے باہر کرتی ہے''۔اس کا بیان ہے:۔

''اس پرندے کی اس منفرد عادت کا سبب یہ ہے کہ کوئل کے انڈے رفتہ رفتہ پکتے ہیں اسے ہر انڈہ دینے کے درمیان بہت سارے دنوں کے گذرنے کا وقفہ درکار ہوتا ہے اور چھوٹے پرندوں کے بچوں کی نسبت خوراک فراہم کرنے کے معاملے میں زیادہ دن درکار ہوتے ہیں ان تمام حالات میں اس کے لیے اپنے انڈے پکانا اور بچے کو پالنا مشکل ہو جاتا ہے۔اس پرندے میں عقل سلیم کا فقدان بھی ہے کہ جس کے سبب وہ اپنا گھونسلہ نہیں بنا سکتا۔اس نسل کے ماتحت اجزا کی نشوونما بھی کم ہوتی ہے اور چھوٹے انڈوں میں اپنی ماں باپ کی کمزور تحریک کی وجہ بھی اس کے ساتھ شامل ہو سکتی ہے۔یہ تمام باتیں ان کی منفرد عادت کو بیان کرتی ہیں۔

94:یورپی کوئل یعنی Cuculus Canorus (کشمیری سنت یا کُکو) کشمیر میں ہر سال وارد ہونے والا پرندہ ہے۔مئی میں یہاں وارد ہونے کے بعد یہ کشمیر کی وادی میں شاذ و نادر ہی دکھائی دیتا ہے مگر مختلف اطراف میں وادیوں، نچلی ڈھلوانوں اور جنگلات میں کثیر تعداد میں پایا جاتا ہے۔میں نے ایک 13,000 فٹ اونچے درّے کی تہہ میں انھیں اچھی خاصی تعداد میں موجود دیکھا۔اس کے اردگرد برفانی چٹان کے سوا کچھ نہیں تھا اور جب یہ ڈھلوانی چٹانوں پر بیٹھے ہوتے ہیں تو ایک دوسرے کو آواز دے کر اس کا جواب بھی دیتے رہتے ہیں۔موسم بہار میں وارد ہونے کے بعد کوئل کو اپنی آواز کا احساس کرنے میں کچھ وقت درکار ہوتا ہے۔میں نے ایک پرندے کو اس کی مشق کرتے دیکھا ہے اور اس وقت وہ محض ایک کرخت آواز ہی نکال سکتی تھی۔

95: میں نے جس کوئل کا کبھی شکار نہیں کیا وہ میرے خیال میں Hicrococcysx جنس سے تعلق رکھتی ہے۔مئی، جون اور جولائی کے دوران تمام پہاڑی نالوں میں یہ کوئل عام طور پر پائی جاتی ہے۔میں نے اس کوئل کو سندھ، لدر، واڑ دون اور دیگر مقامات پر دیکھا ہے۔اس کا عام رنگ نسواری مائل خاکی ہے اور ایم ایچ ڈارون نے، جس نے اس کوئل کا بہت سال قبل شکار کیا تھا، اس کے سر کو سرخی مائل زرد بیان کیا ہے جس کے پَر بادامی مائل نسواری رنگ کے ہوتے ہیں۔نیچے سے

ان پروں کا رنگ سفید ہوتا ہے۔اس کی دُم پر سفید اور سیاہ رنگ کی گول دھاریاں ہوتی ہیں۔

یہ پرندہ بہت شور مچاتا ہے۔اس کی آواز دن رات سنائی دیتی ہے جس کے سبب کیمپ میں کافی خلل پیش آتا ہے اس کی آواز کے چھ سر ہوتے ہیں جو زیر و بم ہوتے رہتے ہیں اور چھ سروں کو پانچ بار دہرانے کے بعد ایک اونچا سر پیدا ہوتا ہے اس کے بعد مدھم چَپ چَپ چَپ چَپ چپ چپ چیپ چیپ چیپ چیپ چیپ چوپ چوپ چوپ چوپ چوپ چوپ، مجھے پہلی بار اس پرندے کی شناخت کا موقعہ حاصل ہوا ہے۔شاید یہ پرندہ Cuculus Intermedius ہے جس کا ایک نمونہ رتن پیر میں ہیوم کے مجموعے میں شامل ہے۔

96: پرندہ Pied Crested Cuckoo دیکھا تو گیا ہے مگر یہ پرندہ موسم گرما کے دوران وادی میں عام نہیں ہوتا۔ یہ پرندہ اونچائیوں پر نہیں چڑھتا۔اس کی بلند سیٹی دار آواز عموماً ماہ جولائی میں موسم برسات کے آغاز میں سنائی دیتی ہے۔

ذیلی شجرہ۔ ریشہ دار پرندے

مجھے اس بات کی حیرانی ہوئی کہ میں نے ریشہ دار پرندوں کو کشمیر میں نہیں دیکھا۔

ذیلی کنبہ حقیقی ہُدہُد

97: ہمالیائی جنگلی ہدہد کشمیر کے جنگلات میں 9000 فٹ بلندی تک واقع جنگلات میں موجود ہوتا ہے۔ایڈمز کے بیان کے مطابق ہدہد کا سر سفید، سینہ نیلگوں، سیاہ پیٹ اور ہوا کی نالی سرخ ہوتی ہے

98: چھلکے دار پیٹ والا سبز ہدہد مختلف بلندیوں پر واقع پہاڑی جنگلات سے لے کر سرینگر کے ارد گرد میں واقع درختوں کے جھنڈوں میں یہ پرندہ دیکھا گیا ہے۔ یہ واحد جنس ہے جسے میں نے دیکھا ہے مگر اس کا رشتہ دار G. Occipitalis اور سیاہ چھاتی والا سبز ہدہد بھی کشمیر کے جنگلات میں پایا جاتا ہے۔

ذیلی کنبہ ہدہد چڑیا

99: عام ہدہد چڑیا موسم بہار اور گرما کے دوران یہ پرندہ عام ہوتا ہے میں نے یہ پرندہ نشی باغ اور کشمیر کے بہت سارے حصوں میں دیکھا ہے۔حالانکہ یہ پرندہ نالوں پر بھی دیکھا گیا ہے مگر

کسی بلندی پر اسے نہیں دیکھا گیا۔

شجرہ طوطے

100: سلیٹی سر والا طوطا [illegible]

[illegible] زیادہ تعداد میں طوطے پائے [illegible] میں نے سندھ اور لدر کی ڈھلوانوں میں بھی انہیں دیکھا ہے اور موسم خزاں کے دوران اٹواٹ میں اخروٹ کے درختوں میں یہ پرندہ کافی تباہی مچاتا ہے۔ اس پرندے کا شکار لولاب میں کیا گیا ہے۔ یہ پرندہ درختوں میں افزائش نسل کرتا ہے۔ اس کی آواز خوشگوار اور نہایت سریلی ہوتی ہے جس سے جنگل میں منگل کا سماں ہوتا ہے۔ جہاں یہ اکثر اوقات پرواز بھرتا ہے۔ پہلے مہینے کے دوران ہی سلیٹی مائل نیلے رنگ کا سر نمودار ہو جاتا ہے۔ اس کو آسانی کے ساتھ سکھایا جا سکتا ہے۔ یہ نہایت خوبصورت پرندہ ہے میں نے ایک پرندہ لایا تھا جو باغ میں میرے پیچھے پیچھے آیا کرتا تھا اور میرے کپڑوں پر چڑھ کر شانوں پر بیٹھ جاتا تھا۔ چند مہینوں کے اندر اس نے بولنا بھی سیکھ لیا۔ جب تنہا ہوتا تو خود بخود اس کی مشق کرتا اور ایک حادثے کے طور پر مجھے اس پرندے کی مہارت کے بارے میں معلوم ہوا۔ میں نے اس پرندے کو ماہ اکتوبر کے اواخر میں کشمیر میں دیکھا۔ اس کے پر عام طور پر سبز ہوتے ہیں، دُم نیلی اور زرد ہوتی ہے۔

کنبہ کوّے

101: یورپی پہاڑی کوا حقیقی پہاڑی کوّے کشمیر میں ناپید ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ ان میں سے چند اسی جنس سے ہوں گے۔ میں نے ہمیشہ یہ باور کیا تھا کہ C.Tibetanus ایک تبتی ساخت کا طوطا ہے اور صرف موسم خزاں وہیں پر گزارتا ہے اور یہیں افزائش حاصل کرتا ہے۔ مگر یہ کبھی کشمیر کی طرف سے آتا معلوم نہیں ہوتا۔ چنانچہ یہاں پر آنے والے پرندے C.Corex ہو سکتے ہیں جو موسم گرما کے دوران شمالی پنجاب میں عام ہوتے ہیں۔

102: یورپی گھناؤنا کوا موسم سرما کے دوران ولر اور دوسری جھیلوں کے قریب دیکھا جاتا ہے۔ جو زخمی جنگلی مرغے کی تلاش میں رہتا ہے۔

103: مشرقی ٹوپی دار کوا جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے یہ کوا بھی کشمیر میں موجود ہے۔

متذکرہ بالا دونوں قسمیں پنجاب کی نسبت کشمیر میں زیادہ پائی جاتی ہیں اور پرندے جمع کرنے والوں کے لیے یہ نمونہ ہے۔ برٹش میوزیم کے ڈاکٹر باؤلر شارپ کا بیان ہے کہ اسکاٹ لینڈ اور یورپ کے دیگر علاقوں میں کوؤں کی دونسلوں کی باہمی طور پر تخم ریزی ہوتی ہے اور چھوٹے کوؤں کو ٹوپی دار کوے کہا گیا ہے۔ ان کے سینے اور چمڑی پر سیاہ داغ ہوتے ہیں۔ ان دونوں کی آواز منفرد طور پر کائیں کی نسبت تیز ہوتی ہے۔

104: جنگلی کوا: جنگلات اور پہاڑی مرغزاروں میں نہایت عام ہوتا ہے کسی بھی شخص کے کیمپ کے آس پاس اس کوے کی آواز ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ یہ آواز کسی بارہ سنگھے یا ریچھ کی موت پر آتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اچھی خاصی خوراک حاصل کرنے کے لیے وہ ایک شکار کا تعاقب کرے گا۔ ٹھنڈے مہینوں کے دوران وہ وادی کے قصبوں اور دیہات کے آس پاس پایا جاتا ہے۔ ایک بار اپنے پنجرے سے نکل کر ایک سیاہ پرندہ (Merula Castanal) جسے میں نے اس کے گھونسلے سے کچھ دور پایا تھا۔ ایک کوا پرورش کی کوشش کر رہا تھا۔ ایڈمز نے اسے C.Corone سے چھوٹا اور ہندوستانی چھوٹے کوے سے بڑا بیان کیا ہے۔ یہ پرندہ وادی کشمیر کے گردونواح کے پہاڑوں میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ میں نے خود اس کا کشمیر میں مشاہدہ کیا۔ اوٹلس C.Intermedius اور C.Macrophyuchus کو یکجا رکھتا ہے۔

105: ہندوستانی گھریلو کوا ایک معروف کوا ہے جس کا اطالوی نام نہایت غیر موزوں ہے۔ سرینگر اور دریائے جہلم کے کناروں پر واقع قصبوں سے پہلے کی نسبت زیادہ عام ہے اور اس طرح اس نے وادی کشمیر کے پرندوں میں اپنا مناسب مقام حاصل کر لیا ہے۔

106: پہاڑی کوا عام طور پر جھنڈوں کی صورت میں موسم خزاں یا سرما کی شروعات میں کھیتوں پر منڈلاتا نظر آتا ہے۔ اس کے بعد یہ پرندہ ہزارہ یا شمالی پنجاب کی جانب چلا جاتا ہے۔ اس پرندے کی افزائش یہاں پر نہیں ہوتی۔

107: سفید گردن والا جنگلی کوا تمام تر وادی کشمیر میں نہایت عام ہوتا ہے۔ یہ پرندہ درختوں اور دیواروں کی سوراخوں میں افزائش حاصل کرتا ہے۔ اس کے انڈے زردی مائل نیلگوں سبز ہوتے ہیں جن پر نسواری رنگ کے دھبے ہوتے ہیں۔ سرینگر کے محل، جھیل ولر کے جزیرے اور

دوسرے مقامات پر بھاری تعداد میں جگہ حاصل کرتا ہے۔ چند پرندے لازمی طور پر پنجاب تک نقل مکانی کرتے ہیں۔ جہاں یہ پرندہ سردیوں میں بھاری تعداد میں موجود ہوتا ہے۔

108: بہت سارے داغوں والا سروتا کشمیر کے جنگلات میں نہایت عام ہوتا ہے مگر عام طور پر اکیلا دکھائی دیتا ہے۔ بعض اوقات دو یا تین کی جھنڈ کی صورت میں پایا جاتا ہے۔ اس کی کرخت آواز مسلسل دہرائی جاتی ہے۔ صنوبر کے درختوں پر عام طور پر موجود رہتا ہے۔ یہ پرندہ جنگل میں چپ چاپ تنہا بیٹھا نظریں جمائے دکھائی دیتا ہے۔ اس کی چیخ بے حد ناخوشگوار ہوتی ہے۔

اوٹس لکھتا ہے کہ یہ مشرقی کشمیر کا ہمالیائی کوا ہے، جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے ان کوؤں میں سے کوئی بھی پرندہ کبھی ہمالیہ میں موجود نہیں رہا۔ چنانچہ میں اس جنس کو اس کی ملحقہ قسم Urocissa کا نام دوں گا۔

109: زرد چونچ والی نیلی یورپی مینا: اس خوبصورت پرندے کے پَر نیلے اور سفید اور اس کی دُم کے پَر لمبے ہوتے ہیں۔ کشمیر کے جنگلات میں 7,000 فٹ سے 8,000 فٹ بلندی تک فراوانی سے پایا جاتا ہے۔ میں نے اس کی گھنٹی دار آواز بار بار سنی ہے۔ ایک مرتبہ میں یہ اس بکری کو دیکھ رہا تھا جسے ایک ریچھ نے ہلاک کر دیا تھا۔ دو یورپی مینائیں نزدیک ہی ایک گنجان جھاڑی پر بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ اندھیرا بڑھنے لگا، ریچھ چلتا ہوا سیدھا مردار تک پہنچ گیا۔ اس بات میں شک نہیں کہ یورپی میناؤں نے ہی اسے پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔

110: مینا: ایڈلف کے بیان کے مطابق یہ پرندہ کشمیر میں ہمیشہ سے عام طور پر موجود رہا ہے، اس نے دو مرتبہ اس پرندے کا گھونسلہ کشمیر میں دیکھا (اوٹس، فان، برٹش، انڈین برڈز۔ صفحہ 25)۔

111: عام ہندوستانی مینا وادی میں نہایت عام ہے۔ درختوں کے جھنڈوں اور باغات میں عام طور پر پائی جاتی ہے۔

ذیلی کنبہ للپیرا کوا

112: لال چونچ والا للپیرا کوا بلند پہاڑوں پر جنگلی علاقوں سے نیچے یہ پرندہ کافی عام ہے۔ یہ جھنڈوں یا بکھرے ہوئے گروہوں کی صورت میں ملتا ہے۔ اس کی آواز صاف شفاف

اور گونج دار ہے۔اس کے پر سیاہ ہیں۔چونچ اور پاؤں سرخ ہوتے ہیں جو اسے پرندوں کی کسی اور قسم سے الگ کرتے ہیں۔چند پرندے موسم گرما کے دوران میدانوں کی طرف تک نقل مکانی کر جاتے ہیں۔

113: پہاڑی للیپر اکوا۔ یہ پرندہ کئی علاقوں میں پایا جاتا ہے۔بسا اوقات یہ پرندہ نچلی وادیوں تک اُتر آتا ہے۔مقامی باشندوں کا کہنا ہے کہ یہ پرندہ بلندیوں پر موجود رہتا ہے۔یورپ میں یہ پرندہ ایلپس اور اپی نائین میں پایا جاتا ہے۔(جرڈن جلد ا صفحہ 370)۔رنگ شوخ کالا، چونچ زرد اور پاؤں شوخ سرخ ہوتے ہیں۔اس کی آواز لال چونچ والے کوّے کی طرح ہوتی ہے کشمیری شکاریوں کا کہنا ہے کہ دو للیپر ے کوّے خوراک کی مانند ہی،حلال ہوتے ہیں۔

کنبہ گرسل

114: ہمالیائی گرسل: وادی کے تمام علاقوں میں پائی جاتی ہے۔درختوں،عمارتوں وغیرہ کے شگافوں میں افزائش حاصل کرتی ہے۔اس کے انڈے نیلگوں زرد ہوتے ہیں۔افزائش کے موسم کے بعد جوہڑوں پر واقع درختوں میں ان کے بڑے بڑے جھنڈ جمع ہوتے ہیں۔ان میں سے متعدد پانی میں ہی رہتے ہیں۔موسم سرما کے دوران ان کی بھاری تعداد ہندوستان میں نقل مکانی کرتی ہے۔ان کے پَر شوخ سیاہ ہوتے ہیں جب کہ ہر پَر کی نوک زرد،سفید مائل نسواری ہوتی ہے۔پہلے پہل اس کی چونچ سفید ہوتی ہے مگر افزائش کے موسم میں اس کا رنگ تبدیل ہوکر زرد ہو جاتا ہے۔اس کی ٹانگیں زرد نسواری ہوتی ہیں۔اس پرندے کی لمبائی 9انچ، پَر 5انچ اور دُم 3انچ ہوتی ہے۔

115: وسط ایشائی گرسل کا پچھلا حصہ سرخی مائل سیاہ ہوتا ہے۔پَر تانبے اور کانس کے رنگوں کے اور لمبائی 5انچ سے زیادہ ہوتی ہے۔برٹش میوزیم میں کشمیر کے اس پرندے کا نمونہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ پرندہ گرسل کے دیگر نمونوں کے ہمراہ وادی کشمیر کے راستے ہندوستان تک نقل مکانی کرتا ہے۔(اوٹس،فونا، برٹش انڈیا برڈس ان صفحہ 521)

116: عام ہندوستانی گرسل: اس کا امتیاز قرمزی سر اور کانوں کے اوپر قرمزی ڈھکن سے ہوتا ہے جب کہ اس کا گلا بھی قرمزی ہوتا ہے۔یہ پرندہ سائبیریا میں افزائش حاصل کرتا ہے

اور ہندوستان میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ ہیوم کا خیال ہے کہ اس پرندے کی نسل کشی کشمیر میں بھی ہوتی ہے اور ہمارے علاقے سے جو نمونہ حاصل کیا گیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یا تو یہ پرندہ کشمیر میں اپنا گھونسلہ بنا کر رہتا ہے یا نقل مکانی کے مرحلے سے بھی گزر جاتا ہے۔

117: عام مینا: وادی میں نہایت عام ہے مگر زیادہ بلند پہاڑی ڈھلوانوں تک نہیں جاتی۔

کنبہ کرم خور کوئل

118۔ ہندوستانی خاکی کرم خور کوئل کے بارے میں ڈاکٹر ایڈمز کا بیان ہے کہ یہ پرندہ کشمیر میں عام طور پر پایا جاتا ہے اور اکثر یہاں پر اس کا گھونسلہ موجود رہتا ہے۔ مگر میں یہ رائے نہیں رکھتا۔ اس ہندوستانی پرندے کی شاہی کوے Dicrurus Ater کے ساتھ گہری مشابہت ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ اس کے منہ پر سفید نشان نہیں ہے۔

کنبہ اوریول

119۔ ہندوستانی اوریول (کشمیری زبان میں پوشہ نول) یہاں پر ماہ اپریل کے آخر میں وارد ہوتا ہے اور موسم گرما کے دوران یہاں رہتا ہے۔ اس کی زرد اور سیاہ رنگت اور شیریں سیٹی کے سبب فوراً پہچان ہو جاتی ہے۔ میں نے یہ پرندہ 7,000 فٹ بلندی تک دیکھا ہے۔ یہ پرندہ اپنا گھونسلہ درختوں کے تنوں کے جو (Fork) پر بناتا ہے جو یا تو بندھا یا لٹکا ہوا ہوتا ہے۔ اس کے گھونسلے کے ساتھ میلے کچیلے چیتھڑے، گھاس اور تنکے وغیرہ منسلک رہتے ہیں جو اس شاخ کے ساتھ بندھے رہتے ہیں جو اس گھونسلے کو طاقت فراہم کرتی ہے۔

کنبہ چھوٹی چڑیا

120: سیاہ اور زرد بڑی چونچ والی چڑیا 9,000 فٹ یا اس سے بلند جنگلات میں عام طور پر پائی جاتی ہے۔ اس کی آواز تیز اور چہچہانے والی ہوتی ہے اور اس کو بار بار دہراتی ہے۔ سر، گردن، پَر اور دُم سیاہ ہوتی ہیں جبکہ باقی پروں کا رنگ زرد ہوتا ہے۔

121: نشاندار پروں والی چڑیا نر۔ سر اور تمام بالائی حصہ بدشکل سلیٹی سیاہ، نیچے سے زردی مائل پیلا، پروں پر نمایاں طور پر سفید نشان۔ مادہ کے اوپر کے چھوٹے حصے نر کی مانند ہوتے ہیں مگر اس کے ابروز زرد اور زردی مائل ہوتے ہیں۔ سر زرد اور رخساروں پر سیاہ نشان ہوتے ہیں۔ عام

شکل و شباہت میں نر سے زیادہ نشان ہوتے ہیں۔

اس پرندے کی چونچ بہت موٹی، گہری اور لمبی ہوتی ہے۔ اس کے پر رنگدار ہیں۔ جن کی لمبائی 8.5 انچ ہوتی ہے۔ یہ چڑیا کشمیر کے جنگلات میں پائی جاتی ہے مگر سیاہ اور زرد چڑیا کی نسبت نا پید ہے۔ درختوں کی چوٹیوں پر اکثر اوقات رہتی ہے اس کی آواز ہموار سیٹی دار ہوتی ہے جو کافی فاصلے سے سنائی دیتی ہے۔ اس کے علاوہ چہچہاہٹ کی آواز بھی پیدا کرتی ہے۔ پھل اور گلاس کے علاوہ پتھر ہضم کر جاتی ہے۔ یہ پتھر توڑتی بھی ہے۔

122: سنگتری سخت چونچ والی چڑیا: یہ خوشنما پرندہ وادیٔ کشمیر کے چند حصوں کا نمائندہ ہے۔ میں نے اسے وارڈون، وانگت، بانڈی پورہ کی پہاڑی ڈھلوانوں اور ست سرن درے کے بالکل قریب کے جنگلات کے علاوہ سونمرگ میں بھی بھاری تعداد میں دیکھا ہے۔ نر کے پَر چہرہ اور دُم سرخی مائل سنگتری اور دُم کا تلا سفید ہوتے ہیں۔ مادہ خاکی اور سیاہ اور آواز نرم اور شریں سیٹی کی صورت میں ہوتی ہے اس کی چہچہاہٹ بھی خوشگوار ہوتی ہے۔

یہ نہایت پالتو ہوتی ہے۔ درخت کے قریب بیٹھ کر یا کسی خیمے کے دروازے کے نزدیک بیٹھ کر دانہ چگتی ہے۔ ایک موقعے پر دو یا تین چڑیا میرے خیمے میں داخل ہوئیں اور میرے پاؤں کے قریب پھدکتی رہیں۔

123: سرخ سر والی چڑیا جنوبی کشمیر میں پائی جاتی ہے۔ (اوٹس، فونا، برٹش انڈیا برڈس [i] صفحہ 217)

124: گلابی پیشانی والی چڑیا دھرم شالہ میں پائی گئی۔ (اوٹس صفحہ 1)، اس کی نسل کشی کافی بلندیوں پر ہوتی ہے اور موسم سرما کے دوران نیچے اُتر آتی ہے۔

125: عام گلابی چڑیا کشمیر میں یہ پرندہ غیر مانوس نہیں ہے۔ کھیتوں، درختوں کے جھنڈوں اور کاشت شدہ زمینوں میں موجود رہتا ہے۔ عام طور پر اس کے پر نسواری مائل سرخ ہوتے ہیں۔ سر، گلہ، سینہ اور پشت، گلابی اور قرمزی ہوتے ہیں۔

126: ہمالیائی سنہری چڑیا (کشمیری زبان میں سیرا) موسم بہار اور سرما کے دوران وادی میں جھنڈوں کی صورت میں پائی جاتی ہے اور موسم گرما کے دوران بلند، ڈھلوانوں پر پائی جاتی

ہے۔ میں نے اس کا ایک گھونسلہ تخت سلیمان میں ماہ مئی میں دیکھا جسے ایک پتھر کے نیچے زمین پر بنایا گیا تھا۔ یہ گھونسلہ گھاس اور کائی کا بنا ہوا تھا۔ اس کے آس پاس گھاس اور بالوں کی پرت تھی۔ اس گھونسلے کے اندر پانچ انڈے موجود تھے، جن کا رنگ خاکی تھا۔ اس پرندے کی آواز خوشگوار ہے اور اس کو آسانی سے پالا جا سکتا ہے۔

127: ہمالیائی سبز چڑیا کے بال و پر زرد اور زیتونی نسواری ہوتے ہیں۔ پہاڑی ڈھلوانوں، جنگلات اور کاشت شدہ علاقوں میں یہ پرندہ جھنڈوں کی صورت میں موجود ہوتا ہے۔ سنہری چڑیا کی نسبت یہ پرندہ اس قدر عام نہیں ہوتا۔

128: سرخ پیشانی والی چڑیا میں نے یہ پرندہ گلمرگ، وادئ سندھ، بانڈی پور اور دوسرے علاقوں میں دیکھا ہے اسے 8,000 سے 10,000 فٹ بلندی پر سرو کے جنگلات میں بھی دیکھا گیا ہے اور بعض اوقات 10 سے 50 فٹ کے فاصلے سے ایک محدب شیشے کے ذریعے اس کا معائنہ کیا ہے اور دیکھا ہے کہ میرے خیمے کے دروازے کے چند فٹ کے فاصلے پر یہ چگ رہا تھا۔ یہ خاموش عادات والا پرندہ ہے اس کی آواز تک میں نے نہیں سنی۔ یہ پرندہ چار سے چھ کے جھنڈ میں رہتا ہے مگر بعض اوقات جوڑوں کی صورت میں بھی دیکھا گیا ہے۔ یہ پرندہ، جون جولائی، اگست اور اکتوبر کے دوران دیکھا جاتا ہے۔ کشمیریوں کا کہنا ہے کہ موسم سرما کے دوران یہ نیچے اتر آتا ہے مگر میں نے اس پرندے کو بالائی جنگلات سے کہیں اور جاتے کبھی نہیں دیکھا۔

129: سنہری سینے والی چڑیا اس پرندے کی کشمیر میں 5,000 سے 10,000 فٹ بلندی کے درمیان نسل کشی ہوتی ہے جس کا انحصار موسم پر ہے۔ (اوٹس صفحہ 231) یہ پرندہ وادی میں موسم سرما کے دوران دکھائی دیتا ہے۔

130: ہندوستانی گھریلو چڑیا نہایت عام اور تمام وادی کی جانی پہچانی ہے۔ اپنے خالص رنگوں کے سبب یورپی گھریلو چڑیا سے مختلف ہے۔

131: دارچینی درختی چڑیا پہاڑی جھونپڑوں، درختوں کی جھاڑیوں اور جنگلی ڈھلوانوں پر 9000 فٹ کی بلندی تک پائی جاتی ہے۔ بسا اوقات یہ انسانی گرفت سے دور رہتی ہے اور Idicus کی نسبت زیادہ خاموش طبع ہوتی ہے۔ عام بال و پر دارچینی، سرخی مائل بادامی، پشت

پر چند سیاہ نشان، گلے پر ایک سیاہ پیوند' نیچے سے زردی مائل ہلکا بھورا لمبائی 5.5 انچ ہوتی ہے۔

ذیلی کنبہ چھوٹی چڑیا

132: صنوبر چھوٹی چڑیا موسم سرما کے دوران کشمیر میں 6,000 فٹ سے 9,000 فٹ کی بلندی پر پائی جاتی ہے۔ مگر مشرقی مرغزاروں چھوٹی چڑیا کی نسبت کم عام ہے۔ نر پرندے کے سر کا بالائی حصہ سفید جب کہ مادہ کا رنگ بھورا مائل ہوتا ہے۔ جرڈن کے مطابق اس پرندے کی لمبائی 6.5 انچ ہے۔ میں نے نر پرندے کی لمبائی 17.5 انچ پائی ہے۔

133: مشرقی مرغزاری چھوٹی چڑیا وادی میں نہایت عام ہوتی ہے۔ جھاڑی دار زمین اور جنگلات کے سروں اور کاشت شدہ علاقوں وغیرہ میں 5500 سے 9000 فٹ کی بلندی کے درمیان پائی جاتی ہے۔

134: سفید ٹوپی والی چھوٹی چڑیا وادی میں کھیتوں اور جھاڑیوں میں اور پہاڑوں پر 9,000 فٹ کی بلندی تک عام طور پر پائی جاتی ہے۔

135: بھورے سر والی کشمیری چھوٹی چڑیا جھاڑیوں، کھیتوں اور کھلی زمینوں پر عموماً پائی جاتی ہے۔ میں نے اسے نوبگ کشمیر میں دیکھا۔ اس کے علاوہ کشمیر کے دوسرے علاقوں میں بھی اسے پایا گیا۔

کنبہ چارک

136: ریگستانی چڑیا چارک وادیٔ کشمیر اور نچلی ڈھلوانوں کے علاوہ پہاڑوں کی بنیاد پر پائی جاتی ہیں۔ تھیوبالڈ کی تحریر کے مطابق لمبائی قریباً 6 انچ، پاؤں زرد، نسواری ہوتے ہیں۔

137: مشرقی کلنڈرہ چارک (کشمیری میں جل) ان کی چونچ محدب اور مضبوط ہوتی ہے۔ لمبائی 7.5 انچ، پَر 4.5 انچ، دم 4.5 انچ ہوتی ہے۔ (جرڈن، برڈس آف انڈیا جلد ii صفحہ 447) عام بال و پر، چارک کی مانند نیچے سے ہلکے، جس کے سینے کے بالائی حصے پر سیاہ بھورے نشان ہوتے ہیں۔ اس کا گانا نہایت سریلا ہوتا ہے اور ایک ایک گانے والے پرندے کے طور پر مقامی لوگ اسے پنجروں میں بند کر رکھتے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ موسم سرما کے دوران وادی میں کثیر تعداد میں موجود رہتا ہے۔ مقامی لوگ اس کو برف پر ایک چٹائی بچھا کر پکڑتے ہیں۔ جس پر دہ

اس کے چگنے کے لیے تھوڑے چاول رکھتے ہیں۔ چارک اس چاولوں کو کھانے کے لیے نیچے اُترتے ہیں۔اس کے بعد اسے بالوں سے بنا کر پھندے سے پکڑ لیتے ہیں۔ایک نیا پکڑا ہوا پرندہ دو سے چار آنے میں فروخت ہوتا ہے اور ایک تربیت یافتہ گانے والے پرندے کے عوض بارہ برطانوی روپے حاصل ہوتے ہیں۔ مجھے ایک پٹھان مخبر نے بتایا کہ اس نے ایک جال،غزنی سے لایا تھا جس کے عوض اس نے پچاس شلنگ لینے سے انکار کر دیا۔اس پرندے کو صحت مند بنانے کے لیے گھی پر لپٹی ہوئی دال کی خوراک دے کر کھلائی جاتی ہے۔بہت سارے پرندے نسل کشی کی خاطر مزید شمالی علاقوں تک جا کر بس جاتے ہیں۔

138: لمبی چونچ والا سنگینوں والا چارک میں نے خود بھی یہ چارک کشمیر میں نہیں دیکھا ہے مگر یہ پرندہ کافی بلندیوں پر پایا جاتا ہے۔

139: ہندوستانی چنڈول وادیٔ کشمیر میں نہایت فراوانی سے پایا جاتا ہے۔ یہ پرندہ موسم بہار، گرما اور خزاں میں ہوتا ہے۔اس کے ترنم سے سبھی واقف ہیں۔ مقامی لوگ اس کو ایک گلوکار پرندے کے طور پر رکھتے ہیں۔ میں نے ایک بار ایک چنڈول پر نظر رکھی جو گیت گاتی ہوئی زمین سے اڑی اور یونہی گاتے ہوئے وہ بلند پرواز کرتی گئی حتیٰ کہ وہ آنکھوں سے اوجھل ہوگئی اس نے زمین سے پرواز اور پھر واپسی کے لیے پندرہ منٹ کا وقت لیا۔اس قسم کے نرم پرندے کے لیے یہ کام گانے اور پٹھوں کی مشق کے لحاظ سے نہایت شاندار کاوش ہے۔

کنبہ ممولے

140: Hodgson's Pied Wagtail میرے خیال میں یہ پرندہ کشمیر میں نہایت عام ہے۔سردی اور گرمی دونوں موسموں میں یہ پرندہ پایا جاتا ہے۔ بعد کے موسم میں یہ پرندہ چھوٹے جھنڈوں کی صورت میں جمع ہوتا ہے اور کسی خاموش جوہڑ یا تالاب کی طرف گھاس یا بانسوں کے راستے نکل جاتا ہے۔نقل مکانی کے دوران M.Personata اور M. Alba بلاشک یہاں سے گذرتے ہیں۔

141: بھورا ممولا مندرجہ بالا ممولے (140) کے مقابلے میں پہاڑوں میں عام طور پر پایا جاتا ہے۔ میں نے اس پرندے کو 8,000 فٹ کی بلندی تک پرواز کرتے ہوئے وادی میں بھی

دیکھا ہے۔

142: : نیلے رنگ والا ہندوستانی موالنقل مکانی کے دوران کشمیر سے ہو کر گذرتا ہے۔ (اوٹس۔صفحہ 297)

143: پرندہ Hodgson's Yellow Headed Wagtail کشمیر کی گھاس اور جھیلوں اور جوہڑوں میں عام طور پر پایا جاتا ہے۔ یہ پرندہ نیلوفر کے پتوں پر دوڑتا ہوا دیکھا جاسکتا ہے۔ دلدلی نالوں اور کھائیوں وغیرہ میں عام طور پر موجود رہتا ہے۔ اس کے زرد اور سیاہ گرمائی بال و پر کے سبب بہ آسانی کے ساتھ پہچانا جاسکتا ہے۔

144: پرندہ Brown Roch Pipit پاندر تھن کے نزدیک پہاڑوں کے دامن میں 23 مئی 1894 میں کھلی ڈھلوانوں پر یہ پرندہ دیکھا گیا۔ اس کے پروں کا قرینہ، قد وقامت رنگ اور پروں کی ترچھی بیرونی نوک کے علاوہ بجا طور پر قوسی عقبی پنجہ جرڈن کی A.Sordida سے من وعن مطابقت رکھتی ہے۔ (برٹش آف انڈیا جلد ii صفحہ 236)، مگر چونچ نسبتاً 1/4 سے 1/5 زیادہ تھی۔ بلتھ نے اسے شمال مغربی ہمالیہ سے حاصل کیا اور مسٹر تھیو بالڈ نے اسے پنجاب کے پہاڑی علاقوں میں پایا۔ اس نے قریباً 5300 فٹ کی بلندی پر اس کا شکار کیا۔ لمبائی 8 انچ، پر 3.75 انچ، دُم 3.25 انچ سامنے سے چونچ 0.5 انچ سے 3/5 انچ، ٹخنے کی ہڈیاں 1.25 انچ تھی۔ ایڑی اور پنجہ 15/18 انچ، اولین بنیادی منٹ، دوسرا، تیسرا، چوتھا اور پانچواں پر بتدریج لمبے ہوتے جاتے ہیں۔

145: پرندہ Hodgsons' Pipit کشمیر سے آسام تک ہمالیہ کی زیریں ڈھلوانوں پر پایا جاتا ہے۔ (اوٹس صفحہ 311)

کنبہ رینگنے والے پرندے

146: پرندہ Himalayan Tree Creeder جنگلات میں عام طور پر پایا جاتا ہے اور موسم بہار اور خزاں کے دوران یہ پرندہ وادی کے درختوں کے جھنڈوں اور پھلوں کے باغات میں اور بلند جنگلات میں پایا جاتا ہے۔

147: پرندہ Hodgso's Tree Creeper برف کے نزدیک صنوبر کے جنگلات

میں کہیں کہیں پایا جاتا ہے۔(اوٹس صفحہ 330)

148: پرندہ Hodgson's Tree- Creeper اکثر اوقات کشمیر میں موسم خزاں اور موسم سرما کے دوران دیکھا گیا ہے۔ میں نے اس پرندے کو موسم گرما کے دوران نہیں دیکھا ہے۔ پہاڑوں کی چٹانوں، ٹیالے کناروں اور کھڑی چٹانوں میں اکثر آتا رہتا ہے۔ اس کے پروں پر شوخ قرمزی ٹکڑا اس وقت عیاں ہوتا ہے جب یہ پرندہ پرواز کر رہا ہوتا ہے۔ یہ ایک خوبصورت پرندہ ہے جو ایک چٹان سے دوسری پر پھدکتا رہتا ہے۔ یہ پرندہ کیڑے مکوڑے کھاتا ہے۔

149: پرندہ White-Cheeked Nauthatch جنگلات میں نہایت عام ہے سرو اور صنوبر کے درختوں پر اکثر بیٹھتا ہے۔ اس کی آواز چھوٹے بچے کی آواز سے مطابقت رکھتی ہے۔ یہ آواز کشمیر کے کسی بھی جنگل میں سنائی دیتی ہے۔

150: پرندہ Brook's Nuthatch بھی کشمیر میں پایا جاتا ہے۔ حالانکہ متذکرہ بالا پرندہ کی نسبت یہ پرندہ اس قدر عام نہیں ہے۔

کنبہ پھدکی پرندے

151: پرندہ The Crested Brown Tit ایڈمز نے اس پرندے کو دیکھا اور اسے برڈس آف کشمیر کی فہرست میں شامل کیا۔

152: Indian Grey Tit یہ پرندہ عام ہے اور پالتو ہے۔ جب میں 1890 میں ایک دوست کے ہمراہ گلمرگ میں قیام کر رہا تھا تو ایک پرندہ بار بار ہمارے خیمے میں آیا کرتا تھا۔ وہ ہمارے ناشتے کی میز کے قریب آ کر بیٹھ جاتا اور چھوٹے چھوٹے ریزے کھایا کرتا اور ایک پردے کی آڑ میں رات بھر خیمے کے اندر ہی موجود رہتا۔ رات کے کھانے کے وقت قندیلوں اور گفتگو کی رخنہ اندازی کی اسے بالکل پروا نہ تھی۔

153: The Crested Black Tit یعنی Lophpphanes Melanolophus نے اس پرندے کو درج کیا ہے اور میں نے خود بھی اس پرندے کو کشمیر کے جنگلات میں دیکھا ہے۔

154: پرندہ The Green Backed Tit کشمیر سے بھوٹان تک ہمالیہ میں بھی

مقامات پر پایا جاتا ہے۔(اوٹس صفحہ 50)

155: Aggitha Liscus Niveigularis پرندہ کو میں نے گلمرگ میں پایا اور اس پرندے کا معائنہ کیا ہے۔(اوٹس صفحہ 50)

156: The Yellow Browed یہ پرندہ کشمیر سے بھوٹان تک ہمالیہ میں تمام مقامات پر موجود ہے۔(اوٹس صفحہ 54)

ذیلی کنبہ جنگ پرندہ حقیقی

157: The Rufous-Backed Shrike پرندہ ہی ایک حقیقی جنگ پرندہ Shrike ہے جسے میں نے یہاں دیکھا ہے۔ یہ یہاں مارچ کے آخر پر وارد ہوتا ہے اور موسم خزاں میں دوبارہ غائب ہوجاتا ہے۔ یہ پرندہ 6500 فٹ تک جاسکتا ہے۔ یہ ایک نقال پرندہ ہے میں نے اسے سیاہ تیتر، چھوٹے باز وغیرہ پرندوں کی کامیابی کے ساتھ نقل اتارتے ہوئے دیکھا ہے۔

کنبہ سیلوائیڈ

158: Indian Great-Reed Warbiliro جھیلوں اور لمبے بانسوں میں کثیر تعداد میں موجود ہے۔ نیز دریاؤں کے طویل کناروں میں ملتا ہے جہاں لمبی گھاس موجود ہوتی ہے۔ یہ پرندہ اپریل سے اگست تک ملتا ہے۔ اس پرندے کی آواز کرخت ہوتی ہے۔

159: Large Billed Bush Warbler پرندہ موسم گرما کے دوران تمام وادی کشمیر میں موجود ہوتا ہے۔(اوٹس صفحہ 363)

160: Hume's Lesser White- Throa Ted Warbler پرندہ کشمیر میں 9,000 فٹ کی بلندی پر نسل کشی حاصل کرتا ہے اور موسم سرما کے دوران ہندوستان کے میدانوں میں اس کی نسل کشی ہوتی ہے۔

161: Indian Lesser White Throated Warbler پرندہ بروکس نے چہچہانے والا یہ پرندہ 5,000 سے 6,000 فٹ کی بلندی پر ماہ مئی کے دوران چھوٹی جھاڑیوں اور دریاؤں کے کناروں میں دریافت کیا۔(اوٹس صفحہ 387)۔

162: Tytler's Willow Warbler کشمیر سے کماؤں تک ہمالیہ پربت میں موسم

گر ما بسر کرتا ہے اور موسم سرما کے دوران ان ہی کے دامن میں نیچے آتا ہے۔ اس کے علاوہ جزیرہ نما میں بھی موجود رہتا ہے۔ (اوٹس صفحہ 402)۔

163: Brown Willow-Warbler کشمیر کے ہمالیائی خطے کے مختلف حصوں میں موسم گرما گذارتا ہے۔ (اوٹس صفحہ 403)

164: Olivāceous Willow -Warbler کشمیر میں نسل کشی حاصل کرتا ہے اور موسم سرما کے دوران میدانوں میں چلا جاتا ہے۔ (اوٹس 404)

165: Brooks Willow Warbler پرندہ کشمیر میں نسل کشی کرتا ہے۔ (اوٹس صفحہ 409)

166: Green Willow Warbler پرندہ غالباً کشمیر میں نسل کشی کرتا ہے۔ یہ موسم سرما ہندوستانی جزیدہ نما میں گذارتا ہے۔ (اوٹس 413)

167: Blyth's Crowned Willow- Warbler پرندہ کشمیر سے سکم تک کے ہمالیائی خطے میں موسم گرما کے دوران دیکھا گیا ہے اور غالباً نچلی وادیوں میں موسم گرما گذارتا ہے۔

168: Hodgson's Grey-Headed Flycatcher Warbler پرندہ نیپال سے کشمیر تک (اوٹس صفحہ 120) جنگلوں میں بہت عام اور جنگلات میں 8,000 فٹ کی جھاڑیوں میں موجود رہتا ہے۔

169: The Pale Bush- Warbler پرندہ کشمیر میں نسل کشی کرتا ہے۔ (اوٹس صفحہ 437)

170: Tge Brown Hill Warbler پرندہ کشمیر سے بھوٹان تک ہمالیہ میں تمام تر مقامات پر پایا جاتا ہے۔ (اوٹس صفحہ 445)۔

171: The Indian Wren-Warbler پرندہ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ یہ وادی میں موجود ہوتا ہے۔

کنبہ ترغا

172: The Spotted Fork Tail پرندہ چھوٹی پہاڑی ندیوں خاص طور پر ان جنگلی

کناروں پر جہاں آبشار موجود ہوں عام طور پر پایا جاتا ہے۔ بال و پر، عام طور پر سیاہ وسفید ہوتے ہیں یہ آپ کے سامنے تیزی سے گذر جانے کے معاملے میں کافی چالاک ہے۔ خوشگوار اور سیٹی کی مانند آواز نکلتا ہے۔ لمبائی 16 انچ ہوتی ہے۔

173: Little Fork- Tail پرندہ بڑے بڑے ندی نالوں کے کنارے دیکھا جاتا ہے مگر H.Maculatus کی مانند عام نہیں۔ جرڈن کا بیان ہے کہ یہ سرمئی واٹر رابن Rhyacornis Fuliginosa کے ساتھ چٹان پر بیٹھ کر مطمئن رہتا ہے اور اکثر مؤخرالذکر اسے ختم کر دیتا ہے۔ یہ بات میں ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں۔

174: The Indian Bush- Chat پرندہ وادی اور نچلی ڈھلوانوں میں موسم بہار اور گرما کے دوران عام طور پر پایا جاتا ہے۔ موسم سرما کے دوران ہندوستان چلا جاتا ہے۔

175: Gould's Wheatear پرندہ موسم گرما کے دوران 7,000 سے 9,000 فٹ بلند مرغزاروں میں پایا جاتا ہے۔ یہ پرندہ کافی عام نہیں ہے۔

176: The Plumbeous Redstart اس کے نام سے اس ننھے پرندے کا رنگ ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس کی دُم سوختہ سرخ ہوتی ہے جسے وہ پھیلاتا ہے اور پہاڑی ندی میں چٹان میں بیٹھ کر اس کے ساتھ اٹھکھیلیاں کرتا ہے۔ 7,000 فٹ کی بلندی پر واقع تمام پہاڑی ندی نالوں میں یہ پرندہ عام طور پر پایا جاتا ہے اور اپنی دل پسند چٹان کو دراندازوں سے بچانے کے لئے کافی جھگڑالو ہوتا ہے۔

177: White -Capped Redstart پرندہ کشمیر کے تمام دریاؤں اور پہاڑی نالوں میں پایا جاتا ہے۔ اس پرندے کے سیاہ اور شاہ بلوطی رنگ کے بال پر اور سفید ٹوپی کی وجہ سے اسے آسانی سے پہنچانا جا سکتا ہے۔ یہ پرندہ کافی اضطراب میں رہتا ہے اور صاف وھاتی سیٹی کی آواز نکالتا ہوا پیہم ایک چٹان سے دوسری پر پھدکتا رہتا ہے۔

178: The Blue - Fronted Restart پرندہ گلگت سے لے کر کشمیر اور یہاں سے آسام تک پایا جاتا ہے۔ (اوٹس صفحہ 92)

179: Eversmann's پرندہ کشمیر کے ہر حصے میں موسم سرما کے دوران وارد ہوتا ہے۔

(اونس صفحہ 94)

180:Red Flanked Bush-Robin پرندہ، 7000 سے 8,000 فٹ بلند جنگلات میں پایا جاتا ہے۔ اوپر سے اس کا رنگ نیلا اور نیچے سے سرخی مائل بادامی ہوتا ہے جب کہ اس کے ابرو سفید ہوتے ہیں۔ یہ پرندہ زیادہ عام نہیں ہے۔

181: ہندوستانی نیل کنٹھ پرندہ، میں نے یہ پرندہ مارچ اور اپریل میں دیکھا ہے۔ اس کے زردی مائل نسواری بال و پر کو اس کے گلے اور سینے کے بالائی حصے نیلے آسمانی رنگ سے راحت حاصل ہوتی ہے۔ یہ پرندہ پہاڑوں کے دامن میں جھاڑیوں وغیرہ پر اکثر اوقات نمودار ہوتا ہے۔ مادہ پرندے کی چھاتی بھدی ہوتی ہے جس کے کناروں پر سیاہی مائل نشان ہوتے ہیں۔

182:پرندہ Jerdon's Accentor کیپٹن کک نے اسے سونہ مرگ کے نزدیک نسل کشی کرتے ہوئے دیکھا ہے اور غالباً یہ پرندہ وادی کے بہت سارے ضلعوں میں پایا جاتا ہے۔

183:پرندہ Blue Rock Thrush میں نے اس چٹانی پرندہ کو اکثر اوقات پہاڑیوں پر دیکھا ہے۔ تنہا یا جوڑے کی صورت میں سرینگر میں تخت سلیمان پر پایا جاتا ہے۔ جہاں پر مجھے یقین ہے کہ ان کی نسل کشی ہوتی ہے۔ اس پرندے کو دیکھنے کے بعد مجھ میں اس کا گھونسلہ تلاش کرنے کا اشتیاق بڑھ گیا۔ موسم سرما کے دوران وادی کشمیر سے غائب ہو جاتا ہے۔

184:Blue Headed Rock Thrush پرندہ میں نے یہ لدر وادی میں پہلگام کے مقام پر دیکھا ہے جہاں پر مئی کے مہینے میں یہ پرندہ اکثر وارد ہوتا ہے۔

185:پرندہ Dusk Ground Thrush کشمیر کا نغمہ زن وادی کشمیر میں عام طور پر پایا جاتا ہے جو چنار کے درختوں کے جھنڈوں پر اور باغات وغیرہ میں اکثر اوقات نمودار ہوتا ہے۔ اس کی بولی اپریل سے جولائی تک سنی جا سکتی ہے یہ پرندہ کیڑوں مکوڑوں کی تلاش میں دن بھر نغمہ زن ہوتا ہے۔ خاص طور پر صبح اور ان دنوں کے دوران جب آسمان پر ابر آلود گھٹائیں گھری ہوں۔ ایڈمز اس پرندے کا موازنہ سیاہ بلبل کے ساتھ کرتا ہے مگر یہ پرندہ اس سے بھی زیادہ انگریزی ترنمے Trudus Musicus سے مطابقت رکھتا ہے۔

186:Central Asian Black Bird پرندہ میں نے کشمیر سے متعلقہ اس پرندے

کے نمونوں کا معائنہ کیا ہے۔(اوٹس صفحہ 124)

187: Grey-Winged Black Bird پرندہ مقامی لوگ اس پرندے کو کستور سے موسوم کرتے ہیں مگر یہ کشمیر میں ناپید ہے اس کا نغمہ نہایت شیریں اور انگریزی بلبل کے ساتھ گہری مطابقت رکھتا ہے ایک بھورے ڈلے کے سوا اس پرندے کے پر اور پروں کے اندر کا حصہ نہایت اچھا خاصا ہے۔ایک نغمہ زن پرندے کے طور پر اس کی اچھی قیمت وصول ہوتی ہے۔

188: پرندہ Grey Heade Ouzel ایک خوبصورت ترنم ہونے کے علاوہ خاص طور پر وادی کے جنوب اور جنوبی مشرق میں رہتا ہے۔یہ پرندہ عام طور پر شام کے وقت سرو کے درخت کی چوٹی پر بیٹھ کر گاتا ہے اور اس کا گانا نہایت دل فریب ہوتا ہے جو ہمارے انگریزی ترنمے کی آواز کے قریب ترین ہے۔میں اس پرندے سے متعلق تفصیل بیان کرتا ہوں۔نر۔سر خاکی سفید، تاج پر گھر گہرا، گلے اور گردن پر ہلکا ہے۔اس کے پَر اور دُم سیاہی مائل ہیں۔مادہ پرندے کے رنگ قدرے کم شوخ اور زیادہ بھورے ہیں، ٹھوڑی اور گلے کا رنگ سفید، چونچ، ابرو اور ٹانگیں زرد ہیں۔لمبائی 10.5 انچ۔موسم گرما میں یہ پرندہ گلمرگ میں ظاہر ہوتا ہے۔میں نے اس پرندے کا نغمہ ڈنڈوار میں ماہ اپریل میں سنا ہے جس وقت جنگلوں میں برف کی تہہ ابھی گہری ہوتی ہے۔مئی اور جون کے دوران اس کی نسل کشی ہوتی ہے اور یہ اپنا گھونسلہ بدلو(سرو) کے درخت پر بناتا ہے۔یہ چار سے پانچ سبزی مائل نیلے نسواری نشانات والے انڈے دیتا ہے۔

189: The Black Throated Ouzel پرندہ بہار کی شروعات کے دوران نہایت عام ہوتا ہے۔وادی میں بید کی جھاڑیوں، پھلوں کے باغات اور بعد از اں موسم خزاں کے اواخر میں یہ پرندہ کم بلند پہاڑیوں کے دامن میں واقع جھاڑی دار جنگلات میں پایا جاتا ہے۔موسم خزاں کی شروعات میں یہ بلند پہاڑیوں کے جنگلات میں بھی نمودار ہوتا ہے۔میں نے یہ پرندہ موسم گرما کے دوران دیکھا ہے چنانچہ یہ نہیں جانتا کہ اس کی نسل کشی کہاں ہوتی ہے۔کبھی کبھی میں نے یہ پرندہ موسم سرما کے دوران بھی دیکھا ہے۔

190: The Feildfare پرندہ جنگلات کے اندر کافی عام ہوتا ہے۔میں نے اسے 20 یا اس سے زیادہ تعداد میں جھنڈ کی شکل میں دیکھا ہے۔یہ جنگلات کی سطح سے بلند تر چٹانوں پر،

کھلے مرغزاروں کے اردگرد پایا جاتا ہے۔ عام طور پر یہ پرندہ شرمیلا ہوتا ہے اور اپنی ہلکی آواز کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے۔ ''ٹررر'' کی آواز کو دہراتا ہوا یہ پرندہ ایک سے دوسرے درخت تک پرواز کرتا ہے۔ کھانے کے معاملے میں یہ پرندہ بہت اچھا ہے۔ ایڈمز رقمطراز ہے کہ میں نے یہ پرندہ پہاڑیوں میں موسم گرما اور موسم خزاں کے دوران دیکھا ہے۔

191: Yellow - Billied Whistling Thrush پرندہ پہاڑی ندی نالوں کے علاوہ باغات اور جھاڑیوں کے اردگرد عام ہوتا ہے۔ اس کی آواز بلند صاف اور موسیقی سے لبریز سیٹی دار ہوتی ہے اور مقامی عوام الناس میں Merula Boulboni کے ساتھ مشترکہ طور پر اسے کستور کا نام دیا گیا ہے۔ کبھی کبھی انگریز اسے سیاہ بلبل بھی کہتے ہیں۔ اس پرندے کا رنگ سیاہ ہوتا ہے۔ جس پر نیلگو چمک ہوتی ہے۔ چند پہاڑی نالوں پر لٹکتی ہوئی چٹانوں اور پلوں کے تلے یہ پرندہ اپنا گھونسلہ بناتا ہے۔ اس کی نسل کشی مئی اور جون مہینے کے دوران ہوتی ہے۔ موسم سرما کے دوران ہندوستانی پہاڑیوں کی جانب نقل مکانی کر جاتا ہے۔ میں نے اس پرندے کو ہر موسم کے دوران گاتے ہوئے سنا ہے۔

کنبہ تیرنے والے پرندے

192: Brown Dipper پرندہ رواں دواں ندی نالوں میں ملتا ہے۔ ان کے راستوں پر پرواز کرتا ہے۔ کبھی کبھی یہ پانی میں غوطہ لگالیتا ہے اور جان بوجھ کر اس میں چلتا ہے۔ بسا اوقات یہ ندی کی سطح کے نیچے جا کر پتوں اور آبی کیڑوں کی تلاش کرتا ہے۔

193: White Breasted Asiatic Dipper اس پرندہ کی بابت جرڈن رقمطراز ہے کہ یہ پرندہ کشمیر کے بلند پہاڑوں کے ندی نالوں میں ہی پایا جاتا ہے۔ جہاں سے اسے ڈاکٹر ایڈمز نے لایا تھا۔ میں نے اس پرندے کو ایسے ہی علاقوں میں دیکھا ہے۔ 14,000 فٹ بلند کوتوال چوٹی کے مشرقی دامن میں ایک چھوٹے سے جوڑ پر واقع میں نے دیکھا کہ یہ پانی پر چکر کاٹ رہا ہے کیونکہ یہاں پر ابھی بھی ایک مچھلی اُبھری تھی۔ جب میں دوسری مچھلی کو ابھرتے ہوئے دیکھ رہا تھا کہ ایک غوطہ زن پرندہ آیا اور مجھے دیکھ کر وہ اس چھوٹی ندی کے راستے نیچے کی طرف پرواز کر گیا جو بور پھاروں کی پہاڑی سے نیچے وادی سندھ کی طرف جاتی ہے۔

کنبہ گانے والی چڑیا

194: پرندہ: کشمیری گانے والی چڑیا کو ایڈ مز نے پتھریلے مقامات، ڈھلوانوں اور کشمیر کے پہاڑوں میں واقع برفانی طوفان والے علاقوں کے سروں میں دیکھا۔ یہ پرندہ عام طور پر پایا جاتا ہے۔ میں نے اس پرندے کو زیریں علاقوں میں جھاڑیوں وغیرہ میں دیکھا ہے۔ اپنے طور طریقوں کے معاملے میں یہ پرندہ انگریزی چڑیا سے کافی مطابقت رکھتا ہے۔

کنبہ باتونی ترغہ

195: پرندہ The Western Varigated Laughing Thrush
7000یا8000فٹ پر کافی عام ہوتا ہے جو جھاڑیوں اور گھاس کے اندر اور جنگلات کے سروں میں اکثر اوقات نمودار ہوتا ہے۔ اس کی آواز پرشور اور سیٹی دار ہوتی ہے جسے یہ بار بار دہراتا ہے۔

196: پرندہ The Rufous Chinned Laughing Thrush
8000یا9,000فٹ پر کشمیر کے جنگلات یا پہاڑوں پر واقع گھنے علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ اس کے چہچہانے کی آواز مدھم ہوتی ہے جو اس کے رین بسیرے میں داخل ہونے سے پہلے سنائی دیتی ہے۔

197: پرندہ Streaked Laughing Thrush کشمیر کے باغات اور پہاڑیوں کی جانب جھاڑیوں میں عام طور پر پایا جاتا ہے۔ یہ موسم سرما کے دوران یہاں ٹھہرتا ہے۔

کنبہ بلبلیں

198: پرندہ White Cheeked Crested Bulbul وادی کا ایک مستقل باشندہ ہے مگر یہ پرندہ بلندیوں تک نہیں جاتا۔ یہ پرندہ نہایت عام اور پالتو اور کوتاہ اندیش ہوتا ہے۔

مکانوں اور کشتیوں میں بلا جھجک داخل ہو جاتا ہے۔ میں نے ایک پرندہ کھانڈ کے برتن پر بیٹھے ہوئے دیکھا جو مجھ سے دو فٹ کے قریب فاصلے سے کھانڈ چرا کر لے گیا۔ یہ پست درختوں یا جھاڑیوں میں اپنا گھونسلہ تیار کرتا ہے۔ اس کے انڈوں کا رنگ سفید ہوتا ہے جس پر قرمزی رنگ کا داغ ہوتا ہے۔ باغات اور پھلوں کے باغات کے لیے یہ تباہ کن پرندہ ہے جو غنچوں اور پھلوں کو تباہ کر دیتا ہے۔

کنبہ کوئل۔ جلاد پرندہ

199: The Short Billed Minivet پرندہ (یورپی باشندوں کے لیے ہندوستان میں رلجہ برڈ ہے) عام طور پر یہ پرندہ پہاڑی جنگلات اور بسا اوقات زیریں بلندیوں پر ایک دوسرے درخت پر جھنڈوں کی صورت میں اڑتا ہوا دیکھا جاسکتا ہے۔ جہاں یہ پرندے اجلی چمکتی دھوپ میں گلناری اور سیاہ رنگوں میں مادہ پرندہ زرد اور بھورے رنگوں میں نمودار ہوتے ہیں۔ اس پرندے کی ہلکی چہچہانے والی آواز ہے۔ موسم سرما کے دوران یہ پرندہ میدانوں اور زیریں پہاڑوں کی طرف نقل مکانی کر جاتا ہے۔

کنبہ مکھی مار چڑیا

200: The Verditer Flycatcher پرندہ: بسا اوقات یہ پرندہ تنگ جنگلی گھاٹیوں اور درختوں کے جھنڈ کے درمیان پایا جاتا ہے۔ اپنی ہلکی نیلی رنگت کے سبب یہ پرندہ نہایت منفرد ہے۔

201: The Sooty Flycatcher پرندہ: کشمیر کا ایک مستقل باشندہ ہے۔ اس کی نسل کشی جون میں ہوتی ہے۔

202: The Indian Red-Brested Flycatcher پرندہ موسم گرما کشمیر میں گذارتا ہے اور موسم سرما کے دوران لنکا میں چلا جاتا ہے۔

203: The Slaty Blue Flycatcher پرندہ ماہ جون کے اوائل میں کشمیر میں نسل کشی کرتا ہے جب اس کا گھونسلہ بروکس نے تلاش کر لیا تھا۔

204: The Slaty Blue Flycatcher پرندہ عام نہیں ہے۔ عام طور پر 6,000 فٹ کی بلندی پر جنگلوں اور جھاڑیوں وغیرہ میں دکھائی دیتا ہے۔ یہ پالتو ہونے پر راضی ہوجاتا ہے۔ کسی کے خیمے کے نزدیک ایک شاخ پر بیٹھ کر وہ اپنی چونچ کیڑے مکوڑوں پر مارتا ہے اور ہر مرتبہ وہ اپنے مقام پر واپس آجاتا ہے۔ (ایڈمز کے کشمیر میں مشاہدات)۔

205: پرندہ The Rufous Tailed Flycathera کشمیر میں موسم گرما کے دوران موجود رہتا ہے۔

206: پرندہ The Indian Paradise Flycather

وادی میں عام ہے۔ مختلف اطراف کی تنگ گھاٹیوں اور زیر جنگلی ڈھلوانوں میں موسم گرما کے دوران پایا جاتا ہے۔ یہ ماہ اپریل میں وادی میں آ جاتا ہے۔ نر پرندہ اپنے دو برسوں کے دوران اوپر سے شوخ شاہ بلوطی اور نیچے سے سفید ہوتا ہے اور تیسرے موسم کے دوران سفید پَر نکال لیتا ہے۔ میں نے انھیں شاہ بلوطی رنگ لمبی دُم اور سفید پروں کے ساتھ دیکھا ہے۔ اس کا گھونسلہ دیدہ زیب انداز سے مکڑے کے جالے کی طرح بھوری کائی کا بنا ہوتا ہے۔ یہ 5 سے 6 انڈے دیتا ہے۔ جن پر سرخی مائل دھاریاں ہوتی ہیں۔

کنبہ ابابیل

207: Common Swallows کشمیر میں اسے کتج کہتے ہیں۔ ماہ فروری کے اواخر میں وارد ہوتا ہے اور اپریل میں مکمل طور پر رہائش پذیر ہوتا ہے۔

208: پرندہ Kashmir House Martin اوپر سے یہ پرندہ سیاہ ہوتا ہے جس پر فولادی بھورے رنگ کا عکس ہوتا ہے۔ اس کی دُم بھوری مائل سیاہ ہوتی ہے۔ گلہ اور اس کے نیچے کی تہہ مکمل طور پر سفید ہوتے ہیں۔ طرفین سے یہ نسواری رنگ کا ہوتا ہے۔ اس کے شانوں کے نیچے بغلی بال وغیرہ گہرے نسواری رنگ کے ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر ایڈمز نے یہ پرندہ کشمیر کے دریاؤں کے چٹانی کناروں پر دیکھا۔ غالباً کشمیر میں پرندہ Common House Martin بھی موجود ہے مگر میں ابابیلوں کے چند نمونے کی شناخت نہ کر سکا۔

رینگنے والے زمینی کیڑے

کشمیر میں سانپوں کو سُرف کہتے ہیں۔ میں نے وادی کے تمام حصوں میں سانپ دیکھے ہیں۔ یہ بات مشہور ہے کہ وادی کے ان حصوں کے سانپ زہریلے نہیں ہیں جہاں سے ہرمکھ کی چوٹی نظر آتی ہے۔ وادی کشمیر میں دو قسم کے زہریلے سانپ موجود ہیں۔ ایک کو گنس کہتے ہیں جو وادی سندھ میں پایا جاتا ہے اور دوسرے کو پوہر کہتے ہیں جو وادی لدر کے مشرق میں ملتا ہے۔ مقامی لوگوں کا کہنا ہے کہ جب پوہر بوڑھا ہو جاتا ہے تو اس کی پشت پر بال نمودار ہو جاتے ہیں۔ گنس اور پوہر کا کاٹا عام طور پر جان لیوا ثابت کیا جاتا ہے اور میں نے ایک تجزیہ کرنے والے شخص کو اس وقت گنوا دیا جب اُسے سونہ مرگ کے مقام پر پر گنس نے کاٹ لیا۔ گنس کے بارے

میں ڈاکٹر ایملی رقمطراز ہے۔"یہ زیگنوں سر والا چھوٹا اور موٹا سانپ ہے جو کشمیر کے پہاڑوں میں پایا جاتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ سانپ پشت سے سیاہ اور پیٹ سے زرد ہے چند مقامی لوگوں کے مطابق یہ سانپ ڈیڑھ فٹ لمبا ہوتا ہے اور اس کا رنگ خاکی ہے اس کا کاٹنا مہلک ہوتا ہے۔ کسی شخص کو بازو یا ٹانگوں پر اگر گنس ڈنک مارتا ہے تو اس پر دل اور زخم کے درمیان پٹی باندھ دی جاتی ہے جس پر جھاگ کا لیپ لگایا جاتا ہے۔ مریض کو ان گلابوں کا عرق نکالنا ہوتا ہے جو اسے کھانے کے لیے دیے گئے ہوں جب کہ مریض کو خوش رکھنے کے لیے موسیقی کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ سانپوں کے کاٹنے کا یہ مقامی علاج ہے۔ لار پرگنہ میں گنس کثیر تعداد میں موجود ہوتی ہے۔ وادی کے جنوبی حصے میں سانپ کبھی دکھائی نہیں دیے۔

چھپکلیاں (کینک نٹ) اور مینڈک (منہ مونڈج) بھی پہاڑی ڈھلوانوں میں عام طور پر پائے جاتے ہیں۔ بچھو (بچھ) بھی عموماً پایا جاتا ہے۔ کشمیر میں بچھو بہت زہریلے ہوتے ہیں۔ لوگ بچھو کے ڈنک کی پروا نہیں کرتے۔ پانچ پانچ انچ کی لمبائی تک ہزار یا کن کھجورا بھی وادی میں پایا جاتا ہے۔

کیڑے مکوڑے

یہاں مکھیاں اور بڑ مکھیاں فراوانی سے موجود ہیں مگر وادی کے نچلے حصوں میں موجود مچھر زیادہ نقصان دہ ہیں۔ میں نے ہندوستان بھر میں اتنے مچھر نہیں دیکھے جس قدر سرینگر سے نیچے دریائے جہلم اور جھیلوں پر پائے جاتے ہیں۔ شام کے وقت وہ کیمپ میں آدھمکتے ہیں۔ اگر مچھر (موہ) کی پیہم موجودگی سے بچنا ہو تو آگ کے پاس بخارات کے قریب بیٹھنا چاہیے۔ اگرچہ کشمیر میں ہندوستان کے مقابلے میں زیادہ مچھر ہوتے ہیں مگر یہ مچھر نسبتاً کم زہریلے ہوتے ہیں۔ کشمیری مچھر کا کاٹنا اس قدر خارش آمیز نہیں جتنا اس کے ہندوستانی برادر کا ہوتا ہے۔ بعض اوقات بلند مقامات پر بھی مچھر موجود ہوتے ہیں۔ 11,800 فٹ بلند راج دیا گن درے پر مچھر عموماً نمودار ہوتے ہیں وہ بہت ظالم ہوتے ہیں۔ پسو (پش) اور کھٹمل (ژر) اور دوسرے ناخوشگوار کیڑے مکوڑے بھی عام طور پر پائے جاتے ہیں۔ اور کشمیریوں کا کہنا ہے کہ اگرچہ ان کے مقامی ڈاکٹروں نے ان سے پیدا شدہ تمام بیماریوں کا علاج تلاش کرلیا ہے مگر وہ پشوؤں کے لیے خاص دوائی

تلاش کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ بلند علاقوں میں واقع جنگلات میں جھجڑ کی اچھی خاصی تعداد ہے۔ یہ خاص طور پر ان علاقوں میں پائے جاتے ہیں، جہاں برف پگھل چکی ہو اور جہاں بڑے سر والی بڑ مکھی بلند سطح پر واقع مرغزاروں میں جولائی اور اگست کے مہینوں میں بھاری تعداد میں پائی جاتی ہے۔ یہ کیڑا نہایت جارح ہے۔

ٹڈی (ہاٹو) کبھی کبھار کشمیر میں آگھستی ہے۔ سال 1868 میں ٹڈی دل نے دھان کی فصلوں کا بھاری نقصان کیا۔ 1891 کے موسم گرما کی شروعات میں بڑے بڑے جھنڈ نمودار ہوئے مگر اطمینان کی بات یہ ہے کہ انھیں اطراف کی وادیوں کی طرف دھکیل دیا گیا اور برف میں وہ ٹڈی دل نیست و نابود ہو گیا جہاں ان کے منجمد جسموں پر لالچی ریچھ ٹوٹ پڑے۔ چنانچہ 1891 میں فصلوں کا کوئی نقصان نہیں ہوا۔ ایک کیڑا کیٹر پلرز (پتنگا) کشمیر میں (مُہر) کے نام سے جانا جاتا ہے جس سے درختوں خاص طور پر پوہ (Wych Hazel) کے درختوں کو بھاری نقصان پہنچتا ہے۔ چند دنوں میں مُہر جنگلات سے درختوں کے پتوں کو صفاچٹ کر جاتا ہے مگر پتوں کا یہ نقصان دائمی نہیں ہوتا بلکہ پتے دوبارہ پیدا ہو جاتے ہیں۔

سبزیوں کو لگنے والے کیڑوں میں کھونگا (ہانگو) جونک (دیرک) اور مچھلی کے مانند کیڑے کو ڈاڈو کہتے ہیں۔ یہ کیڑے دھان کے پودے کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ جونک کو خون چوسنے کے لیے استعمال میں لایا جاتا ہے۔ اور اس کی درآمد پنجاب سے کی جاتی ہے۔

ڈرزا ایک سیاہ بنیادی کیڑا ہے جو مکئی اور کپاس کی جڑوں کو نقصان پہنچاتا ہے اور سبزیوں کے کیڑوں میں بدترین کیڑا مانا جاتا ہے۔

مچھلی

مچھلی کشمیریوں کی غذا کا ایک اہم حصہ ہے اور جو لوگ جھیلوں کے نزدیک رہتے ہیں یا جو کشتی رانوں کی رواں دواں آبادی ہے ان کی زندگی کا زیادہ تر انحصار اپنے جالوں کے ذریعے حاصل کردہ شکار یا ماہی ڈور پر ہے۔ تازہ مچھلیاں تیل کے ساتھ کھائی جاتی ہیں یا انھیں بلا نمک ملائے خشک کر کے موسم سرما کے لیے محفوظ کیا جاتا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ کشمیری خواتین کی زرخیزی کا سبب مچھلی اور تیل کی خوراک ہے۔ اس وقت مچھلی کو محفوظ رکھنے کے لیے اقدامات کرنے کی

ضرورت نہیں ہے۔ مثلاً ڈائنامائٹ کا استعمال وغیرہ بدعتوں کا چلن کشمیر میں اس قدر عام ہے کہ کشمیر میں ابھی ان طور طریقوں کا پتہ نہیں ہے۔ مچھلیوں کی فراہمی میں کمی کی مجھے کوئی شکایت نہیں ملی ہے۔ قیمتوں میں حالانکہ 9 پیسے فی سیر کی شرح سے اضافہ ہوا ہے جو دو پونڈوں پر ایک پیسہ ہے مگر یہ اضافہ زیادہ نہیں ہے۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کی وفات پر مچھلی مارنے پر سخت ممانعت عائد کی گئی تھی جو چھ برس تک جاری رہی۔ اب بھی کوئی شخص امیرا کدل اور زینہ کدل کے درمیان مچھلی نہیں پکڑ سکتا۔ مچھلی مارنے کا ٹھیکہ ہر برس نیلام کیا جاتا ہے۔ گزشتہ تین برس کے دوران اوسطاً 2,000 روپے کی رقم اس طرح وصول کی گئی۔ کینیڈا کی رینبو (Rainbow) مچھلی برفانی پانی کی عادی ہے۔ کشمیر اور تیل بل وادی میں اس کو نہایت آسانی کے ساتھ بڑھاوا دیا جا سکتا ہے۔ آب رسانی کا ذخیرہ پوری طرح سے بھر جائے تو یہ اسی تجربے کی خاطر نہایت موزوں مقام ہے۔ کرنل الون کی تجویز یہ بھی ہے کہ ڈل اور مانسبل کی جھیلوں میں پائیک (2) پیدا کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے۔

وادیٔ کشمیر میں پائی جانے والی مچھلیوں کی اہم اقسام کے بارے میں تفصیلات اور دیگر معلومات ذیل ہیں:

چری گاڈ:

اس مچھلی کا اوسط وزن 2 سے 3 پونڈ ہے۔ یہ مچھلی 3 پیسے فی سیر کے حساب سے فروخت ہوتی ہے اس کا ایک ڈورسل اور پانچ شکمی پر ایک بڑا منہ، سیاہ نشانات والی پشت، سنہری پیٹ اور آنکھ کے نزدیک سے دم تک ایک لمبا خط ہوتا ہے۔ اس کی نرم چمڑی ہوتی ہے۔ چری گاڈ کو اکتوبر اور نومبر میں پکڑا جاتا ہے۔

سُتر گاڈ:

اوسطاً وزن نصف سیر بیان کیا جاتا ہے۔ اس کی بھی وہی قیمت ہوتی ہے جو چری گاڈ کی ہوتی ہے۔ یہ ایک چھوٹی قسم معلوم ہوتی ہے۔ اس کا ایک ڈورسل پانچ شکمی پروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کی طرفین سنہرے رنگ کی ہوتی ہیں اور دھبوں والی پشت ہوتی ہے۔ اس کی بے خول چمڑی نرم ملائم ہوتی ہے۔ یہ مچھلی فراواں ہوتی ہے اور سال کے تمام موسموں میں پکڑی جاتی ہے۔

گرودٹ گاڈ:

اس کا اوسط وزن نصف سے 75. سیر ہوتا ہے اور قیمت وہی ہوتی ہے اس کے ایک ڈورسل کے پانچ شکمی پر ہوتے ہیں جن کا رنگ گلابی ہوتا ہے۔ اس کی پشت عمیق سیاہ، پیٹ زردی مائل، سفید اور بے خول چمڑی نرم ملائم ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مچھلی پتھروں اور چٹانوں کے تلے قیام کرتی ہے۔ اس کی شناخت بھی چڑی گاڈ اور سٹر گاڈ جیسی ہوتی ہے۔

پکوریا پیکری گاڈ:

اوسطاً 8 سے 16 سیر ہوتی ہے اور اس کی بھی وہی قیمت ہوتی ہے۔ اس کا بڑا منہ ہوتا ہے جو خول سے ڈھکا ہوا ہوتا ہے۔ رنگ سفید ہوتا ہے یہ ایک نایاب قسم کی مچھلی ہے۔ اس کا موسم نومبر سے جولائی تک ہے۔

چاش گاڈ:

اوسطاً وزن نصف سے ایک سیر ہے قیمت وہی۔ اس مچھلی کا نوکیلا سر، چھوٹا منہ نرم بے خول جلد اور رنگ سفید ہوتا ہے۔ یہ مچھلی دسمبر ماہ سے مارچ تک پکڑی جاتی ہے مگر نہایت ناپید ہوتی ہے۔

ہرچ:

اوسطاً وزن نصف سیر یا کم ہوتا ہے قیمت وہی۔ ایک ڈورسل پانچ شکمی پَر چھوٹا منہ سیاہ پشت، سنہری پیٹ، پختہ خول ہوتا ہے۔ اس کا موسم اکتوبر سے مئی تک ہوتا ہے۔

رمہ گاڈ:

اس کا اوسطاً وزن ایک چھٹانک ہوتا ہے۔ قیمت 2 پیسے فی سیر رنگ ہرا سبز۔ یہ مچھلی جہلم میں جون ماہ میں لائی جاتی ہے۔ جب پانی سرد ہوتا ہے تو یہ جھیلوں میں چلی جاتی ہے۔

انیور گاڈ:

اوسطاً وزن ایک چھٹانک یا کم ہوتا ہے۔ یہ مچھلی ایک پیسہ فی سیر فروخت کی جاتی ہے۔ رنگ سیاہ ہوتا ہے، موسم اور عادات رمہ گاڈ کی مانند ہے۔

ٹیٹ گاڈ:

اس کا اوسطاً وزن ایک چھٹانک یا کم ہوتا ہے۔ 2 پیسے فی سیر کے حساب سے فروخت کی

جاتی ہے اس کا رنگ سیاہ ہوتا ہے۔اگست سے اکتوبر تک جب یہ مچھلی بہت چھوٹی ہوتی ہے تو اسے ٹیٹ گاڈ کہتے ہیں۔جب دریا میں پانی کی سطح کم ہو جاتی ہے تو اس مچھلی کو اُن کھلے طاسوں میں پکڑا جاتا ہے جو کسی ندی کے کنارے پر پیدا ہو جاتے ہیں۔

دراس:

اس مچھلی کا بھاؤ ایک پیسہ فی سیر ہے۔اس کو اگست اور ستمبر میں نکالا جاتا ہے۔یہ بات بھی مشکوک ہے کہ آیا یہ کوئی علاحدہ قسم ہے۔

ایت گاڈ:

یہ ایک چھوٹی سی سفید مچھلی ہے۔یہ ان چھوٹی سی ندیوں میں پائی جاتی ہے جو جہلم میں جا کر گرتی ہیں اور جب پانی کی سطح بلند ہوتی ہے تو یہ بہہ کر دریا میں آ جاتی ہیں۔

یہ تمام مچھلیاں اپنے اپنے موسم میں اسلام آباد سے بارہمولہ تک دریائے جہلم کی گذرگاہ میں پکڑی جاتی ہیں۔ماہ جون کے دوران ہشر (پارم گاڈ پنجابی گاڈ) سرینگر سے نیچے دریائے جہلم کے مختلف مقامات سے حاصل کی جاتی ہے۔ایک چھوٹی سی مچھلی گورنَ ندی نالوں اور دلدل میں پائی جاتی ہے۔جھیل ڈل سے ستر گاڈ جال اور کانٹے سے حاصل کی جاتی ہے۔چری گاڈ اور ریت گاڈ کو صرف کانٹے سے پکڑا جاتا ہے۔اس جھیل میں موجود تمام مچھلیاں گہرے سبز رنگ کی بیان کی جاتی ہیں جس کا سبب اس جھیل میں وسیع پیمانے پر نباتات کا موجود ہونا بیان کیا جاتا ہے۔اس میں وہ گھاس پھوس وغیرہ شامل ہے جس میں یہ مچھلیاں رہتی ہیں۔

جھیل وُلر میں ستر گاڈ اور چری گاڈ جال کے علاوہ کانٹے سے پکڑی جاتی ہیں جب کہ پکٹ گاڈ کو صرف جال کے ذریعے پکڑا جاتا ہے۔اکثر اوقات مچھلیوں کو اس جھیل اور دوسری جھیلوں کے پانی سے الگ کیا جاتا ہے۔

دریائے سندھ میں بھی گاندربل کے نیچے مچھلیوں کی فراوانی ہے۔ستر گاڈ ، چاش گاڈ ، چری گاڈ اور مؤخر الذکر اقسام کافی تعداد میں پائی جاتی ہے۔پانی کے کم درجۂ حرارت کے بموجب شدید گرمی کے بغیر مچھلیاں نہیں پکڑی جاسکتیں۔شہتوت کے موسم میں اس قدر زیادہ مقدار میں مچھلیاں نکالی جاتی ہیں کہ ماہی گیر دریائے جہلم کے پانی کو چھوڑ کر سندھ کی طرف عام طور پر راغب

نہیں ہوتے ۔ پالتو مچھلی کو مٹن جی اور دیری ناگ کے علاوہ دوسرے تالابوں اور چشموں میں لایا جاتا ہے مگر ان کی نسل کا کوئی نام نہیں ہے ۔ان کو ناگ کہا جاتا ہے۔

دریائے جہلم میں ماہی گیری کے لیے مارچ نہایت موافق موسم ہے۔ دسمبر سے فروری تک جب اس دریا کی سطح نہایت کم ہوتی ہے مچھلیاں جھیل ولر میں چلی جاتی ہیں۔ جال کے ذریعے ماہی گیری (والی بانس) کرنے والوں کا ایک منفرد طبقہ ہے جبکہ کانٹے کے ذریعے ماہی گیری (والی بانس) کا طبقہ الگ ہے ۔مؤخرالذکر لمبی ڈوری کا استعمال کرتے ہیں جس کی لمبائی 1000 گز ہوتی ہے۔اس کے ساتھ کانٹوں کو جوڑا جاتا ہے۔ڈوری اور کانٹے کے درمیان ایک ایک چھوٹا سا پتھر یا کنکر لٹکایا جاتا ہے۔

دسمبر، جنوری اور فروری کے مہینوں میں مچھلیوں کو راغب کرنے کے لیے کیڑے مکوڑوں کو استعمال میں لایا جاتا ہے اور برس کے دوسرے موسموں میں ایک لیپ تیار ہوتا ہے جو عام طور پر آٹے سے تیار ہوتا ہے۔ یہ ڈوریاں پوری طرح پانی میں ڈبو دی جاتی ہیں اوا یک کانٹے دار کھمبے کے ذریعے مچھلی پکڑی جاتی ہے ۔موسم گرما کے مہینوں کے دوران ایک چھوٹی سی کشتی میں بیٹھ کر مچھیرا اپنی ڈوری لگ بھگ چار گھنٹوں تک دوڑاتا ہے۔مگر موسم سرما کے دوران جب مچھلیاں کمزور پڑ جاتی ہیں اور فوری طور پر نہیں کاٹتیں ۔تو یہ ڈوری رات کے وقت ڈالی جاتی ہے اور صبح کے وقت نکالی جاتی ہے۔اس مقصد کے لیے کانٹوں کی تیاری خوش اسلوبی کے ساتھ خود ماہی گیر انجام دیتے ہیں جو شکل وصورت اور مواد کے لحاظ سے انگریزی طرز کے کانٹوں سے مختلف ہوتے ہیں۔اس بات کا دعویٰ کیا گیا ہے کہ ایک مرتبہ مچھلی اس کانٹے میں پھنس جاتی ہے تو اس کا بچ نکلنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

ایک دن میں ایک ماہی گیر کے لیے دو یا تین ترک مچھلی اوسطاً کامیابی کی علامت تصور کی جاتی ہے۔بہرحال مچھلیاں آٹھ سیر (3) فی ترک کے حساب سے فروخت کی جاتی ہیں۔

کشمیری مچھلی کے بارے میں وائین مندرجہ ذیل تفصیلات بیان کرتا ہے۔

مجھے صرف چھ مختلف اقسام کے بارے میں معلوم ہے جن میں سے ہمالیائی ٹراوٹ سب سے زیادہ عام ہے۔موسمی حالات اور خوراک حاصل کرنے کے حالات پر منحصر یہ مچھلی شباہت اور

رنگ کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہے اور مقامی باشندے مجھے یہ بات باور کرانے میں شاید حق بجانب ہیں کہ اس کی صرف ایک قسم کے بجائے متعدد اقسام ہیں۔ حقیقی ٹراوٹ کے برعکس یہ مچھلی کا بلی کے ساتھ کانٹے کی طرف آتی ہے۔ میں نے کشمیر میں فلائی فشنگ (بنسی میں مکھی لگا کر مچھلی پکڑنا) کی کوشش کی مگر میں نے محسوس کیا کہ یہ ایک غیر فائدہ مند طریقہ ہے۔ مجھے یاد ہے کہ اسلام آباد میں چند مچھلیاں میرے سامنے لائی گئیں جو رنگ کے لحاظ سے اس حقیقی ٹراوٹ کے ساتھ مطابقت رکھتی تھیں جنھیں میں نے دیکھا تھا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ سبھی مچھلیاں متذکرہ بالا اقسام کی تھیں۔ وہ ایک دو اور تین پونڈ وزن کی تھیں۔ جھیل میں چند مچھلیاں اس سے بھی کافی زیادہ بڑی تھیں جنھیں میں نے دیکھا تھا۔ میں نے ایک زرد تانبے رنگ کی مچھلی دیکھی تھی جس پر سیاہ دھبے تھے۔ یہ مچھلی بے موسم جھیل سے پکڑی گئی تھی مگر یورپی ٹراوٹ کے مقابلے میں یہ زیادہ بے ذائقہ تھی۔ اس مچھلی کو ستری گاڈ بھی کہا جاتا ہے۔

میری رائے یہ ہے کہ میں نے وہ سفید سمندری مچھلی دیکھی ہے جو سوپور نگری پر زینہ گیر کی کریوہ والی ندی میں پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹی سی سفید مچھلی ہے جس کی ٹک نیلگوں ہے اور ایک کمزور مچھلی چکور سے مطابقت رکھتی ہے۔ اس کی لمبائی قریباً 6 انچ ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور مچھلی کی لمبائی 5 انچ ہے۔ شکل وصورت میں امریکی مچھلی سے مشابہت رکھنے والی ایک اور مچھلی ہے جسے اُدمر کہتے ہیں۔ اس کا عام رنگ غروبی زیتونی ہے اور دم کی طرف سرخی مائل ہے اس کے تین شکمی اور دو ڈورسل پر ہیں۔ آنکھیں لگ بھگ سر کے عین اوپر ہیں۔ چہرے کے گوشت اور سینہ کے درمیان گھوڑے کے نال کی مانند ایک سینگ دار پلیٹ ہے۔ میں نے جن مچھلیوں کو دیکھا وہ نہایت چھوٹی تھیں مگر مجھے بتایا گیا کہ ان کا وزن 3 سے 4 پونڈ تک بڑھ جاتا ہے۔ آخر میں رامہ گاڈ کا ذکر کروں گا یہ مچھلی سوپور نگری کے ایک گاؤں میں پکڑی جاتی ہے۔ اس مچھلی کا رنگ مٹیالا ہوتا ہے۔ میرے خیال میں یہ واحد مچھلی ہے جس کا رنگ سرخی مائل سنہری، پَر سرخی مائل اور طرفین میں بہت زیادہ سیاہ، بھدی اور بوتل کی مانند سبز رنگ کی بڑی بڑی دھاریاں ہیں۔ بالائی ہونٹ کے سینگ سے دو شمولات لٹکتی ہیں، اس کی پشت نہایت خاردار ہے جو کسی ہتھیار کی مانند معلوم ہوتا ہے۔ اس پر ایک پشتہ آنکھ کے سامنے اور منہ کے درمیان واقع ہوتا ہے۔ جس کی گولائی الٹی اور

نیچے کی طرف مڑی ہوتی ہے اور یہ ایک مستقیم کی صورت میں دُم کے مرکز تک چلا جاتا ہے۔ اس مچھلی کا وزن 75 پونڈ تک بڑھتا ہے وادیٔ کشمیر کے غریب طبقوں، یہ مچھلیاں خوراک کا ایک اہم ذریعہ ہے۔

●✻✻✻●

حوالہ جات

(1) کرنل اُنون لکھتا ہے جب سے کشمیر کے بارے میں معلومات حاصل کی ہے میں نے صرف ایک ہی پُہر کو دیکھا ہے۔ یہ سانپ میں نے وادیٔ لیدر سے اوپر کے پشتے پر کولر کے مقام پر دیکھا۔ اس نے ایک شکاری کو ڈسنے کی کوشش کی مگر شکاری نے اسے مار ڈالا۔ یہ شکاری سخت پریشان تھا اور کہہ رہا تھا کہ وہ کشمیر کے ایک خطرناک سانپ سے بچ گیا ہے۔ یہ سانپ 2 فٹ لمبا، موٹا اور نسواری رنگ کا تھا۔ اس کے بڑے پھن زہر آلود تھے۔ کشمیر کے لوگ پُہر کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ دور ہی سے اچھل کر وار کرتا ہے۔ گنس بھی عام ہے جو 12 سے 15 اور 30 انچ تک لمبی ہوتی ہے۔ اگرچہ اس کے ڈسنے سے موت واقع ہوتی ہے مگر میں نے ایسے اشخاص بھی دیکھے جو گنس کے کاٹنے کے بعد بچ گئے۔

(2) میں صلاح دوں گا کہ امریکہ اور کنیڈا کی رین بوٹراوٹ اس مچھلی سے زیادہ بہتر رہے گی۔ کیونکہ یہ برفانی پانی میں پلتی ہے۔ ڈل اور مانبل جھیلوں میں اور سنبل کی جھیلوں میں پائک پیدا کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے۔

(3) پرچون فروش ایک ترک کے بدلے میں 6 سیر دیتے ہیں جو بجائے خود ایک ہی ترک ہوتے ہیں۔

●❊❊❊●

چھٹا باب

آثارِ قدیمہ

کشمیر کی وادی ہندوؤں کی مقدس سرزمین ہے اور میں نے شاید ہی ایسا کوئی گاؤں دیکھا ہو جس میں قدیم زمانے کے آثار موجود نہ ہوں۔ پرانے کشمیری مندروں کے ضخیم پتھر کی نسبت جسے متبرک مسلمانوں نے الٹا کر دیا تھا۔ لنگ کی بے شمار مہین علامات ہیں اور صاف وشفاف چشموں پر کندہ شکلوں کے انہدام کے ساتھ ہر موڑ پر میرا سامنا ہوا۔ دیہاتی لوگ اس کھنڈرات کے بارے میں اس کے سوا کوئی بھی معلومات نہیں دے سکتے کہ یہ مندر پانڈوؤں یا بودھوں نے تعمیر کیے تھے۔ اُس شہر کے پنڈتوں کو آثارِ قدیمہ کی بابت کوئی پروا نہیں اور قدیم ہندو زمانے کی شان وشوکت کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں۔ جب کوئی مغلوں کے زمانے کی طرف آتا ہے تو روایات مزید واضح ہو جاتی ہیں اور میں نے چند ایسی مساجد دیکھی ہیں جو طرزِ تعمیر سے جداگانہ ہیں۔ جو شہتیر دں کے درمیان پتھروں سے تعمیر کردہ ہیں۔ ان میں سے اکثر مسجدوں کو اورنگ زیب نے بنوایا تھا۔ اس نے مذہبی عمارتوں کو تعمیر کروایا جب کہ دیگر مغلوں نے حکومتی طور پر عشرت کدے، باغات، آبشار اور خوبصورت گرمائی مسکن بنائے۔ جہاں ہندو عمارات وقت اور موسم کی قید سے بالاتر ہیں وہاں مسلمان درگاہیں اور مسجدیں گر کر مسمار ہو جاتی ہیں اور اب ان کی عہدِ پارینہ کی ثروت کا شاید ہی کوئی نشان بچا ہے۔ مسجد جہانگیر کے نمونے تباہ کاروں کی یلغار کے سامنے ڈٹے رہے لیکن

اگر ان پر جلدی اور انصاف پسندی سے پیسہ خرچ نہ کیا گیا تو ان میں سے بہت کم بچ پائیں گے۔ وادی کے جنگلی گلابوں کو چھوڑ کر سلیم اور نور محل کے عشرت کدوں کی یادیں تک نہیں رہ گئیں۔ یہ توقع کی جاتی ہے کہ حکومت کشمیر چھبل، ویری ناگ، شالیمار اور نشاط کے خوبصورت عشرت کدوں کو ختم ہونے کی ہرگز اجازت نہیں دے گی لیکن اگر جلد ہی اقدامات نہ کیے گئے تو یہ خوبصورت مقامات اداس اور ناقابل دید کھنڈرات بن کر رہ جائیں گے۔ جہاں تک قدیم کشمیر کے پرانے پتھروں کا تعلق ہے یہ بات کہنا مشکل ہے کہ آیا ان ماخذوں کا مزید نقصان سے تحفظ کبھی ممکن ہوسکتا ہے۔ میں نے اکثر مارتنڈ کو دیکھا کہ شال میں واقع یہ مندر جسے کنگھم نے Fane of Ranesa سے تعبیر کیا تھا۔ وہ لڑھک رہا ہے اور زلزلے کا ایک جھٹکا اسے پتھروں کے ڈھیر کے ساتھ ملا دے گا۔ مگر مارتنڈ قدیم فن کے بیش قیمت اور نادر نمونے کا تحفظ کرتا ہے تو اس کے لیے نہ صرف روپیہ پیسہ بلکہ فنی مہارت کی بھی ضرورت ہے۔ اس کھنڈر کو پرانے زمانے کے کھنڈرات میں اہم ترین مقام حاصل ہے۔ اگر کبھی حکومت قدیم ماخذوں کے تحفظ کا کام شروع کرتی ہے تو میرے خیال میں ہندوؤں کے دو آثار قدیمہ مارتنڈ اور پانچ کو تحفظ دینے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ اول الذکر قدیم عمارتوں میں سب سے عالیشان ہے جبکہ موخر الذکر مکمل ترین ہے۔ زلزلوں کی وجہ سے کشمیر کے مندروں کا مستقبل نہایت بے یقینی کا شکار رہا ہے۔ 1885 کے جھٹکے نے پٹن کی عمارتوں کو کافی نقصان پہنچایا۔ میں نے کشمیر کی تاریخ عہد پارینہ کے بارے کے اقتباسات اخذ کیے ہیں اور ہندوؤں کے کئی اہم اور قدیم عمارتوں کی تفصیل کا حوالہ دیا ہے مگر وادی میں اس تلاش کے بھاری امکانات موجود ہیں۔ آبپاشی اور دوسرے کاموں کی کھدائی میں مجسمے اور قدیم تاریخ کے آثار قدیم نمودار ہوئے ہیں۔ اگر کسی کے پاس دولت اور فرصت ہو تو کشمیر کے ندیوں کی ڈھلوانوں میں واقع قدیم شہروں کی تلاش میں اسے ایک سودمند روزگار حاصل ہوگا۔ 1882 میں آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کے آنجہانی مسٹر گیرک نے بارہ مولہ کے نزدیک اشکر کے مقام پر کھدائی کا کام کیا۔ اس نے مربع پتھروں کے ایک ٹوپ یا ستوپا کو کھودا جس کو کنڈوں کے شکنجوں سے جکڑ کر رکھا گیا تھا۔ اسے توقع تھی کہ یہاں وہ تانبے کے پتر ملیں گے جو چینی سیاح ہیون سانگ کے مطابق وہاں پر دفن کیے گئے تھے۔ مسٹر گیرک نے تفصیلی کھدائی کی مگر وہ ناکام رہا۔ یہ اشک پور کا مقام تھا جہاں پر للتادیتہ کی

طرف سے مہاتما سوامی کا مجسمہ اور بودھوں کے لیے استوپ تعمیر کیے گئے۔ وادی کے مشرقی حصے کے ساتھ ساتھ پہاڑی ڈھلوانوں میں قدیم شہروں کے کھنڈرات دستیاب ہوئے ہیں۔ میں یہ نہیں جانتا کہ کس حد تک ان کا جائزہ لیا گیا ہے مگر یہ تاثر موجود ہے کہ کھوجی افراد کا وادی میں قیام عارضی ہونے کے سبب ان کی تحقیق چند مشہور مندروں تک ہی محدود رہی۔ میرے ذہن میں بھی وہی تاثر ہے جو لوگ کہتے ہیں کہ بہت سارے آثار قدیمہ کو وادی سے باہر لیجایا جا چکا ہے بلکہ حکومت کے پاس بھی متعدد مجسمے اور شہر سرینگر کے قدیم مقامات سے ملے ہزاروں شولنگ ہیں۔ جھیل ولر میں واقع ایک جزیرہ اس بات کی نمایاں مثال ہے۔ ایک کھوجی کے لیے میں وادی کے مشرقی کنارے کی سفارش کروں گا۔ روایات کے مطابق دریائے جہلم پر واقع سنبل جیاپور کا قدیم مقام ہے اور لوگوں کا کہنا ہے کہ سنبل پر کھدائی کرانے سے بھاری خزینے حاصل ہوں گے۔ شاید ہی کوئی برس ایسا گذرتا ہے جب کشمیر میں یہ افواہیں نہ پھیلتی ہوں کہ کشمیر میں نادر خزینے تلاش کیے گئے ہیں۔ حکومتی مفادات کو محفوظ رکھنے کے لیے سرکاری طور پر اقدامات کیے جاتے ہیں مگر جب سے میں اس وادی میں موجود ہوں۔ یہ افواہیں بے بنیاد ثابت ہوئی ہیں۔ بہرحال یہ بات ممکن ہو سکتی ہے کہ باضابطہ تلاش سے اُس دولت کو کچھ حد تک حاصل کیا جا سکتا ہے جس سے للتادتیہ اور دوسرے فاتحوں نے وادی کو مالا مال کیا تھا۔

میرے فرائض نے مجھے یہ فرصت ہی نہ دی کہ میں کھنڈرات میں تبدیل قلعہ جات اور چھوٹے مقامات کی تاریخ پر تحقیق کرسکوں جو وادی کے مغربی حصے میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ یہ قلعہ جات مغل یا پٹھان عہد کی حالیہ تعمیرات ہیں مگر چھوٹے مقامات اس قبل از تاریخ عہد سے تعلق رکھتے ہیں جب کشمیر چھوٹے چھوٹے راجواڑوں میں منقسم تھا مگر یہ قلعہ جات اور مقامات اب محض پتھروں کے ڈھیروں اور سانپوں کے بلوں یا گیدڑوں کے مسکن میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ گنجان آباد شہر اب ویران ہو چکا ہے اور اس زمین پر اب خاردار جھاڑیاں وغیرہ نمودار ہو گئی ہیں۔ رامنزاکان ایک دلچسپ مقام ہے جس کے بارے میں اس سے قبل کوئی تفصیل موجود نہیں ہے۔

خوشی پورہ گاؤں کو کوٹ راج کریوہ میں رام چندر اور لچھمن کے تیر پائے گئے ہیں۔ یہ تیر تراشے ہوئے پتھر کی صورت میں ہیں جس کی آٹھ پرتیں ہیں۔ اس کے بارے میں معلوم نہیں کہ

یہ تیر ایک طویل پرواز کے بعد کس قدر زمین کے اندر دھنسے ہوئے ہیں ۔ اسی کریوہ میں بہت سارے گڑھے بھی موجود ہیں جن میں پانی اور گھاس وغیرہ بھرا ہے کسی وقت یہ سپاٹ زمین راکھشسوں یعنی شیطانوں کا مسکن تھی ۔ وقت کی گردش ، آپس میں قتل وغارت اور بے تحاشہ آدم خوری کے سبب ان کی تعداد میں کمی واقع ہوگئی ۔ کشتیوں کے دوران زمین کے ساتھ ٹکینوں اور گھٹنوں کی زمین پر رگڑ کی وجہ سے ڈھلوانیں پیدا ہوئیں ۔ اس طرح دبے کچلے انسانوں پر اوتاروں نے رحم کھایا ۔ انھوں نے پچھی پورہ میں رام کنڈ اور لچھمن کنڈ کے مقدس مقامات سے تیر چلائے اور راکھشسوں کو مار ڈالا ۔ ہندو اس مقام پر اشنان کرنے کے لیے جاتے ہیں ۔ یہ حکایت اس دور سے تعلق رکھتی ہے جب اس سرزمین پر قانون شکن کوٹ راج آباد تھے ۔ اکثر وہ نچلی سطح پر واقع پر امن مقامات پر گھس آیا کرتے تھے اور ایسے مقامات انھیں نہایت پسند تھے ۔ میں ان تمام مقامات پر گیا ہوں جن کی بابت اب میں تفصیلات بیان کروں گا ۔ اس بارے میں میں نے ان بہترین تفصیلات میں اضافہ کر دیا ہے جو اس سلسلے میں ماہر مصنفین نے پہلے ہی فراہم کی ہیں ۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ یہ بات بے معنی ہوگی اگر اراضیات جیسے باب میں جہاں میں نے لیڈیکر کی تحقیق سے استفادہ کیا یہاں پر بھی میں ایسا نہ کروں ۔ چنانچہ میں اس بات میں ہندوستانی آثار قدیمہ کے ماہر آنجہانی سر الیگزینڈر کننگھم کے الفاظ کو دوہراؤں گا ۔

پہلے میں کشمیر کے فن تعمیر کی بابت اس کی کیفیت بیان کرتا ہوں اور ہر ایک مندر کی تفصیلات کے بارے میں بیٹس گزیٹیئر میں درج معلومات درج کروں گا ۔

کشمیر کے فن تعمیر کے کھنڈرات شاید ہندوستان بھر کے موجودہ یادگاروں میں بہترین ہیں کیونکہ ان میں یونانی فن کے غیر مبہم اثرات دکھائی دیتے ہیں ۔ ہندو مندر عموماً ایک قسم کے فن تعمیر کا مجموعہ ہے جس میں زیبائشی حصوں کو ایک ساتھ جمع کیا گیا ہے جب کہ ایک جین مندر عموماً ستونوں کا ایک وسیع تر جنگل ہے جو ایک دوسرے سے مختلف دکھائی دینے کے انداز میں بنائے گئے ہیں اور ان کی تفصیلات میں بہت کم فرق ہوتا ہے جبکہ دوسری طرف کشمیری فن تعمیر کے حصوں میں لاپروائی اور ان کی آرائش کے خوشگوار قرینے اپنائے گئے ہیں ۔ وہ بلاشک مختلف ہیں تاہم منفرد ہیں ۔

کشمیری فن تعمیر کے اوصاف اس بلند اہرام نما چھتوں میں مضمر ہیں جو اس کے اہرام نما مثلث حصوں سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ سہ گوشہ دروازے اور اس کے ستونوں کی ترتیب کے عظیم درمیانی فاصلوں میں اس فن تعمیر کے اوصاف پنہاں ہیں۔ یونانی سہ گوشہ دروازے نہایت پست ہوتے ہیں جب کہ چھت نہایت سپاٹ ہوتی ہے۔ اول الذکر کو بلا بارش دھوپ والی آب وہوا کے لیے تیار کیا جاتا ہے جب کہ مؤخر الذکر بارش اور برفانی آب وہوا میں یکساں طور پر موافق ہوتے ہیں۔ مگر آب وہوا کے فرق کے علاوہ ان دونوں ممالک کی چھتوں کے منفرد ہونے کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ ان دونوں ملکوں میں عمارتوں کی تعمیر کے لیے کسی قسم کا مواد دستیاب ہے۔ یونان میں عمارتوں کی تعمیر میں پتھر استعمال ہوتا ہے جبکہ کشمیر میں چوب یا لکڑی استعمال ہوتی ہے۔ اول الذکر نے پست قد سپاٹ چھتوں کی تعمیر کی جن کے درمیانی ستونوں کا فاصلہ بہت کم ہوتا تھا جب کہ مؤخر الذکر کی چھت بلند اور ستونوں کی ہیئت کافی چوڑی ہوتی ہے۔

کشمیری فن تعمیر میں ستونوں کے درمیان کا فاصلہ کافی وسیع ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ اہم ہے اور نظام کا یہ ایک منفرد پہلو ہے۔ درحقیقت مجھے اس امر کا شبہ ہے کہ یونانی لوگ کشمیری طرز تعمیر کی نمایاں علامت سے بجا طور پر واقف تھے۔ چار قطرے والے ستونوں کی ترتیب کے اس درمیانی فاصلے کی تکنیک کو انھوں نے کبھی استعمال نہیں کیا۔ اگر کیا بھی تو انھوں نے اسے آرئیوسٹائل Araiostyle سے موسوم کیا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے ہندو یا مشرقی آریوں کا حوالہ دیا ہے۔ جسے ہیروڈوٹس نے Apeioi کا نام دیا ہے۔ کشمیر کے آریاؤں نے ستونوں کی جس ترتیب کا انتخاب کیا وہ کسی بھی صورت میں چار نصف قطروں سے کم نہیں تھی۔

کشمیری ستونوں کے درمیان کا فاصلہ ہمیشہ آرئیوسٹائل میں ہوتا ہے۔ آریوں کی طرف سے استعمال شدہ اس اسٹائل کو میں آریائی نظام کہنے کا قائل ہوں۔ یہ نام اس کیلئے نہایت موزون ہے کیونکہ یہ مقام مستند کلاسیکی نظاموں کی طرح ہی ایک واضح نظام ہے۔ ان کی طرح یہ بھی قواعد کے

تابع ہے جو چند حدود کے اندر اس کے ماہرین تعمیرات کی ذہانت کا نتیجہ ہے۔ درحقیقت، کشمیری
ستون ہندوستان کے تمام ستونوں میں اس لیے ممتاز ہیں کہ ان کی ایک اساس ہے اور ہر ایک
ستون کا اس کے نصف قطر سے ایک تناسب ہے۔ اس کے برعکس ہندوستون تمام صورتوں اور تمام
جسامتوں کے ہوتے ہیں۔ ایک پسندیدہ ہندوستون کی اساس ایک چوتھائی تک مربع ہوتی ہے۔
اس کے بعد اس کے آٹھ اطراف ہوتے ہیں۔ تیسرا مرحلہ سولہ اطراف کا اور بالائی حصہ گول
ہوتا ہے۔ دوسرے کا بالائی حصہ دوگنا ہوتا ہے۔ اساس قدرے کم ہوتی ہے جب کہ تیسرے کا ڈنڈا
اس کی اونچائی کا ایک چوتھائی ہوتا ہے جب کہ بقایا تین چوتھائی اساس اور بالائی حصہ ہوتا ہے اس
کے باوجود تینوں قسم کے ستون ایک ہی مندر میں ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے نظر آتے ہیں۔
کشمیری فن تعمیر کی تمام دیگر ہندوستانی عمارات پر برتری سے خود ہندو بھی واقف ہیں کیونکہ
کشمیری عوام کے لیے ان کا نام شاستر شلپنا یا فن تعمیرات بھی ہے۔ یہ اصطلاح ان کے فن تعمیر
میں ماہر ہونے کی سند کو قبول کرتی ہے۔ اب بھی کشمیری لوگ مشرق کے ماہر ترین دستکار ہیں۔ اس
بات پر یقین کرنا محال ہے کہ دوسرے مشرقی جولاہے، بندوق ساز اور خوش نویس لازمی طور پر
ہندوستان کے بہترین معمار ہوں گے۔

آریائی طرز تعمیر کے نظام کی باریکیوں کو دیکھیں اور اس کے چند کلاسیکی نظاموں کے ساتھ
موازنہ سے پہلے میں ان چند اہم عمارات کی تفصیلات بیان کروں گا جو اب بھی کشمیر میں موجود
ہیں۔ ان تمام عمارتوں کی پیمائش میں نے ذاتی طور پر نومبر 1847 میں کی تھی۔ یہ تمام عمارتیں
چونے کے نیلے پتھر سے تعمیر کی گئی ہیں۔ جس کو روغن کرنے کی سب سے زیادہ گنجائش موجود ہوتی
ہے اور میرے خیال میں اسی وصف کے سبب بہت ساری کشمیری عمارتوں کو اب تک موجودہ حالت
میں محفوظ رکھا جا سکا ہے۔ مارتنڈ کے سوائے کسی بھی مقام کا نام موجود نہیں۔ مارتنڈ (Martand)
کا کشمیری تلفظ مٹن ہے مگر ان سبھی مقامات کو ایک ہی عام نام پانڈو لڑہ یا پانڈوؤں کے مسکن ہے مگر
اس نام کا کوئی دعویٰ موجود نہیں بشرطیکہ بطلیموس کی اس بات کو مستند مانا جائے کہ "Circa
Autem Bidaspum Pandovorum" یعنی پانڈوؤں کی سلطنت بتیستا ویعنے وتستا یعنے
جہلم تک پھیلی ہوئی تھی جس کا مطلب کشمیر سے ہے۔ ان سطور سے ظاہر ہوتا ہے کہ پانڈو کافی دیر

تک ہمارے سن عیسوی کی دوسری صدی تک کشمیر میں آباد رہے۔ اس نکتے کو صحیح تسلیم کرتے ہوئے اس عام منطق میں بھی کچھ صداقت معلوم ہوتی ہے کہ کشمیری مندر پانڈوؤں کی نسل کے ہیں کیونکہ چند عمارات کا سن تعمیر پانچویں صدی تک ہے جب کہ دوسری چند عمارتیں بلاشبہ اور بھی زیادہ قدیم شاید سن عیسوی کی شروعات سے بھی پرانی ہیں۔ اس میں سے ایک عمارت 220 قبل مسیح کی ہے۔

کشمیر میں کئی مندر نیم وبیش شکستہ حالت میں ہیں۔ خاص کر یہ اونتی پورہ (Awantipora) میں کھنڈرات کا ڈھیر بن چکے ہیں۔ ان مندروں کا ذکر کرتے ہوئے ٹریک (1) بیان کرتا ہے۔

''اس بات کے تخیل کا مشکل امکان ہے کہ کھنڈرات جس حالت میں موجود ہیں یہ زمانے یا کسی انسان کا کام ہو سکتا ہے۔ ان کی ٹھوس صورت مصر کی عظیم یادوں کے ہم پلہ ہے۔ ان عمارتوں کو مسمار کرنے کے لازمی طور پر زلزلے ذمہ دار ہوں گے''۔

اس عبارت کا حوالہ اس لیے دیا ہے کہ اونتی پورہ مندروں کے کھنڈرات کی بابت کافی ابہام موجود ہے۔ میری رائے میں ان عمارتوں کی تباہی اس قدر مکمل ہے کہ یہ زلزلے کا نتیجہ نہیں ہو سکتا کیونکہ زلزلوں کے سبب عمارتیں صرف بڑی بڑی سلوں کی صورت میں گر سکتی ہیں مگر ان مندروں کا بالائی حصہ اس وقت پتھروں کے ایک الجھے ہوئے ڈھیر کی صورت میں موجود ہے جو ایک دوسرے سے بالکل الگ ہو چکے ہیں۔ چنانچہ میرا خیال ہے اور میں اپنے تجربے کی بنا پر یہ بات کہنے میں پوری طرح حق بجانب ہوں کہ اس قسم کا تخریبی طور پر مسمار ہونا محض بارود سے ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ میں نے پتھر اور اینٹ کی چند عمارتوں کے علاوہ خود بھی ایک قلعے کو بارود سے اڑایا ہے اور میں نے اس کا نتیجہ بھی دیکھا ہے کہ تمام حصے ایک دوسرے سے الگ ہو کر یا تو الٹ گئے یا ان میں سے بہت سارے تہہ و بالا ہو گئے۔ ان میں سے کوئی بھی تاثر زلزلوں کے باعث ممکن نہیں ہو سکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ٹریک اور مورکرافٹ دونوں نے اس تباہی کا موجب ایک ہی ایجنسی کو قرار دیا ہے۔ انھوں نے اس بات کو باور نہیں کیا ہوگا کہ اس دور میں بھی اس تباہی کا سبب بارود ہو سکتا ہے۔ کیونکہ شاہ ہمدانؒ کی طرف سے مارتنڈ کو تباہ کرنے کی روایتی کوشش کے بارے میں لکھتے ہیں: ''یہ خوش قسمتی کی بات ہے کہ اس وقت لوگ بارود سے نا آشنا تھے''۔ میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ ہمدان کے میر شاہ کے وقت اس قسم کے تباہ کن مواد کی بات نہیں سنی گئی تھی مگر

کشمیری مندروں کی تباہی کے لیے تاریخ اور روایات دونوں متعصب حکمران سکندر کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں جس کی مجسمہ شکنی کی عادت کے سبب اُسے بت شکن کا لقب دیا گیا تھا۔ یہ اس وقت حکومت کر رہا تھا جب تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا جس کے ساتھ اس نے تحائف کا تبادلہ کیا اور میرے خیال میں اسی تیمور سے اس نے ''بدشگون قاتلی مشورے'' کا تحفہ بھی حاصل کیا تھا۔ یہ بات تند مزاج والے تیمور کے لئے ناممکن نہیں تھی کیونکہ سکندر کی طرح وہ بھی ایک بدنام بت شکن تھا۔ گبن اس بات سے انکار کرتا ہے کہ 1402 میں مغل یا عثمانی ترک بارود سے واقف تھے مگر وہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ 1402 میں قسطنطنیہ کے محاصرے کے وقت ترکوں کے پاس دھات کی توپ موجود تھی (2)۔ میرے خیال میں یہ بات بھی ممکنات میں شامل نہیں کی جاسکتی کہ بارود کو کم از کم بیس سال قبل مشرق میں کشمیر کی طرف لے جایا گیا ہو جو 1400 سے 1420 کا سن بنتا ہے۔ یا یہ مواد سکندر کے عہد حکومت میں کشمیر لایا گیا ہو جس کا 1416 میں انتقال ہوا۔

اگر اس بات کو بھی نہ مانا جائے کہ اونتی پورہ کے مندروں کو بارود سے نقصان پہنچایا گیا تھا تو بھی اس کے لیے دوسرے حکمران اورنگ زیب کو ذمہ دار گردانوں گا۔ فرشتہ (3) نے ما سوائے ایک کے تمام مندروں کی مسماری کے لیے سکندر کو ذمہ دار قرار دیا تھا۔ یہ ایک مندر مہادیو کو وقف تھا۔ یہ مندر بھی اس لیے بچ سکا کہ ''اس کی بنیاد پانی کے تلے دبی تھی''۔ ابو الفضل (4) کا بیان ہے کہ 90-1570 میں چند بت پرستی کے حامل مندر ''مکمل طور پر محفوظ'' تھے۔ فرشتہ نے بھی اپنے عہد میں یعنی 1600 کے قریب (5) اسی قسم کی عمارتوں کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ چند عمارتیں آج بھی کھڑی ہیں حالانکہ یہ عمارتیں کم وبیش شکستہ حالت میں ہیں۔ یہ بات بھی یقینی ہے کہ سکندر نے ان تمام عمارتوں کو تباہ نہیں کیا ہوگا۔ عین ممکن ہے کہ اس نے حکم جاری کیا ہوان تمام عمارتوں کو تہہ وبالا کر دیا جائے اور مجھے اس بات میں بھی شک نہیں کہ اس کے عہد میں بہت سارے اہم مندروں کو مسمار کر دیا گیا۔ مثال کے طور پر اس نے اپنی ملکہ کا سرینگر میں واقع روضہ مندر کی بنیاد پر تعمیر کر دیا ہے اور اس کا مواد بھی ہندو سے ہی لیا گیا ہے۔ اسی طرح اس کے بیٹے زین العابدین کے گرد جو دیوار بندی ہے وہ بھی ایک ہندو مندر کا احاطہ تھا اور آخری بات، نوشہرہ (6) سرینگر میں مسجد کا دروازہ بانسری نما ستونی حلقے سے تعمیر کردہ ہے۔ اس مسجد میں موجود پتھر پر تحریر کے مطابق

اس کی تعمیر اس کے بیٹے زین العابدین کے عہد میں ہوئی تھی۔ ان تین مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ کم از کم تین مختلف ہندو مندر یا تو سکندر یا اس کے پیشروؤں کے زمانے میں تباہ کیے گئے۔ چونکہ ان مندروں کی بربادی کے لیے اس سے پہلے کسی حکمران کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا گیا ہے۔ چنانچہ ہم بلا کسی توقف کے ان مندروں کی تباہی کے لیے خود سکندر کو ذمہ دار قرار دے سکتے ہیں۔ یہ مندر تباہ کرنے والے کے بے رحم ہاتھوں کے علاوہ کوئی دوسری ایجنسی کم ذمہ دار نہیں ہے مگر اس کے آخری اثرات بھی مساوی طور پر یقینی ہوں گے جو کشمیر کے مندروں پر کام میں مصروف عمل ہوں گے۔ تلف کنندہ کی طرف سے ستونوں اور پتھروں کو اُکھاڑ کر لے جانے کی خاموش تباہی کا عمل بھی صدیوں سے جاری رہا ہوگا۔ جس کے سبب دوسری عمارتوں کی تعمیر عمل میں لائی گئی۔ جن ستونوں سے محرابیں بنائیں گئیں وہ زلزلوں کے سبب گر گئے اور انھیں اس مسجد یا مقبرے کی آرائش کے لیے دوبارہ تیار کرلیا گیا جو گردونواح میں تعمیر کیے گئے ہوں۔ پس کشمیر میں ہر ایک مسلم عمارت جزوی طور پر یا پوری طرح ہندو مندروں کے کھنڈرات پر تعمیر کی گئی ہے۔

یہاں ہمیں پہلی نظر میں ہی کشمیری ستونوں کی یونان کے گول کلاسیکی ستونوں کے ساتھ گہری مماثلت نظر آتی ہے۔ پہلا تاثر تو بلاشبہ ستونوں کے تین حصوں بنیادی بلّی اور بالائی حصے میں تقسیم اور بلیوں کی بانسری نما گولائی سے حاصل ہوتا ہے۔ یونانی نظام کے مخصوص ڈھانچوں خاص طور پر ڈورک کے مزید جائزے سے اس بات کی مزید تصدیق ہوجاتی ہے۔ لہٰذا کشمیری ستونوں کا بالائی حصہ Echinos وہ ڈورک صدر کا ایک اہم رکن ہے، مزید گہرائی سے جائزہ لینے پر معلوم ہوتا ہے کہ کرنیتھن کے سوائے تمام کلاسیکی تعمیرات کی چوڑائی قریباً انھیں قواعد کے مطابق ہے۔

یہاں تک کہ مندروں کی بیرونی ڈیوڑھی اور ان کا مثلث حصہ ہندوستان کے بجائے یونان کی یاد دلاتے ہیں۔ اور اس بات کو باور کرنا محال ہے کہ یہ طرز تعمیر ہندوستانی طرز کی مثالوں سے بالکل مختلف ہے وہ یونانیوں کے ساتھ مشترک ہوگا۔ یہ قریبی مطابقت محض ایک اتفاق ہی قرار دی جاسکتی ہے۔ وِلز اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ کشمیری مثلث کو شامی یونانیوں سے مستعار لیا گیا وہ اپنی رائے کی بنیاد اس بات کو مانتا ہے کہ کشمیری مندروں کی تکونی جو مثلث کے وسطی گوشے تک اونچی چلی جاتی ہے، ایک ایسا عمل ہے جو کلاسیکی طرز تعمیر میں سن عیسوی کے آغاز تک رائج نہیں تھا مگر

میرے خیال میں پروفیسر نے قدیم عمارتوں کے کسی نمونے کو نہیں دیکھا ہوگا جن میں تخت سلیمان پر مندر کی بیرونی دیواروں اور زین العابدین کے مقبرے کے علاوہ بوم جو کا غار میں واقع مکمل مگر چھوٹا مندر شامل ہیں۔ 220 ق م کے ابتدائی زمانے کے نمونے، جب وادی کابل پر پہاڑ تک کہ مغربی پنجاب پر اینتھی ڈیمس اور اس کے بیٹے ڈیمیٹرس کا قبضہ ہو چکا تھا۔ اگر اس بات کو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ کشمیری ماہرین تعمیرات مثلث، گول ستونوں یا کسی قسم کی ادنیٰ تفصیلات کے لیے یونانیوں کے مرہون منت ہیں تو میرے خیال میں انھوں نے انھیں اپنے قریبی ہمسایوں یعنی بیکٹرئین یونانیوں سے مستعار لیا ہوگا۔ میرا خیال یہ بھی ہے کہ ان مثلثوں کی تقلید رومی مثالوں سے کی گئی ہو اور جس شخص نے یہ نقل کی ہوگی اس نے ڈھانچے کی محرابوں کو نظر انداز کر دیا ہوگا۔ جو ان کوششوں میں موجود ہیں۔ درحقیقت کشمیریوں کے کلیدی ڈھانچے جو تمام Quipked Ovoios یا Echini نوعیت کے ہیں، وہ خالص یونانی طرز تعمیر سے مستعار لیے گئے ہوں گے، جو گول پرتوں والے ڈھانچے کا اس سے پہلے کا رومی جدت کاری کا کارنامہ ہے۔

کشمیری فن تعمیر اور یونانی تعمیرات کے درمیان اور نمایاں مطابقت ان کا طرز عمل ہے، جو کئی صدیوں کے طویل ارتقائی دور میں بھی تبدیل نہیں ہوا۔ اس پہلو سے یہ نمونے مجسمہ سازی سے قطعی طور پر مختلف ہیں۔ میں خود یہ بات محسوس کرتا ہوں کہ کئی کشمیری اقسام اور بہت ساری تفصیلات کا بلی یونانیوں کے مندروں سے مستعار لی گئی تھیں۔ درحقیقت ہندوستانی تقلیدوں کے ساتھ یہی معاملہ کاریگروں کو درپیش آیا ہوگا۔ جو قدرتی طور پر مقامی فن تعمیر پر اس کی پیوندکاری کی گئی ہوگی۔ چنانچہ عام طریقہ ہندوستانی ہی رہے گا جب کہ دوسری تفصیلات یہاں تک وسیع تر اقسام کی اساس غیر ملکی رہی ہوگی۔

میرے خیال میں مجموعی طور پر بانسری نما گول ستونوں اور ان ستونوں کی وسیع تر قطار اس کے بلند مثلث کونے، اس کی خوش نما تکونی محرابیں ایک منفرد طرز تعمیر کا زمرہ حاصل کرنے کی مستحق ہیں۔ چنانچہ میں نے اس کو "آرمین نظام" کہنے کی جسارت کی ہے۔ اس کے لیے اس کا دعویٰ بنتا ہے۔ اول کہ یہ کشمیر کے آریوں کا طرز تعمیر تھا۔ دیگر یہ اس کے ستونوں کی باہمی ترتیب ہمیشہ چار نصف قطروں میں مشتمل ہوتی ہے جو وقفہ یونانی اور آریو سٹائل سے وابستہ ہے۔

بھوم جو وادیٔ لدر کے دہانے پر واقع ہے اور اسلام آباد سے آسانی سے قابل رسائی ہے۔ یہ غار دریائے لدر کے بائیں کنارے پر گاؤں بون سے قریب ایک میل شمال میں واقع ہے۔ یہ وسیع ترین مندر کال دیوکو وقف ہے۔ ایک قدرتی مگر چونے کے پتھر کی مصنوعی طور پر تیار کی گئی بنیاد پر قائم کردہ شگاف میں یہ غار نما مندر واقع ہے۔ اس غار کا داخلی دروازہ دریا کی سطح سے ساٹھ فٹ بلند ہے جس کا فن تعمیر کے تحت دروازے کی صورت میں تراشا گیا ہے۔ پچاس منٹ کے وقت کا ایک لمبا راستہ ہے جس کے بعد ہم مندر کے دروازے تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ ایک دس فٹ مربع کا سادہ کمرہ ہے جو ایک بے ترتیبی سے تعمیر کردہ بنیاد پر تعمیر ہوا ہے۔ یہاں تک رسائی چند سیڑھیوں کے بعد ہوسکتی ہے۔ مربع دروازے کے آس پاس دو گول طاقیں ہیں جن کے اندر موجود مجسمے خراب ہو چکے ہیں اس کے اوپر بلندی تکونی عروج پر وسطی گوشے تک چلی جاتی ہے۔ یہ مندر کب بنایا گیا اس کی بابت نہ تو کوئی ریکارڈ (7) اور نہ ہی کوئی روایت موجود ہے۔ مگر تمام قسم کی آرائش کے فقدان اور ہیئت کی سادہ ساخت جو اس علاقے کے ڈھلوانی چھت کی پتھریلی تقلید ہے۔ تمام امکانات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ یہ کشمیری مندر ایک مکمل نمونہ ہے۔ اور عیسوی سن کی پہلی یا دوسری صدی سے وابستہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کے قریب ہی ایک دوسرا غار ہے جو اس سے قدرے بڑا ہے۔ مگر اس میں آثار قدیمہ کے کوئی آثار نہیں۔ اسی وادی میں نصف میل آگے پہاڑی مینڈ کی بنیاد پر دو مندر ہیں۔ ان میں سے بڑے مندر کو مسلم مقبرے میں بدل دیا گیا ہے مگر کافی حد تک دونوں غار مندروں کی تقلید ہیں۔ ان کی تاریخ تعمیر کافی عرصے کے بعد کی ہے۔

بابا بام الدین ریشیؒ کی درگاہ اور اس کے پیروکار رقوع الدین ریشیؒ کا مقبرہ بھی قریب ہی ہے۔ ہیوگل کا بیان ہے کہ غاریں بزدل کشمیریوں کی حکایات میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے ان کی بنیاد مندرجہ ذیل وجوہ پر ہے۔ کالی برس 2108 (993 ق م) راجہ نر نے ناگ کی خوبصورت بیٹی کو جھیل کے کنارے پر پکڑ لیا جو نہایت شان کے ساتھ جھیل کے ساکن پانی میں چل رہی تھی وہ اس عورت کا گرویدہ ہوگیا مگر اپنے جذبات کو اس ناگ کنیا میں جگانے کی ناکام کوشش کی۔ کافی سوچ وچار کے بعد اس نے اُسے اپنے شوہر سے دور جانے کی کوشش کی مگر اس کا منصوبہ ناکام رہا۔ غصے میں آکر برہمن نے راجہ سے کہا کہ وہ اس کی توہین کا بدلہ لے لے۔ اس

طرح ایک طوفان برپا کیا گیا، زمین پھٹی جس میں یہ راجہ اور اس کا تمام تر دربار دفن ہو گیا۔ اس ناگ دیوتا کی بہن نے اس کی مدد کی اور اس شہر پر بھون پر بت سے بڑے بڑے پتھر پھینکے۔ بومہ زوہ کی گپھائیں اُسی مقام پر واقع بیان کی جاتی ہیں جہاں پر پتھر لڑھکائے گئے تھے۔ (ہیوگل-گروئیسے)

اونتی پورہ دریا جہلم کے دائیں کنارے پر واقع ہے اور سرینگر سے اٹھارہ میل کے فاصلے پر ہے۔ اونتی پورہ کی قدیم دارالحکومت کا نام اس کے مشہور بانی راجہ اونتی ورمن سے وابستہ تھا۔ جس نے 854 سے 883 عیسوی تک حکومت کی۔ اس کے گردونواح میں تمام مقامات پر کھنڈر بکھرے پڑے تھے مگر عہد پارینہ کے صرف نشانات ہی باقی ہیں۔ ان میں وہ دو مندر بھی شامل ہیں جنھیں اس نے تعمیر کرایا تھا۔ ایک مندر اس نے اپنی تخت نشینی سے پہلے تعمیر کرایا اور دوسرا بڑا مندر اس کے کافی دیر بعد بنوایا گیا۔ یہ دونوں مندر مہادیو کے نام وقف ہیں۔ اوّل الذکر کا عنوان اونتی سوامی ہے اور مؤخر الذکر اونتیشور ہے۔ یہ دونوں مندر دریا کے کنارے واقع ہیں۔ اونتی پورہ تین چوتھائی میل شمال میں گاؤں جن بوئیر کے قریب واقع ہے۔ اب ان مندروں کی شکل غائب ہو چکی ہے اور بھاری کھنڈرات میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ مگر دونوں کے دروازے بدستور کھڑے ہیں۔ چھوٹے مندروں کے ستونوں کی ترتیب مکمل طور پر زمین دوز ہو چکی ہے۔ اس کی جزوی کھدائی کی جا چکی ہے۔ یہ طرز تعمیر مارتنڈ کے چہار کونے مندر کے متوازی ہے۔ مگر محرابی کونوں کے جزوی طور پر منسلک ستونوں پر کشیدہ کاری نے اس کے کردار میں بھاری گونا گونیت پیدا کی ہے۔ مگر باقی ستون قدرے کم دلکشی سے متناسب ہیں۔

ریت اور کلکتہ ریو یو سے ان تفصیلات کا اقتباس لیا گیا ہے جس میں مصنف کی رائے ہے کہ اونتی پورہ چبوترہ کی ریت اور مٹی نکالنے سے ہی اس مفروضے کی تشریح ہو سکتی ہے کہ بنیادی طور پر کشمیری مندر مصنوعی جھیلوں سے گھرے پڑے ہیں(8)۔ فورسٹر نے مئی 1783 میں اونتی پورہ کا دورہ کیا اور اس مقام کو اس نے بھیتی پور کا نام دیا۔

اسلام آباد کے اوپر کے کریوہ میں مارتنڈ واقع ہے اور اسلام آباد، بھون اور اچھبل سے یہاں تک رسائی حاصل ہو سکتی ہے۔

ہندو مارتنڈ کے کھنڈرات ایک کریوہ کے بلند ترین حصے پر واقع ہیں۔ مارتنڈ کو عموماً پانڈو کورو یا پانڈووؤں کا گھر ۔مشرق کا محیط کہتے ہیں جہاں سے پہاڑوں کے ساتھ اس کا رابطہ سلام آباد تین میل شمال سے شروع ہوتا ہے۔ بلاشبہ اسے کشمیر میں عمدہ ترین مقام حاصل ہے۔ اپنے محل وقوع اور جسامت کے لحاظ سے یہ کھنڈر کشمیری شان وثروت کا مقام رکھتا ہے۔ اس وقت مندر کی اونچائی چالیس فٹ سے زیادہ نہیں ہے مگر اس کی ٹھوس دیواریں اور خدوخال بانسری نما گول ستون پر جھکی ہوئی ستونوں کی قطار اسے نہایت خوبصورت شکل عطا کرتی ہیں۔ یہ تمام باریکیاں نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہیں جو اس عمارت کے نہایت موافق ہیں۔ اس مندر کی تاریخ تعمیر اور انداز پرستش کی بابت مختلف قیاس آرائیوں کی سعی رائیگاں کی گئی ہے۔ برہمن اور دوسرے لوگ اسے عام طور پر پانڈوؤں کا گھر کہتے ہیں۔ یہ مندر مارتنڈ یا آفتاب (Sun Tample) کے نام وقف ہے۔ کشمیریوں کو اس بات کی حیرانی ہے کہ اس مندر کی تعمیر کی حقیقی تاریخ واقعات نگاری کے نکتہ نظر سے متنازعہ ہے۔ اس کا تعین ایک صدی کے احاطے یعنی 370 سے 500 عیسوی کیا جاسکتا ہے۔ اس عمارت کے جس حصے کو اب مارتنڈ کہا جاتا ہے وہ ایک بلند مرکزی عمارت ہے جس کے داخلی دروازے کے ساتھ ہی ایک الگ عمارت ہے۔ یہ تمام ڈھانچہ ایک چبوترے پر کھڑا ہے جس کے اردگرد گول ستون ہیں جن کے درمیان مثلث محرابی کونے ہیں۔ اس خالی دیوار کے بیرون کی لمبائی نوے گز اور سامنے کا حصہ چھپن گز ہے۔ اس میں کل چوراسی ستون ہیں جو ایک منفرد انداز میں سورج کے ایک مندر میں مناسب تعداد ہے۔ بشرطیکہ یہ فرض کرلیا جائے کہ ہندوؤں کے لیے چوراسی ایک متبرک عدد ہے۔ کیونکہ ایک ہفتے کے ایام اور البروج میں علامتوں کی تعداد بھی اسی کا مخفف ہے۔ راج ترنگنی کے مطابق ستونوں کی یہ ترتیب مشہور ومعروف راجہ للتادتیہ کا کام ہے جس نے 693 سے 729 عیسوی تک حکومت کی۔ اسی تصنیف سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس مندر کی تعمیر رانا دیتہ اور ملحقہ عمارتیں اس کی رانی امرت پارکھا نے تعمیر کرائیں۔ اگرچہ ان شلوکوں کی تشریح کافی حد تک متنازعہ ہے۔ رانا دیتہ کے عہد حکومت کی تاریخ (9) کی بابت بھی قدرے ابہام ہے مگر یہ بات آسانی سے اخذ کی جاسکتی ہے کہ اس کی موت پانچویں صدی کے پہلے اول نصف حصے میں واقع ہوئی۔ یہاں تین دروازوں کے کھنڈرات ابھی تک موجود ہیں جو ڈیوڑھی کی طرف

کھلتے ہیں۔ ان میں کلیدی دروازہ اسلام آباد کے مغربی حصے کے سامنے کھلتا ہے۔ یہ بھی ایک مستطیل ڈھانچہ ہے جو چونے کے پتھر کی بڑی بڑی سلوں سے تعمیر کیا گیا۔ جن کی لمبائی چھ سے آٹھ فٹ ہے ان میں سے ایک دروازہ نو فٹ ہے ان میں خوبصورت تناسب ہے اور عمدہ ترین مواد کے ساتھ انھیں ایک دوسرے کے ساتھ مضبوطی کے ساتھ جوڑا گیا ہے۔ مرکزی عمارت کی لمبائی تریسٹھ فٹ اور چوڑائی چھتیس فٹ ہے۔ اس لحاظ سے یہ کشمیر کے تمام مندروں میں ایک الگ مقام رکھتا ہے۔ ایک انتر شالہ اور اردھ منڈپ نامی بڑی دالان ہے جن کی چوڑائی اٹھارہ فٹ ہے۔ صرف دالان کو ہی ننگا چھوڑا گیا ہے جب کہ دیگر دو حصوں میں دیواریں ہیں جن کے طاقوں میں مجسمہ سازی کی گئی ہے۔ یہ عمارت اس وقت بالکل عریاں ہے چنانچہ چھت کی حقیقی صورت کا تعین دوسرے مندروں کے حوالے اور خود مارتنڈ مندر کے مختلف حصوں سے کیا جاسکتا ہے۔ اس بات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ چھت اہرامی صورت کا ہوگا اور اس کی داخلی ڈیوڑھی اور دائیں بائیں کی عمارت پر بھی اس قسم کی چھتیں ہوں گی۔ یہاں پر چار نمایاں اہرام ہوں گے جن میں سے اندرونی عمارت کا اہرام بلند ترین ہوگا۔ زمین سے اس اہرام کی اونچائی پچھتر فٹ رہی ہوگی۔

اس مندر کا اندرونی حصہ بھی بیرونی حصے کی مانند لازمی طور پر شاندار رہا ہوگا۔ کھنڈرات کی صورت میں موجود سیڑھیاں چڑھنے کے بعد آفتاب پرست ایک نہایت آرائش شدہ کمرے میں داخل ہوتے ہوں گے جس کا دروازہ اور طرفین میں تکونی محرابیں ان میں ایک ہندو ترشول مجسمہ ہے اور پہلے دروازے کے آس پاس تکونی طاق ہیں جن میں سے ہر ایک میں ہندو دیوی کی مورتی رکھی گئی ہے۔ چھتوں کی اندرونی آرائش کا محض اندازہ ہی کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ آرائشی پتھر اب موجود نہیں ہیں۔ تاکہ کوئی بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکے۔ بیرن ہیوگل کو شک ہے کہ مارتنڈ مندر پر کبھی چھت موجود رہی ہوگی مگر اس مندر کی دیواریں بڑے بڑے پتھروں کے ڈھیر پر اب بھی کھڑی ہیں اور جو پتھر آس پاس بکھرے پڑے ہیں وہ صرف چھت کے پتھر ہی ہو سکتے ہیں(10)۔ کننگھم کا خیال ہے کہ اس جگہ پر کھلی دھوپ کی گنجائش کے سبب ہی یہاں پر سورج دیوتا کے مندر کا خیال آیا ہوگا۔ یہاں سے کشمیر کا نہایت دل فریب نظارہ دکھائی دیتا ہے۔ اس کے نیچے

مشرق کی جنت واقع ہے جہاں مقدس ندی نالے، باغات اور سرسبز کھیت ہیں۔ اور اس کے اردگرد برف پوش پہاڑ ہیں جو اپنے دامن میں واقع وادی پر خوشیاں بکھیرتے نظر آتے ہیں۔ اس نصف میل کے پہاڑی ٹیلے سے 360 میل چوڑی اور 100 میل لمبی وادی کا منظر اس قدر خوبصورت دکھائی دیتا ہے کہ "مارتنڈ ایک خوبصورت سرچشمۂ نور معلوم ہوتا ہے"۔

سرینگر سے 35 میل دور وادی کے مشرق میں نرستان واقع ہے۔ اس کا راستہ ترہٹ سے گذرتا ہے۔

یہ کشمیر کا ایک دلچسپ ترین کھنڈر ہے۔ اس کا محل وقوع نہایت جاذب نظر ہے۔ اس کے پس منظر میں براری آنگن پہاڑی سلسلے کی ڈھلوانیں ہیں۔ یہ مندر 65 فٹ مربع کے حصار میں واقع ہے۔ اس کی دیوار پانچ فٹ موٹی اور آٹھ فٹ لمبی ہے جو جا بجا زمین بوس ہو چکی ہے۔ اس کا کلیدی داخلی دروازہ مغرب کی جانب ہے۔ اس کے علاوہ ایک خوبصورت ڈیوڑھی بھی ہے جس کے بیرونی حصے میں آرائی نظام کی عدم تکونی محرابیں ہیں۔ اس کو آٹھ فٹ بلند ستونوں سے تقویت حاصل ہوئی ہے۔ ان ستونوں کے درمیان داخلی دروازے کی چوڑائی چار فٹ ہے۔ بیرونی ڈیوڑھی آٹھ فٹ چار انچ ہے اور درمیان سے مربع ہے جب کہ دوسری ڈیوڑھی قدرے زیادہ لمبی ہے۔ دیوار کی تینوں طرفوں کے درمیان میں ایک احاطہ اور ایک خالی محرابی کونہ ہے۔ شمال کی جانب بھی ایک مربع عقبی دروازہ ہے جو تین فٹ دو انچ ہے۔ اس قسم کا ایک دروازہ مغرب کی جانب ہے جو ایک مربع کمرے میں کھلتا ہے۔ یہ کمرہ اس احاطے کے جنوب مغربی کونے میں واقع ہے۔ اس کمرے کو روشنی ایک چھوٹے سے محرابی دریچے سے حاصل ہوتی ہے۔ جنوبی دیوار سے احاطے کی جانب پانچ فٹ مربع کا ایک چھوٹا سا کمرہ ہے جس کی چھت اہرامی ہے۔

اس احاطے کے اندر مندر کا ڈھانچہ کھڑا ہے۔ یہ ڈھانچہ شکل وصورت میں پاندرتھن سے مطابقت رکھتا ہے، مگر تناسب اور دوسرے لحاظ سے یہ ڈھانچہ زیادہ دیدہ زیب ہے۔ یہ بنیاد کے اوپر ہر جانب پندرہ فٹ بلند ہے۔ باہر بیرونی ڈیوڑھی مغربی سمت میں ہے جو دیوار کے سامنے سے تین فٹ باہر ہے۔

دیگر تین اطراف کے وسط میں ایک خالی تکونی محرابی راستہ ہے جس کا تناسب ڈیوڑھی کے

متوازی ہے۔ڈیوڑھی کے ہر جانب ہندو دیوتاؤں کی مورتیاں ہیں جو دیوار میں نمایاں طور پر کندہ ہیں۔اور تکونی محراب کے کونے میں موجود ہیں۔

اندرونی داخلی راستے ساڑھے چھ فٹ بلند اور ساڑھے تین فٹ چوڑا دروازہ ہے جس کو ستونوں کی تقویت حاصل ہے۔معلوم ہوتا ہے کہ اس پر اور درمیانی دروازے پر پتھر کے کواڑ لگے تھے۔اندرونی دالان ساڑھے آٹھ فٹ مربع ہے اور دیواریں خالی ہیں ماسوائے اس کے کہ دروازے کی جنوبی سمت میں محرابی کونہ ہے۔اس مندر کا فرش پتھر کا ہے جو بیچ میں سے شکستہ ہے۔شاید یہاں پر شولنگ نصب تھا۔زمین سے ساڑھے آٹھ فٹ اوپر ایک منڈیر ہے۔معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سے ایک مقام پر چھت کو روشن کیا گیا ہے۔دیواریں اب چوبیس فٹ کی بلندی تک کھڑی ہیں شاید گنبد مزید دس فٹ بلند تھا۔چھت کے دونوں اطراف ایک نشتر تھا۔

پاندریتھن سرینگر،اسلام آباد سڑک پر واقع ہے اور سرینگر سے بہ آسائش قابلِ رسائی ہے۔یہ مقام ایک قدیم اور دلچسپ ہندو مندر کی حیثیت سے نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔یہ مندر دریا کے کنارے سے پانچ سو گز کے فاصلے پر ایک تالاب کے درمیان واقع ہے جس کے اردگرد بید اور چنار کے درختوں کے جھنڈ ہیں۔یہ تالاب چالیس فٹ مربع شکل میں ہے اور عام موسموں کے دوران چار فٹ گہرا ہے۔یہ تالاب اس کائی سے بھرا ہے جو نرم کیچڑ والی تہہ میں اگتی ہے۔اس تالاب میں پانی شمال کی جانب واقع چھوٹے چھوٹے چشموں سے آتا ہے۔

اس مندر میں جانے کے لیے دقت پیش آتی ہے۔یہ مندر اٹھارہ فٹ مربع ہے جس کی ہر جانب ایک ڈیوڑھی ہے جو آرائش وسجاوٹ کی بھرمار کے سبب ابہام پیدا کر چکی ہے کونی کے اندر تکونی اور گنبد کے اندر گنبد سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ یہ مندر موجودہ کھنڈرات کے بعد تعمیر کیا گیا غالباً یہ مندر جدید کشمیری تعمیر کی جدید ترین مثال ہے۔یہ مندر راجا پارتھا کے عہد حکومت میں تعمیر کیا گیا جس نے کشمیر میں 921 سے 931 عیسوی تک حکومت کی۔یہ مندر اس کے وزیر میرو نے بنایا جس نے اسے میرو وردھمان سوامی کے لقب سے مہادیو کو وقف کیا۔

یہاں کی زمین پر سرینگر کا اصلی شہر آباد تھا اور پاندریتھن کا موجودہ نام سنسکرت پوراندزدھشنا یعنی ''قدیم دارالحکومت'' کا بگڑا ہوا روپ ہے۔بہرحال ڈاکٹر ایلسا ئیل کا قیاس ہے کہ یہ لفظ

پانڈو اور درانڈون یعنی پانڈوؤں کے والد سے اخذ کیا گیا ہے۔سرینگر کے موجودہ مقام پر دارالحکومت اس مندر کی بنیاد ہے۔تقریباً پانچ سو برس قبل راجہ پرورسین دوئم نے منتقل کیا۔مگر قدیم شہر کو تب تک ترک نہیں کیا حب تک کہ 960 کے قریب راجہ ابھیمانیو کے عہد میں ہولناک آگ سے تباہی مچی۔آگ کے یہ شعلے اس قدر بھیانک تھے کہ اس مندر کے سوا کوئی عمارت نہ بچ سکی۔
اس مندر کو اس لیے بچایا گیا کہ اس کے آس پاس پانی تھا۔اس کے گردونواح میں چند کھنڈرات کے ٹکڑے بکھرے پڑے ہیں ان میں دو بڑے شولنگ ہیں ساٹھ فٹ اونچا ایک شولنگ سیدھا اور "مکمل" ہے جبکہ دوسرا تین حصوں میں شکستہ ہے۔اس کا زیریں حصہ پانچ کونوں والا ہے جس کے محیط کا بالائی حصہ کونے کی مانند ہے۔اگر اس کو جوڑا جائے تو اس کی لمبائی سولہ فٹ ہوگی۔اس کے قریب قدرے خالی مقام کے بعد پتھروں کا ایک ڈھیر ہے جو بیٹھنے کے انداز میں کسی قوی ہیکل جان دار کے پاؤں ٹانگوں اور گھٹنوں کی طرح بلند معلوم ہوتا ہے۔غالبًا یہ کوئی بودھ مجسمہ ہے۔اس کے علاوہ ایک الگ تھلگ کھائی کھودی گئی ہے گویا کسی صناعی کی صورت میں یہ ایک مربع ستون ہے۔جس کی ہر جانب ایک تراشیدہ صورت ہے مگر اس چٹان کو الٹ دیا گیا۔اور ٹوٹ کر اس کے تین ٹکڑے ہو چکے ہیں اور یہ آگ کے عمل سے اس قدر مسخ ہو چکی ہے کہ اس کے حقیقی ڈیزائین کی بابت بات کرنا بھی محال ہے۔ان ٹکڑوں میں سے ابھی تک ایک منسلک ہے اور اصلی چٹان کا حصہ ہے۔بیرن ہیوگل نے پاندرٹھن کی عمارات کو"بودھ مندر" سے موسوم کیا ہے۔اس کا بیان ہے کہ اندرونی حصے میں بودھ مجتمے ہیں مگر اس سے دوہری غلطی ہوئی ہے کیونکہ یہ مندر مہادیو کو وقف ہے۔چنانچہ اس کے اندر کی مورتیوں کا بودھ مت سے کوئی تعلق نہیں۔ٹریبک مورکرافٹ کا ایک رفیق کار تیر کر اندر گیا مگر وہاں سے اسے اس قسم کی کوئی مورتی نہیں ملی۔بلکہ تمام چھت ایک پلستر کی تہہ سے ڈھکا ہوا تھا۔اس وقت اس کا بیان قطعی طور پر درست تھا۔

ان مندروں کو پانی کے بیچ تعمیر کرنے کا مقصد بلاشبہ انھیں ناگوں کے تحفظ میں دینا تھا جن کے دھڑ انسان کے اور دُم سانپ کی ہوتی ہے۔ان ناگوں کی کشمیر میں سالہا سال تک پرستش ہوتی رہی ہے۔(مورکرافٹ، ہیوگل وائین، کننگھم، گرویس، ڈاکٹر سٹائین نے "ٹورس آرکیالوجکل اینڈ ٹوپوگرافیکل ان اینڈ ایبرونڈ کشمیر" کے عنوان سے ایک مقالہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے

سامنے 13 نومبر 1894 کو پیش کیا تھا۔کشمیر کے کھنڈرات کے حالیہ جائزے کے بعد اس کا بیان ہے''ہر اس معاملے میں جہاں کھنڈروں کا تفصیلی جائزہ ابھی تک ممکن ہے۔کسی مندر کے سامنے یا اس کی جانب ایک حصار بند طاس میں میں نے ایک ناگ دیکھا۔پانڈر یتھن کے قلع نظر جواب ملبے کا ڈھیر بن چکا ہے، میں نے کسی بھی جگہ اس قرینے کا نشان تک نہیں دیکھا۔جس کے مطابق اکثر اوقات یہ مفروضہ اختیار کیا گیا ہے کہ تمام کشمیری مندر تالابوں کے درمیان تعمیر کئے گئے تھے''۔

پٹن کا مقام سرینگر بارہ مولہ سڑک پر ان مقامات کے نصف راستے میں واقع ہے۔

راج ترنگنی میں لکھا گیا ہے کہ اونتی ورما کے بعد شنکر ورما، جس نے 883 سے 901 عیسوی تک حکومت کی، اس نے اپنے دارالحکومت شنکر پورہ میں اپنی رانی سگندھا کے ہمراہ دو مندر مہادیو کو وقف کیے جن کے عنوان گوریشا اور سگندھکشوار تھے اس قصبے کی پہچان موجودہ پٹن سے کی گئی ہے جہاں پر گاؤں کے جنوب مشرق کی جانب شاہراہ کے علاوہ دو مندر اب بھی کھڑے ہیں۔یہ دونوں مندر سادہ ڈھانچے ہیں لیکن تمام اطراف سے بند ہیں۔ان کی بیرونی ڈیوڑھیاں اس قدر جاذب نظر ہیں کہ ان کے گہرے طاق کھو کھلے کمرے بن گئے ہیں۔ان میں کسی وقت ہر ایک میں ایک شولنگ ہوا کرتا تھا۔ان دونوں مندروں کا فن تعمیر مارتنڈ کے ساتھ مطابقت رکھتا تھا اور یہ دونوں مندر اسی قدر عمدہ حالت میں ہیں مگر دیواروں میں چند شگاف پیدا ہوئے ہیں اگر ان کے پاس جنگلی درختوں کو بڑھنے اور پھیلنے دیا جائے جن درختوں نے ان دیواروں میں جڑیں پیدا کرلی ہیں تو ان دونوں عمارتوں کی تباہی کا دن دور نہیں۔

اس گاؤں کے شمال میں موضع گاسی پورہ کے قریب پتھر کے دو نہایت پر کشش ستون ہیں جنھیں مقامی لوگ گورمت کہتے ہیں اور ان کا اعتقاد ہے کہ یہ دونوں زانی تھے جنھوں نے اپنی بداعمالیوں کے سبب ایسی ہی بدبختی پائی جو لاٹ کی اہلیہ کو درپیش آئی تھی۔بہر حال یہ دونوں ستون مندر کے بالکل چھوٹے ماڈل ہیں جو اس سرزمین پر وہاں ملتے ہیں مگر ان کی ایک خاصیت یہ ہے کہ یہ ستون اندر سے خالی نہیں ہیں۔ان کے داخلی راستے کے مقام پر مجسمہ دار چوکھٹے ہیں(11)

پتھر پر کھدائی کی تحریروں میں چند حروف باقی بچے ہیں جنھیں وائیں نے نقل کر کے کلکتہ

ارسال کیا مگر انہیں پڑھا نہ جاسکا۔ اگر چہ ان میں سے چند حروف کی سنسکرت کے ساتھ مطابقت تھی۔ (وگنے، گرو سے)

پانچ، سرینگر سے انیس میل کے فاصلے پر نونگاری کریوہ میں جہلم سے چھ میل کی دوری پر واقع ہے۔

اس گاؤں کے جنوب کی طرف دریا کے کنارے پر ایک چھوٹے سے سرسبز مقام پر ایک مندر ہے جو اخروٹ اور بید کے چند درختوں سے گھرا ہوا ہے۔ یہ مندر کشمیر کے ایسے کھنڈروں میں خوبصورتی اور بیرونی خدوخال کے لحاظ سے ایک قدیم ترین مندر ہے۔ اس عمارت کا بہترین تحفظ اس وجہ سے ممکن ہوسکا ہے کہ یہ مندر ایک الگ تھلگ مقام پر سپاٹ زمین کے بلند دامن میں واقع ہے جو اسے دریائے جہلم سے پانچ یا چھ میل کے فاصلے پر الگ کرتا ہے۔ یہ فن تعمیر کے لحاظ سے معرکتہ الآرا ہے۔ یہ ڈھانچہ آٹھ فٹ مربع پر مشتمل ہے جس کا کھلا داخلی دروازہ ہے جس میں ہر ایک سمت صرف دس پتھروں سے تیار کی گئی ہے۔ چار کونوں پر صرف ایک ہی پتھر ہے۔ تمام داخلی دروازوں پر دو مجسمہ دار بالائی چوکھٹے ہیں جب کہ یہ دونوں اہرامی چھت سے بنے ہوئے ہیں جن میں سے نچلا آٹھ تا چار فٹ اونچا ہے۔ اس بنا پر جنرل کننگھم نے لکھا ہے کہ کسی مستند اتھارٹی کے بغیر یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ یہ راجہ نریندر دِتیہ کے زمانے کا ہے۔ جس کا عہد حکومت 483 سے 490 عیسوی ہے (12)۔ ان دونوں داخلی دروازوں پر صناعی کا کام ترتیب کے ساتھ کیا گیا ہے۔ خالص فن تعمیر کے معاملے میں اس کی باریکیوں کو فن لطیفہ کے تحت انجام دیا گیا ہے۔ اب بہت ساری تفصیلات مسخ ہوچکی ہیں مگر ظاہری طور پر یہ دیوی استھاپن ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ مندر ویشنو کو بطور سورج یا سورج دیوتا کے نام وقف کیا گیا ہے۔

اس گنبد کے اندرون میں سورج کرنیں بکھیرتا ہے اور اس کا مربع ہر ایک کونہ اور زاویے اور خط کے درمیان کی جگہ پر ایک جن یا دربان ہے جس پر یہ کرنیں پڑتی ہیں۔ یہ چھت جزوی طور پر کھسک چکی ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ اسے پٹھانوں نے اکھاڑ کر شہر لیجانے کی کوشش کی تھی۔

اس مندر کے اندر ابھی تک ایک بڑا شولنگ ہے۔ پانی کے نکاس کی نالی اور بیل ان داخلی

دروازے کے دیواری ستونوں پر ریزوں سے تعمیر کردہ ہیں۔

تخت سلیمان مندر کشمیر کے تمام مندروں میں قدیم ترین ہے۔ بیرن ہیوگل کا خیال ہے کہ اس مندر کو گورنر یا خاندان کے راجہ گوپادیتہ نے 370 ق م میں تعمیر کرایا تھا مگر بعد کے تجزیہ نگار اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ اس بلند مقام پر یہ اولین عمارت اشوک کے بیٹے جلوکا نے تعمیر کرائی تھی۔ 300 ق م میں اشوک ایک ایسا عظیم حکمران تھا جس نے بودھ مت قبول کیا۔ اس بات کا مکمل امکان ہے کہ اب اس مندر کا نام ونشان باقی نہیں رہا ہوگا۔ بعدازاں یہ مندر راجہ گوپادیتہ نے جیشتور کو وقف کیا جو مہادیو کا ایک لقب ہے۔ اس کا عہد حکومت 253 سے 328 عیسوی تھا(12) مندر کی بنیاد اور بیرونی دیوار اب تک صحیح سلامت باقی ہے جب کہ بالائی ڈھانچے کی کافی حد تک تجدید کی گئی ہے۔ اس کی چوٹی کو نقصان پہنچا ہے مگر اس کی عام شکل وصورت ایک کونے کی مانند ہے۔ اس کی تکمیل میں آٹھ سلوں کی مستطیل ترتیب کے ذریعے گوشے تیار کیے گئے ہیں۔ یہ کونہ پچیس فٹ بلند ہے جس کی بنیاد بھی متناسب ہے۔ یہ ڈھانچے ایک ہشت گوشہ چبوترے پر ٹکے ہوئے ہیں۔ جن کی دیوار اس چٹان سے دس سے بارہ فٹ اونچی ہے۔ جس پر اس کی تعمیر ہوئی ہے۔ اس کا قطر قریباً سوفٹ ہوسکتا ہے۔ زمین سے مندر کے دروازے تک چونے کے پتھر کی سیڑھیاں چڑھ کر مندر کے دروازے تک پہنچا جاسکتا ہے۔ مؤخرالذکر عمارت کے قدرے نیچے جو تخت کی چوٹی تک پہنچتی ہے۔ چند کھنڈرات اس امر کا اشارہ کرتے ہیں کہ اسی مواد سے ایک اور عمارت یہاں موجود رہی ہوگی۔

اس کا اندرونی حصہ گول ہے جس کا نصف قطر چودہ فٹ ہے، سپاٹ چھت گیارہ فٹ بلند ہے، دیواریں آٹھ فٹ موٹی ہیں جن کو ابرق کا سفید پلستر ڈھانپے ہوئے ہے۔ یہ چھت چونے کے پتھر کے چار ہشت گوشہ ستونوں پر ٹکی ہوئی ہے۔ فرش کے مرکز میں ایک چوکور چبوترہ ہے جس پر سیاہ پتھر کا ایک شولنگ نصب ہے۔ اس کے اردگرد ایک سانپ کی کھدائی کی گئی ہے۔ دو ستونوں کے بائیں جانب دو فارسی تحریریں پتھروں پر کندہ ہیں۔ اس کے اگلے حصے پر درج ہے کہ یہ بت ایک حاجی ہشتی نے ہندو سموت کے برس 54 یعنی قریب 1780 برس قبل تعمیر کیا جب کہ اس کے عقب میں اسی قسم کے ایک ستون کے نچلے حصے میں لکھا ہے جس شخص نے یہ ستون کھڑا کیا وہ خواجہ

رَتم ولد مرجان تھا اس پر درج تحریر کو پڑھا نہیں جا سکا۔فرگوسن اس بات کا قائل ہے کہ موجودہ صورتحال میں مندر کی تعمیر کسی نامعلوم ہندو نے بھگوان شو کے اعزاز میں شروع کی ہوگی۔ جب غالبًا رواداراشہنشاہ جہانگیر کی حکومت تھی اور یہ کام 1069 ہجری بمطابق 1659 عیسوی میں بند کر دیا گیا جو متعصب اورنگ زیب کی حکومت کا پہلا سال تھا۔

وانگت سے تین میل دور ایک تنگ گھاٹی کے سرے پر انسانی آبادی سے دور چند مندروں کے کھنڈرات ہیں۔ پہاڑوں پر گھنے جنگلات میں بلند قامت صنوبر کے درختوں کے درمیان اور اس کی چرمراتی ہوئی دیواروں سے اس کی مذہبی عقیدت عیاں ہوتی ہے۔

خیال کیا جاتا ہے کہ یہ مندر تخت سلیمان، بومزو اور پانچ کے مندروں کے بعد قدیم کھنڈرات ہیں۔ایک دوسرے سے سو گز کے فاصلے پر دو حصوں میں چھ اور گیارہ عمارتیں ہیں۔ جنگلات کی نگہداشت نہ ہونے کی بدولت بہت سارے چھوٹے مندر قریباً مکمل طور پر تہہ و بالا ہو چکے ہیں۔ اس گھاٹی کی چوٹی پر صنوبر کے ایک بہت بڑے درخت نے جڑیں گاڑلی ہیں اور مرکزی جڑیں کلس کے برابر اٹھی ہوئی ہیں۔

پانچ کے مندر کے مقابلے میں اس مندر کا فن تعمیر زیادہ جدید ہے۔اس مندر کا نمایاں پہلو اس کا کھلا نقشہ اور بغلی ڈیوڑھیوں پر تکونی محرابیں ہیں۔

ناگہ بل کے ایک مقدس چشمے کے نزدیک قریب ہی ایک زیارت ہے۔ یہاں سے ایک پیدل راستہ ہرمکھ پربت کے راستے گنگا بل کی پہاڑی جھیل تک جاتا ہے۔ ہر برس 20 اگست کو یہاں پر ایک بڑا تیوہار منایا جاتا ہے جس میں کشمیر کے تمام حصوں سے ہزاروں کی تعداد میں ہندو شریک ہوتے ہیں۔ پیدل راستے سے بھی تلیل کی وادی تک رسائی حاصل ہو سکتی ہے۔ وانگت مندروں کی تعمیر مختلف ادوار میں عقیدت کے طور پر ان افراد نے کی جو اس دشوار گذار چڑھائی پر پہنچنے میں کامیاب رہے۔

●❁❁❁●

حوالہ جات

(1) ٹریلوز۔جلد دوم،ص245
(2) عروج وزوال-65. c.-نوٹ نمبر93
(3) برگس،جلد4،ص465
(4) آئین اکبری،جلد2،ص124
(5) برگس۔جلد4،ص445
(6) سی ایف فرگوسن۔ہسٹری آف انڈین اینڈ ایسٹرن آرکی ٹیکچر۔ص282-281
(7) ڈاکٹر سٹائن کا خیال ہے کہ یہ مندر بھیم کشور کے اس مندر کے قریب ہے جس کا ذکر کلہن نے کیا ہے۔یہ مندر بھیماشی نے تعمیر کیا جو دسویں صدی کے پہلے نصف حصے میں وادئ کابل کا حکمران تھا۔
(8) ڈاکٹر اسٹائن کا بیان۔ص175
(9) فرگوسن کے مطابق مارتنڈ کی تاریخ 750عیسوی ہے جبکہ اس نے رانہ دتیہ کا عہد حکومت 578سے 594عیسوی طے کیا ہے۔
(10) فرگوسن کے بقول اس مندر کی چھت لکڑی کی بنی ہوئی تھی۔
(11) میں نے بہت سارے چھوٹے چھوٹے مندر دیکھے ہیں لوگ انھیں کوٹر مورو کہتے ہیں۔ڈاکٹر اسٹائن کا بیان ہے یہ ہر لحاظ سے قبروں کی یادگاریں ہیں۔
(12) بقول فرگوسن پانچ ہمارے دور کی تیرھویں صدی سے متعلق ہے۔

●❀❀❀●

ساتواں باب

سیاسی تواریخ

اہلِ کشمیر نے تواریخ کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ ان میں ہندو راجاؤں کا ابتدائی دور ہے جس کی سرگذشت مشہور و معروف تصنیف راج ترنگنی میں درج ہے۔ مسلمانوں کا عہد جسے سلطنتِ کشمیر کہا گیا ہے مغلوں کا عہد یا بادشاہ چغتائی، شاہان مغلیہ کا عہد ہے۔ اور پٹھانوں کا عہد شاہانِ درانی عہد ہے۔ اگر ہر عہد کو تفصیل سے بیان کیا جائے تو ہر دور تاریخی دلچسپیوں کا موجب ہوگا مگر میں تو محض تواریخ کشمیر کا مختصر حال ہی بیان کرسکتا ہوں۔

میں نے یہ واقعات یہاں درج کرنے کی ضرورت محسوس کی ہے جن کو یہاں کے لوگوں نے کافی پسند کیا اور یہ بات لوگوں میں گفتگو کا موضوع رہی ہے۔ میں یہاں پر یہ دلیل نہیں دینا چاہتا کہ کشمیر کی مقبول اور حقیقی روایت موجود ہے حالانکہ عظیم ادوار کی مقامی روایتوں کی نمایاں مثالیں چند مقامات پر اب بھی موجود ہیں۔ عین ممکن ہے کہ اس علاقے کی جو تاریخ میں نے دیہاتی لوگوں سے جمع کرنے کی کوشش کی ہے وہ تمام ادبی ماخذوں سے بھی تلاش کی جاسکتی ہے۔ دیہاتوں میں رہنے والے بہت سارے سربراہ پڑھ لکھ سکتے ہیں اور ان سبھی کو راج ترنگنی کے تراجم تک رسائی حاصل ہے۔ یہ سربراہان کلہن کی سرگذشت سے داستانیں دہراتے ہیں، اس طرح ناخواندہ دیہاتیوں نے بھی اپنے ملک کی تواریخ کا ایک اندازہ سا کرلیا ہے۔ جب دیہاتی لوگ رات کو

الاؤجاگر باتیں کرتے ہیں تو ان کا بیان مبہم اور متضاد ہوتا ہے۔ اور ان کی خیالی باتوں میں بیان کردہ ناموں اور واقعات سے اتفاق کرنا ناممکن نہیں ہو پاتا۔ ڈاکٹر اسٹائن کی طرف سے مندرجہ ذیل سطور میں۔ تاریخ کشمیر کے دستیاب ماخذوں کا ذکر ہے اور اس بات کا جواز بھی ہے کہ تاریخ کے عام واقعات سے زیادہ انھوں نے کچھ اور کوشش کیوں نہیں کی۔

کشمیر ہندوستان بھر میں ایک الگ تھلگ خطہ ہونے کا بجا طور پر دعویٰ کرسکتا ہے جہاں پر تحریرشدہ تاریخ کا طویل سلسلہ موجود ہے۔ اسلامی فتوحات کے پیچھے کی تاریخ اور مورخین کے حقیقی نام مندرج ہیں ہندوستان کے دیگر حصوں میں تاریخ کے ایک متعلم کے لیے ناکافی اور عموماً غیر یقینی تفصیلات سے ملک کی تاریخ کے خدوخال تیار کرنے پڑتے ہیں جن کا انکشاف کتبات، سکوں اور ادبی کاوشوں کے بے شمار حوالوں سے ہوتا ہے اور شاذ و نادر ہی ایک دو صدیوں کے اہم واقعات کا مسلسل بیان ہو پاتا ہے۔ اگر تواریخ کشمیر کا طالب علم اپنے آپ کو بہتر حالت میں پاتا ہے تو ان دستاویزات کے تحفظ سے ممکن ہوسکا ہے۔ اس سے وادی کے عوام میں حقیقی تاریخی شعور کی موجودگی کا بجا طور پر احساس ہوتا ہے اگرچہ مجموعی طور پر ہندوستانی ذہن میں اس شعور کا شدت سے فقدان ہے۔

ان حالات کا خاص طور پر ہندوستان کی اُن تواریخی روایات کے ساتھ گہرا تضاد ہے جن کی بابت ان یورپی علما کی توجہ مرکوز ہوئی جنھوں نے ہندوستان کی قدیم تاریخ کا باریک بینی سے مطالعہ کیا تھا۔ کالبروک اور دوسرے رہبروں کی طرف سے ان دستاویزات پر لگاتار تحقیق کے انجام کار ڈاکٹر ہورلیس ہمین ولسن 1825 میں بنگال ایشیاٹک سوسائیٹی کی طرف سے کشمیر کی قدیم ہندو تاریخ پر ایک مقالہ شائع کرسکا جس میں کشمیر کی تاریخ پر دستیاب مواد کا پہلی بار تجزیہ کیا گیا تھا۔ اگر اُن دونوں کی ہندوستانی لسانیات کے حالات پر غور کیا جائے تو یہ کوشش نہایت قابل ستائش تھی۔ ڈاکٹر ولسن نے کشمیر کی سنسکرت تاریخ راج ترنگنی کو سامنے لایا جس کی ڈاکٹر ولیم جون نے بے سود تلاش کی تھی۔ یہ محض ایک تصنیف نہیں تھی بلکہ چار سرگزشتوں کا ایک سلسلہ تھا جسے مختلف مصنفین نے تحریر کیا تھا۔ مؤخر الذکر تصنیفات کو اس کے بعد کا تسلسل قرار دیا جاسکتا ہے جبکہ پہلا حصہ اس سلسلے کی اہم ترین کوشش تھی۔

یہ کشمیری شاعر کلہن کی راج ترنگنی تھی۔ یہ تصنیف سنسکرت شعروں کے آٹھ ابواب پر مشتمل ہے جو ان مختلف خاندانوں کی تاریخ بیان کرتی ہے جنھوں نے کشمیر پر ابتدائی دور سے مصنف کے عہد تک حکومت کی۔ اس نے اس تصنیف کو 1148 میں راجہ جے سمہا کے دور حکومت میں لکھنا شروع کیا۔ اگر چہ کلہن خود بھی اپنے پیش روکئی مورخوں کا ذکر کرتا ہے مگر ان میں سے کسی بھی مورخ کا کام ہم تک نہیں پہنچ پایا ہے بلکہ راج ترنگنی کشمیر کی قدیم تاریخ پر معلومات کے ایک براہ راست ماخذ کے طور پر نمایاں ہوئی ہے۔ اگر اولین خاندانوں کے پہلے تین ابواب میں درج تفصیلات کی داستانوی نوعیت کو تسلیم بھی کر لیا جائے اور ان حصوں کی فرضی سرگزشت کو نظر انداز کر دیا جائے پھر بھی کلہن کی یہ کاوش تاریخ کشمیر کی بابت تسلسل سے متعلق تاریخی تنقید کی کسوٹی پر پوری اُترتی ہے۔ ساتویں صدی کے بعد کے مندرجات کو مستند تسلیم کیا جا سکتا ہے اور جوں ہی ہم مصنف کے عہد کے قریب پہنچتے ہیں تو مندرج تفصیلات سے ہماری دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔

کلہن کے کام کو پنڈت جونراج نے جاری رکھا۔ اپنے پیش رو کے تخلیق کردہ انداز بیان کو جاری رکھتے ہوئے اس نے وادی کو آخر ہندو خاندانوں اور اولین مسلم حکمرانوں تک لایا ہے۔ جب 1417 میں سلطان زین العابدین تخت نشین ہوا۔

سری ور کی جونہ راج ترنگنی زین العابدین کے دورِ حکومت کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے اس دور تک آتی ہے جب 1486 عیسوی میں فتح شاہ تخت نشین ہوا۔ سنسکرت سرگزشتوں کا یہ سلسلہ پرجے بھٹ کی تصنیف راجیہ ولی پنا کا پر ختم ہوا جس نے 1586 میں اکبر کی فتح تک کے واقعات کو بیان کیا۔

مغل دور کے واقعات کے لیے ہم مسلم مورخین کی تصنیفات کے علاوہ کشمیر کے موجودہ فارسی مورخوں کی کاوشوں کو زیر مطالعہ لا سکتے ہیں جن میں حیدر ملک، محمد اعظم، نارائن کول اور دوسرے مصنف شامل ہیں جو اٹھارھویں صدی کے اوائل تک بقید حیات رہے ہوں گے۔ اگر چہ ان تصنیفات میں اکبر کی فتح سے قبل تواریخ کشمیر کے قدرے کم مسخ واقعات درج ہیں پھر بھی یہ بات مشکوک ہے کہ آیا ان مصنفین کے پاس ان ادوار کے بارے میں ان سنسکرت سرگزشتوں کے علاوہ کوئی دیگر مواد موجود تھا جو ابھی تک ہمیں دستیاب ہیں۔

تعلیم یافتہ کشمیریوں کے ذہن میں تواریخی واقعات کی بابت ان کی دلچسپی ختم نہیں ہوئی کیونکہ حالیہ وقتوں میں بیربل کاچرو کی تواریخ، آنجہانی دیوان کرپا رام کی گلزارِ کشمیر میں ابتدائی ادوار ان واقعات کے علاوہ جو اس سے قبل نسخوں میں درج تھے، سکھ اور ڈوگرہ عہدوں میں وادی کی تاریخ پر روشنی بھی ڈالی گئی ہے۔

ہم نے پہلے بھی اس بات کو زیرِ نظر رکھا ہے کہ تواریخ کشمیر کی قدیم روایات کی بابت پہلے پہلے ڈاکٹر ولسن نے تنقیدی مطالعہ کیا۔ اس کے خلاصے میں صرف چھ ابتدائی ابواب تک کا مطالعہ ہے جن کے مسودات اس قدر نامکمل تھے کہ ان کا ترجمہ نہایت ناقابلِ عمل ہے۔ پہلی کاوش کی اشاعت کے کلکتہ میں شائع اولین ایڈیشن کے بعد ڈاکٹر مورکرافٹ کے جوش وخروش کے سبب ایک مکمل نسخہ دستیاب ہوا جس نے ترکستان کی بدنام مہم کے دوران 823 میں مسٹر ٹرویئر نے فرینچ ایشیاٹک سوسائٹی کے لیے اس تصنیف کے ترجمے کے ایڈیشن کا کام شروع کیا۔ اول الذکر نسخہ کبھی مکمل نہیں ہوا اور بہت پہلے ہی مستند اسکالروں نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ موٴخر الذکر کی نہایت محدود قدر و قیمت تھی۔

بعد ازاں جنرل کننگھم، پروفیسر لیسن اور دیگر حضرات نے ہندو خاندانوں کے شجرۂ نسب اور بیرون کشمیر کے علاقوں سے ان کے تعلقات کی بابت اہم باتوں کو عام کیا پھر بھی 1877 میں بقیدِ حیات ممتاز ماہر امورِ ہند پروفیسر بُہلر کو اس وقت تک کیے گئے کام کا جائزہ لینا پڑا تا کہ اس سرگذشت کی تشریح ممکن ہو سکے۔ انھوں نے جو رائے دی وہ تواریخ کشمیر کے ایک طالب علم کے لیے کسی طور بھی حوصلہ افزا نہیں تھی۔ اس بات پر شاید ہی یقین کیا جا سکے کہ جس کتاب نے بہت سارے سنسکرت عالموں کی توجہ کو مبذول کیا ہے وہ اطمینان بخش حالات میں موجود نہیں ہے اور بہت ساری تفصیلات طلب تشریح ہیں حالانکہ ان میں سے بہت سارے عالم صفِ اول میں شمار ہوتے ہیں اور انھوں نے اس پر کافی محنت بھی کی ہے (1)۔

پروفیسر بُہلر نے بجا طور پر ان نتائج کے کم ہونے کو مواد کا فقدان قرار دیا جس پر یورپی اور ہندوستانی اسکالروں نے اس وقت تک کام کیا تھا اور یہ بات ظاہر ہوئی تھی کہ اس مشکل تصنیف کی مزید تشریح کے لیے کشمیر کے پرانے جغرافیہ اور اس کی قدیم روایات کا موقعہ پر مطالعہ ناگزیر

ہے''۔ پروفیسر بُہلر کی رپورٹ کے فوراً بعد مسٹر جگدیش چندر دتہ کی طرف سے شائع انگریزی ترجمے نے مندرذیل رائے کی مزید تصدیق کی ہے۔ کلکتہ ایڈیشن کے مسخ شدہ متن پرمبنی اس ترجمے کا استعمال کرنے میں اس طالب علم کو احتیاط سے کام لینا ہوگا جس کی رسائی اصل متن تک ممکن ہوسکتی ہے۔ کیونکہ اس میں کشمیر میں جاکر تقابلی تحقیق نہیں کی گئی ہے۔ اس کے باوجود جس محنت ولگن کے ساتھ مترجم نے یہ کام سرانجام دیا ہے اسکی ستائش کا وہ بجاطور پرحقدار ہے۔ 1892 میں کلہن کی تصنیف کا ایک نیا ایڈیشن سٹائین نے کشمیر کونسل کے زیراہتمام شائع کیا۔ اس میں صحیح متن کو پہلی بار شامل کیا گیا کیونکہ مدیر نے Codex Archetypus کو پہلی مرتبہ حاصل کیا تھا اور اس میں اسے کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ اس اشاعت کی دوم جلد جو وادی میں اس مقصد سے لے جائی گئی تا کہ نتائج کو موقع پر ہی پرکھا جاسکے اور اس کی تشریحات کی جانچ کی جاسکے، وہ اب تک سامنے نہیں آئی ہے۔

جہاں تک کلہن کی راج ترنگنی کے سنسکرت تسلسل کا تعلق ہے یہاں پر یہ بات قابل غور ہے کہ اب تک کسی بھی ترجمے کی کوشش نہیں کی گئی ہے اور اس وقت یہ کام ناقابل عمل ہوگا۔

فارسی تذکروں کا ذکر پہلے ہی کیا جاچکا ہے اور یہ نسخے تواریخ کشمیر کے ابتدائی سلسلے میں مفید مواد ہونے کا ہرگز دعویٰ نہیں کر سکتے۔ قریباً تمام تر حالیہ نسخے زمانۂ حال کے ہیں۔ چنانچہ یہ لازمی ہوجاتا ہے کہ مسلم دور کا باوثوق مطالعہ کرنے سے قبل ان کے ماخذوں کا جائزہ لیا جائے۔ اس میں کوئی بھی سرگذشت شائع شدہ نہیں اور نہ ہی ان کا کوئی ترجمہ یا خلاصہ دستیاب ہے۔ جس سے ایک یورپی متعلم کوان تک آسانی سے رسائی حاصل ہوسکے۔

تواریخ کشمیر کے باضابطہ مطالعے کے لیے جو تحقیقی کوششیں اب تک کی گئی ہیں ان میں سے مندرجہ ذیل کیفیت کافی حدتک روشناس کراسکتی ہے۔ اس بارے میں اچھا خاصا مواد میسر ہونے کے باوجود جو دقتیں پیش آئیں ان کا اندازہ بھی ہوسکتا ہے۔ ان حالات میں اس محدود کتابی احاطے میں اس قدر گنجائش نہیں ہے کہ ہرایک اہم دور کی مستند تاریخ کو بیان کرنا ممکن ہوسکے۔

چنانچہ میں ان میں اہم واقعات کا ذکر کروں گا۔ جن پر عام طور دیہاتی علاقوں میں گفتگو ہوتی ہے۔ کسی کو ہندو زمانے کی وہ عالی شان عمارتیں پربت یا بلند سطح پر واقع سپاٹ زمین دکھائی

نہیں دیتی جب تک کہ کسی کے دل میں یہ اُمنگ پیدا نہ ہو کہ جو لوگ اس وادی کے باشندے تھے وہ کیسے ہوں گے۔؟ یہ عمارتیں اس وقت کھنڈر بن چکی ہیں اور آج کے کشمیری انھیں محض یہ کہہ کر مسترد کر دیتے ہیں کہ یہ عمارتیں پانڈوؤں کے مسکن ہیں۔ان کے لیے یہ بات کوئی معنی نہیں رکھتی کہ کشمیر کسی دور میں پانڈوؤں کی گوری چٹی نسل کی جائے پیدائش رہی ہوگی۔(2)

کشمیری دیہاتیوں سے ملک چین کی شان وشوکت اور طاقت کی بابت سنی ہوئی بات چیت دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔وہ نہایت وثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ کشمیر کسی دور میں تاتار کے چینی شہزادوں اور ہشکا، جشکا اور کنشک کی ماتحتی میں تھا اور کنشک (3) کی بابت یہ کہا جاتا ہے کہ وہ بودھ اور تاتاری تھا۔یہ امر اسی قدر دلچسپی کا موجب ہے کہ مقامی مذاہب کو تہس نہس یا مٹا کے اور بودھ مت کی سنی سنائی باتوں کا پورے شد ومد سے مقابلہ کر کے برہمن وادی ابتدا کے عمل پر نظر رکھی جائے۔(4)

سنسکرت کے علما کے لیے یہی موضوعات ہیں۔موجودہ کشمیریوں کے خیالات کے خدوخال تراشنے کے معاملے میں مجھے مزید نرم روی سے کام لینا ہوگا۔ہندو عہد کا حال بیان کرنے کے لیے مجھے راج ترنگنی کے مسٹر جے سی دت کی طرف سے کیے گئے ترجمے میں درج گوشوارے کا سہارا لینا ہوگا جب کہ بعد کے ادوار کے معاملے میں مجھے ان تاریخوں کا استعمال کرنا ہوگا جو ملکی زبان کی تواریخوں میں درج ہیں۔یہ تاریخیں اگر چہ قیاساً صحیح ہیں مگر ان سے میرا مقصد پورا ہو جائے گا تا کہ میں عوام کی طرف سے تسلیم کردہ تاریخ کے مقبول واقعات کا بیان کر سکوں۔حقیقی مؤرخین کے لیے عوام جن حقائق کو بیان کرتے ہیں کسی قدر و قیمت کے حامل نہیں ہو سکتے ان کے لیے مقابلتاً دوسری ادبی کاوشوں میں دیے گئے حقائق اور واقعات زیادہ نادر ہیں۔

کشمیر کا پڑھا لکھا ہندو یا مسلمان اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ یہ وادی کسی وقت ایک وسیع جھیل تھی جس میں دیوی پاروتی کی کشتی شمال میں اس کے مسکن ہرموکھ سے جنوب میں جھیل کی طرف چلتی تھی۔اس کے اعزاز میں یہ جھیل ستی کے نام سے مشہور ہوئی جس کے معنی پاکیزہ عورت کی جھیل ہے مگر اس جھیل میں ایک جابر دیو جل دیو (5) رہتا تھا جس کا سرپرست برہما تھا۔اس دیو نے جھیل کے کناروں پر بھی جانداروں کو نیست و نابود کر دیا اور اس ملک کو بنجر اور ویران کر کے رکھ دیا۔اتفاق سے برہما کا پوتا کاشف (کشیپ) اس جھیل تک آپہنچا اور اسے یہاں کی تباہی کا منظر

دیکھ کر بے حد دکھ ہوا اور اس نے اس دیو پر قابو پانے کا قصد کر لیا۔ کاشف ایک ہزار برس تک دینی ریاضت کرتا رہا اور آخر اس نے جل دیو کا مقابلہ کرنے کی طاقت حاصل کر لی، مگر دیو بچ کر پانی میں روپوش ہو گیا۔ اس مرحلے پر کاشف کی امداد کے لیے وشنو آگے بڑھا اور اس نے بارہ مولہ کے مقام پر اپنے ترشول سے ضرب لگائی چنانچہ جھیل کا پانی باہر نکل گیا مگر جل دیو ہاری پربت کے نزدیک ایک کھائی میں چھپا رہا حالانکہ دیوتاؤں نے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے میں چاند لے کر اس کی تلاش کی مگر جل دیو انھیں بدستور جل دیتا رہا۔ آخر کار دیوی پاربتی نے اس پر ایک پہاڑی کی چوٹی دے ماری جس سے دب کر جل دیو مارا گیا۔ اس پہاڑی کو اب ہاری پربت(6) کہا جاتا ہے۔ اس دیوی کے اعزاز میں یہاں پر ایک عظیم استھاپن ہے۔ بعدازاں اس وادی کا نام کاشف مر یعنی کاشف کا مسکن پڑ گیا اور اب کی مسخ صورت کشمیر ہے۔ دوسری حکایات کے مطابق کاشف ایک طاقتور پہلوان تھا اور ایک ہزار مندروں میں پوجا کرنے کی خواہش لے کر وہ اچانک مذہب کی جانب مائل ہو گیا۔ یہ مندر جھیل کے پانی میں پنہاں تھے۔ اس نے بارہ مولہ کے مقام پر پہاڑ میں سوراخ کر کے ایک سرنگ نکالی اور وادی خشک ہو گئی۔

جب کچلے جانے سے جل دیو مارا گیا تو دوسرے چھوٹے چھوٹے دیووں کے حوصلے پست ہو گئے ۔ آدم زاد اس وادی میں موسم گرما کے دوران ہی آتے تھے جب کہ موسم سرما میں وہ کشتواڑ کے گرم اور خشک خطوں میں چلے جاتے تھے۔ اور سردیوں کے دوران وادی کو دیویوں اور آسیبوں کے رحم و کرم پر چھوڑ جاتے ۔ بدقسمتی سے ایک ایسا ضعیف برہمن کشمیر میں رہ گیا جو چلنے پھرنے سے معذور تھا۔ اس نے کشمیر میں موسم سرما گزارا۔ اس دوران وہ نیل ناگ گیا جہاں اس چشمے کی دیوی نے اسے نیل مت پوران دیا۔ اس پوران کا مطالعہ کرنے کے بعد برہمنوں نے آسیبوں کو نکال پھینکا اور بیسویں صدی قبل مسیح کے آس پاس کشمیر مکمل طور پر ایک آباد علاقہ ہوا(7)۔ پہلے پہل کشمیر مختلف چھوٹی چھوٹی بادشاہتوں میں بکھرا ہوا تھا جو کوٹ راج کے طور پر مشہور تھے۔ ان کے کھنڈرات آج بھی موجود ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے راجواڑے آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے۔ حتیٰ کہ جموں کے علاقے سے ایک راجپوت نے آکر انھیں شکست دی۔ چنانچہ کشمیریوں کا کہنا ہے کہ جموں اور کشتواڑ کے علاقوں نے وادی کی تاریخ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے اور یہ بات قابل

غور ہے کہ گونند اوّل یہی راجپوت ہے یا آریہ دت کے مطابق اس کا عہد 2448 ق م یا 1400 ق م یا 1260 ق م تھا، میرے لیے یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی کیونکہ وادی میں اب گونند کا کوئی نام لیوا نہیں ہے۔ عیسوی سن کی شروعات سے قبل جو اوّلین حکمران برسراقتدار آئے ان میں بدھ کے بعد اشوک آیا۔ اس کے بیٹے جلوکا نے دوبارہ شیو کی پرستش شروع کر دی۔ وہ ناگ کنیاؤں کا عاشق تھا مگر اس کے تھوڑے عرصے بعد بودھوں نے ترسک راجاؤں ہشکا جشکا اور کنشک کے تحت دوبارہ طاقت حاصل کر لی۔ ناگاؤں نے حملہ کر دیا اور پہاڑوں کے اوپر سے بڑے بڑے برفانی پتھر لڑھکا دیے۔ آخر کار کاشف یا کشپ کے خاندان سے ایک راجہ چندر دیو نے مداخلت کی اور نیل مت پوران کی رسوم کو بحال کر دیا۔ عوامی حکایات میں یاد کیا جانے والا اگلا نام مہرا کل (515 عیسوی) ہے۔ لوگ (8) وادی کے جنوب مغرب میں ایک درے کی طرف اشارہ کر کے بیان کرتے ہیں کہ یہ راجہ اس وقت کس قدر خوش ہوا جب اپنی فوج کے ساتھ اس درے کو عبور کرتے ہوئے اس ہاتھی کی چیخیں سنائی دیں جو پہاڑی سے ایک ندی میں جا گرا تھا۔ اس راجہ کو اس سے اتنا لطف حاصل ہوا کہ اس نے ایک اونچی چٹان سے مزید ایک سو ہاتھیوں کو نیچے گرائے جانے کا حکم صادر کیا۔ اس ظالم راجہ کی ایک اور حکایت یہ بیان کی جاتی ہے کہ دریائے چندر کول سے ایک پتھر کو ہٹایا جانا مقصود تھا۔ راجہ کو خواب میں بتایا گیا کہ یہ پتھر محض ایک پاک دامن عورت ہی ہٹا سکتی ہے۔ بہت سارے شہریوں کی بیویوں نے یہ کام سرانجام دینے کی کوشش کی مگر ناکام رہیں۔ بالآخر ایک کمہار کی بیوی چندراوتی نے یہ کام سرانجام دیا۔ اس سے راجہ کے ذہن میں خیال پیدا ہوا کہ اس قدر تعداد میں عورتیں آبرو باختہ ہیں۔ اسے غصہ آ گیا اور اس نے ان تمام عورتوں کو ہلاک کرنے کا حکم دے دیا۔ ان کے بھائیوں اور شوہروں کو ملا کر مقتولین کی کل تعداد تین لاکھ تک پہنچ گئی۔ (9)

نیک سیرت راجہ گوپادتیہ مہراکل کے بالکل برعکس تھا۔ اس نے کشمیر کے برہمنوں کو پاکیزگی عطا کرنے میں اچھا خاصا کردار نبھایا اور ان کے مفادات کو تقویت بخشی۔ راجہ تجنا کے عہد کے زبردست قحط کو کافی حد تک یاد کیا جاتا تھا۔ لاتعداد کبوتروں کے آ جانے کے سبب یہ قحط ٹل جانا ایک عجیب و غریب بات تھی۔ ماتری گپت کا نام بھی اچھی خاصی دلچسپی کا موجب ہے۔ ظاہر ہوتا ہے کہ

اسے اُجین کے عظیم مہاراجہ وکرمادتیہ نے کشمیر کا راجہ بنایا۔ ماتری گپت ایک شریف شہزادہ تھا اور راجہ پرورسین کے سامنے اس کا سرنگوں ہونا اس کی انکساری اور کردار کی شرافت اور اس دور کے شائستہ آداب کو ظاہر کرتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ راجہ پرورسین نے سرینگر کی بنیاد رکھی جس کا مرکز ایک تفریحی پہاڑی تھی جس کی چوٹی سے تمام شہر کو دیکھا جاسکتا تھا۔

کشمیری عوام للتادِت کے نام کو سب سے زیادہ یاد کرتے ہیں جس کا عہد 738-697 عیسوی ہے۔ وہ کشمیر کے راجہ پرتاپ دِتیہ کا بیٹا تھا۔ اس کی ماں ایک بہت بڑے تاجر کی داشتہ تھی جس کی خوبصورتی پرتاپ دِتیہ کی توجہ کا مرکز بنی۔ تخت نشین ہونے کے جلد بعد للتادت ہندوستان فتح کرکے روانہ ہوگیا۔ ہندوستان کے راجاؤں کو زیر کرنے کے بعد اس نے اپنی توجہ وسطی ایشیا کی طرف مبذول کی اور ہر جگہ فتحیابی اور کامرانی حاصل کرتا ہوا بارہ برسوں کے بعد تبت کے راستے کشمیر پہنچا۔ اس نے تمام ملکوں سے کاریگر اور اہل علم ودانش اپنے ہمراہ لائے اور انہیں فلاح عامہ کے کاموں پر مامور کیا۔ اس نے خوبصورت مندر تعمیر کرائے اور ہندوستان سے لایا ہوا سونا ان مندروں کی سجاوٹ کے لیے استعمال کیا۔ پارسپورہ میں اس نے ایک بلند ستون اور مارتنڈ میں مندروں کی تعمیر کرائی (10)۔ اس نے عمدہ قسم کی نہریں تعمیر کرائیں' دلدلی زمین پر نالیاں نکلوا کر اسے قابل کاشت بنایا۔ اس نے ایک وسیع لنگر خانے کی تعمیر عمل میں لائی جہاں پر روزانہ ایک لاکھ افراد کو کھانا کھلایا جاتا۔ وہ انصاف پسند اور عالی مرتبہ راجہ تھا مگر بعض اوقات نشے کی حالت میں وہ جابرانہ احکامات جاری کرتا تھا۔ بسا اوقات اسے زیادہ فتوحات کی تڑپ رہتی۔ وہ وسط ایشیا (اترا کورو) کی طرف کوچ کر گیا۔ کشمیریوں نے اسے واپس آنے کی تلقین کی مگر سینتیس برس کی حکومت کے بعد وہ ترکستان میں راہی ملک عدم ہوا۔ رخصت ہونے سے قبل اس نے اپنی رعایا کو دانشمندانہ رائے دی جو بعد کے مورخین کے لئے روشنی کا سرچشمہ معلوم ہوئی۔ اس نے انھیں اندرونی خلفشاروں کے خلاف متنبہ کیا اور کہا کہ اگر قلعوں کی مرمت ہوتی رہے اور اس میں غلہ اور رسدات موجود رہیں تو دشمن سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس نے یہ قاعدہ بھی وضع کیا کہ ایک پہاڑی سلطنت میں نظم وضبط کی سختی سے پابندی لازمی ہے۔ اس کے علاوہ کاشتکاروں کے

پاس ان کی ایک برس کی ضروریات سے زیادہ غلہ رکھنے کی اجازت نہیں دینی چاہیے ورنہ وہ اپنے ہمسایہ کے کھیتوں میں گھس جائیں گے۔ کاشت کاروں کو دبا کر رکھنا لازمی ہے اور ان کا طریق کار شہری عوام کے مقابلے میں پست تر ہونا چاہیے ورنہ موخر الذکر مصیبت کے شکار ہو جاتے ہیں۔ للتا دتیہ کی آخری ہدیت یہ تھی کہ عہدوں پر خاندانی ٹولیاں قابض نہیں رہنی چاہئیں۔ جب کائستھ ازدواجی رشتوں اور شادیوں کے ذریعے ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہو جاتے ہیں تو عوام کی بدبختی کے دن قریب آ جاتے ہیں۔ للتا دتیہ ایک شاندار فاتح و کامران تھا اور عوام کو دیے گئے اس کے مشورات ایک پیشین گوئی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ بات بھی درست ہے کہ شراب کے نشے میں دیوانگی کا عالم طاری ہونے پر اس نے حکم جاری کر دیا کہ پردرسین کے خوبصورت شہر کو نذر آتش کر دیا جائے اور جیسے جیسے وہ شعلوں کو بلند ہوتے ہوئے دیکھتا گیا وہ دیوانہ وار قہقہے لگاتا رہا۔ مگر اخلاق کا تقاضا ہے اسے معاف کر دیا جائے۔

راجہ اونتی درمن 883-855 کوئی فاتح اور کامران نہیں تھا مگر اس کے دورِ حکومت میں وادی میں نالیوں کے نظام پر خاص توجہ دی گئی۔ اس بارے میں ایک دانشمندانہ شخص سُیا نے ہمیں دلچسپ داستان سنائی ہے۔ کشمیر میں پانی جمع ہو جانے کی وجہ سے کشمیر میں کاشت کی حالت میں ابتری پیدا ہو چکی تھی اور قحط پڑ رہا تھا۔ اس معاملے میں جب سُیا سے مشورہ کیا گیا تو اس نے جواب دیا، میرے پاس عقل و دانش ہے مگر دھن دولت نہیں۔ اور راجہ نے شاہی خزانہ اس کے سپرد کر دیا۔ اس دانش مند نے دھن دولت کو کشتیوں میں ڈالا اور اس مقام پر لے گیا جہاں دریائے جہلم میں چٹانوں کی وجہ سے رکاوٹ پیدا ہوئی تھی(11)۔ اس نے مٹھی بھر (سکے) دریا میں اچھال دیئے سبھی لوگ کہنے لگے کہ یہ دانشمندانہ شخص دیوانہ ہو چکا ہے مگر جو دیہاتی قلت کے شکار تھے وہ سکوں کو تلاش کرنے لگے۔ اس عمل کے دوران دیہاتیوں نے چٹانوں کو بھی ہٹا دیا اور پانی رواں دواں بہنے لگا۔ سُیا کے وقت سے لے کر اب تک حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی کیونکہ چند مقامات پر وادی میں اب بھی پانی جمع ہو جاتا ہے اگر سُیا کی ترکیب کے تحت انھیں ادائیگی ہوتی رہے۔ وہ موجودہ یومیہ اُجرت کے مقابلے میں زیادہ کڑی محنت کرتے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اونتی ورمن کا رجحان شومت کی طرف تھا اور یہاں پر یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ موجودہ دور کی طرح اجتماعی طور پر

ہندو کی پوجا کرتے تھے۔

اونتی ورمن کا بیٹا شنکر ورمن ایک عظیم فاتح اور کامران تھا۔ اگر چہ کشمیر کی آبادی کم ہو چکی تھی تاہم اس کی فوج میں نو لاکھ پیادہ، تین سو ہاتھی اور ایک ہزار گھوڑے تھے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس قدر بھاری تعداد میں فوجی کہاں سے بھرتی کیے گئے۔ کشمیر میں جنگجو تانترے اور ڈامروں کا ذکر ملتا ہے اور یہ قبیلے آج بھی یہاں موجود ہیں مگر یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے آیا للتادتیہ اور شنکر ورمن کے سپاہی وادی کے باشندے تھے یا پنجاب سے لائے گئے کرائے کے سپاہی تھے مگر اس بات پر یقین کرنا محال ہے کہ ایک ایسا علاقہ جس نے کبھی شاندار سپاہیوں کی پرورش کی تھی وہاں صدیوں کے جبر واستبداد کے بعد یہ حالت ہوئی کہ یہاں پر ایک بھی جنگجو شخص اب موجود نہ رہے۔

شنکر ورمن کو پٹن کے مندروں کے سبب یاد کیا جاتا ہے۔ اگر چہ وہ ایک عظیم فاتح و کامران حریص، ظالم، جواری اور عیاش شخص تھا۔ کشمیر کی سلطنت میں اختلافات نمودار ہونا اب شروع ہو چکے تھے۔ تولہ مولہ کے برہمن اُس وقت بھی طاقتور تھے۔ انھوں نے 782 عیسوی میں جیاپیٹرا کو موت دی تھی راجہ یکشنکر 48-939 نے برہمنوں کو دور رکھنے سے اپنی شروعات کی مگر آخر ان پر عنایتوں کی بارش کرنے لگا۔ پال ڈامر اور تانترے لوگوں کے بڑھتے اقتدار کا ذکر راج ترنگنی میں اکثر ملتا ہے اور یہ بات اکثر دیکھی گئی ہے کہ جب کبھی راجاؤں اور ان کے سپاہیوں نے ہندوستان پر حملہ کیا وہ بے عملی کے شکار ہو گئے اور خانہ جنگی کی طرف مائل ہو گئے۔

بعد کا دور یعنی رانی دِڈا کا عہد حکومت خاص دلچسپی کا حامل ہے۔ یہ منفرد عورت کابل کے شاہی خاندان کے راجہ بھیما کی پوتی تھی۔ وہ راجہ کھیم گپت کی رفیقۂ حیات تھی اور امور حکومت میں اس نے پہلے ہی کافی علم حاصل کر لیا تھا۔ 958 عیسوی میں راجہ کھیم گپت کی موت کے بعد دِڈا نے اپنے نابالغ بیٹے ابھینیو کی نگراں بن کر کشمیر پر حکومت کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد اسے ابھینیو کی فوری موت میں دلچسپی ہو گئی اور اس نے یکے بعد دیگرے اپنے تین پوتوں کو کھلے عام یا مشتبہ طریقوں سے قتل کروا دیا اور آخر 980 میں اس نے خود عنان حکومت سنبھالی۔ اس کے بعد اس کا عہد حکومت تیس برس تک جاری رہا۔ اور یہ دور کسی قسم کے خلل سے بالاتر رہا ہے۔ اس رانی کے دور میں کشمیر میں امن وامان قائم رہا۔ مگر اس کے بعد اس کے متبنّیٰ سنگرام دیو اور اس کے جانشینوں

کے دور میں اندرونی خلفشار نے اس امن وچین کو تہس نہس کر دیا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ 1101 سے 1111 تک واچھلا کے عہد حکومت میں اس کے وزرا اور چھوٹے چھوٹے سردار رہزنوں کی مانند سلوک کرنے لگے۔ وہ سلطنت میں خانہ جنگی کے متمنی تھے مگر اس کا خزانہ خالی تھا۔ 1101 تا 1149 جب کلہن اپنی تاریخ کا اختتام کرتا ہے اس وقت خانہ جنگی کے سوائے کچھ نہ تھا۔ لوٹ مار، آتش زدگی اور لڑائی میں ماہر ڈامر لوگوں نے وادی میں دہشت پھیلا رکھی تھی۔ مرکزی طاقت زوال پذیر تھی۔ راجہ زیادہ سے زیادہ بے بس اور لاچار معلوم ہوتے تھے۔ اس بات میں شبہ ہے کہ واچھلا نے مستھیوں سے حقارت کی جو حکمت عملی اپنائی تھی وہ دانشمندانہ تھی اور بعد کے واقعات میں یہ سوال مزید پر اسرار ہو جاتا ہے۔ راجہ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی رائے میں وقتاً فوقتاً پیچش اور درد شکم کی جو وبائیں اچانک لوگوں کو موت کے انجام کو پہنچاتی تھیں اس کی بدولت رعایا کی تیز تر تباہی کے لئے کائیستھ افسر ذمہ دار ہیں۔ یہ تمام باتیں اس ہندو سلطنت میں انتشار کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔ اور جو صدیوں تک قائم رہتا تھا۔ اور 1305 میں جب یہاں سہا دیو کی حکومت تھی تو کشمیر شرابیوں اور جواریوں کی سرزمین بن چکا تھا اور خواتین کی حالت بھی کسی طور بہتر نہیں تھی۔ اس کے عہد حکومت میں کشمیر پر تاتاری ذولقدر خان نے حملہ کیا تو سہا دیو بھاگ کر کشتواڑ چلا گیا۔ کشمیری اسے عموماً تا تار زولزو کے نام سے جانتے ہیں۔ اس نے یہاں پر لوگوں کا قتل عام کیا، انھیں غلام بنایا اور سرینگر شہر کو آگ لگا دی۔ آٹھ ماہ تک قابض رہنے کے بعد زولزو کو ضروریات زندگی کی قلت محسوس ہونے لگی کیونکہ اس کے جبر وقہر سے لوگ تنگ آ کر بھاگ گئے تھے اور وادی ویران ہو چکی تھی۔ اب وہ وادی سے باہر نکلنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے جنوب کے کل نارہ واڈ کے راستے اپنا سفر شروع کیا مگر راستے میں اسے برف نے دبوچ لیا جہاں وہ اس کی فوج اور اس کے کشمیری غلام فوت ہو گئے۔ دریں اثنا سہا دیو کا سپہ سالار کسی نہ کسی طور وادی میں اپنی حکمرانی قائم رکھنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ جب زولزو رخصت ہوا وہ اندرکوٹ چلا گیا اور گدیوں کو نکال باہر کیا جو کشتواڑ سے یلغار کرنے آئے تھے۔ رام چندر کے ساتھ دو آدمی تھے اور دوسرے بیرونی افراد کی مانند انھیں بھی تواریخ کشمیر میں اپنا کردار نبھایا تھا۔ ان میں سے ایک صورت کا باشندہ شاہ میر تھا جس کی ولادت کے وقت یہ پیشین

گوئی کی گئی تھی کہ وہ کشمیر کا سلطان بنے گا۔ دوسرا ریخچن تھا جس کے والد کا تبت کے راجہ کے ساتھ جھگڑا ہو گیا۔ وہ کشمیر میں مہم باز کے طور پر وارد ہوا مگر زیادہ دن نہیں گذرے کہ ریخچن شاہ اور رام چندر میں تفریق پیدا ہو گئی اور تبت سے کرائے کے قاتلوں کی مدد سے حملہ کر کے اسے ہلاک کر دیا۔ اس کے بعد اس نے رام چندر کی بیٹی کوٹا رانی سے شادی کی اور 1323 میں اپنی سلطانی کا اعلان کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کشمیر میں دینی معاملات میں زبردست ہیجان اور ابہام تھا۔ ریخچن شاہ کی اس معاملے میں کوئی ذاتی سوچ نہیں تھی۔ چنانچہ اس نے سوچا کہ اس ملک میں موجود کسی نہ کسی مذہب کی پیروی کو قبول کر لیا جائے وہ ہندو اس لیے نہیں بن سکا کیونکہ کوئی بھی ہندو اسے اپنی برادری میں شامل نہیں کرتا۔ چنانچہ اس نے مذہب کا معاملہ وقت پر چھوڑ دیا۔ ایک دن اس نے دیکھا کہ بلبل شاہؒ نماز ادا کر رہے ہیں اور عبادت کی اس صورت کی ستائش کر کے اس نے اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے صدرالدین کا لقب اختیار کیا۔ جامع مسجد اور بلبل شاہؒ کی عظیم درگاہ کی تعمیر اس نے عمل میں لائی جو آج کل بلبل لنکر کے نام سے مشہور ہے۔ بعد ازاں ڈھائی برس کے مختصر عہد حکومت کے بعد اولین مسلم سلطان ریخچن شاہ راہی ملک عدم ہوا۔ اس موقعہ پر سمہا دیو کا بھائی ادیان دیو منظر عام پر آیا اور ریخچن شاہ کی بیوہ کوٹا رانی سے شادی کی۔ اردان نام کے ایک ترک نے کشمیر پر حملہ کیا مگر اس کی بیوی نے فوج جمع کی اور دشمن کے خلاف شاہ میر کی کمان میں روانہ کی۔ مگر ادیان دیو میں بھی اپنے بھائی کی مانند ہی جرأت کا فقدان تھا۔ اردان کو شکست ہوئی اور ادیان دیو واپس آ گیا اور اس نے پندرہ برس تک حکومت کی۔ اس کی موت کے بعد کوٹا رانی نے اقتدار سنبھالا مگر وہ صرف پچاس یوم تک حکومت کر سکی۔ کیونکہ شاہ میرزا نے (یا مقبول عام شاہ میر) 1343 اپنی سلطانی کا اعلان کر دیا۔ شاہ میر کی طاقت کو مستحکم بنانے کے لیے اس نے کوٹا رانی کے ساتھ شادی کی تجویز پیش کی اس بات کو محسوس کرتے ہوئے اس نے موقعہ شناسی کی حکمت عملی کو اپنایا آخر وہ شاہ میر کی چیرہ دستیوں کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئی۔ جوں ہی وہ عروسی کے کمرے میں داخل ہوا اس نے دیکھا کہ ہندو شہنشائیت کی آخری علامت نے خنجر گھونپ کر خودکشی کر لی تھی۔ تب شاہ میر شمس الدین کے نام سے کشمیر کا سلطان بن گیا وہ سلاطین کشمیر کے اولین شجرے کا سلطان تھا۔

1394 میں سلطان سکندر تخت نشین ہوا مگر جلد ہی وہ بت شکن کے لقب سے بدنام ہو گیا۔ اس کی وجہ اس کا وہ انتہائی جوش تھا جو اس نے قدیم اور عالی شان مندروں کو مسمار کرنے میں دکھایا۔ جن کی تعمیر ہندو راجاؤں نے کرائی تھی۔ سکندر ایک بہادر اور شائستہ شخص تھا مگر اس کے تمام نیک اوصاف اس کی بنیاد پرستی کے تلے دب کر رہ گئے۔ اپنے دربار میں اس نے عالم و فاضل مسلمانوں کو راغب کیا۔ اس میں مشہور شاہ ہمدان کا جانشین محمود خان ہمدانی تھا۔ جس نے سلطان کے مذہبی جوش میں مزید اضافہ کیا۔ ہندو مندروں کو گرا کر زمین بوس کر دیا گیا۔ ایک برس کے لیے مارتنڈ مندر کو مسمار کرنے کے لیے بھاری جمعیت بلائی گئی۔ اس عظیم الشان تعمیر کو مسمار کرنے میں کوئی بھی حربہ کارگر نہ ہوا۔ عالیشان عمارتوں کو بے دردی سے مسخ کیا گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ چند عمارتوں میں نصب پتھروں میں یہ پیشین گوئی کی گئی تھی کہ انھیں سکندر تباہ کر دے گا اور اس نے مایوسی کے عالم میں کہا کہ اگر اسے پتھروں پر ان تحریروں کی بابت معلوم ہوتا تو وہ ان عمارتوں کو چھوڑ دیتا کیونکہ ان بت پرست لوگوں کی پیشین گوئی کو پورا کرنے کی اس کے دل میں قطعی خواہش نہیں تھی۔ سکندر کے اس جوش و خروش کا بھی ایک اندازہ تھا کیونکہ قدیم مندروں کی بنیادوں اور ستونوں کو اس نے شہر کے ندی نالوں کے کناروں اور جامع مسجد کی تعمیر کے لیے استعمال کیا۔ ہندو مندروں پر اپنا قہر و غصہ نکالنے کے بعد اس نے ان افراد پر توجہ دی جو یہاں پرستش کرتے تھے۔ اس نے ان کے سامنے تین متبادل پیش کیے۔ موت، تبدیلی یا جلا وطنی۔ بہت سارے لوگ بھاگ گئے۔ بہت ساروں نے اپنا مذہب تبدیل کر لیا اور بہت سارے قتل کر دیے گئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس حکمران نے قتل شدہ برہمنوں کے سات من مقدس زنار جمع کر کے جلا دیے، ہندو تعلیمات کی وہ تمام کتابیں جو اس کے ہاتھوں لگی انھیں اس نے جھیل ڈل میں پھینک کر ڈبو دیا۔ اور سکندر اس بات کے لیے اپنی ذات کو داد دیتا گیا کہ اس نے وادی سے ہندو مذہب کو نکال پھینکا ہے۔ اس قنوطی عہد میں شراب، جوئے اور موسیقی پر سخت پابندی عائد تھی۔ سکندر کے پچیس سالہ دور حکومت کے دوران کشمیر ایک اداس ملک بن کر رہ گیا۔

زین العابدین 1417 میں اس کا جانشین ہوا اور اس بیدار مغز سلطان کی بابت بات کرنا ایک خوشگوار ذکر ہے۔ اس کے پچاس سالہ دور حکومت کو اب بھی لوگ تواریخ کشمیر کے ایک

خوشحال ترین دور سے تعبیر کرتے ہیں۔ اپنی ذاتی زندگی میں وہ بھاری اوصاف کا مالک تھا۔ اسے اپنی نفس پر قابو تھا اور وہ کفایت شعار بھی تھا۔ اپنے ملازمین کے اخراجات وہ تانبے کی اس کان سے ادا کرتا تھا جو اس نے تلاش کی تھی۔ اس نے اپنی حکومت کو عمل کے وسیع تر امور کے لیے وقف رکھا۔ اس کی تخت نشینی فراخدلانہ اقدامات کی وجہ سے قابل ذکر ہے۔ جن میں گذشتہ راجاؤں اور سلاطین کی طرف سے گرفتار شدگان کی رہائی بھی شامل ہے۔ درمیانہ داروں کے منافع جات میں باقاعدگی لانے میں اس نے ذاتی دلچسپی لی۔ اس نے ایک بارہ منزلہ بلند محل تعمیر کرایا، ہر منزل میں پچاس کمرے تھے اور ہر کمرے میں پانچ سو افراد بیٹھ سکتے تھے۔ اس عمارت کا نام زینہ ڈب تھا اور اسے دریائے سندھ سے پانی مہیا کیا جاتا تھا۔ یہ عظیم مسلمان کاشتکاروں کا گہرا دوست تھا۔ اس نے بہت سارے پلوں اور نہروں کی تعمیر عمل میں لائی۔ اس کے عہد میں جھیل کا پانی حبہ کدل کے راستے دریائے جہلم میں گرتا تھا۔ اس نے اس نہر کو بند کر کے جھیل کا پانی نالہ مار میں موڑ دیا۔ اس نے سات پلوں کے ستون اینٹوں اور پتھروں سے تعمیر کرائے۔ وہ کاشتکاری کا بہت شوقین تھا۔ جہاں کہیں بھی وہ گیا اس نے باغ لگوائے مگر وہ جھیل ولر میں کشتی رانی کر کے اپنا وقت گزارنا زیادہ پسند کرتا تھا جہاں پر اس نے ایک خوبصورت جزیرہ بنوا کر اس پر سہ منزلہ محل اور ایک مسجد تعمیر کرائی۔ اندر کوٹ سے سوپور تک اس نے ایک بند راستہ تعمیر کرایا اور فلاح عام کے بہت سارے کام عمل میں لائے۔ اس عظیم سلطان کی شان برہمنوں کی جانب اس کی رواداری کے جذبے میں مضمر تھی (12)۔ اس کے بارے میں ایک دلچسپ داستان بیان کی جاتی ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ سلطان بستر مرگ پر تھا اور سلطان کے لیے ایک ہندو جوگی نے اپنی روح دینے کی پیشکش کی بشرطیکہ اس کے جسد خاکی کو کسی محفوظ مقام پر رکھا جائے۔ چنانچہ جوگی کی روح سلطان میں تحلیل ہو گئی اور جوگی کے جسد خاکی کو جلا ڈالا گیا۔ اس کے بعد حقیقی سلطان زین العابدین نہیں بلکہ وہ ہندو زاہد تھا۔ بہر کیف حقیقی بات کچھ بھی ہو مگر اس وقت سے لے کر سلطان کی طرف سے ہندوؤں پر کیے گئے مظالم کی تلافی کرنے کی خواہش سلطان کے دل میں بڑھتی گئی۔ اس نے ہندوؤں پر عائد ٹیکس جزیہ معاف کر دیا اور انھیں فارسی کی تعلیم دی۔ کئی طریقوں سے ان میں جاگیریں تقسیم کر کے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ چند ہندو مندروں کی اس نے مرمت کرائی جن میں

تخت سلیمان پر واقع مندر بھی شامل ہے۔ مذہبی رواداری کے نتیجے کے طور پر ملک بدر پنڈت وادی میں واپس آ گئے اور ان ہی کے قافلے میں جنوبی ہندوستان سے بہت سارے برہمن بھی یہاں آ گئے۔ اس سے قبل اس ملک کی درباری زبان سنسکرت تھی اور یہ ایک خوش قسمتی ہے اور یہ بات ان کے حق میں بھی جاتی ہے کہ پنڈتوں نے جلد ہی فارسی کو اپنا لیا۔ اب ان کے لواحقین فارسی نویسی کے ماہرین میں شمار ہوتے ہیں۔ اسی وقت سے کشمیر کے برہمن تین حصوں میں منقسم ہو گئے۔ وہ لوگ جنھوں نے فارسی کو اپنا لیا اور درباری زندگی میں داخل ہوئے، کارکن کہلائے۔ جن لوگوں نے پجاریوں کا دھندہ اپنایا وہ باچھت برہمن کہلائے اور جن لوگوں نے خود کو سنسکرت تعلیمات کے لیے وقف کر دیا وہ پنڈت کے نام سے مشہور ہوئے۔

یہ عظیم سلطان علم و دانش، فنون لطیفہ اور کاریگری کا شوقین تھا۔ اس نے بیرون ممالک میں بہت سارے کاریگران فن کو ترویج دی۔ اس کے دربار میں کافی تعداد میں شعرا، موسیقار اور گلوکار موجود تھے۔ ملا احمد کشمیری اور سلطان کے درمیان جھگڑے کی بابت ایک دلچسپ داستان بیان کی جاتی ہے۔ اس شاعر کو کشمیر سے وطن بدر کر دیا گیا۔ بہر حال اس نے بادشاہ کی شان میں جو قصیدہ لکھا اس کے سبب اسے فوراً واپس بلایا گیا۔ اس کے عہد حکومت کے دوران مکمل امن وامان نہیں تھا اور اس سلطان کا ایک جنگجویانہ پہلو بھی ہے۔ اس نے تبت اور پنجاب کو فتح کیا اور پشاور سے سرہند تک اپنی سلطنت قائم کی مگر شر پسند چکوں سے کافی دقتیں پیش آئیں جو اچانک طور پر نمودار ہو گئے تھے۔ انھوں نے شاہی محل زینہ ڈب کو آگ لگا دی اور بہت مشکلیں پیدا کیں حتیٰ کہ انھیں دردستان تک دھکیل دیا گیا۔ ان کے سرغنہ پانڈ د چک کو گرفتار کر کے سلطان نے کوڑے مروا کر مار ڈالا مگر اپنی خاص دریادل فطرت کے سبب اس نے اس کے بیٹے حسن چک کو اپنے حق میں کر لیا۔ سلطان زین العابدین 69 برس کی عمر میں راہی ملک عدم ہوا اور کشمیر پر کل 52 برس حکومت کی۔ اپنے پیچھے وہ نرم دل، فراخ دل اور کامیاب حکمران کے نقش چھوڑ گیا۔ بدقسمتی کی بات ہے کہ اس نے اپنے جانشینوں کے لیے حکومت کا کوئی دائمی نظام وضع نہیں کیا اور 1479 میں اس کا بیٹا حاجی حیدر شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ وہ ایک شرابی شخص تھا جس کی کمزوریوں نے چکوں کو اپنی طاقت بڑھانے کا موقعہ دے دیا۔ چکوں کی اصلیت کے بارے میں بہت کم معلومات ہیں ان کی جرأت

اور حوصلے سے معلوم ہوتا کہ ان کا خون کشمیریوں کے ساتھ ملتا نہیں تھا اور کہا جاتا ہے کہ وہ دردستان سے آئے تھے۔ حکایات اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ وہ شمال سے آئے تھے۔ اتر مچھی پورہ میں واقع کشمیر کا ایک خوبصورت ترین تاریگام کا تالاب مدن چک کی طرف سے تعمیر کردہ معلوم ہوتا ہے۔ اسی کے نواح میں واقع رنگی پورہ کے مقام پر ایک قدیم چک شہر کے کھنڈرات ہیں۔ شمال مغرب میں واقع خوشی پورہ کے مقام پر پتھروں کے تیر رامن کان سے معروف ہیں۔ اور ان کا اشارہ شورش پسند چکوں کے دیوتاؤں کی طرف ہے جن کا ایک قلعہ خوشی پورہ کے مقام پر واقع تھا۔ وادی کے جنوب میں کوئی بھی مقام ایسا نہیں ہے جو چکوں کے ساتھ وابستہ رہا ہو۔ راجہ سمہادیو کے عہد میں لنگر چک ایک ممتاز شخص تھا اور پانڈو چک بلمت چک اور شمس چک کافی شہرت کے مالک رہے ہیں۔ ایک حکایت کے مطابق پانڈو چک ایک ایسے باپ سے پیدا ہوا جو خود ایک کشمیری خاتون سے تولد ہوا تھا اور وہ ایک بہت بڑا دیو تھا۔ اس نسل کے چک تاریگام میں آباد ہیں جن کا قد وقامت کافی بڑا ہے۔ چک لوگ شیعہ تھے اور سولھویں صدی کے پہلے نصف تک جو روایتی حریفوں رینہ اور ماگرے لوگوں اور آخر 1556ء میں غازی خان کو انھوں نے زیر کرلیا۔ اس وقت عملی طور پر سلطان تھا اور شمس الدین کے شجرہ کے سلطان محض کٹھ پتلیوں کے مانند تھے۔ یہ چک پہلے کی مانند ہی بہادر اور شجاع تھے مگر ایسے افراد نہیں تھے کہ ایک مستحکم خاندان کی بنیاد رکھ سکیں۔ غازی خان سنی لوگوں پر ظلم ڈھاتا تھا جب کہ یوسف خان نے 1580 میں اقتدار سنبھالتے ہی ایک کسان خاتون سے شادی کرلی اور عیش وعشرت میں بدمست ہوگیا۔ وہ کشمیر کا اولین سلطان تھا جس نے گلمرگ کی دلفریبیوں کو تلاش کیا جو وادی میں موسم گرما کے لیے ایک صحت افزا مقام تھا وہ ایک غیر دانشمند شخص تھا اور اپنے وزیر سعید مبارک خان سے جھگڑتا رہتا تھا جس نے اسے فوراً کشمیر سے باہر نکال دیا۔ یوسف خان کا بیٹا یعقوب خان کسی اور مٹی سے بنا شخص تھا اور 1586 میں جب اکبر نے پہلی مرتبہ کشمیر پر قابض ہونے کی کوشش کی (13) تو اس نے وادی جہلم کے باشندگان بومبا اور کوکا طبقوں پر ایک فوج جمع کی اور مغلوں کو بھاری نقصان پہنچا کر شکست دی۔ اگرچہ یہ بات یہاں بجا طور پر کہی جاسکتی ہے کہ حملہ آور فوج کے لیے خوراک کی قلت اور موسلا دھار بارشوں نے اس علاقے میں دشواریاں پیدا کیں اور اکبر کی فوجوں کی پسپائی کا باعث بنیں۔ یوسف خان شروع

سے اکبر کی اطاعت قبول کرنا چاہتا تھا اور یہ بات یعقوب خان کے حق میں جاتی ہے کہ اس نے اپنے والد کی اس کمزوری کی ڈٹ کر مزاحمت کی اور کشمیر مغلوں کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ اپنی اس عارضی کامیابی کے بعد یعقوب خان بہت ظالم ہو گیا۔ ہندو اور سنی افراد اس کے تختۂ مشق ہوئے چنانچہ انھوں نے مل کر اکبر کو ایک عرضداشت ارسال کی۔ اکبر نے ان کے ساتھ مذہبی رواداری قائم کرنے اور غلاموں کی تجارت کے خاتمے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ 1585 کو مرزا قاسم کی قیادت میں راجوری کے راستے ایک عظیم لشکر کشمیر روانہ کی۔ یعقوب خان اس کا سامنا کرنے کے لیے آگے بڑھا مگر اس کی فوج میں زیادہ تر ایسے لوگ شامل تھے جو جلدی اسے چھوڑ کر مغلوں کی طرف چلے گئے۔ کافی زوردار مقابلہ ہوا مگر یعقوب خان کو پسپا ہونا پڑا۔ وہ وادی کے جنوب میں پہنچ گیا۔ 1586 میں مرزا قاسم اپنی فوج کے ہمراہ سرینگر پہنچا مگر یعقوب خان نے ان پر حملہ کر دیا جس نے تخت سلیمان پر اپنا مورچہ سنبھال رکھا تھا، عین اسی وقت جنوب سے شمسی چک آ گیا۔ مغلوں کو قریباً قریباً شکست ہو گئی تھی کچھ عرصے تک جنگ اور جاری رہتی مگر کشمیریوں پر مغلوں کا قبضہ مکمل طور پر اس وقت ہوا جب اکبر کا ہیرپور سے گذرنا ہوا اور 87-1586 سے وادی سلاطین کشمیر کے ہاتھوں سے نکل کر مغل شہنشاہوں کے پاس چلی گئی۔

اکبر نے تین مرتبہ کشمیر کا دورہ کیا۔ 1587 میں وہ اپنے مشیر مال ٹوڈرمل کو ساتھ لایا جس نے پٹن میں اپنا پڑاؤ ڈال کر مالیاتی بندوبست کو نہایت سرعت رفتاری سے طے کیا مگر بیان کیا جاتا ہے کہ غائب النظری کے سبب اس نے اپنے ریکارڈ سے پٹن کے نزدیک دیہات کو حذف کر دیا۔ اپنے تیسرے دورے کے دوران اکبر نے بھاری اخراجات سے ہاری پربت پر ایک قلعہ تعمیر کرایا۔ اس قلعے کے نواح میں اس نے ایک قصبہ ناگرنگر تعمیر کیا۔ جہاں پر اس کے امرا اور روسا نے اپنے مکانات اور باغات تعمیر کرائے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ہاری پربت کا قلعہ اس مقصد سے تعمیر کیا گیا کہ ان کشمیریوں کو کشمیر واپسی کے لیے راغب کیا جائے جو چک سلاطین کے عہد میں مصائب کے سبب یہاں سے بھاگ گئے تھے۔ اس قلعے کی تعمیر پر مامور مردوں اور عورتوں کو کافی زیادہ یومیہ اُجرت ادا کی جاتی تھی۔ ایک شادی شدہ عورت کو چھ آنے اور غیر شادی شدہ کو چار آنے یومیہ ادا کیے جاتے تھے۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ اکبر کے پاس اس خوبصورت وادی میں گزارنے

کے لیے زیادہ فرصت نہیں تھی چنانچہ اس نے ہاری پربت قلعے کی تعمیر کا کام کافی سرعت سے کرایا اور جو تھوڑا بہت کام یہ عظیم شہنشاہ پیچھے چھوڑ گیا تھا اسے ٹوڈرمل نے مکمل کرایا۔ اس کے جانشین جہانگیر (14) کو کشمیر کے ساتھ محبت تھی اور جب بہرام گلہ میں بستر مرگ پر اسے پوچھا گیا کہ اُسے کیا چاہیے۔ اس نے جواب دیا ''صرف کشمیر'' اس کے متعدد دوروں کے طفیل یہاں پر عیش و عشرت کے دلفریب باغات کی تعمیر ہوئی۔ اس نے جو رواج قائم کیا وہ اس کے امرا اور وسا نے اپنایا۔ وادی کے اطراف و اکناف میں چنار کے درخت لگائے گئے۔ موسم گرما کے آرام کدوں اور جھرنوں کے کھنڈرات سبھی کی داغ بیل مغلوں نے ڈالی۔ اگر چہ ان شہنشاہوں کے بارے میں کہا گیا کہ وہ محض نمائشی بادشاہ تھے مگر جہاں تک کشمیر کا تعلق ہے اس کے میدانوں میں سایہ دار درختوں کے لیے وہ ہماری شکر گزاری کے حقدار ہیں۔ مغل دور میں جھیل ڈل کے گرد و پاس میں 777 باغات تھے۔ صرف مشک خوابی سے ہی سالانہ ایک لاکھ روپے کی آمدنی ہوتی تھی۔ ایک وسیع تر سلطنت کے معاملے میں ہر بات کا دارومدار اس کے صوبے کی نوعیت اور اس کے ناظم کے مشوروں پر ہوتا تھا۔ یہ صوبہ مختلف تھے مگر مجموعی طور پر یہ دیکھا گیا کہ مغل شہنشاہ عدل پسند اور بیدار مغز تھے۔ ان کے قوانین اور قواعد ان کا بہترین منشور تھا۔ جہانگیر کا ایک صوبے دار نہایت ظالم حکمران تھا مگر وہ نہایت طاقتور شخص تھا کیونکہ چکوں کو اسی نے حتمی طور پر کچلا تھا۔ عشرت کدوں کی تعمیر کے معاملے میں شہنشاہ شاہجہاں ایک عظیم معمار تھا مگر وہ اس پہلو سے خوش قسمت تھا کہ اسے صوبے دار ظفر خان اور علی مردان کے ساتھ عادل حکمرانوں کی حیثیت سے پیار و محبت کے ساتھ نام لیا جاتا ہے۔ ظفر خان نے اعتقاد خان کی طرف سے عائد کیے گئے، بہت سارے سنگین ٹیکس معاف کر دیے اور زعفران پر جو مالیہ وصول کیا جاتا تھا اس میں بھی اس نے اصلاحات کیں۔ اس نے کشتی رانوں کے علاوہ لکڑی اور بھیڑوں پر ٹیکس میں کمی کر دی اور اس رواج کو بھی سختی سے ختم کر دیا جس کے تحت بہترین قسم کے پھل سرکاری اہلکاروں کے استعمال کے لیے ضبط کر لیے جاتے تھے۔ اور اس کے سبب عوام کو اپنے درخت کاٹ دینا پڑے۔ علی مردان خان کا مزاج فلسفیانہ تھا اور باور کیا جاتا ہے کہ اسی مزاج کی بدولت اس نے ہندوستان تک کے راستے پر پیر پنچال پر خوبصورت سرائیوں کی تعمیر عمل میں لائی۔ اس حکمران کے دور میں کشمیر میں زبردست قحط پڑا اور اس وجہ سے

اسے امتیاز حاصل ہو گیا کہ اس نے پنجاب سے غلہ درآمد کیا۔

کشمیر کے برہمن اورنگ زیب کے نام کو قابل نفرت سمجھتے ہیں۔ اگر چہ اس نے فقط ایک مرتبہ کشمیر کا دورہ کیا مگر منکر افراد کے خلاف اس کا غیظ وغضب کشمیر میں اپنا منفی اثر چھوڑ گیا۔ ایک ہندو فقیر رشی پیر بادشاہ کی تعزیر کیے جانے کے بارے میں ایک حکایت بیان کی جاتی ہے۔ اس پیر کے پاس ایک پیغام رساں بھیجا گیا جس نے اسے شہنشاہ کا حکم سنایا کہ وہ اس کے روبرو دربار ہندوستان میں پیش ہو۔ رشی پرواز کرتا ہوا ایک ہی شب میں ہندوستان پہنچ گیا اور جب شہنشاہ محوخواب تھا اس کے سامنے شیر پر سوار ایک خوفناک صورت میں پیش ہوا۔ خوفزدہ ہو کر اورنگ زیب نے اس کا بادشاہ کا مرتبہ بحال رکھنا منظور کر لیا مگر یہ داستان یہیں ختم نہیں ہوئی۔ اس وقت سے اورنگ زیب نے ہندوؤں کو ستانا بند کر دیا۔ جوں ہی مغل سلطنت کا زوال شروع ہوا کشمیر کا صوبہ خود مختار صورت اختیار کرتا گیا۔ محمد شاہ کے عہد حکومت میں عبدالغنی اور ملا شریف الدین کلاشپورہ نے ہندوؤں کو کافی دبایا، شہر کے ایک ہندو علاقے کو نذر آتش کر دیا گیا اور ہندوؤں پر پگڑی باندھنے کی ممانعت کی گئی۔ اس کے عہد میں صوبے باہمی جنگ کے شکار ہوئے اور کشمیر میں بے حد افراتفری اور لاقانونیت پھیل گئی۔ 1751 کے آخر تک معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر کے صوبے دار کا عہد پشتنی صورت اختیار کر چکا تھا اور وہ عملی طور پر دہلی سے خود مختار ہو کر آتا تھا۔

1752-54 میں کشمیر کی بدقسمت وادی نئے آقاؤں کی ملکیت بن گئی اور سبھی حکومتوں میں پٹھان حکومت بدترین اور ظالم ترین تھی۔ شاہان درانی کے ابتدائی عہد کے واقعات کا خاکہ پیش کرنے سے قبل یہ بہتر ہوگا کہ ہم گزشتہ عہدوں کی چند خصوصیات کا ذکر کریں۔ چند پہلوؤں سے ہندو عہد ایک شاندار عہد رہا۔ فتوحات سے حاصل کردہ مال غنیمت سے تیار کردہ شاندار مندر اور رفاہ عامہ کی شاندار تعمیرات بنائی گئیں۔ ان تعمیرات کے کھنڈرات آج بھی بتاتے ہیں کہ ان دنوں کشمیر میں شاندار عمارتوں کی برکت ہوگی جب کہ دیگر مقامات پر کریوہ جات پر آباد قدیم شہریوں کی ٹھیکریاں اس بات کی علامت ہیں کہ یہ شہر کافی گنجان آباد رہے ہوں گے۔ عوام کے حالات کی بابت بہت کم معلومات دستیاب ہیں مگر ہندو راجاؤں کے تحت آباد ہندو لوگ کافی خوشحال رہے ہوں گے۔ آبپاشی کی نہریں اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ راجاؤں نے اپنی تمام تر دولت

مندروں پر صرف نہیں کی۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ آیا وہ لوگ بہادر اور جنگجو تھے۔ یہ بھی عین ممکن ہے کہ جنگجو لوگ پنجاب سے لائے گئے کرائے کے عسکری ہوں گے۔ اس کا اگلا عہد سلاطین کشمیر کا عہد ہے۔ جس میں زین العابدین کا دور سب سے زیادہ تابناک دور رہا ہوگا۔ اس کے سوا صحت مند اور خوشگوار شاید ہی کوئی اور دور رہا ہوگا۔ طاقت کے عروج کو قومی جماعت کی جدوجہد سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا کیونکہ مغلوں اور پٹھانوں کی مانند وہ بھی اسی قدر غیر ملکی رہے ہوں گے اور تہذیبی اور تمدنی احیا کے معاملے میں یہ عرصہ دونوں سے کم تر تھا دو ایک صوبے داروں کے عہد حکومت کو چھوڑ کر مغل دور میں عوام کے لیے فرحت وخوشحالی کے تمام تر عناصر موجود تھے۔ شہنشاہوں کے عالیشان دربار نے عوام کو مشکلوں میں مبتلا کر کے عوام پر زبردستی ساز وسامان کی باربرداری کی ذمہ داری ڈالی ہوگی (15)۔ ان کی شان وثروت نے یہاں کے عوام کی زندگی پر کوئی اثر نہیں ڈالا کیونکہ تمام مشرقی افراد کی طرح وہ بھی شاہی شان کی ظاہری نمائش میں یقین رکھتے تھے۔ وہ اس کے لیے بلاشبہ ادائیگی کرنے کو تیار تھے۔ جہانگیر اور اس کی پیاری رفیقۂ حیات نور جہاں اور ان کے درباریوں کی بابت کافی زیادہ سنا گیا ہے جو اپنے شاہی آقاؤں اور ایک دوسرے پر سبقت لیجانا چاہتے۔ انھوں نے باغات کی تعمیر کی اور اس دور میں کشمیر مسلسل طور پر فرحت اور آسودہ حالی کا گہوارہ رہا۔ اس دوران انتظامی امور کو بالائے طاق رکھ دیا جاتا مگر رفاہ عامہ کے کاموں کو نظر انداز نہیں کیا جاتا۔ ٹوڈرمل کا مالیاتی بندوبست اگرچہ جلد بازی کا نتیجہ تھا پھر بھی اس کی مستقل نوعیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ دیہی حکام کے ادارے کی داغ بیل مغل دور ہی میں ڈالی گئی۔

بہر حال جب ہم مغل دور کے بعد شاہانِ درانی کے دور میں داخل ہوتے ہیں تو ہم ظلم وستم کے دور میں داخل ہوتے ہیں جہاں افغان شجاعت، غیرت وآبرو سب کو تہس نہس کر کے رہ گئے۔ مفاد خصوصی کے تحت گورنروں کی تقرریاں کی جاتیں جنھوں نے وادی کے کنگال عوام کا جس قدر بھی ممکن ہو سکا استحصال کیا۔ دولت وصول کرنے کا کام تیز رفتاری سے سرانجام دیا جاتا کیونکہ کسی کو بھی یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اسے کتنے دن گزارنے کے بعد کابل طلب کرلیا جائے گا اور انھیں کسی نئے موقعہ شناس کو عنان اقتدار سونپنا پڑے گی۔ پٹھان حکمرانوں میں شاید امیر خان جواں شیر بہترین شخص تھا جس نے ایک پل کی تعمیر کرائی جو سرینگر کے داخلی دروازے پر واقع ہے۔ اس نے شیر

گڑھی کا محل بھی تعمیر کرایا مگر دوسری جانب ڈل پر واقع مغل باغات کو تباہ کر کے اس نے اپنی پست فطرت کا مظاہرہ کیا۔ دیگر پٹھان حکمرانوں کو محض ان کے جبر واستبداد اور بے رحمی کی وجہ سے ہی یاد کیا جاتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے پھول توڑنے کی بجائے سر قلم کرنے پر زیادہ توجہ دی:

سر بریدن پیش این سنگین دلان گل چیدن است

یعنی ان سنگ دلوں کے نزدیک کسی کا سر کاٹنا ایک پھول توڑنے کے برابر تھا۔

ان مظالم کے شکار پنڈت، شیعہ اور وادیٔ جہلم کے بومبا تھے، ظالموں کی پہلی صف میں اسد خان کا شمار ہوتا ہے جو اس امر کی شیخی بگھارتا تھا کہ ظالم نادرشاہ اس کا اوّلین نمونہ ہے۔ اس کا رواج تھا کہ وہ پنڈتوں کو دو دو کر کے باندھ دیتا اور گھاس کی بوریوں میں بند کر کے جھیل ڈل میں پھینک دیتا۔ اس کی تفریح یہ تھی کہ ایک پنڈت کے سر پر گوبر یا گندگی سے بھرا ہوا مٹکا رکھ دیا جاتا اور مسلمان اس پر تب تک پتھر برساتے رہتے جب تک یہ ٹوٹ نہ جائے، بدقسمت ہندو بے چارہ گندگی سے لت پت ہو کر قریباً اندھا ہو کر رہ جاتا۔

پنڈت پہلے مونچھیں بڑھاتے تھے مگر انہیں داڑھیاں بڑھانے کے لیے بھی مجبور کیا جانے لگا۔ پگڑی اور جوتے پہننا ان کے لیے ممنوع قرار دے دیا گیا۔ پیشانی پر ٹیکے کا نشان مسدود کر کے رکھ دیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ بھونڈی اور پٹھانوں کے زیر اثر لمبی پگڑیاں اس عہد کے جبر وتشدد کی یادگار ہیں۔

ہندوؤں پر جو ظلم ستم کیا گیا اس کے نتیجے میں بہت سارے برہمن یا تو یہاں سے فرار ہو گئے یا قتل کر دیے گئے یا انھوں نے اپنا مذہب تبدیل کر کے اسلام قبول کر لیا۔ اسد خان کے بعد مدد خان وارد ہوا۔ اس زمانے کی ایک مشہور کہاوت ہے "ظلم اسدرار اسد مدد" جس کے معنی ہیں کہ اسد تو چلا گیا مدد وارد ہو گیا۔ ایک اور ظالم میر ہزار تھا جو برہموں کو ڈبونے کے لیے گھاس کی بوریوں کے بجائے چمڑے کے تھیلوں کو بروئے کار لاتا تھا۔ اس نے شیعہ اور برہمن افراد کو بلا امتیاز پانی میں ڈبو دیا۔ عطا محمد ایک جنونی اوباش تھا جس کی ایجنٹ ایک عمر رسیدہ عورت کوشیب تھی جس کے سبب برہمن ماں باپ کافی سراسیمہ تھے کہ وہ اپنی بیٹیوں کی بے حرمتی کی اجازت دینے کی بجائے ان کی

بال تراشی یا ناک کاٹ کر ان کی خوبصورتی کو مسخ کر دیتے۔ ان دنوں مسلمان اگر پنڈت کو دیکھتا تو یہ کہہ دیتا "تم ایک برہمن ہو اور میں تم پر سوار ہو جاؤں گا" یہ مقولہ اب بھی دہرایا جاتا ہے۔ پٹھانوں کے جبر و استبداد کی داستانوں کو درج کرنا یہاں پر اکتا دینے والی بات ہوگی مگر آخر کار یہ جبر و استبداد برداشت سے اس قدر باہر ہوگیا کہ کشمیریوں کی امیدیں اب رنجیت سنگھ کے طلوع ہوتے ہی اقتدار کے ساتھ وابستہ ہوگئیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ فتح برقزائی رنجیت سنگھ کے ساتھ معاملہ طے کررہا تھا اور اس نے کشمیر فتح کر لیے جانے کی صورت میں آٹھ لاکھ روپے سالانہ ادا کرنے کا وعدہ کیا تھا، چنانچہ پیر پنچال کے راستے کشمیر تک ایک فوج روانہ کی گئی۔ اوباش گورنر عطا اللہ خان نے قدرے مزاحمت کا مظاہرہ کیا مگر اسے شکست نصیب ہوئی۔ فتح محمد خان نے رنجیت سنگھ کو آٹھ لاکھ روپے دے دیے اور اس مملکت کی حکومت کو وہ اپنے برادر محمد عظیم خان کے حوالے کر کے چلتا بنا۔ حالانکہ محمد عظیم خان نے خود دو کروڑ روپے کی رقم جمع کر لی مگر مہاراجہ رنجیت سنگھ کو خراج کی سالانہ رقم دینے میں وہ سراسر ناکام رہا۔ 1814 میں سکھ فوجوں نے پیر پنچال کے راستے پیش قدمی کی جبکہ رنجیت سنگھ ذاتی طور پر پونچھ سے اس مہم کی نگرانی کرتا رہا۔ راجوری کے راجہ نے ایک جھوٹی افواہ پھیلا دی کہ سکھ فوجوں کے ہراول دستے کو ہیر پور کے مقام پر محمد عظیم خان نے شکست دے دی ہے چنانچہ تمام تر سکھ فوج پسپا ہو کر رہ گئی۔ اس کامیابی و کامرانی کے نشے میں سرشار ہو کر عظیم خان نے اب برہمنوں کو صعوبتیں دینے میں آسودگی تلاش کرنا شروع کر دی۔ سرینگر کی ایک سرکردہ شخصیت پنڈت بیربل درچوری چھپے فرار ہوگیا اور قلی نرواؤ کے راستے اپنے فرزند راجہ کاک کے ہمراہ نکل گیا۔ وہ لاہور جا پہنچا اور رنجیت سنگھ سے دادِ فریاد کی کہ وہ کشمیر کی مدد کے لیے آگے بڑھے۔ جب یہ اطلاع محمد عظیم تک پہنچی، اس نے درخاندان کی خواتین کو طلب کیا۔ بیربل کی اہلیہ نے خودکشی کر لی مگر راج کاک کی بیوی کو مسلم بنا کر کابل روانہ کر دیا گیا جہاں پر وہ ابھی کچھ عرصہ پہلے تک بقید حیات تھی۔ جب محمد عظیم کو لاہور میں بیربل در کے مشن کی کامیابی کی اطلاع ملی تو اسے خطرہ لاحق ہوا۔ لہٰذا وہ اپنے برادر جبار خان کو گورنر بنا کر خود فوری طور کابل چلا گیا۔ 1819 میں رنجیت سنگھ کے عظیم مشیر دیوان چند اور جموں کے راجہ گلاب سنگھ نے ہمراہ مل کر قدرے دشواریوں کے ساتھ گورنر کو شکست دے دی اور شوپیان میں داخل ہوگیا۔ پس کشمیر پانچ پشتوں کی مسلم حکومت

کے بعد ہندوؤں کے ہاتھوں میں آ گیا۔ پٹھانوں کے اقتدار کا زوال دیکھ کر کشمیر کے سبھی طبقوں کو فرحت اور راحت کا احساس ہوا ہوگا۔ کسانوں کے لیے اس سے بڑی کوئی راحت نہیں تھی کہ کابل کے حریص سرداروں نے ان کا خون نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ میرا مقصد یہ کہنا نہیں کہ سکھ عہد زیادہ نیک دل یا بہتر تھا۔ مورکرافٹ مندرجہ ذیل اقتباسات (حصہ سوم باب دوم صفحہ 235، 293 اور 294) ظاہر کرتے ہیں کہ بندوبست اراضی کافی حد تک تشنۂ تکمیل تھا اور سکھوں کے ہاتھوں کشمیر کو شاید ہی کوئی رحم نصیب ہوا ہوگا۔

جس گاؤں میں ہم ٹھہرے وہ نصف متروکہ تھا اور جو باشندے وہاں ابھی تک رہ رہے تھے وہ انتہائی زبوں حالی کے شکار تھے، کسی راحت اور نظام میں تبدیلی کے بغیر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں باشندوں کا فقدان ہو کر رہ جائے گا۔ اس کے باوجود یہ سرزمین دھان کی کاشت کے لیے نہایت موافق تھی اور معلوم ہوتا ہے کہ فصل بھی اچھی خاصی ہوتی ہوگی۔ بہر حال عوام کو اپنی محنت کا بہت کم صلہ حاصل ہوتا تھا کہ محصول وصول کرنے والے بھی اسی گاؤں میں موجود تھے جو اپنے مالک جواہر مل کے لیے اسی غلہ کا $\frac{9}{10}$ حصہ لے جاتے۔

جن کشمیریوں کو ہمارے ساتھ پہاڑوں تک جانا تھا وہ قطعی طور پر مختلف نہیں تھے۔ ظاہری طور پر وہ نیم برہنہ حالت میں غربت اور فاقہ کشی کی نہایت ہیبت ناک تصویر پیش کر رہے تھے۔ وہ اس قدر کنگال تھے کہ سکھوں نے اس چوکی کو عبور کرنے کے لیے فی نفر ایک پیسہ ٹیکس عائد کیا تھا مگر اس چوکی پر ان کو بالکل روکا نہیں گیا۔ اگر کوئی مقامی باشندہ کسی سکھ کو قتل کر دیتا تو اس کو سولہ سے بیس روپے کا جرمانہ ادا کرنا ہوتا جس میں سے اگر وہ ہندو ہوتا چار روپے مقتول کے کنبے کو ادا کر دیے جاتے اور اگر وہ مسلمان ہوتا تو دو روپے ادا ہوتے۔ جب ہم نے دن بھر کا سفر طے کر لیا تو ہم نے دیکھا کہ سڑک کے کنارے پر ایک صحت مند نوجوان کی لاش پڑی ہوئی تھی جس کا گلہ کٹا ہوا تھا۔ مردان علی ملک نے حکم جاری کیا اس کو گھاس کے ساتھ ڈھانپ دیا جائے تا کہ ہمارے قلی اس منظر کو دیکھ کر سراسیمہ نہ ہوں۔ راستے میں اس قسم کی تین اور لاشیں ملیں وہ لوگ جواہر مل کے چند پیروکار تھے جن کی تعداد پینتالیس کے قریب ہوگی اور کہا جاتا تھا کہ وہ لوگ درّے کو عبور کرتے ہوئے ہلاک ہو گئے۔ انھوں نے اب تک حقیر لباس اور آسرے کے فقدان میں بھی شدید سردی

سے اپنا تحفظ کیا تھا مگر رات کے وقت ان کی ٹانگوں میں رسیاں باندھ دی جاتیں تاکہ وہ فرار نہ ہو سکیں۔

موتی رام پہلا سکھ گورنر تھا۔ کاروبار حکومت میں اس کے ساتھ ہری سنگھ اور پنڈت بیربل وابستہ تھے۔ ہری سنگھ نے جلدی ہی لوبھا اور کوکا لوگوں کے چھکے چھڑا دیے۔ اپنے عدل اور انسان دوست سلوک کے سبب موتی رام نے وادی میں اعتماد بحال کر دیا۔ 1835 میں کرپا رام گورنر بن گیا۔ وہ ایک نرم دل اور اپنے حال میں مست شخص تھا۔ وہ کشتی رانی اور کشتی ران خواتین کا شوقین تھا۔ جنھوں نے اس کو کرپا سوڑئین کا نام دے رکھا تھا۔ سوڑئین ایک کشمیری لفظ ہے جس کی مراد چپو کی آواز سے ہیں۔ 1827 میں ایک زبردست زلزلہ آیا اور قریباً تمام شہر تباہ ہو کر رہ گیا اس کے بعد ہیضے کی وبا پھوٹی۔ اسی سال تین برہمن عورتیں خودسوزی کر کے ستی ہو گئیں۔ پانچ برس کی آرام دہ حکومت کے بعد کرپا رام کو اس وقت لاہور واپس طلب کر لیا گیا جب وہ جھیل ڈل میں ایک عیش وعشرت کی محفل میں محوشریک تھا۔ وہاں پر اس کی بے عزتی کی گئی۔ چنانچہ ترک دنیا کر کے وہ ہردوار چلا گیا جہاں پر اس نے ایک تیاگی کی زندگی بسر کر لی۔ کشمیری لوگ طنزیہ انداز میں کہتے ہیں کہ کرپا رام نے وادی میں کوؤں کو ترجیح دی۔ یہ اس لیے بھی لازم تھا کہ آخری رسوم ادا کرنے کے لیے ان کی ضرورت پیش آئی تھی اور پنجاب میں یہ رواج تھا کہ ایسے موقعوں پر کوؤں کو دانہ ڈالا جائے۔ کرپا رام کے فضول دورِ حکومت کے دوران یہاں کے حیوانات میں اضافہ ایک انمول اضافے کے طور پر کافی قدر و قیمت رکھتا تھا۔ 1831 میں رنجیت سنگھ کا مشہور و معروف فرزند شیر سنگھ کشمیر کا گورنر ہوا۔ وہ خود تو عیش وعشرت میں بدمست رہا اور کاروبار حکومت بیسا کھا سنگھ پر چھوڑ دیا۔ ان دنوں کشمیر ایک سنگین قحط سالی کا شکار ہوا لہٰذا واقعات پر نگہداشت کے لیے لاہور سے جمعدار خوشحال سنگھ کو روانہ کیا گیا۔ اس کی غیر دانشمندانہ دخل اندازی کی وجہ سے قحط نے مزید سنگین صورت اختیار کی۔ شیر سنگھ کے عہد حکومت کا قحط کشمیری تاریخ میں نمایاں واقعہ کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ 1833 میں میاں کرنل سنگھ کشمیر کا گورنر تھا۔ پنجاب سے غلے اور انڈوں کی درآمد کر کے اس نے دیہی عوام میں کسی حد تک مقبولیت حاصل کر لی کیونکہ قحط سالی کے دوران کا غلہ، بیج اور مرغے وغیرہ سب تباہ ہو چکے تھے اس نے شادی بیاہ پر عائد کردہ ٹیکس معاف کر دیا اور نظم ونسق میں

باقاعدگی لانے کے لیے بھی اقدامات کیے۔ اس نے مالیاتی ڈویژن کا قیام عمل میں لایا اور دیہات میں کاشتکاری کا کام یا تو ٹھیکیداروں کے سپرد کر دیا گیا یا زمین انھیں اس شرط پر رہن دی گئی کہ وہ اپنی پیداوار کا نصف حصہ حکومت کو بصورت جنس ادا کریں گے۔ زرعی مقاصد کے لیے بلا سود رقم پیشگی ادا کی گئی، مناسب اوزان کو ترویج دی گئی اور بے ایمان درمیانہ داروں کو سزا دی گئی۔ کرنل میاں سنگھ معاملات پر سرعت رفتاری کے ساتھ منصفانہ فیصلے صادر کیا کرتا تھا(16) اس نے کشمیر میں کافی نیک نامی اور شہرت حاصل کر لی۔ مگر سپاہیوں کی من مانی کے سبب اس کی زندگی مختصراً تمام کر دی گئی اور باقی ماندہ سکھ حکومت بے راہ روی اور لاقانونیت کی شکار ہوگئی۔ میاں سنگھ کے قتل کی سزا دینے کے لیے راجہ گلاب سنگھ جموں کشمیر آیا اور اپنا نصب العین پورا کرنے کے بعد وہ پنجاب چلا گیا اس کے بعد 1842 تک شیخ غلام محی الدین کشمیر کا گورنر رہا۔ 1843 میں بومباؤں کی بے چینی کے سبب وادی جہلم بے چینی اور بدامنی کی شکار ہوگئی۔ بومبا اب بھی وادیٔ کشمیر میں کرناؤ کے علاقے میں رہتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ وہ پاکس برٹانیکا سے قبل ترکی نسل کے ہیں۔ وہ ایک بہادر مگر شورش پسند قبیلہ کے تھے۔ ان کے سرغنہ سلطان زبردست خان کو پھانس کر سرینگر میں لاکر قید کر دیا گیا۔ اس بات کا انتقام لینے کے لیے ایک دلیر ترین بومبا شیر احمد نے کھوری کے مقام پر سکھوں کے 7000 آدمیوں کو ختم کر کے رکھ دیا اور اس علاقے پر حملہ کرنے کے بعد اس نے 8000 توڑے دار بندوقوں کے ساتھ کشمیر کی طرف پیش قدمی کی۔ گورنر کے بیٹے امام الدین کو اس کے 12000 سپاہیوں کے ساتھ شکست ہوئی۔ اسی دوران برف باری ہوگئی اور سکھ فوجوں کو پیچھے ہٹنا پڑا اور زبردست خان کو واپس اس کے دوستوں کے حوالے کر دیا گیا۔ 1843 ہی میں شیخ غلام محی الدین نے جامع مسجد کے دروازے کھول دیے جو 1819 سے بند پڑے تھے۔ 1845 میں امام الدین گورنر ہوا۔ اگلے برس 16 مارچ 1846 کو راوی اور سندھ کے درمیان دریائے راوی کے مغرب میں واقع پہاڑی علاقوں کو سکھوں نے الگ کر کے تاوان جنگ کے عوض حکومت برطانیہ کے حوالے کر دیا۔ یہ علاقہ 75 لاکھ روپے کے عوض مہاراجہ گلاب سنگھ اور اس کی اولاد نرینہ کے وارثین کے حق میں دے دیا گیا۔ حالانکہ امام الدین کے مہاراجہ گلاب سنگھ کے ساتھ خوشگوار مراسم تھے تاہم اس نے بلا مزاحمت کشمیر پر اپنا حق نہیں چھوڑا اور کچھ عرصہ تک سرینگر میں لڑائی

جاری رہی اس نے شیر احمد اور اس کے بومباؤں کو بلایا اور ہاری پربت قلعہ انھیں چالیس یوم کے لیے دے دیا۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کی فوجوں کو شکست ہوئی اور اس کا نمائندہ لکھپت رائے ہلاک ہوگیا۔ بومباؤں اور کوکاؤں نے وادی پر حملہ کیا اور شہر میں لوٹ مار کی۔ اس مرحلے پر برطانوی فوج یہاں داخل ہوگئی اور امام الدین نے ہتھیار ڈال دیے۔

مہاراجہ گلاب سنگھ ڈوگرہ حکمران تھا۔ جو طاقت دور اندیشی اور عزم مصمم کا مالک تھا۔ اس کی اولین ترجیح یہ تھی کہ اپنی نئی جائداد کی جفاکش بومباؤں سے حفاظت کی جائے۔ اس مقصد سے اس نے قلعہ جات تعمیر کیے جہاں بدنام درے کوئے وائون پر کمان ہوسکتی تھی اور کوہِ ماست چھانا کے اوپر سڑک پر اپنا مکمل تسلط جمائے رکھا۔ شیر احمد نے اپنی جدوجہد سات برس تک جاری رکھی اور جب کبھی موسم میں نمی آجاتی تو وہ کاگھن واپس چلا جاتا۔ مہاراجہ گلاب سنگھ نے اسے آزاد کردیا جس کے بعد وہ زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہا اور دیوسر تحصیل میں واقع اپنی جاگیر میں انتقال کرگیا۔ اس کے بعد مہاراجہ نے نہایت احتیاط کے ساتھ کشمیر کے مالیاتی بندوبست پر اپنی توجہ دی۔ اس نے کہا کہ کاہچرائی کے معاملے میں ایک حصہ پہاڑوں پر مشتمل تھا جبکہ دوسرا زیر آب تھا۔ اور تیسرا حصہ جاگیرداروں کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ جلد ہی اس نے اس نظام کو بدل ڈالا۔ اپنی محنت اور جانفشانی اور اہلکاروں کی سخت نگہداشت وادی کے لیے بہت سارا مالیہ جمع کرلیا۔ اس بارے میں مبالغہ آمیز اطلاعات کے مطابق کشمیر کی خرید کے عوض جو رقم ادا کی گئی تھی چند برسوں کے اندر وصول کرلی گئی۔ مہاراجہ گلاب سنگھ نے اس بات کی احتیاط کی کہ مالیہ خزانہ عامرہ تک پہنچے نیز یہ بھی دیکھا کہ کوئی غیر ضروری اخراجات نہ ہوں۔ اس نے اپنے مخالفین اور جرم کو سختی کے ساتھ دبا ڈالا۔ اب اس سے بھی افراد ڈرتے تھے۔ اس کی رعایا اور تمام اہل کار اسے عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس نے شخصی حکومت کے اصول کو تکمیل بخشی اور عوام پر یہ ثابت کردیا کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہوسکتا ہے۔ اگر اسے ان کی ملازمت کی ضرورت ہوتی تو اس پرانی طرز کی روایت پر کاربند رہنے کے بجائے حکومتی مالیات سے ادائیگی کا طرز عمل نہیں اپناتا۔ مہاراجہ سراپا حکومت تھا اور جس قدر بھی ممکن ہوا اس نے اپنا وقت کشمیر میں صرف کیا۔ وہ ایک انصاف پرور اور کافی ہوشیار حکمران ہونے کے علاوہ اچھا خاصا دانش مند مالک اراضی تھا۔ اس دور میں عوام کی حالت بہتر ہوئی اور کافی

عرصے کے بعد انتظامیہ کی کارگزاری پر اعتماد پیدا ہوا۔ وہ برطانوی حکومت کا ایک اچھا دوست تھا۔ خاص طور پر 1857 کی شورش کے دوران اس نے یہ دوستی نبھائی۔ وہ اسی برس کا راہی ملک عدم ہوا۔ جس دن انتقال ہوا اس روز زلزلہ آیا۔ دودھ گنگا ندی کے کنارے اس کی آخری قیام گاہ قائم کی گئی۔ اس کا تیسرا فرزند رنبیر سنگھ اس کا جانشین ہوا جو ایک مثالی ہندو شہزادہ تھا۔ وہ مذہبی امور اور سنسکرت تعلیمات کے لیے وقف انسان تھا مگر مسلمانوں کے تئیں وہ مہربان اور روادار تھا اور انھیں اپنے مذہب کی اس نے مکمل آزادی دی۔ یورپی افراد کے لیے وہ نہایت مہمان نواز تھا۔ ریاست میں سکول اور ڈسپنسریاں کھولنے کے معاملے میں اس کی مساعی سے صاف ظاہر ہے کہ وہ برطانوی اداروں کا زبردست پرستار تھا۔ 1872 میں سنی شیعہ فسادات رونما ہوئے اور مہاراجہ نے انصاف پروری کے جذبے کے تحت شیعہ افراد کو تین لاکھ روپے معاوضے کے طور پر ادا کیے۔ مہاراجہ نے کشمیر میں اناج کی نئی قسموں کو ترویج دینے میں نمایاں کاوشیں کیں۔ صنعت ابریشم، شراب سازی اور پوست پر اس نے کھلے دل سے روپیہ خرچ کیا۔ وہ ایک بیدار مغز شہزادہ تھا اگر وہ اپنے والد کی مانند پختہ ارادے کا مالک ہوتا تو وادی کی ترقی کے لئے بہت کچھ کر سکتا تھا۔ اور اپنے ملازمین اہل کاروں کو قابو میں رکھ لیتا۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد حکومت کے آخری حصے کے دوران 1877-79 میں بھیانک قحط پڑا۔ اسے ایک ایسی بیماری نے آگھیرا جس کے چنگل سے وہ کبھی نکل نہ سکا۔ ستمبر 1885 میں اس کا سب سے بڑا بیٹا مہاراجہ پرتاپ سنگھ تخت نشین ہوا جسے 1892ء میں ہندوستان کا عظیم کمانڈر بنایا گیا۔ اپنے والد کی مانند اس نے خود کو امور مذہب کے لیے وقف کیا۔ حالانکہ اس کے شوق نہایت قدامت پسند تھے مگر اس نے اپنی رعایا کی حالت کو بدلنے کے لیے کافی کچھ کیا۔ کشمیر کے تمام افراد کے تئیں اس کی مہربانیوں کے باعث اس نے عوام کی محبت حاصل کر لی۔

پچاس برس سے کم مختصر عرصے میں جو تبدیلی رونما ہوئی ہے اسے محسوس کرنا محال ہے۔ لاقانونیت اور مسلسل لڑائیوں کی جگہ مکمل امن وامان نے لے لی۔ اور غیر ملکی فوجوں کی ہر برس ہونے والی مداخلت اب قصۂ پارینہ بن کر رہ گئیں۔ کشمیریوں کی زبوں حالی اور مایوسی کی جگہ اب یورپی سیاحوں کی خوشگوار آمد نے لی۔ جو اس خوشنما وادی میں کثیر رقوم صرف کرتے ہیں۔

ہندوستان کے کسی بھی حصے میں پاکس برٹانیکا نے اس قدر متاثر نہیں کیا جتنا کشمیر میں کیا ہے۔ بیرونی حملہ آوروں کی مسلسل فتوحات اور حکمرانوں کے پیہم تغیر و تبدل سے اب نجات حاصل ہوئی ہے۔ ڈوگرہ عہد کا اہم ترین واقعہ ہندوستان سے ٹھیلہ سڑک کی تکمیل ہے جس کی بدولت اب ریل کے ذریعے یہاں تک دو دن کا سفر ہے۔

خاص طور پر جب وادی کی حکمرانی مغلوں کے ہاتھوں چلی گئی۔ کشمیر کا رابطہ ہندوستان سے سرمائی دنوں میں بالکل منقطع ہو جاتا تھا۔ وادی کے اس علاحدگی نے کشمیری عوام کی تاریخ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اس امر کی بدولت یہ لوگ ان گورنروں کے رحم و کرم پر رہ جاتے تھے جو ایک تو مختصر عرصے تک حکمران ہوئے اور دوسرے وہ ان کی زبان اور رسم و رواج سے بہرہ تھے اور دہلی، کابل یا لاہور کے شاہی درباروں کی حکمت عملی کے قطع نظر جو اپنی مطلق العنانی چلاتے تھے یہ لوگ کشمیریوں کو اسی نظر سے دیکھتے جس نظر سے رومی صوبے دار افریقیوں کے ساتھ پیش آتے۔ مختصر عرصے کے بیرونی حکمرانوں کی نازک مزاجی اور توہمات نے عوام کے کردار پر گہرا اثر ڈالا کیونکہ یہ لوگ اس بات سے بخوبی واقف ہوتے کہ ان اجنبی گورنروں کی حکومت کتنے عرصے تک چل سکے گی۔ شاید کوئی ایسا دوسرا ملک نہیں جہاں پر کشمیر کی نسبت اس قدر زیادہ پر تجسس تبدیلیوں کا ریکارڈ ہو۔ یہ بھی تعجب کی بات ہے کہ مختلف النوع نسلوں، مذاہب اور زبانوں کی حامل حکومتوں کی اس تبدیلی کے باوجود ان کی مخصوص قومی شناخت کو کوئی زک نہیں پہنچی۔ اس کے لیے کافی حد تک کشمیر کی جغرافیائی علاحدگی ذمہ دار ہے۔ چنانچہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وادی جہلم کی سڑک ان کے رواج اور خیالات میں وہ انقلاب پیدا کر دے گی جو مغل، پٹھان، سکھ اور ڈوگرے یہ کام سرانجام نہیں دے پائے مگر ہندوستان کے ساتھ تیز تر مواصلاتی رابطوں سے جو انقلاب رونما ہوگا اس کو دانشمندانہ رہبری اور اس عمل پر احتیاط سے نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔

●❋❋❋●

حوالہ جات

(1) کشمیر میں سنسکرت مسودات کی تلاش کے سلسلے میں کوششوں کی تفصیلی رپورٹ جرنل آف دی بمبئی برانچ آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے 1877 کے شمارے میں صفحہ 53 پر درج ہے۔

(2) ہندو تاریخ کشمیر پر ایک مضمون میں ایچ، ایچ، ویلسن نے لکھا ہے کہ کشمیر مستند تاریخ کے پہلے بھی ایک بادشاہت رہی ہوگی۔ اس ریاست کی تنظیم کے حالات زیادہ پرانے بھی ہو سکتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ زمانہ قدیم میں کشمیر پانڈو شہزادوں کی اصلی سلطنت ہو اور پھر انھوں نے ہندوستان کے میدانی علاقوں میں اپنی حکمرانی قائم کی ہو۔ اگرچہ اسٹائن کے بقول پانڈو خاندان کا کشمیر کے ساتھ تعلق ثابت کرنے کے ثبوت موجود نہیں ہیں۔

(3) یہ روایت زندہ کرنا جیسا کہ اسٹائن کا کہنا ہے کافی دلچسپی کا باعث ہوگا اگر حقیقی کرداروں کے ناموں کو مستند طور پر ثابت کیا جائے کہ کلہن کی پہلی کتاب میں ہشکا جشکا اور کنشکا کے ہم آہنگ نام ملتے ہیں۔

(4) کشمیر کے ہی متعلق ایچ ایچ ویلسن لکھتا ہے کہ بودھ مت میں افتراق کا علم کشمیر میں بہت پہلے ہی تھا غالباً اسی لیے برہمن برتری کو تسلیم کر کے ترویج دی گئی کشمیری اس ابتدائی دور میں سے تھے جو شیوازم سے پہلے تھا اور ان کے برہمن زاد آج بھی شومت کے پیروکار ہیں۔

(5) ڈاکٹر اسٹائن لکھتے ہیں کہ یہ نام قبول عام صوتیات کا ایک ردعمل ہے کیونکہ قدیم نیل ست پوران میں جلود بھاوانام درج ہے۔

(6) ڈاکٹر اسٹائن ہی کا کہنا ہے کہ کشمیر میں اسے ہارہ پربت کہتے ہیں اور ہری پربت کا واسطہ ڈوگری

کے ساتھ ہے۔ جس کا ہری یعنی شو کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ ہرساریکا کا جدید نام ہے۔ زمانہ قدیم سے پاروتی کی اسی نام سے پوجا کی جاتی رہی ہے۔ (پربت) پہاڑی کے دامن پر واقع ہے۔

(7) ڈاکٹر اسٹائن لکھتے ہیں کہ کرکوٹ سلطنت سے قبل راج ترنگنی میں بیان کردہ اطلاعات بے کار ہیں اور انھیں بالائے طاق رکھا جانا چاہیے۔ اس حوالے سے صرف چند تاریخیں ہی مدلل قرار دی جاسکتی ہیں۔

(8) ڈاکٹر اسٹائن ہی کے الفاظ میں مہرا کولا کا دور قابل اعتماد ذرائع سے (چینی سیاحوں کے تذکروں سے) 515 عیسوی بتایا جاتا ہے۔ جو یہ کہانی درج ہے اسے پیر پنچال درے سے جوڑا گیا ہے جہاں جنوب میں علی آباد سرائے کو ہی ونج کہتے ہیں۔

(9) یہ عبارت راج ترنگنی سے نقل کی گئی ہے۔

(10) ڈاکٹر اسٹائن نے تصدیق کر لی ہے کہ مارتنڈ مندر للتادتیہ نے ہی بنوائے۔

(11) اسٹائن لکھتے ہیں کہ سیا کے بارے میں کلہن کی تحریر کردہ کہانی تاریخی حقائق کو سامنے لاتی ہے۔ اس سلسلے میں کلہن نے تمام تفصیلات وضاحت کے ساتھ بیان کی ہیں۔

(12) آئین اکبری میں درج ہے کہ بڈ شاہ نے بیلوں کو ذبح کرنا ممنوع قرار دیا تھا۔

(13) آئین اکبری میں لکھا ہے کہ بابر کے زمانے سے ہی مغلوں نے کشمیر کو زیر کرنے کی کوششیں شروع کی تھیں۔

(14) اُس کی سوانح حیات کے مطابق اس نے ایک کشمیرن سے شادی کر لی۔ وہ لکھتا ہے ''اس کے بعد شہزادہ کشمیر کی بیٹی سے جو جوگیوں کے معاشرہ سے تھا، میں نے ایک اور بیٹی کو جنم دیا جو صرف ایک سال کی عمر میں انتقال کر گئی''۔

(15) برنیر لکھتا ہے کہ جب اورنگ زیب کشمیر آیا تو اس کا مال اسباب ڈھونے کے لیے بھمبر سے شکمیر تک تیس ہزار قلی کام پر لگائے گئے۔

(13) عام طور پر سکھا شاہی کی اصطلاح وادی میں فوری مقدمہ کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ یہ اس فیصلے سے مختلف ہوتا ہے جو باقاعدہ تفتیش کے بعد کیا گیا ہو۔

●❀❀❀●

آٹھواں باب

مادّی تاریخ

سیاسیات کشمیر کی تواریخ کے حوالے سے یہ تو پہلے ہی کہا جاچکا ہے کہ حکمرانوں کی پے در پے تبدیلیاں اور نظم وانتظام میں تسلسل میں فقدان عام انسان کی زندگی پر منفی اثرات مرتب کرتے رہے ہیں۔ اگر چہ کشمیریوں کی مادی تاریخ نے بھی ان کی اس بے بسی اور مظلومیت کے حوالے سے ایک کردار ادا کیا ہے۔ جس کی بنا پر انھیں مشکوک قسم کے لوگوں اور بے اعتبار عوام کا درجہ دیا گیا۔

میں مادی زندگی کے اس باب میں آتش زدگیوں، سیلابوں، زلزلوں، قحط سالیوں اور وبا اور ہیضے کا ذکر کروں گا۔ اس بات پر شاید قاری کو تعجب ہوگا کہ جن لوگوں نے یہ مصائب سہے ہیں وہ اس قدر مطمئن ہیں گویا یہ وارداتیں ان کے لیے بہترین مفادات کی صورت میں وارد ہوئی ہیں۔

اہل کشمیر نے مجھے ہمیشہ یہی تاثر دیا کہ وہ اگر آج ایک ہیبت ناک صورت حال سے نکلے ہیں تو انھیں ہر روز ایک نئی بربادی کا خدشہ لاحق رہتا ہے۔ شاید ہی اُن کے لیے کوئی ایسا دن گزرا ہو جب انھوں نے کسی ایسی زحمت کا ذکر نہ کیا ہو جس کے وہ شکار ہو چکے ہوں یا وہ اس گناہ کی بات کرتے ہیں جس کی پاداش میں اُن کے لئے یہ مصائب سامنے آئے ہوں۔

آتشزدگیاں

آتشزدگیوں کی تباہ کاریوں کو زیادہ تر سرینگر میں ہی محسوس کیا گیا ہے کیونکہ ان مکانوں کی

لکڑی اور چھت کی گھاس وغیرہ شعلوں کی جلد ہی نذر ہو جاتی ہیں۔ جب کہیں آگ نمودار ہوتی ہے تو اس پر قابو پانا نہایت مشکل ہو جاتا ہے۔ اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے کہ آگ ایک خطرناک واردات ہے اور اس کی شکار فصلیں بھی ہوتی ہیں۔ نادار لوگ شعلوں کو بجھانے کی قطعی کوشش نہیں کرتے۔ ان شعلوں کو بجھانا حکام اور فوج کی ذمہ داری تصور کی جاتی ہے۔ شہر میں ایسی سڑکیں موجود نہیں جن پر فائر انجن لائے جا سکیں اور جب آگ کے شعلے بلند ہو جاتے ہیں تو پانی کے چھوٹے چھوٹے گھڑے ناکافی ہوتے ہیں۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد میں سرینگر شہر کا بہت بڑا حصہ جل کر راکھ ہو گیا اور اس کے تخت نشین ہونے سے قبل بھی یہ شہر آتشزدگی کے سبب کئی مرتبہ برباد ہو چکا ہے۔ ہر مرد اور عورت اپنے ہمراہ آگ لگانے کا ایک مؤثر ذریعہ کانگڑی ہمیشہ رکھتا ہے اور تنکوں کے بستروں کو بھی جلدی سے آگ لگ جاتی ہے۔ میں نے کوئی بھی ایسا شہر نہیں دیکھا جہاں سرینگر کے مقابلے آتشزدگی کا زیادہ احتمال ہو۔ اور نہ ہی میں نے کوئی دوسری ایسی جگہ دیکھی جہاں آگ بجھانا اس قدر دشوار ہو اور یہ امر بھی اپنی جگہ درست ہے کہ دریائے جہلم یہاں سے قریب ہی بہتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ شہر میں سڑکوں کی تعمیر، آب رسانی اور چھتوں پر گھاس وغیرہ کے بجائے ٹائیلوں کے استعمال سے کسی روز شہر کو آتش زدگیوں سے نجات حاصل ہو سکے جو یہاں کے بے بس اور معصوم شہریوں پر نازل ہوتی ہیں۔ دیہات میں گھروں کی بہت زیادہ تعداد نہیں ہوتی۔ یہاں پر بھی اکثر اوقات آگ کی وارداتیں ہوتی ہیں اور جو بھی نقصان ہوتا ہے، اس کا سد باب بھی جلدی ہو جاتا ہے۔

طغیانیاں

مقامی زبانوں کی الگ الگ تواریخوں میں بہت سارے تباہ کن سیلابوں کا ذکر آیا ہے مگر سب سے بڑا سیلاب اس وقت آیا جب 1879 میں بارہ مولہ کے نیچے کھادنی یار پہاڑ کے پھسلنے سے وسیع علاقہ زیر آب آ گیا۔ دریائے جہلم کا راستہ مسدود ہو گیا اور وادی کا ایک بہت بڑا علاقہ پانی میں ڈوب گیا۔

1841 میں زبردست سیلابوں کے سبب جان و مال کا بھاری نقصان ہوا۔ چند بزرگ اشخاص نے مجھے وہ نشانات دکھائے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ 1841 کے سیلاب 1893 کے

سیلاب کے برابر یا اس سے زیادہ تباہ کن رہے ہوں گے۔1841 میں طغیانی کی سطح کی بابت حقائق کا تعین تو میں نہ کر سکا جو جھیل ڈل میں 1893 کی سطح سے نوفٹ زیادہ تھی۔جھیل میں پانی کی سطح کبھی دریائے جہلم کے پانی سے زیادہ بلند نہ ہوئی۔

1893 کے سیلاب ایک بھاری آفت کی حیثیت رکھتے ہیں مگر ان سیلابوں کا ایک خوشگوار اثر یہ ہوا کہ حکومت کو اس بات کا انتباہ ہو گیا کہ سرینگر میں واقع مکانات کی جائداد کا تحفظ ناکافی ہے۔ چنانچہ اب سرینگر میں ایسے کام چل رہے ہیں جن سے زیرآب ہونے سے اس شہر کا تحفظ ہو سکے۔مگر اس شہر کا تحفظ دریا کے کناروں پر پیداوار کے نقصان کے مترادف ہوگا کیونکہ جنوب کی جانب بہنے والا تمام تر پانی اپنے راستے سے گزر کر بارہ مولہ تک پہنچ جائے گا۔ چنانچہ سرینگر کے سیلابوں سے زیادہ تحفظ کی مراد یہاں کے بیچوں بیچ سے گزرنے والے پانی کو زیادہ مسدود کر دینا ہوگا۔ یہ تمام باتیں اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ جن لوگوں نے اس شہر کی بنیاد رکھی، انھوں نے اپنے جانشینوں کو سنگین انجینئرنگ کا مسئلہ وراثت میں دیا ہوگا اور کسی دن یہ راستہ ان کے ذہن میں آیا ہوگا کہ بارہ مولہ میں دریائے کے طاس کی سطح کو نیچے کیا ہوگا تاکہ وادی میں دروازے نصب کر کے دریا کے پانی کو باقاعدہ بنایا ہوگا۔دوسرے لوگ دریائے جہلم کی ایک متبادل نہر کا ذکر کرتے ہیں جو سرینگر کے اوپر شمال کی جانب جاتی ہے مگر یہ منصوبہ اس امر کے باعث مشکل ہو جاتا ہے کہ دودھ گنگا ندی کا طاس جہلم سے بلند سطح پر واقع ہے۔شاید اس دشواری کا حل دلدلی مٹی کے نکاس سے ممکن ہو سکتا ہے۔ میں نے اس رپوٹ کے باب دوم میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ کس طرح ایک کے بعد دوسری نسل اس ندی میں رچ بس گئی جونہی یہ سرینگر سے گزرتی ہے اور دکھایا کہ دریائے جہلم کے کنارے تکونی شکل کی جھیل ولر میں رفتہ رفتہ ریت مٹی جمع ہو رہی ہے۔ یہ تمام تر سوال اولین اہمیت کے حامل ہیں۔قدرتی طور پر سرینگر توجہ کا پہلا مرکز ہے مگر مالیۂ اراضی کے لحاظ سے یہ بھی لازمی ہے کہ فصلوں کا بار بار زیرآب ہونے سے تحفظ کیا جائے۔1893 سیلابوں کے سبب سے حکومت کو صرف مالیہ اراضی میں 64904 روپے کا نقصان ہوا۔پچیس ہزار چار سو چھتیس ایکڑ زمین پر فصلیں زیرآب ہوگئیں، دو ہزار دو سو پچیس گھر تباہ ہو گئے اور تین سو انتیس افراد لقمۂ اجل بن گئے۔وادی کشمیر میں سیلاب گرمی اور مسلسل بارشوں کی

وجہ سے آتے ہیں۔ پہاڑوں پر پیہم بارش کے سبب برف پگھل جاتی ہے اور اس کا پانی پہاڑوں سے بہہ کر ندی نالوں میں گرتا ہے۔ صرف پگھلتی ہوئی برف ہی طغیانی کا سبب نہیں ہوتی اور نہ ہی صرف موسلا دھار بارشیں اس تباہی کا موجب بنتی ہیں۔ حتیٰ کہ پگھلتی برف اور موسلا دھار بارش دونوں وجوہ ایک ساتھ پیدا نہ ہو جائیں سیلاب نہیں آتے۔ میں نے یہ مشاہدہ کیا ہے کہ بارہ گھنٹے تک بارش ہوتی ہے جس کے بعد تیز اور چمکتی دھوپ نمودار ہو جاتی ہے۔ جب بارش چوبیس گھنٹے تک پڑتی ہے اور دور دور تک پھیل جاتی ہے تو ندیوں، دریاؤں میں پانی کی سطح بلند ہو جاتی ہے مگر سنگین سیلاب نہیں آتے۔ 1893 میں 18 جولائی کے دن بارش برسنا شروع ہوئی اور باون گھنٹے تک بلا رکاوٹ جاری رہی۔ موسم بھی کافی گرم تھا اور جب بادل چھٹ گئے تو تمام پہاڑوں سے برف غائب ہو چکی تھی۔ اس وقت وادی میں صرف ایک ہی موسمیاتی مرکز تھا اور اسی مرکز کے زیر آب ہونے سے قبل یہاں پر چھ انچ بارش درج کی گئی تھی اور یہ مرکز تباہ ہو گیا۔ اسلام آباد سے تار کے ذریعے وارننگ موصول ہوئی کہ ایک بھاری سیلاب نیچے آ رہا ہے مگر بدقسمتی سے وادی کے جنوب میں بارش کے بارے میں حقائق ہمیں معلوم نہیں ہیں۔ بہر حال معلوم تھا یہ بارش قدرتی اور غیر معمولی نوعیت کی تھی۔ یہ امر سیدھی بات سے عیاں ہو جاتا ہے کہ دیوسر تحصیل میں ایک ریچھ اور چیتا ایک ساتھ مردہ پائے گئے تھے جبکہ اُتر مچھی پورہ میں ایک دیوہیکل اژدہا میدانوں تک بہتا آیا تھا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ پہاڑی ندیوں کی طوفانی لہریں نہایت خطرناک تھیں۔ بڑے بڑے درخت اپنی جڑوں سمیت اکھڑ کر کھیتوں کے درمیان بہہ گئے تھے۔ جھیل ولر اس وقت جا بجا تلہن اور باجرے کی فصل سے بھری پڑی تھی۔ شہر کے پلوں کے حصے اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ پنج ناڑہ کے ارد گرد زیریں علاقوں کے لوگ سرعت کے ساتھ اپنے بچوں و مویشیوں سمیت بلندی پر واقع مقامات پر منتقل ہو گئے۔ چنانچہ بہت کم جانی نقصان ہوا جو لوگ وہیں ٹکے رہے انھوں نے رات درختوں کی شاخوں پر چڑھ کر بسر کی اور وہاں سے گزر رہے کشتی رانوں سے انھوں نے امداد طلب کی مگر بہت ساری صورت میں کشتی ران بھی بے رحم ثابت ہوئے۔ سرینگر میں جو اطلاعات جمع ہوئیں ان کے مطابق اجتماعی طور پر ہانجیوں نے بے رحمانہ اور نازیبا سلوک کیا۔ خاص طور پر سرینگر شہر میں بھاری افراتفری تھی۔ حال ہی میں تعمیر کردہ دوسرا پل طوفانی لہروں کی تاب نہ لا کر

بہہ گیا اور اس کے زور سے دیگر پانچ پل بھی بہہ گئے ۔ کیونکہ یہ پل بھی اگر چہ زیر آب تھا تاہم قابل عبور بھی تھا۔ اس امر کی اطلاعات بھی موصول ہوئیں کہ جن افراد کا کاروبار دریا کے ایک طرف اور رہائش دوسری طرف تھی وہ ڈوب گئے ۔ جولائی کی رات بے یقینی اور تشویش کی شب تھی۔ غرق آب ہونے سے بچ نکلنے کے بہت سارے واقعات سے متعلقہ اطلاعات بھی موصول ہوئیں۔ سیلابوں کی ہیبت اور رعناواری محلہ کے زیریں محل وقوع کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے ایک تعجب اور نیک فعالی کا امر ہے کہ ایک لاکھ اٹھارہ ہزار نو سو ساٹھ (1,18960) کی کل آبادی میں سے صرف 17 افراد جاں بحق ہوئے جن میں سولہ اموات غرق آب ہونے اور ایک موت مکان کے گر جانے سے ہوئی۔ بہر کیف دیہات میں بہت کم اموات ہوئیں۔ زیریں سطح پر واقع ان علاقوں میں جہاں فصلیں تباہ ہوگئی تھیں وہاں پر شاید ہی کوئی جانی نقصان ہوا تھا کیونکہ وہاں کے عوام ہمیشہ سیلابوں کے انتظار میں رہتے تھے مگر پہاڑی علاقوں میں لازمی طور پر نقصان ہوا تھا جہاں انسان، حیوان اور بھیڑیں دریا کی طوفانی لہروں میں بہہ کر ندی نالوں میں آگریں۔ میری اطلاع میں ایک یا دو ایسے معاملات بھی آئے جہاں آدمیوں نے درختوں پر پناہ لی۔ مگر بدقسمتی سے یہ درخت گر گئے اور انھیں پہاڑی ندی نالے اپنی طوفانی لہروں میں بہا کر لے گئے۔ ان سیلابوں کے اہم شکار گڈریے اور چرواہے بنے جو اس خطرناک طوفانی رات میں دریا کے کناروں پر اپنے ریوڑوں کی تلاش کر رہے تھے۔ اچانک سیلاب آجانے سے ان کی لاشیں ندی نالوں میں کافی گہرائیوں تک جا گریں۔ مگر شہروں کی نسبت یہ ایک نیک فال ہے کہ چھ لاکھ ستر ہزار نو سو اٹھاسی کی کل دیہی آبادی میں سے 1893 کے بھاری سیلابوں میں صرف بتیس افراد جاں بحق ہوئے۔ ان میں سے اکیس افراد دریا برد ہوئے۔ گلمرگ کے بالائی جنگل میں درخت گرنے سے پانچ افراد اور باقی چھ افراد مکانوں کے گرنے سے جاں بحق ہوئے ۔ ذخیروں کا نقصان بھی خدشات سے کم تھا۔ ان بھیڑ بکریوں کے نقصان کی بابت صحیح اندازہ نہیں ہوسکا جو جولائی کے مہینے کے دوران ان پہاڑی چراگاہوں پر چرنے کے لیے آتی ہیں مگر اطلاع کے مطابق کافی بھیڑیں ہلاک ہوگئیں ۔ مجموعی طور پر تین سو انتیس مویشیوں کا نقصان ہوا اور ان اعداد و شمار کو درست تسلیم نہیں کیا جاسکتا ہے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ماہ جولائی میں ہل چلانے والے تمام مویشی اور دودھ نہ دینے والی گائیوں

کو چرانے کے لیے بلند سطح پر واقع میدانوں میں لے جایا جاتا ہے۔ میں نے یہ بات تو لازمی طور پر سنی تھی کہ بھیڑیں دریا برد ہو گئیں مگر یہ نہیں سنا کہ مویشی بھی سیلابوں کی نذر ہو گئے۔ دریا اس بات کی حقیقی شہادت بیان کرتا ہے کہ چند مویشی بارہمولہ سے نیچے دریا کی سطح پر تیرتے ہوئے دیکھے گئے۔

خاص کشمیر میں سیلابوں نے دو ہزار دوسو پچیس مکانات تباہ کر دیے۔ ان گھروں میں سفیدے کے درخت کی تیار کردہ وہ کمزور جھونپڑیاں بھی شامل تھیں جن میں جھیل ڈل میں سبزیاں اگانے والے کاشکار رہائش پذیر ہیں اور وہ گھٹیا معیار کے مکانات بھی جن کی تفصیلات وادی میں اکثر دستیاب ہیں۔ جنگلات کے نزدیک یہ جھونپڑے محض شہتیروں سے تعمیر کیے جاتے ہیں مگر جوں ہی جنگلات سے فاصلہ بڑھتا ہے لکڑی زیادہ مہنگی ہو جاتی ہے اور لکڑی کے چوکھٹوں میں نیم سوختہ اینٹیں جوڑ کر ان تختوں کو لکڑی کے چوکھٹوں کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے۔ یہاں پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ عمارت سازی کی مؤخر الذکر تکنیک میں سیلابوں سے مدافعت کی زیادہ قوت موجود ہوتی ہے۔ ایک کشمیری کاشتکار کے اوسط مکان کی مالی قیمت لگانا مشکل کام ہے، کیونکہ عمارت سازی کا کام دیہاتیوں کے تعاون سے سرانجام ہوتا ہے۔ مکان بنانے کے لیے جو دوست جنگلات سے لکڑی لاتے ہیں انھیں فقط کھانا دیا جاتا ہے۔ مگر ہنرمند کاریگروں کو ان کی اُجرت ادا کی جاتی ہے۔ اور ان میں نجار اور گلکار شامل ہوتے ہیں۔ عام حالات میں کوئی دقت پیش نہیں آتی اور کشمیری ہمیشہ کام کو زیادہ طویل بنانا چاہتا ہے۔ مگر بدقسمتی سے سرینگر میں 1892 میں ایک تباہ کن آتشزدگی نے کثیر تعداد میں مکانوں کو تباہ و برباد کر دیا۔ چنانچہ نجاروں اور گلکاروں کی طلب بڑھ گئی اور اُجرتوں میں اضافہ ہو گیا اور یہ بدعت دیہات تک پھیل گئی۔ حالانکہ حکومت نے آتشزدگی کے شکار لوگوں کے تئیں ہمدردی کا مظاہرہ کیا اور انہیں لکڑی فراہم کرنے کے لیے جنگلوں سے مفت درخت کاٹنے کی اجازت دے دی۔ اس کے باوجود بھی نئے مکانوں کی تعمیر کی لاگت بہت زیادہ تھی۔ موسم سرما بھی قریب تھا اور بہت سارے دیہاتیوں کے دل میں یہ خدشہ تھا کہ جن کاشتکاروں کے مکان تباہ ہو گئے ہیں وہ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کے پاس پناہ لینے پر مجبور ہو جائیں گے کیونکہ اس قدر مختصر عرصے میں مکان بنانا ناممکن تھا۔ ایسے لوگوں کو دربدر ہونے سے بچانے اور

انھیں گاؤں کے ساتھ ہی وابستہ رکھنے کے لیے یہ لازمی تھا کہ اپنے مکان بنانے میں وقت ضائع نہ کرنے کے معاملے میں ان کی فہم وتفہیم کی جائے ۔مگر شہروں اور دیہاتوں میں نجاروں کی بھاری طلب کے سبب اس کام میں تاخیر واقع ہوئی اور پنڑی نار کے گردونواح میں اچھے جھونپڑوں کی تعمیرِ نو کے لیے زیادہ وقت لگ گیا۔

سرینگر سے اوپر فصلوں کا نقصان کافی کم تھا کیونکہ زمین کا محل وقوع ایسا ہے جہاں سے پانی دریائے جہلم میں گرتا ہے۔سب سے زیادہ نقصان نچلے علاقوں میں ہوا۔جس وقت یہ سیلاب آئے اس وقت گندم، جو اور تلہن کی ربیع کی فصل کاٹ لی گئی تھی ۔مگر اس کا بہت سارا حصہ یا تو کوٹا جاچکا تھا یا کوٹنے کے لئے زمین پر موجود تھا۔دھان کی فصل خریف یا تو کھل چکی تھی یا ان کی بالیاں تیار ہو رہی تھیں ۔مکئی کی بالیاں تیار ہو چکی تھیں اور ان سے ایک اچھی فصل کی امیدیں وابستہ تھیں۔ جب پہاڑوں سے ہوتا ہوا سیلاب اسلام آباد کی بندرگاہ کھنہ بل تک جا پہنچا تو اس کی رفتار میں کمی واقع ہوئی اور دریائے جہلم کا پانی سست روی سے نیچے آیا مگر اس کی جسامت کافی زیادہ تھی۔دریا کے دونوں کناروں کو اونچا کیا گیا تھا۔جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے 1893 میں ان بلند کناروں کی مرمت کی کوشش کی گئی ۔پانپور اور تکر پورہ کے مقام پر ان کی اونچائی اس قدر بڑھا دی گئی کہ یہ معمول کے سیلابوں کی مدافعت کر سکے۔مگر چند مقامات پر پہاڑیوں کا پانی جہلم میں آتا ہے۔ چنانچہ ان مقامات پر قدیم دنوں میں سیلابی دروازوں کی تعمیر عمل میں لائی گئی تھی مگر جہلم کا پانی پیچھے مڑ کر سیلابوں کی صورت میں نیچے آ گیا۔محکمۂ تعمیرات عامہ کے ناظم کا یہ خیال تھا کہ ان دروازوں کو بحال کر دیا جائے مگر کسی وجہ سے یہ دروازے تعمیر نہ ہو سکے۔چنانچہ جب دریا کا پانی نیچے آیا تو یہ پانی ان داخلی مقامات میں بھر گیا جنھیں گیٹ لگا کر بند کرنا تھا۔بہت ساری صورتوں میں یہ ان بلند کناروں سے اوپر بہہ گیا اور ان میں شگاف پیدا کر دیے۔مگر میری رائے یہ ہے کہ اگر سیلابی دروازوں کی بروقت تعمیر مکمل بھی ہوئی ہوتی تو بھی سرینگر سے اوپر کناروں میں یہ پانی زبردستی بھر جاتا۔ربیع کی جو فصلیں کوٹنے کے لیے پڑی تھیں وہ تباہ ہو گئیں۔ نچلی سطح کی زمین پر واقع کھیتوں میں کافی دنوں تک پانی رکا رہا اور یہ بھی تباہ ہو گئے ۔اسی طرح دھان اور مکئی کی کھڑی فصلیں بھی تباہ ہو گئیں کیونکہ وہاں پر پانی رکا پڑا تھا اور سیلابی پانی کو باہر رکھنے کے لیے جو بلند کنارے تعمیر کیے گئے

کو چرانے کے لیے بلند سطح پر واقع میدانوں میں لے جایا جاتا ہے۔ میں نے یہ بات تو لازمی طور پر سنی تھی کہ بھیڑیں دریا برد ہو گئیں مگر یہ نہیں سنا کہ مویشی بھی سیلابوں کی نذر ہو گئے۔ دریا اس بات کی حقیقی شہادت بیان کرتا ہے کہ چند مویشی بارہمولہ سے نیچے دریا کی سطح پر تیرتے ہوئے دیکھے گئے۔

خاص کشمیر میں سیلابوں نے دو ہزار دو سو پچیس مکانات تباہ کر دیے۔ ان گھروں میں سفیدے کے درخت کی تیار کردہ وہ کمزور جھونپڑیاں بھی شامل تھیں جن میں جھیل ڈل میں سبزیاں اگانے والے کاشتکار رہائش پذیر ہیں اور وہ گھٹیا معیار کے مکانات بھی جن کی تفصیلات وادی میں اکثر دستیاب ہیں۔ جنگلات کے نزدیک یہ جھونپڑے محض شہتیروں سے تعمیر کیے جاتے ہیں مگر جوں ہی جنگلات سے فاصلہ بڑھتا ہے لکڑی زیادہ مہنگی ہو جاتی ہے اور لکڑی کے چوکھٹوں میں نیم سوختہ اینٹیں جوڑ کر ان تختوں کو لکڑی کے چوکھٹوں کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے۔ یہاں پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ عمارت سازی کی مؤخر الذکر تکنیک میں سیلابوں سے مدافعت کی زیادہ قوت موجود ہوتی ہے۔ ایک کشمیری کاشتکار کے اوسط مکان کی مالی قیمت لگانا مشکل کام ہے، کیونکہ عمارت سازی کا کام دیہاتیوں کے تعاون سے سرانجام ہوتا ہے۔ مکان بنانے کے لیے جو دوست جنگلات سے لکڑی لاتے ہیں انھیں فقط کھانا دیا جاتا ہے۔ مگر ہنرمند کاریگروں کو ان کی اُجرت ادا کی جاتی ہے۔ اور ان میں نجار اور گلکار شامل ہوتے ہیں۔ عام حالات میں کوئی وقت پیش نہیں آتی اور کشمیری ہمیشہ کام کو زیادہ طویل بنانا چاہتا ہے۔ مگر بدقسمتی سے سرینگر میں 1892 میں ایک تباہ کن آتشزدگی نے کثیر تعداد میں مکانوں کو تباہ و برباد کر دیا۔ چنانچہ نجاروں اور گلکاروں کی طلب بڑھ گئی اور اُجرتوں میں اضافہ ہو گیا اور یہ بدعت دیہات تک پھیل گئی۔ حالانکہ حکومت نے آتشزدگی کے شکار لوگوں کے تئیں ہمدردی کا مظاہرہ کیا اور انہیں لکڑی فراہم کرنے کے لیے جنگلوں سے مفت درخت کاٹنے کی اجازت دے دی۔ اس کے باوجود بھی نئے مکانوں کی تعمیر کی لاگت بہت زیادہ تھی۔ موسم سرما بھی قریب تھا اور بہت سارے دیہاتیوں کے دل میں یہ خدشہ تھا کہ جن کاشتکاروں کے مکان تباہ ہو گئے ہیں وہ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کے پاس پناہ لینے پر مجبور ہو جائیں گے کیونکہ اس قدر مختصر عرصے میں مکان بنانا ناممکن تھا۔ ایسے لوگوں کو دربدر ہونے سے بچانے اور

انھیں گاؤں کے ساتھ ہی وابستہ رکھنے کے لیے یہ لازمی تھا کہ اپنے مکان بنانے میں وقت ضائع نہ کرنے کے معاملے میں ان کی فہم وتفہیم کی جائے۔ مگر شہروں اور دیہاتوں میں نجاروں کی بھاری طلب کے سبب اس کام میں تاخیر واقع ہوئی اور پنڑی نار کے گردونواح میں اچھے جھونپڑوں کی تعمیر نو کے لیے زیادہ وقت لگ گیا۔

سرینگر سے اوپر فصلوں کا نقصان کافی کم تھا کیونکہ زمین کا محل وقوع ایسا ہے جہاں سے پانی دریائے جہلم میں گرتا ہے۔ سب سے زیادہ نقصان نچلے علاقوں میں ہوا۔ جس وقت یہ سیلاب آئے اس وقت گندم، جو اور تلہن کی ربیع کی فصل کاٹ لی گئی تھی۔ مگر اس کا بہت سارا حصہ یا تو کوٹا جاچکا تھا یا کوٹنے کے لئے زمین پر موجود تھا۔ دھان کی فصل خریف یا تو کھل چکی تھی یا ان کی بالیاں تیار ہورہی تھیں۔ مکئی کی بالیاں تیار ہو چکی تھیں اور ان سے ایک اچھی فصل کی امیدیں وابستہ تھیں۔ جب پہاڑوں سے ہوتا ہوا سیلاب اسلام آباد کی بندرگاہ کھنہ بل تک جا پہنچا تو اس کی رفتار میں کمی واقع ہوئی اور دریائے جہلم کا پانی سست روی سے نیچے آیا مگر اس کی جسامت کافی زیادہ تھی۔ دریا کے دونوں کناروں کو اونچا کیا گیا تھا۔ جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے 1893 میں ان بلند کناروں کی مرمت کی کوشش کی گئی۔ پانپور اور ککر پورہ کے مقام پر ان کی اونچائی اس قدر بڑھادی گئی کہ یہ معمول کے سیلابوں کی مدافعت کر سکے۔ مگر چند مقامات پر پہاڑیوں کا پانی جہلم میں آتا ہے۔ چنانچہ ان مقامات پر قدیم دنوں میں سیلابی دروازوں کی تعمیر عمل میں لائی گئی تھی مگر جہلم کا پانی پیچھے مڑ کر سیلابوں کی صورت میں نیچے آ گیا۔ محکمۂ تعمیرات عامہ کے ناظم کا یہ خیال تھا کہ ان دروازوں کو بحال کر دیا جائے مگر کسی وجہ سے یہ دروازے تعمیر نہ ہو سکے۔ چنانچہ جب دریا کا پانی نیچے آیا تو یہ پانی ان داخلی مقامات میں بھر گیا جنھیں گیٹ لگا کر بند کرنا تھا۔ بہت ساری صورتوں میں یہ ان بلند کناروں سے اوپر بہہ گیا اور ان میں شگاف پیدا کر دیے۔ مگر میری رائے یہ ہے کہ اگر سیلابی دروازوں کی بروقت تعمیر مکمل بھی ہوئی ہوتی تو بھی سرینگر سے اوپر کناروں میں یہ پانی زبردستی بھر جاتا۔ ربیع کی جو فصلیں کوٹنے کے لیے پڑی تھیں وہ تباہ ہوگئیں۔ نچلی سطح کی زمین پر واقع کھیتوں میں کافی دنوں تک پانی رکا رہا اور یہ بھی تباہ ہو گئے۔ اسی طرح دھان اور مکئی کی کھڑی فصلیں بھی تباہ ہوگئیں کیونکہ وہاں پر پانی رکا پڑا تھا اور سیلابی پانی کو باہر رکھنے کے لیے جو بلند کنارے تعمیر کیے گئے

ہیں ان کے سبب دریا کا پانی دریا میں ہی واپس بہتا رہا۔

جوں ہی سیلابوں کا پانی سرینگر پہنچا تو اس کے پلوں نے پانی کو روک لیا اور سری نگر کے جنوبی حصے کو اس پانی نے ایک وسیع ساکن جھیل میں بدل دیا۔ منشی باغ میں دریا کے بلند کناروں نے کافی عرصے تک سیلابوں کا مقابلہ کیا مگر اس کے بلند کنارے میں شگاف پڑ گیا اور اسی وقت سیلاب کا پانی اس پشتے سے اوپر بہنے لگا۔ یورپی سیاح اس صورتحال کا مقابلہ کرنے کے لیے مکمل طور پر تیار تھے۔ راجہ امر سنگھ کی دوراندیشی کی بدولت ہر ایک کو کشتیاں فراہم کی گئیں۔ اگر ان سیلابوں کا حملہ دوپہر کے بجائے رات کو ہوا ہوتا تو بھاری جانی نقصان ہو سکتا تھا۔ جو یورپی اور دوسرے لوگ سرینگر سے اوپر دائیں کنارے پر رہتے تھے انھیں اچھی خاصی پریشانی ہوئی۔ محکمۂ ڈاک و تار کے ملازموں کے لیے بھاری مصیبت پیدا ہوگئی۔ ہندوستان اور گلمرگ کے ساتھ مواصلاتی رابطہ منقطع ہو کر رہ گیا اور تخت سلیمان کے گرد ڈھلوانوں میں خشک زمین کا کوئی بھی ٹکڑا نہیں بچا۔ گھوڑے اور مویشی چڑھ کر برآمدوں میں آگئے اور 21 جولائی کی رات بہت سارے آدمیوں نے درختوں پر چڑھ کر بسر کی۔ کشتی رانوں نے اس صورتحال کا فائدہ اٹھا کر لوگوں کو درختوں سے نکال کر مکانوں کی بالائی چھت پر لیجانے کے عوض بھاری اُجرت طلب کی اور اندرونِ شہر ان لوگوں کو تب تک دریا عبور کرانے سے انکار کر دیا جب تک کہ انھیں بھاری اُجرت نہ دی جائے۔ شہر کے اندر بہت بڑا خطرہ موجود تھا۔ دریا کے دونوں کناروں پر واقع گھروں میں کبھی سیلاب کا پانی نہیں آیا تھا مگر پلوں کے ٹوٹ جانے اور پانی کے اندر کشمکش میں مبتلا لوگوں کے منظر نے خوف و دہشت پیدا کر دی۔ اس بات کی زوردار افواہیں بھی پھیل گئیں کہ بھاری جانی نقصان ہوا ہے۔ عورتوں نے فوری طور پر یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ ان کے شوہر جو دریا کے دونوں طرف کام کر رہے تھے ڈوب گئے ہیں۔ اور چند دنوں تک سیلابوں کی وجہ سے ہونے والی اطلاعات کو مبالغہ آمیزی کے ساتھ پیش کیا جاتا رہا۔

سیلابی پانی نے اس دروازے کو بھی توڑ دیا تھا جو سیلابوں سے جھیل ڈل کا تحفظ کرتا ہے اور اس جھیل پر واقع باغات بھی زیرآب ہو گئے تھے۔ نیز خربوزے، کھیرے، سبزیوں کے کھیت اور ٹماٹر بھی تباہ ہو گئے تھے جو ماہ جولائی کے دوران شہریوں کی غذا کا ایک حصہ ہوتے ہیں۔ شہر تک آمد

ورفت کے تمام راستے بند تھے۔ دیہات میں پن چکیاں برباد ہو چکی تھیں، قیمتوں میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ عوام کی بنیادی غذا چاول کے دام ایک روپے میں چھبیس سیر سے بڑھ کر ایک روپے میں 18 سیر ہو چکے۔ تیل کے نرخ ڈیڑھ روپے سے بڑھ کر دو روپے چھ سیر ہو چکے تھے۔ اور نمک کے دام ایک روپے میں سات سیر سے بڑھ کر ایک روپے میں چھ سیر ہو چکے ہیں۔ ماسوائے نمک اور تیل کی قیمتوں میں یہ اضافہ محض عارضی تھا۔ جہاں تک اول الذکر کا تعلق ہے حالانکہ قیمتیں دو روپے سے کم ہو کر ایک روپیہ رہ گئیں۔ تیل کی قیمتیں بلاشبہ زیادہ رہیں۔ کیونکہ تلہن کی فصل کو بھاری نقصان پہنچا تھا۔ جہاں تک نمک کی قیمتوں کا تعلق ہے وہ تب تک اونچی رہیں جب تک کہ کوہالہ کی سڑک کو کھول دیا گیا۔ شہر کے زیریں سطح پر واقع نواحی علاقوں خاص طور پر رعناواری میں رہائشی مکان تباہ ہو گئے مگر مجھے اس وقت حیرت ہوئی جب میں نے دیکھا کہ رعناواری اور زیریں سطح پر واقع دیگر علاقوں میں بہت کم نقصان ہوا تھا کیونکہ جھیل ڈل کے دروازے اگرچہ ان سیلابوں میں بہہ گئے تھے اور ستھو قاضی کا بلند کنارہ جو دریائے جہلم کی طغیانی کی پیش بندی کرتا ہے، اس میں شدید شگاف پیدا ہو گیا اس کے باوجود بھی جھیل ڈل کی سطح کبھی اس قدر بلند نہیں ہوئی جسے سیلاب کہا جا سکے۔

سرینگر سے نیچے دریا کی روانی ڈھلوان کی صورت میں جھیل ولر کی جانب بڑھتی ہے۔ جھیل آنچار کے شمال میں دریائے سندھ کے لبالب پانی سے دریائے جہلم کا دایاں پشتہ بہہ گیا چنانچہ دریائے سندھ دریائے جہلم کا پانی باہمی طور پر گھل مل گیا۔ دائیں کنارے پر تمام تر آنچار کا علاقہ زیر آب ہو گیا اور ولر تک واقع تمام تر علاقہ اس جھیل کی صورت اختیار کر لیا جس کے نیچے دھان، جو اور تلہن کی فصلیں گل سڑ رہی تھیں۔ جو اور مکئی اور تلہن کی فصلیں وہاں سے بہہ گئی تھیں اور سارا علاقہ ایک اندوہ ناک منظر پیش کر رہا تھا۔ براہ راست بارش 20 جولائی کو بند ہو چکی تھی۔ اس کے بعد چمکدار دھوپ نکلی جس کے سبب ٹھہرے ہوئے پانی میں فصلیں سڑ گئیں۔ ایک آبی پودے کے طور پر دھان میں مکئی کی نسبت زیادہ قوت مدافعت ہے مگر سرینگر سے نیچے سیلاب اس قدر لگا تار تھے کہ جو بھی دھان زیر آب ہوا تھا اس میں سے بہت کم بچ پایا۔ سڑی گلی مکئی کی بدبو اس قدر تیز تھی کہ دیہات کے بہت سارے علاقے ترک کر دیے گئے کیونکہ کاشتکار اپنے مویشیوں سمیت بلند

علاقوں کی طرف بھاگ گئے تھے۔ یہاں وہاں سے کریوہ جات کی کھڑی پہاڑیوں سے مویشی جمع کیے گئے اور لوگوں کو کھلی ہوا میں نیلے آسمان تلے پڑاؤ ڈالنا پڑا۔ شادی پور سے وادیٔ سندھ تک سیلابوں کی وجہ سے بھاری نقصان ہوا تھا اور سندھ کے دہانے تک تمام کھیتوں میں یہاں وہاں شہتیریں بکھری پڑی تھیں اوراس سے بھی بُری بات یہ ہوئی کہ جس سفید ریت نے دھان کی فصلوں کو تباہ کر دیا تھا اس نے آئندہ چند برسوں کے لیے کھیتوں کو بھی بنجر بنا کر رکھ دیا۔ اپنے برباد کھیتوں میں لوگ کبھی روتے اور کبھی وحشیوں کی طرح ناچتے رہے۔ ہر طرف چیخوں کی آواز تھی اور مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ ان فقیروں کی بابت بہت سارے عجیب وغریب قصے کہانیاں بیان ہوتی رہیں جن کے جھنڈے سیلابوں کو روکنے کے لیے نصب کیے گئے تھے۔ اور عوام کا اعتقاد ہے کہ تولہ مولہ کی فصلیں اور سمبل پل انھیں پرچموں کی بدولت بچ سکے تھے جو زیارت گاہوں سے آخری سہارے کے طور پر لگائے گئے تھے۔ سب سے زیادہ تباہی یہاں کے نواحی علاقے پنزی نار میں ہوئی۔ مغل عہد میں جھیل ولر سے زمین واگذار کرنے کے لیے پشتے تعمیر کیے گئے تھے اور یہ پشتے اب بھی جہانگیر اور شاہ جہاں کی یاد دلاتے ہیں۔ ان پشتوں کا اندرونی حصہ پتھر کی سلوں سے تعمیر کیا گیا ہے کیونکہ تجربات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب دلدلی زمین پر بنیاد تعمیر کرنا ہو تو ان کناروں پر مٹی کام نہیں دیتی اور ایسی زمین ولر کے آس پاس موجود ہے۔ جہاں پر پتھر دستیاب نہیں ہیں وہاں یہ روایت ہے کہ وہاں مٹی پر ڈھیر لگائے جائیں تاکہ زمین میں استحکام پیدا ہو اور مضبوط بنیاد قائم کی جا سکے۔ میں یہ نہیں جانتا کہ آیا انجینئرنگ کے نکتہ نگاہ سے یہ روایت کوئی جواز رکھتی ہے مگر کشمیر کے تمام حکام اور کاشتکاروں کا اعتقاد ہے کہ دریا کے کناروں پر قائم کردہ کوئی بھی پشتہ تب تک مضبوط و مستحکم نہیں ہوتا جب تک اس کی بنیاد دھڑوں سے نہ ڈالی جائے۔ قدیم مغل پشتوں کے احاطے میں جو زمین ہے اسے گنڈ یعنی باندھنا کہا جاتا ہے۔ ایک یا دو مواقع پر دن رات محنت کر کے ان کمزور مقامات پر مرمت کے بعد یہ گنڈ بچائے جا سکے۔ پنزی نار کے قریب رہائش پزیر لوگوں کے دلوں میں ہمیشہ سیلابوں کا ڈر موجود رہتا ہے مگر 1893 میں حالات نے انھیں غلط تحفظ کے سبب خاموش رکھا۔ اوّل یہ کہ 92-1891 کی مختصر برف باری کے سبب جھیل ولر غیر معمولی طور پر خشک ہو گئی اور اس کے وسیع کنارے خشک اور پیاسے معلوم ہوتے تھے اور عوام کو یقین تھا کہ معمولی سیلابوں کا پانی

جھیل میں سما جانے کے لئے کافی گنجائش موجود تھی۔ دوسرے یہ کہ 21 جولائی کے سیلابوں سے ایک ماہ قبل یہاں پر ایک بھاری سیلاب آیا تھا اور لوگ نقصان سے بچ گئے تھے۔ لہٰذا انھیں توقع تھی کہ اب دوسری مرتبہ سیلاب نہیں آئیں گے۔ چنانچہ دھان، جو اور تلہن کو تغافل کے طور پر کٹائی کے فرشوں پر چھوڑ دیا گیا اور جب سیلاب آئے تو یہ شاندار فصلیں مکمل طور پر تباہ ہو کر رہ گئیں۔ حالیہ برسوں کے دوران مکئی کی فصل بھی بہترین تھی مگر یہ مکمل طور پر زیر آب ہو گئی۔ اس سے غلّے کے نقصان کے علاوہ گھاس چارے کا بھی مزید نقصان ہوا کیونکہ اس علاقے میں مویشی بھی کثیر تعداد میں موجود تھے اور ان کی غذا میں مکئی کی ڈنٹھل شامل ہے۔ تمام تر خطے کی سطح کافی نچلی اور مٹی دلدل کی نوعیت کی ہے کیونکہ تالابوں وغیرہ سے یہ کئی مرتبہ حاصل کی گئی ہے اور چند مقامات کے بارے میں تو اس بات میں شبہ ہے کہ آیا یہ زمین چند برسوں تک قابل کاشت ہو گی یا نہیں کیونکہ یہ زمین دریائے جہلم کے طاس سے نیچے کی سطح پر واقع ہے اور مسلسل کئی برسوں تک سوکھ ناگ اور جنوبی تالابوں کے گرد پشتے تیار کرنے کے بعد یہ زمین قابل کاشت ہو سکی ہے۔

جھیل ولر کی طرف جن لوگوں کو مئی کی فصلوں کا نقصان ہو چکا تھا انھوں نے اپنی توجہ سنگھاڑے نکالنے پر لگا دی اور خوش قسمتی سے جس سال بھاری سیلاب آتے ہیں اسی برس سنگھاڑے کافی زیادہ تعداد میں دستیاب ہوتے ہیں مگر جو دیہات ولر سے کافی دور واقع ہیں انھیں یہ سہولیت دستیاب نہیں۔ چنانچہ بارہ مولہ سرینگر سڑک کی تعمیر کا کام قحط سالی سے راحت دلانے کے اقدام کے طور پر شروع کیا گیا ہے۔

سرینگر کے نواح میں جن لوگوں کی پورے برس کی فصل تباہ ہو گئی انھیں پشتوں کی مرمت اور آب رسانی کی تعمیرات کا کام دیا گیا۔ اس طرح حکومت نے نہایت فراخدلی اور رحم دلی سے کارروائی کی۔ اگر چہ 1893 کے سیلابوں کو ایک آفتِ سماوی کے طور پر یاد رکھا جائے گا مگر حکومت کی انسان دوست کارروائی کے سبب اس آفت کا مقابلہ کیا گیا۔

بھونچال

جب زلزلوں، قحط سالیوں اور ہیضے سے مقابلہ کیا جائے تو آتش زدگیاں اور سیلاب بہر حال غیر اہم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ پندرھویں صدی میں پندرہ ایسے شدید زلزلے آئے جو زیادہ دیر تک

جاری رہے اور بھاری جانی نقصان کا سبب بنے۔ موجودہ صدی کے دوران چار شدید زلزلے رونما ہوئے ہیں اور یہاں پر یہ بات قابل توجہ ہے کہ یہ 1884 اور 1885 کے دوران رونما ہوئے۔ دو گذشتہ شدید زلزلوں کے دوران شدید جھٹکے محسوس ہوئے۔ اس بیضوی علاقے کا مرکز سرینگر اور بارہ مولہ تھا(1)۔ 1885 کا زلزلہ 30 مئی کو شروع ہوا اور اس زلزلے کے زیادہ تر شدید جھٹکے 16 اگست تک محسوس کیے جاتے رہے۔ مکانات تباہ ہوگئے، ہر طرف افراتفری اور گھبراہٹ تھی اور لوگ بہت دنوں تک گھروں سے باہر سوتے رہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ لگ بھگ ساڑھے تین ہزار افراد جان بحق ہوگئے۔ عمارتوں کے گرنے کی وجہ سے متعدد مویشی گھوڑے اور دیگر خانگی مویشی دب کر ہلاک ہوگئے۔ بارہ مولہ اور پٹن میں سب سے زیادہ نقصان ہوا۔ زمین میں بہت بھاری شگاف پیدا ہوگئے اور بیان کیا جاتا ہے کہ ان شگافوں سے گندھک اور بہت ساری جلنے والی گیس اُگلتی نظر آئی۔ پانی کے بہت سارے پرانے چشمے نیست و نابود ہوگئے اور زمین کھسکنے کا عمل واقع ہوا۔ ان میں سے ایک کریوہ تحصیل میں لاری ڈورا کے مقام پر ہے جس سے سنگھاڑوں کے مدفون ملے، حالانکہ یہ مقام جھیل ولر کی سطح سے پندرہ سو فٹ بلندی پر واقع ہے۔ نیز یہ دلیل بھی دی گئی ہے کہ کشمیری طرز تعمیر کا تعین اس بات کو مدنظر رکھ کر بھی کیا جاتا ہے کہ یہ عمارتیں زلزلوں کے جھٹکے برداشت کرسکیں۔ مگر وادیٔ کشمیر کے باشندوں کا یہ دعویٰ ہے کہ کمزور عمارتیں ان زلزلوں کے دوران بچ جاتی تھیں مگر بھاری عمارتیں گرتی تھیں۔ یہاں اس بات کو سمجھنا لازمی ہے کہ 1885 کے زلزلوں کے دوران پٹن کے مندروں اور سرینگر کے محلات کا بھی کافی نقصان ہوا ہے۔ اب بھی میں نے دیکھا ہے کہ دیہاتی لوگ عارضی طور پر اپنے بچنے کے لیے ایک قسم کا سہارا تیار رکھتے ہیں جنھیں ان جھٹکوں کے تحفظ کے لیے پناہ گاہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے کیونکہ ایک زلزلہ گزر جانے کے بعد دوسرے کا خدشہ ہمیشہ بنا رہتا ہے۔

قحط سالیاں

مقامی مورخوں نے انیس قحط سالیوں کا ذکر کیا ہے جن کے بارے میں انھوں نے نہایت ہیبت ناک تفصیلات دی ہیں مگر اس اہم پہلو پر سبھی لوگ متفق ہیں کہ یہ قحط سالیاں وقت سے پہلے برف باری یا اس وقت بھاری بارشوں کے سبب رونما ہوئی ہیں۔ جب موسم خزاں کی فصلوں کی

کٹائی کا عمل جاری تھا۔ موجودہ صدی میں دو مرتبہ خوفناک قحط رونما ہوئے۔ ان میں سے ایک شیر سنگھ کے وقت میں آیا ہے جو 1831 میں موسم خزاں کے دوران جلدی برف باری کے دوران رونما ہوا اور ماضی قریب کی ایک تباہ کاری اکتوبر 1877 کے دوران مسلسل بارشوں کے سبب عمل میں آئی جو جنوری 1878 تک جاری رہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ شیر سنگھ کے عہد میں قحط سالی میں کشمیر کی آبادی آٹھ لاکھ افراد سے کم ہو کر دو لاکھ افراد تک رہ گئی اور اس قحط سالی کے بعد جو سیلاب آئے ان کے سبب آب پاشی کے کئی اہم کام تباہ ہو گئے اور وسیع تر کاشت شدہ علاقہ زیر آب آ گیا۔ 79-1877 کی قحط سالی میں بے مثال جانی نقصان ہوا۔ ایک حاکم نے بیان کیا ہے کہ اس قحط سالی کے بعد سرینگر کی آبادی ایک لاکھ ستائیس ہزار چار سو سے کم ہو کر ساٹھ ہزار نفوس تک گھٹ گئی جبکہ دیگر ذرائع کا بیان ہے کہ وادی کی کل آبادی میں سے دو بٹا پانچ زندہ بچ سکی۔ گزشتہ قحط سالی کے بعد اب کئی برس گزر چکے ہیں مگر کشمیری مقولہ ''دراگ ژلہِ تہ داغ ژلہِ نہ'' یعنی قحط تو گزر جاتا ہے مگر اس کے داغ باقی رہ جاتے ہیں اور یہ مملکت 1877 کی قحط سالی کے بعد ابھی تک سنبھل نہیں پائی چونکہ ابھی تک اس قحط سالی کی یادیں لوگوں کے ذہنوں میں تر و تازہ ہے۔ چنانچہ دیہاتیوں کے خیمے میں یہ قحط سالی پیہم طور پر موضوع گفتگو رہتی ہے۔ اس قحط سالی سے وابستہ چند مزید حقائق کا میں ذکر کروں گا کیونکہ اس صورت حال سے چند سبق سیکھنے کی ضرورت ہے اور کبھی دوبارہ اس وادی میں قحط سالی کی آفت رونما ہو تو یہ سبق نہایت مفید ثابت ہوں گے۔ اوّل یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ وادی میں قحط اس وقت رونما ہوتے ہیں جب دھان یا مکئی کی فصل کٹائی سے قبل بارش یا برف باری ہو اور یہ ایسے حالات ہیں جن کا سدباب کسی پیش بندی سے ممکن نہیں ہے۔ شدید خشک سالی کے سبب کسی حد تک قحط کا سامنا ہوتا ہے مگر کشمیر میں آب پاشی کی سہولیات اس قدر وسیع پیمانے پر دستیاب ہیں کہ خشک سالی سے دھان جیسی خاص پیداوار کا قطعی طور پر نقصان نہیں ہوتا ہے۔ 1877 میں اگر لوگوں کو اپنی فصلیں کاٹ کر لے جانے کی اجازت دی جاتی تو دھان کی فصل بچ سکتی تھی۔ جس قدیم نظام کے تحت مالیہ کی غرض سے فصل کی کٹائی میں تاخیر واقع ہوئی تھی اسے اب ختم کر دیا گیا ہے۔ اب کاشتکار فصلوں کو کاٹ سکتے ہیں اور انھیں بجا طور پر ڈھانپ کر رکھ سکتے ہیں۔ اگر یہی بات 1877 میں ہوئی ہوتی اور فصلوں کو بارش ہونے سے قبل کاٹ لیا جاتا تو ان

فصلوں کو بچایا جا سکتا تھا۔ اکثر اوقات یہ بات میرے ذہن میں آئی ہے کہ اگر خزاں کی کٹائی کے وقت دیہاتی عارضی پناہ گاہیں تعمیر کرلیں تو چاول اور مکئی کی فصلوں کو کاٹنے کے بعد ڈھانپ کر رکھا جا سکتا ہے۔ اگر 1877 کی مانند بارش تین ماہ تک بھی ہوتی رہے تو فصل کا کچھ حصہ بچا کر رکھا جا سکتا ہے۔ جن برسوں کے دوران رک رک کر بارش ہوتی ہے ان برسوں میں پناہ گاہوں کی تعمیر سے دھان کی کٹائی بہتر حالت میں ہو سکتی ہے۔ چاول اور مکئی کی فصلوں کو کاٹ کر نمی کی حالت میں بوریوں میں بند کیا۔ سڑنے کا عمل شروع ہوا اور دانہ سیاہ ہو کر بڑھ گیا۔ جب یہ بات ظاہر ہوگئی کہ کھانے کے لیے چاول یا دھان موجود نہیں ہے تو شہری عوام کے لیے جو کا ذخیرہ 1.40 روپے فی خروار کے حساب سے جاری کیا گیا۔ درمیانہ دار فوراً جو اور گندم لے آئے اور بعد ازاں ان کا پرچون نرخ انیس روپے مقرر کر دیا۔ جیسے جیسے موسم سرما قریب آتا گیا ہل چلانے والے مویشی چارے کی نایابی کی وجہ سے دم توڑنے لگے۔ 1878 میں حکام نے فصل خریف کے لیے بیج حاصل کرنے میں دیر کر دی۔ بدقسمتی سے ان بیجوں کا آرڈر سرچ ہاؤسز کو دیا گیا اور اب تک لوگ اس قدر مایوس ہو چکے تھے کہ انہوں نے اپنے ذخیرے حریص اور بے اصول حکومتی اہلکاروں کو سونپنے کے بجائے زمین بوس کر دیئے یا انہیں دریا میں ڈبو دیا۔ 1878 کی فصل بہار کے دوران گندم اور جو کی جو واحد امید باقی تھی وہ بھی بارشوں کے سبب فصلوں کو نقصان پہنچنے سے موہوم ہوگئی اور جو باقی بچا تھا اس میں سے بہت کم کاشتکاروں کے پاس پہنچنے دیا گیا۔ بھاری بارشوں نے پھلوں کے درختوں کو بھی نقصان پہنچایا اور بھوکے لوگ انار اور ناشپاتیوں پر ٹوٹ پڑے۔ اس کے بعد شہتوت کے ناپختہ پھل، بعد ازاں گھاس اور دلدلی زمینوں اور جنگلوں کی باری آتی رہی۔ دانے دار اور سدابہار درختوں بو اور ایلم درختوں کے تنوں کو پیس کر آٹے کی صورت دی گئی اور جو لوگ جنگلوں کے قریب رہائش پذیر تھے انہوں نے جڑی بوٹیوں اور بلا چربی دودھ پر گزارہ کیا مگر دودھ کے بغیر جڑی بوٹیوں کی خوراک مہلک ثابت ہوئی۔ 1878 کے موسم گرما تک قحط اپنے غضب کی صورت میں بڑھتا رہا۔ تجہیز و تکفین کے بغیر پڑی ہوئی لاشیں لاچاری اور بے کسی کی کیفیت بیان کر رہی تھیں۔ یہ ایک ہیبت ناک تصویر تھی۔ لاشوں کے انباروں سے کنوئیں اور سوراخ بند ہو چکے تھے اور انسانی لاشیں کتوں کا شکار بن چکی تھیں۔ سب سے زیادہ مصیبت پہاڑوں پر آباد گوجروں پر ٹوٹی تھی۔ یتیم

دوشیزائیں شہر کے دلالوں کو فروخت کی گئیں۔ تمام مملکت کے اطراف و اکناف میں دہشت کا دور دورہ تھا۔ آدمی کبھی نہیں چاہتے تھے کہ خوراک کا تھوڑا بہت ذخیرہ جوان کے پاس بچا ہے وہ اپنے رشتے داروں کے ساتھ بانٹ لیں۔ اور جو کچھ بھی ان کے ہاتھ لگتا وہ اس پر ٹوٹ پڑتے۔ عام حالات میں ایک دن کی خوراک کے لیے ایک سیر چاول کافی ہوتا ہے مگر لوگ اس سے دوگنی مقدار میں چاول کھا جانے کے بعد بھی خود کو بھوکا محسوس کرتے گویا ہر ایک جسم میں کوئی جن یا بھوت گھس چکا تھا جس کو خوراک میسر کرنا لازمی تھا۔ بہت سارے افراد نے پنجاب بھاگ جانے کی کوشش کی مگر عوام کی نقل مکانی کا سدباب کرنے کے لیے بے رحم فوجی تعینات کیے گئے تھے۔ مختلف درّوں پر تعینات محافظوں کو کنبوں کے والدین کی طرف سے رشوت دینے کی ہولناک داستانیں بیان کی جاتی ہیں تاکہ وہ یہاں سے گزر نکل سکیں۔ ان حالات میں وادی میں بیوی بچوں کو مرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ جب وادی میں سبزیاں ختم ہوگئیں تو لوگوں نے کھلی کی ٹکیاں اور چاول کا بھوسہ کھانا شروع کر دیا جس سے اجل کا کام آسان ہوگا۔ چنانچہ کافی عرصہ گزر جانے کے بعد نیم دلی سے قحط سالی سے راحت پہنچانے کے اقدامات شروع کیے گئے۔ کئی خیراتی خانے قائم کیے گئے اور غلّہ پنجاب سے درآمد کیا گیا مگر اس غلّے کی تقسیم کے لیے ایجنسی راشی ثابت ہوئی۔ اہلکاروں نے غلّے میں گندگی کی ملاوٹ کر کے کافی مال خرد و برد کر دیا اور یہ غلہ دولت مند افراد میں پچیس روپے فی خروار کے حساب سے فروخت کیا گیا۔ 1878 میں راہ داری کا وہ طریقہ ترک کر دیا گیا جس کے مطابق کوئی بھی شخص بلا اجازت وادی سے باہر نہیں جا سکتا اور جو لاغر لوگ بچ گئے تھے وہ ان درّوں سے گرتے پڑتے پنجاب پہنچے۔ بہت سارے راستے میں جاں بحق ہو گئے۔ دیہات میں اموات کی شرح کافی زیادہ تھی۔ شہر کے اندر بدقسمت شال باف اس قحط کا زیادہ شکار ہو گئے۔ یہاں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ہندوؤں میں فاقہ کشی کے سبب نسبتاً کم اموات ہوئیں۔ مسلمان پنڈتوں کے بچ جانے کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ وہ ایک اعلیٰ طبقہ خیال کیے جاتے تھے اور جو غلہ میسر تھا وہ انہیں بھاری مقدار میں حاصل ہوا مگر انصاف کے تقاضے کے پیشِ نظر یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ مسلمانوں کی نسبت کشمیر کے ہندو خوراک کے معاملے میں زیادہ نفاست پسند ہیں اور انھیں فاقہ کشی (برت رکھنے) کی عادت ہے۔ 1878 کے قحط کی ہیبت ناکیوں کو دہرانا چند حکومتی اہلکاروں

کی عیاری پر تبصرہ کرنا یہاں پر واجب نہیں ہوگا۔ جنھوں نے محض دولت کمانے کے لیے بے اعتنائی سے کام لیا تھا۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے عوام کو بچانے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا مگر 1878 تک اس تباہی کی حقیقی اصلیت اسے معلوم نہیں ہوسکی۔ اس کو غلط اطلاعات فراہم کر کے باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ فاقہ کشی کے سبب کوئی اموات واقع نہیں ہوئی ہیں جب مہاراجہ کو معلوم ہوا ہے کہ ہزاروں کی تعداد میں لوگ ہلاک ہورہے ہیں تو اس نے دولت کے معاملے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ اگر چہ کافی تاخیر کے بعد غلہ پہنچا تو اس کا سبب سڑکوں کی خستہ حالت تھی۔ اس تاخیر سے ہی سہی اگر اس غلّے کی عوام میں منصفانہ تقسیم ہوتی تو بھاری تعداد میں اموات کو روکا جاسکتا تھا۔ بدقسمتی سے کشمیر میں حکومتی اہلکاروں پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا اور مہاراجہ کی دی ہوئی خیرات ان لوگوں کے لیے ذاتی فائدے کا ایک ذریعہ بن کر رہ گئی۔ یہاں تک کہ شلغم کا جو بیج بھاری مقدار میں کشمیر بھیجا گیا اسے راستے میں بے ضمیر افراد نے چھین لیا اور اس کے بجائے دیہاتیوں میں تلہن کا بیج فروخت کیا گیا۔ قحط سالی کی ہیبت ناکیاں اکتوبر 1879 تک جاری رہیں۔ بہت سارے افراد کو غلے کی درآمد سے اور فصل کی اچھی کٹائی کے بعد بچالیا گیا۔ جون میں حالات خراب ہونے کے آثار پیدا ہوئے اور یہ حال اگست کے مہینے تک جاری رہا جب تک کہ فصلوں کو بروقت بارش سے بچالیا گیا۔ یہ کہنا محال ہے کہ آیا اس بات کا صحیح اندازہ تھا کہ قحط سالی سے صرف دو بٹہ پانچ آبادی ہی بچ سکی۔ مگر یہ بات درست ہے کہ جب میں نے 1879 میں دیہات کے معائنے کا کام شروع کیا تو شاید ہی ایسا کوئی گاؤں ہوگا جہاں میں نے متروکہ گھروں اور کھیتوں کو نہیں دیکھا ہو۔ ان کی تاریخ میں یہ ایک اہم سنگ میل ہے کہ میری بندوبست کی کارروائیوں کے بعد اور دربار کے احکامات کے تحت 1878 کے ان مفرور لوگوں کو موروثی زمینوں کے حقوق زائد از دس برس کے بعد واپس دے دیے گئے جو واپس آ گئے تھے۔

اگر چہ بے موسم بارشیں اور برف باری ہوتی رہی جب مکئی اور دھان کی فصلیں درانتی کے لئے تیار رہیں مگر میرے خیال میں یہ ممکن نہیں کہ مستقبل میں کشمیر کو اس قسم کی کسی قحط سالی کا سامنا کرنا پڑے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ایک طرف کاشکاروں کے تئیں حکومت کی پالیسی میں بھاری تبدیلی واقع ہوئی ہے اور یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ چھ لاکھ پچانوے ہزار دوسو اکاسی کاشکاروں

کے مفادات کو قربان کرنا بری اقتصادیات کے مترادف ہوگا مگر 1878 میں ذمہ دار اہلکاروں کے ایک طبقے کو قحط سالی کی ہیبت سے بچانا دوسری بات تھی کیونکہ کاشتکاروں کے تئیں کوئی رحم نہیں برتا گیا۔ ایک ہوشیار اور دانشمند تحصیلدار کے راستے میں اگر شہری ضروریات کی رخنہ اندازی نہ ہوتی تو اس نے اپنے دیہاتوں کو یکجا رکھا ہوتا۔ جنگلات میں دستیاب جنگلی پھلوں سے اس نے فائدہ اٹھایا ہوتا اور لوگوں کو اس بات پر آمادہ کیا ہوتا کہ پختہ ہونے سے پہلے وہ پھلوں کو نہ توڑیں۔ مگر لوگ افراتفری اور گھبراہٹ کے شکار ہوگئے اور ان کی رہبری کرنے والا کوئی نہیں تھا اور ہر شخص کو یہی فکر تھی کہ صرف شہروں کی اعانت ہی کی جارہی ہے اور جب جو اور گندم کی فصل پک کر تیار ہوگئی تو فصلوں کی فراخدلانہ تقسیم کے ذریعے کاشتکاروں کی حوصلہ افزائی ایک سیاسی اقدام کے ساتھ رحم دلانہ اقدام ہوتا مگر حکومتی مشاہدین اس قدر طاقتور تھے اور 1878 میں ان کی حرص و ہوس اس قدر بڑھ گئی تھی کہ وہ رات دن فصلوں کے پختہ ہونے کا انتظار کرتے رہے اور آخر کار فاقہ کشی کے شکار عوام کو ان کی کاٹی ہوئی فصل کا مشکل سے ایک چوتھائی حصہ دیا۔ یہ تعجب کی نہیں کہ جن لوگوں کے آس پاس مردہ یا مرنے والے افراد تھے وہ کس بے رحمی سے دل شکستہ ہوئے ہوں گے۔ وہ اس کوشش میں ہوں گے کہ کسی طور وہ یہاں سے نکل کر پنجاب کی طرف فرار ہو جائیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ راحتی اقدامات شروع کرنے کے لیے نہ کوئی کوشش کی گئی اور نہ ہی کسی تنظیم کی تشکیل دی گئی اور اس زرخیز ملک میں جہاں آلو، شلغم، گاجر، سب کچھ جلد از جلد پیدا ہوسکتا تھا وہاں لوگ محض فصلوں کے ناکام ہونے سے مایوس ہوا اور دلبرداشتہ ہوکر رہ گئے۔ یہ بات سوچنے کی ہے کہ قحط سالی کی امداد کے کس قدر بہترین کام وادی میں سرانجام دیے جارہے ہیں پھر بھی جانوں کا نقصان ہوا اور تمام تر محنت اور توانائی اکارت گئی۔ 1878 میں تباہ شدہ آب پاشی کی نہروں کی تجدید ہوسکتی تھی، سڑکوں کی مرمت کا کام ہوسکتا تھا۔ خاص طور پر ایسے وقت میں جب ہزاروں کی تعداد میں لوگ مرگ ناگہانی کا انتظار کررہے تھے۔ اگر کبھی آئندہ وادی میں قحط سالی کا خطرہ پیدا ہوا تو آسانی سے کہا جاسکتا ہے کہ اس صورتحال کا مقابلہ کرنے اور اسے روکنے کے لئے کوئی تنظیم موجود ہوگی۔ سوئم یہ کہ وہ قدیم طریقہ جس کے مطابق حکومتی اجازت کے بغیر کسی کو بھی فصل کاٹ کر لے جانے کی اجازت نہیں تھی، اب یہ رواج ختم کر دیا گیا ہے۔ اب ہر کاشت کار فصلوں کو اپنے گھر کے اندر خشک

کر سکتا ہے اور آخری بات یہ کہ اب ہندوستان تک ایک بیل گاڑی سڑک جاتی ہے جہاں سے اب قلت کے دوران غلّہ درآمد کیا جا سکتا ہے اور میرے خیال میں صرف یہی اقدام 1878 جیسے تباہ کن قحط کے دوبارہ رونما ہونے سے بچا سکتا ہے۔ بارہ مولہ سے راولپنڈی تک ایک لمبا راستہ ہے اور مستند سیاسی ماہرین اقتصادیات کی برآمدات کی مخالفت کرتے ہیں۔ یہاں پر میں یہ بات کہنے کی جسارت کروں گا کہ جب تک ریاست کا ہندوستان کے ساتھ ریلوے راستہ قائم نہیں ہو جاتا تب تک حکومت وادی کشمیر کی اہم غذا چاول کی برآمد پر پابندی لگانے میں حق بجانب ہے۔ 1878 کی قحط سالی سے تجربات حاصل کئے گئے ہیں کہ خانہ تلاشیوں کا حکم جاری کرنا ایک مہلک امر ہوگا اور تمام طبقات کے لوگوں کے ساتھ میں متعدد مذاکرات کئے ہیں۔ اور غلے کی تلاش میں خانہ تلاشیوں کے معاملے پر عوام نے جو زور دیا میں اس سے کافی حد تک متاثر ہوا کہ 1878 کے موسم بہار کے دوران کی گئی ان خانہ تلاشیوں کے سبب ہی قلت نے قحط سالی کی صورت اختیار کر لی۔ اور ایک بات جو مستقبل کی کسی حقیقی قحط سالی سے نمٹنے کے معاملے میں غور طلب ہے وہ یہ ہے کہ 1878 تک حکومت کی یہ پالیسی رہی ہے کہ کسانوں کے پاس زیادہ اناج نہ رہنے دیا جائے۔ ان سے جو کچھ لیا جاتا اسے سرینگر لایا جاتا اور ایسے ذخیرہ خانوں میں رکھا جاتا جن میں پانی ٹپکتا تھا چنانچہ یہ اناج غذائی مقاصد سے ناقابل استعمال ہو کر رہ جاتا۔ نئے بندوبست کے مطابق خاطر خواہ مقدار میں غلہ اب ہر سال دیہات کے پاس رہتا ہے۔ اس سے قبل اس امر سے وادی کے لوگ واقف نہیں تھے مگر اب لوگوں میں بچت کی عادت پڑ گئی ہے۔ اگر بچت کے اس رجحان کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے اور اگر کبھی مستقبل میں قحط سالی کا مسئلہ درپیش آتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ سبھی دیہاتی اسی صورت حال کا مل کر مقابلہ کریں گے اور آئندہ فصل ربیع تک انسانوں اور حیوانوں کے زندہ رہنے کے لیے وافر مقدار میں غلہ اور گھاس کا چارہ موجود ہوگا۔ قحط سالی سے راحتی اقدامات کی شروعات اور پنجاب سے غلہ درآمد کرنے سے قبل اس قسم کی دشت نوردی کا سامنا نہیں ہوگا۔

آخری بات یہ کہ کشمیر جیسی مملکت کے لیے سڑک کے ذریعے الگ تھلگ ہونے کے باوجود کبھی مستقبل کی کسی قحط سالی کا مقابلہ کرنا ناممکنات میں شامل نہیں ہوگا بشرطیکہ یہاں کا انتظامیہ مقامی طور پر دستیاب وسائل کا صحیح طور پر استعمال کرے۔ اگر سنگھاڑوں کے علاوہ تالابوں اور

جھیلوںؔ کی مصنوعات کے علاوہ جنگلی پیداوار اور پھلوں کے اُن باغات کو خاطر میں نہ لایا جائے جو کشمیر کے اطراف واکناف میں پھیلے ہوئے ہیں تاہم آلو، شلغم اور گاجر کی پیداوار بڑھا کر اس بارے میں بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔ زراعت کے باب میں ہم دیکھیں گے کہ دیہات میں سبزیوں کے باغات کو بہتر بنانے کی کافی گنجائش ہے اور یہ کام سرینگر کے نواح میں بیج کے کھیت قائم کر کے انجام دیا جا سکتا ہے۔ اگر کشمیر کی آبادی کو قحط سالی سے بچانا ہے تو قلت سے نمٹنے کے لیے ایک پالیسی مرتب کرنا ہوگی۔ 1877 میں اس مملکت میں غلے کے انباروں کی بابت جو بھی تخمینے لگائے گئے تھے وہ محض قیاس آرائی پر مبنی تھے۔ یہ صورت حال اب بدل چکی ہے اور حکومت کے پاس اب ان تمام معاملوں کے حوالے سے معلومات موجود ہیں۔ قابل اعتبار اعداد وشمار کی عدم موجودگی میں یہ بات کہنا ناممکن ہے کہ آبادی 1877 کی قحط سالی کے مساوی ہی زیادہ ہے مگر یہ بات آسانی سے کہی جا سکتی ہے کہ آبادی کی مناسب نشو ونما اب بھی کافی حد تک غائب ہے اور مالیہ اراضی کے مفادات میں بھی یہ لازم ہے کہ ان تمام اسباب کا سد باب کیا جائے جو قحط سالی کے طور پر اس قدر اندوہ ناک اموات کے طور پر رونما ہوئے تھے۔ بہت سے لوگوں کے علم میں یہ بات بھی آئی ہے کہ بہت ساری کشمیری خواتین کافی اولاد خیز ہیں۔ ایک شاہد نے اس بیان کو تسلیم کیا کہ ہر عورت کے اوسطاً دس سے چودہ بچے ہوتے ہیں۔

ہیضہ

وادیٔ کشمیر میں بچوں کی بھاری تعداد ہے۔ یہاں پر قحط سالی، چیچک وغیرہ کے علاوہ اس مادی تاریخ میں جس آخری موضوع کی بات کرنے جا رہا ہوں وہ ہیضہ ہے۔ کشمیر کی آبادی جلد ہی اس دھرتی کو آباد کرنے کے لیے کافی ہو جائے گی۔ آبادی کے سوال پر بات کرتے ہوئے بہت سارے کشمیری اگرچہ کشمیری خواتین کی زرخیزی کو تسلیم کرتے ہیں مگر اس کے ساتھ ہی وہ کہتے ہیں کہ خدا اپنا حصہ لے جاتا ہے اور بدقسمتی سے یہ ایک حقیقت ہے۔ مگر اس سوال پر کہیں اور بحث کی جائے گی۔ مگر بچوں کی اموات کے اور بھی بہت سارے اسباب ہیں جن میں چیچک اور سرد موسم شامل ہیں۔ میرے خیال میں ہیضے کی وبا نے کشمیر کی مادی تاریخ میں اپنا مقام حاصل کر لیا ہے جہاں تک میں تعین کر سکا ہوں ہیضے کا پہلا ذکر 1598 میں ملتا ہے۔ اس سے پہلے اس بیماری کے

بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا۔ اگر جانتا بھی تھا تو اس کا نام موجودہ 'وبا' سے مختلف تھا۔ موجودہ صدی کے دوران ہیضے کی وبا دس مرتبہ پھوٹ چکی ہے اور قریباً سبھی وبائیں کشمیری عوام کے لیے تباہی کا موجب ثابت ہوئی ہیں ان میں سے 1892 کے دوران رونما ہوئی ہیضے کی وبا شاید آخری اور بدترین ہے۔ کشمیر کے چیف میڈیکل آفیسر کا بیان ہے کہ کشمیر میں پانچ ہزار سات سو اکاسی (5,781) افراد جاں بحق ہوئے ہیں اس کے علاوہ پانچ ہزار نو سو اکتیس افراد دیہات میں چل بسے۔ اس وبا کے دوران میں اپنے کیمپ میں تھا اور بہت سارے متاثرہ مرکزوں سے ہو کر گزرا۔ میرا عقیدہ ہے کہ افراتفری کے سبب رجسٹریشن کا کام دیہات میں اس قدر محتاط نہیں تھا جتنا کہ شہر میں کیا گیا۔ چنانچہ دیہات میں پانچ ہزار نو سو اکیس اموات۔ وادی میں ہیضے کے سبب ہونے والی اموات کی پوری تفصیل دستیاب نہیں ہے۔ میری واقفیت کے مطابق چند دیہات میں بہت سارے کنبوں میں بھاری تعداد میں خالی مقامات چھوڑ دیے گئے ہیں۔ اگرچہ ہیضہ کے سبب مالیہ اراضی کو معاف کرنا لازمی نہیں تھا مگر ہیضہ نے کئی برسوں تک متعدد گاؤں کی خوشحالی کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ اس بات پر عام اتفاق ہے کہ کشمیر میں ہیضہ پھیلنے کا مرکز یہاں کا گندہ دارالحکومت سرینگر ہے اور ایک دفعہ جب یہ وبا یہاں پھیلتی ہے تو یہ جلدی ہی گندے قصبوں میں اور اس کے بعد دیہات میں پھیل جاتی ہے۔ نہ کوئی دوا اور نہ ہی کوئی طبی ادارہ کارگر ثابت ہوتا ہے اور لوگ چپ چاپ بیٹھ کر اس وقت کا انتظار کرتے ہیں جب طاعون ان کا خاتمہ کر ڈالتا ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ اپنے دورے کے دوران میری دانست میں آیا کہ کریوہ جات پر میدانوں میں واقع دیہات ہیضے سے پاک تھے مگر وادی کے دلدلی حصوں میں یہ بیماری بکثرت پائی جاتی ہے۔ کشمیر میں ہیضے کے سوال پر بااختیار حکام نے تفصیلی بحث کی ہے اور سبھی کی یہ رائے ہے کہ سرینگر شہر کو صاف کر کے اس کی حالت بدلنے کی خاطر کچھ نہ کچھ لازمی طور پر کیا جانا چاہیے۔ چند لوگوں کا کہنا ہے کہ اگر سخت گیر اقدامات کیے گئے تو ہیضہ وبائی صورت اختیار کرے گا۔ اب چونکہ سرینگر بذریعہ سڑک ہندوستان کے ساتھ منسلک ہو گیا ہے چنانچہ صحت وصفائی سے متعلقہ اصلاحات کی ضرورت دوگنی ہو جاتی ہے کیونکہ اگر پنجاب میں ہیضہ موجود ہوتا ہے تو راولپنڈی کی عظیم چھاؤنی کو ہمیشہ خطرہ لاحق رہے گا' دوسری طرف اگر ہندوستان میں ہیضے کی وبا پھوٹ پڑتی ہے تو اس کے بعد یہ کشمیر میں بھی

رونما ہوگی کیونکہ تجارت کی مانند ہیضہ بھی سڑک کے ذریعے وارد ہوتا ہے۔ جب تک بارہ مولہ سے پنجاب تک سڑک چالو نہیں ہوتی تھی تب تک ہندوستان میں ہیضے کی وبا پھوٹنے پر بھی کشمیر تندرست رہتا۔ حالانکہ 1867 سے 1890 کے دوران پنجاب میں ہیضے کی وبا بارہ مرتبہ پھوٹ پڑی تھی مگر اس عرصے کے دوران کشمیر میں صرف پانچ مرتبہ ہیضہ رونما ہوا۔ اب یہ بات یقینی ہوگئی ہے کہ ہیضہ پنجاب تک پہنچتا ہے تو سڑک کے ذریعے یہ وبا تنگ وادی سے ہوتی ہوئی سرینگر پہنچ جائے گا۔ میں نے اوپر بیان کیا ہے کہ اگر یہ بیماری سرینگر کی موافق گندگی میں ایک دفعہ گھر کر لیتی ہے تو یہ گاؤں تک پھیل جاتی ہے جس سے ریاست کے مالیہ اراضی دہندگان کاشتکاروں کی بھاری تعداد میں اموات ہوتی ہے اور جیسا کہ میں زور دے چکا ہوں کہ مالیہ اراضی کے مفادات میں ہی سہی تو قحط سالی کو روکنا ہی سیاسی مصلحت ہوگی اور قحط سالی کے سبب مالیات کا شیرازہ بکھر جاتا ہے اور یہ لازمی ہو جاتا ہے کہ سرینگر کی مالیاتی اعتبار سے بھی صفائی کی جائے تاکہ ہیضے کا جو خطرہ ہر وقت منڈلاتا رہتا ہے اسے دور کر دیا جائے۔ میں اس میں یہ اضافہ کروں گا کہ بارہ مولہ سے سوپور کی صفائی بھی لازمی ہے کیونکہ سرینگر اور ہندوستان کے درمیان جو مواصلاتی راستہ ہے اس پر یہ دونوں گندے قصبے واقع ہیں۔ اس سے بھی زیادہ مالیہ اراضی کا پہلو ہے جس کے سبب حکومت قحط سالی اور ہیضے کے معاملے میں اپنا گھر لازمی طور پر درست کرے گی۔ اول الذکر ہولناکیوں سے میں واقف ہوں، میں نے ان دیہاتوں کو واضح شہادت اور باتوں کو بھی کانوں سے سنا ہے جو ان دیہاتیوں نے بیان کی ہیں۔ جو کاشت کو چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے تھے مگر ہیضے کے سبب ہونے والی تباہی اور دل شکنی کا میں چشم دید شاہد ہوں۔ ڈی فو کی کتاب ''پلیگ آف لندن'' سے مظہر ہے کہ ایک انگریزی کردار ضرر رسانی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس بات میں تعجب نہیں کہ مستحکم مشرقی افراد کو 1892 جیسا عذاب توازن کھونے پر مجبور کر دیتا۔ تمام دکانیں بند تھیں اور جو کھلی تھیں وہ صرف سفید کپڑا فروخت کرنے والوں کی تھیں جو لاشوں کو لپٹنے کے کام آتا تھا۔ آدمی کسی کو قرض نہیں دیتے تھے اور وہ خاموشی کے ساتھ دن بھر قبرستانوں پر بیٹھے رہتے۔ دن کے وقت لوگ باغوں اور پارکوں یا شہر کے باہر چلے جاتے اور رات کو گھر لوٹتے تاکہ ان دوستوں کی بات جان سکتے جو دن کے دوران چل بسے ہوتے۔ قبروں کی لمبی قطاروں سے معلوم ہوتا کہ بے شمار افراد جمع ہو رہے ہیں

جبکہ دریاؤں میں کشتیوں کا جلوس شمشان گھاٹوں کی طرف رواں دواں ہوتا اور ان کے قریب سے گزرنے والی کشتیوں میں بیٹھے مسافروں کے چہرے اُترے ہوتے جب آدمی مجھے یہ بات بتاتے کہ کس طرح ان کے کنبے کے تمام افراد لقمۂ اجل بن گئے تو وہ دیوانہ وار قہقہے لگانے لگتے۔ میں نے کبھی اس قدر خوفناک ناامیدی نہیں دیکھی تھی جتنی 1892 میں محسوس کی۔

اختتامیہ

جہاں یہ بات یادرکھنا لازمی ہے کہ یہ آفات شاذ ونادر رونما ہونے والے واقعات نہیں ہیں اور ایک نسل کی زندگی میں آتشزدگیاں، طغیانیاں، زلزلے، قحط سالیاں اور ہیضے کا رونما ہونا ہمیشہ متوقع امر ہے وہاں اس معاملے میں اہل کشمیر کے ساتھ رعایت برتی جانی چاہیے (2)۔ میرے پاس اس بات کا یقین کرنے والا کوئی ذریعہ نہیں کہ آیا دیگر علاقوں کے لوگ جن میں زلزلوں اور دیگر تباہ کاریوں کی نذر ہونے والے لوگ بھی ہیں اُن علاقوں کے برعکس کم مضبوط کردار والے ہیں جہاں کے عوام ان عذابوں سے بچے رہتے ہیں۔؟ مگر میرے خیال میں کشمیریوں کے مزاج کے بارے میں افسوس ہی سے کام لینا پڑے گا۔ کیونکہ وہ برابر خدشات، تفکرات اور شبہات میں مبتلا رہتے ہیں اور اس ملک کے مذاہب نے ان میں اور اضافہ کر دیا ہے۔

ماضی میں یہاں پر حکومت نے دیانتداری اور حکام کی نیک دلی کے اعتماد کو زبردست ٹھیس پہنچائی ہے اور اس پر طرۃ یہ کہ جب ناگہانی آفات بار بار آتی ہیں تو اُن لوگوں کے دلوں میں آفاقی نظام پر اعتبار کم ہو جاتا ہے۔ توہم پرستی کے سبب کشمیری بزدل بن کے رہ گئے ہیں۔ جبر اور ظلم نے انھیں دروغ گو اور مادی تباہیوں نے انھیں خودغرض بنادیا ہے۔ اس طرح سے نیکی کے وجود پر ان کا عقیدہ کم ہوتا گیا ہے۔

آتش زدگیاں، سیلاب، قحط اور بیماریاں وغیرہ قابو تو جاسکتی ہیں جس سے قدرتی طور پر کشمیر کے اُن باشندوں کی اخلاقی بہتری پیدا ہوسکتی ہے جنھیں بدنام کیا جاتا ہے بشرطیکہ اُن پر رحم کیا جائے۔ لہٰذا حکومت کو ان مصائب کا مقابلہ کرنا چاہیے۔

●❁❁❁●

حوالہ جات

(1) وادی کی بیضوی شکل اس بات کی دلیل ہے کہ وادی بھونچال کے بعد ہی جھیل کے پانی سے خشک ہوئی تھی۔

(2) مثلاً پٹن کی بات کریں۔ یہ گاؤں سرینگر سے بارہ مولہ کی جانب نصف راستے پر واقع ہے۔ اس کی آبادی ایک سو پینسٹھ کنبوں پر مشتمل ہے۔ 1885 میں سروے کرنے والے افراد زلزلے میں ختم ہو گئے۔ 1892 میں پچپن افراد ہیضے کا شکار ہوئے۔ یہ بات برسوں کا خوفناک ریکارڈ ہے اور کسی بھی طرح یہ کوئی غیر معمولی اعداد و شمار نہیں ہے۔

●❊❊❊●

نواں باب

اعداد وشمار

1891 کے مالیاتی بندوبست اور مردم شماری سے پہلے وادیٔ کشمیر کے بارے میں اعداد وشمار فراہم کرنا اگرچہ ناممکن نہیں تھا مگر محال ضرور ہے۔ اکبر کا عظیم ماہر شماریات آئین اکبری میں صوبہ کشمیر کے لیے مجموعی طور پر اعداد وشمار پیش کرتا ہے۔ وادی اس کا چھوٹا حصہ تھا جس کی حدوں کا نامکمل طور پر تعین کیا گیا تھا۔ اس کے بعد ان کی تواریخیں اور تحریریں مبہم اعداد وشمار فراہم کرتی ہیں۔ جس میں تحقیقات کا کوئی طریقہ کار نظر نہیں آتا۔ آبادی کے تمام اعداد وشمار کو بعض قیاس آرائیوں کی بنا پر پیش کر کے انھیں پیچیدہ بنا دیا ہے۔ اس بات کا کوئی معقول خلاصہ بھی نہیں کیا گیا ہے کہ اس خطے کا جغرافیائی نام کشمیر تھا۔ جہاں تک کشمیر کے مالیہ کے بارے میں اعداد وشمار فراہم کیا گیا ہے وہاں یہ بات یاد رکھنا لازمی ہے کہ یکے بعد دیگرے آنے والے ہر خاندان نے وادی کے مالی وسائل کے بارے میں مبالغہ آمیزی سے کام لیا اور یہ بھی کوشش کی کہ مبالغہ آمیز تخمینہ جات کے مطابق مالیہ جمع کیا جائے۔ یہاں پر اس بات کو یاد رکھنا ضروری ہے کہ یہاں ایک قدیم رواج ہے کہ کشمیر کے حکومتی اہلکار حساب کتاب کو اس انداز سے توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں کہ اُن کے آقاؤں سے یہ بات پوشیدہ رہے کہ آیا مالیہ معمول کے مطابق تھا۔ وہ یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ مالیہ کم وصول ہوا ہے، جو بھاری آمدنی دکھائی گئی ہے اس کا وجود محض کاغذی ہے۔ یہ ایک ایسی بات ہے کہ جہاں مشرق میں آمدنی کو کم دکھایا جاتا ہے کیونکہ مشرقی حکومتیں اپنے

وسائل کو بڑھانے کی عادی ہوتی ہیں اور ایک خود دار محتسب اُن اعداد وشمار کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتا ہے جو مجموعی اندازے کے نصف کے برابر ہوتے ہیں اس پر مغل سبحانی اکبر نے معمولی سی مہربانی کی ہوگی۔ آبادی کی اکثریت سے وصول ہونے والا بھاری مالیہ اراضی لازماً اس مشرقی حکمران کو بھی عزیز تر ہوگا اور میرا خیال ہے کہ کشمیر کی مالی صلاحیت کے بارے میں مبالغہ آمیز اندازے، اسی جذبے کے عین مطابق ہوں گے۔ ایک بار پھر کشمیری اہلکار اس مملکت کے وسائل کا حساب لگانے کے معاملے میں اوسط کے نقطۂ نظر سے قابل مذمت اور غلط طریقے بروئے کار لاتے ہیں۔ اگر کبھی غیر معمولی پیداوار ہوئی تو گورنر نے بہت بڑا مالیہ وصول کر لیا۔ وہ اسی کو معیاری تسلیم کرتے ہوئے اپنے حساب کتاب سے قحط سالی، سیلابوں اور آفات کے برسوں کو یکسر حذف کر دیتے ہیں۔ ایک ملک کے مثبت پہلو کو اُجاگر کرنا ایک اچھی بات ہے مگر اعداد وشمار میں حقیقی صورت ظاہر ہونی چاہیے۔ جس طرح اکبر کے ماہر شماریات نے کابل اور قندھار کو صوبہ کشمیر میں شامل کیا تھا اور حال ہی میں یہ بات بھی سننے میں آئی ہے کہ جموں کے چند علاقے بھی کشمیر میں شامل کیے گئے ہیں۔ اور موٹے تخمینہ جات سے اس بات کا تعین محال ہو جاتا ہے کیونکہ یہ بکھری ہوئی تحریروں کی صورت میں ملتی ہیں۔ چنانچہ ان تخمینہ جات کو وادیٔ کشمیر کے کھاتے میں ڈالا جائے۔ مستقبل میں کسی غلطی کی پیش بندی کے لیے میں اس بات کا خلاصہ کر دوں کہ وادی کو اس رپورٹ میں کس طرح پیش کیا گیا۔

اس باب میں کشمیر تین وزارتوں یا اضلاع، خاص، اننت ناگ اور سوپور پر مشتمل ہے جس میں بارہ مولہ سے نیچے کا ضلع مظفر آباد شامل نہیں ہے۔ جب میں نے کشمیر پر کام شروع کیا تو اس وقت وادی میں تین وزارتیں، خاص اننت ناگ اور سوپور شامل تھیں۔ وادی میں پندرہ تحصیلیں ہیں جن کی تقسیم درجہ ذیل ہے۔

1۔ وزارتِ خاص

1۔ خاص

2۔ اچھ ناگام

3۔ ڈونسو مانچھامہ

4۔ ولرو ہو

	5۔ چیراٹ
	6۔ انت ناگ
2۔ وزارتِ انت ناگ	7۔ سری رنبیر سنگھ پورہ
	8۔ دیوسر
	9۔ ڈچھن پارہ
	10۔ شوپیان
3۔ سوپور یا کامراج	11۔ لال
	12۔ بلمت پورہ
	13۔ اُترمچھی پورہ
	14۔ بیروہ ناگام
	15۔ کرہون

میں نے ان تینوں وزارتوں کو قائم رکھا ہے مگر تحصیلوں کی تعداد بارہ کر دی ہے۔

1۔ خاص وزارت	1۔ لال پھک
	2۔ سرینگر
	3۔ سری پرتاپ سنگھ پورہ
	4۔ ناگام
2۔ انت ناگ وزارت	5۔ اونتی پورہ
	6۔ انت ناگ
	7۔ ہری پورہ
	8۔ سری رنبیر سنگھ پورہ
3۔ سوپور وزارت	9۔ اُترمچھی پورہ
	10۔ سوپور
	11۔ پٹن

یہاں یہ بات کہنا لازمی ہے کہ بندوبست اراضی سے قبل وادی گریز پہلے گلگت صوبے کا ایک حصہ تھی مگر اب سوپور کے حصے کے طور پر اس کا سروے کیا گیا ہے۔ میں نے اس انتظامی ڈویژن میں جو تبدیلیاں کیں ان کی بنیاد دو اصولوں پر تھی۔ اوّل یہ کہ ہر علاقے کا تمام تر آب پاشی طریقۂ کار ایک ہی تحصیلدار کے دائرہ اختیار میں ہو اور دوئم تحصیل کی حد بندی کے لیے دریائے جہلم کا استعمال کیا جائے۔

کشمیر کے مقامی ڈویژن کافی حد تک الگ الگ تھے۔ پرانے زمانے میں یہ مملکت دو حصوں میں منقسم تھی جنوبی حصہ مراج اور شمالی حصے کو کامراج کہا جاتا تھا۔ روایت کے مطابق دو بھائیوں مرہان اور کامران کے درمیان حکومت کے لیے جھگڑا تھا۔ سرینگر کے نیچے کا سارا علاقہ کامان کے قبضے میں چلا گیا جو کامان راج اور مارہان کا علاقہ مرہان راج کے نام سے معروف ہوا۔ ان مقامی ڈویژنوں کو آج بھی لوگ تسلیم کرتے ہیں اور ماراج کے پٹوولی کامراج سے مختلف ہیں اور یہ دونوں یامراج سے مختلف ہیں، جو نام سرینگر کو دیا گیا تھا۔ ان ڈویژنوں میں چونتیس (34) سب ڈویژن تھے۔ جنھیں آج بھی تسلیم کرتے ہیں۔ اگرچہ حکومت نے انتظامی مصلحتوں کے تحت ان کی حدود میں تبدیلیاں کی ہیں مگر قدیم نام اس کے باوجود بھی قائم رہے ہیں۔ رنبیر سنگھ پورہ تحصیل کے لوگ خود کو آئندہ برسوں کے دوران بھی شاہ آباد اور برنگ کا نام دیتے رہیں گے۔ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس مملکت کی 1871 میں پانچ وزارتوں یا اضلاع سرینگر، پٹن، اننت ناگ کامراج اور شوپیان کی صورت میں تقسیم کی گئی۔ بندوبست اراضی کی شروعات سے عین قبل چار اضلاع سرینگر، ہری پورہ یا شوپیان، کامراج اور اننت ناگ رہ گئے تھے۔ ان اضلاع کی اٹھائیس تحصیلات کے تحت دو ہزار چار سو ستاسی گاؤں تھے۔

وادیٔ کشمیر کی تین وزارتوں اور ان کے تحت گیارہ تحصیل ایک انتظامی سربراہ حاکم اعلیٰ یا کشمیر کے گورنر کے ماتحت تھیں۔ یہی افسر گلگت، اسطور اور مظفر آباد کا بھی انتظامی سربراہ تھا جبکہ لداخ اور اسکردو، جموں کے اعلیٰ حاکم کے ماتحت ہیں۔ جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ اس بار جو اعداد و شمار دیے گئے ان میں وادیٔ کشمیر کے تین اضلاع خاص، اننت ناگ اور سوپور شامل ہیں جب کہ مظفر آباد اور اسطور کو ان میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔

آبادی

بیان کیا جاتا ہے کہ 1835 میں وادی کی آبادی دو لاکھ لوگوں سے زیادہ نہیں تھی۔ یہ آبادی سرکاری ظلم اور جبر، زلزلوں، قحط سالیوں اور دیگر آفات کے سبب بیس برسوں کے دوران آٹھ لاکھ نفوس سے کم ہوئی تھی۔

1868 میں سرینگر کی آبادی کی مردم شماری کی گئی مگر اس کے صحیح ہونے پر شک کیا جا رہا ہے۔ اس کے مطابق یہاں کی آبادی ایک لاکھ گیارہ ہزار دو سو پچھتر تھی جن میں سے چوبیس ہزار نو سو پینتالیس ہندو اور ستاسی ہزار سات سو ستر مسلمان تھے۔ رہائیشی گھروں کی تعداد بیس ہزار تین سو چار تھی۔

1873 میں ایک مرتبہ پھر مردم شماری عمل میں لائی گئی جس کے مطابق کشمیر کی کل آبادی بشمول ضلع مظفر آباد چار لاکھ اکانوے ہزار آٹھ سو چھیالیس افراد پر مشتمل تھی۔ بعدازاں 79-1877 میں زبردست قحط سالی کا سامنا ہوا۔ ڈاکٹر ایلمسلی نے میڈیکل مشنری کے طور پر وادی میں چھ برس تک قیام کیا۔ اس کے مطابق اس وادی کی آبادی چار لاکھ دو ہزار سات سو تھی، ان میں سے پچھتر ہزار ہندو اور باقی مسلمان تھے۔ شہر سرینگر میں ایک لاکھ ستائس ہزار چار سو لوگ آباد تھے جب کہ وہی آبادی دو لاکھ پچھتر ہزار تین سو افراد پر مشتمل تھی۔

قحط سالی کے سبب ہونے والی اموات کے بارے میں کوئی صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا مگر دیہاتیوں کے ساتھ اس موضوع پر بات چیت کے بعد میں نے جو تاثر قائم کیا ہے اس کی بنا پر 1879 میں میں نے مندرجہ ذیل تحریر درج کی جس میں کسی قسم کی مبالغہ آمیزی نہیں ہے۔

''اس موسم گرما یعنی (1879) کے دوران آبادی کے بارے میں تخمینہ لگانے کے لیے جس کسی یورپی باشندے نے باریکی سے شہر کا معائنہ کیا اس نے یہاں کی آبادی کو ساٹھ ہزار نفوس سے زیادہ نہیں بتایا مگر صحیح طور پر کچھ پتہ نہیں چلتا۔ شمال کی چند وادیاں مکمل طور پر تباہ ہو گئیں۔ تمام دیہات کھنڈرات بن گئے۔ شہر کے چند بیرونی علاقوں میں خیمے موجود نہیں تھے۔ شہر کا نصف حصہ تباہ ہو چکا تھا۔ قبرستان لاشوں سے بھر چکے تھے اور دریاؤں میں بھی ایسی لاشیں پڑی تھیں جنھیں وہاں پھینک دیا گیا تھا۔ اس بات کا امکان نہیں کہ وادی کے پانچ میں سے دو حصے سے زیادہ افراد

بچ پائے ہوں گے''۔

ڈاکٹر ایلمسلی کے اعداد وشمار صحیح ہو سکتے ہیں کیونکہ قحط سالی کے سبب 67,400 افراد شہر اور ایک 1,74220 افراد دیہات سے غائب ہو گئے ۔ شالوں کے ایک فرانسیسی تاجر کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ پہلے جہاں سرینگر میں تیس ہزار سے چالیس ہزار شال باف موجود تھے وہاں قحط سالی کے بعد صرف چار ہزار شال باف رہ گئے تھے ۔ یہ تاجر سرینگر میں کافی عرصے سے رہائش پذیر تھا۔

1891 کی مردم شماری

1891 کی مردم شماری کے تحت جو اعداد وشمار فراہم کیے گئے ہیں انھیں صحیح مانا جاسکتا ہے۔ ان کے مطابق وادئ کشمیر آٹھ لاکھ چودہ ہزار دوسو اکتالیس نفوس کی آبادی پر مشتمل ہے جس میں سے شہر سرینگر کی آبادی ایک لاکھ اٹھارہ ہزار نو سو ساٹھ ہے یعنی بارہ برسوں کی مدت میں سرینگر کی آبادی دوگنی ہوگئی ہے۔خیال کیا جاتا ہے کہ 1879 میں دیہی آبادی ایک لاکھ ایک ہزار اسی رہ گئی تھی اب 1891 میں یہ آبادی چھ لاکھ پچانوے ہزار دوسو اکاسی ہے ۔اس بات سے آبادی کے مستحکم ہو جانے کی حالت ظاہر ہوتی ہے اور میجر مانٹ گومری کے ان مشاہدات کی تصدیق ہوتی ہے جو انھوں نے کشمیر میں اپنے سروے کے دوران تحریر کیے تھے۔''بیان کیا جاتا ہے کہ اوسطاً ہر خاتون کے دس سے چودہ بچے ہوتے ہیں''۔

بہر حال میں یہ بات کو سوچنے لگا ہوں کہ ڈاکٹر ایلمسلی کا حساب کتاب نشانوں سے کم تھا۔ اس بارے میں معمر اور ذہین کشمیری میری تصدیق کرتے ہیں کہ کشمیر میں 1891 کی آبادی 1887 کے برابر تھی۔ یہ وقت کشمیر میں قحط سالی سے پہلے کا ہے۔ چنانچہ 1891 میں تعین کردہ آبادی اور ڈاکٹر ایلمسلی اور دیگر افراد کی طرف سے تخمینہ شدہ آبادی کے درمیان موازنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔لہٰذا اس مردم شماری کے مطابق آٹھ لاکھ چودہ ہزار دوسو اکتالیس نفوس پر مشتمل اس آبادی میں سے صرف باون ہزار پانچ سو چھہتر ہندو ہیں جبکہ ڈاکٹر ایلمسلی کے حساب کے مطابق یہ تعداد پچھتر ہزار ہندو تھی، مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ اس قحط سالی کے دوران ہندوؤں کا زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ بہر حال ان اعداد وشمار میں سے ایک اہم پہلو نکالا جاسکتا ہے۔ میرے خیال میں 1868 میں

سرینگر شہر میں جو مردم شماری ہوئی تھی' افراد کی تعداد کے لحاظ سے نادرست ہے، مگر جہاں تک خانہ شماری کا تعلق ہے یہ آبادی صحیح ہے۔1868 کے دوران میں بیس ہزار تین سو چار رہائشی گھر تھے جبکہ 1891 میں ان گھروں کی تعداد بائیس ہزار چار سو اڑتالیس تھی۔اس اضافے کی وجہ یہ ہے کہ 1877-79 کی قحط سالی کے دوران دیہات سے بہت سارے افراد نقل مکانی کر کے شہر میں آ کر آباد ہو گئے تا کہ وہ بے گار سے بچ سکیں اور سستی خوراک حاصل کر سکیں۔

مذاہب

مندرجہ ذیل گوشوارہ عوام کے مذہب کے لحاظ سے تقسیم کو ظاہر کرتا ہے۔

ہندو	سکھ	مسلمان	عیسائی	پارسی
52,576	4,092	7,37,433	132	8

لہذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان کل آبادی کے ترانوے فیصد تھے جب کہ ہندوؤں کی تعداد سات فیصد سے بھی کم تھی۔

شہری آبادی

اس مردم شماری کے مطابق کشمیر کے چار قصبوں کو تسلیم کیا گیا ہے جنکی آبادی مندرجہ ذیل ہے۔

سرینگر—1,18,960

اننت ناگ—10,227

سوپور—8,410

بارہمولہ—5,656

میزان : 1,43,253

سرینگر کی آبادی کو بجا طور پر شہری آبادی تسلیم کیا جا سکتا ہے۔مگر دیگر قصبوں کی زیادہ تر آبادی کا حصہ کاشت کاروں پر مشتمل ہے۔شوپیان، بیج بہاڑہ، پانپور اور بانڈی پورہ میں غریب کاشت کار لوگ آباد ہیں۔اننت ناگ، سوپور اور بارہ مولہ کی آبادی کی زمرہ بندی کو شہری آبادی کے طور پر کی گئی ہے۔چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کشمیر کی کل آبادی کا سترہ فیصد شہری آبادی ہے اور زمانہ قدیم سے ہی حکمرانوں کی یہ حکمت عملی رہی ہے کہ زرعی آبادی کے مفادات کو سرینگر کے عوام

کے آرام وآسائش پر قربان کیا گیا ہے۔

ضلع وار دیہی آبادی

مندرجہ ذیل گوشوارے سے آبادی کی ضلع وار تقسیم ظاہر ہوتی ہے۔

نام ضلع	دیہات کی تعداد	تعداد خانہ	تعداد خانہ فی گاؤں	کل آبادی	تعداد افراد فی گھر
خاص	847	27,330	33	190,725	7
اننت ناگ	796	32,536	41	214,331	6
سوپور کامراج	1,111	34,904	31	241,498	7
راجوں کی جاگیریں	116	3,620	31	24,334	7

اس طرح سے فی کنبہ افراد کی تعداد سات ہے۔ کشمیر پر کیے گئے اپنے سروے کی تحریروں میں میجر منٹگمری رقمطراز ہے۔

''یہ ایک ایسا ملک ہے جہاں پر کنبے میں رہنے والے افراد بشمول ہر جاندار دس سے تیس کے درمیان ہے۔ تیس مختلف دیہات میں خاص تحقیقات کرنے پر یہ اوسط اٹھارہ پائی گئی ہے''۔

فرض کیجیے کہ مردم شماری کے اعداد وشمار درست ہیں تو یہ معلوم ہوگا کہ موروثی نظام ختم ہو رہا ہے اور یہ رجحان ہے کہ زراعت پیشہ موروثی مکان چھوڑ کر اپنا گھر بناتے ہیں اور بلاشبہ یہ رجحان موجود ہے۔ بندوبست کی کارروائیوں کے دوران یہ امر ہر روز میری نوٹس میں آتا رہا۔ اب تک یہ رجحان صحت مندی کا حامل رہا ہے کیونکہ کنبے کے مختلف اراکین کی اراضیات اب بھی اس قدر زیادہ ہیں کہ ان میں زیادہ کاشت نہیں ہو سکتی۔

جنسی پہلو

کل آبادی میں سے چار لاکھ انتیس ہزار چار سو چونسٹھ مرد اور تین لاکھ چوراسی ہزار سات سو تہتر عورتیں ہیں۔ سرینگر شہر اور قصبات کے اندر فی ہر ہزار ہندو مردوں کے لئے آٹھ سو سترہ

عورتیں ہیں جبکہ فی ہزار مسلم مردوں کے لئے نو سو سولہ عورتیں ہیں۔دیہات میں ہر ہزار ہندو مردوں کے لئے سات سو اکیس عورتیں ہیں جبکہ اس معاملے میں مسلمانوں کی حالت بہتر ہے کیونکہ ہر ہزار مسلم مردوں کے لئے آٹھ سو بچانوے عورتیں ہیں۔مسلم زراعت پیشہ افراد میں عورتوں کے مقابلے میں مردوں کی تعداد شاید زیادہ ہے کیونکہ 26 فروری 1891 کو جب یہ مردم شماری کی گئی تو اس وقت بہت سارے مرد پنجاب گئے ہوئے تھے۔بہرحال عورتوں کی کمی اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں مذاہب کے لوگوں میں ایک سے زیادہ عورتوں سے بیاہ کرنا شاذ و نادر ہی مروّج ہے۔

تولید اور مرگ اطفال

1891 کی مردم شماری میں میجر منٹگمری اور دیگر مشاہدین سے اس بابت مکمل طور پر تصدیق ہوئی ہے کہ کشمیری کافی زرخیز ہیں۔زراعت پیش طبقات میں بچوں کا تناسب ہر دس ہزار کے لئے چار ہزار چار سو پینسٹھ ہے جبکہ تمام ہندوستان میں یہ تناسب تین ہزار آٹھ سو اٹھاسی فی دس ہزار ہے۔اس آبادی سے دوسرے دلچسپ پہلو بھی ظاہر ہوتے ہیں کہ ہندوستان کے دیگر صوبوں کے مقابلے میں کشمیر میں پیدائشیں زیادہ تعداد میں ہوتی ہیں۔دو برس کے کم عمر کے بچوں کی اموات ہندوستان کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہیں مگر کشمیر میں دو سے تین برس کے اندر عمر کے بچے ہندوستان کی نسبت زیادہ طاقتور معلوم ہوتے ہیں۔کم عمری میں اموات کی زیادہ شکار چھوٹی بچیاں ہوتی ہیں کیونکہ وہ چیچک کی وجہ سے مر جاتی ہیں شاید لڑکوں کے مقابلے میں ان کی کم پروا کی جاتی ہے۔کشمیر میں ایک افسوس ناک پہلو یہ بھی ہے کہ نصف کے قریب بچے پیدا ہونے کے بعد ہی دم توڑ جاتے ہیں اور ایک تہائی بچے ایک برس کی عمر تک پہنچنے کے بعد چل بستے ہیں اور اس بات پر اور بھی زیادہ افسوس ہوتا ہے کہ اگرچہ لڑکوں کی نسبت زیادہ لڑکیوں کی تولید ہوتی ہے پھر بھی مردوں کی نسبت عورتوں کا تناسب مجموعی آبادی میں نہایت کم ہے۔کسی دیگر باب میں میں نے ٹیکہ لگانے کے مؤثر طریقہ کار کی ترویج پر بحث کی ہے۔شاید کشمیر میں زراعت پیشہ افراد کی موجودہ آبادی سے کافی زیادہ آبادی کی ضرورت ہے۔یہ ان کا اپنا اور انسانی مفاد ہے کہ ننھی لڑکیاں چیچک کی بیماری کا شکار ہوتی ہیں۔

درازیٔ عمر

بیان کیا گیا ہے کہ یہ وادی اس قدر صحت مند ہے کہ گائیوں کی طرح آدمی بھی صرف ایک ہی بیماری سے خوفزدہ ہوتا ہے، بڑھاپا۔ وادی میں میری ملاقات بہت سارے عمر رسیدہ افراد سے ہوئی ہے اور میں نے چالیس برس کی عمر کے ایسے افراد کو دیکھا ہے جن کے بال سفید ہو چکے ہیں۔ ایک گاؤں وانہ کاری (حمال) میں درازیٔ عمر کی ایک نمایاں مثال سامنے آئی۔ کرشن داس کی عمر پچانوے برس ہے اور اس کے چار بیٹوں کی عمر بالترتیب ستر، ساٹھ، چالیس اور تیس ہے۔ کرشن داس کا والد ایک سو پانچ برس کی عمر میں راہی ملک عدم ہوا اور حال ہی میں اس کا چچا وفات پا گیا جس کی عمر ایک سو چودہ برس تھی۔ کرشن داس کی بیوی کی موت نوے برس کی عمر میں واقع ہوئی۔ وہ آسانی سے تیس میل چل سکتا ہے۔ اس کی یادداشت نہایت تیز ہے اور اپنی توانائی کا راز بکری کا دودھ بتاتا ہے۔ اس نے کبھی چائے، تمباکو یا شراب کا استعمال نہیں کیا ہے۔

مردم شماری کے مطابق کشمیر میں اوسط عمر مندرجہ ذیل ہے

	دیہی	شہری
مرد	20.11 برس	21.30 برس
عورتیں	19.19 برس	20.35 برس

شہروں کی آسائش کن زندگی سے اوسط عمر میں ایک برس کا اضافہ ہوتا ہے۔ کشمیریوں اور ایک انگریز کی اوسط زندگی کے نہایت برعکس پہلو ہیں۔

جرائم اور تعزیرات

یہ ایک خوش آئند بات ہے کہ کشمیر جرائم سے پاک اور سرینگر تعزیری معاملہ میں وادی کے لیے کافی ہے۔ اگر 92-1891 کو عام حالات کا برس تسلیم کیا جائے تو دو سو تینتالیس ملزمان کو تعزیرات کے لیے لایا گیا مگر وہ وادی کے باشندے نہیں تھے بلکہ ضلع مظفرآباد سے آئے ہوئے تھے۔ ان ملزمان میں سے صرف دو عورتیں تھیں اور چھ لاکھ ستر ہزار نو سو نواسی افراد کی زراعت پیشہ آبادی سے اس میں فقط اکتالیس افراد کا حصہ تھا۔ 92-1891 کی ابتدا میں صرف ایک سو اکیس افراد زیر تعزیرات تھے مگر سال کے آخر میں نئے اندراجات کے بشمول زیر حراست صرف

127 ملزمان تھے ۔قیدیوں کی روزآنہ اوسط تعداد ایک سو اتیس تھی ۔ اگر کشمیر میں اوسط ملزمان کی تعداد دوسو تینتالیس تسلیم کر لی جائے تو کسی ایک برس کے دوران انگلینڈ میں یہ تعداد صفر اعشاریہ صفر سات صفر ہوتی ہے (1) جبکہ کشمیر کی مجموعی آبادی کے لحاظ سے یہ اوسط صفر اعشاریہ دونو ہے۔ یہاں ملزمان کی حقیر تعداد اس لیے بھی ہے کہ انتظامیہ کی طرف سے کسی قسم کی نرمی نہیں برتی جاتی اور پولیس میں بھاری جوش پایا جاتا ہے۔ کسی بھی ملک میں کشمیر کے مقابلے میں محکمہ سراغ رسانی موجود نہیں ہے اور میرے عقیدے کے مطابق جرم کی عدم موجودگی کا سبب عوام کی غیر جرائم پیشہ کردار ہے اور جزوی طور پر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جرم کی ابتدا سے ایک طاقتور جاسوس کی نگاہ اس بات پر رہتی ہے کہ اس کے دوست اور رشتہ دار اس کے ساتھ دغابازی کریں گے۔ سال 1891-92 کے دوران کشمیر میں تعزیرات پر کل نو ہزار دوسو پچاسی روپے صرف ہوئے جبکہ ان سے ایک ہزار سات سو آٹھ روپے کی آمدنی جرمانے کے طور پر وصول ہوئی۔

اس بات کے علاوہ کہ وادی میں جرم کا ارتکاب بہت کم ہے ایک اطمینان بخش امر یہ بھی ہے کہ ان جرائم کا تعلق جائداد سے ہوتا ہے اور یہ کسی فرد یا شخص کے خلاف نہیں ہوتے چنانچہ 1891-92 کے دوران جن پانچ سو تینتالیس معاملوں کی اطلاع موصول ہوئی ان میں سے صرف پنتیس جرم کسی شخص کے خلاف تھے جبکہ چوری کا کوئی بھی کیس نہیں ہوا۔ گزشتہ دس برسوں کے دوران سرینگر میں صرف دس افراد کو پھانسی دی گئی ہے۔ ان میں سے صرف ایک شخص وادی کا باشندہ تھا۔ یہ امر بھی اطمینان بخش ہے کہ بچوں میں جرائم کا رجحان بھی ناپید ہے۔ چنانچہ ملزمان میں صرف دو لڑکوں کی عمر سولہ برس سے کم تھی۔

پولیس

کشمیر میں انسداد جرم اور 814241 افراد پر نظر رکھنے کے لیے 436 افسروں اور ماتحتوں کی ایک پولیس فورس ہے جس کے لیے سالانہ پچاس ہزار تین سو بارہ روپے کی لاگت کانی ہے۔ پولیس کی معاونت دیہی چوکیدار کرتے ہیں جن کی تعداد کافی زیادہ ہوتی ہے اور وہ کافی ہوشیار لوگ ہوتے ہیں۔ یہ تحقیقاتی جماعت ہزار آدمیوں پر مشتمل ہے جو عام طور پر ڈوم طبقے سے وابستہ ہیں اور ان میں سراغ رسانی کی کافی صلاحیتیں ہوتی ہیں اور خفیہ اطلاعات بہم پہنچانے کے لیے ان کے

پاس بہترین طریقہ موجود ہے۔ اگر کوئی بھی دلچسپ واقعہ گاؤں میں رونما ہوتا ہے چوکیدار اس کی فوری طور پر پولیس کو اطلاع دیتا ہے۔ چوکیدار حکومت سے کوئی تنخواہ حاصل نہیں کرتا بلکہ اس کے علاقے میں رہائش پذیر دیہاتی اسے عطیات دیتے ہیں۔ یہاں تک نیلی اور سرخ رنگ کی اس کی وردی اور اس کا سرکاری برچھا بھی دیہاتیوں کی طرف سے فراہم کیا جاتا ہے۔ اب یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ چوکیداروں کی تنخواہ حکومت ادا کرے مگر میری رائے یہ ہے کہ اس تبدیلی سے نہ حکومت اور نہ ہی دیہاتیوں کو فائدہ پہنچے گا۔ اس وقت چوکیدار ایک دیہی ادارہ ہے جو دیہاتی عوام کی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات میں گہری دلچسپی لیتا ہے مگر اس کا نتیجہ برا ہوتا ہے جو باقی دیہاتیوں کی طرح چوکیدار کو بھی بھگتنا پڑتا ہے۔ اس وقت یہ امر چوکیدار کے مفاد میں ہے کہ وہ زراعت کا کام کرے اور ایسے کاموں سے دور رہے جن سے وہ مصائب کا شکار ہو سکتا ہے۔ اگر وہ حکومت کا تنخواہ دار ملازم بن جاتا ہے تو وہ حکومتی جوش کی بنا پر ترقی پانے کی کوشش کرے گا۔ چنانچہ ایک حکومتی اہلکار دیہی طبقے کا رکن نہیں رہے گا، اس سے اس کی فائدہ مند سرگرمی ختم ہو کر رہ جائے گی۔

تعلیم

بہت سارے ملکوں میں شراب کو ارتکاب جرم کا منبع قرار دیا جاتا ہے اور تعلیم اس کے انسداد کا ایک طاقتور ذریعہ ہے۔ کشمیر میں شراب اور منشیات کو عوامی زندگی میں دخل حاصل نہیں مگر ان دونوں بدعتوں کی عدم موجودگی کی وجہ تعلیم کی تبلیغ کو ہرگز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جہاں تک حکومت کا تعلق ہے مندرجہ ذیل گوشوارے سے وادی میں تعلیمی سرگرمیوں کا اندازہ ہو جائے گا۔ ایک مرتبہ پھر میں اس مملکت میں عام حالات کی علامت کے طور پر 92-1891 کا انتخاب کرتا ہوں۔

اسکول میں داخل لڑکوں کی تعداد	1,585
اوسطاً روزانہ حاضری	1,228
انگریزی پڑھنے والے طلبہ کی تعداد	299
صرف اُردو، ہندی پڑھنے والے طلباء	1,541
صرف سنسکرت پڑھنے والے طلبا	41

مذہب

ہندو	1,327
سکھ	21
مسلمان	233

یہاں یہ بھی کہنا ہوگا کہ باون ہزار پانچ سو چھہتر ہندوؤں میں سے سرکاری سطح پر صرف 1,327 تعلیم حاصل کرر ہے ہیں جب کہ مسلمانوں کی تعداد سات لاکھ ستاون ہزار چار سو تینتیس کی آبادی میں سے صرف دو سو تینتیس سرکاری اسکولوں سے مستفید ہو رہے ہیں۔ان اعداد وشمار سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ہندو مجموعی آبادی کا سات فیصد سے بھی کم حصہ ہیں اور حکومت کی طرف سے دی جانے والی تعلیمی سہولیات سے فیضیاب ہونے والوں میں ان کی تعداد تراسی فیصد ہے۔ اس سے یہ امر زیادہ ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے کہ کل ایک ہزار پانچ سو بچاسی لڑکوں میں سے ایک ہزار دو سو بیس سرینگر کے اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔

ان اعداد وشمار سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ کشمیر تعلیمی لحاظ سے پسماندہ ہے۔چنانچہ حکومت پر اس بات کے لیے زور دیا جانا چاہیے کہ وہ مزید اسکول کھولیں۔ہندوستان میں بھاری دولت اور وسیع مزدوروں کی وسعت کے پیش نظر قدرتی طور پر یہ سوال پوچھا جائے گا کہ حکومت کشمیر ہندستانی اداروں سے قرضہ لینے میں اس قدر ماہر کیوں ہے اور وادی کے عوام کو عملی طور پر مفت تعلیم فراہم کرنے کا طریقہ یہاں پر کیوں نہیں اپنایا گیا۔اس کا جواب یہ ہے کہ زیادہ خوشحال لوگ سرکاری اسکولوں میں دی جارہی تعلیم کی نسبت مسجدوں کے اسکولوں اور پرائیوٹ اداروں کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔یہ تعجب کی بات ہے کہ دیہات میں رہائش پذیر بھاری تعداد میں مسلمان آسانی سے فارسی لکھ سکتے ہیں۔فی الحال دیہی آبادی حکومت سے کسی قسم کی امداد نہیں چاہتی اور والدین کا خیال ہے کہ گھریلو سکول ترقی یافتہ طالب علمی سے بہتر ہوتے ہیں جبکہ شہری اسکولوں میں آزاد خیالی پروان چڑھتی ہے۔سرکار بھی قدیم خیالات کی ہے اور تعلیم یافتہ پنڈتوں کی تعداد ان کی مانگ سے کہیں زیادہ ہے۔اسی طرح سرکاری اخراجات پر بہت سارے طلبا تیار کیے جارہے ہیں۔اگر کوئی کشمیری پنڈت ملک سے کام کی تلاش میں باہر جاتا ہے تو تعلیم کو وسعت دینے کی

بجائے وہ سرینگر میں ہی رہنے کو ترجیح دے گا۔ جہاں تک دیہی طبقات کا تعلق ہے حکومت کا یہ خیال ہے کہ جو بھی اشخاص تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ اپنے اخراجات پر کریں اور اس بات میں شبہ ہے کہ زراعت پیشہ آبادی کے موجودہ حالات میں سرکاری اخراجات پر تعلیم دینا کیا دانشمندانہ اقدام ہوگا۔ میرے خیال میں بہترین پالیسی یہ ہوگی کہ دیہی طبقات کو فی الحال ان کے حال پر چھوڑا جائے اور سرینگر میں تکنیکی تعلیم فراہم کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی جائے۔ کشمیریوں میں فنکارانہ جذبہ موجود ہے اور فنی مصنوعات تیار کرنے کے معاملے میں ان کی مہارت کافی مشہور ہے۔ فن پارے اور مصنوعات تیار کرنے کے معاملے میں قدرت نے یہاں فراخدلی کے ساتھ خام مال فراہم کیا ہے اور تکنیکی رہبری کے فقدان میں عمدہ قسم کے ریشے، بید کی چھڑیاں، چمڑا اور وادی کی مٹی عملی طور پر ضائع جاتی ہیں۔ مجھے کسی ایسے مقام کے بارے میں معلوم نہیں جہاں سرینگر کے مقابلے میں تکنیکی تعلیم زیادہ بہتر ثابت ہو سکتی ہے۔ فنی صلاحیتیں ہمیشہ موجود ہوتی ہیں مگر انھیں بروئے کار لانے کے لئے ماہر رہبری کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ رہبری انھیں حکومتی سرپرستی اور حوصلہ افزائی سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ بہت ساری ایسی باتیں ہیں جو تکنیکی تعلیم کے بارے میں ہدایت کا تقاضا کرتی ہیں۔ شہر کی بھاری آبادی پہلے ہی حکومت پر ایک بوجھ کی مانند ہے اور یہ آبادی ہر سال زیادہ لاچاری اور پستی کا شکار ہو رہی ہے۔ جس انداز سے شہری عوام نصف دام پر غلّہ حاصل کرتے ہیں اور اس کے سبب پیدا ہونے والی غریبی کے پیش نظر محنت کشی اور خوشحالی کا عنصر غائب ہو جاتا ہے۔ اُجرت کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے اور یہ محض چاول کی مقدار یا مقررہ دنوں کی خوراک کی صورت میں وصول کی جاتی ہے۔ ان معمولی اجرتوں کے سبب کشمیری دستکار کو کسی قسم کا شکوہ یا شکایت نہیں ہے اور وہ اس معاملے میں اپنے مالک کے ساتھ جھگڑا بھی نہیں کرتا۔ اس طرح درمیانہ دار پچاس فیصد کا منافع کما لیتا ہے۔ اگر حکومت نے فراہمی اور مانگ کے اصول پر کاربند رہتے ہوئے غلّے کی قیمتوں میں باقاعدگی لائی تو یقینی طور پر دستکاروں کو شکایت ہوگی۔ انھیں اس بات کا بجا طور پر احساس ہے کہ سرینگر کے دستکاروں نے اس قدیم پسماندگی سے نجات حاصل نہیں کی ہے۔ یہ تاثر ان کے ذہن سے ابھی تک نکلا نہیں ہے کہ عملی طور پر وہ حکومت کے غلام ہیں۔ پہلے بھی ذکر کیا گیا ہے کہ تجارت شال کے قدیم دنوں میں یہ بات ضروری تھی کہ مالی طور پر شال

بافوں کی پرورش کی جائے۔اس کے لیے انھیں سستے داموں پر غلہ فراہم کیا جائے اور حکومت کو جو خسارہ ہوتا ہے اسے قیمتی شالوں پر بھاری ٹیکس عائد کر کے پورا کیا جاتا تھا اور یہ ٹیکس آسانی سے وصول ہو جاتا تھا مگر شال کی تجارت اب ختم ہو چکی دستکاروں کی طرف سے حکومت کو کچھ بھی نہیں دیا جاتا اور ہوسکتا ہے کہ حکومت اپنی پرانی پوزیشن کو اپنا لے اور اس کے تحت اجرتوں کا تعلق قیمتوں کے ساتھ قائم کر دیا جائے۔ یہ تبدیلی اب شروع ہو چکی ہے اور میرے خیال میں اس سے درمیانہ دار کو براہ راست فائدہ پہنچتا ہے۔ چنانچہ سرینگر کی مصنوعات کی ساخت میں اس سے نمایاں بہتری پیدا ہوگی۔ بہت سارے ملکوں میں کام اور اجرتوں کا اپنا اپنا طریقہ ہوتا ہے مگر کشمیر میں اس دیانت دارانہ آزادی کی کوئی وقعت نہیں کیونکہ لوگوں میں یہ احساس گھر کر گیا ہے کہ وہ مفلس اور قلاش ہیں اور ان کا وجود ہز ہائینس مہاراجہ کے رحم وکرم پر ہے چنانچہ اس حالت میں تبدیلی آنا ناگزیر ہو چکا ہے اور ان کی غربت سے اگر کسی کو فائدہ پہنچتا ہے تو وہ درمیانہ داروں کا طبقہ ہے۔ مسلمانوں میں ٹیکنکل تعلیم کی ضرورت کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ عملی طور پر وہ سرکاری تعلیمی اداروں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے۔ اگر وہ نئی دستکاریاں سیکھتے ہیں تو حکومت ان سے استفادہ کر سکتی ہے۔

طبّی امداد

حکومت نے عوام کو طبی امداد بہم پہنچانے میں ہمیشہ بہترین اقدامات کیے ہیں۔ اس مقصد سے سرینگر میں ایک ہسپتال قائم کیا گیا ہے اور تین اضلاع میں چھ دواخانے ہیں۔ مندرجہ ذیل گوشوارے سے ظاہر ہوتا ہے کہ 92-1891 میں عوام کس قدر طبی سہولیات سے مستفید ہوئے۔

داخل ہونے والے کل مریضوں کی تعداد	_ _ _ _ _ _ _ 615
بیرون دروازہ مریضوں کی کل تعداد	_ _ _ _ _ _ _ 22,960
میزان	_ _ _ _ _ _ _ 1,23575

جراحی کے آٹھ سو اٹھاسی آپریشن کیے گئے جن میں سے دو سو تراسی بڑے آپریشن تھے۔ سرینگر میں آٹھ افراد کی دونوں ٹانگیں کاٹنے کا عمل سرانجام دیا گیا جو پالے سے سڑ چکی تھیں۔ یہ ٹانگیں زہر آلودہ ہو کر سڑ گئی تھیں۔ کشمیر جیسے ملک میں پہاڑی دروں پر مسافر پالے کے سبب اعضا کے بگڑ جانے کا شکار ہو سکتے ہیں اور لوگ پہاڑی حادثوں اور جنگلی جانوروں کی طرف سے زخمی ہو سکتے ہیں۔ یہاں پر سرینگر کا ہسپتال ایک عظیم نعمت ہے۔ یہاں پر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جراحی

کے کل آپریشنوں میں سے دوسو پچاس فیصد جنسی بیماریوں کے معاملے تھے۔ سرینگر ہسپتال اور دیگر دواخانوں میں جن بیماریوں کا علاج کیا جاتا ہے وہ نہایت عام ہیں جن میں بخار، آتشک، ریح حار کی بیماری، اعصابی تناؤ کے امراض، امراضِ چشم، امراضِ دمہ، ضعف معدہ، امراض ہاضمہ، ریشوں کا جڑ جانا اور امراضِ جلد شامل ہیں۔ اس سلسلے میں شاندار میڈیکل مشن کے ساتھ اس کا تقابلی جائزہ باعث دلچسپی ہوگا۔

کشمیر میڈیکل مشن 1893 (یہ اعداد وشمار گزشتہ پانچ برسوں کا اوسط ہیں)

سرینگر ہسپتال	80
داخل شدہ مریض	853
بیرونِ دروازہ مریض	8,688
کل مریض	20,606
عارضی سرمائی کیمپ (صرف دو ماہ کے لیے)	
نئے مریض	1,469
میزانِ کل	2022
دیہات، ایام کار	90
معائنہ شدہ مریضوں کی تعداد	5,167
جراحی آپریشن	
بڑے	503
ادنیٰ	2086
اوسط آمدنی از رضاکارانہ ذرائع	10,000

دیہاتیوں کو یورپی دوائیوں پر زبردست اعتقاد ہے۔ پانچی پورہ تحصیل دیوسر میں آٹھ دنوں میں علاج کے لیے ڈھائی ہزار مریض آئے اور وادی کے دوسرے کنارے ترہگام میں بھی تعداد اسی قدر زیادہ ہے۔ مگر سرینگر شہر اور بڑے قصبوں میں لوگ اپنے حکیموں کے ہاں جاتے ہیں۔ پہلے مرحلے میں عام طبی بیماریوں (غیر جراحی) کے لیے ان کا سہارا لیتے ہیں۔ عام طور پر یورپیوں کے

ہاں جراحی تکلیفوں کے لیے آتے ہیں حالت انتہائی طور پر خراب ہو جاتی ہے۔ قدرے دور افتادہ علاقوں مثلاً دراس، کرگل، واڑون اور اسکردو میں بھی حالات کشمیری دیہاتیوں کی مانند ہیں۔

کوڑھ اور پاگل پن کے مریض

اس مردم شماری میں ایسے مریضوں کی تعداد کے بارے میں معلومات فراہم نہیں ہیں تاہم معلوم ہوتا ہے کہ 92-1891 میں ایک سو تین اور 93-1892 میں کوڑھ کے دو سو ساٹھ مریضوں کا علاج کیا گیا۔ 1890 میں کی گئی تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ 1890 میں وادی میں کوڑھ کے ایک سو تینتیس مریض تھے۔ کوڑھ کے مریضوں کی زیادہ تعداد ان خانہ بدوش گڈریوں کی ہے جو موسم گرما کے دوران وادی میں وارد ہوتے ہیں۔ حکومت نے کوڑھ کے مرض پر قابو پانے میں فراخدلی کا مظاہرہ کیا ہے۔ کشمیر میڈیکل مشن کے تحت کوڑھ کے علاج کے لیے ایک سرکاری ہسپتال کام کر رہا ہے۔ 93-1892 کے دوران سرینگر جیل کے ساتھ منسلک پاگل خانے میں 145 پاگلوں کا علاج کیا گیا۔ انگریزی معیار کے مطابق یہ کسی طور پاگل خانہ نہیں ہے جہاں بے خوابی کا علاج انتہائی جوش دلانے سے کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر مترا رائے بہادر کا اندازہ ہے کہ پاگلوں کی تعداد 250 ہے اور اس کے مریض زیادہ تر ہندو ہیں۔ یہ بدقسمتی کی بات ہے پاگل پن سے متعلق کوئی اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں۔ مگر دیہات میں میرے اکثر دوروں کے دوران مجھے اس امر سے واقف کرایا گیا کہ پاگل عام طور پر گاؤں میں پائے جاتے ہیں۔ چند لوگ تو پیدائشی پاگل ہوتے ہیں، چند لوگ چرس کے بکثرت استعمال سے اور چند لوگ کسی آفت کے بعد حواس کھو دیتے ہیں۔ پاگل بے ضرر انسان ہوتے ہیں اور دیہاتی لوگ ان کی اچھی خاطر مدارات کرتے ہیں۔ میں نے ایک پاگل خانہ قائم کرنے کے سوال پر تبادلۂ خیال کیا مگر دیہاتیوں کا خیال ہے کہ یہ پاگل اپنے حال میں ہی خوش ہیں اور ان کو باندھ کے رکھنے سے فائدے کے بجائے نقصان ہوگا۔ وہ ان کی اتنی ہی قدر کرتے ہیں جتنی سوئٹزرلینڈ کے لوگ کریٹنز (Cretins) کی کرتے ہیں۔

وادی میں خودکشی کی وارداتیں نہایت کم ہوتی ہیں مگر مجھے ایسے واقعات کا پتہ ہے جہاں غیر مہذب زبان کے استعمال کے سبب موت ہوئی ہو یا ہو سکتا ہے کہ یہ موت دل شکستگی کے باعث واقع ہوئی ہو۔ کشمیری لوگ اعصابی اعتبار سے کمزور ہوتے ہیں اور وہ اچانک اور بڑی مصیبتوں کا

سامنا نہیں کر سکتے جب کوئی مصیبت نازل ہوجاتی ہے تو وہ ظاہر داری سے کام لیتے ہیں اور بدحواسی کے عالم میں ہاتھوں سے اشارے کرتے ہیں اور تعجب ہوتا ہے کہ آیا ان کا ذہن اپنا توازن حاصل کر سکے گا۔ کشمیریوں کے مقابلے میں ایک عام ہندوستانی میں زیادہ ٹھنڈا ذہن اور نرم مزاج پایا گیا ہے۔

گیگھے کی بیماری عام طور پر پائی جاتی ہے۔92-1891 کے دوران 520 افراد کا علاج کیا گیا۔

اندھے پن کا مرض عموماً پایا جاتا ہے اور یہ مرض کلیدی طور پر چیچک کی وجہ سے رونما ہوتا ہے۔ مگر ہمارے پاس ان بیماریوں کے اعداد وشمار دستیاب نہیں ہیں۔

کافی عرصہ گزر جانے کے بعد کشمیریوں نے مغربی طرز علاج کے فائدوں کو پہچاننا شروع کیا۔ یورپی طریقۂ علاج کے بڑھتے ہوئے اثر کے لیے کشمیر میں سرگرم عمل میڈیکل مشنریوں کی تندہی ذمہ دار ہے۔ اب عوام کی بھاری تعداد کو اپنے ہی معالجوں پر اعتقاد ہے۔ ان معالجوں میں سے بہت سارے افراد اچھی خاصی مہارت اور تجربے کے مالک ہیں۔ وادی میں 300 حکیم یا معالج ہیں اور قاعدے کے مطابق یہ کاروبار موروثی ہے۔ ان کا طریقۂ علاج یونانی طرز علاج پر مبنی ہے۔ مجھے ایسی باتوں کے بارے میں معلوم ہے جہاں میرے ماتحتوں نے کشمیری حکیم کی مہارت سے کافی فائدہ اٹھایا ہے۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ میں کافی پریشان تھا اور کشمیریوں کے ایک وفد نے آ کر گزارش کی کہ میں ایک حکیم کو اپنے بیٹے کا علاج کرنے کی اجازت دے دوں۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ یہ حکیم بیماریوں کا علاج کرنے میں کبھی ناکام نہیں رہا۔ اسے جڑی بوٹیوں کے متعلق اچھی خاصی واقفیت حاصل ہے اور اس کے لیے جڑی بوٹیاں جمع کرنے کا کام چرواہے اور گڈریے کرتے ہیں کیونکہ یہ لوگ ان بلند پہاڑوں پر گرمیاں گزارتے ہیں جہاں یہ بیش قیمت طبی پودے پائے جاتے ہیں۔ یہ حکیم ایک دولت مند شخص کے ہاں ایک مرتبہ جانے کے لیے آٹھ آنہ وصول کرتا ہے اور دوائیاں تیار کر کے بھی کچھ پیسہ کما لیتا ہے۔ وہ جراحی کے معاملے میں ہاتھ پاؤں نہیں مارتا۔ وہ قلم کے ساتھ اس رگ پر نشان دیتا ہے جسے کھولنا مطلوب ہوتا ہے مگر اسے کھولنے کے لیے وہ ایک حجام کو بلاتا ہے۔ وادی میں 1,900 سے زیادہ حجام ہیں۔ اگر جونک لگانا مطلوب

ہوتا تو ایک مخصوص شخص کو طلب کیا جاتا ہے۔ عام قسم کے حکیم گڈریوں سے جڑیاں حاصل نہیں کرتے بلکہ دوا فروشوں سے خریدتے ہیں۔ یہاں 159 دوا فروش موجود ہیں۔ حکیم زچگی کے معاملوں کا ہرگز علاج نہیں کرتے۔ زچگی کا کام خاص خاص عورتیں کرتی ہیں جن کی تعداد 74 ہے۔ ان حکیموں کے علاوہ بہت سیانے لوگ دیہات میں موجود ہوتے ہیں جنھیں جڑی بوٹیوں کے اوصاف سے متعلق اچھی خاصی واقفیت حاصل ہے اور ایک نمایاں بات یہ ہے کہ قریباً ہر ایک انسان پودوں کے طبی اوصاف کے بارے میں جانتا ہے۔ تمام سنگین بیماریوں کے لیے ان حکیموں کا اکثر علاج چوب چینی ہے جو چین سے درآمد شدہ ایک جڑی ہے اور جو کھانے کے لیے دی جاتی ہے۔ چیچک کا ٹیکہ اس قدر عام ہے کہ کشمیر میں اس کے بارے میں پہاڑی گوجروں کے سوا کسی کو تو کچھ معلوم نہیں اور عام طور پر چیچک کا علاج کسی پیر سے قرآن خوانی کے ذریعہ سے کیا جاتا ہے۔ عوام کو عموماً پیروں کی طرف سے دیے گئے گنڈے تعویذوں پر اعتقاد ہوتا ہے۔ وہ سبھی امراض کے لیے اکسیر ہیں۔ ان تعویذوں کو یا تو دائیں بازو (2)، گردن یا پگڑی پر باندھا جاتا ہے یا اس تعویذ کو پانی میں ڈالا جاتا ہے اور مریض اس کی سیاہی کو گھول کر پی جاتا ہے یا اس کے دھوئیں کو بیمار سونگھتا ہے۔ اس تعویز کے دھوئیں کو سونگھنے کے بعد مریض خواب دیکھتا ہے جن کے بارے میں پیر صاحب کو اطلاع دینا لازمی ہے کیونکہ اسی اطلاع کی روشنی میں وہ فیصلہ کرتا ہے اب کیا کیا جائے۔ پیر برادری کے لیے علاج کا کلیدی اصول یہ ہے کہ بیماری بدروح (جن) کی وجہ سے ہوتی ہے چنانچہ ایک مناسب تعویز تیار کیا جاتا ہے جس پر مریض کی والدہ کا نام درج ہوتا ہے اور یہ تعویز مرض کو ختم کر دیتا ہے۔

کشمیر میں بہت سارے پیر موجود ہیں۔ دیگر پیر ایسے ہیں جن کا ذریعہ معاش مذہب ہے ان کی تعداد 4005 ہے۔ ان کے لواحقین کو ملا کر ان کی کل تعداد 15,712 ہے۔ ان سبھی کی پرورش کارکن لوگ کرتے ہیں۔ گداگروں اور ان کے لواحقین کی کل تعداد 24,673 رہے جب کہ مسخروں، اداکاروں رقاصوں کی کل آبادی 1,421 ہے۔ یعنی یہ کہا جاسکتا ہے کہ پانچ فیصد آبادی دوسروں کے بل بوتے پر زندگی بسر کرتی ہے اور مملکت کی دولت میں کسی قسم کا اضافہ نہیں کرتے۔ ان اعداد و شمار میں اُن کاہل فقیروں یا گداگروں کو شامل نہیں کیا گیا جو بھوکے ٹڈی دل کی

طرح موسم گرما کے دوران یہاں آ جاتے ہیں۔ کشمیر میں فقیر کی اصطلاح کی کوئی مذہبی اہمیت نہیں۔ جو شخص خود کو دینی عبادت کے لیے وقف کر دیتا ہے اسے درویش کہا جاتا ہے۔ میں نے گداگروں کے بارے میں نسلوں اور قبیلوں کے باب کا ذکر کیا ہے۔ کشمیر میں گداگری کو ایک باعزت پیشہ تصور کیا جاتا ہے۔

مالیات

آئین اکبری سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر کا کل مالیہ 30,11,629 خروار تھا جس کی مالیت 6,21,13040 دام کی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک خروار کی قیمت، آٹھ آنے تین پائی ہے مگر بدقسمتی سے آئین اکبری میں چند خامیاں ہیں جن کا جواب تشنہ طلب ہے چنانچہ مالیہ کی مانگ 3,11,619 خروار بیان کی جاتی ہے۔ اس میں سے 9,43,507 خروار کی قیمت 12,10,18,880 دام ہے جو نقدی کی صورت میں وصول ہوتی ہے۔ اس سے فی خروار کی شرح پانچ آنے دو پائی بنتی ہے مگر آئین اکبری کے مطابق 8 آنے 4 پائی اور 5 آنے 9 پائی۔ یہ قیمت مغل دور میں فی خروار مقرر کی گئی تھی۔ ان شرحوں کے تعین میں نہ صرف آئین اکبری میں تین نقائص ہیں جن کی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔ چنانچہ جب میں پرگنہ وار تفصیلی مالیہ کی مانگ کو جمع کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ وادی کشمیر (سرکاری کشمیر) کی کل مالیاتی طلب 28,61,488 خروار یا نقدی کی صورت میں 14,75,445 روپے ہے۔ اس میں سے 9,88,780 خروار کی نقد قیمت 4,78,902 روپے تھی جنھیں نقدی کی صورت میں وصول کیا جاتا تھا۔ میں دیر، دچھن، کھادرہ اور بانہال کے بغیر ان تمام پرگنہ جات کی نشاندہی کر سکتا ہوں جو اس وقت وادی میں قائم کیے گئے تھے۔ دچھن کھادرہ اس وقت ضلع مظفر آباد میں شامل ہے جب کہ بانہال جموں کے ضلع ادھم پور کا حصہ ہے۔ آئین اکبری کے مطابق ان تین پرگنہ جات کی طلب 28,331 روپے تھی جبکہ عملی طور پر مالیہ کی طلب میں سرینگر کا حصہ 17,77,333 روپے تھا۔ لہٰذا وادی کے کل مالیہ اراضی میں سے 28,331 کی رقم کو منفی کرنا ہوگا۔ چنانچہ وادی کی مالیاتی طلب 12,69,281 تھی مگر بدقسمتی سے وادی کی کل مالیاتی طلب کے بارے میں کوئی اعداد و شمار نہیں ہیں۔ ہمیں پرگنہ سپر سمن کا ذکر ملتا ہے جس کے مطابق یہاں سے جنگلی ایندھن سمیت 4,130 خروار وصول ہوتے

تھے۔ چنانچہ یہ بات اخذ کی جاسکتی ہے کہ اکبر کے عہد میں 12,69,281 مالیہ اراضی کے طور پر وصول ہوتا تھا مگر ان قصبوں میں کاہچرائی فیس، جنگلاتی واجبات اور دیہی ملازمین پر عائد ٹیکس کی وصولی بھی شامل تھی۔ یہ اور بھی بدقسمتی کی بات ہے کہ اس بارے میں بھی کچھ معلوم نہیں کہ مالیۂ اراضی کس قدر وصول ہوتا تھا۔ ایک تاریخ کی کتاب کا بیان ہے کہ کشمیر پر مغلوں کا قبضہ مالی لحاظ سے سودمند نہیں تھا اور عین ممکن ہے کہ 1,26,931 ایک لاکھ چھبیس ہزار نوسو اکتیس روپے کی مطلوبہ رقم مکمل طور پر جمع نہ ہوتی ہو۔ ہمیں یہ بات معلوم ہے کہ اکبر کے عہد میں کشمیر کے دیہات کی حالت کسی طور پر خوش حال نہیں تھی جبکہ سرینگر میں خوشیوں کا ماحول تھا(3)۔ بعد کے مالیاتی اعداد وشمار کے ساتھ مغل دور کا موازنہ کرنے کے لیے ہمیں یہ فرض کرنا ہوگا کہ شہر سرینگر کے سوائے وادی کی مالیاتی طلب 12,69,381 روپے تھی جبکہ مجموعی مالیاتی مطالبہ 14,47,114 روپے تھا۔

مقامی تاریخوں کے مطالعے سے یہ حیران کن بات سامنے آتی ہے کہ پٹھانوں کے عہد میں کشمیر میں مالیات کا تخمینہ 60,00000 روپے تھا۔ ہمیں یہ تو معلوم نہیں کہ اس وقت روپے کی کیا قیمت تھی مگر یہ بات آسانی سے کہی جاسکتی ہے کہ پٹھانوں نے بھی وادی سے 60,00000 روپے خون چوس کر وصول کیے ہوں گے۔ غالباً کشمیر کی اصطلاح میں دیگر علاقے بھی شامل ہوں گے مگر اس بات کی کوئی معتبر شہادت موجود نہیں کہ 60,00000 روپے وصول کیے گئے چنانچہ اس معاملے پر مزید بحث کرنا فضول ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ سکھ عہد میں مالیاتی مطالبہ 28,00000 روپے تھا اور یہ کہ غلام محی الدین نے 26,00000 روپے جمع کئے مگر یہاں بھی اس بات کا ذکر نہیں کہ روپے کی قیمت کیا تھی۔ ہوسکتا ہے کہ سکھ عہد میں ہری سنگھ روپے کا چلن تھا جس کی قیمت آٹھ آنے تھی۔ چنانچہ اس بات کا ذکر کرنا درست ہوگا کہ غلام محی الدین نے جو 26,00000 روپے جمع کیے تھے وہ ہری سنگھ روپے تھے(4)۔ اور یہ رقم اس حساب سے تیرہ لاکھ روپے ہوتی ہے جو مغل عہد کے مالیاتی مطالبات سے ڈیڑھ گنا کم ہے۔ یہاں پر اس بات کی وضاحت کرنا لازمی ہے کہ غلام محی الدین کے دور حکومت میں مظفرآباد بھی شامل تھا۔ مسٹر باورنگ کی ایسٹرن ایکس پیرنسز کے مطابق ظاہر ہوتا ہے کہ 1861 کے قریب کشمیر کا مالیہ اراضی ڈیڑھ لاکھ پونڈ سے زیادہ نہیں تھا جب کہ کل مالیہ

ڈھائی لاکھ پونڈ تھا۔ مسٹر باورنگ کے ایک روپے کی قیمت دو شلنگ لگائی۔ لہٰذا اگر اس کا تخمینہ درست ہے تو مالیہ اراضی 1,50,000 روپے ہے۔

اس کے دو برس بعد 72-1871 میں مالیاتی وصولیوں کا تخمینہ جات کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ بدقسمتی سے یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ آیا یہ تخمینہ کبھی وصول کیا بھی گیا یا نہیں۔ بجٹ کے لیے ذمہ دار شخص ایک پرامید شخص تھا کیونکہ وہ مالیاتی وصولیوں کا تخمینہ 41,79,152 روپے لگاتا ہے اور شہری اخراجات کی رقم 4,50,600 روپے تھی۔ میں وصولیات کے عنوانات درج کرتا ہوں۔ ان میں سے زیادہ تر وادی کے حوالے سے ہی ہیں مگر ان میں سے چند بشمول قصباتی محصولات اور کسٹمز، افیون، ٹکیاں وغیرہ میں قدرتی طور پر جموں بھی شامل ہے۔ دکانوں اور کاریگروں پر ٹیکسوں کی بابت میں نے جو تفصیلات فراہم کی ہیں وہ کافی دلچسپی کی حامل ہیں۔ ان میں سے بہت ساری غائب ہو چکی ہیں جن میں شالوں پر اجارہ داری شامل ہے مگر ان سے کشمیر میں ٹیکسوں کی عالمی نوعیت کا پتہ چلتا ہے۔ چلکی روپے کی قیمت دس آنے ہے۔

وصولیات کے تخمینہ جات بابت سال 72-1871 چلکی روپے

چاول کی فصل سے سرکار حصے کی قیمت	29,44,844
نقدی وصولیات	14,96,741
شعبہ شال سے وصولیات	600000
ادنیٰ سربراہوں سے خراج	37,163
قصباتی ٹیکس اور کسٹم	5,76000
لکڑی	1,14,210
بھیڑ اور بکریاں	1,17,311
افیون	1,56,000
مقدس ہندوؤں کا چڑھاوا	98,647
گائیں اور بھینس	18,625
کشتیاں	15,599

تمباکو	40,840
عدلیہ	18,692
چرس یا منشیات	21,000
زعفران	34,656
ابریشم	50,000
ختنے	600
جھیل ڈل سے وصولیات	20,792
سنگھاڑہ	35,675
کرایہ پر لیے گئے گھوڑے	51,178
زرقاضیہ (ادنیٰ جھگڑوں پر عائد شدہ جرمانے اور شادیوں پر فیس)	17,250
ٹکسال	12,600
اسٹامپ	9,600
متفرق جرمانے	17,230
ڈاک خانہ	5,312
جنگلی پھلوں کی فروخت	1,350
سرکاری گھوڑوں کی فروخت	67,500
چنار کے پتوں کی فروخت	25
سرکاری باغات کے پھل	3,708
دکانوں، کاریگروں وغیرہ پر ٹیکس	1,13,916
میزان	66,86,644

دکانوں، کاریگروں اور دوسروں پر ٹیکس کی تفصیلات:

چینی بنانے والے	8,110
میوہ فروش اور اچار بنانے اولے	8,891

نانوائی..........................
8,385..........................

آٹا پیسنے والے..........................
7,400..........................

مکئی فروش..........................
4,800..........................

حمال..........................
775..........................

گلکار..........................
1500..........................

نجار..........................
2,995..........................

سپاری فروش..........................
365..........................

قصاب..........................
21,750..........................

کپاس کے کاشتکار..........................
380..........................

آہنگر
795..........................

سنار..........................
992..........................

ٹھٹھیرے..........................
150..........................

رنگ ساز..........................
3,450..........................

اونی دھاگے کے تاجر..........................
2,829..........................

طوائفیں..........................
1,900..........................

بزاز..........................
1,250..........................

چوڑی فروش..........................
575..........................

حلال خور..........................
11,925..........................

ہتھیاروں کے قلعی گر..........................
160..........................

باغبان..........................
3,110..........................

ٹیپ بنانے والے..........................
706..........................

کاشتکار اور مرکبان..........................
1,850..........................

کپڑے کے دلال..........................
1,430..........................

لکڑی چیرنے والے..........................
215..........................

کپڑا سینے والے	120
چاقو بنانے والے	85
رنگ ساز	275
ٹوکریاں بنانے والے	180
جوتے بنانے والے	550
گورکن	810
پتھر ڈھونے والے کشتی ران	700
زمین کھودنے والے	40
لکڑہارے	630
نقدی کے کاروباری	716
مینا کار	192
چمڑے کے تاجر	160
اونی کپڑے بنانے والے	165
کمان ساز	475
چرواہے	12,677
جولاہے	2,160
جونک فروش	913
کنگھی ساز	30
ایندھن فروش	400
چاول کی روٹی بنانے والے	623
کاغذ گر	775
متفرق	366
کل	1,13,916
بادشاہی روپے کے مطابق	71,197

سرینگر میں محصولیات

دکانوں اور دستکاروں پر عائد ٹیکسوں کا طریقہ اب ختم کر دیا گیا ہے مگر چونگی کی صورت میں حاصل کی گئی وصولیات کی رقم کم نہیں کی گئی ہے کیونکہ یہ کشمیر تک درآمد کے محصولات کی صورت کے ساتھ شامل ہوتی ہے۔ شہر کے لوگوں کی خاص غذا چاول ہے۔ اور میرے مشورے پر اسے چونگی سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔ میری پر زور رائے ہے کہ سرینگر میں براہ راست محصولات کافی موزوں ہیں۔ موجودہ نظام جس کے مطابق بلدیاتی اخراجات کو عام وصولیات سے حاصل کردہ ایک حصے سے پورا کیا جاسکتا ہے۔ حقیقی بلدیاتی زندگی اور اقتصادیات کے لیے تباہ کن ہیں۔ سرینگر میں واٹرورکس کی تعمیر اور صحت وصفائی کو بہتر بنانے پر اس وقت بھاری رقم صرف کی جارہی ہے۔ اس ملک کی وصولیات کو مواصلات اور آب پاشی کے کاموں کے لیے وقف کیا جانا چاہئے ان رقومات کو بلدی لوازمات کے لیے خرچ کیا جانا چاہیے۔

72-1871 کے تخمینہ جات سے پتہ چلتا ہے کہ مالیہ اراضی کی وصولیات کی رقم 27,75,990 روپے ہے۔ اس رقم میں مظفر آباد سے وصول شدہ 84,000 روپے کی رقم بھی شامل ہے مگر دوسری وادی کی مالیہ اراضی کی طلب کو رد کرنے کے بعد میرے خیال میں یہ رقم وصول کی جاسکتی ہے۔ 1887 میں میرے پیش رو کو مالیۂ اراضی کا جو تخمینہ فراہم کیا گی وہ 1600754 روپے ہے مگر کسی اور جگہ بیان کیا ہے کہ ان مالیات کا وجود محض کاغذی تھا۔ 1880 سے 1888 تک مالیہ اراضی کی حقیقی وصولی صرف 12,68,280 روپے تھی۔

میں یہاں پر وادیٔ کشمیر میں 1888 سے 1893 تک مالیہ اراضی اور زمینی مالیہ کی وصولی کے اعداد وشمار درج کرتا ہوں:

1888-89	21,31,258
1889-90	12,55,734
1890-91	12,48,374
1891-92	12,49,614
1892-93	140,6,634
1893-94	14,79,839

دلچسپ بات یہ ہے کہ ان مدوں سے وصول شدہ رقومات کو جن میں عدالتی فیس، محصول، ڈاک وتار اور دیگر متفرق ذرائع شامل ہیں اور جن میں لکڑی کے ڈبوں، باغات، رکھیں اور چوب کوٹ کھیت شامل ہیں نہایت دلچسپی کے ساتھ دیکھا جائے۔

1888-89	5,53,120
1889-90	5,72,240
1890-91	40,2,859
1891-92	5,93,441
1892-93	6,27,119
1893-94	9,15,265

میرا بنیادی تعلق وادی کشمیر کے مالیہ اراضی کے ساتھ ہے۔ مگر مالیہ اراضی میں اضافے کے ساتھ متفرق ذرائع سے ہونے والی آمدنی بھی اہمیت رکھتی ہے۔ میں نے نئے بندوبست سے متعلق باب میں دکھایا ہے کہ میرا مقصد مالیہ اراضی میں سالانہ 1,85,103 روپے اضافہ کرنا ہے۔ یہاں اس بات کو ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ اس رپورٹ تک 18,115 ایکڑ غیر آباد اراضیات پر اجازت سے سالانہ 51,893 روپے مالیہ اراضی حاصل ہوں گے۔ میں وادی کشمیر کو ایک نہایت روشن مستقل ملک تصور کرتا ہوں۔ اگر اس کا دانشمندی سے بندوبست کیا جائے اور اگر دیہی آبادی میں اضافہ ہو تو آئندہ دس برسوں کے دوران مالیہ اراضی میں اچھا خاصا اضافہ ہونے کا امکان ہے۔ اب تک موصولہ اعداد وشمار قابل اعتبار ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اعداد وشمار مغل دور سے زیادہ ہیں۔

دور	وادی کشمیر کی آمدنی
مغل	12,69,381
پٹھان	نامعلوم
سکھ	13,00000
ڈوگرہ	

1860 15,00000

1871(اندازاً) 27,75,990

(اصلی) .... نامعلوم

1887(اندازاً) 5,42,07,542

(اصلی) .... نامعلوم

1888(اصلی) 12,31,258

میں ماضی اور حال کے درمیان تقابلی جائزے کی کوشش کرر ہاہوں ۔ یہاں پر اس بات کو ذہن نشین کیا جانا چاہیے کہ جب راجہ رام سنگھ سی بی او سر امر سنگھ کے سی ایس آئی کو کاشت شدہ اراضیات کے بھاری قطعات حاصل ہوئے تو مالیہ اراضی کو منتقل کرایا گیا۔ جب سے مالیہ اراضی کی مفروضہ وصولی 74,607 روپے بھی۔ اس کے علاوہ سال 1872 میں دیوسر اور شوپیان تحصیلات میں واقع 57 دیہات راجپوتوں کو منتقل کرائے گئے جن سے 59,490 روپے بطور مالیہ اراضی وصول ہوتے تھے۔ ایک بار پھر 1891 میں 6,305 روپے کا مالیہ اراضی مذہبی عطیات کے لیے وضع کردیا گیا۔ ان تفصیلات سے مجموعی طور پر 1,40,402 روپے کا مالیہ اراضی بنتا ہے اور جب 1861 کے مالیہ اراضی کا تقابلی جائزہ لیا جاتا ہے تو اس بات کو ذہن نشین رکھا جانا چاہیے۔

میرے محکمے کی طرف سے کل 190555 ایکٹر رقبے کا سروے کیا گیا۔ ہم نے جھیلوں اور پہاڑوں مثلاً تخت سلیمان اور اشک ٹینگ کے سوائے تمام کاشت اور غیر کاشت شدہ علاقوں کو شامل کیا ہے جو اس وادی میں واقع ہیں۔ جنگلات اور پہاڑی اطراف کو اس میں شامل نہیں کیا گیا ہے اور پہاڑی ڈھلوانوں پر واقع دیہات کی حدود کا تعین کاشت کی مدد سے کیا گیا ہے۔ جہاں پر دیہات کا محل وقوع کسی پہاڑی کے دور افتادہ کونے پر ہے ہم نے اس کے فاصلے کے درمیان واقع قطعہ اراضی کو شامل نہیں کیا۔ پس وادیٔ کشمیر سے 40 میل کے فاصلے پر وادیٔ گریز واقع ہے۔ 1,95,555 ایکڑ کے عمومی رقبے میں گریز کا حصہ 6054 ایکڑ کاشت شدہ رقبہ ہے اور یہ گریز کے دیہات کی نمائندگی کرتا ہے۔ پہاڑی اطراف اور جنگلات کے درمیان قطعات اراضی اس میں شامل نہیں ہیں۔ عین ممکن ہے کہ آبادی میں اضافے کے ساتھ کاشت کی حدود پہاڑوں کی

چڑھائی تک پہنچ جائیں۔ ہمیں پہلے ہی جنگلات اور پہاڑی ڈھلوانوں کی ان اراضیات کو وضع کرنے کے لیے کافی درخواستیں وصول ہوئی ہیں جو دیہی حدود سے باہر واقع ہیں۔ ایک لاکھ پچانوے ہزار پانچ سو پچپن ایکڑ کا کل رقبہ کشمیر کے زیر قبضہ ہے جسے وہ زرعی مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں جو رقبہ واپس ہوا ہے اس میں سے کافی حصہ دلدلی زمین کا ہے جہاں تب تک کاشت ممکن نہیں جب تک پانی کے نکاس کا انتظام نہ ہو۔ ان جوہڑوں کے اردگرد دیہاتوں کو اپنے مال مویشی چرانے کے عمدہ قسم کا علاقہ میسر ہے اور ایک یا دو برس اگر بارش نہ ہو تو ان جوہڑوں اور دلدلی زمینوں کے کناروں پر کاشت کے مقصد سے زمین حاصل ہو جائے گی۔ یہ جوہڑ آس پاس رہنے والے لوگوں کو بھاری مقدار میں خوراک بھی فراہم کرتے ہیں اور انھیں کاشت کا معاون قرار دیا جا سکتا ہے۔ جن علاقوں کا سروے کیا گیا اس میں راجہ رام سنگھ سی پی اور راجہ امر سنگھ کے سی آئی کی جاگیرات شامل نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ چند ایسے چھوٹے چھوٹے دیہات بھی شامل نہیں کیے گئے جن میں مالیہ اراضی معاف ہے۔

جن علاقوں کی میں بات بیان کر رہا ہوں وہ ہیرفورڈ، ہرٹ فورڈ اور ہنٹنگڈن علاقوں کی مجموعی آبادی سے زیادہ ہے۔ فصلوں کے زیر کاشت رقبہ آکسفورڈ شائر سے 5000 ایکڑ زیادہ ہے۔

حجم اور ضخامت کے معاملے میں ہندوستان بھر میں سرینگر کا 22واں درجہ ہے۔ یہ ایک جہد عمل میں مصروف شہر ہے جس کا رقبہ 3795 ایکڑ ہے۔ اس رقبے میں چند علاقے گنجان آباد، چند کم آباد اور چند علاقے آباد ہیں۔ اس میں سرینگر کے بیرونی علاقے تخت سلیمان کی ڈھلوانوں اور دریائے جہلم کے درمیان واقع ہیں اور سونہ وار گاؤں بھی سرینگر کا ایک حصہ ہے۔ تین ہزار سات سو پچانوے ایکڑ علاقے میں 1,39,410 نفوس آباد ہیں جن میں سے 96062 دریائے جہلم کے دائیں کنارے اور 43,348 بائیں کنارے پر آباد ہیں۔ شہر کے نہایت گنجان آباد اور پرہجوم وہ علاقے ہیں جو دریا کے کناروں کے قریب واقع ہیں۔ دریا اور نالہ مار کے درمیان فی ایکڑ زمین پر 100 افراد آباد ہیں جبکہ کٹہ کول اور دریا کے درمیان کی آبادی 100 فی ایکڑ ہے۔ سونہ وار سے آخری پل (صفا کدل) تک دریا کی لمبائی 606 میل ہے اور براہ راست 3 میل ہے۔ پہلے پل (امیرا کدل) سے آخری پل تک دریا کی براہ راست لمبائی 271 میل ہے۔ دریائے

دودھ گنگا سے جھیل ڈل تک دریا کی براہ راست چوڑائی 2 میل ہے۔

شہر کی اصلی آبادی، جس کا نیم شہری اور شہری آبادی سے امتیاز کیا گیا ہے، 1,18,960 افراد پر مشتمل ہے۔ یہ 1,18,960 افراد مندرجہ ذیل پیشوں اور کاروبار میں مصروف عمل ہیں۔

1۔انتظامیہ اور دفاع	10,482 ....
2۔زراعت پیشہ اور مال مویشی پالنے والے	3,246 ....
3۔گھریلو اور ذاتی خدمات	11,660 ....
4۔سودا سلف فروش اور کاریگر	65,395 ....
5۔تجارت و مواصلات	8,309 ....
6۔عالم اور فنون لطیفہ کے پیشہ ور	8,371 ....
7۔غیر مسلسل کاروبار اور بے کار	11,497 ....

ان زمرات میں سے 4 میں سرینگر کے حقیقی کارکن شامل ہیں ان میں 62,395 افراد میں سے اون کی صنعت میں ہی 22,501 افراد مصروف کار ہیں۔ درزیوں اور رفوگروں کی تعداد ایک 1,31,171 ہے جبکہ دوسروں کے کاروبار نہایت کم تر ہیں جن کی عظیم مشرقی شہر کی ضروریات کے مطابق ذیلی تقسیم کی گئی ہے۔

ان میں سے سب سے اہم قابل ذکر شیر فروش 2,601، قصاب 432، غلہ فروش 3,437، سبزی فروش 2069، پھل فروش 1,348، تمباکو فروش 945، گھاس اور ایندھن فروش 1077، زرگر اور سیم گر 1,827، سوزن کار 1027، تانبہ گر 606، نجار 1,316، کیمیات وادویات فروش 557 اور بوٹ وجوتے ساز 1,606 ہیں۔

نمبر پانچ کی زمرہ بندی نہایت چھوٹی ہے جیسا کہ کہیں اور وضاحت کی ہے۔ اب تک اس ملک کی تجارت حکومت کے ہاتھوں میں رہی ہے اور توقع کی جاتی ہے کہ زمرہ میں شامل افراد انتظامیہ سے غائب ہو جائیں گے اور تجارات کے میدان میں ذریعۂ معاش تلاش کریں گے۔ ان 8,309 افراد میں سے 3,382 کشتی کے ذریعے نقل وحمل میں مصروف کار ہیں۔ چنانچہ کشمیر کا

کاروبار عملی طور پر 4,727 افراد کی طرف سے چلایا جارہا ہے۔

زمرہ نمبر 6 سے ظاہر ہے کہ 8,371 افراد میں سے 6,519 ذریعہ معاش کے طور پر دین یا مذہب پر دارومدار رکھتے ہیں۔ ان میں دوسوسات ادیب ہیں، قانونی پیشے سے 48 افراد روزگار حاصل کرتے ہیں جبکہ طبی اور زچگی کے کاروبار میں سے 738 کارکن اور ان کے لواحقین شامل ہیں۔

زمرہ نمبر 7 سے ظاہر ہے کہ شہر میں 1,254 گداگر ہیں۔ ان تمام لوگوں نے تمام قسم کی شرم وحیا کو کھو کر گداگری کا پیشہ اختیار کیا ہوگا، یہ لوگ شہر میں گداگر بن کر اس لیے آتے ہیں کیونکہ یہاں پر خوراک سستی ہے اور اجرتیں کافی زیادہ ہیں۔ چنانچہ سرینگر میں انھیں آسانی سے بھیک اور خیرات مل جاتی ہے۔

اوزان اور پیمانے

برطانوی روپے کے علاوہ کشمیر میں تین قسم کے سکّے مروج ہیں۔ یہ ہیں:

خام روپیہ جس کی قیمت برطانوی 8 آنے ہے۔ اس پر آئی۔ ایچ۔ ایس الفاظ کندہ ہیں۔

چلکی روپیہ جس کی قیمت برطانوی 10 آنے ہے۔

نانک شاہی روپیہ جس کی قیمت برطانوی 16 آنے ہے۔

نانک شاہی روپیہ اب مروج نہیں اور اس مملکت میں برطانوی یا عرف عام میں ڈبل روپیہ اب زیادہ مروّج ہو رہا ہے۔ بہرحال دیہاتی لوگ ابھی بھی خام یا چلکی روپوں کی صورت میں حساب وکتاب کرتے ہیں۔ اس سے بھاری ابہام پیدا ہوتا ہے حتیٰ کہ اس معاملے میں روپے کی قیمت کے بارے میں صحیح تفہیم حاصل ہو۔ دس آنے کی مالیت کا چلکی روپیہ حساب وکتاب کی بہترین بنیاد فراہم کرتا ہے۔

اوزان (کھار)

ایک خروار (کھار) یا ایک گدھے کا بوجھ کشمیر میں صدیوں سے وزن کا پیمانہ مانا جاتا ہے۔ اب اس لفظ کا مخفف ہوگیا ہے جو گدھے کے کشمیری ترجمہ کھر سے لیا گیا ہے۔ سرینگر میں ناپنے کا کوئی معتبر پیمانہ نہیں ہے مگر بسا اوقات اپنے تجربات کی بنا پر مجھے معلوم ہوا کہ ایک گز سولہ گرہ کا

ہوتا اور برطانوی گز سے 0-5 انچ زیادہ ہوتا ہے۔

قیمتیں

اپنی ابتدائی رپورٹ میں ڈاکٹر ونگیٹ کا مشاہدہ ہے کہ کشمیر میں قیمتوں کا کوئی رواج نہیں تھا۔ 1889 میں جب میں نے کام شروع کیا تو یہ صحیح ہے کہ بہت ساری قیمتوں کا کوئی وجود تک نہیں تھا۔ تنخواہوں کی ادائیگی غلے کی صورت میں کی جاتی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ 1889 میں مجھے نقدی کی بجائے تلہن لینے کے لیے کہا گیا تا کہ میں اپنی ذات اور اپنے محکمے کو تنخواہ کی ادائیگی کر سکوں۔ تلہن کو ایک اچھا زربدل (کرنسی) تصور کیا جاتا ہے۔ جبکہ بہت سارے لوگوں کو مکئی اور گری دی جاتی تھی مگر اسے خسارہ زدہ ذریعۂ ادائیگی کہا جاتا تھا۔ حکومت نہ صرف اپنے ملازمین کو غلے کی صورت میں ادائیگی کرتی تھی بلکہ پرائیوٹ لوگ بھی اپنے ملازمین کو اسی انداز میں ادائیگی کرتے تھے۔ ایک گھریلو نوکر کو عام مزدوری کی صورت میں سولہسے بیسخر وار شالی دی جاتی تھی۔ کافی حد تک شالی کی کرنسی (زربدل) مروج تھی۔ اور چاندی کو ملک کے کاروبار میں ذیلی حیثیت حاصل تھی۔ بدقسمتی کی بات ہے کہ اعداد وشمار کے مقصد سے ان سکوں کی تعداد اور مقدار ظاہر نہیں ہوتی جو کشمیر میں استعمال کے لیے سرکاری ٹکسال میں گھڑے جاتے تھے۔ جو جموں اور ہز ہائنس مہاراجہ کے تحت دوسرے علاقوں سے نمایاں صورت رکھتے تھے۔ جموں ٹکسال میں چاندی کے علاوہ ایسے پرانے سکے استعمال کیے جاتے تھے جو غیر مروج ہو چکے تھے۔ یہاں پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ جو مواد سکوں میں استعمال ہوتا تھا اس میں سونا ایک تہائی وزن کا تھا۔

اس کے علاوہ چلکی روپے کی قیمت دس آنے ہے اور اچھی خاصی تعداد میں برطانوی روپوں کا بھی چلن ہے۔ کشمیر میں آنے والے سیاح یہاں پر برطانوی روپے لاتے ہیں اور حالیہ برسوں کے دوران جس کرنسی میں مالیہ اراضی کی ادائیگی ہوتی ہے اس میں خاطر خواہ تعداد برطانوی سکوں کی صورت میں بھی ہوتی ہے۔

یورپی سیاحوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ 1888 میں مستقل یورپی باشندگان کی تعداد بھی اب اچھی خاصی ہے جن کی نمائندگی مشنری کرتے ہیں۔ یورپی باشندے یقینی طور پر نقدی کی صورت میں ادائیگی کرتے ہیں۔ اگر چہ رفاہ عامہ کے کاموں کے مقابلے میں

وہ رقم برائے نام ہو کر رہ جاتی ہے مگر اسے اس لئے بھی اہمیت حاصل ہوئی ہے کہ یہ غلّے کے چلن کے بجائے چاندی کی کرنسی کی صورت میں ادا ہوتی ہے۔

1889 میں کوہالہ سے بارہ مولہ تک کی سڑک کھولی گئی۔ اس سڑک کی تعمیر سے سیاحوں اور تجارت کی آسان آمدرفت کے علاوہ اس تعمیر سے حکومت کو 21,78,877 روپے کی آمدنی ہوئی ہے اور بھاری تعداد میں سکوں کا چلن ممکن ہوا ہے۔ اس کے بعد سرینگر سے گلگت تک سڑک تعمیر کرنے کے لیے پندرہ لاکھ اٹھارہ ہزار روپے سرکاری خزانے سے واگذار کئے گئے جب کہ سالانہ 6,50000 روپے غلّے کی خریداری کی بہم رسانی، گلگت قلعے کو رسدات کے لیے اجرتوں اور مال گاڑیوں کی ادائیگی کے لیے ہوتی ہے۔

سرینگر میں پانی کی بہم رسانی (واٹر ورکس) پر تین لاکھ پانچ ہزار روپے کے مصارف ہونے کا اندازہ ہے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے پانچ برسوں کے مختصر عرصے کے دوران اچانک اس سکے کا چلن عام ہوا ہے اور یہ بھی دیکھا گیا فوج اور اہلکاروں کو غلّے کی صورت میں ادائیگی کے بجائے اب باقاعدہ نقد ادائیگیاں ہونے لگی ہیں۔ تعمیرات عامہ کے معاملے میں چنانچہ یہ سمجھا جائے گا کہ کشمیر کی کرنسی میں افراطِ زر پیدا ہوئی ہے۔ قدرتی طور پر اس کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ اشیا ضروریہ کی قیمتوں اور اجرتوں میں اضافہ ہوگیا ہے، مگر مجھے اس بارے میں قطعی یقین نہیں کہ قیمتوں میں یہ اضافہ مستقل ہوگا۔ عوام کی اہم غذا شالی قیمتوں کو اعتدال پر رکھا گیا ہے۔ جزوی طور پر یہ بات مصنوعی طریقوں اور جزوی طور پر کاشت میں توسیع اور بہتری لائے جانے سے ممکن ہوسکی ہے۔ اس سال اور گزشتہ برس (1893 اور 1894) کے دوران گزشتہ کچھ برسوں کی نسبت ارزانی رہی ہے مگر جن دیگر اشیا پر حکومت کا کنٹرول ممکن نہیں ان کی قیمتوں میں اضافے کا رجحان جاری ہے۔ اگرچہ بجاطور پر شالی کی قیمتوں کو اجرتوں کی بنیاد بنایا گیا ہے مگر قدرتی طور پر اب یہ اس ملک کی کرنسی کا درجہ نہیں رکھتی اور نہ ہی دوسری مصنوعات کی قیمتیں مقرر کرنے کے لیے شالی کو اب معیار تصور کیا جاتا ہے۔ شہر کے پنڈتوں نے اکثر مجھ پر الزام لگایا کہ میں نے زرعی پیداوار کی قیمتوں میں اضافہ کیا ہے۔ مقررہ آمدنی والے لوگوں کے لیے قیمتوں میں اضافے کے پیش نظر بھاری مشکلات کا سامنا ہوتا ہے مگر اس بندوبست اراضی کے بہت سارے مخالفین خود بھی مالکان

زمین تھے مگر وہ اس بات کو یکسر بھول گئے کہ اگر چہ انھیں ملازمین کی اجرتوں کی صورت میں نقصان ہوا ہے مگر انھیں اپنی پیداوار کی جو قیمت وصول ہو گی اس سے انہیں فائدہ ہوا ہے۔ میں اس بات کی وضاحت کرنا غیر ضروری تصور کرتا ہوں کہ اس بندوبست کا قیمتوں میں اضافے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی قیمتوں میں اضافے اور کرنسی کے تعلقات کی بابت ریکارڈ کا حوالہ دینا لازمی سمجھتا ہوں۔ سرینگر کے پنڈتوں کے لیے یہی دلیل کافی ہے۔ بااختیار مشاہدین کے مطابق اس وقت چاندی کی مقدار پٹھانوں کے عہد کی نسبت زیادہ ہے۔ مختصر یہ کہ جو چاندی خزانہ عامرہ میں جمع تھی وہ اب کشمیر میں مروّج ہو گئی ہے۔

1887 سے دیہی مصنوعات کی قیمتوں میں مندرجہ ذیل اضافہ ہوا ہے۔

ادنیٰ کمبلوں کی قیمت تین اور چار روپے ہو گئی ہے۔

سن 1887 سے بیلوں کی قیمت ایک روپیہ سال کے حساب سے چڑھی ہے۔

گھی کی قیمت ایک روپے میں چار سیر ہوا کرتی تھی اب یہ قیمت ایک روپیہ میں تیاڈھائی سیر ہے۔

ایک ٹٹو کی قیمت 15 روپے کے قریب تھی مگر گلگت سڑک کی تعمیر کے سبب ٹٹوؤں کی مانگ بڑھ جانے سے اب یہ قیمت 25 روپے سے 35 روپے ہو گئی ہے۔

اخروٹ کی قیمت 3 روپے فی خروار تھی اب یہ قیمت 8 روپے فی خروار ہے۔

اون کی قیمت فروخت ایک روپے میں دو سیر تھی مگر اب یہ قیمت ایک روپے میں ڈیڑھ سیر ہے۔

مواصلات

کشمیر سے باہر جانے کے لیے بہت سارے درے ہیں۔ ابوالفضل نے ایسے چھبیس دروں کا ذکر کیا ہے، لیکن مندرجہ ذیل نقشہ مسافروں اور تاجروں کے اختیار کردہ کئی دروں اور راستوں کو دکھاتا ہے:

محل وقوع..........نام..........بلندی (فٹ)..........منزل......سرینگر سے

......راز دیانگن......11,800......گریز..........73

شمال......برزل......13,600......گلگت......230

......نار بل......11,570......کشتواڑ......109

......بانہال......9.200......جموں......147

....سیالکوٹ......174

......پیر پنچال......11,400......بھمبر......148

مشرق......مارگن......11,600......واڑون......

......زوجیلا......11,300......لداخ......252

......قراقرم......18,317......یارقند......7777

......سکت ون......18,137......

مغرب......توسہ میدان......10,500......پونچھ......69

....جہلم......173

شمال مغرب......نآش نار......10,200......کرناہ ٹیٹوال......88

....مظفرآباد......119

....ایبٹ آباد......163

●❋❋❋●

حوالہ جات

(1) سیکرٹس آف دی پرزن ہاؤس۔ آرتھر گرفتھ۔ جلد ا۔ ص356

(2) یہودی عقیدے کے لوگ چمڑے کی ڈبیاں کو بائیں بازو پر باندھتے ہیں۔

(3) کئی سال تک شہر میں خوشحالی کا سماں رہا۔ جہاں ہر قسم کے کارکن کثرت سے موجود ہیں۔ (آئین اکبری)

(4) مورکرافٹ نے 1823 میں لکھا ہے کہ ہمارے دور ے کے وقت کسان پنجابی سکے میں 3800000 روپے ادا کرتے تھے جو 290,000 پونڈ کے برابر ہے۔ اس بارے میں ایچ ایچ ولس نے یہ اضافہ کیا ہے کہ مشکل سے ہی مالیہ وصول ہوتا تھا۔ 1836 میں 23 لاکھ روپے کا مطالبہ کیا گیا مگر بیرن ہیوگل کے مطابق یہ توقع نہیں تھی کہ اس قدر رقم جمع کی جا سکے گی۔ کہاں جاتا ہے کہ رنجیت سنگھ نے 1838 میں اس رقم میں کمی کر کے اٹھارہ لاکھ کر دی مگر یہ رقم اُس وقت جمع نہ ہو سکی۔

●❀❀❀●

دسواں باب

سماجی زندگی

دیکھو یہ پہاڑیاں، وادیاں، جنگل، سرمئی دھند میں گھرے ہوئے ہیں
کھیت اور کوٹھے پہاڑوں میں دو گنے ہو گئے ہیں
لبالب وادیوں میں پانی میں مویشی چر رہے ہیں
جھونپڑوں کی چمنیاں جنگلوں میں دھواں اُگل رہی ہیں
اور جھونپڑوں سے ملحق باغات کی
مہک سے رچی بسی ہوا ہے۔
آورورالیگ

گاؤں

کشمیر کا گاؤں بے حد خوبصورتی کا حامل ہے۔ اخروٹ، سیب اور خوبانی کے درختوں کی چھاؤں، صاف شفاف چمکدار گھاس سے بھرے کناروں پر بید کی مونگیاں، سرخ جڑوں کے اردگرد چاول کے پودوں کا گھیرا یا نرگس کے سیاہ خوبصورت کھیت یا سیاہ پتوں والے دھان کی دوسری قسمیں ان تمام کو ملا کر کشمیری گاؤں بے حد قدرتی حسن اور کشش کا حامل ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی دھان کی لہلہاتی بالیاں ایک پٹری کی مانند دکھائی دیتی ہیں جن کا رنگ بادامی سے تانبے کا

ہو جاتا ہے۔ دھان کی بالیاں گوناگونی کی حامل ہوتی ہیں جو گہرے کاسنی سے زیتونی، سیاہ اور ہلکے سبز سے گلابی اور دیسی سرخ تمام مل کر آفتاب کی روشنی میں جلتی ہوئی دھات کی مانند معلوم ہوتے ہیں۔ اس گہرے خطے میں سے کسان کی جھونپڑی جھانکتی ہے۔ اس کی گھاس کی ڈھلوان چھت نیچے کی طرف سرکتی ہے۔ ہر جھونپڑی کے ساتھ سبزیوں سے بھرا ایک باغیچہ ہے۔ اس کے قریب ہی لکڑی کا وہ کوٹھار ہے جس میں غلّہ رکھا جاتا ہے۔ جو ایک بڑے سنتری بکس کی مانند کھڑا کیا گیا ہے۔ اس کے نچلے حصے میں کیے گئے سوراخ سے غلّہ باہر نکالا جاتا ہے اس جھونپڑی کے آنگن میں عورتیں مکئی اور دھان کوٹنے میں مصروف دکھائی دیتی ہیں۔ ایک جانب روئی کاتنے کا ایک چرخہ رکھا گیا ہے۔ کتّے سو رہے ہیں اور بچے دھوپ میں لوٹ پوٹ ہوتے نظر آتے ہیں جب کہ ان کے بڑے بھائی اور دوسرے بچے دودھ دینے والی گایوں اور مویشیوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ ندی پر ایک عجیب قسم کا غسل خانہ ہے جہاں پر دیہاتی نہایت آرام کے ساتھ وضو کرتے ہیں۔ اور اس غسل خانے کے نیچے بطخیں للچاتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ قبرستان بھی گاؤں کا ایک نہایت خوبصورت مقام ہے۔ چمکتے ہوئے شوخ قرمزی سفید گل سوسن اور زرد (زمبک) پھول اکثر داغ مفارقت دینے والے رشتے داروں کی قبروں پر لگاتے ہیں۔ گاؤں میں کافی کھلی جگہ ہوتی ہے۔ گھروں اور مکانوں کا ہجوم نہیں ہوتا۔ ہر ایک شخص کے مکان کے ارد گرد مٹی، پتھروں یا بانس کی چہار دیواری ہوتی ہے۔ باغ کے گرد کی دیواریں نہایت سادگی اور خوش تدبیری سے تعمیر کردہ ہیں۔ مٹی کو لکڑی کے تختوں سے تیار کردہ سانچوں میں ڈھالا جاتا ہے اور مٹی کے ان سانچوں کی چوٹی پر کانٹے بچھائے جاتے ہیں۔ اس پر مزید مٹی ڈال دی جاتی ہے۔ کانٹوں کی یہ پرت دیواروں کی بارش سے حفاظت کرتی ہے اور یہ ڈھانچہ چند برسوں تک قائم رہتا ہے۔ اس قسم کی دیواروں کو دوس کہتے ہیں۔

مکان

مکان کچی اینٹوں سے تعمیر کیے جاتے ہیں جنھیں لکڑی کے چوکھٹوں میں جڑا جاتا ہے۔ یہ تختے دیودار، صنوبر اور شاہ بلوط کی لکڑی سے بنے ہوتے ہیں۔ چھتیں ڈھلوان ہوتی ہیں تاکہ برف پھسل کر نیچے گر جائے۔ چھت کی لکڑی سے جو بام تیار ہو جاتا ہے اس میں گھاس کا ذخیرہ کیا جاتا ہے اور اس بام کے سروں کو کھلا چھوڑا جاتا ہے تاکہ آگ لگنے کی صورت میں گھاس وغیرہ کا

ذخیرہ نیچے پھینک دیا جائے۔اس گھاس میں عام طور پر تنکے شامل ہوتے ہیں اور دھان کا تنکا اس معاملے میں بہترین مواد تصور کیا جاتا ہے مگر جھیلوں کے قریبی علاقوں میں نرسل کا استعمال ہوتا ہے۔ جنگلات کے قریبی علاقوں میں چھت لکڑی کے چھلکوں سے تعمیر کردہ ہوتی ہے اور مکان حقیقی گیلوں کے ہوتے ہیں جن کی دیواریں ایک گیلی کو دوسرے پر جڑنے سے بنتی ہیں۔ یہ بالکل روسی کسانوں کے گھروں کے مانند ہوتے ہیں۔اس سے قدرے فاصلے پر کلہاڑی سے کاٹے گئے تختے جھری دار شہتیروں کے ساتھ نصب کیے گئے ہوتے ہیں۔ گھر کی پہلی چھت کے باہر شہ نشین یا چھجہ ہوتا ہے جس تک رسائی کے لیے ایک سیڑھی تعمیر کی گئی ہوتی ہے جہاں پر کشمیری لوگ موسم گرما کے دوران بیٹھ کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ بعدازاں ان بلند سطحوں کے ساتھ رسیوں کے ذریعے خشک شلغم، سیب اور مکئی کے بیج حاصل کرنے کے لیے لباب اور مرچوں کو موسم سرما میں استعمال کے لیے لٹکایا جاتا ہے۔ بسا اوقات دیہات میں دیکھا گیا ہے کہ بڑی عمارتوں اور زیارتوں کی چھتوں پر درختوں کی لکڑی کے چھلکے نصب کر کے ان پر مٹی کی پرت ڈال دی جاتی ہے۔اس طرح ان عمارتوں کی بہترین چھت بن جاتی ہے۔اور موسم بہار کے دوران ان چھتوں پر قرمزی، سفید، اور زرد اور شاہی نرگس کے پھول ملتے ہیں۔شہروں میں بڑے مکانوں کی چھتیں درختوں کی چھال اور مٹی سے تیار کی جاتی ہیں۔اس طرح ہاری پربت پہاڑی سے اگر کوئی سرینگر پر نظر دوڑائے تو اسے ہر طرف سرسبز چھتیں دکھائی دیں گی۔ قدرے بڑے اور بہتر مکانوں کی خوبصورت کھڑکیوں پر جالیاں نصب کی گئی ہوتی ہیں جنھیں گرمیوں میں کھولا جاتا ہے اور سردیوں کے درمیان انھیں کاغذ لگا کر بند کر دیا جاتا ہے۔ جیسے ہی موسم بہار کی آمد آمد ہوتی ہے تو کاغذ کو پھاڑ کر پھینک دیا جاتا ہے اور دریچے کھردرے اور ڈھیلے ڈھالے معلوم ہوتے ہیں۔ نچلی چھت پر بھیڑ اور مال مویشی بندھے ہوتے ہیں اور بعض اوقات بھیڑوں کو لکڑی کے بنے پنجرے ڈھانچے میں ٹھونس دیا جاتا ہے جہاں پر موسم سرما کے دوران بچے بیٹھتے ہیں اور مہمانوں کو سلایا جاتا ہے۔ایک مکان کے اندر یہ سب سے زیادہ گرم جگہ ہوتی ہے۔ چنانچہ کوئی بھی شخص یہ بات سوچ سکتا ہے کہ کشمیری مکان نہ تو آرام دہ اور نہ ہی صحت بخش ہوتے ہیں مگر اتنا ضرور ہے کہ یہ مکان اچھے خاصے گرم ہوتے ہیں۔البتہ موسم گرما کے دوران یہ مکان ہوادار ہوتے ہیں مگر جوں ہی موسم سرما آتا ہے تو درازیں اور شگاف گھاس

پھوس کے ذریعے بند کردیے جاتے ہیں اور مال مویشی اور بھیڑوں کی گرم سانسیں اس مکان میں حرارت بھر دیتی ہیں جو نچلی چھت سے ہوتی ہوئی کھلے سوراخوں کے ذریعے وہاں پہنچ جاتی ہیں جہاں بالائی چھت پر یہ کنبہ رہائش پذیر ہوتا ہے۔ چند مکانات کے اندر بخاریاں تعمیر کی گئی ہوتی ہیں مگر قاعدے کے مطابق دیہی عوام گرمی کے لیے بھیڑوں پر دارومدار رکھتے ہیں۔ روشنی کے لئے وہ تیل کا استعمال کرتے ہیں مگر بلند مقامات پر واقعہ دیہات میں صنوبر کی لکڑی سے تیار کردہ مشعلوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ کانگڑی کشمیر کی زندگی میں اس قدر اہمیت کی حامل ہے کہ اسے ہرگز نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ایک کہاوت ہے کہ جس طرح مجنوں کے سینے سے لیلیٰ پیوست رہتی ہے۔ اسی طرح ایک کشمیری بھی کانگڑی کو اپنے جسم سے لگائے رکھتا ہے۔ کانگڑی پرانی وضع کا مٹی کا پیالہ ہوتا ہے جس کے اردگرد درختوں کی ڈالیاں جڑی ہوتی ہیں۔ موسم سرما اور یہاں تک کہ موسم گرما کے دوران معمولی سی سردی ہوجانے پر کانگڑی میں جلتے ہوئے کوئلے ڈالے جاتے ہیں اور اس بھاری بھرکم چوغے (پھرن) کے نیچے سرکا دیا جاتا ہے جو کشمیریوں کا لباس ہے۔ چھوٹے بچے کانگڑی کو دن رات اپنے ساتھ رکھتے ہیں اور شاذونادر ہی لوگ اس جلن سے بچ پاتے ہیں جو رات کے وقت لاپرواہی سے کانگڑی استعمال کرنے پر پیدا ہوتی ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ کانگڑی کی وجہ سے اکثر کینسر ہوجاتا ہے۔ دیہات اور شہر میں آتشزدگی کے جو اکثر واقعات رونما ہوتے ہیں ان کی اصل وجہ کانگڑی بتائی جاتی ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ کانگڑی کی ترویج اٹلی سے ہوئی مگر راج ترنگنی میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے اور اس بات کا امکان ہے کہ یہ ایک مقامی ایجاد ہو بعض لوگ یہ عذر لنگ کرتے ہیں کہ کانگڑی کے سبب ہی ان میں جرأت کا فقدان ہے۔ اور کشمیری عوام میں بزدلی (بکری کے دل) کو اس کے استعمال سے وابستہ کیا گیا ہے۔ ایک مشہور مقامی معالج کشمیریوں کی طرف سے ٹھنڈے چاول اور سنگھاڑوں کے استعمال پر دنگ رہ گیا مگر جب اس نے کانگڑی کو دیکھا تو اس کی سمجھ میں آگیا کہ کشمیریوں کے پاس حلق کی بیماری کا علاج ہے۔ کانگڑیوں میں سب سے نادر چرارشریف (1) میں تیار کردہ کانگڑی ہوتی ہے جس پر نہایت قرینے سے رنگ چڑھائے گئے ہوتے ہیں۔ بکھ کانگڑی کے لیے بہترین ایندھن ہے۔ یہ اِدھر اُدھر پھیلی لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی صورت میں موجود ہوتا ہے جو پہاڑی نالوں کے وہانے پر

جال پھیلا کر جمع کیا جاتا ہے۔ خشک پتوں کے ساتھ گوبر ملا کر بھی کانگڑی کے لیے ایندھن تیار کیا جاتا ہے۔ چند محب الوطن یہاں تک کہتے ہیں کہ کانگڑی اور اس کے ساتھ وابستہ پھرن شہنشاہ اکبر کی سیاست کا نتیجہ ہے جس کا مقصد اس دور کے کشمیریوں کو قابو میں رکھنا تھا جبکہ دوسرے لوگوں کا کہنا ہے کہ عظیم بادشاہ زین العابدین نے ہندوؤں میں فخر کے احساس کو کم کرنے کے لئے کانگڑی اور پھرن اور باسی روٹی کے استعمال پر زور دیا۔

فرنیچر

اگر مختصر طور پر بیان کیا جائے تو کشمیریوں کے ہاں کوئی فرنیچر نہیں ہوتا۔ دیہات اور شہروں دونوں مقامات پر لوگ تنکوں سے تیار کردہ کھردری چٹائیوں پر سوتے ہیں۔ روئی کاتنے کے لیے چرخہ ایک لکڑی کا ڈنڈا اور اوکھل، کھانا پکانے کے لیے مٹی کے چند برتن اور غلے کے ذخیرے کے لیے مٹی کے مرتبان، ایک کشمیری گھر کے اندر بس یہی متاع ہوتی ہے۔ تمام گھروں میں نہایت مفید شئے کلتا پایا جاتا ہے۔ یہ ایک بڑی ٹوکری ہوتی ہے جسے کشمیری اپنی پیٹھ کیساتھ باندھے ہوتے ہیں تاکہ ان میں ڈال کر بھاری مال کی باربرداری کی جاسکے۔ کلتا عام طور پر بید کوٹونیسٹر (Cotoneaster) کی لکڑی کی شاخوں سے تیار کیا جاتا ہے۔

ملبوسات

کشمیریوں کے ملبوسات نہایت سادہ ہوتے ہیں اور دیکھنے پر نہایت معمولی معلوم ہوتے ہیں۔ ایک مرد اور عورت کے لباس میں بہت کم فرق ہوتا ہے۔ دونوں ہی زنانہ چوغا پہنتے ہیں۔ یہ چوغا نہایت بھاری بھرکم اور گردن سے پاؤں تک مکمل ہوتا ہے اور گردن کے پاس بٹن لگے ہوتے ہیں اور کئی مرتبہ مصنوعی طریقوں سے ہوا نکال کر اسے بھاری بھرکم بنا دیا جاتا ہے تاکہ جب وہ زمین پر بیٹھے تو کانگڑی کی تمازت قائم رہے۔ اس چوغے کے نیچے وہ دراز پہنتا ہے۔ سردیوں کے موسم میں یہ ملبوسات اُون سے تیار کیے جاتے ہیں اور موسم گرما کے دوران سوت یا تو گھر میں تیار کیا جاتا ہے یا اسے پنجاب سے درآمد کیا جاتا ہے۔ جب ایک کشمیری کاشتکار کام کر رہا ہوتا ہے تو اس نے سر پر کھوپڑی نما ٹوپی پہن رکھی ہوتی ہے مگر سرکاری تقریبات کے موقعوں پر وہ سفید پگڑی پہنتا ہے۔ ایک خوش پوش کشمیری پگڑی کو اپنے سر کی پشت پر باندھنا پسند کرتا ہے اور اپنی پیشانی کا

بیشتر حصہ وہ نگار رکھتا ہے۔ مسلمان کاشتکاروں کے چوغے کے بازو چوڑے اور کھلے ہوتے ہیں اور مڑی ہوئی آستین کی پشت پہننا ایک ذی عزت ہونے کی علامت ہے۔ تعطیلات کے روز خوشحال گھرانوں کے لوگ چمڑے کے جوتے پہنتے ہیں اور معمولی لوگ اپنے پاؤں ڈھانپنے کے لیے چمڑے یا گھاس کی بنی سینڈل پُلہ ہور استعمال کرتے ہیں۔ ہر کشمیری اپنے لیے دھان کے تنکوں سے پُلہ ہوری تیار کرسکتا ہے۔ دیہاتی لوگوں کے لیے ملبوسات میں رنگوں کا عجیب وغریب فقدان ہوتا ہے اور اس گندے بھورے رنگ کے پھیکے پن کو محض بچوں کی رنگین ٹوپیاں ہی توڑ پاتی ہیں۔ یہاں کے قدرتی حسن وکشش کے پیش نظر دیہاتی عوام کے ملبوسات میں رنگ کی قطعی عدم موجودگی ایک افسوس ناک امر ہے۔ علاقہ جموں کے دورے سے ایک راحت ہی محسوس ہوتی ہے کیونکہ وہاں پر راجپوت ملبوسات کی مشرقی رنگارنگی کی ایک جھلک ملتی ہے۔ بہرحال کشمیری اپنے ملبوسات کے موجودہ رواج کے گرویدہ نہیں ہیں اور انھوں نے اکثر مجھ سے کہا ہے کہ اگر انھیں حکم دیا جائے تو وہ کشتواڑ کا طرزِ لباس اپنالیں گے مگر مجھے اس بات کا خدشہ ہے کہ جب تک کانگڑی کا استعمال جاری رہے گا تب تک زنانہ چوغا پہننے کا رواج جاری رہے گا۔ ایک چوغے میں استعمال کردہ مواد سے ہندوستان کا کوئی باشندہ اپنے لیے دوعدد کوٹ تیار کرسکتا ہے۔ بہرکیف پنڈتانیوں کا لباس گہرا ارغوانی اور نیلا ہوتا ہے۔ اپنی کمر کے آس پاس وہ سفید کپڑا باندھتی ہیں۔ ان کے سر کا ملبوس ایک طرح کا گھونگٹ ہوتا ہے جو سر کی پشت پر جا گرتا ہے اور تمام کشمیری عورتیں بالوں کو ایک خاص انداز میں سجاتی ہیں جس کے بہت سارے پلیٹوں میں کالی اُون یا ریشم کو باندھا جاتا ہے۔ شادی ہونے تک یہ پلیٹ الگ رہتے ہیں اور شادی کے بعد انھیں باندھ کر ایک بھاری بھرکم تِل تیار کیا جاتا ہے۔ صرف دولت مند عورتیں ہی مردوں کی نظر سے بچنے کے لیے گھونگھٹ نکالتی ہیں۔ کشمیری کہتے ہیں کہ ان کا لباس کشتواڑ میں پایا جاتا ہے اور جب کوئی کشمیری سفر پر نکلتا ہے تو یہ اس کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے۔ چوغے کو لپیٹ کر ایک کپڑے کی ایک پٹی کے ساتھ کمر سے باندھ دیا جاتا ہے۔ یا اس کو دراز کے ساتھ لپیٹ دیا جاتا ہے اور یہ دراز پھول کر پائچوں کے ساتھ ایک تھیلی کی صورت اختیار کرلیتا ہے جو ایک آسان اور موثر کام ہے۔ سفر کے دوران ہندوستانی فوج کی مانوس اونی پٹیاں پنڈلیوں سے باندھ دی جاتی ہیں اور بیان کیا جاتا ہے کہ سفر کے دوران

ان سے جسمانی سہولیت ہوتی ہے۔ یہ پٹیاں تیار کرنا بھی ایک فن ہے اور کشمیری اس فن سے واقف ہے۔ کشمیری ظاہرداری پر بہت کم خرچ کرتا ہے۔ اس کے کپڑے گھر پر بُنے ہوئے ہوتے ہیں اور ظاہرداری کے فقدان کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی گئی۔ سرکاری اہلکاروں اور بیرونی دوروں کے دوران اپنی دولت کو پوشیدہ رکھنا یقینی بناسکیں اگر عوام کا کردار ان کے ملبوسات سے ظاہر ہوتا تو مانا جائے گا کہ کشمیری حقیر اور زنانہ رو ہیں۔

ہندوؤں اور مسلمانوں میں فرق

کشمیری پنڈتوں یعنی ہندوؤں کا مسلمانوں سے امتیاز کرنے کے لیے ملبوسات کی چند نمایاں خصوصیات ہیں۔ ایک پنڈت سر پر سفید پگڑی باندھتا ہے جس کا لپیٹ دائیں جانب ہوتا ہے جب کہ مسلمان کی پگڑی کا لپیٹ بائیں جانب (2) ہوتا ہے۔ ایک پنڈت اپنے چوغے کو بائیں جانب باندھتا ہے جبکہ ایک مسلمان دائیں جانب باندھتا ہے۔

ایک پنڈت کے چوغے کے بازو لمبے اور تنگ ہوتے ہیں جب کہ مسلمان کے چوغے کے بازو چھوٹے اور کھلے ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو ہندوؤں سے امتیاز کرنے میں لطف حاصل ہوتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ مسلمان دور سے اُچھل کر ٹٹو پر سوار ہوتا ہے جبکہ ایک پنڈت قریب سے سوار ہوتا ہے۔ ایک پنڈت جہاں وضو کا عمل بائیں ٹانگ سے شروع کرتا ہے مسلمان دائیں ٹانگ سے شروع کرتا ہے۔ دیگر قابل ذکر نمایاں پہلوؤں میں جو باتیں شامل ہیں ان کے مطابق پنڈت تنگ دراز پہنتے ہیں۔ سفید کپڑے کی بیس گز لمبی تنگ پگڑی پہنتے ہیں، سر پر ایک ہموار کھوپڑی نما ٹوپی پہنتے ہیں۔ وہ سر پر بالوں کا ایک گچھا (ژھوگ) بھی قائم رکھتے ہیں اور حجام جس کی نہایت احتیاط سے حفاظت کرتا ہے۔ مزید برآں ایک پنڈت چوغے کے تنگ لمبے بازو کو دستانے کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ اگر چہ وہ اپنے جوتے بھی اسی دستانے میں سنبھال کر رکھتا ہے اور اسی ہاتھ سے کھانا کھانے سے بھی احتراز نہیں کرتا ہے، اس کے برعکس مسلمان ڈھیلا پائجامہ پہنتا ہے۔ اس کی پگڑی پورے سفید کپڑے کی ہوتی ہے مگر اس کی لمبائی دس گز سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اس کی کھوپڑی نما ٹوپی نوکیلی ہوتی ہے، وہ اپنے سر کو پوری طرح منڈوا لیتے ہیں اور بازو کو چھو جانے والی خوراک کو وہ ناپاک سمجھتے ہیں۔ طرز لباس کے بارے میں بھی مسلمان

عورتوں اور پنڈتانیوں کے ملبوس اوران کے کردار کے درمیان بڑا فرق پایا جاتا ہے۔ایک پنڈتانی کمر بند باندھتی ہے جبکہ وہ پائجامہ نہیں پہنتی ہے۔اسکے سر پر سفید کپڑا ہوتا ہے۔اس کے لباس پر بازوں اور کالروں کے سوائے کہیں بھی سوزن کاری نہیں ہوتی۔وہ کبھی چمڑے کے جوتے نہیں پہنتی مگر قدیم وضع کی گھاس کی چپل پہنتی ہے۔وہ اپنے بچوں کے مقابلے میں شوہر کی زیادہ فرماں بردار ہے اور کبھی اپنے شوہر کا نام نہیں لیتی جب کہ مسلمان عورت کمر بند نہیں پہنتی مگر جب اچھی حالت میں ہوتو وہ ہرگز پائجامہ کے بغیر اپنے گھر سے باہر نہیں نکلتی۔اس کے سر پر سرخ کپڑا ہوتا ہے اور اس کے چوغے پر بھاری سوزنی ہوتی ہے۔وہ چمڑے کے جوتے پہنتی اور اپنے شوہر کے مقابلے میں بچوں سے زیادہ وابستہ ہوتی ہے۔اسے اپنے شوہر کا نام لینے میں کوئی ندامت نہیں۔ آخری بات ایک پنڈت خانہ دار عورت ایک مسلمان عورت کے مقابلے میں زیادہ کفایت شعار اور منتظم ہوتی ہے۔ ہندو اور مسلمان عورتیں دونوں ٹٹو پر سوار ہوتی ہیں اور جب موقع آتا ہے تو وہ مردوں کی مانند سواری کرتی ہیں۔

مشاغل وکاروبار

ایک کشمیری اپنے دن کو تین حصوں میں تقسیم کرتا ہے اور رات کے بھی تین حصے ہوتے ہیں۔ وہ نیند سے جلدی بیدار نہیں ہوتا اور صبح سات بجے سے قبل کوئی کام نہیں کرتا۔وہ فخر یہ کہتا ہے کہ وہ مرغے کی اذان کے وقت جاگتا ہے جب چاول کے کھیتوں سے گھاس نکالنے کا کام شروع ہوتا ہے۔اس کے باوجود بھی کہ جب اس نے اپنا کام شروع کر دیا اور جب کوئی کشمیری کاشتکار اپنے فائدے کے لیے ہی کام کر رہا ہوتو وہ پوری محنت سے کام کرتا ہے اور چاول کی کاشت کے موسم میں جب شام ہوتی ہے تو وہ رات کے آرام کا بجا طور پر حقدار ہوجاتا ہے۔ جب موسم سرما شروع ہوجاتا ہے تو تنومند جسم والے بہت سارے مرد سیب اور دوسرا مال واسباب اُٹھا کر پنجاب چلے جاتے ہیں اور لاہور یا دیگر مقامات پر قلیوں کا کام کرتے ہیں اور موسم بہار کی آمد کے ساتھ کشمیر واپس آجاتے ہیں۔ جو لوگ کشمیر میں ہی قیام کرتے ہیں وہ اپنے بھیڑوں اور مال مویشیوں کی دیکھ بھال میں مصروف رہتے ہیں۔وہ موسم سرما کے مختصر دن اور طویل راتیں اُونی کپڑوں کی بُنائی اور ٹوکریاں بنانے میں گزار دیتے ہیں۔اکثر سارا کنبہ نصف شب تک صنوبر کی لکڑی کی تیل

دار مشعل جلا کر اس کی روشنی میں کام کرتا ہے۔ یہ بات کہنے میں ذرا بھی مبالغہ آمیزی نہیں کہ ایک دیہاتی موسم سرما کے دوران مشکل سے چار پانچ گھنٹوں تک سوپاتا ہے۔ زراعت پر باب کے دوران اس کو مفصل طور پر بیان کیا گیا ہے کہ ایک کشمیری کسان کے پاس زیادہ فالتو وقت نہیں ہوتا۔ قطعات اراضی کافی بڑے ہوتے ہیں اور آج کے ایک کاشتکار کو زیادہ تر وقت جبری مزدوری یا بیگاری میں گزارنا پڑتا تھا مگر اب چند برسوں سے حالات بدل گئے ہیں اور اب کشمیری دن بھر مکمل طور پر مصروف رہتا ہے۔ زیادہ خوشحال لوگوں کے طبقے کو سفید پوش کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ سفید کپڑے پہنتے ہیں، وہ بالکل کوئی کام کاج نہیں کرتے بلکہ دوسروں کو کام کرتے دیکھتے ہیں۔ ان کا گھر بھی بہتر ہوتا ہے۔ ان کے باغات بھی عمدہ ترین ہوتے ہیں۔ کئی مرتبہ انھیں ذاتی قبرستان کی آسائش بھی حاصل ہوتی ہے۔ وہ چھوٹے ٹٹوؤں کی سواری کرتے ہیں اور دور دور کی مسافت طے کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ اپنا بستر بھی ہوتا ہے۔ ان کی زندگی کافی آرام دہ ہوتی ہے اور دیہات میں ان کا اچھا خاصا اثر ورسوخ ہوتا ہے۔ انھیں عامیانہ اور دیہاتی کاشتکاروں کے ساتھ زیادہ ہمدردی نہیں ہوتی اور دیہات میں ان کا ذکر عموماً درباری اشخاص کے طور پر ہوتا ہے جو مقامی اہلکاروں کا ساتھ دیتے ہیں۔

کھانا پینا

ایک کشمیری کاشتکار کھانے پینے کا کافی دلدادہ ہوتا ہے۔ درحقیقت اسے بہت کھانا پینا درکار رہتا ہے۔ جب چاول کے کھیتوں میں وہ مصروف کار ہوتا ہے تو اُسے بہت ساری خوراک درکار ہوتی ہے۔ اس کی عام خوراک چاول ہے۔ اس کے ساتھ پکائے گئے چنوں کا سالن یا آٹے کے طور پر پیس کر اس کی روٹی تیار کی جاتی ہے۔ سبزی تیل، نمک اور دودھ کی غیر متعین مقدار اس کے ساتھ ملائی جاتی ہے۔ ایک کشمیری کے عام کھانے سے بہت کم ذائقہ یا کلچر کا اشارہ ملتا ہے۔ اُبلے ہوئے چاولوں کے گولے بنائے جاتے ہیں اور انھیں بند کیا جاتا ہے۔ درحقیقت ایک دیہاتی کو کھاتے ہوئے دیکھنا خوش گوار نہیں مگر جب کسی کاروباری باورچی کو بلایا جاتا ہے تو کھانے تیار کرنے میں لذت اور انھیں آراستہ کرنے میں قرینے کا اظہار کیا جاتا ہے۔ مٹی کی طشتریوں میں رنگ برنگے کھانے ڈال کر قرینے سے سجائے جاتے ہیں۔ خود چاول بھی دیکھنے میں کافی خوشنما

ہوتا ہے۔ وہ گھی زیادہ نہیں کھاتے کیونکہ کشمیری کو محسوس ہوتا ہے کہ اس سے گلے میں خراش پیدا ہوتی ہے۔ مرغے بطخیں وغیرہ عام ہوتی ہیں۔ ایک عام کشمیری کسان شاید ایک ماہ میں چھ مرتبہ مرغے اور پانچ مرتبہ گوشت کھاتا ہے جبکہ مچھلی پکڑی جائے تو یہ بھی کھائی جاتی ہے۔ ہندو زیادہ مرغے یا انڈے نہیں کھاتے ہیں مگر وہ جنگلی مرغا(3) اور جھیلوں میں پائے جانے والے پرندوں کے انڈے کھاتے ہیں۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا کہ عوام کو اپنے کھانے کے لیے شاذ و نادر ہی چاول میسر ہوتا تھا کیونکہ چاول ہمیشہ شہروں کو لیجایا جاتا تھا اور مکئی، جو، ملٹ اور خورد گندم اس کی خوراک میں شامل ہوتے تھے۔ خوش حال لوگ چائے(4) اور کھانڈ کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ چائے کھانسی کے لیے اکسیر تصور کی جاتی ہے کیونکہ کھانسی یہاں پر عام ہوتی ہے۔ چائے یہاں پر تین ذرائع سے آتی ہے۔ بمبئی چائے چین سے آتی ہے، پہاڑی چائے پنجاب میں کانگڑہ سے اور سبز چائے لہاسہ اور لداخ کے راستے چین سے آتی ہے۔ کشمیری چائے میں کھانڈ یا نمک ملا کر پیتے ہیں۔ اول الذکر کو قہوہ اور دوسری قسم کو شیر چائے کہتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہمیشہ دودھ ملایا جاتا ہے۔ دونوں قسم کی چائے روسی سماوار میں تیار کی جاتی ہے۔ یہاں پر یہ رواج ہے کہ چائے کے ساتھ ہمیشہ گندمی روٹی یا بسکٹ کھائے جائیں۔ اکثر چائے کے ساتھ مصالحے خاص طور پر دار چینی ملائی جاتی ہے۔ چینی پنجاب سے آتی ہے، جو سستی نسواری رنگ کی ہوتی ہے۔ ایک اور قسم بتاس یا سفید کھانڈ ہوتا ہے جسے نابد کہتے ہیں۔ نمک مردوں، مال مویشیوں اور بھیڑوں کی غذا کا ایک اہم جزو ہے۔ کشمیری نمکین غذا کو بہت پسند کرتے ہیں۔ نمک دو قسم کا ہوتا ہے ایک تو پنجاب سے آتا ہے جب کہ عامیانہ قسم کا نمک لداخ سے لایا جاتا ہے۔ اگر کشمیر میں چاول میسر ہو جائے تو کشمیری کسی دوسری غذا کی طرف دیکھتا بھی نہیں اور کشمیر وادی کے عوام کا سب سے زیادہ پسندیدہ کھانا وہ چاول ہے جس پر ہلدی کا رنگ چڑھا ہو۔ اس بات کو تسلیم کرنا ہوگا کہ کشمیری مسلمان فضول خرچ اور حریص ہے وہ اپنے پیٹ میں خوراک ٹھونستا ہے اور بعض اوقات اس قدر زیادہ کھا جاتا ہے جو اس کی صحت کے لیے مضر ہوتا ہے۔ اس کے برعکس یہ حقیقت ہے کہ 79-1877 کی قحط سالی کے دوران بہت کم پنڈت جان بحق ہوئے جبکہ مسلمانوں کی بھاری تعداد میں ہلاکتیں واقع ہوئیں۔ اس بات کے قطع نظر کہ اس ملک میں پنڈتوں کی زیادہ حکومت ہے اور مسلمانوں کے مقابلے میں وہ زیادہ

خوشحال ہیں مگر اس سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ پنڈت زیادہ نفاست پسندی سے کھانا کھاتے ہیں۔ اور ان کا مذہب انھیں خوراک سے احتراز کرنے کا عادی بنا دیتا ہے۔ چنانچہ وہ بھوک برداشت کرنے کے زیادہ عادی ہیں۔ موسم گرما کے دوران پھلوں کی فراوانی کے سبب اکثر آبادی کی پرورش ممکن ہوسکتی ہے اور سبزیوں کی خوراک کی بھی یہاں فراوانی ہوتی ہے۔ پہلے شہتوت پیدا ہوتے ہیں جن سے نہ صرف انسانوں بلکہ بھیڑوں، ٹٹوؤں یہاں تک کہ کتوں کو بھی خوراک حاصل ہوتی ہے۔ اس کے بعد خوبانی اور اس کے بعد سیب اور ناشپاتی آتے ہیں۔ پھل حاصل کرنے کے لیے لوگ اس قدر اُتاولے ہوتے ہیں کہ بہت سارے سیب وہ کچے ہی کھاتے ہیں۔ اس کے بعد اخروٹ آتے ہیں مگر ان کو خوراک کا مقام حاصل نہیں ہے۔ کھیروں، تربوزہ اور سبزیوں کی فراہمی بھی فراواں ہے۔ اگرچہ عوام کے لیے یہ مکمل غذا نہیں ہے اور جب گھریلو سبزیوں میں مندے کا رجحان ہوتا ہے تو موسم کے لیے خشک کی گئی سبزیاں اور خشک پھل خوراک کا اہم جزو بن جاتے ہیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ تمام قسم کے اجناس کی تاثیر گرم یا سرد ہوتی ہے اور اسی طرح مختلف اجناس، سبزیوں اور پھلوں کا تجزیہ کیا جانا چاہیے یہ ایک پیچیدہ معاملہ ہے۔ چنانچہ خشک سیب جس کی تاثیر سرد ہے ہمیشہ اُبال کر امرناتھ کے آٹے کے ساتھ کھایا جاتا ہے کیونکہ اسے گرم تصور کیا جاتا ہے۔ اگر پھلوں اور سبزیوں کے علاوہ دودھ کی فراوانی کو مدنظر رکھا جائے تو دیہی علاقوں کی حالت کے بارے میں رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ بہرحال دولت جمع نہیں رہتی ہے اور اگر موسم خزاں کی ایک فصل ناکام ہوجائے تو اس کے بعد مصیبت کے حالات پیدا ہوجاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص دیہاتی عوام کی مادی حالت کو ملحوظ نظر رکھے تو میں کہہ سکتا ہوں ایک کشمیری کسان ہندوستانی کسان سے ہر لحاظ سے بہتر ہے۔ اس کے پاس خوراک کی فراوانی ہے، وافر کپڑا ہے۔ اور ایندھن بھی کافی ہے۔ اور یہ سب وہ زیادہ محنت کیے بغیر بھی حاصل کرسکتا ہے۔ عام طور پر زندگی میں آسائش و آرام ہے مگر عیش و عشرت کا فقدان ہے۔ جس انداز سے اس ملک میں دولت کی تقسیم کی گئی ہے۔ اس سے ملک زیادہ غریب اور زیادہ امیر افراد کے درمیان تقسیم کا عمل ابھی تک کشمیر میں شروع نہیں ہوا ہے۔ یہاں پر کاروباری فقیر ہیں جو نہایت خوشحال ہیں مگر یہاں پر کوئی بھی شخص نہایت غریب نہیں ہے۔

تفریحات

دن بھر کا کام ختم کرنے کے بعد ایک کشمیری گھر واپس آ کر کھانا کھاتا ہے۔ اس کے بعد وہ یا تو آرام کرنے کے لیے جاتا ہے یا کسی جگہ پر مل جل کر حقہ پیتا ہے۔ 1879 کی بہت بڑی قحط سالی کے بعد حقے کا استعمال ختم ہو کر رہ گیا ہے۔ اب لوگ نسوار لینے کے عادی ہیں جو پشاور سے آتی ہے۔ دیہات میں کوئی سماج نہیں ہے اور لوگ صرف شادی بیاہ اور صوفی حضرات کی درگاہوں پر منعقدہ عرس اور میلوں کے موقعوں پر ہی جمع ہوتے ہیں۔ عورتیں کنوؤں پر جمع نہیں ہوتیں مگر پن چکی پر جمع ہو کر وہ صرف گپ لڑاتی ہیں۔ یہاں سے کھالوں میں بھر کر وہ مکئی اور گندم کا آٹا لے کر گھروں تک لیجاتی ہیں۔ بوڑھے اور جوانوں کے لیے کوئی کھیل نہیں اور دیہات میں نہ کھیل اور نہ ہی تفریح کا سامان موجود ہے۔ زندگی نہایت مشکل ہے اور جو بچہ چل پھر سکتا ہے وہ بھی کام کر سکتا ہے۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کے عہد حکومت سے قبل سرینگر شہر کے مختلف وارڈوں کے لوگ پتھر اور غلیل لیے آئے تھے جو ایک نہایت سنجیدہ کھیل کھیلتے تھے۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کو لڑائی کا یہ جذبہ پسند نہیں آیا چنانچہ اس نے اس نقلی لڑائی کو بند کر دیا۔ گلی ڈنڈے کا کھیل ہندوستان میں عام ہے اور یہ کھیل سرینگر میں بھی کھیلا جاتا ہے۔ اور جو شخص ہار جاتا ہے اسے جیتنے والے کو بھی اپنی پیٹھ پر بٹھا کر گھمانا پڑتا ہے۔ سات سمندر کا کھیل بھی نہایت عام ہے اور اس کھیل میں تیار کردہ سات خانوں میں سے ایک ''جہنم'' کہا جاتا ہے۔ چھوٹی عمر کی لڑکیاں کپڑے کے چیتھڑوں سے تیار کردہ گڑیوں سے کھیلتی ہیں اور انھیں ڈولیوں میں اٹھا کر شادی بیاہ کا کھیل رچاتی ہیں اور اب کرکٹ کا کھیل بھی سرینگر میں آ پہنچا ہے۔ میلوں میں دیکھا گیا ہے کہ عمر رسیدہ لوگ لمبی چھڑی کے اوپر (5) سے چھلانگ لگانے کا کھیل کھیلتے ہیں مگر دیہاتی لوگ کبھی دائرے کے اندر داخل نہیں ہو پاتے۔ حالانکہ کشمیر اپنے پہلوانوں کے لیے مشہور تھا مگر میں نے کبھی کوئی کشتی کا مقابلہ نہیں دیکھا۔ آدمی چلنے میں کافی مہارت رکھتے ہیں اور ان کی صحت کھلاڑیوں کی مانند تندرست ہے۔ میں نے پہاڑی نسلوں کی بابت جاننے کی کوشش کی ہے مگر ان لوگوں میں کمیتوں کا ذرا بھی جذبہ موجود نہیں۔ انھوں نے صرف مالی فائدے کی بابت سوچا ہے۔ ایک کشمیری کی تفریحات کے بارے میں کچھ معلوم نہیں شاید پالکی یا کشتی میں جگہ حاصل ہو جانا ہی اس کے لیے ممکن ترین تفریح ہے۔ وہ اُن دوسرے

لوگوں پر حکم چلاتا ہے جو دھوپ میں مصروف کار ہوتے ہیں اور کہتا ہے۔ ''شاباش'' شاید کشمیریوں میں شکار کا کھیل کافی مقبول ہے اور کشمیر کے پیشہ ور شکاری اچھے کھلاڑی ہیں۔ کشمیری کشتی ران تب تک چپو چلاتے رہیں گے حتیٰ کہ اسے مخالف کشتی ران شکست نہ دے ڈالے یا وہ ہار نہ جائے۔ کشمیر میں سرگرم تفریح کار رجحان موجود نہیں مگر گھومنے پھرنے والے بانڈ اور بھگت لوگوں کو عوام پر سبقت حاصل ہے۔ یہ کھلاڑی ہندوستان میں کافی مشہور ہیں اور وہاں ان کا گرم جوشی سے استقبال ہوتا ہے۔ نقل اُتارنے میں ان کی صلاحیت انھیں پذیرائی کا حقدار بنادیتی ہے۔

میں نے کشمیر میں ان کی بہترین ٹولیاں دیکھی ہیں۔ ان میں سے بہترین سو یہ بگ کے بھگت 1877 کی قحط سالی میں جان بحق ہوئے۔ کئی لوگ ٹھنڈی سانس لے کر کہتے ہیں'' آہ بے چارہ یورک'' اور پھر اس کی معرکتہ الآرا اداکاری کا ذکر کرتے ہیں۔ بھگت دیہی زندگی کی گوناگونیت کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ ان کے ملبوسات اور آرائشی کپڑے بہترین ہوتے ہیں اور وہ دیہی سماج کے اندرونی تصویر نہایت دیانت داری کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ مہاراجہ گلاب سنگھ کو بھگتوں کی اس اداکاری سے ہی دیہی نظم و نسق کی قریبی معلومات حاصل ہوتی تھیں۔ میں نے ان سے دیہی محتسب پٹواری کے طرز سلوک کے بارے میں چند اشارے حاصل کیے ہیں۔ پاتھر یعنی ڈرامے پلاٹ قریباً وہی رہتا ہے۔ راجہ گھوڑے پر سوار ہو کر آتا ہے، وزیر پٹواری اور نمبردار کو دیہی حسابات کے لیے طلب کرتا ہے۔ وہ بدبخت دیہاتی جو راجہ کے پاس اپنی فریاد لے کر آیا ہے پہلے تو بہت زور وشور سے بولتا ہے مگر وزیر اور پٹواری کو سر جوڑ کر صلاح مشورہ کرتے ہوئے دیکھ کر جب اس کی بولتی بند ہو جاتی ہے تو دیکھنے والا لطف اندوز ہوتا ہے۔ اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وزیر پٹواری کو بے گناہ پاتا ہے اور سائل کو کوڑے مارے جاتے ہیں۔ ان ڈراموں میں جو دوسرے مناظر دکھائے جاتے ہیں ان میں سب سے زیادہ پسندیدہ وہ ہے جس میں دیہاتی لوگ کپاس بوتے اس کے پھل توڑتے اور اس کی کتائی کرتے ہیں۔ بھگتوں کے بارے میں چند مزید باتیں میں بعد میں بتاؤں گا۔ شاعروں کو بھگتوں سے الگ کرنا ہوگا کیونکہ وہ کبھی اداکاری نہیں کرتے وہ یا تو بھاٹ ہوتے ہیں، ایک تار کی لئے پر گاتے ہیں یا وہ دیہی شاعر ہوتے ہیں جو کام کاج کے دوران اچانک نمودار ہو جاتے ہیں اور بااثر لوگوں کی مدح سرائی بلند آواز میں گانے کی

شکل میں کرتے ہیں۔ میں بہت سارے ایسے شاعروں کو جانتا ہوں اور ان کے شعروں کو غور سے سنتا رہتا ہوں اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ کبھی ختم نہیں ہوتے اور انھیں نہایت بے تکے انداز میں خلط ملط کر دیا گیا ہے جن میں مشرقی خطہ سرطان سے لے کر عام مقامات کی ٹیکنیکل اصطلاحات شامل ہوتی ہیں۔ ان شاعروں کو چند روپے دینا ایک اچھی بات ہے کیونکہ ان کی حالت نہایت خستہ ہوتی ہے۔ جن لوگوں سے ملا ہوں بدقسمتی سے ان میں سے اکثر کے ہوش وحواس قائم نہیں تھے۔ ایک مرتبہ ایک ایسا مسلمان جو ایک اعلیٰ سرکاری اہلکار کو پڑھایا کرتا تھا، مایوسی کے عالم میں شراب کا عادی ہو گیا اور اپنی اس زندگی کو فارسی شعرا کے اشعار سنا کر جائز قرار دیا کرتا تھا۔ جب میں نے اسے وسکی دینے سے انکار کر دیا تو اس نے نہایت سخت الفاظ میں مجھے گالیاں دیں اور کہا کہ بلاشبہ ہندوؤں کا آہنی زمانہ آپہنچا ہے اور وہ اشکبار آنکھوں سے میرے کیمپ سے چلا گیا۔

شہر کے اندر کافی بھیڑ بھاڑ ہوتی ہے اور تیرتی ہوئی زندگی کو سمیٹے ہوئے ایک مقدس دریا ہے۔ کسی نہ کی طرح تو دن گزارا جا سکتا ہے۔ ایک شہری دریا کے گھاٹوں پر بیٹھ کر اپنا وقت گزار سکتا ہے اور وہاں غسل کر سکتا ہے۔ بھاٹوں اور پرندوں کے گیت بھی سن سکتا ہے اور پہلے پل امیرا کدل تک جا کر نئی افواہوں کی بابت معلوم کرتا ہے۔ یہ افواہ جو پیشہ ور افواہ باز لوگ اڑاتے ہیں جو من گھڑت خبروں کے ذریعے اپنا گزر بسر چلاتے ہیں۔ اگر وہ نالہ مار کے کنارے پر رہتا ہے تو وہ اپنی کھڑکی سے اس رواں دواں زندگی سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔

آہ! یہ زندگی، جو ایک شخص اس کھڑکی سے دیکھتا ہے۔
بنگ دنگ ڈھول بجتا ہے تو تلے تو تلے زندگی رواں دواں ہے۔
اوہ، شہر کے چوراہے پر ایک دن، زندگی میں ایسا کوئی بھی لطف نہیں۔

وہ ٹہلتا ہوا محل تک جا سکتا ہے تا کہ اسے معلوم ہو سکے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ وہاں جانے کی سبھی کو اجازت ہے اور سبھی ہز ہائنس مہاراجہ تک اپنی داد فریاد کر سکتے ہیں۔ کسی اور جگہ سرینگر میں رہائش کے فائدوں کی بابت بیان کروں گا۔ ایتھنس کے باشندوں کے مانند کشمیری بھی خبروں کا حریص ہے اور ہر روز ایک نئی افواہ اڑا دی جاتی ہے۔ کشمیر میں نمائندہ اداروں کا کوئی وجود نہیں مگر کشمیری پھر بھی اپنی رائے کا اظہار کر سکتا ہے۔ وہ ایک طویل عرضی پر اپنے دستخط ثبت کر کے اس

شخص کے خلاف آواز اٹھا سکتا ہے جو کسی عہدے کا متلاشی ہو،ایک چالاک آدمی درخواست پر خود ہی کئی دستخط ثبت کر لیتا ہے کیونکہ جعلی دستخطوں کے فن کا مطالعہ سرینگر میں کیا گیا ہے۔ایک مشہور پروفیسر جوش میں آکر ٹھنڈے پانی میں کھڑا ہو جاتا اور اپنے دستخط کو کانپنے والا موڑ دے دیتا۔

ولادت، شادی بیاہ اور اموات کی رسمیں

کشمیر میں ولادت ، شادی بیاہ اور موت کافی دلچسپی کے حامل ہیں۔ پہلے ان کا ذکر نہیں ہوا مگر ان کی بابت بیان کرنا کافی فائدہ مند ہو سکتا ہے۔یہ رسوم گوناگوں اور مختلف النوع ہیں۔ان رسوم کے بارے میں شہروں اور دیہات کے درمیان میں کافی تضاد ہے۔مگر تولید،شادی بیاہ اور موت کے کلیدی واقعات یکساں ہیں۔

مندرجہ ذیل تفصیل میں اوسط ہندو اور مسلمان کے رسوم کی بابت بیان کرنے کی سعی کی ہے۔ جیسا کہ مسلمان دیہاتی اور کشمیری پنڈت نہایت اہم اور متعدد جماعتوں میں موجود ہیں چنانچہ میں نے ان کی رسوم اور رواجوں کا ذکر کیا ہے اور میں نے بانجی واتل اور دیگر طبقوں کے بارے میں کوئی خاص مشاہدات درج کرنے کی سعی نہیں کی حالانکہ ان طبقوں کے خاص رواج ہیں۔ عملی طور پر کلیدی تصورات اور رسوم قریباً وہی ہیں جو دیہاتیوں میں پائی جاتی ہیں۔اگر ہندوؤں اور مسلمانوں کی رسموں کا موازنہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ بہت سارے معاملوں میں یکسانیت ہے۔اخروٹ اور نمک کی اہمیت ،مہندی کا استعمال اور دونوں مذاہب میں لگن چیر یعنی شادی کا دن مقرر کرنا، پھر سال یعنی شادی کے بعد دولہے کا دولہن کے گھر جانا، گل میوٹھ، دولت اور جواہرات کے عطیات، دولہے کا مہرازہ کے طور پر ملبوس اور لقب اور دلہن کو مہارانی وغیرہ شامل ہیں۔چند صورتوں میں یعنی موت کے بعد چہارم پر تحفے دینا۔ وہرہ وۆراور بارکھی یعنی سالگرہ اور برسی کی بالترتیب تقریبات وغیرہ شامل ہیں۔ میں نے ان رسوم کو من وعن درج کیا ہے اور ان کی ابتدا کے بارے میں کسی قسم کی قیاس آرائی سے کام نہیں کیا۔مقامی الفاظ کو تشریحات کے باب میں فراہم کرنے کے بجائے متن میں ہی شامل کیا ہے کیونکہ ان کے انگریزی ہم معنی الفاظ نہیں ہیں۔ چند الفاظ ایسے ہیں جنھیں لوگوں کے ساتھ روزمرہ بات چیت میں سنا جاتا ہے اور جس کسی نے بھی وادی میں کام کیا ہے اور اسے معلوم ہوگا کہ ان الفاظ کے علم سے اُسے کشمیر پر فکری سبقت حاصل ہوگی۔

ہندوؤں میں تولید

ایک ہندو بچہ جب دنیا میں آتا ہے تو اس کے نیچے نرم گھاس روب (یا کوئین) کا ایک بچھونا رکھا جاتا ہے جسے خوشبوؤں اور سنسکرت منتروں کے پڑھنے سے مقدس بنایا گیا ہے اور جب ایک مسلمان دایہ اپنا کام سرانجام دے دیتی ہے تو خاندان کا نجومی تولید کے عین وقت احتیاط کے ساتھ درج کرتا ہے۔ تولیدی بچھونے کو ہُورد کہا جاتا ہے اور اس بستر کے ساتھ ہی ایک مٹی کا برتن بُرلیج رکھا ہوتا ہے۔ اس برتن کے قریب فرش کی اچھی طرح جھاڑ پونچھ کی جاتی ہے اور چاک کے ساتھ یہاں ایک روحانی شکل تیار کی جاتی ہے۔ اس شکل پر ہی ایک پتھر کا دستہ رکھا جاتا ہے جس کی پرستش اس گھر کی ایک دوشیزہ کرتی ہے۔ اس پتھر اور بستر کے چاروں طرف ہر روز کچے چاول بکھیرے جاتے ہیں۔ (رت) ماں کو لوسا کہا جاتا ہے۔ اگر یہ پہلا بچہ ہوتا ہے تو اس کو سادہ پیائی کہتے ہیں۔ زچہ کو بند کرنے سے پہلے اس کمرے میں اکثر ایک میمنہ لایا جاتا ہے جس پر مریض تین مرتبہ چوٹ مارتا ہے۔ اور مٹھی بھر چاول ایک ٹوکری میں ڈالے جاتے ہیں۔ ماں اس میں مٹھی بھر آٹا اور بہن پیسہ ڈالتی ہے۔ خواتین رشتہ دار اندر آجاتی ہیں۔ وہ انجیر، کھجور، بادام، چاول اور پیسے تحفے کے طور پر دیتے ہیں۔ اور آخر میں یہ تمام تحفے پجاری کو دیے جاتے ہیں۔ بعد ازاں عورتیں بستر کے آس پاس چاول، آٹا اور پیسے بکھیرتی ہیں اور جب بچہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر یہ اولاد نرینہ ہے تو اس کی پرواہ کیے بغیر کہ مریضہ پر اس جوش سے کیا اثر پڑے گا یہ عورتیں خوشی سے جھوم اٹھتی ہیں اور اسی دوران ماں کا کھانا ایک دوشیزہ پکا کر اس کی پرستش کرتی ہے اور اس کے بعد اسے بُرلیج میں رکھا جاتا ہے۔ آگ کی پرستش کے بعد یہ دوشیزہ ماں اور بچے کی پیشانیوں پر گھی کا ٹیکا لگاتی ہے۔ بچے کی پیدائش کے تین دن بعد زچہ کو لازمی طور پر کچھ کھانا چاہیے مگر چوتھے روز تل، اخروٹ، بادام اور کھانڈ کو ابلے ہوئے تیل کے ساتھ ملا کر پنجری تیار کی جاتی ہے اور قرب و نواح کے رشتہ داروں اور دوستوں کو بھیجی جاتی ہے۔ اس روز مٹی کے برتنوں میں ڈال کر ماں کو کچھ کھانا دیا جاتا ہے۔ اسی روز زچہ کے والدین بھنا ہوا گوشت اور روٹی بھیجتے ہیں۔ زچگی کے بعد نویں روز (سندر) زچہ اور بچہ کو غسل کرایا جاتا ہے اور اس مبارک موقعے پر بچے کا نام رکھا جاتا ہے۔ اس روز بچے کو کپڑے دیے جاتے ہیں۔ دایہ پرانے گھاس کو اٹھا کر پھینک دیتی ہے اور نیا بستر تیار کرتی ہے۔ ہر روز

نہانے کے بعد مٹی یا کانس کے سات برتنوں میں کھانا بھرا جاتا ہے۔ یہ سات برتن سات دیویوں کی علامات ہیں۔ چند دیویاں گوشت خور اور چند سبزی خور ہیں چنانچہ اس انتخاب کے معاملے میں اختیار برتنا لازمی ہے۔ عام طور پر دال، چاول، اخروٹ اور گوشت کا انتخاب کیا جاتا ہے اور اس کی پرستش کی جاتی ہے۔ سات دیویوں کی نمائندگی کرنے کے لیے سات عورتوں کی موجودگی لازمی ہے۔ خوراک کو مقدس بنانے کے بعد دایہ ایک تنے کے چھال سے مشعل جلاتی ہے اور اسے زچہ اور بچہ کے سر کے اردگرد گھماتی ہے اور آخر ایک مٹی کے پیالے میں رکھے پانی میں اسے بجھا دیتی ہے۔ اس کے بعد وہ گھر سے رخصت ہو جاتی ہے۔ امیر گھرانوں میں اس کے بعد ایک مسلمان دایہ مامور کی جاتی ہے اور مقدس غذا کو ہمسایوں اور رشتے داروں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ نویں روز زچہ کو پہلی مرتبہ کانسی کے برتن میں کھانا دیا جاتا ہے اور اس کے والدین بھنے ہوئے گوشت، روٹی او رنقدی کی صورت میں تحفے بھیجتے ہیں۔ گیارھویں دن بستر کو دوبارہ باہر پھینک دیا جاتا ہے۔ اب زچہ ناپاک نہیں ہوتی اور وہ اپنے بچے کو لے کر ڈیوڑھی میں گھومتی پھرتی ہے اور بچے کو سورج دکھاتی ہے اور اگر ساتویں پشت تک گوتر کی کوئی عورت کسی بچے کو جنم دیتی ہے یا ان گیارہ دنوں کے اندر اس گوتر کا کوئی شخص انتقال کرتا ہے تو پاکیزگی اختیار کرنے کی مدت میں مزید گیارہ روز کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ اگر یہ واقعہ آٹھویں پشت سے باہر ہو تو اس میں ایک دن کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ اگر اس دوران کوئی غیر موافق واقعہ نہ ہو تو یہ گھر ناپاکی سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔ اور ہوس ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد برہمن کنبے کو طلب کیا جاتا ہے اور ایک رسم کاہ نیتر انجام دی جاتی ہے۔ ماں کو گائے کی دی ہوئی پانچ اشیاء کو پینا پڑتا ہے۔ ایک بار پھر سات برتنوں میں خوراک بھری جاتی ہے اور اس میں سے رشتہ داروں اور دوستوں کی شرکت ہوتی ہے۔ کاہ نیتر رسم کے دوران دیوار پر چاک سے ایک درخت کی صورت بنائی جاتی ہے۔ جب برہمن پنڈت اپنے فرائض پورے کر لیتا ہے تو ماں اور باپ کے ہاں کے نجومی بچے کا زائچہ یا زاتک تیار کرتے ہیں۔ زچگی کے روز والدین اپنے رشتہ داروں کو اخروٹ کے تحفے بھیجتے ہیں اور ماں کے والدین مٹھائیوں کے ٹوکرے، ہلدی اور ادرک اپنی بیٹی کے گھر ارسال کرتے ہیں۔ اگر سست رفتاری سے صحت یابی ہوئی تو دیوی کو خوش کرنا پڑتا ہے اور کاہ نیتر کو دہرایا جاتا ہے۔ اگر بچہ روتا ہے اور کھانے

سے انکار کر دیتا ہے تو سندر رسم کو دوبارہ دہرایا جاتا ہے۔ بعض اوقات جب بچہ پہلی مرتبہ سورج دیکھتا ہے تو لڑکا ہونے کی صورت میں اس کے سامنے قلمدان اور اگر لڑکی ہو تو پتھر کا انڈا رکھ دیا جاتا ہے جب بچہ ایک ماہ (ماس نیتر) کا ہو جاتا ہے تو اسے نئے کپڑے پہنائے جاتے ہیں اور رشتے داروں اور دوستوں کو دودھ اور چاول کی دعوت دی جاتی ہے۔ پہلے کپڑے پنڈت برہمن کی بیوی تیار کرتی ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ سوئی نہیں بلکہ جنگلی گلاب کا کانٹا استعمال کرتی ہے۔ کیونکہ سوئی انسان نے بنائی ہوتی ہے اور کانٹا بھگوان نے بنایا ہوتا ہے۔ اس بارے میں ایک توہم پرستی یہ بھی ہے کہ جس بچے کے کپڑے کانٹے سے تیار کیے جائیں گے وہ کبھی تلوار ہاتھ میں نہیں لے گا اور نہ ہی کسی انسان یا حیوان کو زک پہنچائے گا۔ جب اس کی عمر چھ برس ہو جاتی ہے تو اسے پہلی مرتبہ اُبلے ہوئے چاول اور دودھ کا ذائقہ چکھایا جاتا ہے۔ اس روز رشتے داروں اور دوستوں میں کھانا تقسیم کیا جاتا ہے۔ چند گھرانوں میں یہ رواج ہے کہ بچے کے سامنے مختلف اشیا مثلاً قلمدان، غلّہ، سوئیاں وغیرہ رکھ دی جاتی ہیں۔ اگر وہ قلمدان اٹھالیتا ہے تو اس کا اشارہ یہ ہے کہ یہ بچہ لکھنے کا پیشہ اختیار کرے گا۔

موتراشی کی رسم

تیسرے برس کے دوران بچے کی رسم موتراشی (ذرہ کاٹنے) سرانجام ہوتی ہے۔ یہ ایک خوشی کا موقع ہوتا ہے۔ اس رسم کے ایک دن قبل لڑکے کے ہاتھوں اور پاؤں کو مہندی سے رنگا جاتا ہے اس کے بعد پھوپھی کی جانب سے بہت بڑی دعوت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ ہاتھ اور پاؤں کو رنگنے کی رسم کو ماتُزراتھ کہا جاتا ہے اور شادی کے وقت زنار بندی (دیوگون) بھی اسی قسم کی رسم سرانجام دی جاتی ہے۔ اس موقع پر دی گئی، خوراک کو واری کہا جاتا ہے اور یہ واری تین قسم کی ہوتی ہے۔ پہلی قسم میں چاول، بھیڑیا، بکری کی چربی اور ادرک 'بیج' نمک اور تیل شامل ہوتے ہیں، اسے واری بتہ کہتے ہیں۔ دوسری ہلدی، نمک، کاراوے بیج، ایسافوٹکا ئیڈ اور دالوں سے بنتی ہے اور اسے مصالحے وارواری کہتے ہیں اور تیسری واری کے نام سے مشہور ہے اور اس میں دالیں اور تیل میں پکائے گئے چاول شامل ہیں۔ اپنی خدمات کے عوض پھوپھی مبارکبادی تحفے وصولی کرتی ہے جس میں چاول نمک اور نقدی شامل ہوتی ہیں اور ان داریوں کے موقعے پر تمام رشتے دار

اور دوست جی بھر کے کھانا کھاتے ہیں۔ لڑکی کی صورت میں رسم موتراشی نہیں ہوتی۔ لڑکے کے بالوں کو نہایت احتیاط کے ساتھ ایک درخت کے تلے دفنایا جاتا ہے۔

زُنّار باندھنے کی رسم

جب لڑکے کی عمر سات برس ہوتی ہے اور تیرہ برس کی عمر حاصل کرنے سے قبل اُسے ایک مقدس دھاگہ (زنار) پہنانا پڑتا ہے تاکہ وہ حقیقی معنوں میں برہمن بن سکے۔ نجومی کی طرف سے ایک مبارک دن کا تعین کیا جاتا ہے اور اس تاریخ سے پانچ دن قبل رشتے داروں کو لڑکے کے گھر میں آنے کی دعوت دی جاتی ہے اور مسلسل فاقے رکھے جاتے ہیں۔ عورتیں گاتی اور خوشیاں مناتی ہیں۔ ماموں تحفے پیش کرتا ہے اور زنار بندی سے ایک دن قبل خاندانی پنڈت دیوگون کی رسم سرانجام دیتا ہے۔ دیوگن وہ رسم ہے جس کے بعد چونسٹھ دیویوں، جنھیں یوگنیاں کہتے ہیں، کا تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ دوست اور رشتے دار لڑکے کے باپ کو نقدی دیتے ہیں۔ بعض اوقات اچھی خاصی رقوم حاصل ہو جاتی ہیں۔ اس دن لڑکے کے برہمن ہونے کی تصدیق کر دی جاتی ہے۔ اسی دن صحن میں ایک مٹی کا چبوترہ تیار کیا جاتا ہے۔ جس پر آگ جلائی جاتی ہے۔ لڑکا اس میں بادام اور پستے ڈالتا ہے۔ اس کے بعد اسے ایک دوشیزہ اور جوان بچھیا سات مرتبہ دکھائی جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ زمین پر تیار کی گئی ایک مستطیل شکل (ویوگ) پر کھڑا ہو جاتا ہے اور عورتیں اس کے آس پاس گانا گاتی ہیں۔ اس کے سر کے آس پاس سکے اور خول پھینکے جاتے ہیں اور اس کو دریا تک لے جایا جاتا ہے جہاں وہ پہلی رسم عبادت یا سندھیا سرانجام دیتا ہے۔ مبارکبادیاں پیش کی جاتی ہیں۔ ہر ایک کھانا کھاتا ہے اور پنڈتوں کو نقدی دی جاتی ہے۔

شادی بیاہ

ایک ہندو لڑکے کی زندگی میں اگلا اہم واقعہ اس کی شادی ہوتا ہے۔ سب سے پہلے ایک پیشہ ور درمیانہ دار کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ سرینگر میں تقریباً تیس ایسے درمیانہ دار ہیں۔ مسلمان اور ہندو بلائے جاتے ہیں اور جب اس کی نشاندہی ہو جاتی ہے تو لڑکے کے والدین کے ہاں لڑکے اور لڑکی کے زائچے ارسال کیے جاتے ہیں۔ اگر دونوں زائچے موافق ہوں تو کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ لڑکی کے والدین لڑکے کے والدین کو تھوڑا نمک اور کھانڈ اور بعض اوقات چند

روپے ارسال کرتے ہیں۔قاعدے کے مطابق لڑکے کی ماں کولڑکی کو دیکھ کر اپنا فیصلہ کرنا ہوتا ہے اور منزیم یور (میاں جی) کا سب سے فائدہ بخش کام امیروں اور قدیم خستہ حال گھرانوں کا رشتہ جوڑنا ہوتا ہے۔سماجی طور پر سرینگر ترقی یافتہ امراء کا شہر ہے۔ جس لڑکی کی ماں نہیں ہوتی ہے اسے ناپسندیدہ بیوی تصور کیا جاتا ہے۔ نجومی شادی کے لیے ایک مبارک دن مقرر کرتا ہے اور دولہے کے والدین اور ان مہمانوں کو دعوت دی جاتی ہے جنھیں بارات میں شامل ہونا ہوتا ہے۔شادی کے چندروز قبل دولہے اور دلہن کے مکان کو صاف کر کے سجایا سنوارا جاتا ہے۔مہندی رات اور دیوگون کی رسمیں انجام دی جاتی ہیں اور دلہن دیوگن کے روز سے رسمی طور پر برہمن قرار دی جاتی ہے۔ شادی کے دن دولہا لعل و گوہر زرق برق پوشاک پہنے بنگلے کے سجاوٹی پر لگائے کشتی یا گھوڑے پر سوار ہوکر دلہن کے گھر چل دیتا ہے۔اس روز سے اسے مہاراجہ اور دلہن کو مہارانی پکارا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ چار ہندو خدمت گار ہوتے ہیں۔ان میں سے تین کے ہاتھوں میں یاک کی دم ہوتی ہے اور چوتھے کے ہاتھ میں چاندی کا پیالہ اور شنکھ ہوتا ہے۔ ایک مسلمان جسے شاہ گاسی کہا جاتا ہے ہاتھ میں چھاتا لیے دولہے کے سر پر لگائے رہتا ہے۔اسی شجاعتی انداز میں دولہے کے ساتھ نزدیکی رشتہ داروں کا ایک اورلڑکا ہوتا ہے جسے پوت مہرازہ یا بہترین آدمی کہا جاتا ہے۔اور بیان کیا جاتا ہے کہ اس روز اگر دولہے کے ساتھ کوئی ناگوار واقعہ ہو جائے تو پوت مہرازہ اس کی جگہ لیتا ہے۔پٹھان دور میں یہ کوئی معمول کے خلاف بات نہیں تھی کہ جب کوئی دولہا اپنی دولہن کے ہاں جارہا ہوتو اسے گرفتار کرلیا جائے۔ جونہی یہ لوگ دولہن کے گھر کے قریب پہنچتے ہیں تو شنکھ بجائے جاتے ہیں اور دلہن کے گھرانے کا ایک ذی عزت مہمان اس بارات کو ملنے کے لیے آتا ہے۔اگر شادی کا مہورت دن کے وقت کا ہوتو شادی کے مہمان کھانا کھانے کے بعد دلہن کے گھر سے رخصت ہو جاتے ہیں اور دولہا دلہن کو دولہے کے گھر واپس لے جانے کے لیے محافظ کا کام کرتے ہیں۔شادی کی رسم کے بعد، جو کبھی کبھی کھانے سے پہلے ہو جاتی ہے اور کبھی بعد میں سرانجام ہوتی ہے دلہن کا باپ دولہے کے زنار میں تین مزید دھاگوں کا اضافہ کر دیتا ہے۔اس سے قبل کہ دولہے کو اپنے گھر میں داخل ہونے دیا جائے اسے اپنی مامی، موسی، پھوپھی یا بہن کو نقدی ادا کرنا ہوتی ہے۔شادی بیاہ پر بھاری اخراجات ہوتے ہیں۔ برہموں اور خدمت گاروں کی بھاری

تعداد کو روٹی کھلانا پڑتی ہے۔ اپنے نئے گھر میں ایک یا دو دن کے قیام کے بعد بچی دولہن کو سترات (پیتل اور کانسے کے برتن) کے ساتھ اپنے والد کے گھر بھیج دیا جاتا ہے جہاں وہ اپنے لعل وجواہرات اور کپڑوں کے تحائف اپنے والدین کو دکھاتی ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے سسرال واپس چلی جاتی ہے۔ شادی کی رسم کے بعد لڑکی کسی بھی وقت اپنے باپ کے گھر آسکتی ہے بشرطیکہ اس دعوت کے ہمراہ نقدی شامل ہو جو ایک سسر اپنے داماد کو شادی کے دن تحفے کے طور پر ادا کرتا ہے۔ رقم آٹھ آنے سے پانچ روپے کے درمیان ہوتی ہے اور لڑکی کے والد کو یہ رقم ہر اس موقعے پر ادا کرنی پڑتی ہے جب کبھی اہم تعطیلات برسی، سالگرہ یا خانگی تقریبات میں شرکت کے لیے اپنی بیٹی کو دعوت دیتا ہے۔ اس پنڈت کے لیے یہ ایک سنگین مسئلہ ہے جس کے ہاں کافی تعداد میں بیٹیاں ہوں۔ قاعدے کے مطابق جب دولہن تیرہ برس کی ہو جاتی ہے تو ہم بستری کا عمل شروع ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنی پازیب اتار دیتی ہے اور سر پر ایک ترنگا (6) پہنتی ہے۔ یہ ترنگا اس بات کی علامت ہے کہ اس لڑکی کی شادی ہو چکی ہے۔ بہرحال شادی کی عمر ہمیشہ مختلف رہتی ہے۔ والدین جس قدر امیر ہوتے ہیں اسی قدر شادی کی عمر جلدی ہوتی ہے۔ والد کی طرف سے دلہن کو دیے جانے والے تحائف کی تعداد بھی اچھی خاصی ہوتی ہے۔ ان میں سونے چاندی کے زیورات کے علاوہ قیمتی سامان شامل ہوتا ہے۔ ان میں سے صرف ڈیجہ ہؤر یا چندن ہار کا ذکر یہاں پر لازمی ہے۔ ڈیجہ ہؤر خالص سونے کے زیورات ہیں جو کانوں میں پہنے جاتے ہیں اور اس کی یوگ کی مانند ایک عینی شکل وصورت ہوتی ہے اور ایک عورت یہ زیور تب تک پہنتی ہے جب تک اس کا شوہر زندہ رہتا ہے۔ چندن ہار ایک سونے کا زیور ہے جو گردن کے گرد پہنا جاتا ہے۔ یہاں پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ زیور ہمیشہ ایک سسر اپنی بہو کو دیتا ہے۔ دولہے کو اس کا سسر کانوں میں پہننے کے لیے سونے کے چھلے اور سونے کے بازو بند دیتا ہے۔ شادی بیاہ کی رسوم کی یہ تفصیل ختم کرنے سے قبل اس بات کو ذہن نشین رکھنا لازمی ہے کہ اس قسم کی کوئی علامتیں موجود نہیں کہ شادی بیاہ کوئی جشن فتح ہے اور جب دلہن رخصت ہوتی ہے تو بہت کم لوگ آنسو بہاتے ہیں یا بالکل کوئی نہیں روتا اور دلہن کے گھر والے دولہے کو کوئی پریشان نہیں کرتا۔

وفات

اپنی شادی سے لے کر موت تک ایک ہندو دو بار کسی رسمی تقریب میں اہم کردار نہیں نبھاتا ہے۔ جب موت کا وقت قریب آتا ہے اگر ممکن ہو تو کوئین گھاس کا ایک بستر ایک صاف جگہ پر بچھایا جاتا ہے۔ غریبوں میں چاول، نمک اور نقدی تقسیم کیے جاتے ہیں اور مرنے والے کو منتر سنائے جاتے ہیں۔ جب اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر جاتی ہے تو اس کے جسد خاکی کو گھاس کے بستر پر رکھ دیا جاتا ہے۔ خواہ رات ہو یا دن ایک دیا جلا کر اس کے سر کے پاس رکھ دیا جاتا ہے اور شرادھ کی رسم انجام دینے کے بعد اس کو کفن میں لپیٹا جاتا ہے۔ اس میں دھسلا تو گا، ٹوپی اور سرنپت (دو گز لمبا اور ایک چوتھائی گز چوڑا کپڑے کا ایک ٹکڑا) اس کے پیٹ کے گرد لپیٹ دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد جسد خاکی کو ایک لکڑی کے تختے پر رکھ دیا جاتا ہے۔ اسے چار آدمی یا تو کندھوں پر اٹھا لیتے ہیں یا کشتی میں ڈال کر شمشان تک لے جایا جاتا ہے۔ بیٹا چتا کو آگ دیتا ہے مگر آخری رسوم مسلمان ادا کرتے ہیں جن کو کاؤ ج کہتے ہیں۔ اس کے عوض انھیں نصف کفن اور تین سے چھ روپے تک حاصل ہوتے ہیں۔ جب کہ کفن کا دوسرا نصف حصہ جسد خاکی کے ساتھ جلا دیا جاتا ہے۔ اگر متوفی ایک عورت ہے تو اس کے جسم پر دو زیور چھوڑ دیے جاتے ہیں اور یہ زیورات کاؤ جی آگ سے اپنے لیے نکال لیتا ہے۔ آخری رسوم کے دو یا تین دن کے بعد چند ایسی ہڈیاں جنھیں آگ نہیں جلا سکتی، گھر لائی جاتی ہے اور اس روز اسے ہرمکھ پربت پر واقع ایک جھیل تک لے جایا جاتا ہے۔ دس دنوں تک متوفی کا گھر ناپاک رہتا ہے۔ ان دنوں کے دوران کوئی بھی پکایا ہوا کھانا نہیں کھاتا۔ ان دس دنوں تک متوفی کی روح محو سفر رہتی ہے۔ متوفی کے لیے رسوم ایک دریا کے کنارے پر سرانجام دی جاتی ہیں۔ متوفی کا بیٹا اپنا سر اور داڑھی منڈوا لیتا ہے اور جب وہ پورے سوگ کے دس دن مکمل کر لیتا ہے تو وہ اپنے سسر سے حاصل کردہ نئی پوشاک پہنتا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کے ہمراہ گھر پر آتا ہے۔ جب وہ گھر کی طرف واپس پہنچتا ہے تو سوگوار لوگ دو قطاریں باندھ لیتے ہیں۔ پہلے بیٹا اپنے گھر میں داخل ہوتا ہے اور بعد ازاں ان دو قطاروں کے درمیان سے گزرتا ہے۔ اس کے بعد ماتم کنندگان رخصت ہو جاتے ہیں۔ دریں اثنا عورتیں جنھوں نے دریا کے کنارے پر ان آخری رسوم میں حصہ نہیں لیا ہوتا ہے۔

متوفی کے گھرانے پر اظہار افسوس کے لیے آتی ہیں۔ گیارھویں روز متوفی کے لیے شرادھ کی رسم سر انجام دی جاتی ہے اور ساتویں پشت تک کے رشتے دار جنھوں نے گوشت سے پرہیز کیا ہوتا ہے اس روز گوشت کھاتے ہیں۔ متوفی کے نام پر برہمنوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے اور کھانا اور کپڑے خیرات میں دیے جاتے ہیں۔ موت کے تین ماہ بعد شرادھ ہر پندرہ دن بعد اور اس کے اگلے نو ماہ تک ہر ماہ کے بعد شرادھ کیا جاتا ہے۔ ایک بیوہ کا اپنے شوہر اور عورتوں کا اپنے رشتہ داروں کے لیے ماتم سال بھر تک جاری رہتا ہے۔ کچھ مہینوں تک وہ اپنے کپڑے تبدیل نہیں کرتیں۔ اگرچہ کوئی شادی بیاہ ان کے لیے ممنوع ہوتی ہیں مگر انھیں صاف کپڑے پہننے اور گلے کا دھاگہ پہننے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔

چیچک

کہا جاتا ہے کہ چیچک کی وبا وادی کے لیے ایک مصیبت بن چکی ہے جب کسی ہندو گھرانے میں اس مرض کا ورود ہوتا ہے تو چند رسوم ادا کرنا پڑتی ہیں۔ جب معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بچہ چیچک کی بیماری میں مبتلا ہو گیا ہے تو اس کی ٹوپی کے ساتھ چند روپے سی کر جڑ دیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد اُسے الگ تھلگ کمرے میں قید رکھا جاتا ہے اور اس کے اردگرد گھوڑے، ہاتھی، پالکیاں، پنکھے، گڑ کے ٹکڑے، سنگھاڑوں کی گریاں کھلونوں کی شکل میں رکھی جاتی ہیں۔ جب تک چیچک کے دانے اُبھر نہ جائیں بچے کو چاول اور دہی کی خوراک ہی دی جاتی ہے۔ بچے اس کی ماں اور خدمت گار دایہ کو کسی قسم کا نمک نہیں دیا جاتا۔ ایک مچھلی یا گوشت کا ٹکڑا ہمیشہ مریض کے کمرے میں لٹکایا جاتا ہے۔ مگر جب تک چیچک کا مرض جاری رہتا ہے کسی قسم کا گوشت کھانا ممنوع ہوتا ہے۔ اور گھر میں دعائیں کی جاتی ہیں۔ جب مرض کم ہو جاتا ہے تو ٹوپی کے ساتھ جڑے ہوئے روپے الگ کیے جاتے ہیں اور انھیں اُبلا ہوا دودھ خریدنے پر صرف کیا جاتا ہے۔ یہ دودھ رشتہ داروں اور دوستوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ کمرے کو صاف کیا جاتا ہے اور کھلونے اور تھال بھر چاول دریا میں ڈال دیے جاتے ہیں۔ اگر چیچک زبردست ہو تو چیچک کی دیوی شُتلی ماتا کو راضی کرنا پڑتا ہے۔ اس کے لیے ہاری پربت کے پجاریوں کو بھیڑ بکری، گھوڑے یا گدھے اور سونے یا چاندی سے بنی آنکھ کا چڑھاوا چڑھانا پڑتا ہے۔ چیچک کے پہلی مرتبہ نمودار ہونے کے چالیس دن (ژنجم) کے بعد

چاول، اُبلا ہوا دودھ ایک مرتبہ پھر رشتے داروں اور دوستوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

روزانہ عبادت (پوجا پاٹھ)

کشمیری پنڈت کی زندگی میں اہم واقعات تو رونما ہوتے ہیں مگر ہر روز اُسے لازمی طور پر پوجا کرنی پڑتی ہے۔ جب صبح سویرے اٹھتا ہے تو لکڑی کے پاپوش (کھڑاؤں) پہن کر ہاتھوں میں پانی کا لوٹا لیے وہ مقدس دریا جہلم تک چلا جاتا ہے اور وہاں پر غسل کرنے کے بعد وہ اپنی پوجا (سندھیا) کرتا ہے۔ اگر اس کے ماں یا باپ کی موت ہو چکی ہو تو وہ ہوا میں پانی اچھال کر گزشتہ سات پشتوں کے بزرگوں کے نام لیتا ہے۔ اگر اس کے گھر میں مورتیاں (ٹھاکر) ہیں تو وہ ان پر پانی کا چھڑکاؤ کر کے ان کے سامنے چاول اور پھول رکھتا ہے۔ امیر لوگ اس خدمت کے لیے برہمنوں کو مامور کرتے ہیں۔ یہ ٹھاکر نیپال یا نرندایا کشمیر میں شیش ناگ سے لائے گئے قدیم پتھروں کی صورت کے ہوتے ہیں۔ ان ٹھاکروں کی نہایت عجیب وغریب صورت ہوتی ہے۔ اس کے بعد کپڑے پہن کر وہ اپنی پیشانی پر زعفران کا ٹیکہ لگاتے ہیں اور جس پانی سے اس کو دھویا گیا ہوتا ہے اس کا پانی (چرن امرت) پیتا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے کام کے لیے روانہ ہو جاتا ہے۔
چند ہندو غسل کے بعد اس مٹی سے ایک لنگ تیار کرتے ہیں جو انھوں نے تخت سلیمان سے لائی ہے۔ اس لنگ کی پوجا کرنے کے بعد وہ اسے دریا برد کر دیتے ہیں۔ دوسرے لوگ ہر روز شارکا دیوی یا ہاری پربت کے مندر تک جاتے ہیں اور دیوی کی پوجا کرنے کے بعد پہاڑی کے اردگرد ننگے پاؤں طواف کرتے ہیں۔ جواں سال نسل شاید زیادہ نازک اور کم مذہبی رجحان رکھتی ہے۔
ایک حقیقی ہندو ہر ماہ چار مرتبہ برت (فاقہ) رکھے گا۔ مگر اس دوران آبی گریاں، اور آلو کھائے جاسکتے ہیں جبکہ ان دنوں گوشت کھانا ممنوع ہے۔ یہ خوراک وہ چاند کے اُتار چڑھاؤ کے گیارھویں روز کھا سکتا ہے جب کہ پورے چاند (پونم) کے روز چوبیس گھنٹوں میں ایک مرتبہ چاول اور سبزیوں کا استعمال کر سکتا ہے۔

مقدس ایام

کشمیر میں ہندوؤں کے لیے بہت سارے مقدس ایام ہیں ان میں سے بنیادی ایام کا تذکرہ مختصر طور پر کیا جاسکتا ہے۔ یہاں پر یہ بات قابل توجہ ہے کہ سرکار کا کاروبار شمسی ماہ سال کے

مطابق چلتا ہے جبکہ اس کے برعکس کشمیر کے ہندوؤں کا تمام لین دین قمری ماہ وسال کے مطابق ہوتا ہے۔مقدس ایام کا حساب وکتاب بھی قمری مہینوں سے ہی لگایا جاتا ہے جب کہ ہندوؤں کے دنیاوی معاملات میں شمسی مہینوں کا دخل ہوتا ہے۔ شمسی ماہ چیت کا اولین دن ہندؤوں کا یوم بہار یعنی سونت ہوتا ہے۔دیہاتی عوام کے لیے یہ ایک عظیم دن ہوتا ہے۔صبح سویرے ایک ٹوکری میں ثابوت چاول، دہی، روٹی، نمک ایک پھول اور اخروٹ بھر کے ایک ملازم یا گھر کے تمام افراد کو دکھاتا ہے۔ ہر شخص ایک یا دو اخروٹ لیتا ہے اور غسل کے بعد یہ اخروٹ دریابرد کر دیے جاتے ہیں۔بلاکوٹے چاول ماہی گیروں کو دیے جاتے ہیں جو مچھلی کا تحفہ دیتے ہیں۔یوم بہار کے روز اس مچھلی کو پکا کر شام کے وقت کھایا جاتا ہے۔بیساکھ میں پورے چاند کے دن ایک ہندو فقیر ریش پیر کے اعزاز میں عالی کدل پل پر میلہ لگتا ہے۔اس روز درویش پیر کی آخری رسوم ادا کی جاتی ہیں اور ہر ایک ہندو فقیر کے نمائندوں کو ساڑھے چودہ آنے پیش کرتا ہے اور اس کے عوض اسے پکے پکائے ہوئے چاول حاصل ہوتے ہیں جنھیں وہ گھر لے جا کر رشتے داروں میں تقسیم کرتا ہے۔ماہ چیتر کا نیا چاند ایک تیوہار نورے کی صورت میں منایا جاتا ہے اور سونت کے دن کی طرح اس روز بھی افراد خانہ کو ٹوکری دکھائی جاتی ہے مگر اس ٹوکری میں شامل اصل چیز نئے برس کی جنتری ہوتی ہے۔ نورے کے تیسرے روز ایک اور تیوہار تریھ منایا جاتا ہے۔اس روز ایک دعوت کا اہتمام کیا جاتا ہے جس میں دامادوں کو خاص طور پر شمولیت کے لیے بلایا جاتا ہے۔چتر نومی بڑھتے ہوئے چاند کا نواں دن مقدس درگاہ کا دن ہوتا ہے اور پانچویں سے نویں دن تک گوشت بالکل نہیں کھایا جاتا۔جولوگ کھیر بھوانی کی عبادت کرتے ہیں وہ کبھی آٹھ اور کبھی پانچ دن ہرگز گوشت نہیں کھاتے مگر وہ لوگ جو جوالا یا شاریکا کی پوجا کرتے ہیں انھیں گوشت کھانے کی اجازت ہے۔یہ بھی رواج ہے کہ گھر کے کسی کمرے میں جو اُگائے جائیں۔اس جو کو چھاتے میں ڈھانپ دیا جاتا ہے جس کے اندر ایک جلتا ہوا چراغ شب و روز رکھا جاتا ہے اور اس بیج کو دودھ سے سینچا جاتا ہے۔چتر نومی کے روز اس جو کو کاٹ کر چند دنوں تک سر پر پہنا جاتا ہے اور بعد میں اسے دریابرد کر دیا جاتا ہے۔ چتر نومی رام کا جنم دن ہوتا ہے اور اس کا شمار سال کے خوش قسمت ترین دنوں میں ہوتا ہے۔جیٹھ اشٹمی ماہ جیٹھ کے بڑھتے چاند کا آٹھواں دن ہوتا ہے۔جیٹھ اشٹمی اور ہاڑ کا ساتواں دن ہاڑ سمتی

کھیر بھوانی کی عبادت کے لیے مخصوص ہیں۔ بڑھتے ہوئے چاند کا آٹھواں دن ہاڑ اشٹمی شاریکا دیوی کا مقدس دن ہوتا ہے۔ چڑھتے ہوئے چاند کا چودھواں دن ہار چودشی جولا کھی کا خاص دن ہوتا ہے جس کا مندر پانپور کے نزدیک کھریوہ میں ہے۔ چڑھتے ہوئے چاند کا بارھواں دن شراون دواوشی کے دن ان بچوں کی آخری رسوم ادا کی جاتی ہیں جن کی موت زنار بندی سے پہلے واقع ہوجاتی ہے اس روز ایسے بچوں کی مائیں شوپیان میں بٹہ پور کے قریب ماشی کے دن یاتریوں کو دور افتادہ امرناتھ گپھا میں پہنچنا ہوتا ہے جہاں وہ ایک برفانی لنگ کی پوجا کرتے ہیں جو پورن ماشی کے بعد پگھل جاتا ہے۔ پکے ہندو جن میں مرد اور عورتیں شامل ہیں گپھا میں داخل ہونے سے قبل اپنے کپڑے اُتار کر درختوں کے تنوں کی چھال پہن لیتے ہیں۔ بھادوں کے مہینے میں گھٹتے ہوئے چاند کا آٹھواں دن جنم اشٹمی، بھگوان کرشن کا جنم دن ہے اس موقع پر تین دن کا برت رکھا جاتا ہے جس میں ایک دن مکمل برت ہوتا ہے۔ بھادوں کے چڑھتے ہوئے چاند کے آٹھویں روز کنگ اشٹمی کا دن ہوتا ہے۔ اسی روز کشمیری اپنے مرے ہوئے آبا و اقربا کی اُسرکھ (ہڈیاں) لے کر ہرکھ پربت کے نیچے جھیل پر جاتے ہیں اور داغ مفارقت دینے والے لوگوں کی یاد میں وہاں شرادھ کرتے ہیں۔ اسوج مہینے کے دوران، ہندو لوگ اپنے مرحوم قرابت داروں کی یاد میں اپنے گھروں پر ہی شرادھ کرتے ہیں۔ ماہ اسوج میں بڑھتے ہوئے چاند کا نواں دن مہانومی ہوتا ہے اس روز ویسی ہی رسوم انجام دی جاتی ہیں جو چیتر نوی کو ہوتی ہیں۔ اگلے روز دسہرے کا تیوہار رام کی لنکا پر فتح کے اعزاز میں منایا جاتا ہے مگر کشمیری عوام نہ تو دسہرے کا تیوہار مناتے ہیں اور نہ ہی ہولی۔ پوہ مہینے میں ڈھلتے چاند کے پندرھویں روز کچھ ماوس اُن بد روحوں کو راضی کرانے کا دن ہوتا ہے جن کو چاول اور دالوں کا چڑھاوا چڑھا کر منایا جاتا ہے۔ ماہ ماگھ کے چڑھتے ہوئے چاند کے گیارھویں اور بھمسان ایکادشی کے دن برت رکھا جاتا ہے۔ عقیدہ ہے کہ اس روز زمین کا درجۂ حرارت تبدیل ہوجاتا ہے اور مٹی گرم ہوجاتی ہے۔ ہندو کیلنڈر کے مطابق آخری اور اہم ترین تیوہار شوراتری یا ہیرت ہوتا ہے جو ماہ ماگھ کے ڈھلتے ہوئے چاند کے گیارھویں روز منایا جاتا ہے۔ اس روز بھگوان شو کے اس اوتار کو چڑھاوا چڑھایا جاتا ہے جو بھیرو کے نام سے معروف ہے۔ غروب آفتاب سے نصف شب تک اس کی پوجا کی جاتی ہے۔ جن پجاریوں نے دن بھر برت رکھ کر یہ پوجا سر انجام

دی ہے، وہ رات کے وقت ضیافت کھاتے ہیں۔ بھیرو تانترک ناموں میں سے ایک نام ہے۔ شوراتری پر ہندو اپنی بیٹیوں کو ٹیٹھ کے مطابق (7) تحفے دیتے ہیں۔ اس روز ہندو کوئی کھیل کھیلتا ہے مگر ہندوستان میں دیوالی تیوہار کے برعکس اس روز کوئی جوا نہیں ہوتا۔ اس روز عورتیں قطاروں میں کھڑی ہوکر آگے اور پیچھے اپنے قدموں کو بڑھا کر روف گیت گاتی ہیں۔ عید کے روز مسلمان عورتیں بھی اسی انداز میں گیت گاتی ہیں۔ گیت اور رقص بے حد دلنشین ہوتا ہے۔

دوسری شادی اور گود لینا

کشمیری ہندوؤں کی رسوم کی تفصیلات کو ختم کرنے سے قبل یہ بھی لازی ہو جاتا ہے کہ گود لینے اور دوبارہ شادی کا تذکرہ کیا جائے۔ ہر ہندو کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنے لئے گوتر یا کسی دوسرے گوتر سے گود لے سکے مگر اس میں ایک پیش بندی یہ ہے کہ اس کی زنار بندی نہیں ہونی چاہیے۔ ایک متنبیٰ کو کسی صورت بے دخل نہیں کیا جا سکتا جب کہ حقیقی فرزند کو باپ گھر سے بے دخل کر سکتا ہے۔ اگر کسی متنبّیٰ کے بعد بچہ پیدا ہوتا ہے تو گود لیے بچے کو سب سے بڑے بیٹے کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ عملی طور پر کثیر ازدواج (8) کی بابت کسی کو معلوم نہیں۔ ہندو دوبارہ شادی کر سکتے ہیں مگر وہ دوسری بیوی کو پہلی کی موت کے بعد ہی لاتے ہیں۔ دوبارہ شادی کرنے کو اکثر عیش وعشرت تسلیم کیا جاتا ہے اور بہت سارے پنڈتوں نے مجھے باور کرایا ہے کہ اس کو کشمیر میں پسند نہیں کیا جاتا۔ اگر نوعمر بیوہ سات برس کی بھی ہو تو وہ دوبارہ شادی نہیں کر سکتی مگر اس کو متنبیٰ بنانے کی اعانت مل سکتی ہے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ جن بچوں کو متنبیٰ بنایا جاتا ہے ان کی بھاری تعداد بیوی کے گوتر سے ہی ہوتی ہے۔ ایک بیوی اپنی عمر کے زیادہ تر حصے کے دوران اپنے شوہر کے خاندان کے ساتھ ہی رہتی ہے مگر اسے مائکے اور سسرال آنے جانے کی آزادی ہوتی ہے۔ نوعمری میں بیوگی کی وجہ سے جو مصائب پیدا ہوتے ہیں ان کے بیان کی نسبت بہتر طور پر اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

1892 میں ہیضے کی وبا کا غم ناک ترین پہلو یہ تھا کہ بہت ساری لڑکیاں بیوہ ہوکر رہ گئیں۔

مسلم شادی اور خانہ دامادی

اگر ممکن ہو تو مسلمان اپنی بیٹیوں کی شادیاں رشتہ داری میں ہی کرتے ہیں۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو وہ اپنے ہی قبیلے کے ایسے آدمی سے رجوع کرتے ہیں جس کے پاس دولت سے زیادہ بیٹے ہوں

کہ وہ ایسا لڑکا انھیں دے دے جسے وہ اپنا داماد بنا کر رکھ سکیں۔ کشمیری کسانوں نے اپنی بیٹیوں کی کم عمری میں شادی کرنی شروع کر دی ہے اور سات برس کی عمر میں بیٹی کی شادی کر دینا کوئی خلاف معمول بات نہیں۔ جب ایک شخص کی بیٹی کی عمر تین برس ہو جاتی ہے اور وہ قریبی رشتے دار کے ساتھ نسبت طے نہیں کر سکتا تو وہ اپنے گھر میں ایک لڑکا (خانہ داماد) رکھ لے گا اور جب تک یہ لڑکا اس کی بیٹی کے ساتھ شادی نہیں کر لیتا تب تک اسے ایک غلام کی مانند کام کرنا پڑتا ہے۔ خانہ دامادی کا چلن سکھ عہد میں عام ہوا تھا۔ اگر کسی شخص کی نقل وحمل جبری مزدوری کے لیے طلب ہو تو ہمیشہ بد قسمت خانہ داماد کو ہی بھیجا جاتا تھا۔ اگر وہ زندہ واپس آ جائے تو اسے دلہن مل جاتی اگر اس کی موت واقع ہو جاتی تو اس کو ہر چند گھر کے بیٹے کی حیثیت حاصل نہیں ہوتی۔ فی الحال خانہ دامادی کا چلن کافی مقبول ہے۔ اس کے دو فائدے ہوتے ہیں۔ اوّل یہ کہ لڑکی کے باپ کو ایک خدمت گار حاصل ہو جاتا ہے جو سات برس تک اس کے یہاں غلام کی حیثیت سے رہے گا دوسرے یہ کہ ایسی سگائی اور شادی پر اخراجات بھی کم ہوتے ہیں۔ چند لوگ خانہ دامادی کے معاملے میں کافی بے اصول ہوتے ہیں۔ وہ کسی نہ کسی بہانے لڑکوں کو گھر سے بے باہر نکال پھینکتے ہیں اور اپنی بیٹی کسی اجنبی کے حوالے کر دیتے ہیں مگر قاعدہ یہ ہے کہ جس شخص نے اس مدت کے دوران کام کیا ہو، دلہن اسے ہی حاصل ہوتی ہے۔ اس معاملے میں نہ تو لڑکی کے باپ اور نہ ہی خانہ داماد پر کوئی قانونی ذمہ داری ہے کہ وہ کام کرے اور باپ کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی اس لڑکے کے ساتھ کرے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ جب ایسے لڑکے کو گھر پر لایا جاتا ہے تو تحفے کا ایک اقرار نامہ ہوتا ہے۔ اگر وہ لڑکا گھر کو چھوڑ دیتا ہے تو اس تحفے کے قرارنامے کے تحت دی گئی جائداد لڑکے کی ملکیت رہتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اگر وہ لڑکا اپنی دلہن حاصل کرنے کے لیے کوئی اور کارروائی کرتا ہے تو وہ کامیاب ہو جائے گا اور جب تک تحفے کا قرارنامہ (8) نہ ہو وہ اس کی جائداد کو اپنے ہمراہ نہیں لے جا سکتی۔ خانہ دامادی کی رسم کی مقبولیت کا ایک سبب یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ایک شخص اپنی بیٹی کو اپنے گھر میں رکھنے کے قابل ہو جاتا ہے اور مجموعی طور پر رسم کامیاب رہی۔ باپ اور خانہ داماد کے درمیان کوئی زیادہ تنازعے نہیں ہوتے۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ ایک مسلمان باپ کو اپنی بیٹی کے ساتھ گہرا لگاؤ ہوتا ہے۔ عمر رسیدہ لوگوں کو شکوہ ہے کہ جواں سال والی نسل زیادہ

آزاد رہی ہے ۔اور ایک خانہ داماد شادی کے فوراً اپنے سسر کا گھر چھوڑنے پر آمادہ ہوجاتا ہے۔وہ ایک خانہ داماد اپنے سسر کا نام کرام یعنی شجرۂ نسب، ذات وغیرہ اپنالیتا ہے ۔اگر یہ شادی قریبی رشتے دار سے ممکن نہیں ہوتی اور اس لڑکے کے باپ جو بلوغت کو پہنچ چکا ہوتا ہے ایک درمیانہ دار (درال، میاں جی یا منزم یور) کی خدمات حاصل کرتا ہے۔ وہ ان گھروں میں جاتا ہے جہاں شادی کے قابل لڑکیاں ہوتی ہیں اور اپنے گاہک کی فیاضی شان وشوکت کے بارے میں زمین وآسمان کے قلابے ملاتا ہے۔ وہ شادی کی تجویز پیش کرکے وہاں سے چلا آتا ہے ۔اس کے بعد لڑکی کو گھر کے اندر ہی رکھا جاتا ہے۔ باہر جاکر کھیلنے کی اسے اجازت نہیں ہوتی ۔اس کے چند دن بعد کسی نہ کسی بہانے لڑکی اور لڑکے کے والدین کے درمیان غیر رسمی ملاقات کا اہتمام کیا جاتا ہے اور سگائی (نشانی) کا دن مقرر کیا جاتا ہے ۔اس کے جلدی بعد لڑکے کا باپ اپنے رشتے داروں اور دوستوں کی ایک چھوٹی سی ٹولی کے ہمراہ تحائف لے کر لڑکی کے گھر جاتا ہے اور لڑکی کا باپ اس ٹولی کی خاطر مدارت کرتا ہے ۔قاعدے کے مطابق ان تحائف میں کنگن، نقدی، نمک اور کھانڈ شامل ہوتے ہیں ۔ضیافت کے بعد اس ٹولی کی موجودگی میں سگائی کا اعلان کردیا جاتا ہے اور ایک مُلّا دعا مانگتا ہے۔ اگر فریقین کو کوئی شک نہ ہوتو وہ معاملہ زیرِ تحریر لاتا ہے۔ بہرحال اگر اس معاملے میں کوئی شک وشبہ ہوتو یہ قرار محض زبانی رہتا ہے۔ یہ ٹولی رات بھر وہاں قیام کرتی ہے اور اگلے روز لڑکے کا باپ لڑکی کے باپ سے کمبل یا پگڑی وصول کرتا ہے اور نصف نقدی کھانڈ اور نمک لے کر گھر واپسی کا سفر شروع کرتا ہے ۔اس کے بعد مسلمانوں کی چار اہم تعطیلات عید رمضان، عید قربان، معراج شریف اور عرس نبیؐ کے روز لڑکے کے والد لڑکی کے لیے تحفے ارسال کرتا ہے۔ اس کے چھ ماہ بعد تک آنا جانا جاری رہتا ہے اور یہ مدت ختم ہونے پر شادی کی تاریخ طے کردی جاتی ہے ۔لڑکے کا باپ لگن کے طور پر پچاس روپے لڑکی کے باپ کو ادا کرتا ہے ۔ابتدائی باتوں کا اہتمام کرنے کے بعد عزیزوں اور رفیقوں کو دعوت (ڈین) جاری کیے جاتے ہیں ۔شادی کے ایک ہفتے تک دلہن گھر کے اندر بال نیچے کرکے بیٹھی رہتی ہے اور اس کے گھر اور لڑکے کے گھر میں دن رات گانا اور ڈھول بجانا جاری رہتا ہے ۔شادی سے ایک روز قبل لڑکے کا باپ کچھ مقدار میں مہندی دلہن کے گھر ارسال کرتا ہے جسے وہ اپنے ہاتھوں اور پاؤں پر لگاتی ہے۔ شادی کے روز

دولہا غسل کرنے کے بعد دلہے (مہرازہ) کا لباس زیب تن کرتا ہے اور اس لعل و گوہر کو پہنتا ہے جو وہ دوستوں سے مستعار لے سکتا ہے۔ وہ نقدی کی صورت میں تحفے وصول کرتا ہے اور تب یہ بارات گھوڑوں پر سوار ہو کر یا پیدل اپنا سفر شروع کر دیتی ہے۔ پہلے وہ کسی قریبی درگاہ پر جا کر حاضری دے کر دعا مانگتے ہیں۔ اور اس کے بعد اپنے باپ دادا کی قبروں پر فاتحہ خوانی کے لیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ دلہن کے گھر کی جانب روانہ ہو جاتے ہیں۔ وہ تحائف اور ڈولی پیشگی روانہ کر دیتے ہیں جس میں دلہن واپس آئے گی۔ جونہی بارات دلہن کے گھر کے قریب پہنچتی ہے تو اس گھر کی عورتیں باہر روایتی نغمے (وَنہ وَن) گاتی ہیں جن میں دولہے کی حسن و کشش کی مدح سرائی کی گئی ہوتی ہے۔ جب بارات دروازے پر پہنچتی ہے تو گاؤں کا حجام ایک لوٹے سے پانی پھینکتا ہے۔ اس خالی لوٹے میں دولہے کا نمائندہ ایک روپیہ ڈال دیتا ہے۔ اس رواج کو آباد ول کہتے ہیں اور جب دولہا دلہن کو گھر لے جانے کا واپسی سفر شروع کرتا ہے تو اسے دہرایا جاتا ہے جب پوری جماعت جمع ہو جاتی ہے تو دولہا ایک گدیلے پر بیٹھ جاتا ہے۔ ضیافت شروع ہوتی ہے اور اس کا اختتام چائے پر ہوتا ہے۔ جب مہمان کھانا کھا لیتے ہیں تو قاضی کارروائی شروع کرتا ہے۔ اگر نکاح نامہ پہلے رقم نہ ہو تو وہ اسے زیر تحریر لاتا ہے اور اس کے لیے وہ محنتانہ حاصل کرتا ہے۔ بہرحال اس کارروائی کے آغاز سے قبل دونوں باپ مہر کی رقم پر جھگڑا کرتے ہیں۔ کشمیر میں بیوی طلاق کی صورت کے سوا کبھی مہر کی رقم پر دعویٰ نہیں کرتی۔ اس جھگڑے کو محض زبانی جھگڑے تک رکھا جاتا ہے کیونکہ وہاں پر موجود ہر شخص کو معلوم ہوتا ہے کہ مہر کی رقم رواج کے مطابق طے کی جائے گی۔ پھر گاؤں کا سربراہ کھڑے ہو کر اپنے واجبات طلب کرے گا۔ آخر گاؤں کے سبھی عہدیدار اور ملازم مجمع لگا کر اپنے اپنے واجبات طلب کریں گے۔ دریں اثنا دلہن اپنی سہیلیوں کے ساتھ شادی کے تحائف کا معائنہ کرتی ہے جب سب کچھ تیار ہو جاتا ہے تو دلہن کو بہترین عروسی جوڑا پہنا کر اس کا بھائی یا ماموں پالکی تک لے جاتے ہیں۔ اس ڈولی کے اندر بھیڑ کا کلیجہ اور نمک رکھے ہوتے ہیں۔ اس ڈولی کے پیچھے پیچھے گاتی ہوئی گھر کی عورتیں ہوتی ہیں۔ اس طرح وہ اپنے شوہر کے گھر کا سفر شروع کرتی ہے۔ لڑکی کا بھائی اس کے ساتھ جاتا ہے۔ ایک عورت رشتہ دار بھی نوجوان لڑکی (دودہ مأج) کے گھر جاتی ہے وہ اُسے ان رسوم کے بارے میں ہدایت دیتی ہے جو

دلہن کو ادا کرنا ہوتی ہیں۔ جیسے ہی یہ بارات گاؤں سے گزرتی ہے عورتیں باہر آکر دلہن کا چہرہ دیکھنے پر اصرار کرتی ہیں۔ جب دولہے کا گھر آجاتا ہے تو دلہن کو ڈولی میں سے اٹھا کر اس کمرے میں لیجایا جاتا ہے جو اس کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔ وہ اپنی گردن جھکائے اسی کمرے میں بیٹھی رہتی ہے حتیٰ کہ اس کی ساس آکر اس کا چہرہ اٹھاتی ہے۔ جب یہ رسم ادا کرتی ہے تو وہ دلہن کا رومال نکال کر کچھ نقدی ڈال لیتی ہے جو ایک مروجہ دستور (ہشہ کانٹھ) ہے۔ اس کے بعد دولہے کے گھر کی تمام عورتیں دلہن کے ہاتھ کا بوسہ لیتی ہیں اور اس پر روپے رکھ دیتی ہیں۔ شادی کی رات کو ایک بھاری ضیافت کا اہتمام کیا جاتا ہے اور اگلے روز مہمان رخصت ہو جاتے ہیں۔ دلہن اپنے شوہر کے گھر سات دن تک رہتی ہے۔ اس کے بعد عروسی لباس اُتار کر وہ اپنے سسر کے دیے ہوئے کپڑے پہن کر اپنے باپ کے گھر روانہ ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات اس کے ساتھ شوہر جاتا ہے مگر وہ تب تک ان کے گھر دوبارہ نہیں جاتا جب تک اس کے سسرل والے اسے دعوت نہ دے دیں۔ دلہن اور دولہا کے گھروں کو بالترتیب ہوؤ راور مالُنین کے ناموں سے جانا جاتا ہے۔ جب دلہن اپنے باپ کے گھر تین یا چھ ماہ تک رہ لیتی ہے تو ایک مرتبہ پھر دولہے اور اس کے دوستوں کو دلہن کے گھر دعوت دی جاتی ہے جہاں ایک عالیشان ضیافت کا اہتمام ہوتا ہے۔ دولہا وہاں پر تین دن قیام کرتا ہے۔ جب وہ رخصت ہوتا ہے تو اس کا باپ اسے کپڑوں کا تحفہ دیتا ہے۔ اس کے بعد دولہا اور دلہن کے درمیان جنسی تعلقات میں کوئی رکاوٹ نہیں رہتی۔ ہمبستری کے عمل کی اس وقت اجازت ہوتی ہے جب دلہن نو برس کی ہو جاتی ہے مگر قاعدے کے مطابق بیان کیا جاتا ہے کہ ایک لڑکی کو اپنے شوہر کے ساتھ جنسی تعلقات اس وقت قائم کرنے چاہئیں جب وہ بارہ برس کی ہو جاتی ہے اور چودہ (9) برس کی عمر میں وہ ماں بن سکتی ہے۔

ولادت

شادی کی رسومات کے دو برس بعد نوجوان بیوی کو اولاد کی توقع ہوتی ہے اگر یہ توقع پوری نہ ہو تو وہ کسی مذہبی شخص کے ہاں تعویذ کے لیے جاتی ہے یا کسی درگاہ پر حاضری دیتی ہے جہاں پر وہ کپڑے کا ایک ٹکڑا (ڈش) دیوار کے ساتھ باندھ دیتی ہے۔ اپنے دردزہ کے دو ماہ قبل ایک سیانی عورت بلائی جاتی ہے اور گھر کے لوگ کسی مذہبی شخص کے پاس تعویذ کے لیے جاتے ہیں۔ جب بچہ

پیدا ہوتا ہے تو مولوی کو بلایا جاتا ہے جو مولود کے دائیں کان میں اذان دیتا ہے جو اس دنیا میں نووارد کا خیر مقدم ہے تب وہ بائیں کان میں اذان کو دہراتا ہوا تکبیر پکارتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ سبھی معاملات کا اختتام موت ہے۔ نوجوان ماں ایک یا دو دن تک فاقہ کرتی ہے اس کے بعد وہ گندم کی روٹی اور انڈوں کا کھانا کھاتی ہے۔ گھاس کے جس بستر پر وہ لیٹی ہوتی ہے اسے نہر کہتے ہیں اور اسے روزانہ تبدیل کیا جاتا ہے اور ساتویں دن جسے سندر کہا جاتا ہے ماں بچے کو غسل دیتی ہے اور اس بچے کا نام رکھا جاتا ہے۔ یہ نام اس گھرانے کے پیر کی جانب سے دیا جاتا ہے۔ وہ یہ عام طور پر وہ نام دیتا ہے جس کا اشارہ اس کی ولادت کے مہینے سے حاصل ہوتا ہے۔ اگر کوئی بچہ رمضان، شعبان یا رجب کے مہینوں میں پیدا ہوتا ہے تو عین ممکن ہے اسے رمضان، شعبان یا رجب کا نام دیا جائے۔ اگر کوئی بچہ اس مہینے میں پیدا ہوتا ہے جب کسی عظیم فقیر کا انتقال ہوا ہو تو اس بچے کا نام اس فقیر پر رکھا جاتا ہے۔ سلطان عموماً اس لڑکے کا نام ہوتا ہے جو اس ماہ میں پیدا ہوا جب مخدوم صاحب رحمت حق ہوئے۔ کرام کو اس کے پیدائشی نام کے ساتھ جوڑا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر رمضان راٹھور، شعبان بٹ، رجب میر، سلطان لون۔ لڑکیوں کے نام کے ساتھ کبھی ان کے کرام کا نام منسوب نہیں کیا جاتا۔ لڑکیوں کے عام ناموں میں فضلی، مالی، مہری، جانو، دولتی جمی، کالی، فیروزی، سندری، زونی (دوشیزہ ماہ) مختی، فرضی، عشمی ہوتے ہیں۔ دولت مند لوگ تاجہ، ستارہ، بیگم اور عشو کے نام پسند کرتے ہیں۔ شیعہ لوگ اپنے بیٹوں کو سلطان صادق یا عمر سے نہیں پکارتے۔ ساتویں دن حجام کو بلا کر بچے کی موتراشی کی جاتی ہے۔ اس روز بھاری ضیافت دی جاتی ہے۔ اس کے دو یا تین ماہ کے بعد ماں اپنے سسرال چلی جاتی ہے۔ اس کے ہمراہ بچھڑے سمیت گائے یا ٹٹو گھوڑی کے تحفے ہوتے ہیں۔

ختنہ

چار یا پانچ برس کی عمر میں بچے کا ختنہ کیا جاتا ہے۔ یہ موقع بہت بڑی خوشی منانے کا ہوتا ہے۔ دوستوں کو دعوت دی جاتی ہے اور بچے کے ہاتھوں اور پاؤں کو سرخ مہندی سے رنگ دیا جاتا ہے اور اسے بہادرانہ لباس پہنایا جاتا ہے۔ اس رسم سے سات دن قبل گانے بجانے اور کھانے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ختنہ کے روز بچے کو ایک ٹوکری کے اوپر بٹھایا جاتا ہے جس میں ایک

مرغار کھا گیا ہو (10) ایک حجام یہ تمام رسوم سرانجام دیتا ہے۔عزیز و رفیق۔بچے کے ہاتھ کا بوسہ لیتے ہیں اور اسے نقدی (گگا۔ میوٹھہ) ادا کرتے ہیں۔اس کے بعد لڑکے کے ہمراہ زرگاہ تک روانہ ہو جاتے ہیں اور ضیافت کے لیے واپس آ جاتے ہیں۔

موت

ایک مسلمان جب اپنی آخری سانس لینے کی گھڑی تک پہنچتا ہے تو اس کا سر شمال یا مشرق کی جانب کیا جاتا ہے۔ اس کو شہد کے شربت کی صورت میں آخری مشروب پینے کے لیے دیا جاتا ہے۔اس کے آس پاس موجود لوگ خدا کا نام پکارتے ہیں اور جب اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر جاتی ہے تو وہ رونا شروع کر دیتے ہیں۔جسد خاکی کو تب غسل دے کر سوتی کپڑے میں لپیٹ کر ایک تابوت میں رکھا جاتا ہے۔ یہ تابوت نزدیکی مسجد میں ہر وقت تیار ملتا ہے۔ پھر جسد خاکی کو قبرستان لے جایا جاتا ہے۔ دہاں پر موجود دوست اور رشتے دار نماز جنازہ ادا کرتے ہیں جس کے بعد جسد خاکی کو تابوت سے نکالا جاتا ہے۔سوتی کفن کا ٹکڑا گورکن کا حق ہوتا ہے اور میت کو ایک سوتی کپڑے میں لپیٹ کر دفن کر دیا جاتا ہے۔ جنازے کے روز اور اس کے تین دن بعد مہمانوں اور مجاور کو متوفی کا کوئی رشتہ دار ضیافت دیتا ہے اور متوفی کے گھر سے کوئی کھانا نہیں کھاتا۔ چوتھے روز (ژوریم) وہاں ایک بھاری ضیافت کا اہتمام ہوتا ہے اور وفات کے بعد آنے والے جمعہ کے روز سبھی لوگ مزار پر جاتے ہیں اور چند رشتے دار متوفی کے بالوں پر ایک رنگین کپڑا پھینک دیتے ہیں۔ چالیس دن تک متوفی کے لیے دعائے مغفرت کی جاتی ہے۔ مولوی اور غربا کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔ ایک برس تک مولوی کو ہر ماہ تحفے دینا لازمی ہوتا ہے۔اس کے بعد متوفی کی برسی پر مولوی ایک تحفہ حاصل کرتا ہے۔اس لحد پر مختلف قسم کے پھول لگائے جاتے ہیں اور چند مخصوص قسم کی وہ تمام کلیاں بھی جو مقدس ہوں یہاں لگائی جاتی ہیں۔موسم بہار کے دوران قبرستان خوبصورت پھولوں کے باغ کی مانند دکھائی دیتے ہیں۔

مقامی طرز زندگی کا مطالعہ کرنے والے طالب علم کے لیے وادی کے بہت سارے رواج دلچسپی کا باعث ہوں گے مگر ان میں سے دو رواجوں کی بابت بیان ممکن ہے۔ یہ رواج چند پہلوؤں سے انگریزی روایات سے مطابقت رکھتے ہیں۔ پہلا فصل کٹائی کے بعد گھر تہوار آن گت جو

دیوالی کے دوسرے دن ہوتا ہے۔اس وقت شہر بھر کے لوگوں کو سرکاری اخراجات پر موسم خزاں کے پھل کھلائے جاتے ہیں۔اس رسم کو مہاراجہ گلاب سنگھ نے ترویج دی تھی اور اس کے جانشینوں نے اس کو جاری رکھا ہے۔ چیہ مقررہ مقامات پر چاولوں اور موسم خزاں کے دیگر کھانوں کی ضیافتیں تیار کی جاتی ہیں۔ان میں بہتر طبقے کے پنڈت، مسلمانوں، عام مسلمانوں، شیعہ اور ڈوگرے شامل ہیں۔اس موقع پر بسنت باغ میں ڈوگرہ ضیافت کا اہتمام ہوتا ہے جہاں پر صبح سویرے شاہی مندر کی مورتی کو لے جایا جاتا ہے۔آن کت کے موقعے پر کسی قسم کا گوشت نہیں کھایا جاتا۔اونچے درجے کے پنڈتوں اور مسلمانوں کے لیے ضیافتوں کا اہتمام نہایت قرینے سے کیا جاتا ہے۔ مہمان سفید چاول اور دوسرے شریں و نمکین کھانے کے لیے بیٹھ جاتے ہیں۔عوام الناس کے لیے پتوں پر ڈال کر سرخ چاول، سبزیوں کا کچھ حصہ پروسا جاتا ہے۔بھوکے خاکروب کھانے کے لیے چاول اور گرد والے پتوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔دوسرا رواج یوم اپریل فول کی مانند ہے۔جب پہلی برف باری ہوتی ہے تو ہر شخص دوسرے کو پوشیدہ انداز میں برف تھمانے کی کوشش کرتا ہے اگر وہ اپنے ہمسائے کو جُل دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو وہ تحفے کا مطالبہ کر سکتا ہے۔

عام لوگوں کا کردار اور مزاج

عوام کے کردار اور مزاج کا نقشہ پیش کرنے کی کاوش کرتے ہوئے دیہاتیوں اور شہریوں کے درمیان تمیز کی جانی چاہیے۔ چند ایسی خوبیاں ہیں وہ سبھی میں مشترک ہیں خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، دیہاتی ہوں یا شہر باش۔تاہم چند طبقوں کے درمیان امتیاز موجود رہتا ہے۔

دیہاتی

اس بات کو ذہن نشین کیا جانا چاہیے کہ ایک طویل عرصے سے حکومت کی یہ پالیسی رہی ہے کہ کاشتکاروں کے مفادات کو شہری عوام کی بہبود کے تابع رکھا جائے چنانچہ دیہاتی عوام کے کردار میں جو خامیاں اور کوتاہیاں رہ گئی ہیں ان کو درگزر کیا جانا لازمی ہے کیونکہ وہ سرینگر کے خوشحال شہریوں کے مقابل تو نہیں ہو سکتے۔اس باب میں بیان کردہ چند حقائق کی وضاحت میں شہری اور دیہاتی علاقوں کے نظم و نسق سے متعلق باب میں کروں گا مگر اس باب میں بیان کردہ چند کیفیتوں کی وضاحت کے لیے میں کشمیر میں طرز حکومت کی بابت کاشتکاروں کے موقف کا خلاصہ کروں گا۔

اگست 1888 میں اپنی ابتدائی رپورٹ میں میراپیش رووینگیٹ رقم طراز ہے:

''مالیاتی بندوبست اس انداز کا ہے کہ کوئی کاشتکار خواہ زیادہ محنت کرے یا کم اگلی فصل کاٹنے تک اس کے پاس مشکل سے ہی وافر اناج موجود ہوتا ہے۔ وہ عموماً بے کار شہری آبادی کے لیے وہ شالی پیدا کرنے کی ایک مشین کی مانند ہے۔ سستے داموں پر شالی دستیاب ہونے کا راز یہ ہے کہ اگر مناسب سطح تک قیمتوں میں اضافے کی اجازت دے دی جائے تو پنڈتوں کی تمام تر جماعت کو ان کے مطالبات کے سامنے جھکنا پڑے گا۔

ایک مسلمان کاشتکار کو شالی اگانے کے لیے مجبور کیا جاتا ہے جو اسے بازار سے کم نرخوں پر فروخت کرنا پڑتا ہے تاکہ شہری عوام کی تشفی ہو سکے۔ اگر فصل دونوں کے لیے کم ہوتی ہے پھر بھی شہری عوام کے لئے فراہمی لازمی ہے۔ چنانچہ کاشتکار اور اس کے بچوں کو محروم رہنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قحط سالی کے دوران یہ طبقہ بے اطمینانی اور بے سروسامانی کی منہ بولتی تصویر بن گیا تھا۔ کیونکہ کاشت کار کو نہ تو زمین اور نہ ہی فصل پر کوئی حق حاصل تھا۔ شہر کے پنڈتوں کو پیٹ بھر کھانے کا حق تھا۔ خواہ قحط سالی ہو یا نہ ہوا نہیں چلکی (11) روپے فی خروار غلہ ملنا چاہیے۔''

قدیم طریق کار کی تفصیل بیان کرنا ضروری نہیں مگر میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ 1889 میں کشمیر میں میرا کام شروع ہونے سے قبل کاشتکار اپنی زمینوں میں قطعی دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ انھیں مالیہ اراضی کے بندوبست پر قطعی اعتبار نہیں تھا اور نہ ہی کسی چیز میں اسے اعتماد یا اُمید حاصل تھی۔ دبے کچلے عوام میں اوصاف کی تلاش مناسب بات نہیں ہوگی اور نہ ہی ان کے عیوب کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا منصفانہ ہوگا۔ جب کوئی شخص کافی عرصے تک دیہات میں قیام کر لیتا ہے اور کشمیریوں کو اسی من وعن حالات میں دیکھ لیتا ہے تو اسے ان حالات پر رحم کھا کر ان کے عیوب کو درگزر کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔ میں نے ان کے بہترین عادات حاصل کرنے کے کردار اور مزاج کے بارے میں کوشش کی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ مندرجہ ذیل کیفیتوں سے اس موضوع پر نظر یات کا بیان نہ ہوتا ہو۔ بہرکیف میں اتنا دعویٰ تو ضرور کر سکتا ہوں کہ میرے کام کے سبب مجھے وہ

مواقع حاصل ہوئے ہیں جو کسی دوسرے یورپی باشندے کو نصیب نہ ہوئے ہوں اور دیہی عوام سے شناسائی حاصل ہوئی ہو۔ تاہم خاص دلیلوں سے محفوظ رہنے کے لیے نہ تو میں کشمیریوں کے عیوب کو چھپاؤں گا اور نہ ہی اس ملک یا پنجاب کے ذہین باشندوں کے نظریات کو بالائے طاق رکھ سکتا ہوں۔ بہرحال سرینگر کے عوام اور کشتی رانوں کے بارے میں مشاہدات ہی کشمیریوں کے بارے میں ہیں اور وادی کشمیر کے عوام کی مجموعی تصویر میں Ex UNO DISCE OMNES کا اصول کارفرما ہوتا ہے۔

پنجاب میں کشمیریوں کے بارے میں نہایت غلط رائے موجود ہے۔ ہے غرض یہ کہ یہ بات تمام ایشیا میں صادر آتی ہے۔ مقولوں میں اُس کا اخلاق سانپ اور اس کا انداز مرغابیوں کے مصداق گردانا گیا ہے اور ایک کشمیری کو دوست بنانے سے اجتناب کیا ہے۔ مورکرافٹ رقم طراز ہے کہ ''کشمیری ودغرض، توہم پرست، جاہل دب کر کام نکالنے والا، سازشی، بے ایمان اور جھوٹا ہوتا ہے''۔ ایک مشینی کاریگر کے طور پر وہ نہایت ذہین دماغ ہے اور مصنوعات تیار کرنے اور کاروبار میں اسے کافی ذہانت حاصل ہے مگر اس کا لین دین ہمیشہ دھوکہ دہی کے جذبے سے ہوتا ہے اور جب اُسے پکڑا جاتا ہے تو وہ اسی طرح دیدہ دلیری کا مظاہرہ کرتا ہے اور ڈیور تسلیم کرتا ہے کہ وہ کذب بیان دروغ گوئی کے لیے تیار اور دھوکہ دہی کی مختلف صورتوں کے عادی ہیں۔ ہیوگل کے پاس بھی کچھ اچھا کہنے کے لیے نہیں ہے۔ یہ تاریخی واقعہ ہے کہ لدھیانہ کے غدر میں کشمیری انگریزوں کے مخالف ہو گئے اور کانگڑہ کی استعمال اراضی رپورٹ میں مسٹر بارنس نے نورپور کے کشمیریوں کے حق میں نہیں لکھا مگر یہاں پر یہ بات بھی ذہن نشین کرنا لازمی ہے کہ مورکرافٹ نے جن محض شہری عوام کی بات کی ہے وہ لدھیانہ اور کانگڑہ کے کشمیری شال باف تھے۔ جن کی آبادی نہایت کم ہے۔ چنانچہ مورکرافٹ کے القاب دیہاتیوں کے ساتھ بطور جماعت منسوب کرنا ہرچند غیر منصفانہ ہوگا۔ وہ اس بات کو بھی تسلیم کرتا ہے کہ کشمیریوں کے عیوب پیدائشی نہیں ہیں مگر اس حکومت کی دین ہے جن کے تحت انھوں نے زندگی بسر کی ہے۔ کشمیر کے باشندے ایشیا میں سب سے زیادہ ذہین اور زندہ دل لوگ تصور کیے جاتے ہیں اور اس بات کے وہ مستحق بھی ہیں۔ ایک دریا دل اور دانشمند حکومت کے ساتھ وہ اعلیٰ پایہ کے ذہین اور بااخلاق لوگ ہو جاتے

ہیں مگر فی الحال ان کے مقابلے میں کوئی انتہائی پست نسل نہیں ہے۔ میں کشمیریوں کے عیوب پر توجہ دیے بغیر نہیں رہ سکتا جس میں ان کی فطرت سے زیادہ سیاسی حالات کو دخل حاصل ہے اور سوچتا ہوں کہ انھیں قدرے مختلف انسان میں تبدیل کرنا مشکل نہیں ہوگا۔ نائٹ (Where Three Empires Meet، صفحہ iii) رقمطراز ہے۔

جب بھی وہ کسی کشمیری کو دیکھتے تھے تو وہ بھونکتے ہوئے اس کی طرف بھاگنے لگتے۔ کیونکہ وہ اس قسم کا سلوک کرتے ہیں جو پانچ برس کا انگریز کا بچہ کرنے سے شرم محسوس کرتا ہے۔ وہ روتا چلاتا ہے اور خود کو ڈر کے مارے برف پر نیچے گرا دیتا ہے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ جب کوئی انگریزی ٹیریئر بھی بھونکتا ہے تو کسی بھی ہندوستانی کے چہرے پر خوف کے اثرات نمایاں ہو جاتے ہیں شاید نکتہ چینی ان کے حقیقی کردار کا اشارہ کرتی ہے جو 1833 کے دوران وکٹر جیک کانٹ نے رقمطراز کی ..... ''گذشتہ صدی کے دوران افغانوں نے مغلوں سے ان کی فتوحات کو چھین لیا اور اس صدی کے دوران سکھوں نے مغلوں کو نکال دیا اور ہر فتح پر ایک نئی لوٹ مار شروع ہوئی اور امن کے دنوں میں محنت کشی اور صنعت کے خلاف لاقانونیت نے اپنا پورا زور لگا دیا۔ چنانچہ اب یہ ملک پوری طرح تباہ ہو چکا ہے۔ بےچارے کشمیریوں نے اس صورت حال کے سامنے مکمل طور پر گھٹنے ٹیک دیے ہیں اور انسانوں میں سب سے آرام طلب ہو چکے ہیں۔ ان میں سے کسی کو لازمی طور پر فاقہ کرنا ہو تو محنت کے بوجھل تلے وہ ہاتھ جوڑ کر یہ کام کرنا بہتر سمجھتا ہے۔ کشمیر میں جو شخص کام کرتا ہے وہ کپڑا بنتا ہے یا وہ چپو چلاتا ہے اُسے شاید ہی کبھی کھانا نصیب ہو اور جب کہ اس کے مقابلے میں جو لوگ میدانوں میں درخت کی چھاؤں میں سوتے ہیں زیادہ خوش اور فارغ البال ہیں۔

کشمیری اسی فلسفے کے حامی ہیں ایک وقت تھا جب وہ عزت مآب اور بہادر لوگ تھے اور بیرونی استبداد کے سبب وہ موجودہ حالت کو پہنچے مگر جن لوگوں نے راج ترنگنی کا خاص مطالعہ کیا۔ انھوں نے مجھے بتایا ہے کہ بیرونی فتوحات اور جبر واستبداد سے بہت پہلے کشمیری لوگ فریب کاری اور بے ایمانی کے لیے مشہور تھے۔ چنانچہ اس بارے میں یہ قیاس آرائی فضول ہے کہ وہ کبھی کیا تھے مگر جب کوئی یہ رائے ظاہر کرتا ہے کہ وہ اب کیا ہیں تو وہ اُن قدموں کی مانند سوچے بغیر کوئی چارہ

نہیں کافی نسلوں سے وہ جبر واستبداد کے دور سے گزرے ہیں اور کشمیریوں کی طرح ہی وہ بھی زیادہ فریب کار اور زیادہ بے ایمان ہو سکتے ہیں۔ایک ایسے ملک میں جہاں عملی طور پر حیلہ سازی کے علاوہ کوئی ہتھیار نہیں رہتا۔ مجھے یہاں یہ بات ماننے سے کوئی عار نہیں کہ سرکاری اہلکاروں سے نمٹتے وقت وہ کبھی حق وصداقت پر قائم نہیں رہتے۔ اپنی بات چیت ہمیشہ اس امر سے شروع کرتے ہیں کہ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتے اور درحقیقت کبھی جھوٹ بول ہی نہیں سکتے۔ جب ان کا جھوٹ پکڑا جاتا ہے تو وہ کبھی شرمندگی محسوس نہیں کرتے اور صداقت بیانی کے معاملے میں ان میں اخلاقی قدروں کا کوئی جذبہ موجود نہیں ہوتا۔حکومت کے عجیب طریقۂ کار کے تعلق سے جس میں جاسوسی کی وسیع تر اسکیم کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے کے سبب کشمیری ایک دوسرے پر شک کرتے ہیں اور نفرت کرتے ہیں۔ایک برگزیدہ شخص جب موجودہ حالت کے اسباب کو تلاش کرتا ہے تو اس کے قومی کردار کے دو پہلو نمایاں ہوتے ہیں...... دروغ گوئی، رشک اور بدظنی۔ایک کشمیری دوسرے کو خوشحال رہتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا اور ایک دیہاتی کا کسی عہدے تک پہنچ جانا دیہاتی علاقوں میں کوئی مقبول اقدام نہیں ہوتا۔کشمیری کسی بات پر قائم نہیں رہتا۔اسے دربار کورجسٹرڈ خط بھیجنے کی طاقت پر زیادہ اعتماد ہوتا ہے جس میں وہ اپنے مخالفین یا عدو پر مفصل الزامات عائد کرتا ہے جو عموماً دروغ گوئی پر مبنی ہوتے ہیں۔وہ نہایت بزدل ہے اور سرکاری افسروں کے سامنے وہ خود نہایت گھٹیا انداز میں پیش آتا ہے۔ میں نے اکثر دیکھا کہ کشمیری کسی سرکاری اہلکار کے منہ پر اس کی تعریف کرتے ہیں اور اسی رات وہ میرے خیمے پر آتے ہیں اور اس کے خلاف سنگین الزامات عائد کرتے ہیں۔جب کشمیری ملک کے کسی اہلکار کے ساتھ معاملہ کر رہا ہو یا اپنی عرضداشت پیش کر رہا ہو تو اس پر اعتبار کرنا ناممکن ہوتا ہے مگر اپنے ہی گاؤں میں اپنے دیہاتی ساتھیوں کے ہمراہ میں نے دیکھا کہ اس سے حقیقت اگلوا دینا نہایت آسان ہوتا ہے۔ایک کشمیری کی ہمیشہ یہ عادت رہی ہے کہ وہ حقیقت کو مبالغہ آمیزی سے بیان کرتا ہے۔وہ جی جان سے اپنا بیان تیار کرتا ہے اور اپنی نہایت بلند آواز میں الفاظ ادا کرتا ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ گزشتہ دنوں سرکاری اہلکاروں تک رسائی حاصل کرنا انتہائی مشکل تھا اور لازمی تھا کہ بلند آواز کے ذریعے ہی حکام کی توجہ اپنی جانب مرکوز کر سکے۔ایک کشمیری جب یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ کسی سرکاری اہلکار یا ہمسائے نے اس کی پٹائی

کی ہے تو وہ اپنی وہ زلف پیش کرتا ہے جو اس نے اپنی جیب میں ایک پڑیا کی صورت میں باندھ کر رکھی ہوتی ہے۔ عام طور پر یہ ایک گھوڑے کا بال ہوتا ہے۔ اپنی زبوں حالی کو ظاہر کرنے کے لیے ایک کشمیری اپنے جسم پر چاول کے کھیتوں کے بھورے دلدل کی پرت چڑھالے گا یا اپنے عریاں جسم کو گرد و غبار سے ڈھانپ لے گا۔ وہ عام طور پر دھان کے گھاس سے بنائی ہوئی ایک رسی اپنی گردن کے گرد لپیٹے ہوتا ہے جس کے ساتھ ایک اینٹ لٹکی ہوتی ہے۔ یہ اینٹ ظاہر کرتی ہے کہ وہ قلاش ہو کر رہ گیا ہے۔ دھان کے گھاس کی یہ رسی ظاہر کرتی ہے کہ عملی طور پر اس کی زندگی تباہ حال ہو کر رہ گئی ہے۔ اکثر اوقات مرد میرے ساتھ ملاقات کے لیے آتے ہیں۔ ان کے ہمراہ ان کے بیوی بچے بھی ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ہل زمین پر پٹک کر کہتے ہیں کہ ان کے لیے کھیتی باڑی میں کوئی مزا نہیں رہا ہے۔ بوائی کے موسم میں شاید ہی کوئی دن ایسا گزرتا ہو جب کوئی سائل نہالیوں یا اُگتے ہوئے اناج کی خشک بالیاں لے کر وہ میرے ہاں یہ دکھانے کے لیے نہ آیا ہو کہ اُسے آب پاشی کے لیے پانی حاصل نہیں ہے۔ عام مظاہرہ دو مردوں اور ایک عورت پر مشتمل جلوس ہوتا ہے۔ ایک شخص خرقہ پوش ہوتا ہے اور اپنے سر پر انگاروں کا توا اٹھائے ہوتا ہے جب کہ عورت نے اپنے ہاتھوں میں ٹوٹے پھوٹے برتن اٹھائے ہوتے ہیں۔ بعض اوقات جذبات کے اظہار کا یہ طریقہ مزید مفصل ہوتا ہے۔ ایک شخص میرے پاس ننھے بچے کی لاش اٹھائے ہوئے آتا ہے اور الزام عائد کرتا ہے کہ اس کے دشمن اسے اس بچہ کو دفنانے کے لیے زمین تک نہیں دیں گے۔ گاؤں میں اس کا زمینی تنازعہ ہے اور اس طرح وہ اپنی خستہ حالی کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے۔ ایک مرتبہ ناگ مرگ میں میرے پاس ایک شخص آیا۔ وہ بالکل عریاں تھا اور کہا کہ اس کے چچا نے اسے دنیا میں الف ننگا کر کے رکھ دیا ہے۔ یہ شدید سردی کا موسم تھا، میں نے پرانے کپڑوں کا ایک جوڑا اسے دیا اور مذاق میں کہا کہ اس نے اب انگریزی لباس پہن لیا ہے چنانچہ اسے اب اپنے حق پر زور دینا چاہیے۔ وہ گھر چلا گیا۔ اگلی صبح اس کا چچا نمودار ہو گیا جس کے جسم پر کوڑوں سے شدید پٹائی کے نشانات موجود تھے۔

کشمیری نہایت زوردار زبان میں بات کرتا ہے وہ نہایت ثابت قدم ہے۔ ایک پنڈت کی درخواست تین مرتبہ مسترد کر دی گئی اور وہ چوتھی مرتبہ پھر آدھمکا۔ میں نے اسے کہہ دیا کہ اگر اس

نے دوبارہ عرضی پیش کی تو میں اُسے مقامی سرکاری اہلکار کے حوالے کردوں گا۔ اگلی صبح پنڈت ایک کاغذ ہاتھوں میں لیے نمودار ہوا۔ میں نے اُسے فوراً وہاں سے ہٹا دیے جانے کا حکم دیا مگر اس نے کہا کہ اس کاغذ پر عرضی نہیں بلکہ ایک نظم تحریر کی گئی ہے۔ جسے وہ پیش کرنا چاہتا ہے۔ اس نظم میں اس کا شکوہ بیان کیا گیا تھا۔ اگر چہ دنیاوی دعوؤں کو وہ بہ بانگ دہل بیان کرتا ہے وہ زلزلوں اور ہیضے کی وباؤں جیسے عذابوں میں نہایت خاموش رہتا ہے۔ قابل اعتبار مشاہدوں کا بیان ہے کہ 1885 کے زلزلوں کے دوران کشمیری خاموش بیٹھے رہے اور 1892 میں، میں ہیضے کی شدید وباء کے دوران شدید طور پر متاثرہ علاقے میں تھا۔ ان دیہات میں ایک مہیب سناٹا چھایا ہوا تھا۔ متوفی افراد کے لیے کوئی رونا دھونا نہیں تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ عوام الناس گاؤں کے قبرستان میں خاموشی سے بیٹھ کر اپنا دن گزارتے ہیں۔ انھوں نے ان دیہات کے معائنے کے دوران میری خاطر داری سے انکار کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ زندگی نہایت غیر یقینی ہے لہٰذا اس دنیا کے معاملات سے واسطہ رکھنا ایک بڑی بات ہوگی۔ سرینگر میں بھی رونے دھونے اور شکوے شکایت کا اسی قدر فقدان تھا اور عام طور پر اس کا سبب بیان کرنے کے لیے ایک کہانی بیان کرتے ہیں۔ ایک پنڈتانی کا بیٹا مر گیا اور وہ زار و قطار رونے لگی۔ اس موقعے پر ایک روح نمودار ہوئی اور اس کو اپنے متوفی بیٹے کے لیے رونے دھونے پر طعنہ زنی کرنے لگی۔ اس روح نے کہا کہ رات ہونے سے قبل اُسے واقعی رونا پڑے گا۔ رات ہونے سے قبل ہی اس کے شوہر سمیت دیگر دو بیٹے بھی جاں بحق ہو گئے۔ اس کے بعد کوئی بھی شخص رویا دھویا نہیں۔

ذہانت اور عقل سلیم کے معاملے میں کشمیری شاید ہندوستان کے باشندوں سے زیادہ بہتر ہیں۔ دلیل بازی میں وہ کافی تیز ہیں۔ وہ تب تک کسی معاملے کی پیروی ترک نہیں کرتے جب تک انھیں یہ یقین نہ ہو جائے کہ اب اس کے مثبت حل کی کوئی اُمید نہیں۔ وہ ہمیشہ فیصلے کی وجوہات معلوم کرنے پر زور دیتے ہیں۔ ایک کشمیری کی حاضر جوابی اور باہوش ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر وہ گھومتا پھرتا رہتا ہے۔ اگر چہ ایک باشندہ یا کشمیری پنڈت دوست جس کے افراد خانہ چند پشتوں سے ہندوستان میں آباد ہیں، کہتا ہے کہ اس کی خاطر جمعی موسمی حالات کے سبب ہے۔ وہ لکھتا ہے "کشمیری پنجاب کے میدانوں اور ہندوستان کے دیگر حصوں میں آباد

ہو گئے ہیں۔ایک صدی یا وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنا کردار کھو چکے ہیں اور میدانوں میں آباد دوسرے باشندوں کا رنگ اختیار کر کے رہ گئے ہیں۔حالیہ وقتوں تک معمولی سے اشتعال پر ایک کشمیری اپنا گاؤں چھوڑ کر آسانی سے شہر میں آکر آباد ہو جاتا تھا، پنجاب میں جا کر اپنا ذریعہ معاش تلاش کرتا تھا۔ بہت سے لوگ دور دراز کلکتہ یا بمبئی میں جا کر آباد ہو گئے ہیں اور لندن اور اس کے اقتدار کے قصے کہانیوں کے ساتھ آشنا ہو چکے ہیں۔اگر چہ کشمیری بار بار لندن کا ذکر کرتے ہیں مگر میں نے دیکھا ہے کہ اس علاقے کے بارے میں ان کے اندازے بہت دھندلے اور مبہم ہیں۔عام جواب یہ ہے کہ لندن دریائے سندھ کے پار سکر بکر کے پار آباد ہے جو کشمیر کے دیہاتی تحصیل Ultima Thule کی علامت ہے۔بہت سارے موضوعات پر ایک عام کشمیری نہایت ذہانت سے بات کرتا ہے اور طنز و تعریف کے تئیں ان کا کافی رجحان ہے۔یہ وادی اس قدر چھوٹی ہے کہ محل اور اس کے واقعات کی خبر فوری طور پر پھیل جاتی ہے اور اس کے اہلکاروں کی بابت نہایت ذہین انداز میں بحث کی جاتی ہے۔ان کا عقیدہ ہے کہ ہر شخص کی ایک قیمت ہوتی ہے مگر اپنے حکمرانوں کی پہچان وہ تیزی سے کر لیتے ہیں۔کشمیر کے ہر گورنر کا انھوں نے نام رکھا ہوا ہے۔یہ ایک حقیقت ہے کہ مضبوط ترین گورنر جو لوگوں کے ساتھ سختی سے پیش آتے تھے ان کے نہایت ستائشی نام دیے گئے۔وزیر پنوں نے کشمیر میں کسی دوسرے گورنر کی نسبت زیادہ کام کیا اور اپنی سخت روی کے سبب اس کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔اس کے بارے میں ایک مقولہ ہے۔

وزیرِ ژلہ کشیر بلہ

(جب وزیر چلا جائے گا تو کشمیر خوشحال ہو جائے گا)

کشمیری کسی بھی کام کی طرف مائل ہو سکتا ہے۔ جب وہ خود کام کرتا ہے تو وہ ایک بہترین کاشتکار ہے۔ پھولوں کے باغات کی بابت اس کی اچھی خاصی معلومات ہیں۔وہ عمدہ ترین اونی کپڑا بن سکتا ہے۔اپنی چپلیں بھی تیار کر سکتا ہے اور اپنے لیے رسّی بھی بُن سکتا ہے۔شاید ہی کوئی ایسا کام ہے جو وہ نہیں کر سکتا۔ ہندوستانی بنیا کے مقابلے میں کوئی بھی درمیانہ دار نہیں ہوتا مگر خود منفرد طرز کا تاجر ہے۔وہ نفع نقصان کو سمجھ سکتا ہے اور اکثر وہ گھاٹے کا سودا نہیں کرتا۔ بہر حال تمام

مشرقی افراد کی طرح وہ ایک قدامت پسند ہے۔ زراعت میں اصلاحات کی بابت تجاویز کو آسانی سے قبول نہیں کرتا۔ آخر کار میں نے انہیں گوکھرو کاٹنے کی ترغیب دی ہے کیونکہ موسم بہار کے دوران گوکھرو کے ڈنٹھل ایک نہایت خوشگوار سبزی ہے۔ کشمیری اپنے زرعی نظام کی بابت مقولے پیش کرسکتا ہے۔ چند بیت بازیوں اور محاوروں میں ہی اس کی زندگی کا معمول ہے۔ ہل چلانا، بیج بونا، بھیڑ پالنا وغیرہ کے لیے اس کا مناسب وقت ہے جس کا تعین سورج کا حمل میں داخل ہونا ہے اور موسم بہار (نوروز) شروع ہوتا ہے اور جب سورج میزان میں داخل ہوتا ہے تو موسم خزاں شروع ہوجاتا ہے۔

اپنی گھریلو زندگی میں ایک کشمیری کاشت کار اپنے بہترین انداز میں رہتا ہے، وہ اپنی بیوی بچوں کے ساتھ شفیق ہوتا ہے، دیہات میں کبھی طلاق اسکینڈل اور بداخلاقی کی بات سنی تک نہیں گئی۔ عورت بداخلاقی کی مرتکب ہو اس ملک میں ہمیشہ نمایاں رہتی ہے اور رائے عامہ ہمیشہ اس کے خلاف رہتی ہے۔ ایک شوہر کبھی کبھی اپنی بیوی کو سخت سزا دیتا ہے اور وہ شیخی بگھار کر کہتا کہ اپنے گھروں میں نظم وضبط قائم رکھنے کے لیے یہ سب لازمی ہوتا ہے مگر حقیقت تو یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں گھرانوں میں بیوی نہایت طاقت ور ہوتی ہے اور میرے خیال میں قاعدے کے مطابق ایک کشمیری اپنی بیوی سے ڈر کر زندگی بسر کرتا ہے۔ کشمیری بیوی ایک سچی مددگار رفیقہ ہوتی ہے۔ مشترکہ مفادات میاں بیوی کے درمیان رفاقت کے جس جذبے کو فروغ دیتے ہیں وہ نہایت صحت مند ہوتا ہے۔ مجھے ایک ایسی عورت سے واسطہ پڑا جو ایک سنسان اور ویران مقام پر اپنے اس شوہر کی یاد میں گاتی اور چلاتی رہی جو کافی عرصے سے انتقال کر چکا تھا۔ کاشتکار کشتی رانوں سے حقارت کرتے ہیں اور ان کے ساتھ شادی بیاہ کا رشتہ نہیں کرتے کیونکہ اخلاق کے معاملے میں وہ انھیں کمزور سمجھتے ہیں۔ اگرچہ وہ کنبے کے ساتھ مہربان ہے مگر اپنے ہمسایوں کے تئیں وہ قطعی مہمان نواز نہیں۔ اگرچہ وہ اجنبی لوگوں کے تئیں فراخ دل ہے مگر مجھے بہت ساری ایسی مثالیں پتہ ہیں جہاں اس نے فیاضی کے بھاری فقدان کا مظاہرہ کیا۔ اس سے ایک بات اور ظاہر ہوتی ہے کہ مسلمانوں میں قطعی طور پر اتحاد نہیں۔ ہر شخص کا مکان ایک الگ اکائی ہے اور ان اکائیوں کو متحد کرنے کے لیے کوئی بھی ایک طبقہ متفق نہیں۔ اگر کسی پل کی تعمیر یا کسی ندی پر باندھ کے لیے

دیہاتی سرکاری اہلکار کی امداد طلب کرتے ہیں جو دیہاتیوں کو تعاون کے لیے مجبور ہو سکتا ہے۔ یہ صورتحال ایک نہایت افسوس ناک پہلو ہے مگر اس کے اسباب کو تلاش کرنا مشکل نہیں ہے۔ ان کی وضاحت انتظامیہ سے متعلق باب میں کی جائے گی۔ مختصر یہ کہ کشمیری کاشتکاروں کے ساتھ زرعی غلاموں جیسا سلوک ہوتا رہا ہے اور انھیں کاشتکاری کے لیے مجبور کیا جاتا ہے۔ انھیں اپنی اراضیات کے ساتھ قطعی طور کوئی دلچسپی نہیں اور بارسوخ لوگوں کی طرف سے انھیں کسی بھی وقت کام کے لیے بچالیا جاتا۔ وہ قطعی طور پر بے بس اور محکوم ہو کر رہ گئے ہیں اور ہر شخص اپنے حالات کا شکار رہا۔ اگر وہ متحد ہو جاتے تو وہ خوشحال تر ہوتے۔ یہ تیز مزاج کشمیری کردار کا بدترین پہلو ہے۔ اس کے ساتھ گہری بے اعتنائی شامل ہو جانے کے سبب عوام کی حالت سدھارنا نہایت دشوار ہو گیا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے اور اس میں کچھ حد تک حقیقت بھی شامل ہے کہ ایک کشمیری تب تک کسی ضیافت پر بھی نہیں جائے گا جب تک اُسے مجبور نہ کیا جائے۔ اور جب فصلوں کی تباہی سے بچانے کی خاطر کوئی ضروری کام درکار ہو تو دیہاتی خود ہی کہتے ہیں۔ "ہم کو تنخواہ نہیں بلکہ ہمیں جوتے درکار ہیں"۔ یہ محاورہ ان کی مجبوریوں کی ترجمانی کرتا ہے۔ دیہات میں جرم کا نام و نشان تک نہیں، املاک و جائداد بالکل محفوظ رہتی ہے اور میں نے فصلوں کی چوری جیسی کسی واردات کی بابت نہیں سنا ہے۔ کسی افراد کے خلاف جرائم بالکل ناپید ہیں اور جب کشمیری جھگڑا کرتے ہیں تو وہ ایک دوسرے کو گالیاں دیتے ہیں۔ شاید ہی وہ کسی کی پگڑی اچھالتے ہوں یا اپنے مخالف کو اس کے زنانہ گریباں سے پکڑتے ہوں۔ مگر کبھی کبھی کشمیری جھگڑا کرتے ہیں جب شیعہ اور سنی ہوتا ہے تو ان میں سویا ہوا وحشی جذبہ بیدار ہو جاتا ہے۔ جرم کی عدم موجودگی کشمیر کے حکمرانوں خاص طور پر مہاراجہ گلاب سنگھ کی طرف سے خاص اقدامات کرنے سے ممکن ہوئی ہے۔ سارقوں کی زندہ کھال کھینچ لینے کا نہایت مانع اور سنگ دلانہ اثر ہوا۔ اس وقت وادی میں گھوڑیوں کی چوری کرنے والے گلوان ہی واحد قسم کے مجرم ہیں۔ جرم کے فقدان کے لیے اور بھی اسباب ذمے دار ہیں۔ گاؤں کے سربراہ اور دیہاتی چوکیدار اگر کسی جرم کی اطلاع دینے یا مجرم کی سراغ رسانی میں ناکام رہیں تو ان کے ساتھ کسی قسم کی نرمی یا رعایت نہیں برتی جاتی۔ مزید برآں، مخبروں کے قدیم نظام نے مجرموں کے کام کو اور بھی غیر مقبول اور غیر فائدہ بخش بنا کر رکھ دیا ہے۔ یہ بات اب وثوق سے

کہی جاسکتی ہے کہ کشمیری جرم کرنے سے ڈرتا ہے۔

فنون لطیفہ سے وابستہ لوگوں کی طرح کشمیری بھی مبالغہ آمیزی کے کافی شوقین ہیں۔ یہ بات خاص طور پر ان کے اراضیاتی دعوؤں میں دیکھی گئی ہے۔ مگر اپنی نجی زندگی میں بھی وہ مبالغہ آمیزی پسند کرتے ہیں۔ خواہ وہ برسات کا موسم ہو یا بھاری برفباری یا وہ شدید گرمی کے دن ہوں، ہر بات کو وہ جبر کا نام دیتے ہیں۔ اپنی بات چیت کے دوران مخاطب کے لیے ان کے تین انداز ہیں۔ اگر کسی بہتر شخص کو مخاطب کرنا ہو (وہ) حق فقیر کہتے ہیں۔ اگر برابر کے کسی شخص سے بات کرنی ہو تو وہ ''سا'' کہہ کر پکارتے ہیں جو صاحب کی بگڑی ہوئی صورت ہے اور حقیر شخص کو ''بابا'' یا بھائی کہہ کر مخاطب ہو جاتا ہے۔ ہر ایک سکھ کو انتہائی بہادری کا درجہ سردار صاحب اور پنجابی مسلمان کا درجہ بڑھا کر اسے خان بہادر پکارا جاتا ہے۔ مغل دربار کی شان و ثروت کا موہوم سا عکس وادی میں زندہ معلوم ہوتا ہے اور ان لوگوں میں بھی متانت کا عنصر موجود ہوتا ہے۔

لیور کے مطابق بہت سارے پہلوؤں سے کشمیری کاشتکار آئرلینڈ کے ایک باشندے سے مطابقت رکھتا ہے۔ یقینی طور پر وہ حاضر جوابی کا مالک ہے جو آئرلینڈ کے باشندے کا خاصا ہے اور کرایہ دینے میں اسے بھاری اعتراض ہوتا ہے۔ آئرلینڈ اور کشمیر کی بابت بہت سارے معاملات میں یکسانیت ہے۔ دونوں ملک زیادہ طاقتور قوموں کی حکمرانی اور تحفظ کے سبب مصیبت کے شکار رہے ہیں یا مستفید ہوئے ہیں۔ کشمیری اور آئرلینڈ کے باشندوں دونوں کو مزاح پسند ہے دونوں بےضرر فریب کاری کے قائل ہیں اور خوش مزاجی کے ماہر ہیں۔ دونوں ہی بچوں کے لیے شفیق اور بزرگوں کے ہمدرد ہیں۔ دونوں کی صحت صفائی کے اوّلین اصولوں کے لیے بے اعتنائی ہے۔ اگرچہ ایک کشمیری جھونپڑے کا اندرونی حصہ آئرلینڈ کے مطابق قدرے صاف ہوتا ہے۔ ایک دن عرضیوں کی سماعت کے دوران میں نے دیکھا کہ ایک معمر ہندو دیہاتی سر کے بل کھڑا ہے۔ وہ اس عالم میں نصف گھنٹے تک رہا حتیٰ کہ میں نے اس کے آنے کے مقصد کی بابت دریافت کیا۔ اس کے بعد اس نے بتایا کہ اس کے خانگی معاملات اس قدر اُلجھے ہوئے ہیں کہ اُسے معلوم نہیں کہ وہ سر کے بل کھڑا ہے یا پاؤں پر۔ کشمیری ہانجی پھڑکتا ہوا جواب دینے میں ماہر ہے۔ میں نے چند کشتی رانوں سے دریافت کیا کہ آیا وہ کاشتکاری کا پیشہ اپنانا چاہتے ہیں۔ اس پر بوڑھے نے جواب دیا کہ ''ہم

زراعت پیشہ تب اختیار کریں گے جب جہلم خشک ہو جائے گا''۔ جب کشتی رانوں کو ان کی ابتدا کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ وہ حضرت نوحؑ کی اولاد ہیں۔ کشمیری ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایک وصف یکساں طور پر پایا جاتا ہے، وہ ہے ان کی فریب کاری۔ کسی کو بھی یہ امید نہیں ہو سکتی کہ ان مظلوم افراد میں فریب کاری کا عنصر اس قدر موجود ہوگا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ کشمیری ہمیشہ یہ سوچتا ہے کہ جس طرح سے وہ کوئی کام سرانجام دے رہا ہے وہ بہترین راستہ ہے۔ پہلے تو اسے فریب کاری میں مزہ آتا ہے مگر بعض اوقات اس کے نتائج سنگین ہوتے ہیں اور بعض اوقات کوئی بھی یہ بات وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ اس کو دی گئی ہدایات میں ترمیم کر کے ایک سیدھے سادھے کام کو وہ تباہ کر کے رکھ دے گا۔

کشمیری گانے اور گانے والے نہایت دلدادہ ہوتے ہیں اور جب وہ دھان کی جواں سال نہالیاں لگانے یا ان کے لیے زمین تیار کرنے میں محو ہوتا ہے تو اسے گاتے ہوئے سننا نہایت خوشگوار لگتا ہے۔ چند گیت تو شاعرانہ جذبات سے بھرے ہوتے ہیں اور فضاؤں میں شیرینی اور درد کا عالم بکھیرتے ہیں، وہ قدرتی حسن وکشش کا شیدائی ہے اور شہر کے لوگ بادام کے شگوفوں سے بھرے باغوں میں وہاں کی معطر فضاؤں میں چائے لے کر جاتے ہیں اور وجد کے عالم میں گھنٹوں تک وہاں بیٹھے رہتے ہیں۔ موسم بہار کے ابتدائی دنوں میں جب شگوفے پھوٹتے ہیں تو سرینگر کے نواح میں واقع بادام کے باغات شگفتہ اور خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ اگرچہ گلابی رنگ کے پھول بھی نمودار ہوتے ہیں مگر باداموں کے شگوفے عام طور پر سفید ہوتے ہیں۔ کشمیری ایک قنوطیت پسند شخص ہے گفتگو کے دوران وہ نہایت بے محل انداز میں آہ نکالے گا اور کہے گا کہ وہ اپنے گناہوں کے لیے ایسا کر رہا ہے اور ان ہی گناہوں کے سبب کشمیر مصیبت کا شکار ہوا ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا دن گزرتا ہو جب وہ اس لعنت کا ذکر نہ کرتا ہو اور اسی گناہ (پاپ) کی وجہ سے ان پر یہ آفت نازل ہوئی ہے۔ جبر و استبداد، فصلوں کی ناکامی، اور مال مویشیوں کا نقصان تمام تر بدبختیوں کے لیے فوری طور پر اس لعنت کو ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے۔ اس لعنت کے لیے کون سا گناہ ذمہ دار ہے؟ میں اس کی بابت کبھی معلوم نہ کر سکا۔ پجاریوں کا کہنا ہے کہ یہ گناہ دروغ گوئی اور بغض ہیں ......وہ شاذ و نادر ہی مسکراتے یا قہقہہ لگاتے ہیں اور آسانی سے آنسو بہانے لگتے

ہیں۔ پہلے پہل میں نے جب دیہات کے معائنے کا کام شروع کیا تو معمر افراد کو بچوں کی طرح روتے دیکھ کر میں نہایت متاثر ہوا مگر جلد ہی مجھے معلوم ہوا کہ یہ اشک شوئی محض مصنوعی ہے۔ مجھے مزید معلوم ہوا کہ ہر گاؤں میں ایک یا دو افراد کو ہمدردی حاصل کرنے کے لیے تیار کیا جاتا ہے، وہ ماہر اداکار ہیں۔ رائی فصلوں پر نازل ہونے والی ایک آفت ہے اور رائی سے متاثر پودے کی فوراً پہچان ہوسکتی ہے۔ ہر ایک گاؤں میں دو یا تین افراد تباہ شدہ دھان کا گٹھا لیے دوڑے چلے آئے مگر بعدازاں تحقیقات سے معلوم ہوا کہ یہ گٹھے ایک گاؤں دوسرے گاؤں لے جارہے تھے۔

ایک کشمیری کمزور دل اور نازک مخلوق ہے۔ اسے نہ بارش پسند ہے اور نہ ہی وہ تیز گرمی کا مقابلہ کرسکتا ہے۔ میں اُن اشخاص کو جانتا ہوں جو میرے ساتھ بارش کے دوران چلنے کے لیے شرط لگائے ہیں اور دیکھا ہے کہ چند دیگر اشخاص دھوپ کا مقابلہ کرتے ہوئے میرے ساتھ معائنوں کے دوران گھوڑسواری کرتے ہیں۔ ان کے پٹھوں میں بھاری طاقت ہوتی ہے اور تب تک بھاری بوجھ اٹھاسکتے ہیں جب تک وہ خود اپنے لیے کام نہیں کرتا۔ ایسے موقعوں پر وہ کوئی جان نہیں لگاتا۔ وہ کام کے دوران سرگشتی کرتا ہے اور صرف ایک ہاتھ کا استعمال کرتا ہے اور بعض اوقات آفتوں کے وقت میں نے دیکھا کہ وہ حیران کن محنت کے ساتھ درگاہوں کی مرمت کا کام سرانجام دیتا ہے۔ ذاتی طور پر وہ اپنی عادات کے معاملے میں نہایت غلیظ ہوتا ہے اور دن میں ایک مرتبہ وضو کرتا ہے اور اس پر طرہ یہ کہ اس کے کپڑے بھی اس قدر گندے ہوتے ہیں اور گرمیوں کے موسم کے دوران وہ ناگوار ہم سفر بن کر رہ جاتے ہیں۔ وادی میں صابن ہر چند تیار کیا جاتا ہے مگر انھوں نے کبھی اسے ذاتی وضو کے لیے استعمال کے لیے نہیں لایا۔ دیہات میں حجام اپنے گاہکوں کی داڑھی پانی سے صاف کرتا ہے۔ ان کے لیے صابن اس قدر بیش قیمت ہے کہ اس کو وہ ذاتی معمولی کام کے لیے بھی استعمال نہیں کرتے۔ صابن کو وہ کشمیر کے اونی کپڑے کو نرم بنانے کے لیے استعمال میں لاتے ہیں۔ یہ ایک متجسس امر ہے کہ کشمیری لباس کے گندہ ہونے کے باوجود کپڑے دھونے کا چلن خاص طور پر شہروں میں پورے طور پر شدومد سے جاری رہتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کشمیری گندے ہیں مگر بہت سارے دیہات خاص طور پر جو آب پاش نہیں وہاں گھروں سے قدرے فاصلے پر بیت الخلا تعمیر کیے گئے ہیں چنانچہ صحت وصفائی کا تصور وادی میں

بدرجہ اتم موجود ہے۔

شہر کے لوگ

کردار اور مزاج کے معاملے میں شہر کے مسلمان دیہاتی مسلمانوں کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں مگر وہ زیادہ نسوانی مزاج، کاہل اور زیادہ بے بس اور مجبور ہیں۔ کشمیری نہ ہی کام کرے گا اور نہ ہی اپنی صلاحیت سدھارنے کی کوشش کرے گا۔ اس کا تجربہ تو ہم پرستی ہے۔ اس کی رائے میں حکومت کا یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اس کی پرورش کرے اور اسے سستے داموں پر ایندھن فراہم کرے مگر وہ خود کسی فرض کا پابند نہیں۔ جب بار برداری کے لیے مزدوروں کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ لازمی طور پر دیہات سے حاصل کی جاتی ہے کیونکہ شہری عوام اس قدر نازک مزاج ہوتے ہیں کہ وہ کام نہیں کر سکتے۔ کسی قسم کی اختراع پسندی سے اُسے ہر چند اعتراض ہے اور جب صحت وصفائی کی تجویز پیش کی جاتی ہے تو وہ اس کی گلا پھاڑ کر مخالفت کرتا ہے۔ لوگ آتشزدگی کی تباہ کاریوں اور ہیضے کی ہولناکیوں کو یکسر فراموش کر دیتے ہیں اور مذاق اڑاتے ہوئے کہتے ہیں کہ نالیاں اور گلیاں کسی دوسری دنیا کی باتیں ہیں۔ ایک دیہاتی کی طرح شہری بھی موسم سرما کے دوران خود کو گرم رکھنا پسند کرتا ہے اور موسم سرما کے دوران ان کے گھر کا ماحول بھی نہ تو صحت مند اور نہ ہی توانائی کے فروغ کے موافق ہوتا ہے۔ حمام ایک مشہور ادارہ ہے اور سرینگر میں اس وقت چار عوامی حمام ہیں۔ مرد لوگ دن کے وقت ان حماموں پر جاتے ہیں جبکہ عورتیں رات کے وقت حمام پر جاتی ہیں تو وہ اپنے ساتھ کھانا بھی لے جاتی ہیں۔ نصف آنے کے عوض وہ لگاتار غسل کر سکتا ہے جب کہ ایک چوتھائی آنہ دے کر وہ پانی کے نل کے نیچے کھڑا ہو سکتا ہے۔ شہر میں مسلمان ایک ہفتے میں ایک مرتبہ حمام پر نہانا ضروری سمجھتے ہیں۔ تے آور ایک مرتبہ اور خون آور سال میں دو مرتبہ نہاتے ہیں۔ میں نہایت افسوس کے ساتھ یہ بات کہتا ہوں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں شراب نوشی کی لت میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔ وہ عام طور پر سرکاری بھٹیوں میں سیب سے تیار کردہ برانڈی استعمال کرتے ہیں۔ ہندو چونکہ شو بھگت ہیں چنانچہ وہ گوشت اور شراب کے مصرف کو جائز قرار دیتے ہیں مگر دیہات میں مسلمان شراب نوشی سے احتراز کرتے ہیں حالانکہ میں ایک یا دو ایسے سربراہوں کو جانتا ہوں جو شراب نوشی کرتے ہیں۔ ہندوستان کی مانند شراب نوشی کا ایک ہی

مقصد نشہ طاری کرنا ہوتا ہے اور سرینگر کے فیشن ایبل نوجوان سیب کی شراب کا ایک چوتھائی گیلن ایک ہی گھونٹ میں غٹا غٹ پی جاتے ہیں۔ برانڈی نوشی سے باداموں کے ساتھ بھنگ ملا کر پینے کی بدترین لت ختم ہو چکی ہے۔ قاعدے کے مطابق پنڈت چالیس برس کی عمر سے قبل افیون نہیں کھاتے۔ شہری عوام سستی خوراک سے مطمئن نہیں مگر انھیں خوراک اپنے دروازے پر ہی دستیاب ہونی چاہیے چنانچہ پورے دریا پر سرکاری اناج سے بھری کشتیوں کی قطاریں موجود ہوتی ہیں۔ جب یہ تجویز پیش کی گئی کہ یہ غلہ چند مخصوص مقامات پر ہی فروخت ہونا چاہیے تاکہ نگرانی کا کام سہل ہو سکتے تو شہری عوام نے اس تجویز کو ایک جابرانہ اقدام دے کر اس کی مخالفت کی۔ چونکہ وہ محل کے قریب ہیں، لہٰذا ان کی آواز سنی جاتی ہے۔

شہری ہندو دیہات میں رہنے والے ہندوؤں سے بالکل مختلف ہیں۔ مؤخر الذکر وہ شخص ہے جو کھیتوں میں کام کرتا ہے۔ وہ اکثر سادہ لوح، محنت کش اور صحت مند شخص ہوتا ہے۔ شہر کے ہندو مندرجہ ذیل طریقوں پر اپنا گزر بسر کرتے ہیں۔

ئلم۔ قلم یا ہلم

(جھوٹ، قلمکاری یا گداگری)

اس قسم کے لوگوں کا گزر بسر سرکاری نوکریوں پر ہی ہوتا ہے۔ وہ نہایت ذہین اور دانشور ذہن کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان کے طور طریقے اور چال ڈھال نہایت اعلیٰ پایہ کی ہوتی ہے اور ان کے مصاحب اور رفیق نہایت خوش مزاج اور دلکش قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ وہ فصیح بیان اور فی البدیہہ قلمکار ہوتے ہیں۔ اپنی نازک شکل وصورت کے باوجود موقع آنے پر یہ لوگ نہایت جانفشانی کے ساتھ محنت کرتے ہیں۔ وہ اکثر مختصر عرصے کے دوران بھاری دولت جمع کر لیتے ہیں مگر وہ نہایت فضول خرچ بھی ہوتے ہیں اور جلدی ہی ان کی تمام تر دولت ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ مسلمانوں نے مسجدوں اور غسل خانوں کی تعمیر عمل میں لائی ہے مگر مجھے کسی ایسے ادارے کے بارے میں یاد نہیں جو پنڈت کی طرف سے عوام الناس کے لیے وقف کیا گیا ہو۔ شادی بیاہ پر بھاری اخراجات اٹھائے جاتے ہیں اور کنبے کے بدبخت سربراہ کو تمام دیگر اراکین کی اس امر کے باوجود بھی پرورش کرنا پڑتی ہے کہ دوسرے لوگ بھی خوش حال اور فارغ البال ہوں۔ وہ ایک دوسرے کے تئیں

وفادار ہوتے ہیں۔ان کے اتحاد کی وجہ اس امر میں مضمر ہے کہ انہوں نے تمام تر سرکاری دفاتر پر اپنی اجارہ داری قائم کر لی ہے۔اور وسیع تر طاقت حاصل کر لی ہے۔عہدہ اور دولت حاصل کرنے کے معاملے میں وہ نہایت کمزور ہوتے ہیں۔انھوں نے اپنی اس جائداد غیر منقولہ سے بہت کم دولت کمائی جو انھوں نے اپنے اقتدار کے دنوں میں حاصل کی ہے۔اپنے کردار، مزاج اور لیاقت کے سبب دوسرے نجی افراد کی مانند کشمیری مسلمانوں کے مقابلے میں انتہائی بلند پایہ کے مالک ہوتے ہیں مگر نظم ونسق سے متعلقہ باب میں ظاہر ہوتا ہے کہ اہلکاروں کے طور پر یہ لوگ نہایت لالچی، تنگ نظر اور بے رحم ہوتے ہیں۔

اختتامیہ

عوامی کردار کا بیان کا کام نہایت کٹھن اور دشوار ہوتا ہے اور جو تفاصیل میں نے بیان کی ہیں وہ پہلے ہی کافی طویل ہیں اور ان قصّے کہانیوں کے لیے اب کوئی گنجائش نہیں جو عام بیانات سے ہٹ کر ان کے عمومی کردار کے بارے میں بہترین معلومات فراہم کر سکیں۔چنانچہ میں اس میں یہی اضافہ کر سکتا ہوں کہ قومی کردار کے معاملے میں کشمیری لوگ منفرد ہوتے ہیں اور جہاں کہیں بھی جائیں ان کی انفرادیت قائم رہتی ہے۔میں نے ایسے افراد کو کشمیر میں واپس آتے دیکھا ہے جن کے آباواجداد اس ملک سے پشتوں پہلے چلے گئے تھے۔ان کا لباس بدل چکا ہے۔ان کی چال ڈھال میں تبدیلی آ چکی ہے۔اس کے باوجود بھی ان کی شخصیت میں کشمیریت کی واضح علامات موجود ہیں۔ان کے اندازِ تکلّم اور اندازِ فکر سے ان کی نسل کا احساس ہو جاتا ہے۔کشمیریوں کو اپنے وطن سے محبت ہے۔وہ یہاں کی خوراک، پانی اور لباس سے بے پناہ محبت کرتے ہیں حالانکہ ظلم وستم اور جبر واستبداد کے سبب انھیں اپنا گھر بار چھوڑ کر جانا پڑا۔بہت سارے لوگ واپس آ گئے ہیں اور جانے کے لیے تیار نہیں۔جب کسی کشمیری کو پنجاب میں جا کر ملازمت کے فائدوں کے بارے میں بتایا جاتا ہے تو وہ ایک محاروہ بیان کرتا ہے ''ژرہ کنڈی تھر پیٹھ قرار'' یعنی ایک پنچھی اپنی بیشاخ پر مطمئن رہتا ہے۔آخری بات۔اگر کشمیریوں کا کردار کافی حد تک تشنۂ تکمیل ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ ان کی خوبی ہے۔یہ کردار کی خرابی نہیں کہ جب انھیں چند مواقعے حاصل ہوئے وہ وفادار، مردانہ اور انا پرست ظاہر ہوئے۔عزت کا لفظ اس کی زبان پر ہے۔وہ اس بات

کی سخت مذمت کرتے ہیں کہ حکمرانوں کی نظر میں ان کی اور ان کے رفیقوں کی کوئی عزت نہیں۔ ایک ایسا شخص جسے اہل اقتدار میں کوئی بھی زدوکوب کر کے لوٹ سکتا ہے اپنی اور اپنے رفقاء کی عزت سے محروم ہو جاتا ہے۔ کشمیریوں میں آزاد لوگوں میں اوصاف کی تلاش ایک فضول کام ہے۔ کشمیری اسی کردار کا مالک ہے جس میں اس کے حکمرانوں نے اسے ڈھالا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک انصاف پسند اور مضبوط حکومت کشمیری کو ایک مثبت، ذہین اور بے حد ایماندار شخص کا مرتبہ دے کر ہی رہے گی۔

●❋❋❋●

حوالہ جات

(1) چرار شریف وہ مقام ہے جہاں کشمیر کے عظیم صوفی نورالدین نورانی کی درگاہ شریف موجود ہے۔

(2) ہندوستان میں رواج اس کے برعکس ہے۔

(3) یہ دلچسپ بات میری نوٹس میں لائی گئی ہے اور کشمیر کے ہندو اس بات پر زور دیتے ہیں کہ وہ جو کوئی بھی پرندہ کھاتے ہیں اسے مسلمانوں کے طرز پر حلال کرتے ہیں: لارنس

(4) بیان کیا جاتا ہے کہ چائے کی ترویج مرزا حیدر نے یارقند سے کی۔

(5) کشمیر کے سکھ اس واحد چھڑی کے کھیل میں خاصی مہارت رکھتے ہیں۔

(6) بعض اوقات ترانگا وہ لڑکیاں بھی پہنتی ہیں جو شادی کی عمر کو پہنچ جاتی ہیں۔

(7) میں ہندوؤں کے ایک مجموعی طبقے کی بات کر رہا ہوں۔ بہت سارے ایسے ہندو جن کے ساتھ میں رہا ہوں، ان میں سے چند کے ہاں ایک سے زیادہ بیویاں تھیں مگر یہاں یہ بات باعث اطمینان ہے کہ بڑی بیوی چھوٹی کے ساتھ نہایت نرم روی سے پیش آتی ہے۔
ایک شخص ایک سے زیادہ بیوی اُسی صورت میں لائے گا جب اُسے پہلی بیوی سے بچہ حاصل کرنے کی اُمید باقی نہ رہے۔ دوسری شادی پہلی بیوی کی رضامندی سے سرانجام ہوتی ہے۔
بہرحال ایسی شادی کو پسند نہیں کیا جاتا اور ایسی شادیاں بہت کم ہوتی ہیں۔

(8) گریز اور تلیل اب کشمیر خاص کے حصے ہیں۔ اس وادی میں بیوی کی قیمت ایک سو روپے اور ایک ٹٹو ہے۔ اگر کوئی شخص زیادہ امیر نہیں تو وہ اپنی دُلہن کو اُسی کے گھر میں رہنے دیتا ہے اور بارہ برس تک اپنے سسر کی خدمت کرتا ہے۔

(9) ملاحظہ ہو: رومیو جولیٹ

(10) روس کے کسانوں کا اعتقاد ہے کہ مرغی کے ٹوکرے میں زخم کے مرہم کی قوت ہوتی ہے۔

(11) چلکی روپیہ، نوٹی یا پکّہ روپیہ کہلاتا ہے اور دس آنے کی مالیت کا ہے۔

●❄❄❄●

گیارھواں باب

مذاہب

شیعہ مسلمان

کشمیر میں 8,14241 افراد پر مشتمل آبادی میں سے 52,576 ہندو، 4092 سکھ اور باقی مسلمان ہیں جو وادیٔ کی کل آبادی کا 93 فیصد ہے۔ 1890 کی مردم شماری کے دوران شیعہ اور سنّی کو ایک ہی خانے میں شمار کر کے درج کیا گیا تھا مگر پھر بھی عام طور پر کہا جاسکتا ہے کہ کشمیر میں مسلمانوں کی کل آبادی میں شیعہ صرف پانچ فیصد ہیں۔ اہل تشعیہ عام طور پر سرینگر کے ذڈی بل وارڑ اور ضلع کمراز میں رہتے ہیں۔ اگر چہ وہ وادی کے دوسرے حصوں میں بھی آباد ہیں مگر ان کی موجودگی کو صرف اُن کی قبروں سے پہچانا جاسکتا ہے جن کی سطح زمین کے ساتھ ہموار ہوتی ہے جبکہ سُنیوں کی قبریں زمین سے اوپر ایک ڈھیر کی شکل میں اُبھری ہوئی ہوتی ہیں۔

شیعہ نظام کو 1450 میں شمس الدین عراقی نے متعارف کیا مگر چک سلاطین کے عہد کے سوا کبھی اس مسلکی فرقے کو وادی میں غلبہ حاصل نہیں ہوا۔ عراقی کو بھی زبردست مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی تدفین ذڈی بل میں کی گئی اور سُنیوں نے کئی بار اس قبر کو منہدم کرنے کی کوشش کی۔ کشمیر کے اہل تشیعہ اس قبر کو قدر و منزلت سے دیکھتے ہیں۔ شیعہ لوگ نہایت ذی عزت طبقے میں شمار ہوتے ہیں اور سرینگر میں تو ان میں سے چند اچھے عہدوں پر فائز ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے

وفادار ہیں اور غریبوں کی خوب مدد کرتے ہیں۔ شیعہ اور سنی افراد کے درمیان وقتاً فوقتاً ہونے والے تنازعات کے سبب تشدد کے وقعات ہوتے ہیں۔ حالیہ برسوں کے دوران 1872 میں رونما ہونے والا تنازعہ کافی سنگین نوعیت کا تھا۔ یہ تنازعہ اس وقت پیدا ہوا جب اہل شیعہ مدین صاحب کے مزار کے نزدیک تعمیر بنانا چاہتے تھے۔جنھیں سنی لوگ سنی اور شیعہ لوگ شیعہ مانتے ہیں۔شیعہ لوگ ہندوؤں سے نفرت کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ اس تیل کو ہاتھ نہیں لگائیں گے یا ایسی روشنائی کا استعمال نہیں کریں گے جسے پنڈت نے چھوا ہو۔

سُنیوں کے کشمیری ہندوؤں کے ساتھ دوستانہ مراسم ہیں۔ وہ شیعہ لوگوں کو اپنی ذات سے باہر تصور کرتے ہیں اور ان کا مسلمانوں کے طور پر تذکرہ تک نہیں کرتے مگر ان کو اہل تشیع اور رأفز کے ناموں سے پکارتے ہیں۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ مسجد کے اندر شیعہ لوگ جس تالاب کا پانی پیتے ہیں وہ اُسی سے نہاتے بھی ہیں، وہ ان پر ناپاک ہونے کا الزام لگاتے ہیں۔ کشمیر میں ان کی واحد زیارت سرینگر کے زورہ محلّہ میں شاہِ عالم کی زیارت ہے۔اس کے علاوہ ان کی عبادت گاہیں جہاں کہیں بھی موجود ہیں' وہ نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ سرینگر میں زڈی بل اور حسن آباد، ضلع کمراز میں سعید پورہ اور احمد پورہ میں شیعوں کی اہم زیارت گاہیں موجود ہیں۔کوئی بھی سنی ان مقامات پر نہیں جائے گا۔شہر میں شیعہ آبادی زیادہ تر شال بافوں پر مشتمل ہے۔عملی طور پر پیپر ماشی انڈسٹری پر ان کی اجارہ داری ہے۔شیعوں میں مشہور حکیم بھی ہیں۔ معمولی تجربے کے بعد کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ شیعہ ہے۔ وہ اپنی پگڑی مخصوص انداز میں پہنتے ہیں اور گل موچھیں سنی افراد سے الگ انداز میں تراشتے ہیں۔

وہابی

حالیہ دور میں وہابی عقیدے کو کشمیر میں ترویج دینے کی کوشش کی گئی ہے۔شوپیان تحصیل کے دو سو کنبوں نے وہابی عقیدہ اختیار کر لیا ہے مگر مہاراجہ رنبیر سنگھ نے فوری طور پر اس عقیدے کے پروپیگنڈا بازوں کو نکال باہر کر دیا۔گزشتہ پانچ برسوں کے دوران دوبارہ وہابی عقائد کی تبلیغ کی گئی اور درگاہوں کے بہت سارے رشی اور دیگر افراد وثوق کے ساتھ یہ اعلان کر رہے ہیں کہ وہابی خیالات پھیل رہے ہیں۔ کشمیری قدامت پسندوں کی طرف سے یہ بھی مشہور کیا گیا کہ وہابی کسی فرو

واحد کا اپنی بیوی پر واحد حق دینے سے انکار کرتے ہیں۔

سنی

کشمیر میں سنی مسلمانوں کی بھاری اکثریت حنفیہ طبقے سے تعلق رکھتی ہے مگر میر سید علی ہمدانی کے پیروکار کبروی شافعی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ میرے خیال میں سنی اپنے عقیدے کی پیروکاری کے معاملے میں اس قدر کٹر نہیں ہیں ماسوائے اس کے کہ وہ اہل تشیعہ کے ساتھ جھگڑا کرتے ہیں۔ ورنہ وہ ہر قسم کی کٹر پرستی سے بالاتر ہیں۔ وہ رمضان المبارک کے روزوں کے پابند ہیں اور جمعہ کے دن کو وہ چھٹی کا دن کہتے ہیں۔ بہت کم کشمیری مکہ شریف کا سفر کرتے ہیں حالانکہ اب یہ سفر آسان ہو گیا ہے۔ اس پر تین سو چالیس روپے سے زیادہ خرچ نہیں آتا ہے۔ 1892 میں اکیس کشمیری مکہ معظمہ کے سفر محمود پر گئے۔ کشمیریوں کی مذہب کی بابت بے رخی کی بات میں محض اپنے ذاتی مشاہدات کی بنا پر نہیں کرتا۔ عرب کے مقدس افراد نے میرے ساتھ بات کرتے ہوئے اس بات پر حقارت کا اظہار کیا کہ اسلام کی روشنی کشمیر میں موہوم ہے اور مقامی ملا عوام کی مذہب کے تئیں بے رُخی کا ذکر نہایت حقارت کے ساتھ کرتے ہیں۔ زلزلوں اور ہیضے کی وبا کے دوران کشمیری گڑگڑا کر دعائیں مانگنے لگتا ہے اور اپنی درگاہوں اور مسجدوں کی مرمت میں پوری طرح جٹ جاتا ہے مگر جب امن و امان کا وقت ہوتا ہے تو وہ مسجدوں کو کھنڈر بننے کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ اور ملا کی بہت کم پرواہ کرتا ہے۔ گاؤں کی ایک عام مسجد کی حالت کسی کاشت کار کے جھونپڑے سے کسی طور بہتر نہیں ہے۔ میں نے مسجد کو گھاس کی چھت کے بغیر دیکھا ہے اور یہ بھی دیکھا ہے کہ قدیم اور خوبصورت درگاہیں معمولی مرمت کے لیے برباد ہو رہی ہیں۔ مسلمانوں کے دینی نظم و نسق میں باقاعدگی کا فقدان ہے۔ چھوٹے چھوٹے دیہات میں تین مسجدوں کو میں نا گفتہ بہہ حالت میں دیکھا ہے اور میں نے یہ مشورہ دیا ہے کہ ایک اچھی مسجد اور ایک ذی عزت مُلاّ ہونا چاہیے مگر دیہاتی لوگ ہمیشہ اپنے گھروں کے قریب مساجد کو پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ آسائش کے لئے یہ عبادت گھر جابجا پھیلے ہوئے ہیں، یہ نہایت خستہ حالی کے شکار ہیں یا مساجد اور ملاؤں کے تئیں ان کی بے اعتنائی کی وجہ یہ ہے کہ کشمیر کے سنی برائے نام مسلمان ہیں۔ دل میں وہ ہندو ہیں اور ان کی توہم پرستی کی تشفی کے لیے اسلام نہایت خیالی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ ادنیٰ مسجد اور ادنیٰ مولوی سے مڑ کر

لکڑی سے تعمیر کردہ خوبصورت درگاہوں کی جانب جاتے ہیں۔

درگاہیں

ان درگاہوں کی چھت روشن ہوتی ہے اور یہ عہد پارینہ کے کسی نہ کسی فقیر کی ابدی قیام گاہیں ہوتیں ہیں۔لوگ اس فقیر کے پرانے ملبوس اور اس کی پگڑی پر نگاہ ڈالنا چاہتے ہیں۔وہ اس غار کا بھی معائنہ کرتے ہیں جس میں اس فقیر نے اپنی زندگی بسر کی ہوتی ہے۔اس دلیل کے بارے میں کشمیری دل ہی دل میں ہندو ہیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ چند مقامات کو ہندو اور مسلمان یکساں عقیدت کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔مثال کے طور پر ویری ناگ کے فتح پور اور ماگام کے واری پورہ علاقوں میں میں نے مسلمانوں کو قدم رسولؐ (پتھر پر پیغمبرؐ کے عکس پاؤں) کی عبادت کرتے ہوئے دیکھا جبکہ ہندوؤں کو وشنو پاد (شو کے نقش پاؤں) کی پرستش کرتے بھی دیکھا ہے۔عام الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے جب کوئی کسی مسلم درگاہ، اس کے سایہ دار چناروں، بلند قامت سفیدوں اور کھردرے پتوں والے کے ایلم درخت کو دیکھتا ہے تو قدرے تلاش کے بعد وہ ہندو آستھاپن کی تلاش بھی کرے گا۔ یہ بات قدرتی ہے کہ جب مسلمانوں نے اسلام قبول کیا ہوگا انھیں قدیم مذہبی مقامات (1) سے ہر چند لگاؤ رہا ہوگا اور انھوں نے ان مقدس مقامات کو اپنایا ہوگا جو پہلے ہی دیہاتی علاقوں میں مانوس تھے۔میں نے رواجوں سے متعلق باب میں دکھایا ہے کہ چند خیالات کس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں میں یکساں طور پر مشترکہ تھے مگر میں دونوں مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان خوشگوار رواداری کے لیے اس بات کو ذمہ دار سمجھتا ہوں کہ کشمیر کے مسلمانوں نے کبھی ہندو مذہب کا دامن نہیں چھوڑا۔اس رواداری کے دو اسباب بیان کیے جاسکتے ہیں۔گاؤ کشی پر سخت ممانعت بدظنی پھیلنے کا بڑا سبب نہیں تھا اور دوسرے یہ کہ پشتوں سے چلی آرہی سخت اور مضبوط حکومتوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جھگڑوں اور تنازعات کو ہرگز برداشت نہیں کیا۔ جس حکومت نے شادی بیاہ کی رسومات کی خاطر ملاؤں کی سرکاری طور پر پرورش کی اور واضح کردیا کہ تقریبات کے اس حق سے کسی طور پر غیر رواداری اور بنیاد پرستی کی اجازت نہ ہو۔

اولیا پرستی

ہر کشمیری کا عقیدہ ہے کہ جب کبھی پکارا اولیا مدد کو آجاتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ ایک مرحوم ولی

ایک زندہ روحانی بزرگ سے زیادہ طاقت ور ہوتا ہے۔ غیر ملکی لوگ کشمیریوں کو پیر پرست کہتے ہیں اور ان کا پیر پرستی کا لقب نہایت موزوں ہے۔ کشمیری کردار میں تمام تر احترام مسلمانوں کی درگاہوں کے تئیں عادت سے پیدا ہوتا ہے جہاں جھک کر سجدہ کیا جاتا ہے اور ننگے پاؤں کشمیری درگاہ کے دروازے کے قریب آتا ہے۔ اپنے گلے اور جسم پر مقدس گرد کا کشکا لگاتا ہے۔ ایک مرتبہ میں نے اس قاعدے سے منحرف ہونے سے خطرات ہونے کی مثال کو بذات خود دیکھا ہے۔ ایک کشمیری بارات ندی کو پار کر رہی تھی۔ اس ندی کے اوپر ایک ولی کی درگاہ تھی۔ گھوڑوں سے تمام سوار نیچے اُتر کر پل سے گزرے مگر دولہے کا والد دولہے کو اپنی باہوں میں لے کر بدستور گھوڑے پر سوار رہا۔ پل ٹوٹ گیا۔ گھوڑا، والد اور اس کا دولہا بیٹا دریا برد ہو گئے۔ جوں ہی وہ خود کو بچانے کے لیے جدوجہد کر رہے تھے میں وہاں بھاگتا ہوا گیا اور ہجوم کو اس لیے لعن طعن کیا کہ وہ ڈوبنے والوں کو بچانے کی مدد نہیں کر رہے۔ مگر وہ لوگ اُداس دکھائی دے رہے تھے اور کہا کہ وہ اسی انجام کے مستحق تھے۔ میں نے اپنے ہی کچھ آدمیوں کو ترغیب دی کہ وہ گھوڑے کے ساتھ الجھے ہوئے ان لوگوں کو الگ کریں۔ اس وقت اس درگاہ کے خدمت گاروں میں سے ایک نے مجھے بتایا کہ گزشتہ دس برسوں کے دوران چار ایسے افراد پل کو عبور کرتے ہوئے ہلاک ہو گئے۔ جنھوں نے اس ولی کے تئیں حقارت کا اظہار کیا تھا۔ اگرچہ کئی پہلوؤں سے کشمیری لوگ کاہل لگتے ہیں مگر کوئی بھی کشمیری کسی درگاہ کی زیارت کے معاملے میں قطعی طور پر تھکا ماندہ نہیں لگتا۔ میں اکثر ان گھرانوں سے ملا ہوں جو پنجاب کے دور افتادہ علاقوں سے نذر و نیاز کے لیے بھیڑ کو ساتھ لے کر گرتے پڑتے چلے آتے ہیں۔ جس کے اردگرد ماچس کے ڈھکنوں کی مالا پہنائی ہوتی ہے۔ ایک ولی کی برسی کے موقعے پر سبھی لوگ کھانا کھانے سے احتراز کرتے ہیں اور دور افتادہ علاقوں میں رہنے والے کشمیری بھی فاقہ کشی کرتے ہیں۔

دیہی کشمیر کا سرپرست ولی نورالدین نورانیؒ

یہاں کی بہت ساری غیر معروف درگاہیں مشہور نورالدین ولیؒ کی ہیں۔ وہ اور ان کے 91 پیروکار خلیفے وادی میں آکر آباد ہوئے اور ان خلیفوں کے متولیوں کو بھی اب بھی رشی (2) کہا جاتا ہے۔ وہ اپنے پیش روؤں کی مانند صوفیانہ زندگی بسر نہیں کرتے اور سادہ زندگی،، اعلیٰ خیالات کا تصور اب موجود نہیں۔ نورالدین کا سب سے ممتاز خلیفہ باباشکرالدینؒ ہے جس کا مزار جھیل ولر

کے نزدیک وٹلب پہاڑی پر واقع ہے۔ تو سہ میدان پہاڑوں پر ایک الگ تھلگ پہاڑی پر واقع حنیف الدین ہے۔ زین العابدین کا مزار ایک پہاڑی کی چوٹی پر واقع ایک قلعے کی مانند لگتا ہے جو وادیٔ لیدر پر نظر ڈالے ہوئے ہے۔ لطف الدینؒ کی درگاہ خوبصورت کوہ پشکر پر واقع ہے۔ نصیر الدین کی درگاہ اپنے آقا کے قریب چرار شریف میں واقع ہے۔ بام الدینؒ کی درگاہ بومہ زو میں واقع ہے۔ گلمرگ کے نیچے واقع مشہور درگاہ بیام الدین کی ہے جو زین العابدین کا خلیفہ تھا۔ رشی، بابا مخدوم صاحب پیرزادے کشمیریوں کے لیے ہمیشہ محترم خیال کیے جاتے ہیں۔ انھیں وامی کہا جاتا ہے جو سید اوران سید پیرزادوں سے ممتاز ہوتے ہیں۔ وہ غیر ممالک سے آ کر کشمیر میں آباد ہوئے۔ ان تمام کا واسطہ درگاہ پرستی سے ہے اور میرے خیال میں ان کا مسجدوں کے ملاؤں کی نسبت زیادہ اثر ورسوخ ہے۔ ان درگاہوں کے ساتھ خود انحرافی اور نیک کاموں کے قصے کہانیاں وابستہ ہیں۔ عرس کے وقت ملاقات کے لیے یہ درگاہیں خوشگوار مقامات ہیں اور ان درگاہوں کے قدرتی حسن وکشش میں کشمیری عوام کو وہ کیف وسرور حاصل ہوتا ہے جو اسے خستہ حال مسجدوں میں نہیں ملتا۔ چناروں، ایلم، کابلی سفیدوں کے سفید تنوں اور سیمیں پتوں سے آمیز خوبصورت درختوں کی وافر تعداد ایک خوشگوار چھاؤں فراہم کرتی ہے اور قریب ہی کوئی نہ کوئی پانی کا چشمہ ہوتا ہے جو پیاسے لوگوں کی تشنگی مٹاتا ہے۔ اس تفصیل کے بارے میں ایک انحراف چرار شریف پر شیخ نور الدینؒ کی درگاہ ہو سکتا ہے۔ ایک بااختیار جج نے سرینگر کو مشرق کا ایک نہایت غلیظ شہر قرار دیا ہے۔ شاید چرار شریف اس سے بھی زیادہ غلیظ ہے۔ یہ درگاہ ایک تنگ دھڑنگ پہاڑی پر واقع ہے، جس تک رسائی کافی کٹھن اور دشوار ہے۔ یہاں پر پانی کی قلت بھی ہے۔ جس تالاب سے زائرین پانی پیتے ہیں اس کا رنگ وبو اس قدر ناگوار ہے کہ مجھے اس قدر بھیانک تالاب دیکھنے کو نہیں ملا ہے۔ جب پانی کی قلت محسوس ہونے لگی تو وادی کے تمام حصوں سے لوگ چرار شریف آجاتے ہیں۔ زلزلوں، ہیضہ اور خشک سالی جیسی قدرتی آفات کے دوران وہاں لوگ خاموشی سے بیٹھ جاتے ہیں اور اپنے گناہوں کا اعتراف کر کے معافی کے طلب گار ہوتے ہیں۔ اس پر وقار رسم کو نفل کہا جاتا ہے۔ اعتراف گناہ کا عظیم ترین مقام شہر اور آنچار ڈل کے درمیان واقع سر سبز گھاس کا میدان عیدگاہ ہے جہاں پر مسلمان عیدین پر جمع ہوتے ہیں۔ اہم زیارتوں میں کولگام کے سید

محمد حسین سمنانیؒ کی زیارت ہے جو لکڑی پر نقش ونگار کی کھدائی اور روغن شدہ جالیوں کے سبب کافی دیدہ زیب ہے۔ وادی لدر میں زین شاہ یا زین الدین کی درگاہیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ زین الدین شیخ نورانیؒ کا خلیفہ تھا جس کے پیروکار ایک خاص قسم کی ٹوپی پہنتے ہیں جس پر رنگوں کی الجھی ہوئی دھاریاں ہوتی ہیں۔ ایک مرتبہ اس زیارت گاہ پر ایک ملازم کو زین شاہ نے کسی کام سے بھیجا ہوا تھا جسے جبری مزدوری کی خاطر سرکاری اہلکاروں نے پکڑ لیا۔ زین شاہ نے غصے کے عالم میں لدر کو خشک کر دیا جس سے فصلوں کا بھاری نقصان ہوا۔ جب کشمیر کے سلطان نے یہ سنا تو وہ عیش مقام کی طرف گیا۔ اس قسم کی غلطیوں کے اعادے کے احتراز کی خاطر یہ تجویز پیش کی گئی کہ زین شاہ کے پیروکار خاص ٹوپی پہنا کریں۔ کشمیر کے کشتی ران اس درگاہ کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ یہاں پر آ کر ان کے بچوں کی اولین موتراشی کی رسم سرانجام دی جاتی ہے۔ اگر یہ رسم کہیں اور انجام دی جائے تو بچہ یا تو فوت ہو جاتا ہے یا وہ نابینا ہو کر رہ جاتا ہے اس درگاہ پر کشتی ران عقیدت کے ساتھ بھیڑ کا موٹا لیلا نذر چڑھاتے ہیں۔ کوروتی کے مقام پر شیخ نورالدینؒ کی والدہ صدر دید کی درگاہ ہے۔ یہاں پر شیخ نورالدین ولیؒ کے والد اور ان کے بیٹے کی پگڑی کے دیدار ہوتے ہیں۔ اس درگاہ کے نزدیک ہی مانچھ ناگ (شہد کا چشمہ) ہے۔ میٹھے پانی کے سبب اس چشمے کو یہ نام حاصل ہوا ہے۔ پانپور میں سعد بابا صاحب کی درگاہ کے قدیم کام کا ذکر بھی یہاں لازمی ہے۔ لولاب میں اندرہامہ کے مقام پر شاہ ولی کی خوبصورت زیارت ایسے قدیم درختوں کے درمیان واقع ہے جو نہایت تناور اور کافی عمر کے ہیں۔ شاہ ولی بخارا کا رہنے والا ایک دیوانہ شخص تھا اور دیوانہ ہونے کے سبب اس کے نہ تو کوئی مرید اور نہ ہی پیروکار تھے۔ چنانچہ اس نے شجرکاری کا کام شروع کیا۔ اس کو مردہ شے میں جان ڈال دینے کا کمال حاصل تھا اور اسے علم احیائے نو میں قطعی دقت محسوس نہ ہوتی۔ یہاں تک کہ اگر اندرہامہ میں شاہ ولی کے ہاں کوئی مردہ مچھلی بھی لائی جاتی تو وہ اسے دوبارہ زندہ کر دیتا۔

خواجہ حسین قاری کی درگاہ ایک دیدہ زیب زیارت ہے، جو شیوہ (زینہ گیر) کے نزدیک ایک تنگ نالے کلا ورو میں واقع ہے۔ اس درگاہ سے ہو کر ایک چشمہ مخدوم ناگ بہتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ عظیم ولی مخدومؒ نے ایک سخت چٹان سے پانی نکال کر بہایا تھا۔ خواجہ حسن قاری مخدوم صاحب

کا پیروکار تھا۔ درگاہِ تجر اس زیارت گاہ سے دُور نہیں ہے جو عظیم مخدومؒ کی جائے ولادت تھی۔ اپنے گاؤں میں اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی۔ رفقا ان کی تعلیمات کا مذاق اُڑاتے تھے اور وہ ان پر زور دیتے کہ وہ گاؤں کی کوروی۔؟ میں حصہ لیں۔ مخدوم صاحب حضرت سلطان سے مانوس ہو کر تجر سے چلے گئے اور اپنے لوگوں کو بددعا دی۔ انھیں نہ صرف اپنی فصلوں کی قلت محسوس ہوئی بلکہ پینے کے لیے پانی بھی حاصل نہ ہوا۔ یہ بددعا صحیح ثابت ہوئی کیونکہ تجر اور زینہ گیر آج تک خشک ہیں۔

ایک درگاہ کا راہب نہایت طاقتور ہوتا ہے۔ وہ اخراجات میں باقاعدگی لاتا ہے اور روزمرہ فریضوں کو سرانجام دیتا ہے۔ چند صورتوں میں اس کے جانشین کا انتخاب قرعہ اندازی کے ذریعے کیا جاتا ہے جبکہ دیگر اداروں میں راہب کا عہدہ پشتینی ہوتا ہے۔ ان درگاہوں کی مالیات نذرانوں اور چڑھاوے سے حاصل ہوتی ہیں۔ اکثر یہ نذر و نیاز اجناس کی صورت میں ہوتی ہیں اور تمام اخراجات کو پورا کرنے کے لیے کافی ہیں۔ ان درگاہوں کا راہب مسافروں کو کھانا فراہم کرتا ہے۔

بڑی درگاہوں پر نذر و نیاز کی تقسیم خدمت گاروں کے درمیان اسی صورت میں کر دی جاتی ہے جس میں وہ اپنے فرائض سرانجام دے رہے ہوں۔ چرارشریف جیسی درگاہوں کی آمدنی اچھی ہوتی ہے۔ حالیہ وقتوں تک ایک کاشتکار دھان کی فصل کا ایک حصہ اسی درگاہ پر نیاز کے لیے مخصوص رکھتا ہے اور ہر گاؤں میں اخروٹ کا ایک درخت کسی نہ کسی ولی کو وقف کر دیا جاتا ہے۔

عُرس

مختلف درگاہوں پر منعقد ہونے والے سالانہ عرس کشمیریوں کی بے کیف زندگی میں نہایت اہم دن ہوتے ہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ جمع ہوتے ہیں اور پورا دن کھانے پینے اور مختلف اشیا مثلاً کانگڑیوں، شیشے کی چوڑیوں، ہاروں اور رنگدار مٹی کے کھلونوں کی خرید میں صرف کر دیتے ہیں۔ موچی نہایت محنت کے ساتھ جوتوں کی مرمت کرتے ہیں۔ مٹھائیاں فروخت کرنے والے اچھا خاصا کاروبار کرتے ہیں اور درگاہوں میں خیرات کی بھرمار ہوتی ہے جہاں خادم اس خیرات کے لیے زبردست جھگڑا کرتے ہیں۔ اس درگاہ کے عقب میں ہجوم سے الگ تھلگ مردوں کی

دو قطاریں ہوتی ہیں جو اوپر نیچے اُچھل کر (3) اس ولی کی حمد وثنا میں نغمے اور گیت گاتے ہیں۔ ایک گنجان درمیان دو معمر مگر نہایت چابک دست فقیر ایک چھڑی پر کھڑے ہونے کا دشوار کارنامہ سرانجام دیتے ہیں۔ مزار کے بائیں جانب ہزاروں کی تعداد میں خواتین مٹھائیاں کھاتی اور بچوں کو دودھ پلاتی ہیں۔

آستانوں کا اثر

عوام کو اعتماد ہے کہ ان درگاہوں پر حاضری دینے سے ان کے من کی مرادیں پوری ہوں گی۔ بیمار افراد کو تندرستی حاصل ہوگی، عورتوں کو اولاد ہوگی اور جس شخص کا مقدمہ عدالت میں ہو وہ چرار شریف یا کسی اہم درگاہ پر حاضری دے تو مقدمے میں اس کی جیت ہوگی۔ ان درگاہوں پر کپڑے کے سفید ٹکڑے ان افراد کی طرف سے باندھے جاتے ہیں جو اولاد کے متمنی ہوتے ہیں اور جب تک بچہ پیدا نہ ہو جائے کپڑے کا یہ ٹکڑا بندھا رہتا ہے۔

ایک درگاہ کی طرزِ تعمیر ایک ہی منصوبے کے تحت ہوتی ہے۔ پگوڈے کے طرز کی چھت کی چوٹی پر ایک مٹی سے بنی فنائیل ہوتی ہے۔ اور چھت کے چاروں کونوں پر یونانی اساطیر ہوتا ہے جس کے ساتھ لکڑی کی جالریں منسلک ہوتی ہیں۔ لکڑی پر کھدائی اور جالیوں کے ساتھ ولی کے مقبرے کو ڈھانپا گیا ہوتا ہے۔ اور عموماً ان کا ڈیزائن نہایت خوبصورت ہوتا ہے۔ موجودہ فن کا بہترین نمونہ گلمرگ کے نزدیک بابا پیام الدین رشی کی درگاہ پر ملتا ہے جسے عام طور پر بابا رشی کہا تا جاتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ مسلم درگاہوں کا ڈیزائن ہندوؤں کے قدیم طرزِ تعمیر سے لیا گیا ہے مگر پگوڈوں کے ساتھ ان کی نمایاں یکسانیت اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ اس پر چینی اثرات ہیں جب کہ لداخ کے بودھ Chodtens کی یاد دلاتے ہیں۔

وادی میں مسجدوں کی تعمیر اس قدر اچھی نہیں جب کہ ملّا عام طور پر ادنیٰ شخص ہوتا ہے جس کی علمی قابلیت بھی برائے نام ہوتی ہے۔ لال تحصیل میں ملا لکھ پڑھ سکتا ہے۔ مسجد کو عام طور پر دیہی اسکول کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ جہاں بچوں کو قرآن پڑھایا جاتا ہے اور یہ واحد جگہ ہوتا ہے جہاں ایک اجنبی کو رات کے وقت کھانا اور رہائش میسر ہو سکتی ہے۔ مذہب کے نام پر ایک اجنبی کی جو خاطر تواضع کی جاتی ہے وہ ناقابل بیان ہے اور راہ رو کو جلدی سے چلتا کیا جاتا ہے۔ بہت

ساری مسجدوں میں بدشکل طرز کا ایک حمام ہوتا ہے جہاں موسم سرما کے دوران ہمیشہ حرارت اور گرم پانی حاصل ہوسکتا ہے۔ جھیل ڈل کے کنارے حضرت بل کے مقام پر راہ گیروں کی رہائش کا انتظام اور حمام کافی اچھے ہیں۔ یہ انتظام کشمیریوں کی کاوش کی بدولت نہیں بلکہ نواب ڈھاکہ کی خیرات کے سبب ممکن ہوسکا ہے۔

سرینگر کی عظیم جامع مسجد ایک عالیشان عمارت ہے جس کی چھت ایک سو بیس فٹ لمبی ہے جو دیودار (4) کے بھاری ستونوں پر ٹکی ہوئی ہے۔ وسیع چبوترہ موسم گرما کے دوران ایک خوشگوار حجرے کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں پر درختوں کا سایہ، سرسبز گھاس اور ایک نہر کے ذریعے دریائے سندھ سے پانی آتا ہے۔ جامع مسجد کی تواریخ کافی دلچسپی کی حامل ہے۔ سرسری معائنے سے معلوم ہوگا کہ اس عمارت نے بھاری تبدیلیاں دیکھی ہیں۔ اس مسجد کے دروازے پر درج اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی تعمیر عظیم سلطان زین العابدین نے عمل میں لائی۔ سلطان حسن شاہ نے اسے دوبارہ تعمیر کیا اور تکمیل ابراہیم اور احمد ماگرے نے سرانجام دی۔ 909 ہجری میں اس درگاہ کو نذر آتش کر کے دوبارہ تعمیر کیا گیا۔ 1232ھ میں محمد اعظم خان پٹھان نے اس کی دوبارہ مرمت کی۔ سکھ عہد میں اس مسجد کو 23 برسوں تک بند رکھا گیا اور کشمیر کے مسلم گورنر شیخ غلام محی الدین کے عہد تک اسے کھولا نہیں گیا۔

دیگر بیانات کے مطابق جس زمین پر یہ مسجد کھڑی ہے وہ بودھوں کے تقدیس (5) کی حامل رہی ہے۔ اور اب بھی لداخ کے لوگ جامع مسجد پر حاضری دیتے ہیں اور تیتز نگ تسوبک کا نگ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ مقام ہندوؤں کے لئے بھی مقدس ہے۔ روایت یہ ہے کہ مسلمانوں کی طرف سے ہندوؤں پر بھاری ظلم ڈھانے کے بعد مسلمانوں نے اس مقام پر ایک عمارت کھڑی کرنے کی سعی رائیگاں کی آخران لوگوں کے ایسے ہندوؤں کا سہارا لینا پڑا جو کشمیر میں باقی رہ گئے تھے۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اس مسجد کا موجودہ منصوبہ شہنشاہ جہانگیر کا تصور تھا۔ یہ ایک افسوس ناک امر ہے کہ کشمیری اس عمارت کی تجدید و مرمت کی خاطر متحد نہیں ہوسکتے۔ اس رپورٹ میں یہ بات اکثر واضح کی گئی ہے کہ اب تک عوامی مقاصد کے لیے اتحاد قائم کرنا ناممکنات میں شامل رہا ہے۔

مبلغ

جامع مسجد میں باقاعدہ مبلغ موجود ہیں ان میں سے زیادہ فصیح کشمیری زبان کے علاوہ کبھی کسی دوسری زبان میں یہ بات نہیں کرتے۔

شہر کے ممتاز ملّا اور بسا اوقات دیہاتی ملاؤں کا کافی اثر ورسوخ ہوتا ہے مگر قاعدے کے مطابق عام ملا کسی طاقت کا مالک نہیں ہوتا۔ چند دیہات میں مرغوں کو حلال کرنے کا فریضہ ملاؤں کے سپرد ہے کیونکہ کشمیری خون سے خوف زدہ ہو جاتا ہے۔

مذہبی مقامات، ریشیوں، باباؤں،

سیّدوں اور پیرزادوں کا تقابلی جائزہ:

مختلف درگاہوں اور مسجدوں کے تقابلی مطالعہ کی بابت عوامی آراء کو معلوم کرنے یا ریشیوں، باباؤں، سیّدوں اور پیرزادوں کے فرائض اور حیثیت کے بارے میں ان کے خیالات معلوم کرنے کا کام نہایت مشکل ہے۔ عام رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ روایت کے مطابق سیّدوں کا مقام بلند ترین ہے (6) اور جہاں تک باقی زمرات کا تعلق ہے اس کا دارومدار ان کی انفرادیت اور کردار پر ہے۔ پیرزادہ، سیّد اولیا مخدوم صاحب کے شجرہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ مخدوم صاحب پیرزادوں کے پیروکار کشمیر میں موجود ہیں۔ جب کہ اول الذکر کے پیروکار پنجاب میں ہوتے ہیں۔ پہلے پیرزادوں کے پاس زمین کی ملکیت ہوتی تھی۔ ان کے لیے اس زمین پر مقامی لوگ کاشت کیا کرتے تھے مگر اب دیہاتی لوگ اپنے روحانی پیشواؤں کے لیے کام کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ چنانچہ اب پیرزادوں کو یا تو اپنا اختیار جمانا ہوگا یا خود کو اپنے پیروکاروں کے رحم وکرم پر چھوڑ دینا ہوگا۔ وادی کے سیّدوں میں تین اہم نام دستگیرؒ، نقشبندؒ، امیر کبیر اور ولیٔ ہمدان ہیں مگر اس ملک میں ان کی شہرت پھیل گئی۔ پیر دستگیرؒ کے موئے مبارک بلا کسی سایہ دار ہوا میں لٹکے ہوئے ہیں۔ اب بھی اس قسم کے موئے مقدس کو خانیار کی زیارت میں دیکھا جا سکتا ہے۔ دستگیرؒ کے پیروکاروں کو قادری کہا جاتا ہے مگر تمام مسلمان خواہ وہ دستگیرؒ یا کسی دوسرے اولیا کے پیروکار ہوں انھیں ولیٔ خراسان سے بھاری عقیدت ہوتی ہے اور یہ نام انھیں کشتی رانوں نے دیا ہے کیونکہ جب وہ کشتی دریا میں اُتارتے ہیں تو وہ نعرے لگاتے ہیں۔ یا پیر دستگیرؒ۔

نقشبند

کشمیر میں نقشبند نے اپنا اثر ورسوخ اپنے ایک پر جوش پیروکار خواجہ معین الدین (7) کے ذریعے پھیلایا۔ اب اس کے چند پیروکار ہیں جنھیں نقشبندی پکارا جاتا ہے۔ ان کی درگاہ بھی خانیار میں واقع ہے۔

ولیٔ ہمدان

کشمیریوں کے مذہب پر جس شخصیت نے براہ راست اثر ڈالا وہ میر سید علی ہمدانیؒ تھے جو کہ کشمیر میں قطب الدین کے عہد میں آئے اور عملی طور پر وادی میں اسلام کی داغ بیل ڈالی۔ وہ امیر کبیر شاہ ہمدان سے علی ثانیؒ کے نام سے مشہور ہیں۔ ہندوؤں کا بیان ہے کہ انھوں نے ایک ہندو خاتون للہ ایشوری سے فیض حاصل کیا جو دیوی کی پیامبر ہے۔ مسلمان اس بات سے منحرف ہیں مگر وہ اس خاتون کو بھاری عقیدت کی نظروں سے دیکھتے ہیں اور اسے لل دید (8) کہتے ہیں۔ ہمدان واپسی پر سیّد ہمدانؒ کو زہر دے دیا گیا مگر ایک قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس کے کفن نے معجزاتی طور پر ختن اور فارس تک کا سفر کیا۔ اس کی مسجد شاہ ہمدان سرینگر میں واقع ہے اور کشمیر کے مقدس ترین مقامات میں سے ایک ہے اور یہ اس شخصیت کی شایان شان درگاہ ہے۔ جس نے اس ملک بھر میں بھاری اثر ڈالا ہے۔ اس کے پیروکاروں کو کبروی کے نام سے جانا جاتا ہے۔

عظیم شیخ درگاہیں

مخدوم صاحب کو ہمیشہ شیخ یعنی ایسے شخص سے موسوم کیا جاتا ہے جس نے ہندومت سے اپنا مذہب تبدیل کیا ہو۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا شجرۂ نسب نگر کوٹ کے ایک گھرانے سے وابستہ تھا۔ وہ بغداد کے شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کا پیروکار تھا مگر اس کی ولادت کشمیر میں ہوئی تھی۔ جلدی ہی اس کے پیروکاروں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ اس کے پیروکار سہروردی کے طور پر مشہور ہیں۔ اس کی درگاہ ہاری پربت پہاڑی پر واقع ہے مگر مخدوم صاحبؒ اور شیخ نورالدینؒ کو لازمی طور پر کشمیری تصور کیا جاتا ہے اور غیر ملکی سید اولیا کی نسبت ان کا زیادہ احترام کرتے ہیں حالانکہ یہ پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ کشمیر کے مسلمان دستگیرؒ صاحب کو بہت احترام کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ ایک تقابلی جائزے کے بعد مسلمانوں کے مذہبی مقامات کا سلسلہ یوں معلوم ہوتا ہے:۔

۱۔حضرت بل
۲۔مسجد شاہ ہمدانؒ
۳۔جامع مسجد
۴۔چرار شریف میں نورالدین کی درگاہ
۵۔زیارت مخدوم صاحب ہاری پربت

درگاہ حضرت بل جھیل ڈل کے کنارے پر نہایت خوبصورت پس منظر میں واقع ہے اور یہاں پر مارچ میں ایک بھاری میلے کا انعقاد ہوتا ہے جس میں شرکت کرنے کے لیے وادی کے تمام حصوں سے ہزاروں لوگ آتے ہیں۔ اپنے ہمراہ یہ لوگ مشہور اولیا کرام کے پرچم بھی لاتے ہیں۔ حضرت بل کا تقدس یہاں پر موجود موئے مقدس آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سبب ہے جسے سیّد عبداللہ نے 1111ھ میں مدینہ شریف سے لایا تھا۔ اس نے یہ موئے مقدس ایک تاجر نورالدین کو ایک لاکھ روپے کے عوض فروخت کیا۔ نورالدین نے اس موئے مقدس کی نمائش سرینگر میں کی۔ اس موقعہ پر عوام کا اس قدر بھاری جم غفیر تھا کہ بہت سارے لوگ کچل کر جاں بحق ہو گئے۔ اس موقعہ پر یہاں کے حکمران نے دانشمندانہ حکم جاری کیا کہ اس موئے مقدس کو کسی کھلے مقام پر رکھا جانا چاہیے۔ چار دیگر درگاہیں بھی اس امر کا بانگ دہل دعویٰ کرتی ہیں۔ ان کی ملکیت میں بھی حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا موئے مبارک ہے۔ یہ درگاہیں ہیں: کلاشپورہ، اندردارہ، صورہ اور ڈانگر پورہ اور چند لوگوں کا عقیدہ ہے، پیغمبر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا جو موئے مقدس وادی لدر کے قریب کھرم میں موجود ہے وہ حقیقی ہے۔ موئے مقدس کا دیدار مختلف درگاہوں میں سال میں چھ مرتبہ کرایا جاتا ہے مگر دیہاتی لوگ درگاہ شریف حضرت بل تک ہی جاتے ہیں۔

مسجد شاہ ہمدانؒ

مسجد شاہ ہمدانؒ کی تعمیر کا کام سلطان قطب الدین کے عہد میں شروع ہوا۔ یہ مسجد ایک ہندو مندر کی بنیاد پر تعمیر کی گئی۔ یہاں کا مجاور میر سیّد علیؒ کی فصاحت بیانی اور اپنی مذہبی غلطیوں کا قائل ہو چکا تھا۔ بعد ازاں میر محمد ہمدانؒ نے سلطان سکندر کی اعانت سے اس عمارت کی ہیئت اور جسامت کو بڑھایا اور مسجد شریف کی دیکھ بھال کے لیے تین دیہات کا مالیہ دے دیا گیا۔ حال ہی

میں اس مسجد کی مرمت کی گئی ہے۔ یہ مسجد شہر میں ایک نمایاں مقام کی حیثیت رکھتی ہے۔

توہم پرستی اور عقائد قضا و قبر

اولیا اور فرقوں کی گونا گونیت کی وجہ سے یہاں توہم پرستی اور قبر پرستی کا ماحول موجود ہے۔ اولیائے حضرات تمام قسم کی بیماریوں کا علاج کر سکتے ہیں اور ایک شخص کو ایک قسم کی راکھ کو اپنے جسم پر لگانا ہوتا ہے جو وادیٔ کوٹہ ہار میں ریشی پورہ کے مقام پر دستیاب ہے تا کہ وہ صحت یاب ہو سکے۔ ایک مقدس شخص کا جادو ترے کے مرض کا انسداد کرتا ہے جو نچلی وادی میں دھان کی بالیوں کا نقصان کرتا ہے۔ کشمیری خود کو زیرِ عذاب محسوس کرتے ہیں۔ چیرات تحصیل کے چار پتھری کے چھ دیہات سمیت چند گاؤں پر سختی کے ساتھ یہ ممانعت عائد ہے کہ وہ شیخ نور الدینؒ کی توہین نہ کریں۔ کیونکہ ان پر گیگھے اور کم عقلی کا عذاب ہے مگر یہ لوگ ایک عام لعنت کے شکار ہیں۔ اس لعنت کی وجہ سے وہ حکمرانوں کی سخت روی ہے جو وقتاً فوقتاً قحط سالی، زلزلوں اور ہیضے کے سبب ہونے والے نقصانات اور ان کے حالات، ان کی بے بسی اور لاچاری کی علامت ہیں۔ وہ انسان کی طرف سے نازل کردہ عارضی آفات اور کسی لعنت کی وجہ اور مشکلات میں تمیز کر سکتے ہیں۔ جب ہیضے کی وبا پھوٹتی ہے تو وہ خاموش رہتے ہیں مگر جب کوئی اہلکار انھیں دباتا ہے تو وہ اپنے خیالات کا اظہار بانگ دہل کرتے ہیں۔ ان کا دل پسند ذریعۂ اظہار یہ ہے کہ وہ اپنی بلند آواز کو لندن تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔

چند مقامات پر اٹھائے گئے ان خلیفوں کی تقدیس میں مجھے یقین ہے اور چند ایسے درخت ہیں جہاں پر جھوٹے گواہوں پر اندھا پن طاری ہو سکتا ہے۔ مجھے علاقہ کوٹہ میں واقع روز لو چشمے کی کرامات پر بھی یقین ہے جہاں ایسی عجیب علامات دیکھی گئی ہیں۔ جب اس چشمے میں غیبی طاقت آ جاتی ہے تو دو دنوں تک اس کا پانی اُبلتا ہے اور آخر یہ پانی غائب ہو جاتا ہے اور دلدلی پانی رہ جاتا ہے۔ اگر جنگ کے آثار ہوں تو اس کے سطح پر بندوقیں اور تلوار نمودار ہوتی ہیں۔ اگر قحط کے آثار ہوں تو ان پر الگ کرنے والی چکیاں اور دھان کو کوٹنے والے اوکھل واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ اور جب ہیضے قریب آ رہا ہوتا ہے تو قبروں اور بیلچوں کے نشان نمودار ہوتے ہیں۔ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ عوام میں خیموں اور جھونپڑوں کو دیکھ کر بھاری جوش پیدا ہو گیا۔ آنجہانی مہاراجہ رنبیر

سنگھ نے اس موقع پر اس مقصد کے لیے سڑک کے کناروں پر گھوڑ سوار تعینات کر دیے تاکہ وہ اس بات کی اطلاع دے سکیں کہ آیا واقعی یہ علامات نمودار ہوئی تھیں۔ جو لوگ عام موضوعات پر ذہانت کے مالک ہیں انہوں نے مجھے کرامات کی بابت بتایا۔ یہ بات دلچسپی کا موجب ہے کہ جن کشمیریوں کے ساتھ چھ برس تک میرا قریبی رابطہ رہا ہے اور جن کی قابلیت کی مجھے قدر ہے وہ بھی قدیم دنیا کے ان قصے کہانیوں میں یقین کرتے ہیں۔ تمام وادی میں توہم پرستی کی فراوانی ہے۔ شاید ہی ایسا کوئی پہاڑ، دریا یا چشمہ ہوگا جس کے ساتھ کوئی نہ کوئی عجیب و غریب قصہ وابستہ نہ ہو:

قدیم مذاہب کی منصفانہ انسانیت

اقتدار، حسن اور شان و ثروت

وادی، صنوبری پہاڑ یا جنگل

ست رو پتھریلے چشموں

یا شگافوں اور آبی گہرائیوں میں ان کا مسکن ہے۔

اُونچے پہاڑوں پر حسین عورتوں کی صورت میں آسیب ہیں جو گزرنے والے مسافر کو برفانی تودے سے کچلنے سے قبل میٹھے گیت گاتی ہیں۔ ان ظالم قاتلوں کو خوش کرنے کے لیے زوجیلا پر نذر و نیاز پیش کی جاتی ہے۔ ہر موکھ کی سطح پر دیوتاؤں کے سوا کسی کو بھی رسائی حاصل کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ یہ جادوئی حالت سانپوں کو بے ضرر کر کے رکھ دیتی ہے۔ اور جہاں تک میں تلاش کر سکا ہوں۔ وادی کے ان حصوں میں کوئی بھی زہریلا سانپ موجود نہیں جہاں سے ہر موکھ کو دیکھا جا سکتا ہے۔ دریاؤں کے ساتھ بھی کافی قصے کہانیاں وابستہ ہیں۔ پہاڑوں کے اندر بہت ساری ندیاں ہیں جن کی بابت سنا تو گیا مگر انہیں کبھی دیکھا نہیں۔ قدیم ولر تحصیل کے پنگلش علاقے کو کبھی دریائے لدر سے آنے والی ایک سرکش نہر کے ذریعے آبپاشی حاصل ہوئی تھی مگر اب یہ نہر خشک ہے کیونکہ اس علاقے کے لوگوں نے دریائی دیوتا کے نمائندے کو سالانہ خراج ادا کرنے کی پروا نہیں کی۔ یہ نہر اب بند ہو چکی ہے۔ اور جن برگزیدہ اشخاص کو سرنگ کا راز معلوم تھا وہ اب فوت ہو چکے ہیں۔ پنگلش اب اپنے خشک کھیتوں کی جانب مایوسی کی نظروں سے دیکھتا ہے جو چند برس پہلے تک دھان کی سرسبز بالیوں سے لہلہاتے تھے۔ پہاڑی راستوں پر اب آگ اُگلنے والے

اژدہے ہیں اور کوثر ناگ کے بارے میں عجیب وغریب قصے کہانیاں بیان کی جاتی ہیں جہاں بے خبر مسافر کو بدصورت آسیب پکڑ کر جھیل کی گہرائیوں میں غرق کر دیتے ہیں۔ وادی میں حوروں اور پریوں کے لیے ایک نہایت سازگار مسکن ہے اور ایسے گھروں کی کمی نہیں جہاں پر بھوت کا سایہ نہ ہو۔ تمام کشمیر میں ٹھنڈے پانی کے خوبصورت چشمے اس قدر فرواں ہیں۔ وہ قدیم دیوتا اور ناگوں کے مسکن ہیں۔ جب ناگ اس دنیا میں وارد ہوتا ہے تو وہ اپنا ٹھکانہ کسی پہاڑ کے اندرون میں چھوڑ دیتا ہے اور ایک پُر پیچ سانپ کی مانند بل کھاتے ہوئے یہ چشمے پر نمودار ہوتا ہے۔ بعض اوقات وہ نیک ارادے سے آتا ہے۔ اور بعض اوقات وہ شرارت کی غرض سے بھی وارد ہو جاتا ہے۔ اس پر بھی لوگوں میں اتفاق ہے کہ یہ اس قدر غضبناک ہوتا ہے کہ اسے راضی کرنا مشکل ہوتا ہے۔ دیہاتی قصے کہانیوں میں ناگ کی فطرت خطرناک شکل میں ملتی ہے۔ جب ناگ انسانی صورت اختیار کر لیتا ہے تو وہ اس پانی سے پہچانا جاتا ہے جو اس کے بالوں سے قطرہ قطرہ گرتا ہے۔ اگر کسی کو دیہاتیوں کے ساتھ کسی چشمے کے کنارے بیٹھنے کی فرصت ہو تو اسے دیہاتیوں سے بہت سارے دلچسپ قصے کہانیاں (9) سننے کو ملیں گی۔

واسکی ناگ

واسکی ناگ کا چشمہ بہت مشہور ہے جس کا پانی ہلکا اور شریں ہے۔ مئی کے اوائل میں جب تین دن تک زوردار ہوا چلتی ہے تو پانی ظاہر ہو جاتا ہے اور اکتوبر میں پانی خشک ہو کر موسم سرما کے دوران جموں کی جانب کے پہاڑ میں چلا جاتا ہے۔ اس بارے میں ایک واقع بیان کرتا ہوں۔ جموں سے ایک بزرگ نے پانی کی شکایت کی وہ واسکی ناگ کے پاس آیا اور اس نے سانپ کو پکڑ لیا جو اس چشمے کا مالک تھا۔ اس نے وہ سانپ زمین پر رکھ دیا۔ مگر جب وہ شکرانہ ادا کر رہا تھا تو اس نے اس کی پشت کو درخت پر لٹکا دیا۔ دو عورتیں وہاں پر اس خیال سے آئیں کہ اس سانپ سے ان کے بالوں کو لگانے کے لئے مکھن حاصل ہوگا۔ سانپ کی پشت کو نیچے رکھ دیا۔ سانپ وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ جب مقدس آدمی واپس آیا تو اُسے اپنے نقصان کے بارے میں معلوم ہوا۔ وہ وہاں کھڑا رو رہا تھا۔ اسی وقت وہاں شاہ بغداد نمودار ہو گئے۔ انھیں اس مقدس آدمی کی تکلیف کا شدت سے احساس ہوا۔ چنانچہ انھوں نے سانپ کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا اور طے ہوا کہ کشمیر کو دھان

کی فصلوں کے لیے اور جموں کو فصل بہار کے لیے پانی میسر ہوگا۔

ہر ایک غار کی ایک کہانی ہے۔ مذہبی عابدوں اور ان کی کرامات سے متعلق عجیب وغریب قصے کہانیاں بیان کی جاتی ہیں۔ان عابدوں میں سے عظیم ترین ولی شیخ نورالدین ولیؒ ایک قومی ولی کا مقام رکھتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس ولی نے ہندومت کو چھوڑ کر اسلام قبول کیا۔ یہ امر اس بات کو ظاہر کرتا ہے۔اس کی زندگی نہایت بے داغ تھی۔اس نے کسانوں کو سیدھے سادے درس دیئے جن میں ذات پاک کی حوصلہ افزائی، فضول خرچی اور جھگڑوں سے احتراز شامل ہے۔آج کل اس قسم کے لوگ موجود نہیں اور ان کی جگہ وادیٔ سندھ کے رسول شاہ نیم دیوانے اور پیش گوؤں نے لے لی ہے۔ دیہات کے لوگ اس سے خوفزدہ ہیں۔مہاراجہ رنبیر سنگھ اس کے ساتھ مشورہ کیا کرتا تھا۔ میں جب ایک بار اس سے ملاقی ہوا تو اس پر دیوانگی کا دورہ طاری تھا مگر اس نے مجھے ایک نیک صلاح دی کہ ''پڑھو اور سیکھو'' غالباً اس درس میں کسی قسم کا طنز شامل نہیں تھا۔ جب وہ با حواس ہوتا ہے تو وہ غیر فرقہ وارانہ کام انجام دیتا ہے اور اپنی جاگیروں میں اضافے کا کوئی موقع جانے نہیں دیتا۔ بنیادی طور پر رسول شاہ ایک جولاہا تھا۔ایسے بہت سارے دیگر فقیر بھی ہیں جو کشمیر میں اپنا نام کمانے لگے ہیں۔ان میں سے ایک باطل (واٹل) تھا۔اور دوسرا گڈریا۔یہ بات نہیں کہ تقدس کی شہرت حاصل کرنے کے لیے کسی کا تعلق سیّد گھرانے کے ساتھ ہو۔ وادی میں فقیروں کی فراوانی ہے اور جن دو تین لوگوں کا میں نے ذکر کیا ہے ان کے علاوہ دوسروں نے باغ لگائے ہیں۔اور وہ سادہ زندگی بسر کرتے ہیں۔

شریعت یا اسلامی قانون

کشمیری مسلمانوں کے مذہب سے متعلق تفصیلات کے بیان کو ختم کرنے سے قبل میں اسلامی قانون یا شرع کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔اس قانون کی تشریح کرنے والے قاضی ہوتے ہیں۔۔سرینگر میں چار قاضی موجود ہیں جو جائداد موروثی اور طلاق کے پیچیدہ معاملات کا فیصلہ کرتے ہیں۔ذاتی مفاد کے سبب یہ علم ان تک یا ان کے بیٹوں تک ہی محدود رہا ہے اور بیرونی دنیا کو امور شرع کو سیکھنے کی اجازت نہیں۔ دیہات میں مفتی کا کام ملا سر انجام دیتا ہے اور چھوٹے موٹے معاملات پر اپنا فیصلہ صادر کرتا ہے۔پس ایک ملا غلے کی قانونی حقداری صادر کرتا ہے۔اگر

وہ قدرے خواندہ ہوتو اراکین کنبہ کے درمیان تقسیم اراضی پر اپنا فیصلہ صادر کرے گا۔ شہری قاضیوں کی طرف سے کیے گئے فیصلوں کو میں نے اکثر پڑھا۔ میرے روبرو ایک معاملہ آیا جس میں سائل نے زمین کی ایک ملکیت کی سند پیش کی جو اُسے قاضی نے جاری کی۔ مدعا علیہ نے بھی اسی زمین کی صورت میں دوسرے کاغذات پیش کر دیے وہ بھی اُسی قاضی کے جاری کیے ہوئے تھے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ قاضی کسی شہادت کی سماعت نہیں کرتا۔ وہ محض سائل کے بیان کو سنتا ہے اور اس بات کو فرض کرتے ہوئے کہ یہ بیان درست ہے وہ اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے۔ یک طرفہ کارروائی کے لیے صرف قاضی کا مقولہ عام ہے۔ وہ ایک ڈاکٹر کی مانند ہے جو اپنے مریض کی تمام باتیں سننے کے بعد علاج تجویز کرتا ہے۔ میرا تاثر یہ ہے کہ قاضی اپنے فیصلوں میں مقامی حقائق کو صریحاً نظر انداز کرتے ہیں اور عوام کے حقیقی معاملات کے بارے میں ہر چیز سے احتراز کرتے ہیں۔

ہندو مذہب

وادیٔ کشمیر کے 52,576 ہندوؤں میں سے 28,695 سرینگر اور چھوٹے قصبوں میں رہتے ہیں۔ دیہی ہندوؤں کی تعداد 23,881 ہے اور یہ تمام وادی میں بکھرے پڑے ہیں۔ دیہات میں شاذ و نادر ہی کوئی ہندو ہے۔ مگر تمام دیہاتی ہندوؤں کا سرینگر کے ساتھ گہرا رابطہ ہے اور جہاں تک ان کے مذہب کا تعلق ہے وہ عام عبادت سرانجام دیتے ہیں۔ یہ عبادت شہر یا چھوٹے قصبوں میں واقع کسی مندر میں سرانجام ہوتی ہے۔ کھتری دکانداروں کو بُہری کہتے ہیں۔ ان کے سوائے تمام لوگ پنڈت یا تعلیم یافتہ برہمن ہیں۔

شیو

اگرچہ تمام لوگ تعلیم یافتہ نہیں تاہم سبھی لوگ برہمن ہیں اور کلیدی طور پر شیو کے پیروکار ہیں جو پہاڑوں کا مالکِ کُل ہے اور تمام پہاڑی لوگوں کا دیوتا ہے۔

کھیر بھوانی

کشمیری ہندوؤں کی دل پسند دیوی کھیر بھوانی ہے اور وادیٔ سندھ کے دہانے پر کھیر بھوانی کا چشمہ غالباً مقدس ترین مقام ہے۔ اس دیوی کے تیئں مقدس اور بھی کئی چشمے ہیں۔ اس دیوی کے

مسلک کولنکا سے ترویج حاصل ہوئی ہے۔ یہاں پر یہ توہم پرستی موجود ہے کہ ان چشموں کا پانی اپنا رنگ تبدیل کر لیتا ہے جب میں نے تولہ مولہ کے مقام پر کھیر بھوانی کا چشمہ دیکھا تو اس کا رنگ بنفشی مائل تھا۔ جب قحط سالی یا ہیضہ پھیلنے کے آثار ہوتے ہیں تو یہ رنگ سیاہ ہو جاتا ہے۔ دودھ کی دیوی کھیر بھوانی کی خاصیت یہ ہے کہ جن دنوں لوگ یہاں پر جاتے ہیں وہ گوشت خوری سے احتراز کرتے ہیں اور کھانڈ، دودھ، چاول اور پھول چڑھاتے ہیں۔ ہاری پربت پر واقع شاریکا دیوی اور کھریوہ میں جوالامکھی میں بھیڑ کے دل اور جگر چڑھاوے کے طور پر چھڑاوے جاتے ہیں۔ کشمیر میں شاید ہی ایسا کوئی دریا، چشمہ یا پہاڑ ہے جو کہ مقدس نہ ہو۔ اگر ہندوؤں کے عزیز اور مقدس مقامات کی فہرست (10) دینے کی میں کوشش کروں تو اس کے لیے کافی جگہ درکار ہوگی۔ عام لفظوں میں تولہ مولہ چشمے کے سوائے، جو نہایت ابتری کی حالت میں ایک دلدلی زمین میں واقع ہے، یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ مقدس مقامات کے انتخابات کے معاملے میں ہندوؤں کی نظر خوبصورت مناظر پر ہوتی ہے کیونکہ بہت سارے استھانوں اور تیرتھوں کے آس پاس نہایت خوبصورت علاقے ہیں۔

صاف وشفاف پانی کا وہ چشمہ جو سایہ دار درختوں سے ڈھکا ہوتا ہے، جس میں مقدس مچھلی ہوتی ہے۔ ایک چٹان کا ٹکڑا ہوتا ہے، پانی سے رواں دواں ندی نالہ ہوتا ہے یا الگ تھلگ جنگلی میدان میں واقع یہ سب ایسے پہلو ہیں جو مقدس مقامات کے ساتھ شامل ہوتے ہیں جہاں پر ہندو غسل کرکے پھولوں اور چاولوں کا چڑھاوا پیش کرتے ہیں۔ مندروں میں شولنگ کا عالمگیر نشان ہوتا ہے جس کے اردگرد پتھر کا مورچہ ہوتا ہے۔ جس کے آس پاس عقیدت مند کھڑے ہوتے ہیں۔ اس پر پانی اور پھولوں کا چھڑکاؤ کرتے ہیں اور جب پوجا کا وقت آتا ہے تو شنکھ بجا کر موسیقی پیدا کی جاتی ہے۔ مندر کے اندر مختلف مقامات اور آثار مقدس ہوتے ہیں اور مندر کے باہر قدیم مورتیوں کا ایک ایسا انبار سا ہوتا ہے۔ ان میں زیادہ مورتیوں پر سرخ رنگ کا روغن سیندور چڑھایا جاتا ہے۔ ان مندروں کی تعمیر میں ٹھوس عمارتی کام ہوتا ہے اور ان تک رسائی حاصل کرنے کے لیے سیڑھیاں چڑھنا پڑتی ہیں۔ ان کی چھت بلند اور نوکیلی ہوتی ہے اور سرینگر میں ان مندروں پر ٹین کی پلیٹیں جڑی ہوتی ہیں۔ جب سورج کی کرنیں ان کلسوں کو چھوتی ہیں تو یہ

کلس چاندی کی طرح چمکتے معلوم ہوتے ہیں اور دور سے ہی نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ آدمیوں کے ہجوم سے دور قدیم ہندو کشمیر کے اندر اپنی پروقار خاموشی کے لیے موجود ہیں۔ مارتنڈ کا سونا اُتار لیا گیا اور سکندر بت شکن نے اسے توڑ پھوڑ ڈالا۔ آج یہ مندر بلند سطح پر واقع ایک میدان میں کھڑا نہایت فخر کے ساتھ نیچے پھیلی ہوئی خوبصورت وادی پر نگاہ ڈال رہا ہے۔ وانگت کے مندر ایک تنگ نالے کے اندر واقع ہیں۔ اردگرد بلند قامت پہاڑوں نے ان پر اپنا سایہ ڈال رکھا ہے۔ پانچ کے مندر ایک پوشیدہ مقام پر ہیں جو کلیدی سڑک سے کافی دور افتادہ ہے۔ پاندرِتھن ایک کھڑی چٹانی پہاڑی کے نیچے واقع ہے اور گھنے درختوں کے جھنڈ نے اسے قریباً ڈھک لیا ہے۔ ان تمام مندروں میں قدیم تختِ سلیمان (11) پر واقع شنکر آچاریہ کا مندر ہے جہاں پر اب بھی پرستش ہوتی ہے۔ ہر پیر کے دن یہاں چڑھائی چڑھنے کے لیے عقیدت مند پہنچتے ہیں اور شیوراتری کے دن اس خوبصورت پہاڑی پر لوگ چونٹیوں کی مانند جمع ہوتے ہیں۔ اس پہاڑی سے جھیل ڈل اور بل کھاتے ہوئے دریائے جہلم کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ پہاڑی سرینگر کی محافظ دیویوں کے لیے ایک نیک مقام ہے اور کئی مرتبہ بودھوں کے لیے بھی مقدس رہا ہے۔ اس کا قدیمی نام ساندھی مان پربت ہے۔ عام لوگوں کا کہنا ہے کہ سکندر بت شکن نے اس مندر کو بخش دیا تھا مگر اس نے پہاڑی کا نام سندھی ماں سے تبدیل کر کے تختِ سلیمان کر دیا۔ بہت سارے دیہاتی زور دے کر یہ بات کہتے ہیں کہ کسی وقت بادشاہ سلیمان وادی میں رہا ہوگا اور اس پہاڑی کا نام اس کے ساتھ منسوب کیا گیا ہے۔ شہر کے اندر ہی ایک اور پہاڑی ہاری پربت کھڑی ہے۔ یہ پہاڑی بھی ہندوؤں کے لئے بہت مقدس ہے۔ اس پہاڑی کے نیچے دیوی نے آبی آسیب جل دیو کو دفن کر دیا تھا۔ اس پہاڑی کا پرانا نام پدم پیٹھ تھا مگر مسلمان اسے کوہِ ماران کہتے ہیں۔ یہاں پر اٹھارہ بازوؤں والی شاریکا دیوی کی پوجا ہوتی ہے۔

تیرتھ استھان

کشمیر تیرتھ استھانوں کی سرزمین ہے۔ ان میں مشہور ترین امرناتھ کی گپھا ہے جو وادیٔ لدر میں کافی دُور افتادہ مقام ہے اور جھیل گنگ بل ہرمکھ پربت کی برفانی چوٹیوں کے اندر کافی گہرائی میں واقع ہے۔ جھیل گنگ بل پر ہندو لوگ اپنے والدین کی موت کے بعد جاتے ہیں اور ان

استھیوں (جسدِ خاکی کی ہڈیوں) کو سپردِ آب کردیتے ہیں جو چِتا کی آگ میں جل نہیں پاتیں۔ یہاں تک رسائی کے لیے راستے کافی کٹھن اور دشوار گزار ہیں اور بعض اوقات کئی یاتریوں کے لیے جان لیوا ہوتے ہیں اور نازک عورتیں اور بچے کھلی ہوا لگنے سے مرجاتے ہیں۔ امرناتھ کی گپھا میں کشمیر اور ہندوستان کے تمام حصوں سے ہزاروں کی تعداد میں لوگ جمع ہوتے ہیں۔ تولہ مولہ کھیر بھوانی میں حاضری دے کر مفت سرکاری رسد سے مستفید ہونے کے بعد یاتریوں کی فوج سرینگر میں پہنچتی ہے اور متعین مسافتوں کو طے کرتی ہوئی امرناتھ کی جانب کوچ کر کے ساون پورنما (مکمل چاند اوائل اگست) کے دن پہنچتی ہے۔ مقررہ مقامات پر وہ پوجا کرتے ہیں اور وہ مقدس مچ بھون سے ہوکر گزرتے ہیں جو تولہ مولہ کی کھیر بھوانی کے بعد دوسرے درجے پر ہے۔ مچ بھون پر یاتریوں کی فوج کے ساتھ پنڈت بھی شامل ہوجاتے ہیں۔ اس سے آگے بٹہ کوٹ کا ملک گھرانہ اس یاترا کا چارج سنبھال لیتا ہے۔ ملک گھرانے کے لوگوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس پہاڑی راستے کو صاف رکھیں تاکہ چھڑی لے کر یاتری مسافت طے کرسکیں۔ اور اس بات کا بھی خیال رکھیں کہ کسی قسم کی جائداد کی چوری نہ ہو۔ اس کارواں کا سربراہ امرت سر کا سادھو لال گیر ہے۔ جب دن بھر کی مسافت طے ہوجاتی ہے تو سب سے آگے لال گیر سادھو خیمہ زن ہوتا ہے اور وہی گپھا میں سب سے پہلے داخل ہوتا ہے۔ اس گپھا میں چڑھاوے کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک حصہ لال گیر سادھو، دوسرا مچ بھون کے پنڈتوں اور تیسرا بٹہ کوٹ کے ملک گھرانے کو ملتا ہے۔ چونکہ ملک گھرانے کے لوگوں کو گپھا میں داخل ہونے کی اجازت نہیں لہٰذا انھیں اس چڑھاوے کا جائز حصہ نہیں مل پاتا۔ یہ قصہ مجھے ایک ملک نے بتایا کہ آنجہانی مہاراجہ رنبیر سنگھ ایک دیہاتی کا لباس اختیار کر کے سادھوؤں سے آگے نکل گیا اور جب یاتری وہاں پہنچے تو مہاراجہ پہلے ہی اس گپھا میں موجود تھا حالانکہ ملک گھرانے کے لوگ اس سے خوش ہوئے مگر ہندوؤں نے اسے روایت سے خطرناک انحراف قرار دیا۔ جب یاتری شیش ناگ جھیل میں اشنان کر لیتے ہیں تو اس کے بعد بھی مقدس گپھا تک پہنچنے کے لیے دو دن کی مسافت طے کرنی پڑتی ہے۔ اس کے بعد یاتری اپنے ننگے بدن کو ستنے کی چھال سے ڈھک کر بھگوان شیو کو درشن دینے کے لیے آواز دیتے ہیں۔ اگر بھگوان راضی ہے تو اس گپھا سے دو کبوتر اُڑ کر آجاتے ہیں۔ امرناتھ اور ہرمکھ دونوں

مقامات کی یاترا کشمیریوں کے لیے سکون وتقدیس کی باعث ہے۔ چند صورتوں میں یہ مسافتیں کٹھن اور دشوار گزار ہیں اور مجھے اس بات میں شک ہے کہ لوگ ان دونوں مقامات تک آسان راستوں کی تعمیر پسند کریں گے۔ اگر یہ مقامات دل فریب نظاروں کے حامل ہیں مگر ہیضے کے خدشات کے سبب یہ مسافتیں ہیبت ناک صورت اختیار کر جاتی ہیں۔ بہت سارے مسافر چونکہ لاغر اور بیمار ہوتے ہیں چنانچہ وہ آسانی سے وبا کے شکار ہو سکتے ہیں۔

قدرتی عمل کی پرستش

ہندومت کے اسرار پر عمل کرنا ایک مشکل کام ہے۔ اس کے باوجود کشمیر کی دیومالا میں پانی کے چشموں اور سانپوں کا جو اہم حصہ ہے اس پر توجہ دیے بغیر میں رہ نہیں سکتا۔ نہ ہی میں اس امر کو نظر انداز کر سکا ہوں کہ قدرتی کرشمات وکمالات کی نمائش میں ہندو پیش پیش رہتے ہیں۔ رنبیر سنگھ پورہ کے چشموں کے پانی کا خاص اوقات میں اُتار چڑھاؤ ایک وضاحت طلب عمل ہے۔ ڈونسو کے کنگ جین پہاڑی علاقے میں ستمبر ماہ تک تمام سال خشک رہتا ہے۔ اس کے بعد یہ آبشار کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اُتر مچھی پورہ کے سویاں مقام پر زیرِ زمین آگ نمودار ہوتی ہے اور لوگ اس زمین کی حرارت سے کھانا پکاتے ہیں۔ اس مقام پر بھی بھاری تعداد میں عقیدت مند آتے ہیں اور اس کا شمار کشمیر کے مقدس مقامات میں ہوتا ہے۔ کشمیری ہندو ہمیشہ محتاط رہتا ہے، ان قدرتی کرشمات وکمالات کو بھانپ لیتا ہے جس میں مختلف تبدیلیاں نمایاں ہوتی ہیں۔ کشمیر میں ولولہ انگیز کیفیتوں کے بارے میں یہ بات یاد رکھنا لازمی ہے کہ اسلام کی ترویج سے قبل ہندومت کافی مراحل طے کر چکا تھا۔ بودھ مت میں تفریق کے بعد ہندو بھی بکھر گئے اور شیو کی سختی سے پیروی کے بجائے وہ آگ، سانپ اور سورج (12) کے پجاری ہو گئے۔ انہی ہندوؤں نے مجھے بتایا کہ گذشتہ دس دنوں کے دوران ہندو مذہب میں بھاری خامیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ یہ ایک رواج ہے کہ برت یا فاقہ کے دنوں میں وہ صرف سنگھاڑہ ہی کھاتے ہیں۔ لوگوں کا شکوہ ہے کہ شیوراتری کے روز انھیں تخت سلیمان تک پہاڑی پر چڑھنا پڑتا ہے۔ میں بہت ساری ایسی مثالیں پیش کر سکتا ہوں کہ جہاں مذہبی رسومات میں ذاتی مصلحتیں کارفرما ہوتی ہیں۔ کشمیر کے برہمنوں کے بارے میں چند دلچسپ باتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب وہ ہندوستان

جاتے ہیں تو وہ ہندومت کے سختی سے پابند ہیں۔مگر اپنے ملک میں ہی وہ ایسی حرکتوں کے مرتکب ہوتے ہیں جن سے خود قدامت پسند ہندو بھی خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کے ہاتھ سے پانی پی لیتے ہیں۔ وہ ایک مسلمان کی کشتی پر تیار کردہ کھانا کھا لیتے ہیں۔ عام طور پر ہندو بچوں کو پالنے والی ماں ایک مسلمان ہوتی ہے۔ایک ہندو گھرانے میں پالنے والا بھائی طاقت حاصل کر لیتا ہے۔ مہاراجہ گلاب سنگھ نے اس رواج کو ختم کر دیا جس کے تحت مسلمان پانی لاتے تھے اور پنیر کھانے پر روک لگانے کی کوشش کی، مگران تمام باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ یہاں یہ بات یادر کھنے کے قابل ہے کہ کشمیر میں پانی ڈھونے والوں کی کوئی ذات نہیں ہے اور اس پر تعجب نہیں کہ ہندو گلاب سنگھ کی ہدایتوں پر عمل پیرا ہونے میں ناکام رہے۔اس بات کے لیے یہ جواز دیا جاتا ہے کہ کشمیر کے ہندو چند عمدہ ترین سبزیاں اس لیے کھانے سے احتراز کرتے ہیں جس کے لیے ان کا رنگ ذمہ دار ہے۔ ٹماٹر لال پرت والی کابلی سبزیاں، گاجر اور سبز پھلیاں کشمیریوں کے لیے قابل نفرت ہیں۔ پیاز اور لہسن سے دوسری وجوہ پر گریز کیا جاسکتا ہے۔ یہ بات اور بھی عجیب ہے کہ کشمیریوں کو گوشت خوروں کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ کشمیری ہندوؤں کے بارے میں ایک بات یہ ہے کہ وہ ہز ہائینس مہارانی کی رضا کے مطابق پوجا کرتے ہیں۔ یہ چلن نہ صرف شہری پنڈتوں بلکہ عام دیہاتی عوام میں بھی موجود ہے۔ان کے رواج سے یہ بات ظاہر ہے کہ وہ خداتعالیٰ کو مالکِ کل سمجھتے ہیں۔مگر اس معاملے میں اورنگ زیب نے انحراف کیا اور اس قماش کے لوگوں کی پرستش نہیں ہوتی کیونکہ اس نے ہندوؤں پر مظالم توڑے تھے۔

سکھ

کشمیر میں سکھوں کی تعداد نہایت کم ہے۔ پتا نہیں کہ ان لوگوں نے وادی میں اپنے پاؤں کس طرح جمائے۔ بہت سارے لوگوں کا بیان ہے کہ وہ کشمیر میں رنجیت سنگھ کے دست راست کی حیثیت سے وارد ہوئے مگر چند لوگوں کا بیان ہے پنجابی برہمنوں نے پہلے ہی کشمیر میں اپنے پاؤں جمالئے تھے اور جب کشمیر رنجیت سنگھ کے ہاتھوں سے چلا گیا تو انھوں نے سکھ مذہب قبول کرلیا۔ ترال کے سکھ زور دے کر کہتے ہیں وہ پٹھانوں کے عہد میں کشمیر میں وارد ہوئے (13) اور وہ کابل کے ایک بازار کا نام لیتے ہیں جو سکھ محلہ کے نام سے مشہور ہے۔اس طرح مذہب تبدیل

کرنے والے سکھوں اور پنڈتوں کو دچھن پور تحصیل سے جبراً لے جایا گیا۔ سورج پرکاش کی تواریخ میں یہ درج ہے کہ سکھ کشمیر میں اس وقت وارد ہوئے جب ہرگوبند ان کے گورو تھے۔ چنانچہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سکھ مذہب کشمیر میں جہانگیر کے عہد میں بھی موجود تھا۔ ان کا نقطۂ آغاز کچھ بھی ہو وہ ترقی پسند لوگ نہیں ہیں۔ ان کے مذہبی مقامات سے ظاہر ہوتا ہے کہ کشمیر کے سکھوں کے پاس نہ تو دولت ہے اور نہ ہی جوش و جذبہ ان میں موجود ہے۔ ہاری پربت کے نزدیک گورو ہرگوبند کی دھرم شالہ کھنڈرات کی صورت میں ہے۔ کشمیری سکھوں کا روحانی سربراہ بھائی اتبار سنگھ پونچھ کا باشندہ تھا۔ جس کی حال ہی میں وفات ہوئی ہے اور راجہ پونچھ نئے سربراہ کا تقرر کرے گا۔ ہر دوسرے برس روحانی سربراہ کشمیر آتا ہے اور سکھوں سے واجبات وصول کرتا ہے۔ میں نے بھائی اتبار سنگھ کو بھی کشمیر میں دیکھا اس سے کشمیر کے سکھوں کی عام شکل وصورت واضح ہو جاتی ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ وادی کا سکھ طبقہ کمزور اور نالاں ہے۔ سکھوں کا گزر بسر کاشتکاری یا ملازمت سے ہوتا ہے۔ ان میں بہت کم ایسی خوبیاں ہیں جن کے سبب پنجاب کے سکھوں کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا جا سکے وہ نہ بہادر ہیں اور نہ ہی سخت جان(14) ۔

●❀❀❀●

حوالہ جات

(1) مکہ معظمہ میں کعبہ دوسرے مذاہب کے لیے اس سے پہلے بھی مقدس تھا جب مسلمانوں نے اسے اپنایا۔

(2) ریشی اس مسلک کے بے حد ذی عزت لوگ ہیں۔ اگر چہ وہ رسم ورواج کے پابند نہیں ہوتے مگر وہ خدا پرست ہیں۔ وہ نہ تو کسی دوسرے فرقے کو گالیاں دیتے ہیں اور نہ ہی کسی سے کوئی تقاضا کرتے ہیں۔ وہ راستوں پر پھلوں کے درخت لگا دیتے ہیں تا کہ مسافر کو خوراک وغیرہ مل سکے۔ وہ گوشت کھانے سے احتراز کرتے ہیں اور کسی دوسری جنس کے ساتھ تعلقات قائم نہیں کرتے۔ کشمیر میں اس مسلک کے دو ہزار افراد موجود ہیں۔

(3) اس مذہبی ورزش کو دمبائی یاذ کر سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس سے وہی مقصد حاصل ہوتا ہے جو ایک درویش کے رقص سے حاصل ہو جاتا ہے۔ ذہن کو نقطے پر لا کر رقص کرنے والے اپنے آپ پر وجدانی کیفیت طاری کر دیتے ہیں۔

(4) یہ ستون کافی بلند ہیں۔ بعض لوگوں کا بیان ہے کہ انھیں دریائے جہلم پر زینہ کدل اور فتح کدل پلوں کے درمیان تاشوان کے جنگل سے کاٹ کے لایا گیا۔

(5) یہ مصنف شاہی رکاب کے پیچھے تیسری مرتبہ اس پر سکون علاقے میں گیا اور اس مذہب کے برگزیدہ افراد یعنی بودھوں سے ملا۔ (آئین اکبری)، غالباً یہ لوگ لداخی بودھ تھے۔

(6) کشمیر کے سیدوں کا باہر کے لوگ نہایت احترام کرتے ہیں۔ میں اس بات سے بے حد متاثر ہوا کہ ہندوستانی مہمانوں نے مجھے بہت سے خطوط لکھے کہ میں ایسے سیدوں کی امداد کروں جن کی

اپنے ملک میں کوئی طاقت یا رتبہ نہ ہو۔

(7) خواجہ خاوند محمود، خواجہ بہاؤالدین کا جانشین تھا۔ بخارا کا یہ عظیم شہنشاہ شاہ جہاں کے وقت میں دہلی آیا جہاں اس کا گرم جوشی کے ساتھ استقبال کیا گیا۔ اس کے بیٹے خواجہ معین الدین نے شہنشاہ کی بیٹی سے شادی کر لی۔ شاہجہاں نے اسے کشمیر روانہ کیا اور رہائش کے لئے یوسف شاہ کا باغ دیا۔ خانقاہ نقشبندیہ اسی باغ میں واقع ہے۔ اس کی حال ہی میں تعمیر نو کی گئی ہے جو لکڑی پر کھدائی کا ایک خوبصورت نمونہ ہے۔

(8) جب میر سید علی کشمیر آئے تو لل دید مادر زاد ننگی ہو کر دشت نوردی کرتی تھی۔ اس نے سبھی سے کہا تھا کہ کشمیر میں کوئی مرد نہیں ہے لہٰذا وہ شرم کرے تو کس سے؟ مگر جب اس نے میر سید علی کو دیکھا تو اسے مرد تسلیم کر لیا اور فوراً کپڑے پہن لیے۔

(9) اس قسم کے بہت سارے قصے کہانیاں آئین اکبری میں درج ہیں۔

(10) ہندو کشمیر کو ایک مقدس سرزمین تصور کرتے ہیں۔ یہاں پینتالیس مقامات مہادیو کے نام۔ چونسٹھ ویشنو۔ تین برہما اور بائیس درگاہ کے لیے وقف ہیں۔ سات سو مقامات پر سانپ کی شکلیں کھدی ہوئی ہیں جن کی ہندو لوگ پوجا کرتے ہیں۔ آئین اکبری

(11) قدیم مندروں کی تفصیل جاننے کے لئے چھٹا باب دیکھ لیں۔

(12) ایک طویل عرصے تک کشمیر میں ہندو طرز معاشرت قائم رہی ہے۔ ناگوں کی پوجا بھی ہندوؤں کے رسوم کا ایک حصہ ہے اور انھوں نے ناگوں کو بھی دیوتاؤں کی حیثیت دی ہے۔

(13) وائگن اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ سکھ کشمیر میں راجہ سکھ جیون کے عہد میں آئے جو شکار پور کا ہندو تھا۔ اسے 1775 میں کابل کے تیمور شاہ کے دور میں کشمیر کا گورنر مقرر کیا گیا لیکن وہ تخت کابل کو خراج ادا کرنے میں ناکام رہا اور اس نے آزاد ہونے کی کوشش کی مگر تیمور شاہ نے اسے پسپا کر کے اس کی دونوں آنکھیں پھوڑ ڈالیں۔

(14) مندرجہ بالا تحریر قلم بند کرنے کے بعد مجھے یہ کہنے میں خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ سکھوں نے اپنے مذہبی مقامات اور وقف خانوں کا مسئلہ دلچسپی سے ہاتھ میں لے کر ان کے تحفظ اور پائداری کے لیے خاطر خواہ رقومات بھی جمع کر لی ہیں۔

●❋❋❋●

بارھواں باب

نسلیں اور قبیلے

ہندو

یہ ایک تسلیم شدہ بات ہے کہ چودھویں صدی تک وادی کی کثیر آبادی ہندو تھی اور اس صدی کے وسط میں شاہ ہمدانؒ اور ان کے پیروکاروں کی کوششوں اور سلطان سکندر بت شکن کے زبردست تعصب کے سبب عوام کی بہت بڑی تعداد نے اسلام قبول کرلیا۔ روایت ہے کہ ہندوؤں کو اذیتیں دینے کا عمل اس قدر شدید تھا کہ وادی میں ہندوؤں کے صرف گیارہ کنبے رہ گئے۔ ان کے آباء واجداد ملہ ماسی کہلائے اور مفرور افراد اور دکن کے وہ ہندو جو بعدازاں کشمیر آئے ہوئے انھیں بنہ ماسی کا نام دیا گیا ہے۔ بہرحال چند مورخوں کا بیان ہے کہ ملہ ماسی ہندو وادی کے مسیحا کشف (کشیپ) کی اولاد تھے اور بنہ ماسی وہ غیر ملکی تھے جو دیگر ممالک سے وارد ہوئے۔ چند ایک کے سوائے کشمیر میں اب جو لوگ رہتے ہیں وہ سب برہمن ذات کے ہیں اور روایت سے اشارہ ملتا ہے کہ لیوائٹ (Levite) برہمن کافی طاقتور تھے اور ان کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی۔ وہ اس ملک اور یہاں کے حکمرانوں پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ جنگجو طبقے کے بارے میں اکثر اوقات ذکر ہوا ہے اور یہ بات قدرتی ہے کہ بہت سارے ہندو زراعت پیشہ ویسیہ طبقے کے جاٹ تھے۔ اس وقت کشمیر کے ہندوؤں میں جاٹوں کا کوئی نام نشان نہیں۔ مگر کشمیر میں اب بھی کھتری

موجود ہیں انھیں بُہری کہا جاتا ہے اور وہ تاجر پیشہ ہیں جو پنجاب کے کھتریوں کی برادری سے کٹے ہوئے ہیں۔ چند ایسے مسلمان قبیلے بھی ہیں جن کی ابتدا کھتری بزرگوں سے چلی آرہی ہے۔

برہمن

کشمیر کے برہمنوں کو عام طور پر پنڈت کہا جاتا ہے ان کی تعداد 60,316 ہے۔ ان میں سے 28,695 وادی اور قصبات میں رہتے ہیں۔ باقی دیہات میں بکھرے پڑے ہیں اور زیادہ تر وقت زراعت میں گزارتے ہیں۔ کشمیر کے پنڈت خود کو تین جماعتوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ نجومی جماعت (جیوتشی) پجاری طبقہ (گورو) اور کارکن طبقہ (کارکن)۔ پجاری طبقہ دوسری دو جماعتوں کے ساتھ ازدواجی رشتہ قائم نہیں کرتا کیونکہ وہ انھیں غیر مقدس اور انسانیت سے الگ تھلگ خیال کرتا ہے۔ یہ بات بھی ہے کہ تمام لوگ ان کے متوفی ہندوؤں کے ملبوس کو قبول کرنے کی روایت کو حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں مگر جوتشی اور کارکن پنڈت باہمی طور پر شادی بیاہ کر لیتے ہیں۔ جیوتش پنڈت شاستروں کا گہرا علم رکھتے ہیں اور ہندوؤں میں ان کی تبلیغ کرتے ہیں اور وہ اپنا ایک کلینڈر تیار کرتے ہیں جس میں آئندہ برس کے لیے پیش گوئیاں درج ہوتی ہیں۔ پجاری طبقہ مذہب کی رسومات سرانجام دیتا ہے۔ پنڈتوں کے وسیع تر طبقے کا تعلق کارکن جماعت سے ہوتا ہے جو عام طور پر اپنا گزر بسر سرکاری ملازمت سے چلاتے ہیں۔ سرکاری ملازمت حاصل کرنا اب محال ہو گیا ہے کیونکہ پنڈتوں کی تعداد اب بڑھ گئی ہے اور برہمنوں نے اپنا ذریعہ معاش دیگر پیشوں میں تلاش کر لیا ہے۔ چند دیگر افراد باورچی، نانبائی، حلوائی اور درزی کا کام کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ایک پنڈت موچی، کمہار، مکئی بھوننے والے، قلی مزدور، کشتی ران، گلکار، نجار یا پھل بیچنے کے سوائے ہر کام کر سکتا ہے۔ پنڈت اب اداکاری اور موسیقار کے پیشوں کو بھی اپنانے لگے ہیں۔ میرے ہاں ملازم ایک پنڈت پہلے ہز ہائنس مہاراجہ اودے پور کے ہاں ایک گھوڑسوار سپاہی تھا۔ 1894 میں دریا پر باندھ بنانے کے لیے بہت سارے پنڈت یومیہ مزدوروں کی حیثیت میں کام کر رہے تھے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا ہے۔ اس بات میں شک نہیں کہ یہ ذہین اور حاضر دماغ لوگ نئے پیشے اپنائیں گے مگر فی الحال کارکن پنڈت قلم کو اپنی قدرتی منزل سمجھتا ہے۔ حالانکہ بہت سارے لوگ زمین کو اپنا روزگار اور حصول معاش کا ذریعہ سمجھ رہے ہیں۔ دیہات کے پنڈت ہل کے پیچھے

چلنے اور کھاد ڈھونے میں اپنی توہین سمجھتے ہیں مگر ایک شہری پنڈت نے اپنے آپ کو ادبی ماحول سے الگ نہیں کیا ہے۔ وہ زراعت پیشہ برہمن کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے اگرچہ وہ اپنی بیوی دیہات سے لائے گا مگر کسی بھی پوزیشن کا آدمی یہ نہیں چاہے گا کہ اس کی بیٹی شادی کے بعد کسی گاؤں میں جا کر آباد ہو۔ دیگر ممالک کی مانند کشمیر میں بھی کسی شخص کا شعبہ ہی اس کی ساجی پوزیشن کا آئینہ دار ہوتا ہے اور عین ممکن ہے کہ مستقبل میں زراعت زیادہ سودمند پیشہ بن جائے۔ اور شہری زندگی سخت جان اور ادنیٰ ہو کر رہ جائے یا یہ صورتحال برعکس ہو کر رہ جائے اور گاؤں کا برہمن سرینگر کے پنڈت کو اپنی لڑکی دینے سے انکار کر دے۔ شہر کے پنڈتوں کا مستقبل ہر چند تشویش کا باعث ہے۔ پنجاب کے باشندوں کی مانند ان میں کاروباری جذبہ موجود نہیں ہے اور ہندوستان کے ساتھ مواصلات میں آسائش پیدا ہو جانے کے سبب تجارت کے بڑھتے ہوئے مواقع کو بھی وہ نظر انداز کر سکتا ہے۔ وہ نہایت قدامت پسند اور تنگ نظر شخص ہے۔ یہ لوگ اس بات کو قبول نہیں کر سکتے کہ وہ وقت اب گزر چکا ہے۔ جب ہر بالغ پنڈت کو مالیات کی وصولی میں دخل حاصل تھا۔ انھیں اپنے ملک کے ساتھ بھاری رغبت ہے۔ حالانکہ ہندوستان میں کشمیری پنڈتوں نے ممتاز پوزیشن حاصل کرلی ہے۔ مگر ایسے بے روزگار برہمنوں کی کثیر تعداد موجود ہے جو ہرگز پنجاب میں جا کر روزگار کی تلاش نہیں کریں گے اور یہ بات ممکن ہے کہ وادی میں ہی خستہ حال زندگی گزار دیں۔ شہر کا ہر پنڈت اپنے بچوں کی تعلیم کے معاملے میں ثابت قدم ہوتا ہے اور اس کے خیال میں سرینگر میں حکومت کی طرف سے مفت اسکولوں اور چرچ آف انگلینڈ مشن میں یہ تعلیم آسانی سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ میرے ہاں علم پیمائش میں تربیت یافتہ پانچ سو پنڈت ہیں اور جن لوگوں نے انھیں سکھایا ہے ان کا کہنا ہے کہ وہ پنجابیوں کی نسبت زیادہ تیز ذہن ہیں۔ اراضی ان کا کمزور نکتہ ہے۔ پنجاب میں محنت کش نسل کے لوگ ہیں۔ ان کے عمدہ نقوش چھوٹے ہاتھ پاؤں اور پروقار شکل صورت ہوتی ہے۔ ان کی عورتیں پنجابی عورتوں کی نسبت زیادہ خوبصورت ہوتی ہیں اور امتیازی طور پر حسین ہوتی ہیں۔ مسلمان عورتوں کی نسبت ان کی نشو و نما اور قرینہ سازی کی بہتر علامات ہوتی ہیں۔ لہٰذا ان کے بچے نہایت خوبصورت ہوتے ہیں۔

پنڈت متعدد گوتروں اور قبائل میں منقسم ہیں حالانکہ معمولات کے وضو اور پوجا پاٹھ کے

وقت وہ اپنے گوتر کا نام کئی مرتبہ دہراتا ہے۔ مگر ظاہری دنیا میں شاید ہی اس کا تذکرہ سنا جاتا ہے۔ اور پنڈتوں کو ان کی کرام یا خاندانی لقب سے جانا جاتا ہے۔ لیوائٹ برہمنوں میں اٹھارہ اور کشمیر کے دوسرے برہنوں میں ایک سوتین گوتر ہیں۔ ایک گوتر میں بہت سارے کرام ہوتے ہیں جن کی مثال مندرجہ ذیل ہے۔ ملماس گوتر میں ایک کا نام پال دیوداس گار گے ہے اور اس گوتر میں مندرجہ ذیل کرام یا قبائل تحتی قبیلوں کو اپنی آغوش میں لیا ہے۔ سوپوری پنڈت، مالا پوت، میراکسور، کول، بجو، کوکرو، بنگرو، بقایا، خشو، کچلو، مصری، کھر اور مام۔ گوتر کے اندر اندر واجی رشتے کی مخالفت ہے اور سوپوری پنڈت گھرانے کا پال دیوداسگار گے گوتر کی دوشیزاؤں کو اپنی بیوی نہیں بنا سکتا نہ ہی وہ اپنی ماں، نانی، اور پڑنانی کے گوتر میں شادی کر سکتا ہے۔ برہمن پنڈتوں میں ایک گوتر ہے کہ اس گوتر سے کول جیسے عظیم گھرانے اور قدرے کم مانوس گھرانے ناگری جن میں جلالی، واتل، نیکا، سلطان، اوگرا، امین، موجہ، بامزئی، دونت، طوطا، سبن، کسو، مانسلال، سنگاری، رفیح، بانو اور درابی گوتر پیدا ہوئے ہیں۔ یہ بعدازاں بتایا جائے گا کہ مسلمان قبیلوں میں کرام ہمیشہ عرف کا آثار ہے جو آبائی تحتی قبیلے کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ اس طرح سوپوری پنڈت اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ آباءواجداد سوپور سے آئے تھے۔ کوکرو کا معنی مرغا ہے، بقایا کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ کشمیر کی اس بھاری جمعیت سے تعلق رکھتے ہیں جو مالیہ اراضی کے بقایادار تھے۔ کھار کا معنی ہے کہ اس کے آباءواجداد لوہے کی تجارت سے وابستہ رہے ہیں۔ سلطان کا معنی یہ ہے کہ ان کے آباء کا مسلمان بادشاہوں کی صف اوّل کے ساتھ تعلق رہا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

ممتاز کرام میں مندرجہ ذیل نام قابل ذکر ہیں۔ ٹکو، رازدان، کاک، منشی، متھو، کاچرو، پنڈت، سپرو، بھان، زتشی، رینہ، ور، فوطیدار، مدن، ٹھسو، وانگنو، مجو، ہوکھو اور ڈلو۔ درخاندان کے لوگ غالباً زیادہ بارسوخ رہے ہیں۔ اگرچہ محاورے کے مطابق (1) ان کا اثر ورسوخ فائدہ مند نہیں رہا ہے۔ کشمیری پنڈت ہندوستانی پنڈتوں کے ساتھ شادی بیاہ نہیں کریں گے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ راجہ سہد یو کے عہد حکومت میں ایک مسلمان پنڈت کے بھیس میں کشمیری برہمنوں کے ساتھ مل جل گیا اور ان کے سنسکرت اشلوک سیکھ لیے۔ اس قسم کے دھوکہ دہی سے بچنے کے لیے انھوں نے فیصلہ کیا کہ غیرملکی برہمنوں کے ساتھ کسی قسم کے باہمی روابط قائم نہ کیے جائیں۔ دیہاتی عوام

پنڈتوں کو ہمیشہ بٹہ کہہ کر پکارتے ہیں۔

کھتری

وادی میں دوسرے ہندوؤں کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ سرینگر کے کھتری آپس میں شادی بیاہ کر لیتے ہیں۔ وہ تجارت اور دکانداری کا کاروبار کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ پچھلے دنوں میں ان میں سے چند لوگ پنڈتوں کی ذات میں داخل کر لیے گئے۔ اگرانھوں نے برہمنوں کے رسم ورواج اپنا لیے ہیں مگر برہمن ذات کے لوگ انھیں اپنا ہم پلہ نہیں سمجھتے۔ دوانحرافات کے سوائے بوہرہ عورتیں ناک میں چھلّے پہنتی ہیں اور کمر کے گرد کمر بند باندھنے سے گریز کرتی ہیں۔ دونوں جنس کے بوہروں کا شہر کے دوسرے برہمنوں سے امتیاز نہیں کیا جاسکتا ہے۔

سکھ برہمن

وادی کے سکھ درحقیقت پنجاب کے برہمن تھے اور ان کی بابت تفصیلات دیگر باب میں بیان کی گئی ہیں۔ کشمیر کے دوسرے برہمنوں سے ان کا امتیاز ان کے سر کے بالوں کے پہناوے سے ہوتا ہے۔ ان کے لباس میں زنانہ قسم کے چوغے کا فقدان ہوتا ہے جس سے ہمیشہ یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ وہ پنڈتوں کی نسبت کم نفیس اور کم تعلیم یافتہ ہیں۔ سکھ زیادہ تر ترال، پرگنہ کرہن اور حمال میں آباد ہیں۔ وہ خشک فصلوں کی خوش اسلوبی سے کاشت کرتے ہیں مگر چاول کی کاشت کے معاملے میں بھی وہ مسلمان سے پسماندہ ہیں۔ اپنے ذریعہ معاش کے خاطر انھیں زیادہ تر ملازمت کی تلاش رہتی ہے۔ گئے دنوں میں وہ نظامت رجمنٹ میں شامل کیے گئے تھے جس کو مالیہ کی وصولی کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ اس وقت وہ سرکاری محکموں میں چپراسیوں کی ملازمت حاصل کرتے ہیں مگر اس معاملے میں انھیں پنڈتوں کے اناڑی رقیبوں کی صورت میں مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ ان کی نظر قدرے کمزور ہے مگر وہ بدصورت نہیں ہیں۔ ان کی ہلکی بھوری آنکھیں ہوتی ہیں۔ وہ نہایت جاہل اور تکلیف دہ کرائے دار ہوتے ہیں۔ وہ مسلمان کشمیریوں کے ساتھ مسلسل جھگڑتے رہتے ہیں مگر آپس میں وہ اتنا زیادہ نہیں جھگڑتے۔

راجپوت

جس قبیلے کے ساتھ کشمیر کے حکمرانوں کا تعلق ہے وہ یہاں کے راجپوت ہیں۔ یہ لوگ زیادہ

تر وادی کے جنوب کے پہاڑ کے دامن میں دیوسر تحصیل میں آباد ہیں جہاں پر انھیں ایسی جاگیریں عطا کی گئی ہیں جن کا مالیہ اراضی معاف ہے۔ پہلے وہ سرکاری ملازمت کیا کرتے تھے مگر کافی عرصے سے وہ بیکار ہیں۔ اس بیکاری کا اثر ان کے کردار اور شکل وصورت پر بھی پڑا ہے۔ اگرچہ اب بھی وہ کشمیری مسلمانوں کی نسبت چاق وچوبند دکھائی دیتے ہیں مگر دیوسر کے میاں راجپوت اور اس کے دوسرے ڈوگرہ برادر میں بھاری فرق موجود ہے۔ اُمید کی جاتی ہے کہ حکومت اس نسل کے افراد کے لیے موافق روزگار کی تلاش کرے گی۔ اس بات میں شک ہے کہ وہ واقعی کشمیر کو پسند کرتے ہیں مگر وہ سردی کی شدت کو برداشت کرسکتے ہیں اور چند ایک نے تو کافی عمر پائی ہے۔ انھوں نے کشمیری طرزِ تعمیر کو اپنالیا ہے مگر گھر اور ڈیوڑھی کا عام لوگوں سے پردہ ہونا چاہیے۔ راجپوت اپنی خواتین کی خلوت کے معاملے میں زیادہ محتاط ہوتے ہیں۔

مسلمان

کشمیر میں آباد 8,83009 مسلمانوں میں سے 93,575 سرینگر میں آباد ہیں جبکہ باقی ماندہ لوگوں کو کشمیر کی دیہی آبادی میں شمار کیا جاتا ہے۔ چھوٹے قصبات کے مسلمان زیادہ زراعت پیشہ ہوتے ہیں۔ 1891 کی مردم شماری میں مسلمانوں کی زمرہ بندی نہیں کی گئی ہے مگر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مسلمانوں کی بھاری تعداد شیخ کے زمرے میں آتی ہے اور وہ حقیقت میں ہندوؤں کی اولاد ہیں۔ اگرچہ سیّدوں کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے مگر ان کے ساتھ مغلوں اور پٹھانوں کو ملا کر بھی شیخ مسلمانوں کی نسبت بھاری اقلیت میں ہے۔

شیخ

ہوسکتا ہے کہ شیخ مسلمانوں نے تبدیلیٔ مذہب کے بعد شادی سے متعلقہ اور گوتر کے باہر خارجی رسم ورواج قائم رکھے ہوں مگر ان رواجوں کا اب کوئی نام ونشان یہاں موجود نہیں اور مختلف قبیلوں کے نام اور کرام کے سوا کچھ بھی باقی نہیں۔ تانترے کرام کے مسلمان کو تانترے لڑکی یا گاؤں کی کسی اور دوشیزہ کیساتھ شادی کرنے پر اب کوئی پابندی نہیں۔ اس معاملے میں صرف ایک ہی لکیر کھینچی گئی ہے کہ ایک طرف سیّد خاندان میں شادی نہ کی جائے اور دوسری طرف بازاری باغبانوں اور ادنیٰ ذات کے لوگوں کے ساتھ شادی کی ممانعت ہے۔ کرام اور ناموں کی ابتدا اتلاش

کرنا ایک دلچسپ امر ہوگا اگر چہ آپس کے ازدواجی رشتوں سے یہ کرام کسی انفرادیت کے قائل نہیں رہے۔ اگر اس بات کی تحقیق کی جائے کہ مختلف کرام کھتریوں یا برہمنوں سے نکلے تھے۔ مسلمان یہ بات فرض کرتے ہیں کہ پنڈت، کول، بٹ، ایتو (2)، ریشی، منتو، اور گنائی کرام برہمنوں کی اولاد ہیں جنھیں چودھویں صدی کے دوران جبری طور پر مذہب تبدیل کرنا پڑا اور میں نے ان کراموں کے لوگوں کے نقوش کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جس میں برہمنوں کے ساتھ وابستہ خدوخال موجود ہیں۔ مگر مجھے پتہ چلا کہ پنڈت کرام کا ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے عین مطابق ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے کرام کی ابتدا کھتری ہے۔ تاریخ ان کا تذکرہ اُن ہندو ناموں سے کرتی ہے جو فوجی اور جنگجو تھے۔ ان میں ماگرے، تانترے، ڈار، ڈانگر، رینہ، راٹھور، ٹھاکر اور نائک کرام شامل ہیں۔ صرف ایک کرام (3) لون کی ابتداویش بیان کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ ڈانگر شودروں کی اولاد تھے جو چار ہندو ذاتوں میں ادنیٰ ترین ہے۔

کشمیر میں کرام کے تمام تر موضوع زیرِ بحث لانے میں بھاری مشکلات درپیش ہیں اور مشکل اس وقت بڑھ جاتی ہے جب حقیر پیشوں کے لوگوں نے اعلیٰ دکھائی دینے والے نام اپنانے کی گستاخی کی ہے۔ کئی برس گزر جانے کے بعد کشمیر کے ڈوموں نے گنائی کرام اپنا لیا ہے جس پر حقیقی گنائی بے حد نالاں ہیں۔ حالات کو اور بھی بدترین بنانے کے لیے قصابوں اور باغبانوں نے بھی گنائی کرام اپنا لیا ہے۔ کشمیر کے کشتی رانوں نے ڈار کے کرام پر قبضہ جمالیا ہے تاکہ انھیں عزت اور وقار حاصل ہو سکے اور دوسرے کرام کے لوگ اب گنائیوں کو یہ کہہ کر چڑا رہے ہیں کہ گنائی اور ڈار پہلے ڈوم اور کشتی ران تھے۔ بہر حال چند کرام ادنیٰ پیشوں کے لوگوں کے لیے ہی مخصوص ہیں اور بیان کیا جاتا ہے کہ صوفی کرام کی ابتدا برہمنوں میں سے ہے اور عام طور پر یہ لوگ باغبانوں، نانبائیوں کے ملازم ہوتے ہیں۔ ایک اور کرام پال ہے۔ وادی کے حجام اس قدر اونچی نظریں نہیں رکھتے جس قدر قصاب اور کشتی ران رکھتے ہیں بلکہ حجاموں نے اپنا کرام ٹھاکر اپنانے پر ہی اکتفا کیا ہے مگر عبداللہ ڈوم اگر چاہے تو اُسے عبداللہ پنڈت کہلوانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ پہلے پہل تو لوگ مذاق اُڑائیں گے مگر کچھ عرصے کے بعد عبداللہ پنڈت خوشحال ہو جائے گا اور اس کی اولاد ایک لمبا شجرۂ نسب پیش کر دے گی جس کے مطابق اس خاندان کی پشت پر ایک معمولی

مہاراجہ ہوگا جس کی جاگیر تین دیہات پر مشتمل ہوگی اور وہ ایک کھنڈر قلعے کا مالک ہوگا جس پر اب بھی عبداللہ پنڈت کا گاؤں واقع ہے۔ گاؤں کے سرکردہ لوگوں کے شجرے کی بابت سوالات پر چند صبوتورں میں مجھے معلوم ہوا کہ ایک صورت میں ایک کرام اس قدر پیچھے چلا گیا کہ آخر راجہ سے ان کا سامنا ہوا مگر راجہ کی اولاد نے اپنی دولت اور اثر ورسوخ سے مجھے الجھن میں ڈال دیا کیونکہ اس کی چمڑی نہایت سیاہی مائل تھی اور اس کے کچھ دیر بعد میں نے تمام تر شجرۂ نسب کو فرضی پایا اور شاہی اولاد سے متعلقہ یہ فرد ایک ڈوم تھا جس نے حکام کے دلوں میں گھر کر لیا تھا اور سیاہ جلد والے زراعت پیشہ کے روپ میں اپنی حیثیت قائم کر لی تھی۔ کشمیر کا سماجی نظام خوش فہمی کی حد تک لچکدار ہے۔ میں نے کشتی رانوں کی ایک یا دو مثالیں ایسی بھی دیکھی ہیں جہاں انھوں نے حال ہی میں اپنی کشتیوں کو ترک کر کے زراعت پیشہ اپنا لیا تھا۔ اب یہ لوگ زراعت پیشہ افراد کے ہم پلہ ہیں اور ان کے ساتھ شادی بیاہ کر سکتے ہیں۔ اسی طرح میں ایک زراعت پیشہ شخص کی بابت جانتا ہوں جس نے خود ہی اس قسم کی بازاری باغبانی کا پیشہ اپنا کر اپنی حیثیت کو پست کر لیا جہاں فضلے اور گوبر کی مخلوط کھاد (4) کا استعمال لازمی ہے۔ ایسے شخص کو شادی بیاہ کا رشتہ بازاری باغبانوں کے ساتھ ہی کرنا پڑتا ہے اور وہ مسلمانوں کے زراعت پیشہ ایک مرتبہ پھر نئے کرام اُبھر رہے ہیں۔ میں نے زینہ گیر میں دیکھا کہ بھاری مقدار میں لوگ اپنے کرام سے کافی خوش ہیں۔ ان کے ایک بزرگ نے ایک یہودی کا چنگ بجانے پر عمل کیا اور پٹھان جابر آزاد خان نے اپنے پرانے وفادار ملازم کے کان اس لیے کترا دیے کیونکہ وہ نہایت سست تھا۔ اس نے اس کو وطن بدر کر کے لولاب بھیج دیا۔ اس کی کئی اولادیں ہیں اور ان کا کرام کن ژٹو ہے۔ لولاب کے علاقے میں ایک جواں سال کرام ڈوگرہ اُبھر رہی ہے ان کی دو پشتیں ملک کے ڈوگرہ حکمرانوں کی ملازمت میں ہیں۔

شیخوں میں چند مندرجہ ذیل ایسی بھی ذاتیں قابل ذکر ہیں جن کا تعلق کم وبیش اسلام کے ساتھ ہے۔ اسلام قبول کرنے والے کٹر افراد کی اولاد پیرزادہ ہیں جو اپنے آپ کو سیدوں کے ہم پلہ سمجھتے ہیں اور ان کے ساتھ شادی بیاہ کرتے ہیں۔ بابا بھی ان پرجوش لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے اپنا مذہب تبدیل کر کے اسلام قبول کیا ہے اور اب زیادہ تر بھکاری ہیں۔ رشی اُن زیارتوں کے

خدمت گار ہیں جنھیں کشمیر کے قدیم زاہدوں نے قائم کیا۔ رشی لفظ سنسکرت کے رکھی سے بنا ہے۔
کشمیر کی ملاّ گری شیخ پر مشتمل ہے جو دو زمروں میں منقسم ہے۔ پہلے زمرے میں وہ ملاّ شامل ہیں جنھوں نے قانون کی تعلیم حاصل کی ہے اور ان کی شناخت مولوی، قاضی، آخون یا مفتی کے طور پر کی جاتی ہے۔ وہ مسجدوں میں نماز کی امامت کرتے ہیں۔ بچوں کو قرآن پڑھاتے ہیں اور دین پرست لوگوں کی نذر و نیاز پر اپنا گزر بسر کرتے ہیں۔ دوسرے زمرے کے ملاّ وہ لوگ ہیں جو اپنی حیثیت کھو چکے ہیں اور انھیں ہل کہا جاتا ہے۔ وہ متوفیوں کے بدن کو غسل دے کر انہے تجہیز و تکفین کے لیے تیار کرتے ہیں اور قبریں کھودتے ہیں۔ یہ ملاؤں یا دیہاتیوں کے ساتھ شادی بیاہ نہیں کرتے۔ بہت سارے ڈوموں اور بانجیوں نے فال کرام اپنالیا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ لفظ فل کشتی ران کے لیے پنجابی اصطلاح فلاح کی مسخ شدہ صورت ہے۔

تسک اور چک قبیلے کی ابتدا کے بارے میں قدرے شبہات موجود ہیں جنھوں نے سولھویں صدی کے دوران تواریخ کشمیر میں ایک اہم رول ادا کیا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ کشمیر کے ہندوؤں کے نہیں بلکہ چیلاس کے درد مسلمانوں کی اولاد تھے۔ وادی میں بہت سارے خاندانوں کا کرام تسک ہے مگر دیگر مسلمانوں سے وہ کسی طور پر بھی الگ نہیں ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ بارہ مولہ میں آباد ککر و گھرانے گکھر و قبیلے کی اولاد ہیں مگر تسک قبیلے کی طرح کشمیر کے ابتدائی ہندوؤں کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ دیہات کے مسلمان تاجروں کا تعلق وانی کرام سے ہے اور بیان کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ ہندو کھتریوں کی اولاد تھے۔ پرے، پرار وار اور کاہے کرام کی ابتدا کی بابت کچھ معلوم نہیں ہو سکتا۔ قدیم تواریخوں میں ان کا کوئی ذکر نہیں ملتا یہاں تک کہ اس قسم کے کرام ناموں کو آسانی سے گھڑا جاتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ ان ناموں کی ترویج یہاں کے باشندوں کی طرف سے مذہب تبدیل کر کے اسلام قبول کرنے کے بعد کی گئی ہو۔

سیّد

سیّدوں کو ان زمروں میں تقسیم کیا جاتا ہے جنھوں نے پیری مریدی کا پیشہ اختیار کیا ہے۔ اور وہ جنھوں نے زراعت پیشہ اختیار کیا ہے۔ اگر شیخ مسلمانوں کے ساتھ ان کا موازنہ کیا جائے تو انھیں غیر ملکی تصور کیا جائے گا حالانکہ ان کی شکل و صورت طور طریقوں اور زبان میں عملی طور پر کوئی

ایسی بات نہیں ہے۔ جو انھیں دیگر کشمیری مسلمانوں سے الگ کرتی ہے۔ چند سیّد گھرانوں کی وادی میں بھاری قدر و منزلت ہے جب کہ زراعت پیشہ اختیار کرنے والے افراد کو دوسرے دیہاتوں کے ہم پلہ تصور کیا جاتا ہے اور ان کے ساتھ شادی بیاہ کیا جاتا ہے۔ کوئی بھی دیہاتی اس گھرانے کے ساتھ شادی بیاہ کرنے کی بابت نہیں سوچے گا جس نے پیر کا پیشہ اختیار کیا ہو کیونکہ اس بات کا خدشہ ہے کہ اس سے بدبختی نازل ہو جائے گی۔

میر کرام

میر سیّدوں کے کرام کا نام ہے حالانکہ وہ اپنی قلندری قائم رکھتا ہے تاہم میر اس کے نام سے پہلے لگایا جاتا ہے مگر جب وہ دنیاداری اپنا لیتا ہے تو میر اس کے نام کے ساتھ منسلک کیا جاتا ہے۔

سیّد مکار برادری اُن فقیروں پر مشتمل ہے جو سیّد ہونے کا ڈھونگ رچاتے ہیں اور کشمیر و ہندوستان میں صحرانوردی کر کے عوام الناس کو دھوکہ اور فریب دیتے ہیں مگر ان میں سے بہت سارے افراد نے اب تجارت کا کاروبار شروع کر دیا ہے اور آپس میں شادی بیاہ بھی کر لیتے ہیں۔

مغل

مغلوں کی جمعیت کشمیر میں زیادہ تعداد میں نہیں ہے اور نہ ہی انھوں نے کشمیر کے مسلمانوں کے ساتھ شادی بیاہ کے رشتے قائم کیے ہیں اور ان کے شجرے کے تمام نشانات کھو چکے ہیں۔ وہ کشمیر میں ابتدائی مسلمان سلاطین کے ساتھ اور مغل عہد میں وارد ہوئے۔ ان کراموں میں (مرزا اصطلاح کا مسخ) بیگ، بندی، بانڈے اور عشائی ہیں۔

پٹھان

پٹھانوں کی تعداد مغلوں کی نسبت زیادہ ہے اور زیادہ تر اُتر مچھی پورہ تحصیل میں آباد ہیں جہاں وقتاً فوقتاً پٹھانوں کی بستیاں قائم کی گئی ہیں۔ ان میں سب سے دلچسپ بستی درنگہ ہامہ کی لکی کھیل بستی کے آفریدی ہیں، جنھوں نے قدیم پٹھان روایات کو اب بھی قائم رکھا ہے اور پشتو زبان میں بات چیت کرتے ہیں۔ ان کا رنگارنگ لباس ہوتا ہے اور اپنے ساتھ تلوار اور ڈھال لے کر چلتے ہیں۔ انھیں اپنی شجاعت پر ناز ہے اور ایک زبردست دشمن کی غیر حاضری میں وہ اپنا برچھا اور تلوار پاؤں کے ساتھ زمین میں گاڑ دیتے ہیں اور اپنے پست قد ٹٹوؤں سے برچھے چلاتے

ہیں۔ پٹھانوں کی دوسری بستی مچھی پوریوں کی ہے۔ کشمیری عورتوں کے ساتھ شادی کے سبب پٹھانوں نے بہت سارے اوصاف کو کھو دیے ہیں۔ معمر لوگ ابھی پشتو بولتے ہیں اور نوجوان لوگوں کی کشمیریوں کے ساتھ مطابقت ہے اور وہ ان ہی کی زبان میں بات چیت کرتے ہیں۔ مچھی پوری پٹھانوں کا تعلق یوسف زئی طبقے کے ساتھ ہے اور انھیں معروف خانی پٹھان کہتے ہیں۔ مچھی پورہ کا نام غلط العام ہے کیونکہ یہ لوگ حمال میں رہتے ہیں جو مچھی پورہ کے قریبی نواح میں واقع ہے۔ جیسا کہ انھیں آفریدی یا خیبری کہا جاتا ہے، یہ لوگ گلگت سڑک کی تعمیر کے لیے پینتیس جبکہ مچھی پوری پچیس افراد فراہم کرتے ہیں۔ اجرت کی ادائیگی کے طور پر ان کے پاس چند دیہات ہیں جن کا مالیہ اراضی معاف ہے۔ بیشتر پٹھان کشمیر میں دُرانی عہد حکومت کے دوران وارد ہوئے مگر بہت سارے ایسے افراد کو مہاراجہ گلاب سنگھ نے ترویج دی اور انھیں سرحدوں پر خدمات کے لیے بہت ساری جاگیریں عطا کی گئیں۔ بیرو کے علاقے میں بہت سارے دیہات پر سواتیوں اور بونیر والوں کا قبضہ ہے جو گوکھاریاں کا تعلق بہت سارے کھنگ گھرانوں کے ساتھ ہے۔ پٹھانوں کو ہمیشہ خان کا لقب دیا گیا ہے اور یہ لوگ کشمیر کے نسوار فروش ہیں اور پشاور کے ساتھ تجارت کرتے ہیں۔ خان اب ایک کرام کا نام ہے۔

بومبا

اس دلچسپ قبیلے کے لوگوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے اور زیادہ تر مچھی پورہ تحصیل میں آباد ہیں جہاں پر ان کی ایسی اراضیات موجود ہیں جن پر مالیہ اراضی معاف ہے۔ بنیادی طور پر یہ ایک جنگجو طبقہ ہے مگر اب یہ لوگ کمزور ہو کے رہ گئے ہیں اور نہایت خستہ حالی کے شکار ہیں۔ وہ غریب اور جھگڑالو ہیں اور انھیں وہ بے کار لوگ لوٹتے رہتے ہیں جنھیں ہندوستانی بازاروں سے بھرتی کیا گیا ہے۔ بومباؤں کا بیان ہے کہ یہ لوگ ترکستان سے آئے۔ وہ آپس میں شادی بیاہ کر سکتے ہیں اور بارہ مولہ کے نیچے واقع علاقے میں بتہ مال اور کھاکھا گھرانوں سے اپنی بیویاں لاتے ہیں۔ وہ شادی میں اپنی بیٹیاں سیّدوں کو دیتے ہیں۔ کشمیر کے بومباؤں کا قدیم مسکن بٹہ کوٹ ہے اور جب یہ مرتے ہیں تو ان کو بٹہ کوٹ کی خوبصورت وادی کے قبرستان میں لایا جاتا ہے۔ انھیں اب بھی بٹہ کوٹ میں رکھا گیا ہے۔ بومبا گھرانوں کے سربراہ کو راجہ کہا جاتا ہے اور جس علاقے میں وہ رہتے

ہیں وہ راجواڑہ کہلاتا ہے۔

فقیر

چند دیہات میں فقیر یا پیشہ ور گداگر آباد ہیں۔ موسم گرما کے دوران وہ کاشتکاری کرتے ہیں اور موسم سرما کے دوران گداگری کرتے ہیں۔ وہ اس پیشے کو نہایت ذی عزت خیال کرتے ہیں اور کہتے ہیں اگر انھوں نے آبائی روش چھوڑ دی تو ان پر بھاری الزام آئے گا۔ وہ آواز دینے میں اس قدر کرخت نہیں ہیں۔ وہ گداگر گھرانوں میں باہمی طور پر ازدواجی رشتے قائم کرتے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں ان بھوکے بدمعاشوں سے انھیں الگ سمجھا جانا چاہیے جو ہر موسم گرما کے دوران وادی میں وارد ہوتے ہیں۔ یہ غیر ملکی گداگر چور ملک کے لیے ایک لعنت ہوتے ہیں۔

شہر میں کرام خاص طرح سے رکھے ہوئے نام ہیں۔ چند وجوہ کی بنا پر قدیم کرام کے نام ترک کردیے گئے ہیں۔ بانڈے، بچھ، کنٹھ، اورگان کراموں کے سوائے شجروں کی کوئی قدروقیمت نہیں ہے۔ محض دولت کی حیثیت ان پر غالب ہے اور غربت سے ایک گھرانہ پستی کا شکار ہوجاتا ہے۔ اپنی ادنیٰ علامت کو پوشیدہ رکھنے کے لیے کئی لوگوں نے مانوس جانوروں(5)، کیڑوں، تجارتی، اور پیشوں اور مقامات کو اپنے تخلصی ناموں میں شامل کرلیا ہے۔

سرینگر کا ایک ممتاز تاجر گیڈر کے نام سے معروف ہے۔ ایک بااثر اور بارسوخ شخص قبیلے یا اپنے کنبے کے نام یا لقب کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ عشائی کنبہ، جس کے ساتھ مشہور حاجی مختار شاہ کا تعلق تھا اپنے آباء اجداد کی دینداری کا مرہون منت ہے۔ اس شہر کے عوام کی خصوصیات کی فہرست دینے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ بہت ساری ذاتیں نہایت بھونڈی ہیں چنانچہ نہ تو ان کو یہ نام دینے والا اور نہ ہی قبول کرنے والا امبارکبادی، فراخدلی اور نہ ہی بذلہ سنجی کا مستحق ہوتا ہے۔ اور عجیب وغریب اشخاص کو اس قسم کے نام اپنے افراد خانہ کو خاموشی کے ساتھ سپرد کردینے چاہئیں۔ جُو کی اضافت نے برنیئر کو اس تصور کے لیے مائل کیا کہ کشمیریوں کی ابتدا یہودی رہی ہوگی اور یہ اضافت احترام یا محبت کے سبب دی گئی ہوگی۔ جب ایک شخص اپنے نام کے ساتھ 'جُو' کی اضافت اپنالیتا ہے تو وہ اپنے کرام کے نام کا استعمال چھوڑ دیتا ہے۔ پس حبیب جُو ایک مشہور ریشم گر ہے اور بنیادی طور پر وہ حبیب گرٹھ ہے۔ کپڑا فروش جو حقیقت میں سلطان گرزبان

ہے۔دیہات میں بھی بسا اوقات جُو کی اضافت کے ساتھ ہی کرام کا نام غائب ہو جاتا ہے۔ قادر گنائی بھون کا قادر جو اور نیل کا احد ڈار احد جو کے طور پکارا جائے گا۔ جُو کی اضافت قاضیوں کی بستی کو احترام کے طور پر بھی دی جاسکتی ہے۔

کم تر قبیلے

جس طرح مختلف دیہاتی کرام کے کوئی خاص پہلو نہیں ہوتے اسی طرح ان کے کوئی واضح علاقے نہیں ہوتے اور یہ لوگ وادی کے تمام اطراف واکناف میں پھیلے ہوئے ہیں۔ان کے سماجی رتبہ کا معیار نہیں ہے جس کو زراعت پیشہ لوگوں میں طائفہ دار یعنی بازاری باغبانوں، گذریوں، چرواہوں، کشتی رانوں، بھانڈوں، چمڑہ کارکنوں اور دیہات کے حقیر کارکنوں کے ساتھ شادی بیاہ کا رشتہ قائم کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ میں نے بعد ازاں ان گھرانوں کی ابتداء کی بابت کوئی اطمینان بخش تفصیل کی بات نہیں سنی ہے کہ ان لوگوں نے مختلف النوع پیشے کیسے اپنائے۔ چنانچہ میں اس بارے میں کوئی فلسفہ بھی پیش نہیں کر سکتا کہ آیا مثال کے طور پر کشتی ران بنیادی طور پر اپنی دریائی زندگی سے قبل زراعت پیشہ کاشتکار تھے۔آیا وہ دریائی زندگی سے قبل ابتدائی طور پر کسی ممتاز ذات سے وابستہ تھے۔اگر اس معاملے میں فلسفے بیان کیے جائیں تو یہ اور بھی زیادہ خطرناک ہوگا اور عین حالیہ برسوں کے دوران ہی چند کاشتکاروں نے کشتی رانی کی زندگی اختیار کر لی ہے جبکہ دیگر افراد نے بھانڈوں کا پیشہ اختیار کر لیا ہے۔اگر ایک مرتبہ کوئی بھانڈ بنتا ہے تو وہ ہمیشہ کے لیے بھانڈ ہو کر رہ جاتا ہے۔ جہاں تک ان کے رسم ورواج اور شادی بیاہ کا تعلق ہے۔بھانڈوں کے بچوں کو کاشتکاری کا مرتبہ واپس دلانے کے معاملے میں بہت ساری کوششیں کرنا پڑتی ہیں۔ان کے خدوخال میں سے اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہوتا کہ گذریئے، بھانڈ، کشتی ران اور گاؤں کے دیگر ادنیٰ پیشہ لوگ کشمیری کاشتکاروں سے مختلف نسل کے ہیں۔اگرچہ پیشوں کے معاملات میں ان کے لباس دھوکہ دیتے ہیں مگر ایک ڈوم ایک گلوان یا ایک باطل اپنے چہرے سے بھی پہچانا جاتا ہے۔ڈوم کی جلد کاشت کار کی نسبت سیاہی مائل ہوتی ہے۔ان کی آنکھوں میں بے چینی اور غصہ ہوتا ہے جو ایک سارق یا چور کا خاصہ ہے۔چنانچہ گلوان اور باطل اپنی سیاہی مائل جلد کے سبب پہچانے جاسکتے ہیں۔

ڈوم

کشمیر کے ڈوم ایک ہی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں اور حالیہ برسوں تک دیہات میں یہ لوگ کافی طاقتور تھے۔ گاؤں کا چوکیدار ہمیشہ ایک ڈوم ہوتا تھا اور اپنے پولیس فرائض کے علاوہ حکومت کی طرف سے اُسے فصلوں کی دیکھ بھال کا کام بھی کرنا تھا۔ اس بات میں شک نہیں کہ ڈوموں میں غارت گری کا جذبہ ہوتا ہے اور نجی شہریوں کی حیثیت میں ان پر اعتبار نہیں کیا جاتا مگر یہ بات ان کے حق میں جاتی ہے کہ انھوں نے کبھی سرکاری خزانے کو چرانے کی کوشش نہیں کی حالانکہ وہ تحصیل خزانہ جات سے بھاری مقدار میں چاندی سرینگر تک لاتے ہیں۔ دیہاتی چوکیدار کی حیثیت میں ایک ڈوم کے ہاتھوں دیہاتیوں کو ناراض کرنے اور انھیں زک پہنچانے کے کئی موقعے حاصل ہوتے ہیں۔ ڈوم نہایت خوف ناک شخص ہوتا ہے جسے عوام پسند نہیں کرتے اور اس کو راضی رکھنا پڑتا ہے۔ انجام کار پنڈت دیہی چوکیدار کی طرف مائل ہوتے ہیں مگر اس بات میں شک ہے کہ وہ ڈوموں کی نسبت زیادہ جابر اور رعب دار ہوں گے۔ ڈوم اپنی ابتدا (6) کے بارے میں بہت سارے قصے کہانیاں بیان کرتے ہیں اور وہ ہمیشہ بیان کرتے ہیں کہ وہ ہندو راجہ کی اولاد ہیں اور اپنے سارے بیٹوں سے خوفزدہ ہو کر اس نے انھیں تمام وادی میں بکھیر دیا مگر یہ باور کیا جاتا ہے کہ وہ شودروں سے نکلے ہیں۔

گلوان

کشمیر کے گلوان یا گھوڑے بان ڈوموں کی اولاد تصور کیے جاتے ہیں اور ان کا سیاہی مائل رنگ اس بات کی علامت ہے کہ وہ کشمیری کسانوں کی نسل میں سے نہیں ہیں۔ دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ گلوان ژک قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے اس فلسفے کی تصدیق میں کوئی شہادت موجود نہیں ہے، بنیادی طور پر انھوں نے اپنا گزر بسر گھوڑوں اور ٹٹوؤں کے چرواہوں کے طور پر کیا۔ پٹھانوں کے عہد حکومت میں انھیں کافی بدنامی حاصل ہوئی اور جب سکھوں کا دور آیا تو گلوانوں نے اس ملک میں دہشت پھیلا رکھی تھی۔ وہ مختلف گروہوں کی صورت میں گھوما کرتے۔ سبھی لوگ گھوڑ سوار ہوتے اور ان کے ہاتھوں میں بھاری ڈنڈا ہوتا تھا۔ وہ حملہ کرتے تھے اور وہ اکثر باراتوں پر دھاوا بول کر دلہن کو اٹھا کر لے جاتے تھے۔ ان کی دیدہ

دلیری کی مختلف کہانیاں بیان کی جاتی ہیں اور بہت ساری داستانوں کا ہیرو غیرہ گلوان تھا۔ کرنل میاں سنگھ نے مال غنیمت اڑانے والے ان لوگوں کو ملک بدر کرنے میں کافی کوشش کی اور آخر غیرہ اور اس کے رفقا کو گرفتار کر لیا اور اس کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ وہ گلوانوں کی قریباً نصف تعداد کو موت کے گھاٹ اتارنے میں کامیاب ہو گیا۔ مہاراجہ گلاب سنگھ نے بھی یہ کام جاری رکھا اور اس قبیلے کے افراد کو رگھوناتھ پورہ کے مقام پر قید کر دیا اور آخر مہاراجہ رنبیر سنگھ نے ان کو پونچھ روانہ کر دیا۔ بہرحال بہت سارے گلوان واپس کشمیر آ گئے اور گھوڑوں کے چوری کے واقعات میں ملوث ہوئے۔ ان گھوڑوں کو پونچھ لے جایا جاتا تھا جہاں انھیں آسانی سے فروخت کر دیا جاتا تھا۔ اب گلوان کی اصطلاح اس شخص کا حلیہ بیان کرنے کے لیے کی جاتی ہے جہاں کسی شخص کو خونخوار اور رہزنی کی عادتوں کا مالک بیان کرنا مقصود ہو۔ دیہاتی لوگ اکثر کہتے ہیں کہ گھوڑبانوں کے طور پر یہ گلوان چھوٹے گھوڑوں کو ہلاک کر کے کھا جاتے ہیں اور ان کا چمڑہ بدبخت مالک کو واپس کر دیتے ہیں۔

چوپان

کشمیر کے گڈریوں کو چوپان یا پوئل کی صورت میں جانا جاتا ہے۔ اگرچہ وادی کے کسانوں سے ان کے خدوخال الگ نہیں ہیں مگر ان کی نسل الگ ہے اور بعض اوقات وہ چوپانوں کے ساتھ شادی بیاہ کرتے ہیں اور اس کی طرز زندگی کا بیان کسی دیگر باب میں کیا جائے گا۔ وہ خوش باش اور سرگرم شخص ہوتا ہے جو ایک مخصوص قسم کی سیٹی بجاتا ہے اور بلند پہاڑوں میں اپنی جفاکش زندگی کے باعث وہ گٹھیلا اور سخت جان ہوتا ہے۔ اسے جڑی بوٹیوں کا بھی قدرے علم ہوتا ہے اور مقامی ڈاکٹروں کے لیے طبی جڑی بوٹیاں وہاں سے لاتا ہے۔ پہاڑی پر واقع کا ہچرائی رقبہ جات کو مختلف چوپان کنبوں میں تقسیم کیا گیا ہوتا ہے اور دراندازی کو فوری طور پر واپس مڑنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ موسم سرما یا بہار کی شروعات میں چوپان دیہات میں رہتا ہے جہاں پر اس کی قابل کاشت زمین ہوتی ہے۔ چوپانوں اور دودھ فروش شیر گوجروں کے کرام کا نام اکثر واگی ہوتا ہے۔

بھانڈ

کشمیر میں بھانڈوں (بھگت یا بانڈ) کی شناخت ان کے سیاہ لمبے بالوں اور گھومنے پھرنے کی

عادات سے ہو جاتی ہے۔ اگرچہ شادی بیاہ کے معاملے میں عملی طور پر وہ اپنی ہی جماعت کا انتخاب کرتے ہیں مگر بعض اوقات وہ اپنی جماعت میں دیہاتیوں کو بھی شامل کر لیتے ہیں۔ گانے بجانے کے پیشے کو وہ گداگری کے ساتھ منسلک کر لیتے ہیں۔ وہ دشت نورد طبیعت کے لوگ ہوتے ہیں اور پنجاب تک سفر کر کے وہ کشمیری تماشہ بینوں کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اکن گام کے بانڈوں کے سوائے جس میں پنڈت شامل ہیں، بھگت مسلمان ہوتے ہیں۔ شادی بیاہ اور دعوت کے موقعوں پر ان کی بھاری منت سماجت کی جاتی ہے اور فصل کٹائی کے وقت وہ ملک بھر میں گومتے ہیں۔ اور ایک اچھی فصل کے سال میں دیہاتیوں کی طرف سے ملنے والے تحفوں کے سبب ان کا اچھا خاصا گزارہ ہوتا ہے۔ ان کے سازینہ میں اکثر چار سارنگیاں اور بیچ میں ایک ڈھول یا شہنائیاں ہوتے ہیں۔ ان میں سے میں بیس جماعتوں سے مل چکا ہوں جن کے پاس دو ہزار روپے سے زائد مالیت کا اثاثہ ہے۔ ان کی اداکاری اعلیٰ بلند پایہ کی ہوتی ہے اور گانے بھی اکثر خوبصورت ہوتے ہیں۔ وہ بذلہ سنجی میں چابکدست اور اکثر اس کے ردعمل سے بھی بے خوف ہوتے ہیں۔ ان کے گیت کشمیری، فارسی اور پنجابی زبانوں میں ہوتے ہیں مگر میں نے صرف کشمیری گیت ہی ان سے سنے ہیں۔ اکن گام کے بھگتوں کی کہانی قدرے مختلف ہے۔ برہمنوں میں اداکاری کے پیشے کو زوال اور پستی کی علامت سمجھا جاتا ہے اور کشمیری برہمن اکن گام کے اداکاروں کو حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں مگر برہمن اداکاروں کا کہنا ہے کہ وہ دیوی کا حکم بجالانے کے لیے اسٹیج کی طرف مائل ہیں۔ یہ قصہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ اکن گام میں پنڈتوں کے ایک بزرگ سے دیوی نے کہا کہ ''اس سارنگی کو بجاؤ''۔ اس نے معذرت طلب کی مگر دیوی کے اصرار کرنے پر اس نے وہ ساز اٹھایا اور اس نے تال اور لے کے بغیر موسیقی پیدا کی تو دیوی نے اس سے کہا کہ وہ اکن گام کے دیوار تلے بیٹھ جائے اور اس کی عقیدت میں یہ ساز بجائے۔ بعدازاں اس کے بچوں نے بھی برسوں تک دیوی کا حکم بجالایا مگر وہ اس عمل کو زیادہ دیر برداشت نہ کر سکے۔ آخر اس نے مزید ساز بجانے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد اس کو اندھے پن نے آگھیرا اور وہ وادیٔ لیدر میں دربدر مارا مارا پھرتا رہا۔ اس کے بعد لیدر کے مجسٹریٹ کے سامنے دیوی نمودار ہوئی اور اسے حکم دیا کہ پنڈت کو اکن گام واپس پہنچا دے۔ اکن گام پہنچ کر پنڈت کی بینائی

واپس آ گئی مگر اس دن کے بعد اس کی اولاد کسی احتجاج کے بغیر سارنگی بجاتی ہے۔ پنڈت لوگ کبھی اپنے بچوں کو اسکول نہیں بھیجتے کیونکہ ان کے دل میں یہ وسوسہ ہے کہ اس سے دیوی ناراض ہو جائے گی اور ان کے بچوں کو ہلاک کر دے گی۔ بھگت کافی دلدار لوگ ہوتے ہیں۔ ایک کشمیری کسان کی قنوطیت کی نسبت یہ لوگ اچھے خاص خوش دل اور خوش مزاج ہیں۔ یہ لوگ صرف دو رہنماؤں یا سرداروں کو تسلیم کرتے ہیں، جن کے درمیان یہ انتظام ہے کہ یہ لوگ آپس میں نہیں ٹکرائیں گے۔ ان کے پاس خاص پھرہ کتھ (7) ہوتی ہے جسے یہ لوگ اسٹیج پر اداکاری میں استعمال کرتے ہیں۔

ہانجی

کشمیر کے کشتی ران (ہانز یا ہانجی) ایک اہم اور ممتاز قبیلے کی حیثیت رکھتے ہیں اور 1891 کی مردم شماری کے مطابق ان کی تعداد 30877 ہے۔ ان کی ابتدا کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ممکن نہیں ہو سکا ہے مگر ان کا یہ پیشہ بہت پرانا ہے اور تواریخ اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ راجہ پر بھات سین کے دور میں سنگلد یپ کے کشتی رانوں سے وابستہ یہ لوگ ویش ذات کے لوگ ہیں۔ یہاں تک کہ اگر کوئی ہانجی غلط طریقے سے کشتی رانی کرتا ہے تو کہا جاتا ہے ''تم ایک شودر ہو''۔ جب اس بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ ان کا بزرگ نوح تھا۔ مگر حکایت کے مطابق ان کے چند نمائندوں کا بیان ہے کہ ان کی ابتدا خانہ بدوشوں سے ہوئی ہے۔ ان کے گھرانے کا مالک ایک امیر شخص ہوتا ہے۔ اس کے بیٹے اور بیٹیاں کشتی میں ہی رہتے ہیں اور ان کی تمام تر آمدنی ان کے والد کے پاس چلی جاتی ہے جو انھیں کھانا فراہم کرتا ہے۔ جب ایک بیٹا شادی کرنا چاہتا ہے اس کے لیے اپنے والد کی رضامندی حاصل کرنا لازمی ہے اور اکثر یہ رضامندی ملتوی کی جاتی ہے۔ کیونکہ ایک کشمیری کشتی میں نوجوان لوگوں کے لیے بہت کم گنجائش ہوتی ہے۔ ہانجی قبیلے میں کافی زمرات ہوتے ہیں۔ جھیل ڈل کے نصف آبی ہانجی (ڈیمب ہانز) ہوتے ہیں جو عموماً سبزیوں کے باغبان ہوتے ہیں اور جھیل ولر کے وہ کشتی ران جو سنگھاڑے جمع کرتے ہیں (گاڑ ہانز) اور وہ دو طبقے جو ہانجیوں میں سر اٹھا کر چلتے ہیں اس کے بعد ان کشتی رانوں کا احترام ہے جو بڑی بڑی کشتیوں میں رہتے ہیں جن کو باہت اور رواُ رکہا جاتا ہے۔ اس میں

آٹھ سو من غلہ یا لکڑی کی ڈھلائی ہوتی ہے۔اس کے بعد کم ذی عزت لوگوں کا شمار ہوتا ہے۔جو ڈونگوں یا سواریاں ڈھونے والی کشتیوں کے مالک ہوتے ہیں۔ڈونگوں میں رہنے والے ہانز اپنی عورتوں سے عصمت فروشی کا دھندہ کراتے ہیں۔شہر میں بہتے ہوئے دریا پر دارومدار ہونے کی وجہ سے ان کے شہر کے وسیلہ گھرانے کے ساتھ تعلقات ہیں۔ڈونگہ ہانزوں میں بدترین ماٗر ہانز ہوتے ہیں جو نالہ مار میں اپنی کشتیاں چلاتے ہیں۔اسکے علاوہ گاڈ ہانز ہوتے ہیں وہ اپنی کشتیوں سے مچھلیاں پکڑنے کے لیے جال پھینکتے ہیں یا کانٹا چلاتے ہیں۔وہ گالیاں بکنے کے معاملے میں چونگا ہانزوں کو بھی مات دے جاتے ہیں۔اس قبیلے کا ایک چھوٹا سا طبقہ ہقہ ہانز کہلاتا ہے جو دریا میں ادھر اُدھر بکھری لکڑی کو نکالتے ہیں۔ڈونگا یا گاڈ ہانز گالی بکنے کے عادی ہوتے ہیں۔ان گالیوں کے معاملے میں وہ ایک فرہنگ کے باعث کافی مشہور ہوتے ہیں اور اکثر اوقات جب یہ جھگڑا شروع ہو جاتا ہے ایک عورت اپنی کشتی کے اگلے حصے پر کھڑی ہو جاتی ہے اور گالیوں کی بوچھاڑ شروع کر دیتی ہے۔اور دوسری کشتی میں بیٹھی عورت اس کا برجستہ جواب دیتی ہے۔اگر یہ گالی گلوچ رات ہونے سے پہلے ختم نہ ہو جائے تو پہلی عورت ناؤ پر ایک ٹوکرا رکھتی ہے جس کے معنی ہے کہ یہ لڑائی کل صبح پھر شروع ہو جائے گی۔

ہانجی نہایت گٹھے بدن کے چست لوگ ہوتے ہیں اور ان کے بچے نوعمری سے ہی کشتیوں کو باندھنے اور کھینچنے کا کام شروع کر دیتے ہیں۔ان کشتیوں کا چپو دل کی صورت کا ہوتا ہے اور کشمیری کشتی ران اپنی کلائی کو موڑ کر چھوٹے سے شکارے کو چپو سے کھینچتے ہیں۔

ہانجی نہایت سخت جان لوگ ہوتے ہیں۔حالانکہ بڑی کشتیوں میں رہنے والوں کے لیے موسم سرما کے لیے گرم کمرے ہوتے ہیں۔جب کہ کھانے پکانے کے لیے مٹی کے چولہے ہونے کے باوجود ڈونگا ہانجیوں کی کشتیاں سردی سے بہت کم بچ پاتی ہیں کیونکہ ان ڈونگوں کی دیواریں چٹائیوں سے ڈھانپی گئی ہوتی ہیں۔اگر ان میں اخلاقی کمزوریاں ہیں تو اس معاملے میں کسی قسم کا تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ان کی کمزور رہائش میں کسی قسم کا ذاتی پردہ نہیں رہتا مگر اپنے جھگڑالو مزاج اور جھوٹ کے لیے ہانجیوں کے پاس کوئی بہانہ نہیں ہے۔کشمیر اور کشمیریوں کی بابت نصف کے قریب قصے کہانیاں ہانجیوں کی پرواز تخیل سے نکلتی ہیں جو آئرلینڈ کے کار ڈرائیوروں کی مانند اپنے

مسافروں کو حکمرانوں کی بابت عجیب وغریب قصے سناتا ہے۔ وہ نہایت چالاک لوگ ہوتے ہیں جو غلے کے بڑے کاروبار سے لے کر آنے والوں کے لیے کھانا تک پکا لیتے ہیں۔ کنارے پر کھڑا ہوا مانجی بدمعاش ہوتا ہے اور اگر یورپی لوگ اسے اپنی کشتی میں ہی تنہا چھوڑ دیں تو وہ نہایت عقلمند ہوں گے۔ جو دیہاتی لوگ رسدات کی خرید کے لیے نقدی دیتے ہیں وہ شاذ ونادر ہی اسے واپس کرتا ہے۔ ان کے دل پسند کرام ڈانگر، ڈار اور ملہ ہیں۔

واتل

واتلوں کو کشمیر کا خانہ بدوش کہا گیا ہے۔ اور اپنی مخصوص بولیوں کی وجہ سے یہ نہایت دلچسپ قسم کے لوگ ہیں۔ سماجی طور پر انھیں دو جماعتوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک وہ جو گلا سڑا گوشت کھانے سے احتراز کرتے ہیں اور انھیں مسجدوں اور دین اسلام میں داخلے کی اجازت ہے۔ وہ جو مردہ جانوروں کا گوشت کھاتے ہیں انھیں مسجدوں سے باہر رکھا جاتا ہے۔ یہ لوگ دوسری جماعت میں شامل ہوتے ہیں۔ واتل ایک دشت نورد قبیلہ ہے۔ اگرچہ بسا اوقات ایک گھرانہ کسی گاؤں میں آکر بس جاتا ہے وہ اپنی مستقل جھونپڑی تیار کرلیتا ہے مگر دشت نوردی کا جذبہ اس قدر شدید ہوتا ہے کہ کچھ عرصے کے بعد وہ وہاں سے چلا جاتا ہے۔ ان لوگوں کا اصل پیشہ چمڑا سازی ہے۔ پہلے زمرے میں آنے والے واتل بوٹ اور چپل تیار کرتے ہیں جبکہ دوسرے زمرے کے واتل چمڑے اور گھاس کی خانے دار طشتریاں تیار کرتے ہیں اور خاکروبوں کے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ خاکروب واتلوں سے کوئی بھی مسلمان کسی قسم کا واسطہ نہیں رکھتا اور اس کے ساتھ کھانا تک نہیں کھاتا۔ واتل طبقے کو زیادہ ایماندار نہیں سمجھا جاتا اور انھیں مرغیاں چرانے کی عادت ہے۔ ان کی بستیاں عام طور پر گول ہوتی ہے۔ واتلوں کی جھونپڑیاں عموماً کسانوں کی جھونپڑوں سے کافی فاصلے پر واقع ہوتی ہیں۔ یہاں پر واتل مردہ جانورں، اور بھینسوں کے علاوہ بھیڑ بکریوں کی کھالیں تیار کرتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ فروخت کے لیے مرغے مرغیاں پالتا ہے۔ واتل عورتیں نہایت حسین اور خوبرو ہوتی ہیں اور اکثر شہروں تک چلی جاتی ہیں۔ جہاں پر وہ ناچ گانے کا دھندا اختیار کرلیتی ہیں۔ جولائی کے مہینے کے قریب وادی کے تمام واتل نسیم باغ میں واقع لال باب کی درگاہ پر جمع ہوتے ہیں۔ جہاں پر اس قبیلے کے بہت سارے معاملات کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ واتلوں کا

کوئی مذہب نہیں ہوتا اور شادی بیاہ کے رشتے طے کیے جاتے ہیں۔ مگر وہ اپنی درگاہوں کی بھاری قدر کرتے ہیں۔ اور اکثر وہاں پر حاضری دیتے ہیں حالانکہ انھیں مسجدوں میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ لال باب کی پرستش نہیں ہوتی۔ واتلوں کی شادی اور وفات کو قاضی کی موجودگی سے تقدس نہیں بخشا جاتا مگر ذات سے عاری واتل کے پاس اس امر کا بھی علاج ہے۔ چند روپے خرچ کرنے اور گلا سڑا گوشت کھانے سے احتراز کرنے کی قسم لینے کے بعد اُسے دوبارہ اسلام میں شامل کیا جا سکتا ہے مگر واتل اس کا کوئی فائدہ نہیں سمجھتا، کیونکہ بہت سارے واتل اب بھی ذات بدر ہیں۔ یہ بھی سننے میں آتا ہے کہ واتل اپنا عہد توڑ کر دوبارہ پرانے طور طریقے اپنا لیتے ہیں۔

نان گار

ان غیر زراعت پیشہ قبیلوں کے علاوہ موجودہ سماج کے دائرے سے باہر بھی چند ادنیٰ قسم کے لوگ دیہات میں آباد ہوتے ہیں۔ کشمیر میں انھیں نان گار کا نام دیا گیا ہے اور بڑے گاؤں میں ہمیں ایسے پیشوں والے گھرانے ملتے ہیں جو دیہاتیوں کے لئے کام کرتے ہیں۔ انھیں یا تو فصل کا مقررہ حصہ ملتا ہے یا انھیں ان کے کام کی نوعیت کے مطابق اجرت ادا کی جاتی ہے۔ بڑھئی، آہنگر، برتن، جولاہے، قصاب، دھوبی، حجام، درزی، نانبائی، زرگر، باربردار، تیل نکالنے والے، رنگریز، شیر گوجری، کپاس صاف کرنے والے اور نسوار بنانے والے ان ادنیٰ لوگوں کے پاس ان کے گھروں کے ساتھ باغات کے قطعات کے سوائے اپنی کوئی موروثی زمین نہیں ہوتی مگر زمین بھی بکھری ہوتی ہے۔ نان گار اپنے پیشے کو ترک کر کے زراعت پیشہ بن جاتے ہیں۔ یہ بات قابل غور ہے کہ ادنیٰ لوگ نہایت آزاد مزاج ہوتے ہیں آقاؤں کے گھر میں کام کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ ایک تیلی سب سے زیادہ آزاد مزاج ہوتا ہے کیونکہ وہ فارغ البال ہوتا ہے۔
ایک نان گار کی یہاں پر بھی وہی حیثیت بیان کی جا سکتی ہے جو اکثر ایک ہندوستانی گاؤں میں ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اُجرت کی شرحیں بھی طے نہیں کی جاتی ہیں۔ اس طرح بڑھئی اور حجام کو فی نفر کے حساب سے غلّہ دیا جاتا ہے مگر وہ اس سے دوگنی مقدار کا تقاضا کرتے ہیں۔ اور عام طور پر اسے حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بڑھئی، آہنگر، برتن ساز، حجام، اور دھوبی کی گاؤں میں ہمیشہ ضرورت پیش آتی ہے مگر دیہات اور قصبوں کے درمیان نقل و حمل کی بہتری کے ساتھ اس کی

ضرورت کم ہو رہی ہے۔ عین ممکن ہے کہ دوسرے نان گار نہ رہیں یا قصبوں میں جا کر زراعت پیشہ اختیار کریں اور اچھے زرعی مزدور ثابت ہوں جو طبقے ظاہراً زراعت کا پیشہ اپناتے ہیں، ان میں شال بافوں کا زبوں حال طبقہ بھی شامل ہے۔ ان کے ہاتھ اور گھٹنے اس قدر نرم و نازک ہیں کہ افزائش کا کھر درا کام نہیں کر پاتے۔ اس قسم کا دوسرا طبقہ (ووُر) سوتی کپڑا بُننے والوں کا ہے۔ ان شال بافوں میں بہت سے تمام تر ملک میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اور کھیتوں میں کام کرنے کے مقابلے میں وہ اپنی غیر صحت مند قدیم زندگی کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ اپنی کھڈیوں پر صبح سے رات تک بیٹھے رہتے ہیں۔ انھیں مشکل سے کھانا کھانے کا وقفہ حاصل ہوتا ہے جس کے لیے انھیں پونے دو آنے یومیہ اُجرت حاصل ہوتی ہے۔ دیہاتی سماج کے افراد کے طور پر یہ ناکارہ اور فضول قسم کے افراد ہیں۔ سڑکوں پر کام کر کے اور بار برداری کے ذریعے پیسہ کمانے کے لیے وہ اچھی محنت نہیں کرنا چاہتے۔ مئی اور جون کے مہینوں کے دوران شالباف زیادہ تر شہتوت اور کچے سیب کھا کر اپنا گزارہ کرتے ہیں۔ ان کی حالت نہایت ابتر اور ظاہری طور پر لاچاری کی علامت ہے۔ شال انڈسٹری کی بحالی کے مواقع نہایت موہوم معلوم ہوتے ہیں اور قالین کی صنعت کی زبوں حالیوں کو روزگار فراہم کرنے کے معاملے میں نہایت چھوٹی ہے جن کی محنت کے سبب کبھی کشمیری فن کی شہرت دنیا بھر میں قائم ہوتی تھی۔

شالبافوں کے سوائے جن کے پژمردہ چہروں سے ان کی زبوں حالی ٹپکتی ہے۔ دیہات کے کسانوں اور ادنیٰ لوگوں کے درمیان فرق کرنا ناممکن ہے اور اس بات کو ظاہر کرنے کے لیے کوئی بات موجود نہیں کہ ان کی ابتدا کسی ادنیٰ قبیلے سے ہوئی۔ لگ بھگ تمام طبقوں کے خاص اور الگ الگ رسم و رواج ہیں۔ مگر مجموعی طور پر وہ اسی دائرے میں آتے ہیں جس کا ذکر دسویں باب میں کیا گیا ہے۔ ہر طبقے کے رسم و رواج الگ الگ طور بیان کرنے کی یہاں پر گنجائش موجود نہیں ہے۔

گوجر

اس تذکرے کا آخری قبیلہ گوجر ہے۔ وہ کسی طور پر بھی کشمیری نہیں ہیں۔ وہ وادی کے پہاڑوں کے دامن میں رہتے ہیں۔ وہ نیم خانہ بدوش قبیلوں کے اراکین ہیں جو اپنی بھینسوں، بکریوں کو ہمالیہ اور شوالک پہاڑوں پر چراتے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل انھوں نے کشمیر کی طرف اپنی توجہ

دی جہاں پر انھوں نے جنگلات کو صاف کر کے اپنی اور اپنی بھینسوں کی رہائش کے لئے سپاٹ چھتوں والے گھروں کی مسلسل تعمیر کی ہے۔ ان کی زبان کو پاریمو یا ہندی کہا جاتا ہے جو کشمیری زبان سے قطعی طور پر مختلف ہے۔ وہ شاذونادر ہی کشمیریوں کے ساتھ مل جل کر بیٹھتے ہیں۔ اگرچہ مذہب کے معاملے میں کشمیریوں کی طرح وہ بھی مسلمان ہیں وہ ایک نفیس قد آور نسل کے آدمی ہیں جن کے چہروں پر حماقت ٹپکتی ہے اور بڑے بڑے دانت نمایاں طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی واحد سوچ ان کے بھینسوں کی بھلائی ہے اور جب یہ لوگ کاشتکاری کرتے ہیں تو وہ خود اپنے مصرف کے بجائے اپنے بھینسوں کے لیئے مکئی پیدا کرتے ہیں۔ یہ لوگ جہاں بے ضرر اور سادہ لوح قسم کے افراد ہوتے ہیں اور کشمیریوں کی نسبت حکومت کے ساتھ ان کے تعلقات انتہائی دیانت دارانہ ہیں۔ خدا میں ان کا اعتقاد ضرب المثل ہے۔ یہ نہایت سخی لوگ ہیں اور جمعہ کے روز اپنا تمام دودھ خیرات میں دے دیتے ہیں۔ ان کی عورتیں ایک دھاگے میں گانٹھیں باندھ کر درمیانہ داروں کو دیے گئے مکھن کا حساب رکھتی ہیں۔ گوجر کا دل پسند نام محمد ہے اور ان میں حیثیت والے شخص یا گڈریے کے سربراہ کو بھائی کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے۔ شجرکاری کے لحاظ سے ان کا عمل مایوس کن ہے مگر کاشت کاری کے معاملے میں یہ لوگ فائدہ مند ثابت ہوتے ہیں۔ گوجروں کی حوصلہ افزائی کر کے حکومت کشمیر ایک دانشمندانہ اقدام کر رہی ہے۔

دیگر قسم کے قبیلے مختلف تحصیلوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ ان میں سے چند مظفر آباد کے ڈونڈ ہیں۔ دوسرے ضلع ہزارہ کے ترک اور ضلع جہلم کے بابا ہیں۔ یہ لوگ حال ہی میں آ کر آباد ہوئے ہیں۔ یہ آپس میں ہی ازدواجی رشتے قائم کرتے ہیں اور کشمیری ملبوسات نہیں اپناتے۔ انجام کار ضلع ہزارہ سے اچھی خاصی نقل مکانی ہوئی ہے پونچھ اور ہزارہ سے متعدد گھرانے بتدریج نقل مکانی کر کے افغانستان چلے گئے ہیں اور ہزارہ کے باشندے بہترین آباد کار ہیں۔

ذاتی شکل وصورت

کشمیر کے مختلف قبائل کا تذکرہ ختم کرنے سے قبل عوام کی شکل وشباہت کو بیان کرنے کی کوشش بھی لازمی ہے۔ ایک ممتاز عالم کا کہنا ہے کہ کشمیریوں کا چہرہ آریوں کا جیسا ہوتا ہے اور مسٹر ڈریو کا بیان ہے کہ کسان طبقے کی سیدھی اور بلند پیشانی عمدہ خدوخال کا ثبوت ہوتی ہے۔ ان کے

بھورے رنگ کے بال ہوتے ہیں اور آنکھوں کا رنگ زیادہ گہرا بھورا نہیں ہوتا۔ درمیانہ معمر لوگوں کی ناک واضح طور پر مڑ جاتی ہیں جس کے نقوش کافی خوبصورت ہوتے ہیں۔ نوجوانوں کا منہ عام طور پر قوسی صورت کا ہوتا ہے۔ مگر جوں ہی ان کی عمر بڑھتی ہے یہ سیدھا اور نازک ہونٹوں کی شکل اختیار کرتا ہے۔ انگریزی معیار کے مطابق شکل وصورت میں یہ لوگ درمیانہ قد ہوتے ہیں اور اس سے زیادہ ان کا قد عام طور پر نہیں بڑھتا۔ مورکرافٹ ان کے پٹھوں کا قدردان ہے اور بیان کرتا ہے کہ کسانوں میں اس قسم کی صورتیں موجود ہیں جو فرنسین ہرکیولس اور دوسرے مسافروں کے لیے مثالی ثابت ہوں گی جنھوں نے عوام کی طاقت اور عورتوں کے حسن کی شہادت پیش کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ چند کشمیری مضبوط اور سخت جان ہوتے ہیں اور وہ بھاری وزن اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ مسٹر ڈریوز ایک شخص کا واقعہ بیان کرتا ہے، جس نے غیر ہموار راستے پر 240 پونڈ وزن ڈھویا تھا مگر جن سینکڑوں آدمیوں کو میں نے قریباً ننگی حالت میں چاول کے کھیتوں میں کام کرتے ہوئے دیکھا ہے ان سے مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ کشتی رانوں اور شاید پہاڑیوں کے سوائے جو فرنسین ہرکیولس کے لیے مثالی ثابت ہوں وہ سب قاعدے کا انحراف تھے اور پٹھانوں کے عام خدوخال سے زیادہ قد وقامت کے نہیں تھے۔ ان کے پٹھوں، سینے اور عقب میں حصوں کی شاندار نشوونما ظاہر ہوتی ہے اگرچہ ان کی ٹانگوں پر گرنے کے عادی ہوتے ہیں مگر پہاڑی لوگوں کا یہ ایک شاندار اظہار ہوتا ہے۔ مؤخرالذکر ایک نسل کے طور پر کافی توانائی کے مالک ہوتے ہیں اور پہاڑیوں کی کھڑی چڑھائی، خطرناک پگڈنڈیوں تک وزن ڈھونے کے معاملے میں، ان میں بھاری قوت برداشت ہوتی ہے جبکہ ایک انگریز صرف یہ کرسکتا ہے کہ وہ بلا کسی حیل وحجت چلتا رہے۔ چڑھائی کے دوران انھیں ایک انگریز کی نسبت کم پسینہ آتا ہے۔ وہ شاید اس سے آگے نکل سکتے ہیں مگر وہ چھلانگ نہیں لگا سکتے۔ ان کے بازو کمزور ہوتے ہیں۔ ناہموار زمین پر بھی وہ نہایت یقین کے ساتھ قدم رکھتے ہیں مگر سپاٹ زمین پر چلتے ہوئے ایک یورپی باشندہ انھیں عام طور پر پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ جہاں تک خوبصورتی کا تعلق ہے میں نے چند بوڑھے لوگوں اور بچوں کے نہایت خوبصورت چہرے دیکھے ہیں۔ یقینی طور پر وہ یہودی ذات کے ہوں گے مگر ایک عام کسان کو میں مردانہ حسن کا نمونہ قرار نہیں دے سکتا۔ میں کشمیریوں کی نسبت پٹھانوں کو زیادہ

خوبصورت تصور کرتا ہوں۔ کشمیریوں کا زنانہ اور رنگوں سے مفقود لباس ان کی شکل وشباہت سے نظریں پھیرنے پر مائل کر دیتا ہے۔ میں نے قدرت کی پناہوں اور چاول کے کھیتوں میں بھاری بھرکم پاؤں والے اکثر افراد دیکھے ہیں اور میں سیاحوں کے اس خیال کا قائل نہیں کہ وہ کسی خوبصورت نسل کے لوگ ہیں۔ ان کی مڑی ہوئی ناک ایک نمایاں نقش ہے اور موجودہ نسل نمایاں طور پر یہودی ہے۔

نسوانی حسن

جہاں تک عورتوں کی خوبصورتی کا تعلق ہے۔ میں نے دیہات میں ہزاروں کی تعداد میں عورتیں دیکھی ہیں اور میں ان کے بارے میں یاد بھی نہیں کرسکتا جہاں میں نے واقعی ایک خوبصورت چہرہ دیکھا ہے ان کی عورتیں وہاں بہت جلدی عمر رسیدہ ہو جاتی ہیں اگر چہ ان کے بچے اکثر پیارے ہوتے ہیں۔ ایک متوسط درجے کی کسان عورت سپاٹ ہوتی ہے۔ یہ خوبصورتی مرمراتی آواز سے پیدا ہوئی خوبصورتی نہیں ہوتی شاید یہ حسن ہانجی اور واتل عورتوں میں عام ہے مگر ہندوستان کے قدیم اور موجودہ باشندوں کے ذہن میں یہ خیال گھر کر گیا ہے کہ کشمیری عورتوں کا حسن شاید ان کے صحت مند گلابی رخساروں کے سبب ہے اور ان میں سے بہت ساری ہندوستان کی گندمی رنگ سے اس قدر مختلف ہیں۔ شہروں کے اندر جہاں کھاتی پیتی پنڈتانی ہے جس کی آرام دہ اور زیادہ قرینہ مند زندگی حسن کی وراثت کو قدرے کم شکل بنا دیتی ہے۔ اس کے مقابلے میں اس کی وہ محنت کش بہن کے لیے جس نے ہر موسم کو برداشت کیا ہو یہ وراثت زیادہ مشکل ثابت ہوتی ہے۔ مجھے کہنا پڑتا ہے کہ اگر کشمیر کا افسانوی حسن کہیں واقعی موجود ہے تو اس کو وادی کے دیہات کی بجائے خود سرینگر میں ہی تلاش کیا جاسکتا ہے۔ نو عمری میں شادی کے علاوہ سخت محنت کے سبب کشمیری عورتوں کی شکل چیچک کے سبب بگڑ جاتی ہے۔ اگر چہ کسی فارغ البال دیہاتی سربراہ شخص کے گھر میں تو خوبصورتی مل سکتی ہے مگر وہ ان کھیتوں میں نہیں مل سکتی جہاں عورتیں کام کرتی اور گیت گاتی ہیں۔ اپنی کتاب "Journy To Paradise of Indies" میں برنیئر کہتا ہے:

> ''اس ملک کی عورتیں اس قدر خوبصورت ہیں کہ ہر فرد واحد مغل دربار میں
> اپنی بیوی یا داشتہ منتخب کرتا ہے تا کہ اس کے بچے ہندوستانیوں کے مقابلے میں

گورے رنگ کے ہوں اور اصل مغلوں تک پہنچ جائیں۔ ایک مقامی ادیب کی رائے ہے کہ کشمیر میں خوبصورتی اس وجہ سے زوال پذیر ہوئی ہے کہ کشمیر کی عورتوں کو ہندستان لے جایا جاتا ہے اور جہاں اس خوبصورتی کی نشوونما ہوتی وہ عمل غائب ہوگیا۔ معلوم ہوتا ہے میکرو پولو عورتوں کی بات کرتے ہوئے کہتا ہے۔ اگر انھیں سانولی صورت کی سیاہ چشم مخلوق سمجھ لیا جائے تو وہ از حد خوبصورت ہوتی ہیں"۔

●✻✻✻●

حوالہ جات

(1) درنہ باید گذشت بہ زنجیر بجنے دروہ دزداز ے ہیں جنھیں زنجیر سے باندھ کر رکھنا چاہیے۔

(2) چندلوگوں کا بیان ہے کہ ٹھاکر اور اتو کشتواڑ سے آئے تھے۔

(3) دیہاتی لوگ کہتے ہیں کہ لون چلاس سے آئے تھے۔

(4) شہروں اور گلی کوچوں کا فضلہ کوچوں میں جمع کیا جاتا ہے۔ پھر ایک مقررہ وقت گذرنے کے بعد اس کے ساتھ گرد و غبار اور دیگر فضلہ ملایا جاتا ہے تا کہ یہ سیاہ فام ہو جائے۔ اس کے بعد اسے سبزیوں کی کاشت والی زمین میں کھاد کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ کالائی کے نام سے جانا جاتا ہے۔

(5) مثلاً: گگر = چوہا، داند = بیل، بیور = بلی

(6) چندلوگوں کا بیان ہے کہ ڈوم قدیم تسکوں کی اولاد ہیں۔

(7) نجاروں۔ زرگروں اور چماروں کا بھی اپنا اپنا ایک الگ لسانی استعمال ہے۔

تیرھواں باب

زراعت اور کاشتکاری

مٹی کی بناوٹ

کشمیر میں لاتعداد دریا ہونے کی وجہ سے ایک بڑا رقبہ سیلابی زمین پر مشتمل ہے۔اس قسم کی زمین کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ایک تو وہ نئی سیلابی مٹی جو پہاڑی دریاؤں کی خلیج یا دہانے تک آجاتی ہے اور دوسری وہ جو دریائے جہلم کی سطح سے بلند تر اور وسیع تر کریوہ کی صورت میں نمودار ہوتی ہے۔اول الذکر زمین کافی حد تک زرخیز ہے اور ہر سال پہاڑی ندیوں کی ریت مٹی کی تہہ میں موجود مادے سے زرخیز ہو جاتی ہے۔جنگلاتی تحفظ کے کمزور نظام کے باوجود اب تک پہاڑی ندی نالوں کی تہہ میں جمع ریت اور دریائے سندھ میں درختوں کی بے تحاشا کٹائی کے سبب یہاں ریت کے کافی انبار جمع ہو گئے ہیں۔لہٰذا زراعت کے لئے حکومت پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ بلند پہاڑوں پر ان درختوں کا تحفظ کیا جائے جہاں سے بارش کے بعد ندی نالوں کو پانی حاصل ہوتا ہے۔دوسری قسم کی سیلابی زمین قدرے کم زرخیز ہے مگر بروقت بارش ہونے کی وجہ سے حالات بدل جاتے ہیں اور عمدہ قسم کی خشک فصلیں ہی حاصل ہو سکتی ہیں۔پرانی سیلابی زمین میں چوہوں کی بہتات ہوتی ہے۔

کشمیر کے لوگوں نے چاول کے سوائے کسی بھی فصل پر اب تک مناسب توجہ نہیں دی ہے اور

چاول کے کھیتوں کے لئے آب پاشی اور کھاد کا استعمال کر کے مصنوعی زمین تیار کر لی ہے اور اصلی زمین کی بابت اب شاذ و نادر ہی بات کی جاتی ہے۔ مگر کشمیری چار قسم کی مٹی کو تسلیم کرتے ہیں اور چاولوں کی کاشت کے معاملے میں اس کا خاص رکھ رکھاؤ لازی ہے۔ ان اقسام کے نام ہیں۔ گورُٹ، باہل، سیکل اور ڈزن لد۔ گورت زمین میں بھاری تعداد میں مٹی ہوتی ہے۔ اس میں پانی ٹھہر سکتا ہے اور بارش کے فقدان کی صورت میں ہی زمین محفوظ ترین ہوتی ہے۔ اگر بارش زیادہ ہوتی ہے اور مٹی ٹھوس صورت اختیار کر جاتی ہے تو چاول کی پیداوار میں کمی واقع ہوگی۔ باہل زمین قدرتی مضبوطی کی حامل گندھی ہوئی مٹی ہوتی ہے اور یہ خطرہ ہمیشہ موجود رہتا ہے کہ زیادہ کھاد ڈالنے سے یہ مٹی سخت ہو جائے گی اور چاول پنپنے کی صورت اختیار نہیں کرے گا۔ اس آفت کو رَے کہا جاتا ہے۔ اس کا ذکر آگے چل کر کیا جائے گا۔ یہ بیماری اکثر باہل مٹی میں رونما ہوتی ہے۔

سیکل ایک گندھی ہوئی ہلکی مٹی ہوتی ہے جس کی نچلی زمین ریتلی ہوتی ہے۔ اگر بارشیں خاصی مقدار میں ہوں تو سیکل زمینوں میں چاول کی پیداوار زیادہ ہوتی ہے۔ ڈزن لَد مٹی عام طور پر زیریں سطح پر واقع دیہی زمینوں پر بھی پائی جاتی ہے۔ یہ زمین حرارت اور تمازت کی حامل ہوتی ہے۔ جب یہاں چاول کا پودا نشو و نما پاتا ہے تو آبپاشی کا پانی فراہم کرنے کے لئے یہاں وافر اقدامات درکار ہوتے ہیں۔ اگر یہ اقدامات بروقت کر لئے جائیں تو بعض اوقات ڈزن لَد زمین سے چاول کی فصل بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ڈزن لَد زمین کی ایک خاصیت یہ ہے کہ یہاں سے گذرنے والا آبپاشی کا پانی سرخ رنگ کا ہوتا ہے۔ دریائے جہلم کے کناروں اور جھیل ولر کے گردونواح میں ایک زرخیز نباتی مٹی دلدل کی شکل میں پائی جاتی ہے جہاں اچھی بارشوں کے برسوں میں تلہن اور مکئی کی خاصی پیداوار ہوتی ہے۔ اس مٹی کے لئے کوئی کھاد درکار نہیں ہوتی چنانچہ یہاں پر چاول پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہاں پر رواج ہے کہ اس زمین پر ہل چلانے سے قبل یہاں گزشتہ برس کی فصل کی گھاس اور پودوں کو جلا دیا جائے۔

کشمیر کے مرغزاروں کو کریوہ کہا جاتا ہے جو کشمیر کے مناظر کا ایک اچھا جزو ہے۔ ان کا زیادہ تر حصہ گورُٹ زمین پر مشتمل ہوتا ہے مگر اس گورُٹ مٹی کی بھی کئی اقسام ہیں جن کی تمیز ان کے رنگ سے کی جا سکتی ہیں۔ ان میں سے سب سے زیادہ زرخیز قسم سیاہی مائل مٹی ہوتی ہے جسے سُرہ

زمین کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد بہترین مٹی سُرخ گورٹ ہے جبکہ زرد قسم کی بادامی مٹی کو ان تمام اقسام میں بدترین تصور کیا جاتا ہے۔

جن دیگر زمرات کی مٹی کشمیری عوام نے شناخت کی ہے انہیں مقامی نام دیئے گئے ہیں۔ پہاڑوں کے دامن پر واقع زمین چھ سے دس برس تک زیر کاشت رہنے کے بعد اپنی حقیقی طاقت سے محروم ہو جاتی ہے۔ اسے ٹانڈ کہا جاتا ہے۔ جس زمین میں آبپاشی کھیتوں کا پانی رہنے سے نقصان ہوتا ہے اُسے زبل زمین کہا جاتا ہے۔ بعض اوقات زرخیز کھیتوں کے درمیان ترش مٹی جمع ہو جاتی ہے اس کو خار زمین اور جس مٹی میں آبپاشی کا پانی نہ ٹھہرے اس کو تریش کہا جاتا ہے۔ جس زمین میں چشمہ واقع ہو اس کو لیمب کا نام دیا گیا۔ ہیرونتھ مٹی ایک قسم کی سخت اور بری قسم کی خاک ہوتی ہے جو ہمیشہ جم کر نکیہ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ متاتھ ایک قسم کی پتھریلی اور ریتلی مٹی ہے جو پہاڑی دریاؤں سے آتی ہے۔ تتس وہ مٹی ہے جو بھاری پتھروں کی موجودگی سے گرم ہو جاتی ہے۔ جہاں تک تقابلی زرخیزی کا تعلق ہے تازہ ترین سیلابی مٹی اوّل زمرے میں آتی ہے۔ دوئم زمرے میں پہاڑی ڈھلوانوں اور سیلابوں سے حاصل کی گئی ایسی اراضی ہیں جو جوہڑوں کے کنارے پر واقع ہوتی ہیں۔ تیسرے زمرے میں پرانی سیلابی زمین اور چوتھے زمرے میں کریوہ مٹی آتی ہے۔ چاولوں کی سب سے زیادہ پیداوار دریا کے دہانے کے قریب واقع اراضیات سے حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ ان میں پانی کے پیہم نکاس کے لئے کافی ڈھلوان موجود ہوتی ہے۔

کھادیں

کشمیری اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ ان کے کھیتوں میں بھاری مقدار میں کھادیں دستیاب ہوتی ہیں۔ ہندوستان کے دوسرے باشندوں کی طرح وہ بھی گوبر کو ایندھن کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ کشمیر میں رواج یہ ہے کہ موسم سرما کے دوران تمام قسم کا گوبر خواہ وہ بھیڑوں، مویشیوں یا گھوڑوں کا ہو گوبر جمع کیا جاتا اور اسے زراعت کے لئے محفوظ کیا جاتا ہے۔ کیونکہ ان دنوں یہ مویشی گھروں کے اندر ہی ہوتے ہیں جب کہ موسم گرما میں دستیاب گوبر کو خشک کر کے اس کے ساتھ چنار کے پتے اور بید کی شاخیں ملائے جانے کے بعد ایندھن کے طور پر رکھے جاتے ہیں مگر ان کی راکھ کا احتیاط کے ساتھ ذخیرہ کیا جاتا ہے اور عام طور پر لکڑی کے ساتھ جلایا جاتا ہے

تا کہ مسلسل آگ جلانے میں مدد حاصل ہو سکے۔ موسم بہار کی شروعات میں گوبر کے انباروں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کشمیری ایسی کوئی بھی چیز ضائع نہیں کرتا جو زراعت کے معاملے میں فائدہ مند ہو۔ اگر چہ اس کے پاس دوسرے ذرائع بھی ہر چند موجود ہیں۔ اول جب بھیڑوں کے ریوڑ پہاڑوں کی جانب روانہ ہونا شروع ہوتے ہیں تو کھیتوں میں انہیں چرایا جاتا ہے۔ دوئم ایک کشمیری گھاس کے گچھوں کو اس کھاد کی نسبت چالوں کے لئے زیادہ جاندار سمجھتا ہے جو گھروں کے اندر موجود ہوتا ہے۔ آبی راستوں سے تراشے گئے ان گچھوں میں کافی مقدار میں ریت ہوتی ہے اور ان گچھوں سے ڈھک دینے سے تین سال تک کھیت مضبوط رہتا ہے جبکہ گھروں کے اندر دستیاب سب سے زیادہ طاقتور کھاد مرغ بانی کی کھاد ہوتی ہے جسے پیاز کی فصل کے لئے محفوظ کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد بہترین کھاد بھیڑوں سے حاصل ہوتی ہے جسے ہمیشہ چاول کی نہالیوں کے لئے رکھا جاتا ہے۔ اس کے بعد مال مویشیوں کا گوبر ہے اور سب سے آخر میں گھوڑے کا گوبر (1) (لید) ہے۔ ایک کشمیری کاشت کے معاملے میں کھاد کی اہمیت کو بجا طور پر تسلیم کرتا ہے گو کہ وہ ہندوستان میں مروّج کھاد کے استعمال سے اس کا بہتر طور پر کرتا ہے اور اس استعمال کو کافی حد تک بہتر بنایا جاسکتا ہے۔

کشمیر میں کوڑا کرکٹ بھاری مقدار میں ہے اور جب مویشی اور بھیڑ ایک کمرے میں بند ہوتے ہیں تو ان کا زیادہ استعمال ہوتا ہے اور مال مویشیوں کا پیشاب ضائع ہونے سے بچ جاتا ہے۔ کشمیریوں نے اس تجویز کو قبول کرلیا ہے اور اس پر وہ عمل کریں گے۔ اگر چہ کشمیری اپنی بھیڑ کو کھیتوں میں موسم بہار کے دوران چرانے کی اہمیت کو مکمل طور پر پہچانتے ہیں مگر موسم خزاں کے دوران وہ اس اہمیت کو اس وقت یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں جب وہ چراگاہ میدان سے واپس آرہی ہوتی ہیں اور اس کے بعد دو ماہ تک بھیڑوں کو جہاں چاہیں وہاں جانے کے لئے چھوڑ دیا ہے۔ ہل میں جوتے جانے والے تمام مویشیوں کو تیل کی ٹکیہ کھلائی جاتی ہے تا کہ کھاد زیادہ پیدا ہو سکے۔ کشمیریوں نے کھاد کے طور پر ہڈیوں کے استعمال کے گر کو نہیں پہچانا اور چونے کو کبھی کاشت استعمال نہیں کیا جاتا۔ غالباً ڈزن لڈ زمین پر چونے کا استعمال سود مند طور پر کیا جاتا ہے اور میرا خیال ہے کہ کشمیر میں آبپاشی کے لئے جس طرح کا مصرف ہوتا ہے اس میں اکثر پانی میں

چونے کا عنصر موجود ہوتا ہے۔ موسم بہار میں زمین کو جو فصل کے لئے تیار کرنے سے قبل سبز کھاد کو کشمیری لوگ لاشعوری طور پر استعمال میں لاتے ہیں وہ گھاس کی صورت میں مسلسل پیدا ہوتا ہے مگر بدقسمتی سے سبز کھاد فائدہ مند ہونے کی نسبت نقصان دہ ہوتی ہے کیونکہ زمین پہلے ہی بھری فصل والی ہوتی ہے، اس کے مسام کھل جاتے ہیں اور یہ مٹی کافی ہلکی ہوتی ہے۔

شبانہ غلاظت کی اہمیت کو بھی بجا طور پر ذہین نشین کیا گیا ہے۔ سرینگر کے نزدیک قصبات میں باغوں کی نہایت عمدہ کاشت ہے اور اس میں ایک کھاد Pondrette استعمال کی جاتی ہے۔ یہ کھاد شبانہ غلاظت اور شہر کے گرد و غبار کو ملا کر تیار ہوتی ہے اور سورج کے عمل سے تیار ہو جاتی ہے۔ دیہات میں جہاں آبپاشی کے لئے ندی نالہ نہیں ہوتا وہاں دیکھا گیا ہے کہ شبانہ غلاظت اور پاخانہ باغات کی کاشت کے لئے استعمال میں لائے جاتے ہیں۔ دیگر جھونپڑوں کے گرد زمین سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ ایک شخص مٹی کو وہ سب واپس کر دیتا ہے جو اس نے اُسے عطا کیا ہو۔ کشمیر ی دیہات کی بکھری ہوئی نوعیت کے سبب ہندوستانی دیہات کی نسبت شبانہ غلاظت بھی وسیع طور پر تقسیم ہوئی ہے۔ سرینگر میں حالات بہتر ہونے کے سبب مجھے اُمید ہے کہ شبانہ غلاظت شہر کے نواح میں کچھ فاصلے پر پھیل جائے گی مگر فی الحال مالی سبزیوں کی کاشت کاری ہی محض فضلے اور کوئلے کی ملیار کھاد Pondrette کو وہ تعصب کے بغیر دیکھتے ہیں۔

اراضی سے متعلقہ باب میں ایسے حقائق معلوم ہوں گے جن سے معلومات ہوگا کہ سائنسی طریقے سے کاشت کرنے والے لوگوں نے زمین پر کھاد ڈالنے کے نئے اور بہتر طریقے اپنا لئے ہیں مگر آبادی کی موجودہ صورت حال کھیتی کے لئے ایک اچھا پہلو ہے۔ موجودہ طریقہ کار میں تبدیلی کے بغیر اچھی کاشت نئی اور پرانی سیلابی اور دلدلی زمینوں کے لئے کافی ہوں گی۔ وسیع ترعلاقے پر پھیلی کریوہ زمینوں کو فی الحال نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر سرمایہ دستیاب ہو جائے تو سائنس سے اس معاملے میں کافی معاونت حاصل ہو سکتی ہے۔ تاہم کریوہ زمین پر بھی اچھی طرح ہل چلانے سے ہی بھاری فرق پڑ سکتا ہے اور جب ہل چلانے پر زیادہ محنت کی جائے تو میں نے دیکھا ہے کہ اچھے نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔ کریوہ کی صلاحتوں کی بابت کشمیریوں کو بھاری شک وشبہات ہیں اور کہتے ہیں کہ جس زمین پر گھاس پیدا ہو وہاں کچھ بھی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود

وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ چند نامعلوم رقبوں میں کریوہ اراضیات سے جو اور گندم کی فصلیں حاصل ہوتی ہیں اور وہ اس امر کو تسلیم کرتے ہیں جس کریوہ زمین کو آبپاشی حاصل ہو جائے وہ زرخیزی کے معاملے میں نوسیلابی زمین کی ہمعصر ہوتی ہے۔ کریوہ کے معاملے پر میں اس باب کے آخر میں بحث کروں گا۔ یہ ایک نہایت اہم بات ہے کہ اب آبادی میں اضافے کا بھاری امکان دکھائی دیتا ہے۔

آبپاشی

اس وقت کشمیر میں کھیتی کا دارومدار عملی طور پر آب پاشی پر ہے۔ اس ملک کے جغرافیائی حالات کے سبب معمول کے برسوں کے دوران آبپاشی آسانی سے کی جاسکتی ہے۔ اگر موسم سرما کے دوران معمولی برفباری ہوتی ہے اور بڑے بڑے پہاڑ برف پوش ہو جاتے ہیں تو چاول کی فصلوں کے لئے آبپاشی فراواں ہوگی (دیہاتی لوگ پہاڑوں کو ہمیشہ اپنے خزینے قرار دیتے ہیں او راچھی خاصی برفباری کے موسم میں یہ خزینے بھر جاتے ہیں)۔ برف پگھل کر ندیوں کی صورت میں نیچے آجاتی ہے جو وادی میں ایک لکیر کی صورت میں دریائے جہلم میں گرتی ہے۔ جہلم کے دونوں کناروں پر بڑی بڑی کیاریوں کی صورت میں یہ ملک آخر کو ہساروں کی صورت اختیار کرتا ہے اور جن برسوں کے دوران اچھی برفباری ہوتی ہے وہاں پانی ایک سے دوسرے گاؤں تک جلدی پہنچ جاتا ہے۔ ان پہاڑی ندیوں کی گذرگاہوں پر مناسب مقامات پر عارضی بندھ تعمیر کر کے پیش بندیاں کی جاتی ہیں۔ بڑی بڑی نہروں کی صورت میں پانی کو چھوٹے آبی راستوں کے ذریعے لے جایا جاتا ہے اور آخر یہ تمام پانی حدیں پار کر کے جہلم یا اس کے کنارے پر واقع جوہڑوں اور تالابوں میں آکر گرتا ہے۔ وادی کے نچلے حصوں میں جہاں ندیوں کی روانی کم ہو جاتی ہے وہاں پر بندھ تعمیر کئے جاتے ہیں۔ بندھ سے حاصل ہونے والے پانی سے دیہات مستفید ہوتے ہیں۔ یہ بندھ لکڑی کے نوکیلے کھمبوں اور پتھروں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ان نوکیلے کھمبوں کے درمیان گھاس اور بید کی شاخیں موڑ کر لپٹی جاتی ہیں۔ اس مقصد کے لئے بہترین گھاس فنکل کہلاتا ہے۔ اس نہر کو عام طور پر دریاؤں اور کریوہ کی کھڑی چٹانوں کے کناروں کے اردگرد لے جایا جاتا ہے۔ اس صورتحال میں آبپاشی مشکل ہو جاتی ہے۔ ماضی میں جب حکومت فصلوں سے ایک حصہ وصول کرتی

تھی تو یہ دربار کے مفادات میں ہی ہوتا تھا کہ وہ اس کی مرمت میں اعانت کرے مگر 1880ء کے بعد حکومت نے مقررہ اہداف کا سلسلہ شروع کیا تو دیہاتی خود ہی مرمت کا کام انجام دینے لگے اور جب یہ نہر دشوار علاقوں سے گذرتی ہے تو آبپاشی نہایت غیر یقینی ہو جاتی ہے۔ اور جب اس نہر کو کسی ندی کو عبور کرانا مقصود ہو تو کشمیر میں زیر استعمال کشتیوں کی طرح ایک سپاٹ تلے والی کشتی بلند قینچی نما پایوں پر تیار کی جاتی ہے اور اس پر سے گذرنے والا پانی ایک عجیب وغریب آبی سرنگ سے گذرتا معلوم ہوتا ہے جب پانی کو کسی کریوہ سے گذارنا یا اس کے اردگرد لے جانا مقصود ہو تو بعض اوقات ایک سرنگ تیار کی جاتی ہے۔ قاعدے کے مطابق کھڑی چٹانوں کے بیچ میں نہر کو کاٹ دیا جاتا ہے اور ان نہروں میں اکثر شگاف پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے نوکدار کھمبوں اور بانسوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات اس مقصد کے لئے سپاٹ تلے والی کشتی طلب کی جاتی ہے۔ ماضی میں ہر ایک کلیدی نہر کے اوپر دیہاتیوں میں سے ایک میر آب ہوا کرتا تھا۔ اس کا فرض مرمت کی دیکھ بھال اور مزدوروں کو بلانا ہوتا تھا۔ برسوں تک میر آب کو کوئی تنخواہ حاصل نہیں ہوئی اور نہریں نہایت بے ترتیبی کی شکار ہوگئیں۔ مگر اب میر آب کے عہدے کو بحال کیا گیا ہے۔ پانی کی تقسیم کا نظام بھونڈا اگر آسان ہے۔ مگر اس کا فائدہ یہ ہے کہ دیہاتوں کے درمیان تنازعے شاذ ونادر ہی ہوتے ہیں اور ایک ہی گاؤں کے کاشتکاروں میں جھگڑے نہیں ہوتے۔ کہا جاتا ہے کہ شہنشاہ جہانگیر نے اس نظام کی ترویج کی۔ اس نے قاعدہ وضع کیا کہ بلند سطح پر واقع دیہات میں جہاں کوئی مقامی چشمہ موجود نہیں اور نچلی سطح پر واقع جن دیہات کو زائد بہاؤ سے پانی حاصل نہیں ہوتا وہ کلیدی نہر سے پانی حاصل کرنے کے حقدار ہوتے ہیں۔ استعمال اراضی کے دوران ان حصوں کا نہایت احتیاط کے ساتھ اندراج کیا گیا ہے آبادی اور چاول کی کاشت میں اضافے کے ساتھ آبپاشی سے متعلقہ دعوؤں اور تنازعوں کا سلسلہ شروع ہونا ایک ناگزیر بات ہے۔ پہلے زیریں علاقوں میں واقع دیہات کے عوام کو یہ شکوہ ہے کہ بالائی علاقوں کے عوام پہلے چاول کی کاشت نہیں کرتے تھے مگر اب وہ ان کے پانی کے حصے میں کمی کرنے لگے ہیں مگر اب تک جہاں چاول اُگانے والے پرانے گاؤں کی طرف سے کمی کے شکوے کا کوئی سنجیدہ معاملہ سامنے نہیں آیا ہے۔ بالائی دیہات کی ڈھلوان اس قدر پیچیدہ ہے کہ پانی جلدی ہی اپنی پرانی نہروں میں

آ گرتا ہے اور ہمیشہ کی طرح پانی کی روانی کی بدولت کاشتکار ضرورت سے زیادہ پانی حاصل کر لیتے ہیں ۔ مناسب کوہلوں اور کشمیر کی آبپاشی خدمات کی نگہداشت کو قریباً دوگنا کیا جاسکتا ہے ۔ جن بلندیوں تک نہروں اور کوہلوں کا پانی لے جایا گیا ہے اس کی بدولت شاید ہی وادی کا کوئی ایسا حصہ موجود ہو جہاں آبپاشی ممکن نہ ہو سکے ۔ علاوہ ازیں پہاڑی ندی نالوں سے حاصل کردہ آبپاشی کے علاوہ بے شمار چشموں سے اضافی آبپاشی حاصل ہوتی ہے ۔ چند چشموں سے عمدہ قسم کی آبپاشی ہوتی ہے مگر اس میں دو خامیاں ہیں ۔ چشمے کا پانی ہمیشہ سرد ہوتا ہے اور اپنے ساتھ ہی کھاد بخش ریتلی مٹی نہیں لاتا ۔ پہاڑی ندیاں یہ ریتلی مٹی اپنے ساتھ لاتی ہیں مگر اس کے ساتھ ہی ایک جھاگ آتی ہے جو چاول کے لئے نقصان دہ تصور کی جاتی ہے ۔ وادی میں سست چال میں رواں دواں دریائے جہلم سے فی الحال کوئی آبپاشی نہیں ہوتی اور اس کا پانی ضائع ہو رہا ہے ۔ مگر جیسے ہی آبادی میں اضافہ ہوگا تو رہٹ کو نصب کر کے پانی اوپر تک لایا جائے گا ۔ فی الحال نفٹ اریگیشن آسان اور کم خرچ ہے جو ڈیپ ویل سے حاصل ہوتی ہے ۔ چند کریوہ جات پر چشموں کی سطح زیادہ گہری نہیں ہوتی اور جب وادی کی تمام تر آبپاشی والی زمین کو لیا جائے تو مجھے توقع ہے کہ کریوہ جات پر کنوؤں کی کھدائی کی جائے گی ۔ میرے خیال میں رہٹ کے مقابلے میں بالٹی اور رسی کو رہٹوں کے مقابلے میں زیادہ فائدہ مند پایا جائے گا کیونکہ چشمہ اٹھارہ فٹ یا اس سے زیادہ گہرا ہوتا ہے ۔ وادی کے شمال مغرب میں چند تالاب بھی پائے جاتے ہیں اور میرا خیال ہے کہ اس کے بہت سارے حصوں میں تالابوں کے ذریعے آبپاشی کے عمل کو ترویج دی جاسکتی ہے ۔

آلات کشاورزی

کشمیر میں آلات کشاورزی تعداد میں کم مگر آسان ہیں ۔ چونکہ مویشی چھوٹے ہوتے ہیں تو ہل بھی لازمی طور مختلف قسم کی لکڑی سے بنا ہوا ہلکے وزن کا ہوتا ہے ۔ شہتوت کی لکڑی سے بنا ہل ہلکا ہوتا ہے ۔ شہتوت ایش اور سیب کی لکڑی اس سلسلے میں نہایت موافق ہوتی ہے ۔ ہل کے حصے پر لوہے کی نوک جڑی ہوتی ہے ۔ ڈھیلے وغیرہ توڑنے کے لئے لکڑی کے ایک ڈنڈے کا استعمال کیا جاتا ہے اور یہ کام اجتماعی مزدوری کے طور پر کیا جاتا ہے ۔ بعض اوقات بیل لکڑی کی ایک گیلی کو باندھ کر کھینچتے ہیں جب ہل چلانے والا گیلی پر کھڑا ہوتا ہے ۔ مگر قاعدے کے طور پر برف کا پانی

ان مٹی کے ڈھیلوں کو توڑنے کے لئے کافی سمجھا جاتا ہے۔ کشمیر کا پھاوڑا لکڑی کا بنا ہوا ہوتا ہے جس کا منہ تنگ ہوتا ہے جس کے سر پر لوہا پیوست ہوتا ہے۔ اس پھاوڑے کا استعمال کاشتکار گھاس میں ڈھیلوں کو توڑنے اور کھیتوں کو آبپاشی کی خاطر تیار کرنے کے لئے کرتے ہیں۔ مکئی اور کپاس کے لئے لوہے کا ایک بیلچہ گھاس پھوس نکالنے اور مٹی کو ڈھیلا کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ کشمیر میں یہی آلات کشاورزی ہیں۔ مگر عالمی آلات اوکھل اور موسل کا استعمال چونکہ چاول کوٹنے اور مکئی پیسنے کے لئے استعمال میں لایا جاتا ہے۔ اور ان کا ذکر لازمی ہے۔ اوکھل کھوکھلی لکڑی سے تیار کردہ ایک تلے سے تیار کردہ ہے۔ موسل ایک سخت ہلکی لکڑی کا بنا ہوا ہے۔ اس مقصد کے لئے سب سے سخت لکڑی ایک خاردار درخت سے حاصل ہوتی ہے۔ کئی دیہات میں چاول کو کوٹنے کے لئے گیلی کا ایک ہتھوڑا بروئے کار لایا جاتا ہے۔ جو ایک محور پر کام کرتا ہے۔ اس کو اٹھانے کے لئے آدمی کبھی ہتھوڑے کی طرف قدم بڑھاتا ہے تو کبھی پیچھے ہٹا لیتا ہے۔ چاول کی بھوسی تیار کرنے کے اس عمل میں بہت سارا چاول ٹوٹ جاتا ہے۔ میں نے کشمیر میں لکڑی سے تیار کردہ ایک چکی کو مروج کرنے کی کوشش کی ہے جو ویسٹ انڈیز میں استعمال ہونے والی چکی سے مطابقت رکھتی ہے اس سے بہت کم محنت صرف ہوتی ہے اور ڈنڈے موسل سے صرف ایک ہی مرتبہ کٹائی کرنا پڑتی ہے جب کہ اوکھل اور موسل میں تین مرتبہ چاول کا بھوسا نکالنا پڑتا ہے تب کہیں چاول کھانے کے قابل ہو سکتا ہے۔

زرعی سرگرمیاں

وادی میں زرعی سرگرمیوں کے اوقات احتیاط کے ساتھ متعین کئے گئے ہیں جو مسلمانوں کے یوم بہار نوروز کے کچھ عرصہ پہلے اور بعد میں ہوتے ہیں اور موسم خزاں کی ابتداء سے قبل میزان ہوتا ہے۔ اگر یہ مدت بڑھ جائے تو فصل کی ناکامی یقینی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس مدت کا حساب نہایت باریکی کے ساتھ لگایا جاتا ہے جو صحیح وقت فصل بولنے اور ہل چلانے کی باقاعدگی میں رخنہ انداز ہوتے ہیں۔ ان میں آبپاشی کا فقدان ہوتا ہے۔ اگر ان دنوں کے دوران کسی قدرتی یا دیگر وجہ جیسے برف کا تاخیر سے پگھلنا ہو تو عوام میں بہت غصہ پیدا ہو جاتا ہے۔ دوسرے اسباب میں چند بارسوخ لوگ اہلکاروں کی حکم عدولی کرتے ہوئے اپنے لالچی ارادوں کے تحت اپنے حصے سے زیادہ

پانی حاصل کر لیتے ہیں۔ اگر چہ آبپاشی کا فقدان عام اوقات میں میں ان سرگرمیوں میں تاخیر پیدا ہو سکتا ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی واقعہ رونما ہوا کہ کاشت کار کو جبری مزدوری کے لئے پکڑ لیا گیا اور وہ کھیت میں مناسب وقت پر ہل نہیں چلا سکتا۔ اگر چہ اس بات میں شک نہیں کہ چاول کے کھیتوں میں نوروز کے چالیس دن کے اندر ہل چلایا جانا چاہئے' وہاں پر کام ماہ جون کے وسط تک جاری رہتا ہے۔

جہاں تک کشمیر میں موسم خزاں کے فصل کی اہمیت کا تعلق ہے اور سال کی شروعات موسم بہار سے ہوتی ہے۔ چنانچہ میں زرعی سرگرمیوں کی تفصیلات کا بیان مارچ سے شروع کرتا ہوں۔ جس ماہ کے دوران موسم خزاں کی فصلوں کے لئے ہل چلانے کا کام شروع ہوتا ہے۔ مندرجہ کیلنڈر (2) سے ایک کاشت کار کے معمولات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

مارچ اور اپریل :	چاول کے لئے ہل چلانا اور کھاد ڈالنا، مکئی اور دیگر خزاں کی فصلوں کے لئے ہل چلانا۔
مئی اور جون :	چاول، مکئی اور خزاں کی دیگر فصلوں کی بوائی۔
جوان اور جولائی :	پنیری لگانا
جولائی اور اگست :	چاول اور کپاس سے گھاس پھوس کی تلافی کرنا اور لہسن کی کٹائی کرنا۔
اگست اور ستمبر :	کپاس اُکھاڑنے کی شروعات
ستمبر اور اکتوبر :	چاول اور دیگر خزاں کے فصلوں کی کٹائی۔ اگر بارش بروقت ہو تو گندم اور جو کے لئے ہل چلانا اور گندم، جو اور تلہن کی بوائی، بھیڑوں کے لئے بید کاٹنا۔
اکتوبر اور نومبر :	اکتوبر کے پہلے نصف میں چاول کاٹنا۔ گندم اور جو کے لئے ہل چلانا۔
نومبر اور دسمبر :	گندم اور جو کیلئے ہل چلانا۔
دسمبر اور جنوری :	چاول، مکئی اور خزاں کی دوسری فصلوں کی گہائی۔

جنوری اور فروری : بھیڑوں اور مویشیوں کی دیکھ بھال کرنا۔

فروری اور مارچ : بھیڑوں اور مویشیوں کی دیکھ بھال کرنا۔

مارچ کے مہینے میں چاول کے وہ کھیت جہاں پچھلی فصل کی کٹائی ہوئی تھی، جوں کے توں رہتے ہیں۔ یہ کھیت سخت ہوتے ہیں۔ اس مٹی پر برف اور پالے کا اثر ہوتا ہے چند صورتوں میں جب برفباری نہیں ہوتی تو بیلوں کے لئے ہل کھینچنا اور مٹی کاٹنا محال سا ہو جاتا ہے جو طویل سردی کے باعث لاغر اور کمزور ہو جاتے ہیں۔ اگر بارشیں نہ ہوں تو لازمی طور پر پانی دینا پڑتا ہے اور اس کے بعد ہل چلانے کا کام شروع کیا جاتا ہے۔ چند دیہات میں زمین اس قدر کم ہوتی ہے کہ گیلی زمین پر زور لگا کر ہل چلانا پڑتا ہے اور اُن کھیتوں کی نسبت پیداوار ہمیشہ کمزور ہوتی ہے جہاں خشک حالت میں ہل چلایا جاتا ہے۔ گاؤں کا تمام تر کوڑا کرکٹ اور گھر میں جمع کھاد کو عورتیں اٹھا کر کھیتوں میں لے آتی ہیں اور ہل چلایا جاتا ہے جہاں سے آبپاشی کی نالی گذرتی ہے۔ لہٰذا کھیتوں میں جو کھاد پہنچتی ہے وہ مایہ دار کھاد کی صورت میں ہوتی ہے۔ بعض اوقات کھاد کے ڈھیر کھیتوں کے اندر ہی لگا دیئے جاتے ہیں جب کہ ان ڈھیروں پر پانی کا چھڑکاؤ ہاتھوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ بعدازاں اپریل میں جب موسم کھل جاتا ہے ندی نالوں اور آبپاشی کو ہلوں کے کناروں سے گھاس کے گچھے کاٹے جاتے ہیں اور نم کھیتوں پر بچھا دیئے جاتے ہیں۔ جب چار مرتبہ ہل چلا لیا جاتا ہے، مٹی کے ڈھیلے ٹوٹ جاتے ہیں اور زمین میں نمی ہوتی ہے تو ماہ اپریل میں بوائی کا کام شروع ہو سکتا ہے۔ چاول کے بیج کو گہائی کے وقت نہایت احتیاط کے ساتھ منتخب کر کے گھاس کی تھیلیوں میں ذخیرہ کر کے رکھا ہوتا ہے۔ اس کی چھانٹ کر کے دوبارہ جانچ کی جاتی ہے۔ اس کے بعد دوبارہ اسے گھاس کی تھیلی میں ڈال دیا جاتا ہے اور تب تک پانی میں ڈبو کر رکھا جاتا ہے جب تک جراثیم پیدا ہونے کا عمل شروع نہ ہو جائے۔ بعض اوقات اس بیج کو مٹی کے برتنوں میں رکھا جاتا ہے اور ان سے پانی گذرنے دیا جاتا ہے۔ چاول کی فصل 7,000 فٹ کی بلندی تک پیدا ہو سکتی ہے۔ زیریں سطح پر واقع دیہات کی نسبت بلند سطح پر واقع دیہات میں چاول کی جلدی بوائی میں آسانی رہتی ہے کیونکہ سردی کا موسم وہاں جلدی شروع ہو جاتا ہے۔ لہٰذا وہاں برفباری سے پہلے فصل کی کٹائی کرنا لازمی ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ نچلی سطح پر واقع چند دیہات میں جہاں معمول سے

پہلے چاول بونے کا رواج ہے وہاں پیداوار بھی کافی ہوتی ہے۔ مکئی اور خزاں کے باجرہ کے لئے ہل اس قدر احتیاط سے نہیں چلانا پڑتا۔ بس دو یا تین مرتبہ ہل چلانے کو کافی سمجھا جاتا ہے۔ تخم ریزی سے قبل بعض اوقات یہاں پر پانی دیا جاتا ہے لیکن زمین میں کوئی کھاد نہیں ڈالی جاتی۔ صرف کپاس کی فصل کے لئے راکھ اور بیج کی ملاوٹ کے لئے تیار کردہ کھاد استعمال کی جاتی ہے۔ تمام کشمیری اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ جس قدر زیادہ تعداد میں ہل چلایا جائے گا اسی قدر زیادہ مقدار میں کپاس کی فصل پیدا ہوگی مگر اراضیات نہایت وسیع ہیں جب کہ مویشی اور لاغر اور کمزور ہیں۔ چنانچہ بیجوں کے انتخاب کے معاملے میں بھاری احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ احتیاط کے طور پر فصل کی کٹائی کے بعد بیج کو گھاس کی بوریوں میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اشد ضرورت کے وقت ہی کشمیری ذخیرہ کئے ہوئے بیج کو خوراک کے لئے کھولتا ہے اور کافی برسوں سے حکومت کی طرف سے بیج حاصل کرنے کا یہ ایک خوبصورت بہانہ ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ بیج کا شتکار کے گھر میں موجود ہوتا ہے۔

جون اور جولائی کے مہینوں میں جو اور گندم کو کاٹ کر اس کی گہائی ہوتی ہے۔ بالیوں کو مویشی پاؤں سے کچل ڈالتے ہیں یا بعض اوقات چھڑی سے پٹائی کی جاتی ہے اور جہاں پر ہوا نہیں چلتی وہاں الگ کی ہوئی فصل کے ارد گرد دوبارہ کمبل لپیٹ دیا جاتا ہے۔ موسم بہار کی فصلوں کے لئے کچھ بھی کافی ہے کشمیری عام طور پر اسے قرعہ تصور کرتے ہیں اور عام طور پر وہ اس معاملے میں اپنی بازی ہار جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی چاول کی نلائی کی اصلی محنت کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کو خوشابہ کہتے ہیں۔ جس کا میرے پاس انگریزی متبادل نہیں ہے۔ یہ محض نلائی کا عمل نہیں ہے یہ کام پانی اور دلدل کے درمیان کھڑے ہو کر دھوپ کی تمازت میں اس طرح جھک کر سرانجام دیا جاتا ہے جیسے کوئی نانبائی آٹے پر جھکا ہوا ہوتا ہے۔ اس چاول کو پودوں کے اپنے مناسب مقامات پر رکھا جاتا ہے اور سبز پنیری کے ارد گرد نرم دلدل کو نہایت احتیاط کے ساتھ بونا ہوتا ہے۔ کوئی اناڑی شخص اس کام کو سرانجام نہیں دے سکتا کیونکہ صرف ماہر شخص ہی نقلی گھاس کی تلاش کر سکتا ہے جو چاول کا دانہ جیسے ہی دکھائی دیتے ہیں اور خوشابہ کا کام نوعمری میں ہی سیکھا جانا چاہئے۔ ہنڈ ولڑکے پڑھنے کے لئے سکول جاتے ہیں جبکہ مسلمان لڑکے اپنے والدین کے ساتھ شالی کے کھیتوں میں کام

کرتے ہیں۔ وہ خوشابہ سیکھ جاتے ہیں اور ہندو کے چاول کے کھیت پر محض سرسری نظر ڈال کر ہی اس کی حالت کی بابت بتا سکتے ہیں۔خوشابہ بہترین طور ہاتھوں سے سرانجام دیا جاسکتا ہے۔مگر اس کام کو پاؤں کی لات سے انجام دینا چاہئے یا اس انداز سے کرنا چاہئے جیسے کہ ایک مویشی دلدل کے کھیتوں میں اپنے پاؤں چلاتا ہے (گھپن ننبدہ)۔اگر چہ کشمیری جانتا ہے کہ اس کا مؤخرالذکر طریقہ حقیقی خوشابہ کا ایک سست نعم البدل ہے وہ اس بات سے تسلی دیتے ہیں کہ مویشیوں کے پاؤں میں سم ہوتے ہیں جو چاول کے جواں سال پودوں پر آجاتے ہیں۔بعض اوقات جب چاول کا پودا دوفٹ بلند ہوتا ہے تمام فصل پر ہل چلایا جاتا ہے (سیلے) جب مرد چاول کے کھیتوں پر سخت محنت کر رہے ہوتے ہیں تو عورتیں مکئی اور کپاس کے کھیتوں میں ہاتھوں سے کھر پا چلا رہی ہوتی ہیں۔ نقلی مکئی نکالتی ہیں اور جڑوں کے ارد گرد مٹی کو ڈھیلا کرتی ہیں۔جب تک دھان کی فصل کا شگوفہ پیدا ہوتا ہے اور دانہ صورت اختیار کرنے لگتا ہے۔عمل ہر روز جاری رہتا ہے۔اس کے بعد کھیتوں سے پانی گذارا جاتا ہے اور جو بالیوں کو پھلا دیتا ہے۔اس کے فوراً بعد درانتی چلائی جاتی ہیں اور سنہری رنگ کا چاول نم زمین پر آگرتا ہے۔عام طور پر چاول آخری بار پانی دینے تک کھڑا رہتا ہے۔اس کے بعد ہل نہیں چلایا جاتا۔اس کے بعد تلہن کی فصل حاصل کی جاتی ہے۔موسم خزاں کی فصل کٹائی شروع ہونے سے قبل پہلے نصف میں بارش ہوسکتی ہے۔یہ بارش نہایت مفید ہوتی ہے۔اس سے چاول کی فصل میں بہتری پیدا ہوجاتی ہے اور اس سے کاشت کار موسم بہار کی فصل کے لئے ہل چلانے کے قابل ہوجاتا ہے۔اس قسم کی بارش کو کامبر کہا جاتا ہے۔اور جب یہ بارشیں بروقت ہوتی ہیں تو خوشی منائی جاتی ہے۔اگر ستمبر سے پہلے بارش ہوجاتی ہے تو اس رقبے میں ہل چلایا جائے گا اور اس میں تلہن کی کاشت کی جاتی ہے۔گندم اور جو کی فصل کی بھاری اہمیت ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ فصل ایسے وقت میں پیدا کی جاتی ہے جب کاشتکار اور اس کے مویشیوں کو قدرے فرصت نصیب ہوتی ہے۔اس کے لئے خوشابہ ختم ہو چکا ہوتا ہے اور فصل کی کٹائی ابھی شروع نہیں ہوئی ہوتی ہے۔مگر جب ایک مرتبہ کٹائی شروع ہوجاتی ہے تو کاشتکار کے پاس فصل کی کٹائی اور اس کو ڈھونے کے سوائے بہت کم وقت ملتا ہے۔اس کے دل میں یہی اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بارش ہو یا برفباری ہوجائے۔چونکہ وادی میں جھیل ولر کے اردگرد سپاٹ میدان کے سوائے کہیں

ٹھیلے موجود نہیں ہیں۔ایک قدیم زمانے کی ریڑھی کا استعمال کیا جاتا ہے۔کشمیری اس ریڑھی کو کھینچنے کے لئے بیلوں کا استعمال نہیں کریں گے چنانچہ اس ریڑھی کو رفتہ رفتہ فرصت کے وقت کھینچ کر گہائی کے فرش تک لے جایا جاتا ہے۔جب چاول کے انبار بالکل خشک ہو جاتے ہیں تو گہائی کا کام شروع ہوتا ہے۔چاول کے پودوں کا ایک گچھا ہاتھ میں لے کر کاشتکار اس کو لکڑی کی ایک گیلی پر شکتا ہے اور چاول کو چھلکے سے الگ کر دیتا ہے۔چاول کے اس چھلکے کا نہایت احتیاط کے ساتھ ذخیرہ کیا جاتا ہے۔کیونکہ یہ ایک بہترین چارہ ہوتا ہے اور سبھی چھلکوں سے بہترین چھلکا ہوتا ہے۔ گہائی کا کام تمام تر موسم سرما کے دوران جاری رہتا ہے۔جب بارش اور برفباری ہوتی ہے تو یہ سرگرمیاں بند ہو کر رہ جاتی ہیں اور گہائی کا یہ سلسلہ مارچ تک چلتا رہتا ہے۔عین شمال مغرب کے چند دیہات میں جہاں چاول کے پودے کی اونچائی کافی زیادہ ہوتی ہے، چاول کو بالیوں سے الگ کرنے کا کام جانوروں سے لیا جاتا ہے۔جب موسم سازگار ہوتا ہے تو اکتوبر سے دسمبر تک کاشتکار خشک زمین پر گندم اور جو کی فصل بونے کے لئے ہل چلاتا ہے۔مگر دسمبر کے آخر تک ہل چلانے کا کام ختم ہو جانا چاہئے۔اس کے بعد کشمیری چاول کی گہائی اور کٹائی میں مصروف ہو جاتے ہیں۔اس کے ساتھ وہ بھیڑ اور مویشیوں کی دیکھ بھال کا گھریلو کام کرتے ہیں جن میں کمبل بُننا بھی شامل ہے۔ایک کشمیری کو موسم سرما کے وسط میں سڑانڈ بھرے اپنے گھر سے باہر نکلنے کے لئے آمادہ کرنا مشکل ہوتا۔گندم اور جو کے کھیتوں میں ہل چلانے کا کام بھی شاذ و نادر ہی سرانجام ہوتا ہے۔میرے اندازے کے مطابق گندم کے کھیت میں تین بار ہل چلایا جاتا ہے جب کہ جو کے معاملے میں دوبار ہل چلانے کو سوافق اقدام کیا جاتا ہے۔نلائی اور کھاد ڈالنے کا کام میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا جاتا چنانچہ گندم اور جو کی کھڑی فصلوں کو دیکھ کر ایک پنجابی کسان دنگ ہو کر رہ جائے گا۔کھیتوں میں بھاری مقدار میں گھاس ہوتی ہے اور اگر کوئی فصل واقعی موجود ہو تو اسے معجزہ ہی سمجھا جانا چاہئے۔دو برس تک جو اور گندم کی فصل کے بعد زمین تباہ ہو کر رہ جائے گی اور کشمیری موسم بہار کی فصل کے بعد خزاں کی فصل پیدا کر کے دانائی کا کام کرتے ہیں۔مجھے اُمید ہے کہ ایک ایسا دن آئے گا جب کشمیری جو اور گندم کی فصلوں کی جانب زیادہ توجہ دیں گے مگر اس معاملے میں چند باتیں سدراہ ہیں جن کے سبب وادی میں دونوں میں سے ایک بھی فصل بھاری مقدار میں نہیں

اُگائی جاسکتی۔ایک تو بارش بہت کم اور غیر یقینی ہے۔ میں اس بات کو سمجھتا ہوں کہ اگر موسم بہار کے وقت آبپاشی کی کوشش کی جائے تو پانی نہایت ٹھنڈا ہوگا جس سے پودوں کی نشو ونما ممکن نہیں ہو سکے گی۔ میں نے کشمیر میں موسم بہار کی پانچ فصلوں کا جائزہ لیا ہے۔ان میں سے پہلی فصل موسم بہار کی شروعات کے دوران بھاری بارشوں کے سبب تباہ ہوگئی۔اس کے فوراً بعد بہت زیادہ گرمی اور خشکی پیدا ہوگئی۔ دوسری فصل کے دوران بارش کا قطعی فقدان تھا جب کہ تیسری فصل برفباری کی وجہ سے تباہ ہوکر رہ گئی جو بہار کے موسم کے دوران بھی کافی دیر تک جاری رہی۔ جب برف پگھلی تو مٹی کے ڈلے بن گئے اور گندم اور جو کے جواں پودے سکڑ کر تباہ ہو گئے۔چوتھی فصل اس لئے تباہ ہوگئی کہ نہ تو موسم سرما اور نہ ہی بہار کے دوران بارشیں ہوئیں اور آخری فصل کے تباہ ہونے کی وجہ تاخیر سے برفباری اور موسم بہار کے دوران بارشوں کی بہتات تھی۔ کشمیری خوراک کے طور پر جو یا گندم کو اہم قرار نہیں دیتے۔اگر اس کاشت میں بہتری پیدا ہوئی بھی تو یہ محض تجارتی اور کاروباری مقاصد کے لئے ہوگی۔

کشمیر کی اہم غذا ہر طرح سے چاول ہے اور کاشت کار اس کی فصل کو پیدا کرنے میں اپنی تمام تر توجہ صرف کر دیتا ہے۔ چاول کے لئے وہ اپنے کھیتوں کی کیاریاں تیار کرے گا۔آبپاشی نہروں کی کھدائی پر اپنی زیادہ تر قوت صرف کر دے گا اور ایک مویشی کی مانند گہرے دلدل میں گھوم کر اپنے کھیتوں کی نگہداشت کرتا رہے گا۔ زیریں دیہات کی دلدلی زمین میں ایک کیڑا ہوتا ہے جو جلد میں سوزش پیدا کرتا ہے۔اس سے حفاظت کی خاطر وہ اپنے بازوؤں اور ٹانگوں پر صنوبر کے تیل کی مالش کرتا ہے۔اپنے سیاہ بازوؤں اور ٹانگوں پر بھورے رنگ کے دلدل سے لت پت وہ ایک عجیب وغریب صورت والا دکھائی دیتا ہے۔کشمیر کی مٹی سامدار ہوتی ہے۔ چنانچہ فصل کی بوائی کے وقت سے لے کر کٹائی تک پانی کا بہاؤ جاری رہنا چاہئے۔اگر مٹی سخت ہوکر ڈلوں کی صورت اختیار کر لے تو ڈنٹھلوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ پودا متاثر ہوتا ہے اور خوشابہ کا کام ناممکن ہوکر رہ جاتا ہے۔اگر زیادہ سے زیادہ سات دنوں تک کھیتوں کو خشک چھوڑ دیا جائے تو ان کو خطرے سے بچانے کے لیے یہ لازمی ہے کہ پانی کی صورت حال پر نظر رکھنے کے لئے کاشت کار ہمیشہ موجود رہے۔اس کے بعد گھاس پھوس کی پیداوار بھی کافی ہوتی ہے۔اگر چاول کی پیداوار بڑھ جائے تو

گھاس پھوس نکالنا نہایت مشکل ہو جاتا ہے اور چاول کو نقصان پہنچتا ہے کیونکہ ایک ماہر کے بغیر کوئی بھی گھاس کو نکال نہیں سکتا۔ کیونکہ گھاس اور چاول میں تمیز کرنا محال ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کام میں پرانا چلن اپنایا جاتا ہے جس کے مطابق چاول کے پودے کی نشو ونما کے دوران آدمیوں کو جبری مزدوری کے لئے لے جایا جاتا تھا۔ اس سے اچھی پیداوار پر بھاری اثر پڑا تھا۔ کیونکہ یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ چار آنے کی مزدوری کاشت کاروں کو اپنی مرضی سے راغب نہیں کر سکتی کہ وہ اپنے کھیتوں کو چھوڑ دیں۔ جبکہ ایک دو دن کی غیر حاضری سے چاول کی فصل کو بھاری زک پہنچتی ہے۔ کشمیر میں جتنی زیادہ مقدار میں چاول کی کاشت دیکھتا ہوں اتنا ہی اس بات کا قائل ہو جاتا ہوں کو چھوٹی ارضیات سے مراد غلّے کی زیادہ پیداوار ہے۔ میری رائے میں ایک فرد زیادہ سے زیادہ دو ایکٹر زمین کی کاشت دو بیلوں کی مدد سے کر سکتا ہے۔ کاشت کے دو طریقے رائج ہیں۔ پہلے سسٹم کے تحت چاول کو بو کر اس کی نشر کی جاتی ہے۔ دوسرے سسٹم میں چاول کو ایک نہالی میں اُگا کر بعد میں اس کی پنیری لگائی جاتی ہے۔ میں نے ان دونوں طریقوں کے فائدوں کی بابت بار بار سوال کیا ہے۔ میں نے اس بارے میں اختلاف رائے پایا ہے۔ میرے سوال کا جواب یہ ہے کہ نشریاتی چلن سے فی ایکڑ بہترین پیداوار حاصل ہوتی ہے۔ نشریاتی سسٹم کی کامیابی کے لئے چاول کے کھیتوں کا کافی وسیع ہونا لازی ہے اور پانی بھی وقت پر حاصل ہونا چاہئے اور یہ فراہمی بھی زیادہ سے زیادہ ہونی لازی ہے۔ چھڑکاؤ یا نشریاتی نظام میں نہالی سسٹم کی نسبت زیادہ محنت درکار ہوتی ہے۔ مؤخر الذکر کے لئے دو مرتبہ خوشابہ کافی ہوتا ہے۔ جب کہ نشریاتی بوائی کے لئے چار مرتبہ خوشابہ لازی ہے۔ اگر زمین اچھی ہو اور آبپاشی کی فراوانی ہو تو کاشت کے لیے نشریاتی طریقہ کا انتخاب کرے گا مگر بعض حالات میں وہ نہالی کا رواج اپنائے گا۔ اگر پانی کی روانی میں تاخیر واقع ہو اور پودے کو نہالی قطعات میں زندہ رکھا جائے تو بوائی کے چالیس دن تک پنیری نہیں لگائی جائے گی۔

پانی میں رہنے سے چالیس دن کی فراغت کے دوران زمین کو دھوپ اور ہوا کا فائدہ حاصل ہوتا ہے اور یہی وہ وقت ہوتا ہے جب کشمیر کی دیہات سے بھیڑیں پہاڑوں پر واقع کا ہچرائی قطعات کی جانب نقل وحرکت کرتی ہیں اور اس سے ان زمین میں زرخیزی پیدا ہو جاتی ہے جو نہالی

کے چاول کے انتظار میں ہوتی ہیں۔گھاس پیدا ہو جانے کے سبب بھیڑوں کو خوراک حاصل ہوتی ہے۔اوران کی طاقت میں برابر اضافہ ہوتا ہے چنانچہ ایک ماہ قبل کی نسبت ان کی کھاد زیادہ طاقت ور ہوتی ہے۔جب نشریاتی اراضی میں چاول کے لئے پانی کا سیلاب سا آجاتا ہے تو جس شخص کے پاس کاشت کے لئے خشک رقبہ دستیاب ہے وہ نہالی سسٹم کا انتخاب کریگا۔اس سے اُسے فراغت کا وقت مل جاتا ہے۔ان دونوں طریقوں کے اپنے اپنے فائدے ہیں۔نشریاتی نظام سے زیادہ پیداوار حاصل ہوتی ہے۔اس میں زیادہ محنت درکار ہوتی ہے اوراکثر ماہ اپریل کے دوران سرد موسم میں اس میں رخنہ پیدا ہوتا ہے۔نہالی سسٹم میں کم محنت درکار ہوتی ہے اس میں گھاس پھوس سے زمین بھی صاف ہو جاتی ہے اور نشریاتی نظام کی نسبت زیادہ نرم چاول پیدا ہوتا ہے۔اس پر بھی کشمیری اپنا کام خود سمجھتے ہیں اور نہالی سسٹم پر وہ زیادہ انحصار کرتے ہیں۔

جس طرح چاول کی کاشت کے دو طریقے ہیں اسی طرح زمین تیار کرنے کے بھی دو طریقے ہیں۔ایک طریقہ کو تاؤ کہتے ہیں اور دوسرے کو کینالو سے موسوم کیا جاتا ہے۔تاؤ کاشت کے معاملے میں خشک زمین پر ہل چلایا جاتا ہے اور جب ڈھیلے نمی سے بالکل خالی ہوتے ہیں تو رات کے وقت آگ پر رکھنے سے ان کا وزن کم نہیں ہوتا۔جب زمین آبی اور نیم دلدلی ہوتی ہے تو کینالو کی پیداوار بعض اوقات تاؤ کے مساوی ہو جاتی ہے۔مگر قاعدے کے مطابق تاؤ سسٹم سے بہترین نتائج حاصل ہوتے ہیں۔جبکہ کینالو کاشت کے لئے بھاری محنت درکار ہوتی ہے۔نچلی سطح کی زمینوں میں کسانوں کو جبری طور پُرنم زمین پر ہل چلانا پڑتا ہے مگر چند دوسرے حالات ہوتے ہیں جن کا تقاضہ کینالو سسٹم ہے۔جب پہاڑوں پر برفباری ہوتی ہے تو اس کا واضح اشارہ یہ ہے کہ پانی کی قلت درپیش ہوتی ہے چنانچہ کینالو اپنانا ہی واجب ہوگا کیونکہ چشموں کا پانی اگرچہ وافر ہوتا ہے اور زمین کو اس قدر خشک کیا جاتا ہے تاکہ یہ موسم گرما کے دوران پانی کی قلت کے دوران اپنا گزارہ کر سکے۔دوسری جانب تاؤ سسٹم میں وافر پانی درکار رہتا ہے۔کچھ مٹی گرم اور ترش ہوتی ہے جہاں باری باری دونوں چلن اپنانا پڑتے ہیں اور دو برسوں کے بعد تاؤ زمین کو بار بار گیلا کرنا پڑتا ہے اور نمی کی حالت میں اس پر ہل چلانا لازمی ہے۔

کشمیر میں چاول کی کئی اقسام ہیں۔میں نے ایک تحصیل میں چاول کی ترپن اقسام پائیں۔

موٹے طور پر ان کو دو اقسام سفید اور سرخ میں تقسیم جا سکتا ہے۔ خوراک کے طور پر سفید چاول کی زیادہ قدر و منزلت ہوتی ہے اور سفید چاول کی بہترین اقسام باسمتی اور کیناں ہیں۔ یہ اقسام نہایت جلدی سے پھوٹتی ہیں اور دوسرے چاولوں کی نسبت زیادہ سرعت سے پکتی ہے مگر یہ نہایت نازک قسم کے پودے ہوتے ہیں اور سرد ہواؤں کی تاب نہیں لا سکتے۔ ان کی فصل بہت کم ہوتی ہے اور ان کی پھوسی نہایت احتیاط کے ساتھ تیار کی جاتی ہے۔ چند دیہات مخصوص قسم کے چاولوں کے لئے کافی مشہور ہوتے ہیں۔ جھیل ڈل پر تیل بل سفید اور نرم چاول کے لئے مشہور ہے اور قصبہ لال ازن، سلورہ گدھ، کرہیوم جبکہ ایک کشمیری خوش خور کے مندرجہ ذیل اشعار اسلام آباد کے نزدیک ٹیپور کو اچھے چاول کے گہوارے کے طور پر منتخب کرتے ہیں۔

مونگ از خانپور	خانپور سے مونگ
روغن از لالی پور	لالی پور سے گھی
ہاکھ از پانپور	پانپور سے ساگ سبزی
شیر از ہیر پورہ	ہیر پور سے دودھ
برنج از ٹیپور	ٹیپُو رو سے چاول
بَرہ از نندہ پور	نند پور سے بھیڑ
دَچھ از ریپور	ریپور سے انگور

ٹیپُور کی شہرت اب ختم ہو چکی ہے اور یہ ایک افسوسناک امر ہے کہ خوش خور افسروں کی توجہ سے بچنے کے لئے کشمیریوں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور سرینگر کے نفاست پسند افسروں کی فرمائش کے روبرو سر تسلیم خم ہونے کی بجائے چاول، خربوزوں اور پھلوں کے منتخبہ درختوں کو صریحاً ملک بدر کیا گیا۔

سفید چاول کی خوراک کے لحاظ سے کافی قدر و منزلت ہے اور کاشت کار کی نظروں سے سرخ چاول سے یہ کم مقبول ہے۔ اول تو یہ چاول کی نہایت نازک قسم ہے اور دوسری اقسام کے مقابلے میں درجہ حرارت کی تبدیلی سے اسے زیادہ زک پہنچی ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ چاول کی قسم زمین کو بہت جلد کھوکھلی کر دیتی ہے۔ اگرچہ یہ بات مشکوک ہے مگر سرخ چاول کی نسبت اس کی

پیداوار بھی کم ہوتی ہے۔ کشمیر کی انتظامیہ کے تحت حالت یہ ہے کہ قیمتوں کا اب تک تو کوئی وجود نہیں۔حکومت سفید اور سرخ چاول کی مجموعی قیمت ادا کرتی ہے۔کاشت کار کو بہترین اقسام پیدا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے اور اس کا صرف ایک ہی منشاء ہے کہ کوئی بھی پیداوار ہو اس کی مقدار کافی زیادہ بڑھائی جائے۔اسکے علاوہ سفید ساخت کی نسبت سرخ ساخت کے چاول بلند تر مقامات پر اُگائے جاسکتے ہیں اور چند ایسے مقامات جہاں فصلوں کو جنگلی جانوروں کا خطرہ لاحق رہتا ہے وہاں ریچھ اور سور نقصاندہ ہوتے ہیں۔سرخ چاول کو ہمیشہ اُس مقام پر نہیں اُگایا جاتا ہے جہاں پہاڑوں کا پانی پہلے پہل کھیتوں میں داخل ہوتا ہے کیونکہ تمام تر چاول آبپاشی کی ٹھنڈک کو برداشت نہیں کرسکتا۔جیسے ہی کوئی شخص وادی میں اونچائی پر چڑھتا ہے تو چاول کی قسم نمودار ہوجاتی ہے۔یہ پست قد مگر مضبوط پودا ہوتا ہے جس سے ایک سخت قسم کا دانہ پیدا ہوتا ہے جو شریں ذائقہ اور مقوی نوعیت کا ہوتا ہے۔مگر شہر کے لوگ اس چاول کی قدر نہیں کرتے۔پہلی نظر میں یہ بات حیرت انگیز معلوم ہوگی کہ چاول کی لاتعداد اقسام کی وہ کس انداز سے شناخت کرلیتے ہیں۔وہ ان اقسام کو بیج، پنیری، پودے کے مرحلوں پر ہی پہچان لیتے ہیں۔یہاں تک کہ پودے کے مرحلے پر پہنچنے تک ایک اجنبی بھی ان پودوں کی شناخت کرلیتا ہے۔سبز رنگ کے سایوں سے گذرتی ہوئی ہلکے سبز رنگ کی گھاس بعد ازاں نرگس کے گہرے کانسی مایل رنگ کی ہوجاتی ہے۔اور جب چاولوں کے شگوفوں کے پھوٹتے ہیں تو یہ فنون لطیفہ سے لبریز رنگوں کا ایک شاندار امتزاج معلوم ہوتے ہیں۔کشمیری کے لئے یہ بات ایک نیک فال ہے کہ اپنی پسند کی مختلف اقسام کی شناخت میں قدرت اس کی مددگار ہوتی ہے۔ورنہ نلائی کے موسم میں جعلی اور غلط قسم کے جو پودے رونما ہوجاتے ہیں۔ان کی تلاش کرنا اس کے لئے محال ہے۔ایک کاشت کار کو جس نقال سے واسطہ پڑتا ہے وہ کرے یا خود بخود اُگا ہوا چاول ہے۔اگر اسے رہنے دیا جاتا ہے یا نلائی کرنے والوں کی نظروں سے بچ جاتا ہے تو کرے کی باعث سیاہی مائل دانہ پیدا ہوگا اور جب پودا پک کر تیار ہوتا ہے تو یہ نالی سے گر جاتا ہے۔یہ دانا احیائے نو حاصل کرکے کاشت کار کی شناختی صلاحیتوں کے لئے زحمت پیدا کردے گا۔چاول اور کرے میں تمیز کرنے کے لئے یہ رواج ہے کہ ہر برس اُگائے جانے والے چاول کی اقسام میں تبدیلی لائی جائے۔سفید چاول کے بعد سرخ چاول اُگایا

جاسکتا ہے یا سبز گھاس کے بعد سیاہی مائل قسم کا گھاس پیدا ہوسکتا ہے۔ بعض اوقات کاشتکار ایک ہی کھیت میں سرخ اور سفید چاول پیدا نہیں کرتے اس کا کہنا ہے کہ وہ اس دوڑ میں رہتے ہیں کہ فصل کی کٹائی کتنی جلد حاصل ہوسکتی ہے۔ اس کے بعد کھیتوں میں اہم درانداز ہامہ ہوتا ہے جسے ماہرین نباتات جنگلی چاول خیال کرتے ہیں۔ کرے کی مانند اور چاول کے برعکس یہ بھی اپنے بیج چھوڑ دیتا کرتا ہے۔ مگر کرے کی نسبت اسے زیادہ آسانی سے پہچانا جاسکتا ہے۔ ہامہ چاول کو لوگ کھاتے بھی ہیں اور ہندو مندروں میں چڑھاوے کے طور پر بھی پیش کرتے ہیں مگر جب ایک کاشتکار اپنے کھیت کو صاف کرنے کی خاطر ہر اقدام کر لیتا ہے اور اس کا چاول مضبوط اور دلکش ہوتا ہے تو اس کے سامنے مزید خطرات درپیش ہوتے ہیں۔ جب راتیں گرم ہو جاتی ہیں۔ جنوب اور جنوب مغرب کے پہاڑوں میں شام کے وقت روشنیاں چمکتی ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ چاول کا پودا اپنی طاقت کھو رہا ہے اور بالیاں مرجھا کر سفید ہو جاتی ہیں۔ اس وقت کاشتکار کو معلوم ہوتا ہے کہ رَے وارد ہوچکی ہے اور فصل تباہ ہوچکی ہے۔ کئی مرتبہ وہ کام میں جٹ جاتا ہے اور رَے سے متاثرہ چاول کو کاٹ پھینکتا ہے کیونکہ اس کا یقین ہے کہ رَے ایک متعدی بیماری ہے۔ وہ کسی بزرگ شخص سے تعویذ بھی خریدے گا اور چاول میں ایک ڈنڈا کھڑا کر کے رکھ دے گا۔ اس کے بعد وہ تمام کھیت پر راکھ بکھیر دے گا۔ رے کے انسداد کے لئے جن دیگر ترکیبوں کو کام میں لایا جاتا ہے ان میں چاول کے کھیتوں میں سفیدے کی جادوئی چھڑیاں نصب کرنا شامل ہوتا ہے۔ نیز اگر رے سے متاثرہ کھیتوں میں کسی بیوہ کا گذر ہو جائے تو باور کیا جاتا ہے کہ رے کو ٹالا جاسکتا ہے۔ رے کی دو اقسام ہوتی ہیں۔ پہلی قسم وہ ہوتی ہے جہاں ڈنڈی اور بالیاں متاثر ہوتی ہیں۔ اس کو بل رے سے موسوم کیا گیا ہے۔ دوسری قسم کی بیماری میں حملہ جڑوں پر ہوتا ہے اور پودہ اوپر کی جانب مرجھا جاتا ہے اس کو پیخ کہتے ہیں۔ مکئی بھی رئے میں مبتلا ہوسکتی ہے۔ خاص طور پر جب دیہات میں حبس پیدا ہو جائے اور ہواؤں کا راستہ بند ہو جائے۔ میں نے رئے میں مبتلا فصلوں کے نمونے کو کلکتہ بھیجے مگر سبزیوں کو لگنے والا کوئی کیڑا نہیں ملا۔ بالیوں میں کھوکھلا بھوسا اور خاکی بچہ دانی پائی گئی جہاں کبھی تخم ریزی کا عمل واقع نہ ہوا ہو۔ کلکتہ میں یہ باور کیا گیا کہ رئے محض نامساعد موسمی حالات کے سبب شگوفوں کے موسم میں رونما ہوتی ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ زیریں سطح پر واقع

اراضیات میں روشنی نہیں پہنچ پاتی اس سے زمین عام زرخیزی کی نسبت قدرتی طاقت سے محروم ہوجاتی ہے۔شاید یہ بات ضرورت نہ ہو کہ ہرسال جو زمین کھاد فراہم کرتی ہے اس کو کھاد دی جائے۔کاشت کار کو اس بات کی احتیاط رکھنا ہوگی کہ کھاد زیادہ مقدار میں نہ دی جائے اور جب چاول کے کھیتوں سے بھیڑیں گذرتی ہوتی ہیں تو یہ بات ضروری ہے کہ بھیڑوں کی نقل وحرکت کو جاری رکھا جائے۔اگر زمین زیادہ زرخیز ہو تو عین ممکن ہے کہ چاول پر رئے کا حملہ ہوجائے۔ چاول کی اچھی فصل کی خاطر یہ ضروری ہے کہ دنوں کے دوران دھوپ ہو اور راتیں سرد ہوں۔اگر راتیں گرم اور حبس شدہ ہوں تو یہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ رئے شروع ہوچکی ہے۔اگرچہ سرد یعنی ٹھنڈی راتیں سازگار ہوتی ہیں مگر شدید سردی بھی گرمی کی مانند نقصاندہ ہوتی ہے۔کشمیر کو چاروں طرف سے پہاڑوں نے گھیر رکھا ہے اور اگر پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف جم جاتی ہے تو وادی بھر میں درجۂ حرارت جلدی کم ہوجاتا ہے۔تمام چوٹیوں سے ایک سرد ہوا چلتی ہے اور جو دانہ شکل وصورت اختیار کر رہا ہوتا ہے وہ ٹھنڈا ہوکر جرمرا جاتا ہے اس کہ ہندرو کہا جاتا ہے۔چنانچہ چاول کو کاٹ کر گھوڑوں کو چارے کے طور پر دیا جاتا ہے۔ہندرو کی ایک شدید صورت کو بعض اوقات دوہن کہا جاتا ہے۔جب چاول کی کٹائی ہو رہی ہوتی ہے تو کم بلند پہاڑیوں پر برفباری ہوجاتی ہے اور سردی کا یہ زور فصلوں پر اپنا وار کرتا ہے۔کچھ ٹوٹنے کی ایک آواز پیدا ہوتی ہے اور لوگ یہ کہتے ہیں کہ دانوں کے کان مروڑے جارہے ہیں۔اور جب بھوسا تیار کرنے کا موقع آتا ہے تو یہ دانہ چاول نہیں ہوتا بلکہ فضول قسم کا سفید سفوف ہوتا ہے۔چنانچہ اس بات کو ملحوظ خاطر رکھا جانا چاہئے کہ کشمیر جیسے زرخیز علاقے میں بھی ایک کسان کو فکرمندی اور دشواریاں درپیش ہوتی ہیں۔کٹائی کے وقت بارش یا برفباری نہ ہو۔یہی وہ وقت ہوتا ہے جب قحط سالی کا ڈر ہوتا ہے اور کشمیری دعا کرتا ہے کہ اسے حاکم وحکیم سے نجات دلائی جائے۔وہ اس بات کی بھی دعا کرتا ہے کہ فصل کی کٹائی کے وقت موسم صاف رہے۔چاول کی اچھی فصل کے لئے مندرجہ ذیل حالات لازمی ہیں۔موسم سرما کے دوران پہاڑوں پر برفباری ہوتا کہ موسم گرما کے دوران ندیاں اور دریا پانی سے لبالب بھر جائیں۔مارچ اور اپریل کے اوائل میں اچھی بارشیں ہوں اور مئی، جون، جولائی اور اگست کے مہینوں کے دوران چمکدار اور گرم دن اور ٹھنڈی راتیں ہوں اور کبھی کبھی

پھواریں بھی پڑ جائیں اور ستمبر کے دوران شاندار موسم ہو۔ ماہ ستمبر کے دوران راتیں شدید سرد ہونی چاہئیں۔ تمام کشمیری زور دے کر کہتے ہیں کہ بیر دانہ یا بھر پور غلّے کا انحصار بیرونی بھوسے سے سرد شبنم کے جذب ہونے پر ہوتا ہے جس سے شکل اختیار کرتا ہوا دانہ پھول کر سخت ہو جاتا ہے۔

میں نہیں سمجھتا کہ ایک کشمیری کو چاول کی کاشت کے بارے میں زیادہ کچھ سیکھنے کی ضرورت ہے یا اس پر یہ الزام لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ادنیٰ اقسام کے چاول پیدا کرتا ہے۔ زمانہ حال تک اس کا اہم مقصد مقدار حاصل کرنا رہا ہے اور جب تک کشمیر میں تجارت کا چلن نہیں ہو جاتا تب تک چاول کی بہتر قسم بنانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں نے چند کاشتکاروں کو اس امر کے لئے راغب کیا ہے کہ وہ ان اراضیات پر ہل چلائیں جہاں فصل کی کٹائی کے بعد زمین بھی نم ہوتی ہے۔ اگر چہ وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ایسی مٹی ہوا اور پالے سے فایدہ حاصل کرے گی مگر وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ آئندہ (3) برس کی تلائی میں بھاری وقت پیدا ہوگی اور وہ فصل کٹائی کے بعد فراغت سے کھیت جوتنے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ قاعدے کے طور پر تمام مشوروں کے جواب میں کشمیری کوئی نہ کوئی عذر پیش کرتا ہے مگر تمام تر قدامت پسند خیالات کے باوجود ماضی کے موسموں پر مبنی سخت قواید سے اب انحراف کرنے لگے ہیں۔ اور بزرگ لوگ ان ایجادات کی مذمت کرتے ہیں جہاں تک چاول کا تعلق ہے بیان کیا جا سکتا ہے کہ اگر ایک کاشت کار کو پانی اور کھاد میسر ہوتی رہے تو وہ چاول کی کاشت جاری رکھے گا اور وہ فصلوں کو باری باری اُگانے کی بابت خواب میں بھی نہیں سوچے گا، جہاں پر پانی کا حصول غیر یقینی ہے وہاں چاول کے تحت رقبے کو غیر ناقابل کاشت قرار دیا جائے گا۔ میں نے دیکھا ہے کہ کپاس، مکئی، گندم، باجرہ اور ماہ (دال) اُگانے کے چار برس بعد چاول اُگایا گیا۔ اس بات میں شک نہیں کہ چاول سے فراغت کے بعد دھوپ اور ہوا سے زمین کو فایدہ ہوتا ہے مگر اچھی خاصی آب پاشی سے باری باری فصل اُگانے کے فوائد کے باوجود ہر سال چاول اُگایا جاتا ہے۔

سرکاری اہلکاروں اور غیر کاشتکاروں کے درمیان یہ رواج ہے کہ وہ چاول کی پیداوار کے معاملے میں مبالغہ آمیزی سے کام لیتے ہیں۔ چند صورتوں میں یہ اعداد ماہرین (4) کے اعداد و شمار کو بھی حیران کر دیتے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ نہال پورہ میں جہاں پر چاول کے تحت رقبات

دو ایکڑ تک محدود ہیں وہاں سوگنا فصل ہوتی ہے۔ اس بات میں بھی شک نہیں کہ بعض اوقات گھروں کے ساتھ ہی فصلیں اُگائی جاتی ہیں جن میں قدرتی طور پر کھاد فراہم ہوتی ہے مگر کھیتوں سے جو تجربات مجھے حاصل ہوئے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ عام قسم کے کھیت سے ایک ایکڑ زمین سے اوسطاً سترہ من بلا بھوسے کے چاول حاصل ہوتا ہے۔ بلند سطح پر واقع دیہات میں یہ پیداوار پندرہ من ہے۔ میرے خیال میں دیہات کی آبادی میں اضافہ ہوا ہے اور اراضیات سکڑ گئی ہیں جن میں زیادہ آسانی سے کام ہو سکتا ہے۔ اس سے نئی ایکڑ زمین سے پیداوار میں بھی اضافہ ہوگا۔ میں نے چاول کی پیداوار میں آنے والی لاگت کا تخمینہ لگانے کی کوشش نہیں کی ہے کیونکہ کسی بھی علاقے میں اس قسم کے تخمینہ جات واضح نہیں ہوتے ہیں۔ کشمیر میں بھی یہ امر کافی حد تک برمحل آتا ہے اور قیمتوں کی صورت حال نہایت مخدوش ہے۔ بہرحال یہاں پر ایک بات کا تذکرہ ضروری ہے کہ ہل کے ساتھ جوتے جانے والے بیلوں کی قیمتوں میں اضافہ ہو رہا ہے اور کاشت کے معاملے میں بیل ایک اہم جزو کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مکئی

دیگر فصلوں کا مختصر تذکرہ ہی کافی ہے۔ چاول کے بعد مکئی کی فصل اہم ترین حیثیت رکھتی ہے۔ مکئی کی کاشت کیلئے جو ہڑوں سے حاصل کردہ قابل کاشت رقبہ بہترین اراضی ثابت ہوتا ہے۔ اچھے برسوں کے دوران دریائے جہلم کے کناروں پر واقع سیاہ دلدلی زمین سے اس کی بھاری فصل حاصل ہوتی ہے۔ گوجر چرواہوں کے زیر قبضہ بلندی پر واقعہ دیہات میں مکئی کی عمدہ فصل کاشت کی گئی ہے اور گوجروں کی بھینسوں اور مویشیوں کی بھاری مقدار میں کھاد ڈالنے سے اچھی خاصی پیداوار حاصل ہوتی ہے مگر اس انحراف کے سوائے مکئی کے زیر کاشت رقبوں کو کھاد حاصل ہوتی ہے اور فصل کٹائی کا چلن کھاد کو غیر ضروری بنا کر رکھ دیتا ہے۔ مکئی کے ڈنٹھلوں کے کثیر حصے کو کھیتوں میں ہی چھوڑ دیا جاتا ہے اور موسم سرما کے دوران ڈنٹھلیں بارش اور برف کے ساتھ گل سڑ جاتی ہیں۔ عام حالات میں دو یا تین مرتبہ ان زمینوں پر ہل چلایا جاتا ہے اور حتمی طور پر ہل چلانے کا عمل تخم ریزی کے بعد انجام دیا جاتا ہے۔ بوائی کے ایک ماہ بعد مکئی ایک فٹ بلند ہو جاتی ہے اور عورتیں ایک چھوٹا دستی کھرپہ لے کر گھاس پھوس صاف کرنے کے علاوہ جڑوں کے اردگرد کی

مٹی کو ڈھیلا کرتی ہیں۔ قاعدے کے مطابق مکئی کی کاشت خشک زمین پر کی جاتی ہے اور شاید ہی ایسی زمینوں میں آبپاشی ہو پاتی ہے۔ مکئی کی اچھی فصل کے لئے ہر پندرہ روز کے بارش کی ضرورت پڑتی ہے مگر دلدلی زمینوں میں زمین کی نمی کے باعث بارشوں میں تاخیر ہونے کے باوجود اچھی فصل حاصل ہوتی ہے۔ مکئی کی دو اقسام ہیں۔ جلدی پیدا ہونے والی مکئی سے نرم دانا حاصل ہوتا ہے اور یہ چاول کی فصل کے وقت ہی بوئی جاتی ہے۔ اس قسم کی مکئی عام طور پر گھروں کے ساتھ واقع کھیتوں میں پیدا کی جاتی ہے جہاں قدرتی طور پر کھاد حاصل ہوتی ہے۔ عام قسم کی مکئی کا دانہ سرخ رنگ کا ہوتا ہے اور اس کی بوائی مئی اور جون میں ہوتی ہے اور اس کا دانہ میٹھا ہوتا ہے اور کشمیری سفید مکئی کی نسبت اسے زیادہ پسند کرتے ہیں۔ سفید رنگ کی چھوٹی مکئی کی پنجھی مکئی کہا جاتا ہے جو وادی کے مغرب میں بلندی پر واقع دیہاتوں میں اُگائی جاتی ہے۔ مکئی کا پودا کافی بلند قامت ہو جاتا ہے اور کاشت کے تحت رقبے میں اضافے کے تحت کا بچرائی رقبے ناپید ہونے لگے ہیں اور مکئی کی ڈنٹھلوں سے عمدہ کھاد حاصل ہوگی۔ اس وقت گوجر ان ڈنٹھلوں کو مویشیوں کی خوراک کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ خوراک کے سلسلے میں چاول کے بعد مکئی کو اہمیت حاصل ہے اور دودھ کے بغیر کشمیری مکئی کھانا پسند نہیں کرتا۔ مکئی کا دانہ بھٹے سے ڈنڈے کے ساتھ پٹائی کے عمل سے الگ کیا جاتا ہے اور ان بھٹوں کو ایندھن کے طور پر استعمال کرنے کے لئے شہروں تک بھیج دیا گیا ہے۔
مکئی کے بھٹوں کو اگر مناسب طور پر خشک کیا جائے تو ان کو تین برس تک اچھی حالت میں رکھا جا سکتا ہے۔ اور حساب لگایا گیا ہے کہ کشمیر میں 15 ترک بھٹوں سے تیرہ ترک دانے حاصل ہوتے ہوں گے۔ مکئی بھی رے میں مبتلا ہو سکتی ہے اور ایک اور بیماری ساس کا بھی مکئی کی فصل پر حملہ ہو سکتا ہے جو ایک سیاہ رنگ کا دھواں مائل سا روگ ہوتا ہے جو کبھی کبھی بھٹے کو مکمل طور پر ڈھک لیتا ہے۔ قابل کاشت دلدلی رقبوں سے بعض اوقات بھاری فصلیں حاصل کی جاتی ہیں جو آبی زمین میں گیارہ من اور خشکی میں آٹھ من فی ایکڑ ہوتی ہے۔

کانگنی

کانگنی یا شول (Setaria Italica) ایک نہایت اہم پودہ ہے اور جب پہاڑوں کو دیکھنے سے یہ ظاہر ہو جائے کہ برف اور پانی کی قلت ہوگی تو فوراً کانگنی کی کاشت کر دی جاتی ہے۔ اگر اس

زمین سے اچھی فصل کی توقع ہوتو اس پر چار مرتبہ ہل چلایا جاتا ہےاور اپریل اور مئی کے مہینوں میں عین اُسی وقت بوئی جاتی ہے جب چاول بویا جاتا ہے۔تھوڑا بہت نلائی کا کام کیاجاتا ہے۔حتیٰ کہ ستمبر کے دوران یہ پک کر تیار ہو جائے۔اس سے چاولوں کی مانند بھوسی نکالا جاتا ہے۔مگر کشمیری خوراک کے طور پر اس کی قدر نہیں کرتے کیونکہ اس کی تاثیر گرم ہوتی ہے۔کانگنی کی دو اقسام چھوٹی اور بڑی ہوتی ہے۔اوّل الذکر کی خوراک کے طور پر قدر کی جاتی ہے۔اس کا دام سرخ رنگ کا ہوتا ہے جبکہ مؤخر الذکر کا رنگ سفید ہوتا ہے۔ایک اوسط فصل میں ایک ایکڑ زمین سے تین من پیداوار حاصل ہوتی ہے۔

چائینا یا پنگ شکل وصورت سے کافی حد تک چاول کی مانند دکھائی دیتی ہےمگر اس کی کاشت خشک زمین میں ہوتی ہے۔کھیت میں تین مرتبہ ہل چلایا جاتا ہےاور بیج بونے کے بعد اس زمین پر مویشیوں کو زمین کچلنے کے لئے کھلا چھوڑا جاتا ہے۔تخم ریزی کا عمل جون میں سرانجام دیا جاتا ہے اور ستمبر میں فصل کاٹی جاتی ہے۔کبھی کبھی اس میں گھاس پھوس کی نلائی ہوتی ہےمگر کانگنی کی مانند اسے سرکاری طور پر ''دستی شئے خوردنی'' کا نام دیا گیا ہے۔چنانچہ اس کی زیادہ پرواہ نہیں کی جاتی۔جہاں چائینا اپنی گرم تاثیر کیلئے بدنام ہے وہاں اس کو سرد تاثیر کیلئے بدنام کیاجاتا ہے۔یہ ایک تکلیف دہ اناج ہے۔سخت ہونے کے باعث اسے پکانے میں کافی وقت درکار رہتا ہے۔اس کا رنگ سرخ یا سفید ہوتا ہےاور چاول کی طرح اوکھل میں اس کی کوٹائی کی جاتی ہے۔اوسطاً ایک ایکڑ زمین سے ساڑھے چار من پیداوار حاصل ہوتی ہے۔

گنہار

تمام فصلوں میں خوبصورت ترین گنہار ہے جس کے زریں مرجان اور ارغوانی رنگ کے ڈنٹھل اور پھول نہایت دلکش ہوتے ہیں۔یہ فصل اکثر اوقات کھیتوں میں کپاس کے ساتھ ساتھ قطاروں کی صورت میں اُگائی جاتی ہے جس کی سرحدیں مکئی کے کھیتوں سے لگتی ہیں۔کپاس کے گندھکی انبار اور گنہار کے مرجان رنگوں کا نہایت خوبصورت امتزاج پیش کرتے ہیں۔گنہار کی فصل مئی میں تین مرتبہ ہل چلانے کے بعد بوئی جاتی ہے۔اس کو نہ تو سیراب کیاجاتا ہےاور نہ ہی کھاد ڈالی جاتی ہے۔بروقت بارشوں کے بعد باریک دانوں کی ایک فصل ستمبر ماہ میں حاصل کی

جاتی ہے۔اس دانے کو پہلے بھونا جاتا ہے۔ گنبار کے ڈنٹھلوں کو دھوبی استعمال میں لاتے ہیں جنہیں جلا کر راکھ سے وہ ایک نقلی مادہ حاصل کرتے ہیں۔

خورد گندم (گھوڑوں اور مرغیوں کا چارہ)

ترومبہ یا گھوڑوں اور مرغیوں کا چارہ ایک نہایت کارآمد پودا ہے۔یہ فصل کسی بھی زمین پر دیر سے بھی بوئی جاسکتی ہے اور جب ایک کاشتکار کو معلوم ہو جائے کہ چاول کے کھیتوں تک پانی پہنچنے کی کوئی اُمید باقی نہیں کہ وہ فوراً میٹھے ترومبا کی کاشت کردے گا۔کشمیر میں اس کی دو اقسام ہیں۔میٹھا ترمبا جس کے پھول گلابی سفید رنگ کے ہوتے ہیں اور اس کو اکثر چاول کے متبادلَ کے طور پر بویا جاتا ہے۔جہاں پانی میسر نہ ہو رہا ہو اس کو ماہ جولائی کے وسط میں بویا جاتا ہے۔اگر بارشیں فراواں ہوں تو فصل اچھی ہوگی۔ترش ترمبا کے پھول زرد رنگ کے ہوتے ہیں۔بہرحال یہ ایک عارضی انتظام ہے اور بلندی پر واقع دیہات پر عوام یہی کا اناج ہوتا ہے۔بھوسا بغیر دانہَ سیاہی مائل ہوتا ہے۔اسے یا تو چکی میں پیسا جاتا ہے اور اس کی روٹی پکائی جاتی ہے یا اس کو دلیا بنا کر کھایا جاتا ہے۔بیان کیا جاتا ہے کہ شیرین ترمبا گھوڑوں اور مرغوں کیلئے اچھا ہوتا ہے۔اوسطاً ایک ایکڑ زمین سے ساڑھے چار من فصل حاصل ہوتی ہے۔بلند دیہات میں ترمبا کی فصل نہایت خراب حالت میں ہوتی ہے کیونکہ دیر تک پالا پڑنے کے سبب فصل بروقت نہیں بوئی جائی سکتی اور جلدی برفباری سے فصل کی کٹائی پر نقصان ہوتا ہے۔نچلے علاقوں میں واقع دیہاتوں میں کبھی کبھی آبپاشی بھی مہیا کی جاتی ہے مگر بلند دیہات میں فصل کا تمام تر انحصار بارش پر ہوتا ہے اور سیراب کرنے کے لئے میسر پانی نہایت ٹھنڈا ہوتا ہے۔

دالیں۔مونگ

کشمیر کے عوام دالوں کو اہم قرار نہیں دیتے اور دال کو دل پسند کھانا نہیں سمجھتے۔چنے کی بابت یہاں کسی کو معلوم نہیں اور دالوں میں سب سے بہتر مونگ ہے۔زمین پر تین مرتبہ ہل چلائی جاتی ہے۔آبپاشی بالکل مہیا نہیں کی جاتی اور مونگ اکثر چاول کے تحت اُن رقبوں میں اُگایا جاتا ہے جنہیں زیادہ وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔اس کی جڑیں گہری چلی جاتی ہیں اور مٹی میں ہوا ہوتی ہے نہ کھاد دی جاتی ہے اور نہ ہی گھاس وغیرہ کی نلائی ہوتی ہے۔اگر زمین اچھی ہو تو مونگ کی اچھی

فصل حاصل کی جا سکتی ہے۔ فصل ستمبر ماہ میں پک کر تیار ہوتی ہے اور کشمیر میں اوسطاً ڈھائی من سے تین من فی ایکڑ فصل ہوتی ہے۔

ماش (ماہ)

ماہ کی کاشت بھی مونگ کی طرح ہی ہوتی ہے۔ اس سے بھاری فصل حاصل ہوتی ہے مگر یہ دال مونگ کی نسبت زیادہ بےلذت ہے۔ اوسطاً فصل چار من فی ایکڑ حاصل ہوتی ہے۔

مُٹھ

مُٹھ (سویابین) کی فصل اپریل میں ہوتی ہے اور اکثر چاول کے ان کھیتوں میں اُگائی جاتی ہے جن کے موسمی حالات موافق نہیں ہیں۔ اس دال کی خوراک کے طور پر قدر ہوتی ہے مگر موسم سرما کے دوران بھیڑوں کے لئے یہ اہم خوراک ہے۔ مٹھ اور سفید پھلیاں کی بہت ہی کاشت ہوتی ہے۔

تلہن

کشمیر میں تلہن کو کچھ حد تک اہمیت حاصل ہے اور اب جبکہ کشمیر کا رابطہ بیرونی دنیا سے ہو چکا ہے، ایک بنیادی تجارت کے طور پر تلہن زیادہ اہمیت اختیار کرتا جارہا ہے۔ کشمیری اپنی خوراک میں گھی کا استعمال نہیں کرتے مگر انہیں بناسپتی تیل کی ضرورت ہوتی ہے اور اس وقت وہ ان تیلوں کا استعمال روشنی جلانے اور کھانا پکانے کے مقصد سے کرتے ہیں۔ کانوں کے تیل ابھی تک کافی مہنگے ہیں۔ چنانچہ ان کا استعمال نہیں ہو سکتا۔

سرسوں

سرسوں کا تیل بھی تیلوں میں بھاری اہمیت رکھتا ہے۔ کشمیر کی اس میں تین اقسام ہیں۔ پہلی قسم تل گوگلو ہے جو ستمبر اور اکتوبر میں خشک اراضیات خصوصاً قابل کاشت دلدلی زمینوں پر پیدا کی جاتی ہے۔ قاعدے کے طور پر نلائی کا کام نہیں ہوتا، مگر جب قابل کاشت دلدلی زمین پر ایسا ہوتا ہے تو سفید حشیش کا کافی زور ہوتا ہے اور ایک کاشت کار کو اس کی نلائی کرنا پڑتی ہے۔ فروری سے مئی تک بروقت بارشوں کی ضرورت ہوتی ہے اور مئی اور جون میں فصل کی کٹائی ممکن ہو سکتی ہے۔

دوسری قسم کی تاروزیا سرشف کہا جاتا ہے اور موسم بہار میں بوئی جاتی ہے۔ یہ بھی تیل گوگلو کے ساتھ یک کر تیار ہوتی ہے مگر اس کے بیج سے کم مقدار میں تیل حاصل ہوتا ہے تل گوگلو کی اوسط فصل تین من فی ایکٹر ہوتی ہے جب کہ سرسوں کی دوسری اقسام کم پیداوار دیتی ہے۔ سرسوں کی تیسری قسم کو سندج کہا جاتا ہے اور اسے کھڑے چاول میں اس وقت بویا جاتا ہے جب آخری مرتبہ پانی دیا جارہاہو۔ اس سے کم فصل حاصل ہوتی ہے اور اس پر بھی محنت نہیں کی جاتی ہے اور کاشت کار کم فصل کو بھی اپنا فائدہ تصور کرتا ہے۔

کتان

کتان ساری وادی میں بوئی جاتی ہے۔ مگر میں نے کتان کے بہترین کھیت پہاڑی ڈھلوانوں پر دیکھے ہیں۔ زمین پر دو مرتبہ ہل چلایا جاتا ہے اور تیسری مرتبہ ہل ماہ اپریل میں اس وقت چلایا جاتا ہے جب اس کی تخم ریزی ہوتی ہے۔ اور فصل ماہ جولائی کے آخر میں کاٹی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی فصل کے بعد کھیت ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کی اوسط فصل ڈیڑھ سے دو من فی ایکڑ ہوتی ہے۔ اگر کاشت مناسب طریقے سے کی جائے تو پیداوار میں اضافہ ہوسکتا ہے۔ کھیتوں میں نہ تو کھاد ڈالی جاتی ہے اور نہ ہی ان کی نلائی ہوتی ہے۔ قاعدے کے مطابق اس کی فصل نہایت گندگی اور میلی کچیلی ہوتی ہے۔ ایک شخص پہاڑوں پر جیسے جیسے چڑھتا جاتا ہے اسے اس پودے کی ڈنڈی دکھائی دیتی ہے اور کچھ عرصہ پہلے ریشہ حاصل کرنے کی خاطر کتان کی کاشت کی گئی تھی مگر کشمیر میں نئی مصنوعات اور صنعتیں قائم کرنے کے تمام تر دیگر بہترین اقدامات کی مانند اس ریشے کی پیداوار کی سکیم بھی ناکام ہو کر رہ گئی کیونکہ کسی نے کاشتکاروں کی نگہداشت کر کے ان کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔

تل

تل ایک عام فصل ہوتی ہے اور اس کو اپریل میں بویا جاتا ہے۔ زمین پر چار مرتبہ اور پانچویں بار فصل بونے کے وقت ہل چلایا جاتا ہے۔ کھاد نہیں ڈالی جاتی مگر تل کے لئے زرخیز زمین درکار ہوتی ہے نیز بروقت ہلکی بارشیں بھی درکار ہوتی ہیں۔ اس فصل سے ہاتھوں اور کھرپے کے ساتھ گھاس پھوس نکالا جاتا ہے اور تلہن کے دیگر پودوں کی نسبت اس کی دیکھ بھال زیادہ احتیاط

کے ساتھ کی جاتی ہے۔تل ایک نہایت نازک پودا ہوتا ہے اور سرد ہواؤں سے اسے نقصان پہنچ سکتا ہے۔یہ فصل چاول کے فوراً بعد پک کر تیار ہوتی ہے اور اس وقت بیج حاصل کرنے کیلئے پودوں کے نیچے کمبل بچھائے جاتے ہیں اور ذرا سی حرکت سے یہ بیج اڑ کر برتن سے باہر آسکتے ہیں۔کشمیر میں تل کا تیل میٹھا ہوتا ہے اور مرہم کے طور پر اس کی بھاری قدر ومنزلت ہے۔اس کی اوسطاً فصل فی ایکڑ ڈیڑھ من ہوتی ہے۔

تیل

یہاں پر کشمیر میں تیل کی پیداوار کی مختصر تفصیلات بیان کرنا فائدہ مند ہوگا۔اب تک تیل کی وصولیابی حکومت نے مالیے کی صورت میں کی ہے۔مگر اب یہ طریقہ بند کردیا گیا ہے۔اب کاشتکار یا تو تلہن پنجابی کاشت کاروں کو فروخت کر دیتا ہے یا ذاتی استعمال یا خرید کے لئے وہ تیل نکالتا ہے۔تیل نکالنے کا کام پیشہ ور تیلی کرتے ہیں جو وادی کے تمام حصوں میں رہتے ہیں۔اپنی اجرت کے طور پر وہ تھوڑا سا تیل نکال لیتے ہیں اور تیل کی ٹکیہ جمع کر کے وہ اسے مویشیوں کی خوراک کے طور پر فروخت کر دیتے ہیں۔تیل نکالنے کی گھانی ہندوستان میں پائی جانے والی گھانیوں کے برعکس سپاٹ لکڑی سے تیار کی گئی ہوتی ہے اس کو ایک بیل چلاتا ہے جس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوتی ہے۔اسے چلانے والا اونچائی پر بیٹھا ہوتا ہے جہاں سے اسے ہانکنے والا ڈنڈا چلاتا رہتا ہے۔اس میں نیچے کھڑا ہوا ایک شخص بیج ڈالتا ہے۔کشمیریوں کا بیان ہے کہ سرسوں کا تیل روشنی جلانے کی خاطر بہترین تیل ہوتا ہے اور دیسی کھانے کے لئے بہترین ہوتا ہے کیونکہ ان بیجوں میں مختلف بیجوں کی آمیزش کی جاتی ہے۔اس کے بعد بھی اس میں گری، اخروٹ اور خوبانی کے بیجوں کی مزید آمیزش کی جاتی ہے۔مقامی لوگ اس کے اسباب بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر مختلف سائز کے بیجوں کو اکٹھے کچلا جائے تو ان کے مختلف قسم کے بیجوں کو الگ الگ کچلنے کی نسبت زیادہ مقدار میں تیل حاصل ہوتا ہے۔کشمیر میں اخروٹ کو تیل پیدا کرنے کیلئے بھاری اہمیت حاصل ہے مگر روشنی کے معاملے میں نہ تو اخروٹ اور نہ ہی خوبانی کے تیل کو اچھا کہا جاتا ہے۔اخروٹ کے تیل سے گلہ بند ہو جاتا ہے اور دوسرے تیلوں کی نسبت اس کے جلنے کی قوت آدھی بھی نہیں۔

کپاس

وادی میں کئی بلند مقامات پر کپاس کی کاشت کی جاتی ہے۔ قاعدے کے مطابق جہاں سرد ہوا کے سبب چاول کی کاشت مفقود ہو جاتی ہے وہاں کپاس بھی غائب ہو جاتی ہے۔ کپاس کی کاشت کریوہ جات پر ہوتی ہے۔ زیریں سطح پر واقع اس آبپاشی والی زمین پر ہوتی ہے جسے چاول سے فراغت درکار ہو۔ اس زمین پر بار بار ہل چلایا جائے تو فصل اچھی ہوتی ہے۔ بہرصورت تین مرتبہ ہل چلانا ضروری ہوتا ہے۔ اس کے بعد مٹی کے ڈھیلوں اور پتھروں کا اچھی طرح سفوف تیار کیا جاتا ہے اس کا بیج پانی میں بھگو کر تر کیا جاتا ہے۔ اور بونے سے قبل اس کو راکھ کے ساتھ ملایا جاتا ہے۔ اس سے زیادہ اس پودے کو کوئی کھاد حاصل نہیں ہوتی۔ بوائی کا کام ماہ اپریل کے آخر یا مئی میں ہوتا ہے اور اس دوران کھیت کو بار بار سیراب کیا جاتا ہے۔ بیجوں کی فراہمی فراخدلی سے ہوتی ہے اور کشمیریوں کا بیان ہے کہ ایک شخص کے پاؤں تلے کم از کم سات بیج آنے چاہئیں۔ کپاس کے کھیتوں کی نلائی بہتر طور پر کی جاتی ہے اس کے لئے عورتیں ہاتھ اور کھرپے کا استعمال کرتی ہیں۔ کشمیر میں کپاس کا پودا صرف دو فٹ اونچا ہوتا ہے۔ پودہ ہر برس اگتا ہے اور سردیوں کی بارش اور برفباری کے دوران سڑ جاتا ہے۔ کپاس کی کاشت منافعت بخش ہوا کرتی تھی مگر جہلم ویلی سڑک کھل جانے کے سبب ہندوستان سے سوتی کپڑے کی درآمد میں اضافہ ہو گیا ہے مگر اس کا دھاگہ مایوس کن حالات میں ہے۔ ایک گاؤں میں گھر کا بنا ہوا کپڑا ہی اہم ہوتا ہے۔ روئی کاتنے والا چرخہ اور جولاہے کا پھیرا کشمیر کے اطراف و کنار کا ایک اہم جزو ہے۔ چند ایسی وجوہات بجا طور پر موجود ہیں جن کے سبب کپاس کی کاشت کا کام جاری رہے گا۔ کیونکہ دیہاتی لوگ محسوس کرتے ہیں کہ پنجاب سے درآمد شدہ کپڑے کی نسبت گھر پر تیار کیا گیا کپڑا کہیں زیادہ مضبوط اور موٹا ہوتا ہے۔ چنانچہ کپاس کے ایک پودے کی جانب وہ محض روئی حاصل کرنے کی نظر سے نہیں دیکھتے ہیں بلکہ اس کے بیجوں سے وہ تیل حاصل کرتے ہیں۔ یہ جانوروں کے لئے ایک بہت اچھی خوراک کی حیثیت رکھتا ہے۔

موسم بہار کی فصلیں

باجرہ

گندم اور باجرہ موسم بہار میں پیدا ہونے والی وادی کی کلیدی فصلوں میں شامل ہیں۔ رقبے

کے لحاظ سے باجرہ وادی میں پیدا ہوتا ہے مگر وہ اچھی ساخت کا نہیں ہوتا۔ بیج بوتے وقت ایک مرتبہ ہل چلایا جاتا ہے۔ اکتوبر سے دسمبر کے درمیان تک دوبارہ ہل چلایا جاتا ہے۔ نہ تو کھیتوں کی تلائی کی جاتی ہے اور نہ ہی اس میں کھاد ڈالی جاتی ہے۔ غالباً کشمیر کے باجرہ کے تحت رقبہ جات کا دنیا میں بدتر اور بے ترتیب کاشت کے معاملے میں کوئی ثانی نہیں ہے۔ بعض اوقات باجرے اور چرا گھاس کے درمیان تمیز کرنا محال ہو جاتا ہے۔ خوراک کے طور پر باجرے کے دانے کی کوئی قدر نہیں ہے مگر چکی مالکان بسا اوقات اس کی گندم کے ساتھ آمیزش کر دیتے ہیں۔

تبتی باجرہ

سات ہزار فٹ سے زائد بلندی پر واقع دیہات میں ایک خاص قسم کا باجرہ گرم اُگایا جاتا ہے جو پہاڑی لوگوں کی نہایت اہم غذا ہے۔ دیہاتی لوگ عام طور پر اس کا تذکرہ حرامی گندم کے طور پر کرتے ہیں۔ عوام کا کہنا ہے کہ اگر اس کو زیریں علاقوں میں اُگایا جائے تو یہ عام باجرہ کی قسم کا ہوتا ہے۔ باجرہ مئی جون میں اُگایا جاتا ہے اور اگست ستمبر میں پک کر تیار ہو جاتا ہے۔ باجرے کی فصل اوسطاً ساڑھے آٹھ من فی ایکڑ ہوتی ہے۔

گندم

گندم کے فصل کے ساتھ باجرے کی نسبت بہتر سلوک ہوتا ہے۔ کشمیر میں زمین تیار کرنے کیلئے دو مرتبہ اور بیج ڈالتے وقت ایک مرتبہ ہل چلانا کافی تصور کیا جاتا ہے اس زمین پر نہ تو کھاد ڈالی جاتی ہے اور نہ ہی گھاس نکالی جاتی ہے اور قاعدے کے مطابق زمین کو کبھی سیراب نہیں کیا جاتا۔ فصل کی بوائی ستمبر اور اکتوبر مہینوں کے دوران کی جاتی ہے جو ماہ جون میں پک جاتی ہے۔ اس گندم کی عام قسم سرخ رنگ کے سخت دانے کی صورت میں نمودار ہوتی ہے اور پنجابی لوگ کشمیری گندم کے آٹے کو نہایت حقیر اور ادنیٰ تصور کرتے ہیں۔ بہر حال میں نے اس گندم کو صاف کر کے محنت کی ہے اور اس کو مناسب طور پر پسوایا ہے مگر میں نہیں سمجھتا کہ یہ کوئی ادنیٰ قسم کی گندم ہے۔ بعض اوقات میں نے ایک چھوٹے سے قطعہ اراضی میں زیادہ بڑے دانوں والی قسم دیکھی جسے بدترین قحط سالی کے دوران پنجاب سے لا کر ترویج دی گئی ہے مگر کشمیر میں اس قسم کی فصل کو کامیابی حاصل نہیں ہوئی ہے۔ ہم نے خشک زمین سے اوسط پیداوار سات من فی ایکڑ دیکھی ہے۔ فی الحال

یہ کہنا مشکل ہوگا کہ آیا گندم یا باجرہ کشمیر کی کاشت میں اہم مقام حاصل کر سکتے ہیں مگر موسم بہار کی بارشوں کی غیر یقینیت کے باوجود یہ بات ظاہر ہے کہ ہل چلاتے، کھاد ڈالنے اور نلائی سے اوسط پیداوار میں اضافہ ہوگا جو فی الحال ہندوستان کی عام اوسط پیداوار کی نصف ہے۔ جس طرح جَو کا دانہ یا کچھ حد تک گندم کا دانہ کشمیر کے چاول خور کشمیریوں کی طرف سے خوراک کے طور پر حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے لہٰذا ان فصلوں کا قیمتی گھاس نظر انداز کر کے جانوروں کی خوراک کی نذر کر دیا جاتا ہے۔ عام طور پر دیکھا گیا کہ اس فصل کی بڑی بڑی چھڑیوں کو زمین پر ہی سڑنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہ بھی ایک خاص پہلو ہے کہ جب وادی میں دیگر چارہ ناکام ہو جاتا ہے تو شمالی ہندوستان میں چاول کا گھاس خوراک کے طور پر استعمال میں لایا جاتا ہے۔ کشمیر میں بھی یہ چارہ کافی مقبول ہے۔ ہندوستان میں چاول کے گھاس کے مقابلے میں کشمیری گھاس زیادہ رسیلا ہوتا ہے۔ گندم کو دو قسم کی بیماریاں لگ سکتی ہیں۔ ایک بیماری کو سرمہ کہا جاتا ہے جس میں دانہ سیاہ چورے کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور تیز بو چھوڑتا ہے۔ دوسری قسم کی بیماری ساس ہے جس کی تفصیلات مکئی کی صورت میں بیان کی جا چکی ہے۔

کشمیر کی اہم فصلوں کی تفصیلات بیان کرنے کے بعد چند خاص فصلوں کا بیان اچھی دلچسپی کا موجب ہوگا۔

زعفران

زعفران پھولوں کے طور پر مشہور ہے اور مصالحے کے طور پر اس کی بھاری فرمائش ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ہندو اپنی پیشانی پر تلک لگانے کیلئے رنگ کے طور پر اس کا استعمال کرتے ہیں۔ مؤخر الذکر مقاصد کے لئے اب کشمیری پنڈت مختلف نعم البدل مثلاً ہلدی کا مصرف بھی کرتے ہیں۔ اگر توفیق ہو تو کوئی بھی شخص شوخ زعفرانی رنگ کا استعمال کرے گا جس کے ساتھ سیندور اور کوٹی ہوئی صندل کی لکڑی کو ملایا جاتا ہے۔ زعفران کی کاشت ایک مخصوص اہمیت کی حامل ہے اور کشمیر میں اس کی کاشت کے ساتھ ایک داستان وابستہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہر لحاظ سے ایک قدیم صنعت ہے۔ راجہ للتادیتہ کے عہد میں پدماپور میں ایک مشہور معالج تھا اور اس شہر کا نام للتادت کے وزیر پدم کے نام پر ڈالا گیا۔ ایک ناگ یا آبی دیوتا آنکھوں کے مرض میں مبتلا ہو گیا

اور علاج کے لئے وہ معالج کے پاس گیا۔ جس نے اس مرض کا علاج کرنے کی ناکام کوشش کی۔ حیرانی کے عالم میں اس آبی دیوتا سے پوچھا گیا کہ آیا وہ کوئی آدم زاد ہے اور یہ معلوم ہونے پر کہ وہ ایک ناگ ہے اس نے فوراً ناگ کی آنکھوں کے علاج کی کوشش کی مگر ہر مرتبہ وہ زہریلے بخارات کے سبب ناکام ہو کر رہ جاتی جو اس ناگ کے منہ سے باہر نکلتے۔ اس نے ناگ کی آنکھوں پر ایک پٹی باندھی جس سے وہ صحت یاب ہو گیا۔ اس کارِ خیر کے شکرانے کے طور پر ناگ نے اُسے زعفران کی ایک گٹھلی دی اور پدماپور میں زعفران اُگ آیا۔ اب اس قصبے کا نام پانپور ہے۔ میں نے جائے وقوع پر جا کر مندرجہ ذیل امور کی جانچ کے بعد پایا کہ یہ طریقہ کار ست رو اور قدامت پسند ہے۔ اور عین ممکن ہے کہ بیج کی گٹھلیاں پیدا کرنے کے یوروپی طریقوں سے کشمیر میں زعفران کی پیداوار میں اضافہ ہوا۔ اس زعفران کی کاشت کافی تیزی کے ساتھ پھیلتی جا رہی ہے اور جہاں تک بیج اجازت دیتے ہیں، مقامی طریقہ کار ہی استعمال میں لایا جا رہا ہے۔ یہ طریقہ کار کس قدر ست رو ہے اس کا پتہ اس امر سے چلتا ہے کہ زعفران کے تحت کل چار ہزار پانچ سو ستائیس ایکڑ رقبے میں سے صرف بتیس ایکڑ رقبہ زیر کاشت لایا گیا۔ ماضی (4) میں زعفران کی کاشت حکومت کے لئے مالیات کا ایک اہم ذریعہ تھا۔ مگر قحط سالی کے دنوں میں لوگ زعفران کی گٹھلیاں کھا گئے چنانچہ اس کا بیج کشتواڑ سے درآمد کرنا پڑا حالانکہ ہر برس بیج کی پیداوار کے لئے زمین مخصوص رکھی جاتی ہے مگر نئی کاشت کا یہ عمل کافی حد تک ست ہے۔ بیج حاصل کرنے کے لئے ایک مخصوص قسم کی ڈھلوان زمین درکار ہوتی ہے۔ چنانچہ بلب کی کاشت کے قبل تین برس کا عرصہ درکار ہوتا ہے۔ زعفران چھوٹے چھوٹے مربع قطعات میں بویا جاتا ہے۔ اس قطعات کو آٹھ برس تک بے کار رکھا جانا چاہیئے انہیں نہ کوئی کھاد اور نہ ہی آبپاشی کی امداد درکار ہوتی ہے۔ ایک بار گٹھلی کو اس مربع قطعۂ اراضی میں رکھ دیا جاتا ہے تو یہ کاشت کار کی جانب سے کسی قسم کی امداد کے بغیر چودہ برس تک زندہ رہے گا۔ اس عمل میں نئی گٹھلیاں پیدا ہوتی ہیں اور پرانی گل سڑ جاتی ہیں۔ ان گٹھلیوں کی شجر کاری کا موسم جولائی اور اگست کے دوران ہوتا ہے۔ اس بارے میں کاشت کار کو یہ کرنا ہوتا ہے کہ زمین کی سطح کو آہستگی کے ساتھ توڑ کر مورچہ بندی کی جاتی ہے تاکہ چاروں طرف سے بہ نالیوں کا کام دے سکے۔ اکتوبر ماہ کے وسط میں پھول نمودار ہوتے ہیں۔ قرمزی رنگ کے شگوفے اور ان کی مہک

پانپور کے ان قطعات اراضی کو خوبصورت باغات کی صورت عطا کرتی ہے۔ فی الحال زعفران کی کاشت پانپور کے نواحی کریوہ جات تک محدود ہے مگر استفسارات کے بعد مجھے معلوم نہیں ہوسکا کہ آیا پانپور کی مٹی میں کوئی ایسا وصف ہے جو دیگر کریوہ جات میں موجود نہیں۔ کسی نے بھی اس کیفیت کی تصدیق نہیں کی کہ زعفران کے کھیتوں کی مٹی کو دریائے جہلم سے کھودا گیا جب کہ بہت سارے دیگر افراد اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ دوسرے کریوہ جات پر بھی زعفران کی کاشت کی گئی ہے۔ بہرکیف اس امر میں کوئی شک نہیں کہ پانپور کے اوپر کے علاقوں کی مٹی کافی مضبوط ہے اور یہاں پر گندم اور باجرے کی بہترین فصلیں دکھائی دیتی ہیں۔

اگرچہ گزشتہ دو برسوں کے دوران زعفران کی کاشت میں اطمینان بخش طور پر توسیع ہوئی ہے مگر مجھے اس امر کا خدشہ ہے کہ کسانوں کی طرف سے زعفران جمع کرنے کا جو طریقہ کار اپنایا گیا ہے اس سے اس صنعت کے مقبولیت اختیار کرنے میں دقت پیدا ہوسکتی ہے کیونکہ فصل کی کٹائی کے موسم میں کاشتکاروں پر اسی انداز سے نظر رکھی جاتی ہے جس طرح کہ ان لوگوں پر نگہداشت ہوتی ہے جو ہیروں کی کھدائی کرتے ہیں۔ ایام ماضی میں کشمیر کے تمام علاقوں سے لوگ آکر پانپور کے کریوہ جات میں زعفران کی کاشت کیا کرتے تھے مگر اب سرینگر سے چند افراد کے سوائے زعفران کی کاشت کا کام مقامی ہاتھوں میں ہی ہے۔ کٹائی کے دنوں میں پورے کا پورا پھول چن کر تھیلوں میں بند کر دیا جاتا ہے۔ یہ تھیلہ کسانوں کو دیا جاتا ہے۔ اس کے عوض وہ کاشت کار کو دوسرا تھیلا دیتا ہے۔ اس تھیلے کو کبھی کھولا نہیں جاتا اور تجربہ یہ بتاتا ہے کہ کاشتکار کبھی خراب تھیلہ کسان پر تھوپنے کی جسارت نہیں کرے گا۔ اس کے بعد تھیلے کو دریا کے بائیں کنارے پر لے جایا جاتا ہے جہاں کاشتکار زعفران کی فروخت کے لئے خود انتظام کرے گا۔ جب پھولوں کو جمع کیا جاتا ہے تو زعفران نکالنے کا حقیقی کام شروع ہوتا ہے۔ ان پھولوں کو دھوپ میں خشک کیا جاتا ہے اس سے تین لمبی جڑوں کو ہاتھوں سے نکالا جاتا ہے۔ یہ جڑ سنگتری رنگ کی ایک نوک ہوتی ہے۔ شاہی زعفران لمبی جڑ پر مشتمل ہوتا ہے اور یہ اوّل درجے کا زعفران ہوتا ہے۔ اس جڑ کی لمبی سفید بنیاد سے بھی زعفران ہوتا ہے مگر نوکیلی جڑوں کی نسبت یہ ادنیٰ درجے کا ہوتا ہے۔ اس طرح جو زعفران خشک حالت میں جمع کیا جاتا ہے اسے مونگلا کہا جاتا ہے۔ اس سے ایک روپیہ فی تولہ حاصل ہوتا ہے۔

جب مونگلا زعفران نکال لیا جاتا ہے تو دھوپ میں خشک کئے گئے پھولوں کی جھڑیوں سے ہلکی ہلکی دھنائی کر کے الگ کیا جاتا ہے۔اس عمل کو تین مرتبہ دہرایا جاتا ہے۔اس کے بعد تمام تر مواد کو پانی میں ڈال دیا جاتا ہے۔ جہاں پر پتیاں تیرتی ہیں جب کہ پھول کے لازمی جزو پانی میں ڈوب جاتے ہیں۔ڈوبے ہوئے اجزاء (نول) کو جمع کیا جاتا ہے۔جو اجزاء اوپر آ کر تیرتے ہیں ان کو دوبارہ جمع کر کے خشک کیا جاتا ہے۔اس عمل کو تین مرتبہ دہرایا جاتا ہے۔اس مرتبہ نول میں کمی واقعہ ہو جاتی ہے۔آمیزش کا ایک طریقہ مرحلہ سوئم کے نول عمل اوّل کے نول کے ساتھ امتزاج ہوتا ہے۔اس طرح سے حاصل کئے گئے زعفران کا رنگ نسبتاً ہلکا ہوتا ہے۔اور مونگلا کی نسبت اس کی خوشبو بھی قدرے کم ہوتی ہے۔تجارتی حلقوں میں اس کا نام لاچا ہے اور یہ گیارہ آنے فی تولہ کے حساب سے فروخت ہوتا ہے۔ جب زعفران تیار ہو جاتا ہے تو اسے رجسٹری ڈاک کے ذریعے امرتسر اور دیگر تجارتی مراکز تک ارسال کر دیا جاتا ہے۔ اس سے پہلے کشمیر میں ایک رنگ مادر (محبت) کی کاشت کی جاتی تھی۔سمت 1923 تک نگین علاقے اور پانپور میں اس کی وسیع تر کاشت ہوتی تھی مگر ظاہر ہوتا ہے کہ کسانوں میں یہ کوئی مقبول فصل کی حیثیت نہیں رکھتی۔جن جڑوں سے رنگ نکالا جاتا تھا وہ آٹھ آنے فی تولہ کے حساب سے فروخت ہوتی تھیں۔مادر کے معاملے میں اندرکوٹ کا مقام کافی مشہور ہے۔

جھیل ڈل میں کاشت

زعفران کی کاشت کے بعد جھیل ڈل کے تیرتے ہوئے باغات کا ذکر دلچسپی کا حامل ہے۔یہ تیرتے باغات میکسیکو کے ''چناമیاؤں'' سے مطابقت رکھتے ہیں۔اس جھیل کی تمام تر کاشت شہر کے عوام کے لئے بھاری دلچسپی اور اہمیت کی حامل ہے۔رادھ یا تیرتے ہوئے باغات جھیل کے طویل نرکل کے ٹکڑوں سے تیار کئے جاتے ہیں۔ان کھیتوں کی لمبائی اور چوڑائی تقریباً چھ فٹ ہوتی ہے۔ان ٹکڑوں کو ایک سے دوسری جگہ باندھ کر کھینچا جا سکتا ہے۔ان کے چاروں کونوں پر کھمبوں کے ذریعے چپو جیسے پتوار قایم کئے جاتے ہیں جنہیں دریا کی تہ تک لے جایا جاتا ہے۔جب یہ رادھ ایک آدمی کا وزن برداشت کرنے کے قابل ہو جاتا ہے تو ستونوں کے ذریعے جھیل سے گھاس پھوس اور دلدل کے انبار جمع کئے جاتے ہیں۔ان انباروں کو کونین کی صورت دی جاتی ہے

اور تھوڑے وقفے کے بعد رادھ پر رکھ دیا جاتا ہے۔ان کو نین کو پوکر کہا جاتا ہے۔اور ہر کونہ خربوزوں یا ٹماٹروں کی دو پنیریاں یا تربوزوں یا کھیرے کی چار پنیریاں بونے کی گنجائش رکھتا ہے۔ یہاں پر پودوں کی زندگی کی تمام تر لوازمات میسر ہیں۔زرخیز زمین، وافر نمی اور کشمیر میں موسم گرما کی دھوپ میں اچھی قسم کی سبزیاں اس قدر فراوانی سے پیدا ہوتی ہیں کہ ہر کوئی دنگ رہ جاتا ہے۔یہاں پر ہر پودے کی مکمل ہیئت کے تیئں پھل جمع کرنا کوئی خلاف معمول بات نہیں ہے۔ یعنی ایک ہی ڈیمب سے نوے سے سو پھل حاصل ہو سکتے ہیں۔ان تیرتے ہوئے کھیتوں سے زرخیز ڈیمب اراضیات کسی طور پر بھی کم نہیں ہیں جو جھیل کے کناروں اور بسا اوقات جھیل کے اندر اس وقت نمودار ہو جاتی ہیں۔جب پانی اُتھلا ہو جاتا ہے تو کاشت کار جگہ کا انتخاب کرتا ہے اور اس کے چاروں طرف بید یا سفیدے کے درخت لگائے جاتے ہیں۔بیدوں کے اس احاطے کے اندر گھاس پھوس اور دلدل کو کشتیوں میں بھر کر اس زمین پر ڈالتا ہے۔حتیٰ کہ زمین سیلاب کی سطح سے اوپر آجائے اور سال بہ سال کسان اس زمین پر گھاس پھوس اور دلدل کی مزید تہیں ڈالتا ہے۔ ڈیمب قلعے کے آس پاس جھیل سے آبی راستے تعمیر کیے گئے ہوتے ہیں تاکہ نمی ہمیشہ موجود رہے۔ اس ڈیمب زمین پر مختلف النوع فصلیں پیدا کی جاتی ہیں جن میں تلہن، مکئی، تمباکو، خربوزے اور دیگر اقسام مثلاً آلو، پیاز، مولیاں، شلغم، بینگن کا پودا، سفید پھلیاں، آڑو، خوبانیاں اور بہی کے درخت اس زرخیز زمین پر نشو و نما حاصل کرتے ہیں۔اگر چہ یہاں پر جبری مزدوری کا رواج نہیں ہے تاہم ایک متجسس طریقہ کار کے تحت جھیل ڈل کے پانی پر رہائش پذیر طاقتور مکینوں سے ہر روز مالیہ وصول کیا جاتا ہے اور ڈیمب اراضیات کے ایشیا بھر میں خوشحال ترین لوگ رہے ہوں گے۔ ڈیمب طریقہ کار بھاری اہمیت کا حامل ہے کیونکہ نظام محض جھیل ڈل تک ہی محدود نہیں بلکہ وادی بھری میں جو لوگ بڑے بڑے جوہڑوں کے قریب رہتے ہیں اب انہوں نے بھی ایسے مستطیل قطعات تیار کرنا شروع کر دیے ہیں۔

جھیل ڈل کی جنگلی پیداوار

رادھ اور ڈیمب اراضیات سے حاصل ہونے والی اچھی پیداوار کے علاوہ جھیل ڈل کے کاشتکاروں، میر بحری (کشمیر میں انہیں یہی نام دیا گیا ہے) کو کسی محنت مزدوری کے بغیر خوارک

کے ذرائع بھی میسر ہیں ۔سنگھاڑے کی گری ایک اچھی خوراک ہے جس کی کسی بھی طور بے قدری نہیں ہونی چاہئے ۔جیوار سے ایک خوشنما بیج حاصل ہے جس کو کچی یا بھنی ہوئی صورت میں کھایا جاتا ہے۔بُمب ایک سفید پھول والی لمبی ڈنڈی ہوتی ہے اور اول الذکر سے ایک مقوی سبزی حاصل ہوتی ہے جب کہ مؤخر الذکر سے موافق شربت حاصل ہوتا ہے۔اسکے بعد جھیل ڈل کی شان گلابی سوسن سے ہے جس سے میٹھی گری حاصل ہوتی ہے۔اور پتے کی ڈنڈی اور سفید رس سے ایک لذیذ سبزی تیار کی جاسکتی ہے۔ان سب سے کارآمد پیزو ہے جس سے کشمیر کی چٹائیاں تیار ہوتی ہیں۔اس سے ایک لذیذ خوراک بھی حاصل ہوتی ہے جسے جھیل کی مٹھائی سے موسوم کیا گیا ہے۔موسم بہار کے دوران بھی ریشوں سے جمع کئے گئے چورے سے یہ مٹھائی تیار کی جاتی ہے اور پنیر کی تاب کی مانند اسے اُبالا جاتا ہے۔جھیل کے ریشوں کی طرح جڑیں بھی کھائی جاتی ہیں۔

تمباکو

بہت سارے حصوں میں تمباکو کی کاشت کی جاتی ہے مگر زیادہ تر یہ سرینگر کے اندر کے نواحی علاقوں میں پیدا کیا جاتا ہے۔نیز چھوٹے چھوٹے قصبات میں بھی اس کی کاشت ہوتی ہے۔عام کاشتکار اس کا پودا پیدا نہیں اُگاتا یہ تمام تر کاشت باغبان طبقوں کے ہاتھوں میں ہے جو شہروں اور قصبات میں موجود ہوتے ہیں۔نہایت گرانقدر تمباکو دینے والا پودا سرینگر کے ایک حصے میں اُگایا جاتا ہے۔جس کو بریواری کہا جاتا ہے۔اس پودے کے گلابی مائل پھول ہوتے ہیں اور تمباکو کا رنگ شوخ زرد ہوتا ہے۔یہ قسم نہایت نرم ہوتی ہے اور چلاسی ساخت سے کم تیز بودار ہوتی ہے۔جس کو پنجاب سے لاکر ترویج دی گئی ہے۔چلاسی سبز پتوں والا ایک پودہ ہے۔تمباکو ماہ اپریل میں بویا جاتا ہے اور ماہ اگست کے آخر میں اسے چُنا جاتا ہے۔اس کے لئے نہایت زرخیز زمین درکار ہوتی ہے۔عہد ماضی میں حکومت تمباکو مالیہ کی صورت میں وصول کرتی تھی اور اس کی فصل جمع کرنے پر بھاری لاگت آتی تھی۔مگر بعد کے برسوں میں اسے مالیہ کی صورت میں قبول نہیں کیا گیا اور میرا تاثر یہ ہے کہ تمباکو کے زیر کاشت رقبے میں کوئی اضافہ نہیں ہوا ہے۔قحط عظیم کے وقت تمباکو کا چلن بند ہو کر رہ گیا اور اس دوائی کو اب زیادہ تر نسوار کی صورت میں قبول کیا جاتا ہے۔نسوار کی درآمد پشاور سے کی جاتی ہے۔

اسی زرخیز زمین میں شہر اور قصبات میں باغبان طبقہ تمباکو کی کاشت نہایت احتیاط کے ساتھ کرتا ہے۔اس کے خشک کیپسول کو دوائی کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔اجوائین اور کالا زیرہ دونوں ہی باغات کی فصلیں ہیں اور ان کی کاشت بطور فصل مقامی استعمال کے لئے کی جاتی ہے۔ اور گھوڑوں اور دوسرے مویشیوں کی حالت سدھارنے کے لئے اسے مصالحے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ہندوستان،لداخ اور افغانستان تک ان کی بھاری مقدار میں برآمد ہوتی ہے۔

سبزیاں

کشمیر میں سبزیاں بھاری اہمیت کی حامل ہیں۔ ہر دیہاتی کا اپنا ایک باغ کا قطعہ اراضی ہوتا ہے جہاں وہ ذرا سی محنت کر کے اپنی خوراک کی پیداوار میں اضافہ کرتا ہے۔سرینگر کے نواح میں بیجوں کے انتخاب میں قدرے احتیاط سے کام لیتا ہے اور دیہاتی یہ بیج شہر سے خریدتا ہے مگر شہر کے دُور افتادہ علاقوں میں سبزیوں کی کاشت پر بہت کم توجہ دی جاتی ہے اور سبزیوں کی حالت نہایت خستہ ہوتی ہے۔اگر چہ میں نے یہ رائے دی ہے کہ چاول کی کاشت کے ذریعے ایک کشمیری بہت کم سیکھ سکتا ہے مگر میرا یہ بھی خیال ہے کہ سبزیوں کے ایک کاشتکار کی حیثیت میں اُسے ابھی بہت کچھ سیکھنا باقی ہے اور مجھے ایسے وقت کا انتظار ہے جب ایک کشمیری اچھی قسم کا بیج خریدے گا اور سبزیوں کے باغات سے اچھی فصل پیدا کرے گا۔ میں پیشینگوئی کر سکتا ہوں کہ افغانستان کی مانند کشمیر بھی ہندوستان کو بیج برآمد کرے گا۔کڑم، ہاک ایک قومی سبزی ہے۔ یہ ایک سخت اور کرخت پودا ہے اور موافق بارشوں کے برسوں کے دوران سب سے زیادہ محنت کے بغیر اچھی خاصی فصلیں پیدا کی جاسکتی ہیں۔سبز قسم کی یہ ترکاری کشمیر میں عام طور پر پائی جاتی ہے اور موسم گرما کے دوران اس کے پتوں کو پالک کے طور پر کھایا جاتا ہے۔ جبکہ جڑوں کو موسم سرما کے لئے محفوظ کیا جاتا ہے۔میں نے ارغوانی قسم کی ترکاری کے بیج دیہاتیوں کو دیئے ہیں اور اس پودے کی تعریف کی ہے۔اس کے بعد شلغم کی اہمیت ہے جس کی وسیع پیمانے پر کاشت کی جاتی ہے۔اس کی جڑوں کو قتلوں کی صورت میں کاٹ لیا جاتا ہے۔

سبزیوں کا حاصل ٹماٹر بھی فراوانی سے پائے جاتے ہیں۔ان کو دھوپ میں بھی خشک کر کے ان کا ہار بنایا جاتا ہے تاکہ انہیں موسم سرما میں استعمال کیا جاسکے۔انہیں زمین کے ایک کونے پر پیدا

کیا جاتا ہے جس کے سبب اس کی جڑوں سے ہوا آسانی سے گذر سکتی ہے۔ٹماٹر ایک مقبول ترکاری ہے مگر اس کے پودے کو زمین پر ہی رہنے دیا جاتا ہے۔ جس کے ثمرات چھوٹے اور بھدے ہوتے ہیں۔ اس کو چھلوں کی صورت میں تراش کر سردیوں کے مصرف کے لئے سنبھال کر رکھا جاتا ہے۔

مرچیں عموماً باقاعدہ باغبانی کرنے والوں کی طرف سے کاشت کی جاتی ہیں اور شہر کے مضافات میں ان کی فصل بھاری مقدار میں پیدا کی جاتی ہے۔ بڑی جسامت کے کھیرے اور ککڑیاں جھیل ڈل پر وسیع پیمانے پر پیدا کی جاتی ہیں مگر اضلاع میں یہ عام نہیں ہیں۔بینگن کے پودے سے وادی پورے طور پر شناسا ہے مگر آلو کی فصل بھی بھاری وسعت اختیار کرتی جارہی ہے۔ نوبگ کے تربال علاقے کے ڈھلوانوں اور دیگر مقامات پر بہترین قسم کے آلو پیدا کئے گئے ہیں۔ یہ پرانا خوف بھی موجود ہے کہ ہر اچھی شئے کو چھین لیا جائے گا اور اس پر محصول میں اضافہ کردیا جائے گا۔ مجھے توقع ہے کہ اب تمام وادی میں ایک مشترکہ فصل ہوگی۔ وادی کی مٹی میں آبپاشی کیلئے اچھی خاصی نالیاں ہیں اور اس مٹی کو آسانی سے توڑا موڑا جاسکتا ہے۔اور آلو کی فصل کیلئے تمام تر سازگار حالات موجود ہیں۔ استفسارات کے بعد مجھے معلوم ہوا ہے کہ ایک کشمیری کو بیجوں میں تبدیل اور آلوؤں کیلئے زمین کی بابت کچھ بھی معلوم نہیں اور جب پودے کو شہر اور قصبات کے مضافات میں پیدا کیا جاتا ہے تو اسے موسم بہار یا گرما میں سبزیوں کی قطعی پرواہ نہیں ہوتی۔ اس کی توجہ اس امر پر مرکوز ہوتی ہے کہ کوئی ایسے شئے اُگائی جاسکے جو موسم سرما کے دوران اس کا ساتھ دے۔ سبزیاں خشک کرنے کا اس کا طریقہ کار نہایت آسان اور مؤثر بھی ہے۔ اگرچہ خشک ٹماٹر سرما کے دوران سکڑ کر رہ جاتا ہے مگر اس کا رنگ بتاتا ہے کہ کبھی یہ کس حالت میں رہا ہوگا۔ اسکے باوجود نمک مرچ ملانے کے بعد بےلذت نہیں ہوتا اور میں نہیں سمجھتا کہ ایک کشمیری کو تیز مہک کی زیادہ پرواہ ہوتی ہے بشرطیکہ خوراک پیٹ بھرنے کیلئے ہو۔

جنگلی جڑیاں

جن جڑی بوٹیوں کا استعمال کشمیری لوگ موسم گرما اور بہار کے دوران سبزیاں کھانے کے لئے کرتے ہیں ان کا ذکر فضول ہی ہوگا۔ گوکھرو، پھپھوا، کانسی اور شیر فعان۔ درحقیقت ہر ایسا پودا

جوز ہر یلا نہ ہو دیگچی میں پہنچ جاتا ہے' یہاں تک کہ اخروٹ کی آویزیہ کی گھاس کو بھی حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا۔ پہاڑی علاقوں میں جنگلی Asparagus کو آسانی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اگر جنگلی دیوند کو شہد ملا کر پکایا جائے تو اس کا اپنا ہی لطف ہوتا ہے۔ جب کوئی یہ بات سنتا ہے کہ قدیم کشمیری اولیاء و ویل ہا کھ اور جنگلی جڑی بوٹیاں کھا کر گذارہ کرتے تھے تو ہمیں ایک تارک الدنیا فقیر کا تصور نہیں کرنا چاہئے کیونکہ ایک شخص کشمیر میں قدرتی مصنوعات پر بجا طور پر زندہ رہ سکتا ہے۔

پھل

کشمیر پھلوں کا ملک ہے۔ شاید کسی دیگر ملک میں باغبانی مثلاً مقامی سیب، ناشپاتی، انگور، شہتوت، اخروٹ، بادامی سرشی، آڑو، خوبانی، ربسری، سونگی، کشمش اور اسٹرابری دنیا میں بلا کسی دقت میسر ہو سکتے ہیں۔ کشمیر کے پھل عوام کے لئے خوراک کے طور پر بے حد مددگار ہوتے ہیں اور یہ پھل خوشگوار طور پر یکے بعد دیگرے تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ جب گرمیوں کے اولین دنوں کی آمد ہوتی ہے تو دیہاتی لوگ شہتوت کے درخت کو گھرا کر اپنا کمبل بچھا دیتے ہیں ان کے ہمراہ ان کے جانور اور کتے بھی نہایت شیریں سیاہ یا سفید پھل مل کر چباتے ہیں۔ اس پھل کی بہت ساری پیوندی اقسام ہوتی ہیں۔ ان میں ارغوانی رنگ کا رسیلا شہتوت عمدہ ترین پھل ہوتا ہے۔ اور اسے بھاری قدر و منزلت کے ساتھ سنبھال کر رکھا جاتا ہے۔ سردیوں کے موسم کے پیش نظر کشمیری اس شہتوت کو سنبھال کر رکھتا ہے جس کو وہ کھا نہیں سکتے۔ کیونکہ اس پھل کی شیرینی دیرپا ہوتی ہے۔ اس کے بعد خوبانی پک کر تیار ہوتی ہے۔ ان کو فوراً کھا لیا جاتا ہے اور باقیماندہ پھل سرما کے لئے سنبھال کر رکھا جاتا ہے۔ کشمیری اس پھل کی بھاری قدر کرتا ہے اور اس کے پھل کے سوائے سب کچھ دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اس پھل کا استعمال سیم گر دھات کو صاف کرنے کے لئے کرتا ہے اور رنگریز اس کا پختہ کرنے کے لئے استعمال کرتا ہے۔ گلاس عموماً Black Morella قسم کا ہوتا ہے۔ اس کا ترش ذائقہ عوام کو نہایت پسند ہے مگر چند مقامات پر لذیذ (عرب، فارس اور افغانستان کے راستے یورپ سے ترویج شدہ) قسم کے گلاس کی کاشت بھی کی جاتی ہے۔ اس پھل کا کشمیری نام گلاس Cerarus اصطلاع کی مسخ شدہ صورت ہے۔ عوام کا کہنا ہے کہ یہ مقامی

ساخت کا پھل ہے اور میں نے ایسے مقامات بھی دیکھے ہیں جہاں کسی تصور کے مطابق بھی یہ پھل خود بخود پیدا ہوسکتا ہے۔ جنگلی آلو بخارا عموماً کافی نفیس ہوتا ہے اور جس آلو بخارا کی کاشت کی جاتی ہے وہ بھی عام طور پر عمدہ ہوتے ہیں۔ آڑو کی کاشت نے ایک چھوٹے سے رقبے سے وسعت اختیار کی ہے مگر یہ نہایت فرحت بخش ہوتا ہے اور میرے خیال میں جنگلی رسبری نہایت نازک ہوتی ہے اور ان اوصاف میں یہ انگلینڈ کی رس بیری سے مطابقت رکھتی ہے۔ سونگی ایک بے مہک چھوٹا سا پھل ہے مگر اسٹرابری اور کشمش شاندار قسم کے پھل ہیں۔ بعد میں موسم میں سیب ، ناشپاتی اور اخروٹ آتے ہیں اور میرا خیال ہے کہ کشمیر کے لئے پھل پیدا کرنے والے ملک کے طور پر امکانات کافی روشن ہیں۔ اب میں سیب اور ناشپاتی کے بارے میں تفصیل کے ساتھ بیان کروں گا۔ جنگلی سیب اور ناشپاتی وادی کے گردو پیش میں جنگلات کی ڈھلوانوں پر آسانی سے میسر ہوسکتے ہیں۔ کئی نسلوں سے کشمیریوں نے پہاڑیوں سے پھلوں کا جنگلی سٹاک لاکر اپنے باغات میں اس کی شجر کاری کی ہے۔ طریقہ یہ ہے کہ اچھے قد اور گھیرے کے درخت نیچے لائے جاتے ہیں اور انہیں موسم بہار کے دوران لگایا جاتا ہے۔ سکاری نہای میں ہم اچھی جڑوں والے چھوٹے درخت لاتے ہیں اور ہمیشہ برفباری سے قبل لگا دیتے ہیں۔ اس بات کو یقینی بنانے کے بہت کم زحمت اٹھائی جاتی ہے کہ اس سٹاک کی جڑیں اچھی ہیں۔ اگر نصف باغ میں بھی خراب ہوجائے تو کسی کشمیری کو حیرانی نہ ہوگی۔ جب باغ میں جنگلی سٹاک کی شجر کاری کی جاتی ہے تو درخت پر یا تو موسم بہار کے درمیان پیوند کاری کی جاتی ہے یا جولائی اور اگست کے دوران اس کی قلم کاری کی جاتی ہے۔ پیوند کاری کا یہ طریقہ نہایت سہل اور مجموعی طور پر مؤثر بھی ہوتا ہے۔ جنگلی سٹاک پر چار یا پانچ مرتبہ قلمیں لگائی جاتی ہیں اور اس کی چھال اور تنے کو دلدل میں لپیٹ دیا جاتا ہے۔ کونپلیں لگانے کا طریقہ بھی نہایت سہل اور سیدھا سادہ ہے۔ سیب یا ناشپاتی کا چھلکا اُتارا جاتا ہے جس کی نوتولید مقصود ہوتی ہے اور اس کو سبز پتوں والی شاخ کے نیچے رکھ دیا جاتا ہے۔ اس کونپل کو دودھ سے بھری طشتری میں رکھ دیا جاتا ہے۔ اس طشتری کو جنگلی سٹاک والے باغ میں لے جایا جاتا ہے۔ جنگلی درخت کی شاخ سے سبز چھلکا اُتار دیا جاتا ہے اور نئی کونپل کو جنگلی سٹاک میں گھیڑ دیا جاتا ہے۔ اس کو دھاگے کیساتھ باندھا نہیں جاتا بلکہ اپنا وقت پانے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔

اور دیہاتیوں کا کہنا ہے کہ ناکامیوں کی گنجائش نہایت کم ہوتی ہے۔

سیب

عبرویا امبری کشمیر کا مقبول ترین سیب ہے جو ایک گول، سرخ، سفید اور شیریں پھل ہے۔ یہ پھل ماہ اکتوبر میں پکتا ہے اور اسے اسی حالت میں زیادہ دیر تک رکھا جا سکتا ہے۔ اس سیب کی بھاری مقدار میں برآمد کی جاتی ہے اور ہندوستان کے باشندے اسے اس کی مٹھاس اور خوبصورت شکل وصورت کی وجہ سے از حد پسند کرتے ہیں۔ ایک انگریز کے لئے اس کا ذائقہ اون کی مانند خوشبو سے عاری معلوم ہوتا ہے۔ یہ ایک خوش آئند امر ہے کہ امبری کی مانند موہی امبری میں زیادہ تیزاب ہوتا ہے اور یہ نسبتاً سرخ بھی ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ کدو ساری کو کابل سے ترویج دی گئی ہے۔ شکل وصورت میں یہ سیب لمبا ہوتا ہے۔ یہ رسیلا ہوتا ہے بلکہ اس میں تیزابی عنصر ہوتا ہے۔ یہ سیب جلدی پکتا ہے مگر جہاں تک ذائقے کا تعلق ہے میری رائے میں تریل بہترین سیب ہے۔ سوپور کے مضافات میں اس تریل کی فراوانی ہے۔ اس تریل کی تین اقسام ہیں۔ نابدی تریل جو زرد رنگ کی ہوتی ہے، جمامی تریل سرخ ہو جاتی ہے اور سیل تریل بندی اور جمادی تریل سے قدرے بڑی ہوتی ہے اس کا رنگ گہرا سرخ ہوتا ہے۔ جب یہ پک جاتی ہیں تو تینوں قسم کے ان سیبوں کا نیم ترش شیریں ذائقہ نہایت لذیذ ہوتا ہے اور جب یہ سڑ جاتی ہیں تو مہک کے معاملے میں یہ Medler سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اگر سیب کو صحیح تر وقت پر چن لیا جائے تو اس سے بہترین شراب تیار کی جا سکتی ہے۔ کھٹائی تریل ایک عمدہ ساخت کی تریل ہوتی ہے۔ سیبوں کی اور بھی کئی اقسام ہیں مگر کشمیری دودامبری کو ہی ہاتھ لگاتا ہے جو امبری قسم کے سیبوں میں سب سے میٹھا ہے۔ جنگلی قسم کے بہت سارے سیب مثلاً ٹینٹ شکر اور مالوم نہایت تازگی بخش ہیں اور یہ ایک عجیب بات ہے کہ تمام تر کشمیر میں صرف جنگلی درخت ہی پائے جاتے ہیں۔ ستمبر کے اوائل میں جنگلی سیب اور تریل چنتے ہیں۔ ان کو نصف کاٹنے کے بعد دھوپ میں خشک کرتے ہیں۔ قدیم طرز کے سیب نہایت ذائقے دار ہوتے ہیں اور انہیں گنہار کے آٹے کے ساتھ اُبال کر کھایا جاتا ہے۔

جہاں تک سیبوں کا تعلق ہے کشمیری نہایت قدامت پسند ہیں اور جب میں پہلے پہل اس

ملک میں آیا تو انہوں نے بتایا کہ پیوند اور کونپلیں لگانے کے ان کے طریقے بجا طور پر بہترین ہیں اور امبری سیب اتنا ہی اچھا ہے جتنا کوئی دیگر قسم کا سیب ہوتا ہے۔ یہ سیب میٹھا ہوتا ہے اور فروخت کے لئے اسے ہمیشہ تیار رکھا جاتا ہے۔ پنجاب امبری کی منڈی ہے اور دیہاتی دیگر اقسام کو ترویج دینا فضول سمجھتے ہیں مگر میں اپنے خیمے میں دو ایسے افراد کو لے گیا جو کونپلیں لگانے کے ماہر تھے اور رفتہ رفتہ میں نے عوام کے تعصبات پر غلبہ حاصل کرلیا۔ انہوں نے دیکھا کہ کونپلیں لگانے کا یورپی طریقہ ان کے طریقہ کار کی نسبت قدرے صاف اور محفوظ تھا۔ انہوں نے اس بات کو تسلیم کیا کہ ان کی پیوندی مواد، اس کی رال، گوشت کی چربی اور راکھ، دلدل اور تنے کی چھال کی نسبت زیادہ موثر ہیں۔ ہم نے جھیل ڈل پر واقع سرکاری نہالیوں سے ہزاروں کی تعداد میں پیوند شدہ درخت تقسیم کئے ہیں اور اب ہم نے ایسے باغات قائم کرلئے ہیں جہاں سے وادی کے اطراف واکناف کو فرانسیسی اور انگریزی سیب دستیاب ہوسکتے ہیں۔ کشمیر میں شاید ہی کوئی ایسا گوشہ بھی نہ ہوگا جہاں ثمردار درخت پیدا نہ کئے جاسکتے ہوں۔ یہاں تک کہ اسلام آباد سے اوپر خشک مرغزاروں میں بھی فرانسیسی ایک شاندار باغ ہے۔ جس کے لئے آرڈو جھیل ڈل سے روانہ کئے گئے تھے۔ آبپاشی ضروری نہیں ہے بلکہ شاخ تراشی اور دیوار بندی کی ضرورت ہوتی ہے مگر کشمیریوں کو اس بات کے لئے راضی کرنا مشکل ہوتا ہے کہ وہ اپنے درختوں کی شاخ تراشی کریں اور باغات سے مویشیوں کو باہر رکھیں۔ نہایت خوشحال لمبردار بہترین مالکان باغات ہیں اور وہ اس بات میں فخر محسوس کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے باغات کے گرد مٹی گارے کی بلند دیواریں تعمیر کرلی ہیں۔ راج پورہ کا قدوس میر ایک لمبردار ہے اور کشمیر کے کئی دوسرے لمبردار بھی اس کی تقلید کرنے لگے ہیں مگر وہ نہایت بلند قامت درخت کو پسند کرتے ہیں اور اب تک وہ شاخ تراشی کے قائل نہیں۔ اپنے باغات میں کھاد ڈالنے یا جڑوں کی شاخ تراشی کرنے میں انہیں کئی سال صرف ہوجائیں گے۔

ناشپاتی

ناشپاتی (5) ابھی تک کشمیر کے میووں میں دوسرا درجہ رکھتا ہے کیونکہ اس کی وسیع پیمانے پر درآمد نہیں ہوتی تاہم وادی میں چند اہم قسم کی ناشپاتیوں کی کاشت کی جاتی ہے ان میں سے بہترین ناخ ستارونی ہے جس کی شکل وصورت خوبصورت ہوتی ہے اور رسیلا مواد خوردنی ہوتا ہے اور ناخ

گلابی اور اس کی بالائی تہہ کافی سرخ ہوتی ہے۔ کشمیر کے اندر پہلے پیدا ہونے والی ناشپاتی کو گوش بگ کہا جاتا ہے جو نہایت لذیذ ہوتی ہے۔ بعد میں پیدا ہونے والے پھل کو ننگ کہا جاتا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی ناشپاتی دیر پا نہیں ہوتی۔ سرکاری نہالیوں سے وادی کے تمام حصوں تک ایک فرانسیسی ناشپاتی کی کاشت کی گئی ہے اگر ان ناشپاتیوں کو احتیاط سے ڈبہ بند کر کے ان کی فوری نقل وحمل نہ کی جائے تو یہ ہندوستان تک نہیں پہنچ پائیں گی۔ جنگلی ناشپاتی وادی کے تمام حصوں میں پائی جاتی ہے اور اکثر اسکی مطابقت ہرفورڈ شائیر کی پیری ناشپاتی سے ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ بہی کاٹتے وقت بھی ہمیں جنگلی ناشپاتی حاصل ہوتی ہے جس سے اچھی ساخت کی انگریزی ناشپاتی پیدا ہوگی۔ دیکھا گیا ہے کہ بہی کی قلمیں زمین میں نشو ونما حاصل کرتی ہیں اور یہ زمین جنگلی ناشپاتی کے لئے غیر موزوں ہے۔

بہی دانہ

ترش وشیریں ذائقے دار بہی دانہ اچھا خاصا مشہور ہے اور جھیل ڈل کے باغات میں اس پھل کے شاندار نمونے میسر ہوتے ہیں۔ درخت کو بیج حاصل کرنے کے لئے پیدا کیا جاتا ہے' جو پنجاب کو برآمد ہوتا ہے۔

انار

انار بھی یہاں پر عام پائے جاتے ہیں مگر ان میں کوئی خصوصیت موجود نہیں ہے۔

انگور

گذشتہ زمانہ میں کشمیر انگوروں کے لئے کافی مشہور تھا (6)۔ اگر وادی سندھ کے دہانے پر انگور کے چند باغات کو خارج کر دیا جائے تو اس ملک میں ریگستانی انگور حاصل کرنا محال ہو جائے گا اور ہر طرف انگور کی بیلیں سفیدوں اور دیگر درختوں کے ساتھ لپٹی ہوئی اوپر کی جانب بڑھتی دکھائی دیتی ہیں مگر یہ انگور اکثر جنگلی ہوتے ہیں۔ ان کا پھل کمزور اور بے لذت ہوتا ہے۔ عوام کا کہنا ہے کہ وہ اچھے انگوروں کو خود ہی کاٹ ڈالتے ہیں تا کہ انہیں سرکاری اہلکار چھین کر نہ لے جائیں۔ سندھ میں رائے پور کے انگوروں کے باغ کے سفید اور سرخ انگور کافی لذیذ ہیں لہٰذا اس بات کے لئے کوششیں جاری ہیں کہ رائے پور کے انگور وادی کے دیگر حصوں میں بھی پیدا کئے جائیں۔

انگور کھانے کے رجحان میں کمی واقع ہونے کے سبب شراب تیار کرنے کے لیے انگور پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس وقت جھیل ڈل کے کناروں پر انگور کے باغات ایک ہزار تین سو اُناسی ایکڑ رقبے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد حکومت میں ان انگوروں کو بورڈ ڈیکس سے ترویج دی گئی اور اس سکیم کو کامیاب بنانے کیلئے اخراجات کے معاملے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا۔ برگنڈی کا انگور کشمیر میں نہایت موزون ثابت ہوا۔ شراب کشید کرنے کے ایک قیمتی پلانٹ کو درآمد کرکے اسے جھیل ڈل کے کنارے پر گپکار میں نصب کیا گیا اور سال بہ سال میڈاک اور بارساک قسم کی شراب یہاں پر تیار کی گئی جو کبھی اچھی تو کبھی بُری ہوا کرتی تھی۔ مگر بھاری اخراجات کے باوجود انگور کے باغات نشو ونما حاصل نہ کرسکے اور معلوم ہوتا ہے کہ 1890 میں یہ انگور ایک بیماری میں مبتلا ہوئے۔ چنانچہ فوری طور پر امریکی انگوروں کی درآمد شروع کی گئی اور اب یہ انگور غیر صحت مند بورڈ ڈیکس پودوں کی جگہ لے رہے ہیں۔ انگوروں کے ان باغات کا چارج اٹلی کے ایک باشندے سنگور بین ڈیو بینوٹی کے پاس ہے اور شراب کا کارخانہ اٹلی کا ایک دوسرا باشندہ سنگور باسی چلا رہا ہے۔ اس کے علاوہ میڈرک اور برساک قسم کی شراب گپکار میں تیار کی جارہی ہے۔ یہاں پر سیبوں سے بھاری مقدار میں برانڈی تیار ہوتی ہے جو فوری طور پر فروخت ہو جاتی ہے۔ کشمیر میں شراب کی تجارت کے مستقبل کی بابت کوئی رائے قائم کرنا جلد بازی کے برابر ہوگا۔ انگور کے باغات کا انتظام براہ راست حکومت کے پاس ہے۔ نگہداشت کے باوجود انگور کو وہ ضروری توجہ حاصل نہیں ہورہی ہے جس کے سبب اسے کامیابی حاصل ہو۔ اس ملک کے کاشتکاروں نے انگور کی کاشت کو نہیں اپنایا ہے حالانکہ راجہ سر امر سنگھ کے سی ایس آئی اور دیوان امرناتھ نے انگوروں کے باغات قائم کئے ہیں اور انگوروں کی پیداوار شراب کے کارخانے کو فراہم کرتے ہیں، مگر میں نہیں سمجھتا کہ کبھی کشمیر کی میں شراب کی صنعت کو اہمیت حاصل ہوگی اور دیہاتی لوگ انگوروں کی کاشت کریں گے۔ فی الحال شراب کی واحد منڈی سرینگر ہے۔ نقل وحمل کی طویل مسافت اور سرحدوں پر محصولات کے سبب کشمیری شراب کی موزون قیمت پر ہندوستان تک برآمد نہایت مشکل ہے۔ مختصر یہ کہ موجودہ حالات میں یہ کاروبار نفع بخش نہیں ہے۔

ہاپس (جو)

مہاراجہ رنبیر سنگھ نے ہاپس جو کی کاشت کو ترویج دی تھی اور یہ کاشت منافع بخش ثابت ہوئی۔ سوپور کے نیچے ڈپ گام کے مقام پر گذشتہ چند برسوں کے دوران بے کار زمین کو قابل کاشت بنایا گیا ہے۔ اس سے حکومت کو اچھی خاصی آمدنی حاصل ہوتی ہے۔ 1893ء کے دوران تراسی ایکڑ زمین پر ہاپس کی کاشت کی گئی جس سے ڈھائی سو من پیداوار حاصل ہوئی تھی۔ ڈبگام کی مٹی کسی بھی طور اس کے نواحی علاقے کی مٹی سے بہتر نہیں ہے اور فی الحال جتنے علاقے پر ہاپس کی کاشت کی گئی ہے اس کی وسیع پیمانے پر توسیع کے معاملے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ مگر یہ معاملہ بھی انگوروں کی کاشت سے مطابقت رکھتا ہے۔ اور لوگ ہاپس کی پیداوار کی جانب راغب نہیں ہوئے۔ جب تک کشمیر کے چند دولت مند مالکان اراضی اس محفوظ اور منافت بخش فصل کی جانب توجہ نہیں دیتے تب تک ہاپس کی کاشت حکومت کے ہاتھوں میں ہی رہے گی۔

اخروٹ

کشمیر میں اخروٹ کا درخت ہے اور اس کا مقامی نام وونٹ ڈون (سخت اخروٹ) ہے۔ عام حالات میں اس کا خول توڑنا نہایت دشوار ہوتا ہے۔ یہ پھل بے کار ہے مگر اس کی چھال (دبل) بھاری مقدار میں پنجاب کو برآمد کی جاتی تھی۔ جب مالیہ ادا کرنے کا وقت آتا ہے تو کاشت شدہ درخت ایک دیہاتی کے لئے بھاری اہمیت کا حامل ہوتا ہے اور یہ بات قابل توجہ ہے کہ عوام اس پھل کی ترقی کے لئے قدرے بے اعتنائی سے کام لیتے ہیں۔ اخروٹ کا درخت تمام تر وادی میں ساڑھے پانچ فٹ سے ساڑھے سات فٹ کی بلندی میں پایا جاتا ہے۔ یہ درخت ایک بیج سے نشوونما حاصل کرتا ہے۔ اگرچہ پیوندکاری کا عمل کوئی غیر معمولی بات نہیں مگر عام خیال یہ معلوم ہوتا ہے کہ تین اقسام کاغذی، برزل اور وانٹو بیج سے نئی بیج سے حاصل کرتی ہیں۔ میں نے پوچھا اگر یہ بات ہے تو لوگ کاغذی اخروٹ کیوں نہیں بوتے، جس کا خول کاغذ کی مانند اور مغز نہایت عمدہ قسم کا ہوتا ہے اور برزل اور وونٹو کے مقابلے میں اس کی گری سے زیادہ قیمت حاصل ہوتی ہے تو اس کا جواب یہ ملا کہ اب تک اخروٹ تیل حاصل کرنے کے لئے اُگائے جاتے رہے اور کھانے کے لئے نہیں اور اپنے سخت خول کے باوجود وانٹو سب سے زیادہ ثمر دار ہے اور کافی

زیادہ تیل اس سے حاصل ہوتا ہے ۔ برزلی ،کاغذی اور وانو کے درمیان ساخت انگلینڈ کے
عامیانہ قسم کے اخروٹ کے مطابق ہے ۔اخروٹ کے چند درخت کافی جسامت حاصل کر لیتے ہیں
اور جوں ہی کوئی شخص پہاڑی وادیوں کی بلندیوں پر پہنچ جاتا ہے اس قسم کے شاندار درخت اُسے
دیکھنے کو ملتے ہیں ۔ان درختوں کا سایہ راحت بخش ہوتا ہے اور جب پھل اُگنے کا وقت آتا ہے تو یہ
درخت سیاہ ریچھ کا مسکن بن جاتے ہیں ۔ اور جب شور وغل کے ساتھ یہ اخروٹ کی گریاں
توڑتا ہے اس سے ریچھ کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے ۔اب تک حصول مالیہ کے لئے حکومت اخروٹ کا
تیل قبول کر لیتی تھی اور ایک دیہاتی کے لئے اخروٹ کا تیل پنجابی تاجروں کو فروخت کرنے کی
نسبت مالیہ محصول کی صورت میں دینا زیادہ منافعت بخش تھا ۔مگر مستقبل میں محصول کے طور پر اس
قسم کا تیل وصول نہیں کیا جائے گا چنانچہ اب اخروٹ کی برآمد میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے ۔
اخروٹ کی گری کو غذا کے طور پر استعمال کرنے کی کشمیریوں کو پرواہ نہیں مگر ہندوؤں اور مسلمانوں کی
طرف سے ارسال کیئے گئے نئے برس کے تحائف میں اخروٹ ایک اہم جزو ہے ۔ابھی زیادہ
عرصہ نہیں گذرا کہ کشمیر کے اخروٹ کو بھاری خطرہ درپیش تھا ۔پیرس میں ان بڑے تنوں کی بھاری
مانگ تھی جو اخروٹ کے تنے پر سے دستیاب ہوتا ہے ۔اس کی عمدہ لکڑی کو صندوقچے تیار کرنے کے
لئے مصرف میں لایا جاتا ہے اور ایک فرانسیسی باشندے نے ان سبوں کو کاٹنے کی اجازت حاصل
کر لی ۔ اسے معلوم ہوا کہ وادی کے جنوب میں سیاہ قسم کے ہیں مگر شمال کے پیڑ مفید اور فضول ہیں ۔
چنانچہ ان گنت درختوں کو تباہ و برباد کر دیا گیا ہے اور تنے کے ختم ہونے کے ساتھ ہی درخت بھی
بے جان ہو کر رہ جاتا ہے ۔ دیگر درختوں کی مانند اخروٹ کو جو دیگر خطرہ درپیش رہتا ہے وہ سخت
سردی کے موسم کے دوران تمام تر وادی میں منجمد ہونے والی برفانی آندھی کے سبب پیدا ہونے والی
بیماری کٹھ کشو ہے جس سے درختوں میں زندگی منجمد ہوتی ہے اور وہ بے جان ہو جاتے ہیں ۔اخروٹ
کے درختوں کو حکومت کی اجازت کے بغیر کاٹا نہیں جا سکتا مگر میرا تاثر یہ ہے کہ جب تک اخروٹ کی
شجرکاری شد و مد سے شروع ہو بہت سارے پرانے درخت خستہ حال ہو رہے ہیں ۔آخر کار اس
برس 1894 کے دوران میں کسانوں کو اخروٹ کے درخت لگانے کے لئے راغب کرنے میں
کامیاب ہو گیا اور ہر گاؤں میں بیج بویا گیا ہے ۔درختوں کو دو ہفتوں کے دوران گاٹا پک میں جمع

کر کے ایک خشک مقام پر شوراتری (مارچ) تک رکھنا لازمی ہے۔ انہیں پانی میں ڈبو کر دس دن تک رکھا جاتا ہے جس بیج کو مارچ میں بویا جاتا ہے وہ مئی میں پھوٹتا ہے۔ دو برس کے دوران ننھے دخت لگائے جاتے ہیں۔ حساب لگایا گیا کہ بوائی کے چھ برس تک اپنی ثمر داری کی نصف صلاحیت کا پھل دیتا ہے اور دس برسوں تک اس میں بھرپور ثمر داری ہوتی ہے۔ اخروٹ جمع کرنے کا طریقہ کار نہایت لاپرواہی سے بھرا ہوتا ہے اور جھڑیوں اور پتھروں سے ضرب کاری کے سبب شاخوں کو کافی نقصان ہوتا ہے اور درخت کی صورت مسخ ہونے پر وہ انگریزی کہاوت صادر آتی ہے کہ ایک بیوی اور اخروٹ کے درخت کو محض پٹائی کا صلہ حاصل ہوتا ہے۔ یہ حقیقت میری نظر میں آئی کہ اخروٹ چننے کے موسم میں بہت سارے اخروٹ درختوں پر ہی رہ جاتے ہیں اور میرے استفسار کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ گئے برس کے دوران کسی شخص کو درخت سے گر کر اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا تھا چنانچہ سبھی لوگ اخروٹ کے جان لیوا درخت سے خوف زدہ ہیں۔ اخروٹ کا درخت پھل پیدا کرنے میں انفرادی مزاج رکھتا ہے۔ یعنی دو تین برس کی شاندار فصل کے بعد دو یا تین برس تک یہاں کوئی پھل پیدا نہیں ہوگا۔ پرانے قسم کی درختوں کی لکڑی نہایت سخت ہوتی ہے جس پر سیاہ رنگ کے چند دانے ہوتے ہیں۔ فرنیچر اور بندوقیں تیار کرنے کے معاملے میں اس لکڑی کی بھاری مانگ ہے۔

بادام

وادی کے اطراف میں بادام کے باغات پھیلے ہوئے ہیں اور پہاڑی اطراف میں ان منافعت بخش درختوں کی شجر کاری آسانی کے ساتھ کی جاسکتی ہے۔ یہ قدرے غیر یقینی قسم کی فصل ہے چنانچہ اس فصل کی کاشت پر بہت کم توجہ دی جاتی ہے اور بادام کے باغات دیواروں کے بغیر رہ جاتے ہیں۔ بادام شیریں اور ترش دو قسم کے ہوتے ہیں۔ وادی کے اطراف میں باداموں کے تباہ حال درخت اس امر کا آئینہ دار ہیں کہ حکومت باغبانی میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔ ہزار باغات میں پودے لگانے کا حکم صادر کرنا آسان ہے مگر بادام کے باغات کو محصور نہیں کیا جاتا اور مویشی انہیں تباہ کر کے رکھ دیتے ہیں۔ جہاں پر نجی افراد نے باغات لگائے ہیں وہاں نتائج قطعی طور پر مختلف ہیں۔ انگور اور افیون کی فصلوں کے معاملے میں بھی حکومت کو اسی قسم کی ناکامی درپیش ہوئی۔ دنیا کی

کوئی بھی طاقت کشمیریوں کو اس امر کے لئے مجبور نہیں کر سکتی کہ وہ ایسی شئے کی کاشت کریں جسے وہ نفاست پسند سمجھتے ہیں۔

آبی شاہ بلوط ـــ سنگھاڑا

میں نے کسی دیگر باب میں اُن جنگلی پودوں کا شمار کرنے کی کوشش کی ہے جن کی معاشی افادیت ہوتی ہے مگر زراعت کے عنوان کے تحت سنگھاڑا کا شمار کرنا لازمی ہے جس کی گری شاندار خورراک فراہم کرتی ہے اور اس کے خول سے ایک اچھا ایندھن حاصل ہوتا ہے۔ سنگھاڑے کی مختلف اقسام ہوتی ہیں مگر سبھی سنگھاڑے پانی کی سطح پر سفید پھولوں کی صورت میں تیرتے معلوم ہوتے ہیں اور ہوا کے طرف ان کی ڈنڈیاں جھکی ہوئی ہوتی ہیں۔ جب پھل پک جاتا ہے اور سنگھاڑے جھیل میں ڈوب جاتے ہیں حالانکہ سنگھاڑہ جھیل ڈل اور دوسرے علاقوں میں پایا جاتا ہے مگر جھیل ولر اس کا گھر ہے مختلف اقسام میں سے بہترین ساخت کو باسمتی کہا جاتا ہے۔ اسی نام کے چاول کے اعزاز میں اسے یہ نام حاصل ہوا ہے۔ باسمتی ایک چھوٹا سنگھاڑہ ہوتا ہے اور اس کی جلد بھی باریک ہوتی ہے۔ اس سے دو تہائی خولوں کے عوض ایک تہائی گری حاصل ہوتی ہے۔ ڈوگرو ایک بڑا سنگھاڑہ ہے جس کا خول قدرے موٹا ہوتا ہے اور کنگر کا خول کافی مضبوط ہوتا ہے۔ جس کے سینگ لمبے اور باہر کی جانب نکلے ہوتے ہیں اور اس سے سب سے کم گری حاصل ہوتی ہے۔ باسمتی کی کاشت کو فروغ دینے کی کوششیں کی گئی ہیں مگر سال بہ سال اس کی قسم اونیٰ سے ادنیٰ تر ہوتی جا رہی ہے۔ چنانچہ سنگھاڑے نہایت سہل طریقے سے جمع کئے جاتے ہیں۔ سنگھاڑے کی کشتی کو ایک بربر کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے اور لمبے بانسوں کے ساتھ جھیل کی سطح کو ہلایا جاتا ہے۔ ان بانسوں کے ساتھ نیم دائرہ دار کا کرتے ہیں۔ جس کے ساتھ یہ کشتی طواف کرتی ہے۔ گریوں اور دلدل کا ایک بڑا ڈھیر نکال لیتے ہیں۔ اس کے بعد دلدل کی بانسوں (چوکدان) کے ساتھ پٹائی کی جاتی ہے۔ ایک جال (خوش بان) ان سنگھاڑوں پر ڈال دیتے ہیں اور بالکل باہر نکال لیتے ہیں۔ ایک اچھے دن کے کام کے بعد وہ تین من سنگھاڑے نکال لیتے ہیں۔ ان کے خولوں کو توڑ کر گری نکالی جاتی ہے اور خولوں کا استعمال ایندھن کے طور پر کیا جاتا ہے۔ جھیل ولر اور اس کے گرد و پاس آبی شاہ بلوط (سنگھاڑوں) کی بھاری وزن سال بہ سال جمع کی جاتی ہے اور

جھیل کے مضافات میں جب کبھی ساکن پانی موجود ہوتا ہے تو وہاں سنگھاڑہ حاصل ہوتا ہے۔ اکتوبر سے اپریل تک جب پانی کی سطح کم ہوتی ہے تو پانی کے قریب رہنے والے لوگ جھیل کی خوبصورت پیداوار اپنی کشتیوں میں لادنے میں ہمہ تین مصروف ہوتے ہیں۔ بھاری سیلابوں اور پانی بڑھ جانے کا مطلب عام طور پر مراد زیادہ فصل سے ہوتی ہے اور اچھے برسوں کے دوران ایک لاکھ من جائفل جمع کئے جاتے ہیں (7)۔ اس کی گری سفید اور غذا سے بھری ہوتی ہے۔ یا تو اسے آٹے کی صورت میں پیسا جاتا ہے یا اس کا دلیا بنا کر کھایا جاتا ہے۔ ایک پونڈ گری ایک دن کے کھانے کیلئے کافی ہوتی ہے۔ اس کا ذائقہ کسی طور پر بھی ناخوشگوار نہیں اور اس میں غذائیت کا عنصر بھی کافی حد تک موجود رہتا ہے۔ کُل سنگھاڑہ یا ایسے دیہاتی اور جن کے کھیت جھیل ولر کے وسیع و عریض پانی میں پھیلے ہوئے ہوئے ہیں صرف آبی شاہ بلوط یا سنگھاڑوں پر ہی گذر بسر کرتے ہیں۔ جھیل کا شمالی حصہ ہمیشہ نچلی سطح کا ہے۔ اور راس شکرالدین سے گروڑہ تک کھینچی گئی سبز لکیر کے شمال میں کوئی بھی شخص سبز سنگھاڑہ جمع کر سکتا ہے۔ مگر جب سنگھاڑہ پک کر جھیل کی تہہ تک دب جاتا ہے تو کوئی بھی اسکو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ کیونکہ یہ آئندہ برس کے بیج کیلئے درکار ہوتا ہے۔

اختتامیہ

اس بات کے اختتام پر یہ بیان کیا جاسکتا ہے کہ یہاں جو بھی ہری پیداوار موجود ہیں انہیں کشمیر کی معتدل آب و ہوا میں پیدا کیا جاسکتا ہے۔ جیسے جیسے وادی میں کاشتکاروں کو معلوم ہوگا کہ زمین پر کھیتی کا کام محض منافع کمانے کے لئے نہیں بلکہ کم از کم اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لئے بھی کیا جاسکتا ہے تو میرے خیال میں نئی اجناس کو ترویج دی جاسکتی ہے جن کی کاشت کے اچھے نتائج حاصل ہوئے ہیں۔ آلو کی کاشت کو بڑھاوا دیا جاسکتا ہے۔ ہاپس کی کاشت مستحکم ہو چکی ہے۔ تمام قسم کے نہایت نازک پھل اور سبزیاں پیدا کی جارہی ہیں اور ان میں ناشپاتیاں، آڑو، خوبانیاں، بیرو، جنگلی پھل اور ترکاری اسپرگیس محض اسی انتظار میں ہیں کہ یہاں پر سبزیوں اور پھلوں کو ڈبہ بند کرنے کی صنعت کو فروغ حاصل ہو۔ یہاں پر خشک آب و ہوا کے سبب چقندر کی کاشت نہیں ہوسکے گی۔ مگر سرینگر میں واقع یورپی باشندوں کے باغات میں پہلے ہی عمدہ قسم کے چقندر کی کاشت کی جارہی ہے۔ میں اس بات کا تعین نہیں کر سکا کہ آیا چقندر کی فصل کھیت میں اُگانے کی

پہلی کوشش آب وہوا کے سبب ناکام ہوئی یا اس کے لئے انسانی کوتاہی ذمہ دار ہے۔ کھانڈ کی مانگ اور اس کے لئے انسانی کوتاہی ذمہ دار ہے۔ کھانڈ کی مانگ اور اس کی مہنگی قیمت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے میں اس بات کا خیال کرتا ہوں کہ اگر سرمایہ اور صلاحیت میسر ہو جائے تو کھانڈ تیار کرنے کے لئے چقندر کی کاشت کرنا مناسب ہوگا۔ اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ کشمیر کے بہت سارے حصوں میں شکر مایل کو کامیابی کے ساتھ ترویج دی جاسکتی ہے۔ یورپ سے پینی شاہ بلوط کی درآمد کی گئی ہے اور یہ کہنا ابھی کافی حد تک قبل از وقت ہوگا کہ آیا یہ درآمد کشمیر کی غذائی مصنوعات کا ایک حصہ بن سکے گی۔ ماضی کا تجربہ واضح طور پر بتایا ہے کہ جب تک دیہاتیوں کی اپنی مرضی نہ ہو تب تک کوئی اہم فصل پیدا کرنے میں کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی اور حکومت کا کام محض اچھے نباتاتی باغات اور تجرباتی کھیتوں کے رکھ رکھاؤ تک ہی محدود ہونا چاہئے۔ غفلت زدہ باغات چرمراتے ہوئے ریشم گھر اور جموں کے زبوں حال چائے کے باغات اور نیل کے کارخانے اُن اداروں اور کارخانوں کی مایوس کن صورتحال کی علامات ہیں جنہیں حکومتی اہلکاروں کے زیر بندوبست رکھا گیا۔ جہاں تک کشمیر میں موجودہ کاشت کا تعلق ہے مجھے توقع ہے کہ آبادی میں اضافے کے ساتھ ساتھ زراعت میں بھی بتدریج اضافہ ہوگا۔ فی الحال کھیتوں کے وسیع رقبوں کے موجب زمین کس حد تک دباؤ کی شکار ہے۔ گندم، جو اور السی کی حالت کافی خستہ ہے اور تھوڑی ہی محنت سے ان فصلوں کی پیداوار دوگنی کی جاسکتی ہے۔ ایسی زمین پر نہ تو مناسب طور پر ہل چلایا جاتا ہے نہ کھاد ڈالی جاتی ہے اور نہ ہی کبھی اس سے گھاس پھوس نکالی جاتی ہے اور کھیت نیل اور دوسرے پودوں کے سبب گھٹن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ایک خشک زمین میں کیا ہوسکتا ہے؟ اس کی مثال کے طور پر میں پانپور کے نزدیک لیتہ پورگاؤں کا ذکر کروں گا۔ اس زمین پر پانچ مرتبہ ہل چلایا جاتا ہے۔ چنانچہ یہاں پر گندم کی فصل نہایت عمدہ فصل پیدا ہوتی ہے اور یہ فصل کبھی ناکام نہیں ہوئی۔ اس زمین پر فصل کی کٹائی کے بعد ہمیشہ ہل چلایا جاتا ہے۔ آلہ تخم ریزی کی ترویج سے کافی کفایت ہوگی۔ فصل اور کھاد کی نقل وحرکت کے لئے پہیہ دار گاڑی کے استعمال کے سبب دوسری سرگرمیوں پر محنت صرف کی جاسکے گی۔ اس کے بعد یہ بھی ممکن ہوسکتا ہے کہ کشمیر کے بہت سارے حصوں میں کاشت کار دوہری فصل پیدا کرنے کے طریقہ کو اپنائیں۔ 93-1892 کے دوران یہ طریقہ کار چند

دیہات میں کامیاب ہوا۔ اس سمت میں ایک کشمیری کو ابھی بہت کچھ سیکھنا باقی ہے۔ مگر چاول کی اہم فصل کے معاملے میں اسے زیادہ کچھ سکھانا ایک مشکل کام ہوگا۔ جو مشورہ مناسب سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ جب فصل کاٹی جاتی ہے' چاول کے کھیت نہایت نم اور نرم ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس پر ایک مرتبہ ہل چلا کر اسے دھوپ، ہوا، پالے اور برف کے لئے کھلا چھوڑ دیا جانا چاہئے اور میں نے زور دیا ہے کہ فصل کٹائی کے وقت ہل چلانے والے مویشی بے کار اور اچھی حالت میں ہوتے ہیں۔ اور جہاں لاغر اور کمزور ہوتے ہیں' وہاں کھیتوں کو موسم بہار تک بے کار چھوڑ دینے میں ہی دانشمندی ہے۔ اگر انہوں نے میرے مشوروں پر عمل کیا تو گھاس پھوس نکالنے کی محنت دوگنی ہو جائے گی۔ شاید ان کی یہ بات درست بھی ہے۔ جیسے جیسے آبادی میں اضافہ ہو رہا ہے تو بڑے کریوہ اراضیات اور دلدلی اراضیات کو قابل کاشت بنانے پر توجہ مبذول ہوگی اور میں نے اس بارے میں کریوہ جات کے سروں پر واقع چند مینڈوں کی بابت تجویز پیش کی ہے۔ اس وقت بھاری بارشیں کریوہ کی سطح کی مٹی بہا کر لے جاتی ہیں۔ اگر کریوہ جات کے سروں پر شجرکاری کی جائے تو کریوہ جات کی زمین کی حالت میں بجا طور پر بہتری پیدا ہوگی۔ جہاں تک دلدلی زمینوں کا تعلق ہے، میرا خیال ہے کہ راجدھانی کے ساتھ ایک وسیع دلدلی رقبہ ہے جو مکئی اور تلہن کے لئے موزون ہے اور اسے قابل کاشت بنایا جاسکتا ہے۔ میں اس وقت کے انتظار میں ہوں جب بھاپ سے چلنے والے ایسے پمپوں کو بروئے کار لایا جائے گا جن میں پیٹ ڈالا جائے گا۔ آبپاشی بھی کافی حد تک ممکن ہوسکے گی۔ سندھ اور لیدر دریاؤں کو آبپاشی فراہم کرنے کے لئے استعمال کیا جائے گا اور دریائے جہلم پر بھی توجہ دے کر اسے آبپاشی کا ذریعہ بنایا جاسکتا ہے۔ دلدلی زمینوں میں نالیاں تعمیر کی جائیں اور کریوہ اراضیات کی کوہلوں اور کنوؤں کے ذریعے آبپاشی ہو تو کشمیر میں زراعت کا مستقبل روشن ہے۔ حکومت کو آبپاشی پر کوئی روپیہ پیسہ صرف نہیں کرنا چاہیے جب تک کہ باقی متعلقہ زمین دستیاب نہ ہو۔ یہ اب چند سال کی بات ہے۔

●❀❀❀●

حوالہ جات

(1) انگلستان میں گھوڑے کے گوبر کو گائے کے گوبر سے بہتر مانا جاتا ہے۔شاید کشمیر میں گائے کا گوبر اس لئے بھی موثر ہوتا ہے کہ مویشیوں کو موسم سرما کے دوران تیل کی ٹکیہ کھلائی جاتی ہے جبکہ گھوڑوں کو گھاس پھوس کے سوا کچھ نہیں ملتا۔

(2) اہل کشمیر نے سال کی تقسیم اس طرح کی ہے:

سونت	:	15 مارچ سے 15 مئی تک
گریشم	:	15 مئی سے 15 رجولائی تک
وہرات	:	15 جولائی سے 15 ستمبر تک
ہرُدُ	:	15 ستمبر سے 15 نومبر تک
وَندہ	:	15 نومبر سے 15 جنوری تک
شِشُر	:	15 جنوری سے 15 مارچ تک

ان مہینوں کے نام یاد رکھنا مفید ہے۔کشمیری ان مہینوں کی بابت قدرے مذبذب ہیں اور گریوس یعنی کاشتکاروں کے مہینے عام طور پر سرکاری مہینوں کے ایک ماہ پیشگی ہوتے ہیں۔بیان کیا جاتا ہے کہ گریسی کلینڈر کی ترویج سلطان العارفین نے کی اور کشمیری کاشکار ہمیشہ ویشاکھ، زیٹھ، شراوُن، بھوڈر، اشوج، کتک، منگور اور پھِتر کی بات کرتے ہیں جبکہ ہندوستانی مہینوں میں دن کے متبادل بیساکھ، جیٹھ، ساون، بہادون، اسوج، کارتک، مگھر اور چیت ہیں۔

(3) بعض اوقات چاول کی فصل کاٹنے کے بعد کھیتوں کو دوبارہ سیراب کیا جاتا ہے اور ان میں دو سے تین ماہ تک پانی کھڑا رہنے دیا جاتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ پانی گھاس پھوس کو تباہ کر دیتا ہے اور زمین کو تقویت بخشتا ہے۔ اس عمل کے فائدوں کے بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے اور کسی بھی طور پر یہ اختلاف عام نہیں ہے۔

(4) زعفران کی کاشت کے تحت ایک ہزار سے بارہ ہزار زمین کے ابھار تھے۔ جن سے اُن لوگوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے بھی امکانات تھے جنہیں خوش کرنا نہایت مشکل ہے۔

(5) ناخ ایک بڑی ناشپاتی ہے جسے ستمبر کے اواخر میں چُنا جاتا ہے۔ اس سے بھی بڑی ناشپاتی کو گوشہ بزب کہتے ہیں جس کا رنگ پکنے پر زرد ہو جاتا ہے اور اس میں کافی رس موجود ہوتا ہے۔

(6) آج کے مقابلے میں اکبر کے دورِ حکومت میں انگوروں کی فراوانی تھی۔ کشمیر میں ایک دم کے عوض آٹھ سیر انگور فروخت ہوتے تھے اور ایک من انگور کی نقل و حرکت کا خرچہ دو روپے تھا۔ کشمیر کے لوگ لمبی ٹوکریوں میں بھر کر یہ انگور اپنے کندھوں پر اٹھا کر لاتے تھے۔ آئینِ اکبری میں ایک دم کی قیمت ایک روپے کے چوتھے حصے کے برابر تھی۔

(7) کورکرافٹ کا بیان ہے کہ جب اس نے کشمیر کا دورہ کیا تو پتہ چلا کہ حکومت کو شیاسٹھ ہزار خروار سنگھاڑے حاصل ہوتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ جا ئفل کی مجموعی پیداوار اڑتیس ہزار ٹن تھی۔ اس بات میں شک نہیں کہ سنگھاڑوں کی پیداوار میں کمی واقع ہوئی ہے اور عوام زراعت کے پیشے کو ترجیح دیتے ہیں۔

●❀❀❀●

چودھواں باب

مال اور مویشی

حیوانات

کشمیر میں جو مویشی پائے جاتے ہیں وہ جسامت کے لحاظ سے چھوٹے مگر سخت جان ہوتے ہیں اور وہ بہت فائدہ مند کام کرتے ہیں۔ جو حیوانات برطانیہ میں موجود ہیں وہ اُن سے قدرے بڑے ہیں۔ اُن کی پیٹھ دل کش ہوتی ہے اور ان کا رنگ عام طور پر سیاہ یا بھورا ہوتا ہے۔ کشمیر کے بہت سے گاؤں میں افزائش حیوانات کا عمل جاری ہے اگرچہ اس میں بے قاعدگیاں پائی جاتی ہیں اور خاص نسلوں کی افزائش کی طرف توجہ نہیں دی جاتی۔ دُودھ فروشوں کے پاس جو گائیں ہیں ان میں پنجابی خون دوڑتا ہے۔ اب رفتہ رفتہ شیر گوجری اپنے بیل کی ساکھ اس ملک میں بٹھا رہے ہیں۔ جھیل وُلر کے نزدیک زمینوں اور وادی کے شمال مغرب میں مویشی جنوبی علاقوں کی نسبت بہتر نسل کے ہیں۔ میں اس کے لیے پنجابی خون کو ذمہ دار گردانتا ہوں جسے کشمیری میں پاُ رَیم کہتے ہیں۔

جب میں نے وادی کے شمال مغرب میں چند مویشیوں کا وزن کیا تو یہ 35 اور 41 اسٹون تھا۔ دیہاتیوں کے پاس موجود بیلوں کا اوسط وزن 22 اور ½22 اسٹون تھا۔

عادات کی رو سے کشمیر کے مویشی گویا قدامت پسند ہیں۔ اس لیے اگر جھیل وُلر کے اردگرد کی اراضی

میں افزائش شدہ ایک مویشی اونچے دیہات میں لے جایا جائے تو اس کی حالت خراب ہو جائے گی اور کنڈی علاقوں کے دیہات میں افزائش شدہ بیل میدانوں میں بے کار ہو جاتے ہیں۔

جوں ہی موسم گرما کی آمد ہوتی ہے کھیتوں میں ہل چلانے کے لیے درکار بیلوں اور گائیوں کے سوائے تمام مویشیوں کو ہانک کر اونچے پہاڑوں پر لے جایا جاتا ہے جہاں پر انھیں عمدہ چارہ حاصل ہوتا ہے۔ یہ مال مویشی موسم خزاں کے دوران پودوں میں واپس آ جاتے ہیں۔ ایک کشمیری اپنے ہل چلانے والے بیلوں کا استعمال ہرگز بار برداری کے لیے نہیں کرے گا۔ جب فصل کی کٹائی اور بار برداری کا کام ہوتا ہے تو یہ مویشی بے کار مگر تیار رکھے جاتے ہیں۔ کشمیریوں کا کہنا ہے کہ بیلوں کو ہر صورت آرام حاصل ہونا چاہیے اور چاول کے کھیتوں کے دلدلی زمین میں کام کرنے کے بعد ان کے پاؤں پھٹ جاتے ہیں۔

موسم سرما کے لیے چارہ جمع کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔ چاول اور مکئی کا بھوسا مویشیوں کا بنیادی چارہ ہوتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی بھاری مقدار میں گھاس بھی رکھی جاتی ہے۔ چاول اُگانے والے کھیتوں کی سرحدوں پر گھاس کی عمدہ فصل پیدا ہوتی ہے جس کو نہایت احتیاط کے ساتھ کاٹا اور خشک کر کے رسّوں کی صورت میں موڑا جاتا ہے۔ ان رسوں کو درخت سے لٹکایا جاتا ہے اور موسم سرما کی بارش اور برف باری کے درمیان انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ بلندی پر واقع دیہات میں گھاس انگریزی طرز پر تیار کی جاتی ہے۔ یہ گھاس میٹھی اور خوشبودار ہوتی ہے۔ بہترین قسم کی گھاس میں بیرن، جب، بٹاکولیٹ (ترل) اور میتھی شامل ہیں۔ مختلف اقسام کے گھاس کے علاوہ متعدد درختوں کے پتے بھی نہایت احتیاط کے ساتھ جمع کیے جاتے ہیں۔ پہاڑی دیدار اور سفید روئی دار اور خاردار جھاڑی سے اچھی گھاس میسر ہوتی ہے اور جب موسم خزاں آتا ہے تو درخت بے برگ اور بے جان ہو جاتے ہیں۔ موسم سرما کے دوران بیلوں اور دودھ دینے والی گائیوں کو کھلی کی ٹکیا اور کپاس کا بیج کھانے کو دیا جاتا ہے مگر دوسرے مویشیوں کی حالت نہایت نازک ہوتی ہے۔ وہ اپنے مالک کے مکانوں کے گرم اور تاریک گاؤ خانے سے باہر آتے ہیں۔ وہ نہایت کمزور اور لاغر دکھائی دیتے ہیں۔ کشمیری یقینی طور پر اس بات کو صحیح سمجھتا ہے کہ گرمی ہی خوراک ہوتی ہے اور وہ اس بات سے قطعی طور پر بے بہرہ ہے کہ ان گاؤ خانوں میں روشن دانوں کی ضرورت

بھی ہوتی ہے۔ ہل چلانے والے مویشیوں کی قیمتیں بڑھ چکی ہیں اور ان میں اضافہ ہو رہا ہے۔ عام قسم کے ہل چلانے والے بیلوں کی ایک جوڑی پچیس روپے میں مل جاتی ہے مگر وہ پانچ برس کی عمر میں ہی باقاعدگی کے ساتھ جانفشانی کا کام شروع کرے گی۔ اوسط قسم کا ایک بیل آٹھ برس تک اچھا کام کرے گا مگران کے لیے پیچش نہایت مہلک بیماری ہے۔

ایک گاؤں کی عام گائے دودھ دینے والا اچھا حیوان ہے۔ جو گائے ایک دن میں چار سیر دودھ دیتی ہے اسے خزانہ تصور کیا جاتا ہے۔ مناسب خوراک فراہم کر کے شہر کا شیر گوجری اچھے نتائج حاصل کر لیتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ اچھے نتائج افزائش کے ذریعے حاصل ہو سکتے ہیں۔ ان کے پاس اب ایسی گائیں ہیں جن سے ہر روز آٹھ سیر دودھ حاصل ہو سکتا ہے۔

موسم گرما کے دوران دودھ دینے والے مویشیوں کے لیے تری اور کھر قسم کے گھاس ہوتے ہیں اور موسم سرما کے دوران تلف شدہ گھاس کے ساتھ چاول کا بھوسہ اور چاول کا چھلکا ملایا جاتا ہے۔ اس میں چاول کا پانی (چھلِل وونی) ملائے جانے کے بعد دودھ کی پیداوار میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ دراصل ایک کشمیری کے پاس اس کے مویشیوں کی بارے میں بہت سارے محاورے ہیں۔ ایک محاورے کے مطابق کسان کو تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ مویشیوں کی خرید کا سودا طے کرنے سے قبل بیل سے ہل چلا کر اور گائے کا دودھ دوہ کر کریں۔

''دٔندٔ ا۔ستھ گاؤ چاؤتھ'' محاورے میں اس بات پر توجہ مبذول کرائی گئی ہے کہ جو گائے آہستہ آواز میں ڈکراتی ہے اور جس کے تھن موٹے ہوتے ہیں وہ زیادہ دودھ دیتی ہے۔

ہل چلانے والے بیلوں کی طرح گائیوں کی قیمتیں بھی بڑھ گئی ہیں۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گذرا کہ چار سیر دودھ دینے والی ایک گائے کو آٹھ روپے میں خریدا جا سکتا ہے مگر اب یہ گائے پندرہ روپے میں بھی حاصل کرنا مشکل ہے۔ ڈیری والے (شیر گجری) تین برس سے زیادہ عمر کی ہر گائے پر دس آنے کا ٹیکس دیتے ہیں۔

بھینس

کشمیر میں بھاری مقدار میں گھی تیار ہوتا ہے۔ اگرچہ گائیں اور بکریاں ہندوستان کے اس مکھن کا نہایت چھوٹا حصہ فراہم کرتی ہیں مگر گھی کا زیادہ حصہ بھینس کے دودھ سے تیار ہوتا ہے۔

کشمیر کے حکمرانوں کی یہ پالیسی رہی ہے کہ وہ گوجروں کو وادی میں اپنا مسکن بنانے کی ترغیب دیں۔ جبری مزدوری سے مستثنیٰ اور نقدی کی صورت میں تخمینہ بازی کے باعث ان خانہ بدوشوں کو یہاں آباد ہونے کی ترغیب حاصل ہوئی ہے اور تمام تر وادی میں جنگلات کی حدود پر گوجروں کی سپاٹ چھت والی جھونپڑیاں مکئی کی فصل میں پوشیدہ دیکھی جاسکتی ہیں۔ ایک گوجر اپنی جھونپڑی یا اپنے کھیتوں کی بہت کم پرواہ رکھتا ہے۔ وہ خود کو جنگلات کا مالک کہتا ہے اور جب بلند پہاڑوں پر برف پگھل جاتی ہے تو وہ اپنے کنبے کے ہمراہ بہترین کپڑے زیب تن کر کے اپنی بھینسوں کو لے کر جلدی پہاڑی بلندیوں کی جانب روانہ ہو جاتا ہے۔ وہ وہاں پر صحت مند خانہ بدوش زندگی گزارتے ہیں اور پہاڑی پر واقع اپنے جھونپڑوں میں مکھن تیار کرتے ہیں۔ اس مکھن کو پنجابی تاجر خرید لیتے ہیں جو اس مکھن کو گھی میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ موسم گرما کے مہینوں کے دوران جب گھاس کی فراوانی ہوتی ہے تو 40 سیر مکھن سے 32 سیر گھی حاصل ہوتا ہے۔ درحقیقت اس سے درمیانہ دار تمام تر منافع کما لیتا ہے اور ملاوٹ کر کے گھی کی مقدار میں اضافہ کر لیتا ہے۔ 8 سیر گھی میں وہ 2 سیر اخروٹ کا تیل ملائے گا۔ اب جب کہ اخروٹ کے تیل کی قیمت میں اضافہ ہو رہا ہے تو اس بات کا امکان ہے کہ اس قسم کی آمیزش کا سلسلہ بند ہو جائے گا۔ جب ایک درمیانہ دار ایک گوجر سے مکھن وصول کرتا ہے تو وہ اس میں نمک ملا دیتا ہے اور اس کا گھی بنانے سے قبل اس کو دو ماہ تک سنبھال کر رکھتا ہے۔ تمام گوجر درمیانہ داروں کے غلام ہیں کیونکہ ان میں پیشگی وصول کرنے کا رواج ہے۔ میں نے اکثر گوجروں پر زور دیا کہ وہ اپنے آپ کو آزاد کرالیں اور گھی کی قیمتوں میں اضافے کے عمل میں شریک بنیں مگر کشمیری گوجر اپنے دوست اور رفیق بھینسوں کی مانند بے وقوف اور کاہل ہوتا ہے۔ یہ ایک نہایت دلدوز امر ہے کہ گوجر اپنے بھینسوں کے ساتھ نہایت شدت کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ وہ نہ تو کسی دوسری چیز کے بارے میں سوچتا ہے اور نہ ہی کسی دوسری شے کی پرواہ کرتا ہے۔

5 برس کی عمر میں بھینس بچھڑا پیدا کرتی ہے اور بچھڑا دینے کے بعد وہ 18 مہینے تک دودھ دیتی ہے۔ ایک بھینس 15 برس کی عمر پہنچنے تک دودھ دیتی رہتی ہے۔

دودھ دینے والی ہر ایک بھینس پر ایک ٹیکس عائد کیا جاتا ہے جسے شاخ شماری سے موسوم کیا

گیا ہے۔ جو 1:40 روپے سالانہ ہوتا ہے۔ اس قسم کے بیل کو ماٗش کہتے ہیں۔

ایک بانجھ بھینس نصف ٹیکس ادا کرتی ہے جب کہ اپنے اولین بچھڑے والی بھینس نوشکم کو ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ نوزائد بچھڑا جب بڑا ہو جاتا ہے تو اسے کٹی اور بھینس کو جاموس کہا جاتا ہے۔ صرف ایک بچھڑا نسل کشی کے لیے بچا کر رکھا جاتا ہے۔ اور اس نظام کے تحت کشمیر میں بھینسوں کا انتخاب مضبوط اور نفیس قسم کا ہے۔ کشمیر کے گھی کے بارے میں مختلف لوگوں کی مختلف آرا ہیں۔ مگر اس معاملے میں ماہرین کی رائے میں یہ گھی اعلیٰ قسم کا ہے۔ گائے کے دودھ سے بہترین قسم کا گھی تیار کیا جاتا ہے اس کے بعد بھینس کا گھی ہے جبکہ بکریوں کا گھی رنگ میں نہایت صاف وشفاف ہے اور لذت کے معاملے میں یہ گھی تیسرے درجے کا ہے۔

لولاب کے گوجر پٹھان اچھی قسم کا پنیر تیار کرتے ہیں جسے وہ دودھی روئی کے نام سے پکارتے ہیں۔ انگریز خواتین بھی فروخت کے لیے پنیر تیار کرتی ہیں۔ اور بہت سارے لوگ اس پنیر کو پسند بھی کرتے ہیں۔ اس بات میں شک نہیں کہ ایک اچھا پنیر تیار کرنے والا اگر اپنے کاروبار میں تھوڑا سا سرمایہ لگائے تو اسے کامیابی حاصل ہوگی۔ وادی میں دودھ کی فراوانی ہے اور یہ ملک بالائی ہندوستان کو پنیر اور مکھن کی رسد کا ثابت ہو سکتا ہے۔

بھیڑ

کشمیر میں بھیڑوں کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے اور دیہی عوام کے لیے ان کی بھاری اہمیت ہے۔ آئرلینڈ میں سور کی مانند وہ کرایہ ادا کرتے ہیں جب کہ وہ گوشت کی خاطر شہری قصابوں کو فروخت کر دی جاتی ہیں۔ مگر چار برس کی عمر تک کشمیری اپنی بھیڑ کی بھاری قدر کرتا ہے کیونکہ ان سے اُون حاصل ہوتا ہے۔ اور اشد ضرورت کی مجبوری کے تحت ہی وہ مادہ بھیڑ کو خود سے الگ ہونے دے گا۔ مادہ بھیڑ موسم بہار اور موسم خزاں کے آخر میں میمنے دیتی ہے۔ مگر موسم بہار میں دیے گئے میمنے سب سے زیادہ مضبوط اور طاقتور ہوتے ہیں کیونکہ انھیں غذا میسر ہوتی ہے۔ مادہ بھیڑ دو برس کی عمر میں میمنا دینا شروع کرتی ہیں اور چھ برس کی عمر تک افزائش نسل کے قابل ہوتی ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے دانت کھو دیتی ہے موسم بہار اور موسم گرما کے اوائل میں سبز گھاس میسر ہوتا ہے اور گرے ہوئے شہتوت میں لذیذ اور مقوی غذا حاصل ہوتی ہے۔ جب گرمی زیادہ

ہوتی ہے اور بھیڑ درختوں کا سایہ تلاش کرتے ہیں جو دیہات میں اکثر فراوانی سے میسر ہوتا ہے تو ایک پیسہ ور گڈریا آکر بھیڑوں کے ریوڑ ہانک کر وادی کی بلند ڈھلوانوں تک لے جاتا ہے۔ جب وہ اپنے بھیڑوں سمیت چاول کے کھیتوں سے گذرتا ہے تو وہاں ابھی تک تخم ریزی نہیں ہوتی اور ایک رات وہاں پر قیام کے دوران وہ زمین کی زرخیزی میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ اس خدمت کے عوض چرواہے کو اچھا خاصا معاوضہ حاصل ہوتا ہے اور جیسے جیسے ایک گڈریا پہاڑوں کی طرف اپنے سفر کے دوران کھیتوں سے گذرتا ہے تو اُسے بھاری مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔ مگر ایک بار جب وہ چرواہا پہاڑوں پر پہنچ جاتا ہے تو اس مقبولیت کے بعد وہ بے اعتباری کا شکار ہو جاتا ہے اور مقررہ وقتوں پر اپنے بھیڑوں کے لیے نمک لے جانے میں اسے کافی دقت لگتا ہے۔ ایک دیہاتی جوں ہی کاہچرائی کے میدانوں کے قریب پہنچتا ہے یہ نظارہ اس وقت نہایت دلچسپ معلوم ہوتا ہے جب اُسے یہ معلوم ہو جائے کہ اس بھیڑ کو راستے میں ریچھ یا چیتا کھا گیا ہے۔ اگر کوئی بھیڑ غائب ہو جاتی ہے تو گڈریے کو لازمی اس کی کھال پیش کرنا ہوتی ہے اور جب تک گاہک کے ساتھ یہ طے نہ ہو جائے کہ وہ اس کی کھال واپس کر دے گا وہ کبھی بھیڑ فروخت نہیں کر سکتا کیونکہ اسے اپنے گاہک کی زبان بندی کرنا ہوتی ہے۔ یہ کام نہایت مشکل ہے کیونکہ کشمیری کاروبار کے معاملے میں نہایت تیز اور طرار ہوتا ہے کہ وہ آسانی سے چوپانوں کی چوری قبول نہیں کرتا۔ مگر چوپان بھی کسی بدمعاش سے کم نہیں ہوتا۔ وہ اپنے کام کو اچھی طرح سمجھتا ہے اور اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ کوئی دوسرا چوپان اس کے مقررہ کاہچرائی کے رقبہ میں بے جا مداخلت نہ کرے۔

چوپان اپنے آپ کو ایک ممتاز طبقہ خیال کرتے ہیں اور وہ آپس میں ہی ازدواجی رشتے قائم کرتے ہیں۔ اکثر وہ کسی بے ایمان بھائی کی سزا معاف کر کے اسے گاہکوں کو نقصان پہنچانے سے روکتے ہیں۔ چنانچہ ایک دیہاتی پوری طرح چوپانوں کے رحم وکرم پر ہوتا ہے۔ پہاڑوں میں کسی شکایت کے ازالہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہاں تو یہ محاورہ صادر آتا ہے کہ ''کوہ کوتوال یار صوبیدار'' یعنی پہاڑ تو منصف ہوتا ہے اور صنوبر کا درخت پولیس اہل کار اور دونوں کسی دیہاتی کی شکایت سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔

دونسو کھیل کے بارے میں اپنی سروے رپورٹ۔ پیرا نمبر دو سے میں یہ اقتباس پیش کرتا

ہوں۔'' زمینی علاقوں میں دور تک کاشت کی گئی ہےاور کاہچرائی کے لئے بہت ہی کم زمین دستیاب ہے چنانچہ دیہاتیوں کا انحصار پہاڑی چراہ گاہوں پر ہوتا ہے جو یہاں سے مغرب میں واقع ہیں۔ جونہی گرمی میں شدت پیدا ہوتی ہے تو گائیں دوودھ نہیں دیتیں۔ چنانچہ ٹٹو اور گائیں تو سہ میدان کی طرف روانہ ہو جاتی ہیں۔ ماہ جیٹھ کے دوران بھیڑیں رایار کے قریب جمع ہو جاتی ہیں۔ یہ ایک چراگاہ اس مقام پر واقع ہے، جہاں دریائے سکھ ناگ پہاڑوں سے نکل کر سوندی پورہ سے گذر کر درگر کی طرف روانہ ہوتا ہے۔ رایار سے دود پتھری تک کے لیے قطعہ اراضی کو ہک کھل کہا جاتا ہے جہاں بھیڑوں کا شمار کیا جاتا ہے۔ یہ کام ان ٹھیکیداروں کے ذمہ ہوتا ہے جو کاہچرائی کا ٹیکس وصول کرتے ہیں۔ مقامی رواج کے مطابق ہر دیہاتی کو لازماً ایک بھیڑ چوپان کے سپرد کرنا پڑتا ہے اور ہر بھیڑ کے لیے چوپان کو معاوضہ بھی دیا جاتا ہے جو دو سے تین من وٹی (قریباً ڈھائی پونڈ کا وزن) شالی یا مکئی کی صورت میں ادا کیا جاتا ہے۔ اگر کسی چوپان کی شہرت اچھی ہو تو اسے تین من وٹی غلہ دیا جاتا ہے۔ چوپان کے انتخاب کے معاملے میں دیہاتی بے بس نظر آتے ہیں۔ یہ کام موروثی نوعیت کا ہے اور چوپان الگ قسم کے لوگ ہوتے ہیں جو اپنے بے ایمان بھائی کا تعزیری کارروائی یا گاہکوں کے نقصان سے تحفظ کرتے ہیں۔ رواج کے مطابق جو بھیڑیں چوپان کو پرورش کے لیے دی جاتی ہیں وہ ان میں سے اچھی خاصی تعداد میں یا تو خود کھا جاتا ہے یا انھیں فروخت کر دیتا ہے اُسے غائب شدہ بھیڑ کا سر یا کھال لازمی طور پر اس کے مالک کو واپس کرنا پڑتی ہے یا کسی شخص کو قسم اُٹھا کر یہ بیان دینا پڑتا ہے کہ اس بھیڑ کو کسی چیتے یا کسی دوسرے جنگلی جانور کا شکار ہونا پڑا۔ اگر وہ اس میں ناکام رہے تو اسے غائب ہونے والے ہر بھیڑ کے لیے آٹھ آنے کی رقم ادا کرنا پڑتی ہے۔ انتہائی سنگین معاملات میں ایک چوپان کو بیروہ ماگام تحصیل کے ایک گاؤں ہابر میں جسمانی اذیتیں برداشت کرنا پڑتی ہے۔ ہابر میں مجھے چند افراد نے باور کرایا کہ قریباً بیس برس قبل ہابر کے مقام پر ایک چوپان کو ایلم کے ایک درخت کے تلے سے گذرنے کے لیے کہا گیا مگر یہاں سے گذرنے کے بعد وہ نابینا ہو گیا۔ کاہچرائی کے موسم کے دوران ایک دیہاتی کو تین مرتبہ نمک علاقے میں یہاں پر واقع رقبہ کاہچرائی تک پہنچانا پڑتا ہے۔ وہاں وہ اپنی بھیڑوں کی نہایت شدت سے تلاش کرتا ہے۔

علاقے مختلف چوپانوں کے درمیان منقسم ہوتے ہیں اور جب تک چوپان برادری کی رضامندی نہ ہو کسی نو وارد کو اجازت نہیں دی جاتی۔ اس کے علاوہ یہ بھی اگر چہ سچ ہے چوپان ایک دوسرے کی اس حد تک مدد کرتے ہیں کہ وہ ایک دیہات کے لیے اپنا گذریا تبدیل کرنے کا کام مشکل بنا لیتے ہیں مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کھیتوں پر ہل چلانے سے قبل وہ چاول کے کھیتوں میں ایک ریوڑ کو بٹھانا چاہتے ہیں۔ اس صورت حال میں ایک چوپان کے لیے یہ مشکل پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ ہر کھیت میں بھیڑوں کو بٹھانے کی باری نہیں دے سکتا۔ کا ہچرائی کا معاملہ بھی بھاری اہمیت کا حامل ہے۔ خراب برسوں کے دوران بھی اکثر بھیڑ مالکان مالیہ ادا کرتے ہیں اور موسم سرما کے دوران پوشاک کے لیے ایک کاشتکار کو اُون کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ ایک برس میں دوبار اُون تراشی ہوتی ہے۔ پہلی اون تراشی نوروز کچھ ماہ بعد ہوتی اور دوسری اس کے تین ماہ بعد ہوتی ہے۔ جب نہایت کم مقدار میں اُون حاصل ہوتی ہے تو حکومت دو آنے فی بھیڑ کے حساب سے ٹیکس وصول کرتی ہے۔ پہلے یہ ٹیکس ٹھیکیدار وصول کرتے تھے اب سرکاری اہل کار خود یہ کام سرانجام دیتے ہیں۔

جب خزاں کا موسم آ جاتا ہے اور بھیڑوں نے پیٹ بھر کر پہاڑوں میں مزے دار گھاس کھالی ہوتی ہے تو مایوسی کے عالم میں چوپان اُتر کر وادی میں آتا ہے جہاں پر کاشتکار انتظار میں ہوتے ہیں۔ گویا ایک یونانی کی ملاقات یونانی سے ہوتی ہے۔ پھر بھیڑوں کو نقصان اور گڈریے کو واجب الادا معاوضے پر مول تول شروع ہو جاتا ہے۔ گڈریے یہ معاوضہ غلے کی صورت میں وصول کرتے ہیں۔ بعض اوقات کاشتکار اس بات پر بضد رہتے ہیں کہ ایک گڈریا یا تو قسم لے یا کسی درخت کے تلے اذیت برداشت کرے۔ اس کے بعد بھیڑ گاؤں تک واپس آ جاتے ہیں جہاں انھیں کھانے کے لیے اچھی گھاس میسر ہوتی ہے اور وہ شہتوت کے گرتے ہوئے پتوں کو نہایت مزے سے کھاتے ہیں۔ جوں ہی بھیڑ گاؤں میں پہنچتی ہے ان کے نہانے کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ جونہی بھیڑیں دریا یا جھیل سے باہر نکلتی ہیں تو لوہے کے پہیے کے ساتھ ان کے جسم کو بخوبی رگڑا جاتا ہے اور اس کے بعد اُون تراشی کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ پرانے قاعدے کے مطابق اون تراشی کا کام اُسی وقت کیا جانا چاہیے جب سورج میزان میں داخل ہوتا ہے۔ اس کے تین ماہ بعد دوسری اون

تراشی کی جاتی ہے مگر اس سے بہت کم اون حاصل ہوتا ہے۔ اس اون تراشی کے بعد بھیڑیں مکانوں کے نیچے واقع مویشی خانے میں گرمی کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جاتی ہیں۔ اس کے لیے موسم سرما کے چارے کی خاطر ایک کشمیری کا انحصار بید کے پتوں اور خشک شدہ میٹھے پتوں پر ہوتا ہے۔ بسا اوقات ایک دال موٹھی بھی انھیں کھانے کو دی جاتی ہے۔ ہر بھیڑ کی خوراک کے ساتھ ایک اونس نمک لازمی طور پر ملایا جانا چاہیے۔ اس بند اور گھٹن بھرے ماحول میں بھیڑوں کی موت لازمی ہے اور جب کسی دیہاتی کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اب بھیڑ کی صحت یابی ناممکن ہے تو ایسے مریض مویشی کا گلا کاٹ دیتا ہے اور مرگی زدہ گوشت کو کھا جاتا ہے۔

کشمیری اون کی ساخت مختلف اضلاع میں مختلف النوع ہوتی ہے اس کا انحصار اُن مختلف پہاڑوں پر میسر گھاس کے اوصاف پر ہوتا ہے جہاں انھیں موسم گرما کے دوران چرایا جاتا ہے۔ چنانچہ چراگاہوں کے گھاس کا شمار مضبوط گھاس میں ہوتا ہے۔ وادی کے اس حصّے کا گھاس کھانے والی بھیڑوں سے اون کا دھاگہ لمبا مگر سخت ہوتا ہے۔ یہاں کے کمبل اس قدر قیمتی نہیں ہوتے ہیں جس قدر شوپیان کے علاقے کے ہوتے ہیں جہاں کے پہاڑوں کی گھاس مزےدار اور اچھی ہوتی ہے۔ جھیل ولر کے علاقے سے بہترین اور نرم اون حاصل ہوتی ہے۔ جھیل ڈل پر واقع گاؤں نند پور سے بہتر گوشت حاصل ہوتا ہے جہاں پر بھیڑوں کی افزائش اس نازک گھاس سے ہوتی ہے جو مصنوعی طور پر تیار کردہ ڈیمپ اراضیات پر پیدا ہوتی ہے مگر سارے کشمیر میں بھیڑوں کا گوشت عمدہ ترین ہوتا ہے اور ایک مصدقہ اتھارٹی کے فرمان کے مطابق کشمیر کے بھیڑ اسی قدر اچھے ہیں جس قدر سا ئوتھ ڈاؤن کے ہیں۔ ایک کشمیری دو برس کی عمر کے بھیڑ کے گوشت کو بہترین تصور کرتا ہے۔

کشمیر میں بھیڑوں کی کثیر تعداد کے باوجود اکثر اوقات دیہات میں گوشت حاصل کرنا محال ہو جاتا ہے کیونکہ عوام کو موسم سرما کے دوران گرم پوشاک کے لیے اون درکار ہوتی ہے اور جس شخص کے پاس تہہ خانے میں کثیر تعداد میں بھیڑیں موجود ہوتی ہیں وہ اپنے افراد خانہ کو شدید ترین سردی کے دوران بھی گرم رکھ سکتا ہے۔ فی سو بھیڑوں پر تیرہ چلکی روپے کا ٹیکس عائد کیا جاتا ہے۔ یہ ٹیکس (زرِ چوپان) اس وقت جمع کیا جاتا ہے جب ریوڑ (رمبا) پہاڑی چراگاہوں کی جانب جانے کے لیے گذر رہے ہوتے ہیں۔ عین وقتوں تک حکومت کو یہ حق حاصل تھا کہ جونہی ان ریوڑوں کا گذر

ہوتو وہ ایک ہزار بھیڑوں کا انتخاب کرنے کے لیے ہر سو بھیڑ سے ایک بھیڑ منتخب کی جاتی ہے۔ اوّل الذکر کو ہزاری یا خلقت کو بڑا کہا جاتا ہے۔ وزن اور جسامت کے لحاظ سے خلقت کا موازنہ بجا طور کاسٹ دوڑ کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔ اب ایک چرواہے کو کسی قسم کی جاگیردارانہ خدمات سے زیر بار نہیں ہونا پڑتا ہے۔ اس قسم کی مراعات کے عوض اب صرف دھوپ کی جڑوں کی صورت میں تحفہ دینا پڑتا ہے جو مندروں میں دھونی جلانے کے لیے استعمال میں لایا جاتا ہے۔

کشمیری اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اُون سے دھونی میں بہتری آتی ہے اور لکڑی کی نشو ونما بھی اس سے ممکن ہوتی ہے اور اس بارے میں مشہور ہے ''نون چہ مُون'' یعنی نمک سے مراد لکڑی ہے۔

بکریاں

وادی میں بکریاں ایک کثیر تعداد میں موجود ہیں مگر برس ہزارہ اور پونچھ جموں کی نچلی پہاڑیوں کے بکروال اور گوجروں کی طرف سے بڑے بڑے ریوڑ لائے جاتے ہیں۔ گوجروں کی بکریاں نہایت عمدہ قسم کے جاندار ہوتے ہیں اور وہ ان کی جائداد کی مانند ہی بیش قیمت ہوتے ہیں اور انھیں گھی گوشت اور گھی کے نقل وحمل کے لیے کھالیں فراہم کرتے ہیں، بکریوں کو بچوں کی پرورش کے لیے رکھا جاتا ہے اور ہر صبح بکریوں کا دودھ اپنے گاہکوں کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ بکریوں کے دودھ کو طاقت بخش تصور کیا جاتا ہے۔ بکری کے بالوں کو غلہ رکھنے کے لیے بورے تیار کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے مگر کشمیر میں ان بالوں کا استعمال نفیس کپڑا تیار کرنے کے لیے نہیں ہوتا۔ کشمیر میں شال والی بکری کی افزائش کی ہر چند کوشش کی گئی تھی مگر یہ کوشش ناکام رہی کیونکہ یہاں کی آب وہوا اس قدر شدید نہیں کہ اس سے وہ طوفان پیدا ہوسکے، جس سے اس ملک کی تیز اور تند ہواؤں سے بھیڑ کی حفاظت ہوسکے۔ کشمیر میں بھیڑوں کی سالانہ آمد سے کاہچرائی ٹیکس کی صورت میں کچھ آمدنی ہوتی ہے مگر افسوس کا مقام ہے کہ ان بکریوں کے مالک جنگلات کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ کشمیر میں موسم گرما کے دوران کاہچرائی کے لیے ہر سو بکری پر پانچ روپے کا ٹیکس وصول کیا جاتا ہے۔

ٹٹو

کشمیر کے ٹٹو قد و قامت میں چھوٹے ہوتے ہیں مگر ان میں کافی قوتِ برداشت ہوتی ہے۔لگ بھگ ہر گاؤں میں ٹٹو گھوڑیاں موجود ہوتی ہیں اور ان کی افزائش نسل جلدی ہوتی ہے۔ کسی گھوڑی کے ساتھ اس کے تین بچوں کا ایک ساتھ دیکھا جانا کوئی معمولی بات نہیں۔ان کی نسل کشی کی خاطر نہایت موافق جگہ جھیل ولر کا کنارہ ہے جہاں ٹٹو گہرے پانی میں اپنا پیٹ مقوی گھاس کو کھاتے ہوئے اپنے دن گذار دیتے ہیں۔ ماضی میں حکومت نے ٹٹوؤں کی افزائش کی خاطر گھاس کے بڑے رکھ قائم کیے تھے۔ ان میں سے چند رکھ اب بھی جھیل ولر کے نواح میں موجود ہیں۔ پنجاب کے خون کی تاثیر ہے اس کے باوجود بھی دلدلی علاقوں کے ٹٹو اس قدر اچھے نہیں ہیں جس قدر روادی لدر اور سنگلاخ علاقے دیوسر کی نسل اچھی ہوتی ہے۔دلدلی علاقوں کے ٹٹوؤں کے پاؤں نرم ہوتے ہیں اگر چہ ایک ہٹے کٹے کشمیری اور اس کے بستر ے کو اٹھا کر بخوبی ست خرامی سے چل سکتے ہیں مگر جوں ہی وادی سے باہر آ کر پہاڑی راستوں پر قدم رکھتے ہیں تو وہ بیکار ہو کر رہ جاتے ہیں۔بطیلہ سڑکوں کی عدم موجودگی میں کشمیر میں ٹٹوؤں کی نقل و حرکت کو بھاری اہمیت حاصل ہے۔ یہ نقل و حرکت ایک خاص طبقے مرکبان کے ہاتھوں میں ہے۔یہ لوگ ٹٹوؤں کی نسل کشی نہیں کرتے بلکہ ان دیہاتیوں سے انھیں خریدتے ہیں جہاں پر ان کے پٹھوں اور سخت پاؤں کے لیے موافق حالات ہوتے ہیں۔ چند برس قبل ٹٹوؤں کی نسل کشی کا کام غیر مقبول ہو کر رہ گیا کیونکہ جن دیہاتیوں کے پاس ٹٹو موجود تھے ان کی گلگت اور جموں تک بار برداری کے لیے لگا تار طلب رہتی تھی مگر اب گذشتہ تین برسوں کے دوران حالات میں خوش آیند تبدیلی رونما ہوئی اور اب ٹٹوؤں کی نسل کشی کی سرگرمی سرعت کے ساتھ جاری ہے۔قیمتیں تقریباً دوگنی ہو چکی ہیں اور ایک اچھا ٹٹو اب دس روپے میں حاصل کیا جاسکتا ہے۔ٹٹوؤں اور گھوڑوں کی نسل کشی کے لیے کشمیر میں ہر قسم کی سہولت میسر ہے اور توقع کی جاتی ہے کہ زیادہ ذہین کشمیریوں کی طرف سے معقول نسل کشی کا کوئی سہل طریقہ اپنائیں گے۔ جب ایک مرکبان کوئی ٹٹو خریدتا ہے تو وہ فوراً اس کو آختہ کرتا ہے مگر دیہاتی اپنی گھوڑیوں کی متعدد گھوڑوں سے جُدا کرنے کے لیے قطعی کوشش نہیں کرتے۔ میں ذاتی تجربے کی بنا پر کہتا ہوں کہ میں نے تین برس تک وادی میں خچروں کی نسل کشی

کی کوشش کی اور کامیابی کے معاملے میں مجھے کوئی دقت پیش نہیں آئی ۔ درحقیقت یہ کامیابی اس لیے حاصل ہوئی کیونکہ جب کسی گھوڑی کے ساتھ کوئی گدھا نسل کشی کرتا ہے تو دیہاتی اسے ہرگز الگ نہیں کرتے۔ اس کے لیے وہ یہ بہانہ تراش لیتے کہ گھوڑوں کے لیے گھاس کاٹنے کے لیے ان کے پاس فالتو وقت نہیں ہے اور کہتے ہیں کہ اگر خچروں کی نسل کشی کے لیے انھیں اپنی گھوڑی کو اصطبل میں باندھنا پڑتا ہے تو انھیں ٹٹوؤں کی نسل کشی میں زیادہ فائدہ ہے۔ جس طرح بھیڑوں کو پیشہ ور چوپانوں کے سپرد کیا جاتا ہے اسی طرح گھوڑوں کو گلہ وانوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے جو پہاڑی چراگاہوں پر ان کے لیے رسوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں ۔ چوپان کی ایمانداری کو کبھی توجہ کا مرکز نہیں سمجھا جاتا مگر گلہ وان اس بات کے لیے کافی مشہور ہیں کہ گلہ وان اور چوری دونوں ہم معنی الفاظ ہیں ۔ گلہ وان چار آنے یومیہ اجرت وصول کرتا ہے۔ موسم سرما کے دوران ٹٹوؤں کو چاول اور چھلکوں کی خوراک فراہم کی جاتی ہے۔ انھیں جو اور مکئی کے دانے بھی کھلائے جاتے ہیں۔ دیہات میں ٹٹوؤں کی ٹانگوں کو ہمیشہ زنجیروں میں جکڑ کر رکھا جاتا ہے اور اسے اس بات کے ساتھ مناسبت دی جاتی ہے کہ جب جوان ہوتے ہیں تو یہ ٹٹو زیادہ بوجھ بار برداری کر سکتا ہے چنانچہ اسے وہ ٹخنوں والا بنا دیتے ہیں۔ ایک عام ٹٹو ایک مرحلے تک ڈھائی من وزن کی بار برداری کر سکتا ہے۔

میں نہیں سمجھتا کہ کشمیر میں ٹٹوؤں کی نسل کشی کے مستقبل کی بابت کسی قسم کی تشویش کی ضرورت ہے بشرطیکہ گلگت تک بار برداری کے انتظامات کو کچھ حد تک موجودہ بنیادوں پر برقرار رکھا جائے لیکن اگر پرانے طریقۂ کار کو بحال کیا گیا، جس کے تحت ایک منٹ کی نوٹس پر ٹٹو کے مالک ایک فرد کو گلگت روانہ کیا جا سکتا تھا تو دیہاتی اپنی گھوڑیاں فروخت کریں گے اور ٹٹوؤں کی نسل کشی کے کام کا نقصان ہوگا۔

کشمیری جانور کی نسل میں بہتری کے معاملے میں کافی کچھ کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ چند افراد کو ایسے ٹٹوؤں کو آختہ کرنے کی اجازت دے دیں، جن کی نسل کے لیے ضرورت نہ ہو تو نہایت قلیل عرصے کے دوران ہی اس معاملے میں بہتری پیدا ہو سکے گی ۔ یہ اقدام ہرگز غیر مقبول نہیں ہوگا مگر لازم ہے کہ اس کے لیے حکم صادر کیا جائے۔

مُرغیاں

کشمیر میں مُرغیوں اور بطخوں کی فراوانی ہے۔ ہر گاؤں میں اچھی قسم کے مرغ پائے جاتے ہیں جہاں کہیں پانی موجود ہے' وہاں بطخیں رکھی گئی ہیں اور جھیل ولر کے مضافات میں ہنس بھی بکثرت موجود ہیں۔ بھاری تعداد میں بطخیں پنجاب کو برآمد کی جاتی ہیں۔ وادیٔ لولاب میں مرغیوں کی عمدہ ترین نسل پائی جاتی ہے۔ جہاں پر مرغوں کو آختہ کرنے کا رواج ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس رواج کو پٹھانوں نے ترویج دی۔ اس سے قبل آختہ مرغ صرف لال پور میں پائے جاتے تھے مگر اب لولاب کے ہر گاؤں میں آختہ مرغ موجود ہیں، جن کی قیمت آٹھ سے بارہ آنے کے درمیان ہے۔ انھیں درگاہوں میں چڑھاوے کے لیے رکھا گیا ہے۔ مرغوں کو چھ ماہ کی عمر میں آختہ کیا جاتا ہے۔ مرغیوں کے انڈے دیہاتی عوام کے لیے اچھی خاصی آمدنی کا ایک وسیلہ ہوتے ہیں اور کبھی کبھی جب مرغوں کی ہیضے کی وبا (کوکر کانی) کشمیر میں وارد ہوتی ہے اس سے وادی میں بھاری نقصان ہوتا ہے۔ 1892ء میں یہ مرض کافی مہلک ثابت ہوا۔ ظاہری طور پر بلند علاقوں پر واقع دیہات میں زیریں علاقوں کے دیہات کی نسبت وبا کا زیادہ اندیشہ ہوتا ہے۔ وادی میں اب تک ترکیبوں کی ترویج کامیاب نہیں ہوسکی ہے کیونکہ عوام کا کہنا ہے کہ آب وہوا ان کی نشوونما کے لیے موافق نہیں ہے۔ سرینگر میں کبوتر عام ہوتے ہیں۔ پالتو خرگوشوں کی نشوونما بھی ہوتی ہے مگر ان کی ترویج دیہات میں کی گئی ہے۔ مسلمان ہر قسم کے مرغی کے انڈوں کا استعمال کرتے ہیں مگر ہندو ان سے پرہیز کرتے ہیں۔

شہد

وادی کے بلند علاقوں میں واقع دیہات میں شہد کی کاشت ہوتی ہے اور یہ شہد نظام ٹیکس کی ایک مد کی حیثیت رکھتا تھا۔ ایک گھر میں شہد کے متعدد چھتے ہوا کرتے ہیں اور ایک خوشگوار سال میں ایک خانہ سے آٹھ سیر شہد کا چھتہ حاصل ہوتا ہے۔ شاید انگریزی ماہر عسل پروری زنبور ایک کشمیری کی طرف سے اپنائے گئے نہایت قدیم طرز کے طور طریقوں پر مسکرادیں گے مگر اس بات کو ذہن نشین کرنا لازمی ہے کہ مؤخر الذکر کو تمام تر فائدہ ہوتا ہے کیونکہ گرمیوں یا سردیوں کے ایک بُرے موسم کے دوران ان کی خوراک پر شاید ہی کوئی خرچ ہوتا ہو۔ ایک بُرے برس کے دوران شہد

کی مکھیوں کوخوراک کے طور پر سبزیوں کالب لباب اور ایک قسم کا باجرہ کا نگی دیا جاتا ہے۔ زنبور خانہ مٹی کی دو بڑی محدب پلیٹوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ جنھیں مکان کی ایک دیوار کے ساتھ نصب کیا جاتا ہے۔ بیرونی پلیٹ میں ایک چھوٹا سا سراخ ہوتا ہے جس سے ہو کر شہد کی کھیاں داخل ہوتی ہیں۔ اکتوبر کے مہینے کے دوران شہید کی مکھیوں کا ماہر اندرونی پلیٹ کو ہٹا لیتا ہے اور چاول کے چھلکوں پر مشتمل وہ خانہ زنبور کو دھونی دیتا ہے۔ اس سے شہد کی کھیاں داخلی دروازے سے باہر نکل آتی ہیں۔ شہید کی نصف مقدار کو وہ مکھیوں کی سردیوں کے دوران خوراک کے طور پر چھوڑ دیتا ہے۔ اس عمل کے دوران اس امر کا احتمال رہتا ہے کہ شہد کی مکھیوں کے ماہر کو کھیاں ڈس نہ لیں مگر کشمیر کی چھوٹی کھیاں نہ تو ظالم اور نہ ہی زہریلی ہوتی ہیں وہ ڈستی ضرور ہیں مگر ان کا درد بہت کم ہوتا ہے۔ اور یہ جلدی غائب ہو جاتا ہے۔ جن علاقوں میں کھانڈ کی گرانی ہے وہاں شہد کی بھاری قدر و قیمت ہے۔ کھانا پکانے اور اشیا کو محفوظ رکھنے کے لیے اس کا مصرف کیا جاتا ہے۔ اور اس کی موم کو شہروں اور قصبات کے موچیوں اور زرگروں کو فروخت کیا جاتا ہے اور اس کے اچھے دام حاصل ہوتے ہیں۔ عام طور پر شہد صاف اور عمدہ ترین ہوتا ہے مگر شہد کے چھتوں کے سفید ترین جو نمونے میں نے دیکھے ہیں وہ وادی لدر سے لائے گئے ہیں۔ عوام کا بیان کے مطابق تحصیل اُتر مچھی پورہ میں مچھلی کے مقام پر بہترین شہد تیار ہوتا ہے۔ جنوب میں قلی نرواؤ کے مقام پر بھی اچھا شہد تیار ہوتا ہے۔ باور کیا جاتا ہے کہ عسل پروری کے معاملے میں موافق دیہات میں صبح سویرے جلدی دھوپ نکلتی ہے۔ مغرب کے علاقے میں عوام میں یہ وہم موجود ہے کہ شہد کی کھیاں خوش قسمت شخص کے ہاں وارد ہوتی ہیں اور جب یہ کھیاں گھر سے چلی جاتی ہیں تو یہ ایک بدشگونی تصور کی جاتی ہے۔ یہ بھی وہم ہے کہ شہد کی کھیاں کسی گھر میں ہونے والی موت کی بابت خبر رکھتی ہیں۔ کشمیر میں ان باتوں کا وجود نہیں۔ شہید کا چھتہ چار سے پانچ آنے فی سیر کے حساب سے فروخت ہوتا ہے۔

ریشم سازی

کشمیر میں ریشم سازی کی تاریخ وقتی رکاوٹوں اور بے ترتیبی کی شکار رہتی ہے۔ یہاں پر ریشم سازی کی پرانی ساکھ ہے کیونکہ مرزا حیدر (1536) اپنی تاریخ میں شہتوت کے درختوں کی فراوانی کا تذکرہ کرتا ہے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ لوگ شہتوت کے پتوں کو ریشم کے کیڑوں کی خوراک کے

سوائے کسی دوسرے مقصد کے لیے استعمال کی اجازت نہیں دیتے۔حکومت بنگال کے ایک ماہر مسٹراین جی مکر جی رقمطراز ہیں۔

''1896 سے قبل کشمیر میں صنعت ابریشم کا وجود بے ترتیبی کا شکار تھا۔یہ صنعت ناشائستہ انداز میں صدیوں سے موجود تھی۔ جب دمشق اور دوسرے مراکز سے باختری ریشم کی درآمد کی گئی اس بات میں ذرا بھی شک نہیں کہ سن عیسوی کے آغاز سے قبل کشمیر قدیم باختری سلطنت کا ایک حصہ تھا۔ چنانچہ مغرب سے کچھ مقدار میں خام ریشم کشمیر میں بھی آ پہنچا۔ بہرحال کشمیر میں صنعت ابریشم کی ابتدا کی بابت ماسوائے اس کے کچھ بھی معلوم نہیں کہ یہ صنعت یہاں پر نہایت قدیم ہے اور بخارا کے ساتھ اس کے قریبی تعلقات ہیں کیونکہ ان کے درمیان تخم اور ابریشم کے لین دین کا رواج تھا''۔

مسٹر تھامس وارڈل کا بیان ہے۔''عام طور پر یہ باور کیا جاتا ہے کہ ہندوستان نے یہ فن چین سے سیکھا مگر یہ عمل کس دور میں واقع ہوا اس کی بابت کسی کو معلوم نہیں''۔

عوام کا یہ بیان ہے کہ سلطان زین العابدین کے عہد میں ریشم سازی کا وجود تھا اور پٹھان عہد میں یہ صنعت ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ بعد میں 1896 ایک اہم برس کی حیثیت رکھتا ہے' جب نئی صنعتوں کے قیام کے سلسلہ میں مہاراجہ رنبیر سنگھ نے وسیع پیانے پر صنعت ابریشم کو بحال کیا۔اس معاملے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی گئی۔ وادی کے تمام حصوں میں ایک سو ستائیس اچھے پرورش گھر قائم کیے گئے۔یورپ سے ریل سازی اور دیگر مشینری درآمد کی گئی اور ابریشم کے کاروبار کے فروغ کے مقصد سے بہت بڑے محکمے کا قیام عمل میں لایا گیا۔ وقت گذرنے کے بعد دانا ہونا آسان ہوتا ہے مگر اس تصور سے معلوم ہوتا ہے کہ اس صنعت کی بحالی کا طریقہ کار دانشمندانہ نہیں تھا۔ریشم کے کیڑے پالنے والوں کی ایک انجمن کرم کشاں قائم کی گئی۔ان افراد کو چند مراعات دی گئیں جن میں جبری مزدوری سے معافی بھی شامل تھی۔تخم ابریشم کی پرورش کے سلسلے میں انھیں دیہاتیوں کے مکانات پر قبضہ کرنے کی اجازت بھی دے دی گئی نیز شہتوت کے درختوں کو ہونے والے نقصان کے سلسلے میں مخبر تعینات کیا گیا۔نہایت مختصر مدت میں کرم کش دیہاتیوں کے لیے باعث نفرت بن

گیا اور اس بات میں قطعی شک نہیں کہ ریشم پروروں نے اپنی حیثیت کا ناجائز فائدہ اٹھایا اور عوام کو ظلم وستم کا شکار بنایا۔ تمام تر کاروبار نہایت سرکاری حیثیت رکھتا تھا اور عوام الناس کو حقارت اور منافرت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا۔ نیز بحالی کا یہ عمل نہایت ولولہ انگیز تھا۔ پلانٹ اور عمارات پر بھی بھاری لاگت آئی اور تمام تر وادی میں پھیلے ہوئے پرورخانوں کی مناسب طور پر نگہداشت ممکن نہیں ہوسکتی۔ بدقسمتی سے نگہداشت کے لیے کسی کو بھی تکنیکی معلومات میسر نہیں تھیں اگرچہ ریل سازی کی بہتری عمل میں لائی گئی مگر کشمیر میں کوئی ایسا شخص موجود نہیں تھا جو اس آفت کو ٹال سکتا تھا جو 1878 میں درپیش ہوئی۔ جب ریشم کے قریباً سبھی کیڑے بیماری میں مبتلا ہو گئے۔ اس معاملے میں کشمیر کے چیف جسٹس بابو نیلامبر مکرجی کے سر یہ سہرا جاتا ہے کہ انھوں نے ریل سازی کے عمل میں بہتری لائی جس کی تصدیق یورپ سے حاصل موافقانہ رپورٹوں سے ہو جاتی ہے۔ دھاگے کی ساخت کی بھاری تعریف کی گئی تھی۔ یہ صنعت کسی بھی حالت میں 1882 تک چلتی رہی اور اس وقت سے 1890 تک اس صنعت کو ریشم پروروں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا گیا۔ بہترین ساخت کا تخم ابریشم بتدریج ناپید ہو گیا اور ریشم سازی آخر کار ختم ہو کر رہ گئی۔ نفیس قسم کی عمارات گر چکی تھیں '1869 میں تعمیر کردہ 127 عمارات میں سے صرف دو ایک رگھوناتھ پورہ اور دوسری چیر پورہ میں قائم ودائم رہیں۔ عام طور پر یہ باور کیا جاتا ہے کہ یہ بیماری اس قدر مہلک ثابت ہوئی جو یورپ، چین اور جاپان میں پالتو مگر بہتر ساخت کے درآمد شدہ کروں کی وساطت سے کشمیر میں وارد ہوئی۔ ریشم پروروں کا بیان ہے کہ جاپان سے درآمد شدہ تخم ابریشم اس آفت کا موجب بنا۔

1889 میں حکومت ہند کے سیکریٹری سرایڈورڈ بک سی ایس آئی کے مشورے پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ بنگال میں قائم کی گئی مثال کی تقلید کی جائے اور دوربینی مشاہدے کے طریقہ کار کو سیکھنے کے لیے ایک کشمیری کو بنگال روانہ کیا گیا۔ اٹلی اور فرانس سے اچھی ساخت کا بیج درآمد کیا گیا اور کرموں کی جو اچھی فصل حاصل ہوئی وہ ماتحت عملے کی لاپرواہی کے سبب بے سود ثابت ہو کر رہ گئی۔ بدقسمتی سے اس نازک مرحلے پر یہ لوگ انچارج رکھے گئے اور پیش رفت میں عارضی طور پر رخنہ اندازی پیدا ہو گئی۔ 1889 سے 1894 تک کی کارروائیوں کے انچارج بابو نیلامبر مکرجی کے ایک بھائی اور کشمیر کے چیف جسٹس بابو رشی بر مکرجی تھے۔ حالانکہ میں ان کے ساتھ اس کام میں شامل تھا مگر مقامی طور پر صحت

مند تخم ابریشم پیدا کرنے کے معاملے میں جو کلیدی کام کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی اس کے تمام تر پچھلے کے وہی حقدار ہیں۔ 1894 کے دوران بہت ساری صورتوں میں درآمد شدہ بیج سے بیمار کرم ابریشم پیدا ہوئے۔ جن بیجوں کا ہم نے معائنہ کیا تھا ان سے پیدا شدہ کرموں نے شاندار نتائج دیے اور ان میں کسی قسم کی بیماری موجود نہیں تھی۔ مالی وجوہات کی بنا پر ریشم سازی کے معاملے میں بابو رشی بر مکرجی کا ناطہ منقطع ہو گیا اور مجھے یہ کام تفویض کیا گیا۔ 1889 سے ریشم سازی کے ساتھ وابستہ تھا اور میرا مدعا اخراجات کو ٹال کر اپنی کوششوں کو محض صحت مند بیج حاصل کرنے تک محدود رکھنا تھا۔ اس برس کے دوران ہم نے اپنا تمام تر بیج کوٹھ ہار کے عوام کو دیا۔ جہاں تک نگہداشت کا کام ممکن ہو سکا میں نے حکومت کی طرف سے کرموں کے عوض دی جانے والی قیمت میں مزید اضافہ کر دیا تاکہ غنچہ پروروں کو کچھ منافع ہو سکے۔ اس سے جو آمدنی ہوئی اس سے ہمارے اخراجات پورے ہو گئے، کوئی آفت ناگہانی نہ آجائے ورنہ ہمارے پاس 1895 کے دوران پرانے ریشم پروروں کے بیج کی رسد کافی ہو گئی۔ میں نے صرف رگھوناتھ پورہ اور چہ پورہ کے گھروں کو زیر فہرست رکھا ہے میں اس بات کا سختی سے قائل ہوں کہ عامیانہ کشمیری گھر ریشم سازی کے لیے نہایت موافق ہے اس میں ہوا اور روشنی کا معقول انتظام ہے اور کشمیر کے درجہ حرارت کو قابو میں رکھنا بھی جانتا ہے۔ شراب تیار کرنے کا اطالوی انچارج سکو باسی ریشم سازی کی تفصیلی معلومات رکھتا ہے۔ اس نے 1894 میں میرے ساتھ کوٹھ ہار کا دورہ کیا۔ اُسے بھی اس معاملے میں کافی اُمید دکھائی دیتی ہے اور وہ میرے خیال کے ساتھ متفق بھی ہے کہ ریشم کسی کے پورے لوازمات کے تحت ایک کشمیری گھر نہایت سازگار مقام ہے۔ اس نے ہمیں شہتوت کے درخت کی شاخ تراشی کے معاملے میں ہدایات دی ہیں اور اس امر کے احکامات اب جاری کیے جا چکے ہیں اور اب توقع کی جاتی ہے کہ اراضی میں جو بے تحاشہ شاخ تراشی ہوتی تھی وہ اب بند ہو جائے گی۔ میں نے دیکھا ہے کہ ہر جگہ لوگ گھریلو صنعت کے طور پر ریشم سازی کو اپنانے کے متمنی ہیں اور وادی کے تمام حصوں کے افراد نے مجھے بیج فراہم کرنے کی التجا کی ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ حکومت کو فقط صحت مند بیج پیدا کرنے تک ہی محدود رہنا چاہیے۔ ریشم پروری اور ریل سازی کا کام اُسے ترک کر دینا چاہیے۔ مزید برآں میری یہ بھی رائے ہے کہ شہتوت کے پتوں کے استعمال کے حقوق کو سرمایہ کاروں پر چھوڑ دینا چاہیے۔ کشمیر میں ریشم کے امکانات کی مبالغہ آمیزی ایک ناممکن

امر ہے مگر میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جب تک ان امکانات کا ہرگز احساس نہیں ہوگا، تب تک یہ صنعت حکومت کے ہاتھوں میں رہے گی۔

جنگلی شہتوت کا ریشم کا کیڑا کشمیر میں پایا جاتا ہے اور 1894 تک حکومت کو ہی جنگلی غنچہ جمع کرنے کا حق حاصل تھا۔ان کا ریشم شفاف ترین سفید ہوتا ہے۔

وادی میں جن بیماریوں کا ریشم کے کیڑے پر حملہ ہوتا ہے ان میں پیبرائن (Pebrine) ہے جس کے تحت کیڑے پر سیاہ داغ رونما ہوجاتے ہیں اور فلیچیری (Flacherie) ہیں۔اب تک دیگر امراض کی بابت معلوم نہیں ہوسکا ہے۔

کتے

شہروں اور دیہات میں ادنٰی ذات کے کتوں کی بھرمار ہے اور ہندوستان میں اپنے ہم جنسوں کے مقابلے میں یہ کتے زیادہ بڑے اور خونخوار ہیں۔گڈریوں کے پاس لداخی کتوں کی ایک نسل ہے جو بہادر اور ذہین ہوتے ہیں۔

بلیاں

کشمیر میں بلیاں بھی عام ہیں مگر انھیں گھروں میں شاید ہی پالا جاتا ہے۔یہ چھوٹی جسامت کی ہوتی ہیں اور ان کا رنگ بھورا ہوتا ہے۔

●❀❀❀●

حوالہ جات

(1) غلے کے علاوہ ایک چوپان ایک پیسہ بھی بھیڑ کے حساب سے معاوضہ وصول کرتا ہے۔ تیس بھیڑوں پر وہ ایک بھیڑ کی اون حاصل کرنے کا بھی حقدار ہوتا ہے۔ اگر چوپان ایماندار ہو اور سارے کے سارے بھیڑ واپس لائے تو اسے ہر پچاس بھیڑ کے لیے ایک بھیڑ دی جاتی ہے۔ چوپان کے دوسرے اخراجات میں وہ مکھن جو وہ بھیڑ کے دودھ سے تیار کر لیتا ہے۔

●❀✻❀●

پندرھواں باب

صنعتیں اور کاروبار

دیہی کاری گر

کشمیر اپنے کاریگروں کی وجہ سے کافی مشہور ہے۔گزشتہ دور میں فنی چیزیں تیار کرنے والے ہنرمند کشمیریوں کی شہرت دور دور تک پھیل چکی تھی۔سرینگر کا شہر قدرتی طور پر صنعتوں کا اہم مرکز رہا ہے مگر چند قسموں کی مصنوعات تیار کرنے کے سلسلہ میں دیگر علاقے بھی مشہور ہیں۔ چنانچہ اسلام آباد میں بہترین قسم کے سوزن کار پائے جاتے ہیں۔اسی طرح لاکھ کے روغن شدہ لکڑی کے کام کے لیے کولگام مشہور ہے اور لکڑی پر کھدائی کے لیے بیجبہاڑہ اچھی خاصی شہرت کا مالک ہے۔

جولاہے

زینہ گیر کے دیہاتیوں کی نرم اونی کپڑے کی صنعت کافی مشہور ہے۔کشمیری کی یہ عادت ہے کہ وہ جولاہے کی حیثیت سے ایک دوسرے پر سبقت لینا چاہتا ہے۔یورپی سیاح کشمیریوں کے ہاتھ سے بُنے ہوئے کپڑے کے لباس کی بے حد تعریف کرتے ہیں۔دیہاتی عام طور پر اپنے ہی گھروں میں بنا ہوا اونی کمبل (پٹّو) اپنے جسم پر اچھی طرح لپیٹ لیتے ہیں۔یہ کمبل سرینگر میں وہ تاجروں کو فروخت کرتے ہیں۔

کشمیر کے شمالی علاقوں میں اُون دستیاب ہے کیونکہ وہاں چرنے کے لیے اچھی گھاس موجود ہے جبکہ جولا ہے زیادہ تر جنوب میں ہی موجود ہیں ۔شوپیان کے چوڑے کمبل اپنی شناخت کے مطابق فروخت ہوتے ہیں اور ترک و نگام کے خود رنگ کمبل (1) بارہ گز لمبے اور ڈیڑھ گز چوڑے ہوتے ہیں ۔ان کی قیمت چوبیس روپے اور پچیس روپے کے درمیان ہے ۔دوسرے کمبل میں ڈیڑھ گز چوڑے دو عرضوں کو ایک ساتھ سیا جاتا ہے جن کی لمبائی دس گز ہوتی ہے اس کمبل کو وزن کے حساب سے فروخت کیا جاتا ہے اور ایک سیر کے دو روپے حاصل ہوا کرتے تھے ۔ایک اچھے خورد رنگ کمبل سے چھ اور سات روپے حاصل ہو جاتے ہیں جب کہ ایک سفید کمبل پانچ یا آٹھ روپے میں خرید کیا جا سکتا ہے ۔اگر ایک کشمیری کی طرف سے ایک کمبل تیار کرنے میں صرف کی گئی محنت کو ملحوظ خاطر رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ قیمتیں بہت کم ہیں ۔

نجار

کشمیر کے نجار انتہائی قسم کے ماہر کاری گر ہوتے ہیں اور اگر وہ صحیح موڈ میں ہوں تو وہ نہایت عمدہ قسم کا کام کرتے ہیں ۔ چند درگاہوں میں لکڑی پر کھدائی اور جالیاں بنانے کا کام نہایت خوبصورت کام ہے ۔اس سے ان کی فنی قابلیت کا بخوبی اظہار ہوتا ہے ۔ ایک نجار کی مہارت کی اُس وقت خاص طور پر ستائش کرنا پڑتی ہے ۔جب کہ وہ قدیم طرز کے بھدے اوزار رکھتے ہیں جنھیں وہ اپنے چمڑے کے پیش بند میں لے جاتے ہیں ۔نصف ہتھوڑے ،نصف تیشہ (طور) اور ایک چھینی کے ساتھ ایک دیہی نجار وہ تمام کام سرانجام دے گا جس کی اس کے گاہکوں کو ضرورت ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے ایک نجار اُسی وقت کام کرتا ہے جب اس کے مزاج کو موافق آتا ہے اور چند گھنٹوں تک کام کر کے ہی وہ ہفتے بھر کے لئے کھانے کے لیے کما لیتا ہے اور جب تک اُسے خاص تحریک و ترغیب نہ ہو جس میں درگاہ کی مرمت شامل ہے، وہ برآمدے میں بیٹھ کر دھوپ کا نظارہ کرتا رہے گا اور وہ اپنی قسمت کا ممنون رہے گا کہ وہ ایک کاشتکار نہیں ۔کشمیر میں تعمیرات عامہ کے ڈائرکٹر مسٹر ی ٹکلیل کی طرف سے تحریر کردہ مندرجہ ذیل کیفیت بجا طور پر دلچسپی کا حامل ہو سکتی ہے ۔

''ایک کشمیری ایک بے پرواہ نجار اور جوڑ لگانے میں نہایت کمزور ہے ۔حالیہ برسوں کے دوران اس کی کاری گری میں اچھی خاصی بہتری پیدا ہوئی ہے ۔قدیم طرز کے

چند اوزاروں کی بجائے اس نے بہتر اوزار کا استعمال کرنا سیکھ لیا ہے مگر جوڑ لگانے کے معاملے میں وہ اب بھی کمزور ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ رسمی طور پر جوڑ لگانے کے معاملے میں وہ فطری طور پر بے ایمان ہے اور اس معاملے میں وہ اپنے پنجابی ہمسائے کے قطعی برعکس ہے اگر وہ کوئی ڈھیلی چول دیکھتا ہے اس میں پورے طور پر سال نہیں بھریگا۔ جس کے سبب اس نجار کے ساتھ نفرت پیدا ہو جائے گی۔ اگر کوئی کشمیری کوئی دروازہ یا دریچہ تیار کرے تو اس کے تلے سے مسلسل توڑ کر ٹکڑے کاٹنا اور بالائی سرے پر نصف کرنا پڑیں کیونکہ ان کا ڈھانچہ خمیدہ ہو جاتا ہے۔ گلکاری اور عددی ڈیزائینوں کے معاملے میں کشمیری اور پنجابی نجار نہایت قدرتی صلاحیت کے مالک ہوتے ہیں۔ نجار شکل وصورت کی آرائش وسجاوٹ اور چھید ڈالنے کا کام نہایت مؤثر انداز میں سرانجام دے سکتے ہیں مگر ایک کشمیری کی طرف سے جوڑ ڈالنے کا کام نہایت بُرے قسم کا ہوتا ہے۔ اس طرف سے تیار کی گئی کوئی بھی شئے یا فرنیچر قریباً ناکارہ اور فضول ہو کر رہ جاتی ہے، خواہ اس کی سطح پر کس قدر نفاست سے کھدائی کا کام کیا گیا ہو۔''

کشمیری نجار جوڑ لگانے کے لیے ایک خاص طریقے کو استعمال میں لاتے ہیں اور مختلف کاموں کے لیے وہ ایک ہی طریقہ بروئے کار لاتے ہیں جبکہ اس مقصد کے لیے دوسرا شخص کوئی الگ طریقہ اختیار کرے گا۔ تختے نصب کرنے کی یہ واقعی ایک بھدی صورت ہوتی ہے۔ ایک نہایت ہی عام مثال کو لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کشمیر میں بہت سارے مکان لکڑی سے تیار کیے جاتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے سب سے پہلے موٹے طور پر تیار کردہ مربع عمودی اور افقی ستون کھڑے کیے جاتے ہیں ہر ایک ستون پر ایک انچ چوڑی جھری ہوتی ہے جس کے سروں پر چھینی کے ساتھ ڈیڑھ انچ کھدائی کی جاتی ہے۔ اس کی پشت پر تیشہ (اس کام کے لیے ایک دیگر اوزار) استعمال میں لایا جاتا ہے۔ تیشے کا استعمال موسل کی جگہ کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ان پر موٹے طور پر بکھرے ہوئے لکڑی کے تختے نصب کیے جاتے ہیں۔ ان کے دونوں جانب مٹی کا پلستر کیا جاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں لکڑی کا پٹیوں اور مٹی کے پلستر شدہ ایک دیوار تیار ہو جاتی ہے۔ قطعی

طور پر اس عمارت کے استحکام کا انحصار ستونوں کی مضبوطی پر ہوتا ہے۔ عام طور پر وتری تیر بندی سے احتراز کیا جاتا ہے اور ایک یا دو برسوں کے بعد اکثر مکان اپنی عمودی حالت کو قائم نہیں رکھ پاتے اس قسم کے کام کو پچر بندی کہا جاتا ہے۔

ظاہری طور پر ان تختوں کو جھریوں میں مستطیل شکل میں نصب کرنے میں بھاری دقت درپیش ہوتی ہے۔ آخر اس کا احاطہ کیے ہوئے ستونوں کو پُر کیا جانا لازمی ہے اس مشکل پر قابو پانے کا ایک سادہ مگر مؤثر طریقہ ہے جو کولمبس نے ایک انڈے کا توازن قائم رکھنے کے لیے استعمال میں لایا تھا۔ یعنی جھری کا ایک حصہ کاٹ یا چھیل لیا جاتا ہے اور بعد میں دو ایک کیل یا لکڑی کی کھونٹیاں لگا کر اس کی مرمت کر دی جاتی ہے۔

اس اصول کے مطابق ہی بہترین تختوں والی دیوار تیار کی جاتی ہے۔ یہ جھریاں افقی اور عمودی طور پر کھودی جاتی ہیں جس سے ہاؤس بوٹ کے اطراف کی مانند ایک ڈھانچہ تیار ہوتا ہے۔ اس تختے کو پہلے اندر دھکیل کر دراز کے آخر تک عمودی جھری کے ساتھ نصب کر دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ایک چھوٹا سا ستون جھریوں کے دونوں طرف اوپر اور نیچے کی طرف نصب کیا جاتا ہے۔ اس طرح تختوں اور دوہری جھری والے ستونوں کو باری باری نصب کرتے ہوئے ایک تختے دار دیوار تیار کی جاتی ہے جس کا ہر تختہ ہر طرف سے جھری پر ٹکا ہوا ہوتا ہے۔ کشمیر کے ختم بند چھت اسی اصول کی نہایت فنکارانہ توسیع ہے۔ نرم لکڑی کے پتلے تختے لکڑی کے بنے ہوتے ہیں، اس کو جیومیٹریکل صورتوں میں کاٹ لیا جاتا ہے اور انھیں دوہری جھریوں والے ڈنڈوں کے ساتھ ٹکایا جاتا ہے۔ خاص طور پر اس کام کے لیے سرینگر اور اسلام آباد میں چند محدود تعداد میں کاریگر موجود ہیں مگر ایک کشمیری کی جوڑ ڈالنے کے بابت جو نکتہ چینی کی گئی تھی اس کا یہاں پر اطلاق نہیں ہوتا۔ کشمیریوں کی چھت کے لیے متعدد چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو نہایت درستی کے ساتھ نصب کیا جاتا ہے مگر یہ بات بلاشبہ اس امر کی وجہ سے ہے کہ چند عدد مختلف ٹکڑوں سے ہر ایک نمونہ تیار ہوتا ہے اور نقوش کو سیکڑوں مرتبہ دہرانا پڑتا ہے۔ اور ایک خاص پنجرے کے ذریعے اس بات کو یقینی بنایا جاتا ہے کہ تمام ٹکڑے یکساں صورت کے ہوں اور ایک دوسرے کے ساتھ تبدیل کیے جا سکتے ہیں۔

کلہاڑی اور آرا چلانے والے

نجار کے ساتھ کلہاڑی اور آرا چلانے والے افراد کا بھی گہرا تعلق ہے۔ آرا ایک نئی ایجاد ہے مگر آرا چلانے کی صنعت سے اب بہت سارے افراد کو روزگار حاصل ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ شال کی بنائی کے لیے بہترین انگلیاں رکھنے والے افراد بھی اب آرے کے کام کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ کشمیری اپنے گھروں اور کشتیوں کی تعمیر کے لیے آرے سے کٹی ہوئی لکڑی کو پسند کرتے ہیں اور کلہاڑی سے تراشیدہ لکڑی کے مقابلے میں آرے سے تراشیدہ لکڑی کے زیادہ دام وصول ہوتے ہیں۔

ٹوکری ساز

ٹوکری سازی کی صنعت یہاں پر بھاری اہمیت کی حامل ہے اور بہت سارے دیہات میں ایسے کاریگر موجود ہیں جو کانگڑی اور زرعی مقاصد کے لیے بھی ٹوکریاں تیار کرتے ہیں اور نقل وحمل کے لیے چمڑے میں ڈھکی جو قلطاس استعمال ہوتی ہے وہ یورپی سیاحوں میں نہایت شناسا ہوتی ہے۔ یہ قلطاس بھی سرینگر میں تیار کی جاتی ہیں۔

آہنگر

دیہات میں موجود آہنگر ایک نہایت ہی اہم شخص ہوتا ہے وہ ایک نجار کی نسبت زیادہ محنتی کارکن ہوتا ہے اس کا کلیدی کام آلات کشاورزی اور خانگی لوازمات تیار کرنا ہوتا ہے۔ ان میں زنجیریں، قفل اور پھاوڑے بنانے کا کام شامل ہے۔ شہر میں موجود چند آہنگر غیر معمولی مہارت رکھتے ہیں، ایک شخص جسے ریشم کی ریل سازی کے لیے ملازم رکھا گیا ہے، وہ نہایت پیچیدہ مشینری کی نقل اُتار سکتا ہے۔ نہایت عمدہ قسم کے آلات جراحی بھی تیار کیے جاتے ہیں۔ شہرۂ آفاق بندوق ساز امیر اور عثمانا اچھی قسم کی بندوقیں اور رائفلیں تیار کر سکتے ہیں اور ہتھیاروں کے کل پرزوں کو اس قدر چابکدستی سے بدل سکتے ہیں کہ انگریزی اور کشمیری کاریگری میں تمیز کرنا محال ہو جاتا ہے۔ عام طور پر تلواریں سرینگر میں تیار کی جاتی ہیں اور جموں میں ان کی بھاری قدر و منزلت ہے۔

برتن ساز

یہاں پر برتن سازوں کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے جو دیہی آبادی کے لیے برتن تیار کرتی

ہے۔ فی الحال ان کا کام کارآمدات تک محدود ہے اور برتن سازی کے آرائشی پہلو کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ دیہی برتن سازوں کے لیے شہروں میں ان کی مصنوعات کے لیے منڈی موجود ہے کیونکہ تجربے سے یہ بات ثابت ہوئی کہ دیہات میں تیار کیے گئے برتنوں کی نسبت زیادہ دیرپا ہوتے ہیں۔ سرینگر میں عمدہ قسم کے اور دیرپا برتن رعناواری میں تیار ہوتے ہیں۔

دیہاتی صنعتوں میں یہ کام بھاری اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ یہاں کے کاریگر ہنرمند ہیں۔ اگر کبھی بہتر کام کے لیے کشمیر میں تقاضہ ہوا تو بلاشک کشمیری کاریگر وقت کے اس تقاضے کو پورا کریں گے مگر میرا خیال ہے کہ وہ آئندہ کچھ وقت تک اپنے گھر، پوشاک اور کھانا پکانے کے برتنوں کے معاملے میں موجودہ حالت پر ہی اکتفا کرے گا اور دیہی دستکاریوں کی اہمیت وافادیت میں کوئی تبدیلی رونما ہونے کے امکانات نہیں۔

اس کے برعکس شہروں میں صورت حال مختلف ہے۔ یہاں چند ایسے کاریگر موجود ہیں جو عوام کے ذوق اور مروّجات کا لحاظ رکھتے ہیں اور کشمیریوں کی نسبت کم قدامت پسند ہیں۔ مجھے اس بات کا اندیشہ ہے کہ کشمیر کے فن پاروں پر باہر کی دنیا کا اثر مجموعی طور پر مفید ثابت نہیں ہوا ہے۔ سرینگر کے باشندوں کا ایک عام مقولہ ہے کہ جب محصولات ختم ہوئے تو شہر کی خوشحالی بھی چلی گئی (2)۔ اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں محصولات کے خاتم کے ساتھ وہ پیشہ وارانہ انجمنیں بھی ختم ہوگئیں جن کو حکومت کی منظوری اور تحفظ حاصل تھا۔ جب محصولات ختم ہوگئے تو باہر کے لوگ آدھمکے اور تقابلی عمل کے فن پاروں کی قیمتوں میں کمی کردی۔ جب وہ اس بات کا جواز پیش کرتے ہیں کہ شہر کی خوشحالی رخصت ہو چکی ہے تو وہ اس امر کی وضاحت بھی کرتے ہیں کہ محصولات کے دنوں میں حکومت خام مال اور تیار شدہ مصنوعات پر کڑی نگہداشت رکھتی ہے۔ شال کی تجارت کے اچھے دنوں کے دوران وسطی ایشیا سے حاصل کردہ اصل شال اُون کے ساتھ امرتسر کی نقلی اون کی آمیزش کی ہرگز اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ اس سے بُنائی کرنے والا کاریگر مجبور ہو کر رہ جاتا تھا مگر سیم گر دھاتوں کے امتزاج کے ساتھ کام کرنے کے لیے آزاد تھا۔

ان دنوں اس قسم کی اب کوئی نگرانی نہیں۔ تقابلی جذبے کی بدولت اب قیمتیں گر چکی ہیں اور شال بافی سیم گری، پیپر ماشی اور تانبے کے کام کے حقیقی مالک اب زمانہ سازی کے سامنے جھک

گئے ہیں اور اپنے گاہکوں کو وہ سستے اور ادنیٰ ساخت کے نمونے فراہم کرتے ہیں۔ایک ایسے بوڑھے کاریگر سے کہیے کہ وہ ایسے نمونے دکھائے جن کو وہ پہلے کابل تک برآمد کرتا تھا تو وہ آپ کو موجودہ گھٹیا قسم کے ان مصنوعات سے بالکل مختلف اشیا دکھائے گا مگر کابل کے پٹھان اچھے کام کی واجب قیمت ادا کرتے تھے۔فن کے نمونوں کے گرتے ہوئے معیار کے اس رجحان کو روک پانا اب کافی مشکل ہے۔کشمیریوں میں فنی رجحانات بجا طور پر موجود ہیں۔یہ ایک لازمی امر ہے کہ یہ کاریگر زندہ رہیں ان کا گذارہ فن کی منڈیوں پر منحصر ہے۔میرے خیال میں فن پارے تیار کرنے والوں کی حالت بہتر بنانے اور نئے فنون کی ترویج کے معاملے میں کچھ نہ کچھ لازمی طور پر کرنا ہوگا۔ میں نے آرٹ ڈپارٹمنٹ کے ساتھ ٹیکنکل اسکول کھولنے کی ہر چند وکالت کی ہے اور مجھے توقع ہے کہ اس قسم کا اسکول سرینگر کے عوام کے لیے کافی حد تک کارآمد ثابت ہوگا جہاں تک فنی نمونے تیار کرنے والوں کی حالت بہتر بنانے کا تعلق ہے تو میرے خیال میں کیمیاوی اساس کے رنگوں پر کسی قسم کی ممانعتی محصول اور ایک ماہرین کی کمیٹی کی طرف کسی قسم کا ایک طریقہ کار وضع کیا جائے جو فائدہ مند ثابت ہو۔کشمیری فنی چیزوں کے زوال کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ ہر کسی کو یہ شبہ ہے کہ کشمیر کا درمیانہ دار نہایت بدمعاش قسم کا آدمی ہے۔وہ ایک روپے کا تقاضہ کرتا ہے تو بہت سارے افراد کو یہ محسوس ہوگا کہ آٹھ آنے بھی زیادہ قیمت ہے مگر پسینہ بہانے کا موجودہ نظام کافی حد تک تہس نہس ہو کر رہ گیا ہے۔اس سے اُجرتوں میں اضافہ ہوگا اور عین ممکن ہے کہ درمیانہ داروں کے غلاموں کو آزادی حاصل ہو جائے۔اگر پرانے وقتوں کی طرح حکومت محصولات کی صورت میں غلّہ ادا کرتی ہے تو اس سے بہتر ہوگا کہ وہ غلام ہی بنے رہیں۔موجودہ طریقۂ کار سے محنت کش کو کوئی فائدہ نہیں۔ امداد باہمی کے جذبے کا کشمیر میں افسوسناک حد تک فقدان ہے۔غلیچوں کے تاجروں کے سوائے سبھی مل جل کر چلتے ہیں۔اگر دوسری تجارتوں کے لوگ ایک دوسرے سے ہر چند آزادانہ طور پر کام کرتے ہیں مگر ان سبھی کا انحصار درمیانہ دار پر ہوتا ہے جو انھیں ہمیشہ مقروض رکھتا ہے۔ کشمیر میں کوئی بھی کاریگر تب تک کام شروع نہیں کرے گا جب تک اُسے خوراک کے لیے پیشگی رقم نہ مل جائے اور پیشگی رقم حاصل ہو جانے کے بعد وہ تب تک بے کار بیٹھا رہے گا جب تک بھوک اُسے کام کرنے کے لیے مجبور نہ کر دے۔جس سست روی کے ساتھ تقاضوں کی تکمیل کی جاتی ہے

وہ سرینگر میں فن پارے تیار کرنے والوں کا ایک بدترین پہلو ہے شال کے تاجروں کے سوائے دکانداروں کے پاس کوئی ذخیرہ نہیں ہوتا اور اگر خریدار کسی خاص نمونے کی فرمائش کرتا ہے تو اُسے مہینوں تک مجبوراً انتظار کرنا پڑتا ہے۔ جزوی طور پر یہ بات سرمایہ کاری کے فقدان کے موجب بھی ہوتی ہے مگر کلیدی طور پر سرینگر کے تاجروں اور کاریگروں کا غیر کاروباری طریقۂ کار ذمے دار ہے۔ ان میں پہل اور قوت انتہائی حد تک ناپید ہے۔

میں کشمیر کے کاریگروں کے بارے میں تفصیلات نہیں دینا چاہتا۔ کاریگروں کے گردوپیش کا ماحول انتہائی خراب ہے اور فن پارے کی خوبصورتی اور کاریگروں کی زندگی کے درمیان امتیاز کرنا ایک افسوس ناک امر ہے بہرحال ان لوگوں کی اعانت کے معاملے میں کافی دقت درپیش ہے کیونکہ وہ خود اپنی مدد کے لیے کوئی کوشش نہیں کرتے۔

بدبختی سے شال کی صنعت اب ایک روایت بن کر رہ گئی ہے۔ اس صنعت کو اس وقت ایک زبردست دھچکہ لگا جب 1870 میں جرمن اور فرانس کے درمیان جنگ چھڑ گئی اور عینی شاہدوں نے مجھے بتایا کہ کشمیری شال بافوں نے اس جنگ کے دوران فرانس کی تقدیر کے بارے میں شوق و جذبہ کے ساتھ مشاہدہ کیا اور جب اس جدوجہد میں جرمنی کی فتح کی خبر انھیں موصول ہوئی تو وہ زار وقطار روتے ہوئے بہ آواز بلند اظہار افسوس کرنے لگے۔ اگر صنعت کے بحال ہونے کی کوئی موہوم اُمید باقی تھی اور شال دوبارہ مقبول ہوتے مگر یہ اُمید بھی 79-1877 کی قحط سالی کے دوران ختم ہو کر رہ گئی۔ بے چارے شال بافوں کے سوائے کسی بھی فرد کا اس قدر زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ کچھ افراد جو بچ گئے وہ دیہاتوں کی طرف نقل مکانی کر گئے جہاں انھیں فاقہ کشی سے بچنے کے لیے معمولی اُجرت پر کام کرنا پڑا۔ وہ گرمی کی تمازت برداشت کرتے رہے اور ایسے بند کمروں میں رہتے جو موسم سرما کے دوران بالکل بند رہتے تھے گویا وہاں کوئی سادھو یا فقیر رہتا ہو۔ 1891 کے دوران کی گئی شہر کی مردم شماری کے مطابق 5148 شال باف یہاں رہتے تھے مگر ان میں سے صرف 800 سو یا 900 ہی غالیچہ بنانے کی صنعت میں برسرروزگار تھے۔ اب تو یہ امر عام طور پر معلوم ہے کہ وسطی ایشیا کی نفیس اُون کشمیر نہیں پہنچ پاتی۔ خام مال کی قلت کے ساتھ ساتھ مانگ بھی کم ہونے کے سبب صنعت شال کی حدیں اب سمٹ کر رہ گئی ہیں۔ اس انتہائی اہم صنعت کی بابت

تمام حقائق کا شمار مورکرافٹ کی ٹریولز جلد دوم اور سوم میں کیا گیا ہے۔ اگرچہ ریاست میں یہ ایک نہایت منافع بخش صنعت تھی اور اس سے شال بافوں کے مالکوں سے حکومت کو سالانہ 30 روپے فی کس حاصل ہوتے تھے اور تیار شدہ مصنوعات پر 20 فیصد کا لگان وصول کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ لمبے شال پر 7 روپے پندرہ آنے اور مربع شال پر 5 روپے تیرہ آنے کا برآمدی محصول وصول کیا جاتا تھا۔ بنائی کرنے والوں کے لئے یہ ایک کمزور صنعت تھی۔ 1871 میں عام شال باف کو یومیہ ایک یا دو آنے ملتے تھے اور مورکرافٹ کی نوٹس میں آیا کہ صنعت اور برآمداتی بنائی کرنے والوں کی عام آمدنی ایک روپیہ آٹھ آنے یومیہ یا غالباً اس سے کم تھی۔ ہنری ڈاروئین کا کافی عرصے تک اس صنعت کے ساتھ گہرا واسطہ رہا ہے۔ انھوں نے سرینگر میں فن پارے تیار کرنے والوں کے لیے کافی کام کیا ہے۔ انھوں نے شالوں کی بابت مجھے نادر معلومات بہم پہنچائی ہے۔ ڈراوئین کے مطابق کشمیری شال بابر کے عہد سے چلا آ رہا ہے۔ مغل شہنشاہ اپنی دستاروں پر ہیروں کا ایک زیورر تی جھگا آویزاں کرتے تھے جس کی شکل بادام کی مانند ہوا کرتی تھی۔ اس جھگا کے بالائی سرے پر سارس کے پروں کا ایک گچھا ہوتا تھا۔ شہنشاہ بابر کے لیے تیار کیے گئے ایک رومال پر ایک نورباف نے جھگا کی نقل اُتاری۔ یہ نمونہ اس قدر کامیاب رہا کہ تمام رومالوں اور شالوں پر ایک فیشن ایبل ڈیزائین کی حیثیت اختیار کر گیا اور مغل شہنشاہوں نے بہت سارے نورباف کشمیر سے ہندوستان لائے۔ چنانچہ ہندوستان اور فارس کے بہت سارے چھوٹے غلیچوں پر جھگا کی نمائندگی ہوتی ہے اور زمانہ حال میں فقط فارس کے بازاروں کے لیے شال سرینگر میں تیار کیے جاتے ہیں۔

جام داروں میں جھگا ڈیزائنوں کے درمیان مختلف پھولوں کیساتھ ڈھکی ہوئی دھاریاں ہوتی ہیں۔ بوٹہ دار اور جامہ وار کی اب بھی بمبئی کے راستے فارس تک برآمد ہوتی ہے، جہاں پر ان کا استعمال چوغوں اور دیگر گریبانوں کے کناروں کی سجاوٹ کے لیے ہوتا ہے۔

یورپ میں جو پہلے شال پہنچے انھیں مصر کی مہم کے وقت نپولین نے خرید لیا جنھیں اس نے شہزادی جوزفائین کو تحفے کے طور پر دیا۔ اس کے بعد شال ایک فیشن کا روپ اختیار کر گئے۔ ان دنوں جھگا ایک فٹ سے 18 انچ گہرا ہوتا تھا بعد ازاں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ملازمت میں جنرل

وینٹورا نے فرانس تک ایسے شال ارسال کیے جن کا جھگا زیادہ تناسب کا تھا۔ ان شالوں کو پالمز کہا جاتا تھا ان شالوں کی لمبائی 10 سے 11 فٹ اور چوڑائی ساڑھے چار فٹ ہوتی ہے۔ ان کے مرکز کا رنگ عام طور پر سیاہ ہوتا ہے ان کے کناروں کو متوازی قطاروں میں ہتھیلیوں کی آرائش سے لمبا کیا گیا ہے۔ اس شال کو نفیس ترین تبتی پہاڑوں سے حاصل کردہ پشم کے ذریعے تیار کیا گیا ہے مگر بہترین مال تیان شان کے پہاڑوں اور اوش اور طرفان سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ مال یارقند اور لداخ سے آنے والے کارواں فراہم کیا کرتے تھے یہاں سے انھیں امرتسر لاہور اور لدھیانہ روانہ کر دیا جاتا جہاں اس سے الوند یا شالوں کی صورت دی جاتی۔ امرتسر کے نور باف خالص پشم کے ساتھ باختری اونٹ کی گردن کے نچلے حصے کے بالوں کی آمیزش کر دیا کرتے تھے۔ اس آمیزش کی وجہ سے شال بھاری بھرکم اور کھردرے ہو کر رہ جاتے چنانچہ ان میں کشمیر میں تیار کردہ مصنوعات کی لچک کا فقدان ہوتا ہے کیونکہ کشمیری شال خالص پشم کے ساتھ تیار کیے جاتے تھے۔

کشمیر میں 72-1865 کے دوران مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دورِ حکومت میں بہترین شال تیار کیے گئے ان کی بنائی نہایت عمدہ ہوتی ہے ان پر آرائش کے مشرقی طرز کے نہایت مفصل اور شاندار ڈیزائن بنائے جاتے۔ شال تیار کرنے والوں کو اس بات پر آمادہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی کہ وہ نقصان دہ رنگوں کے استعمال سے گریز کریں اور فرانسیسی ایجنٹوں نے انیلین رنگوں والی مصنوعات کی خرید سے انکار کر دیا چنانچہ وہ اس کریہ گری کو ختم کرنے میں کامیاب ہو گئے مگر فنونِ لطیفہ میں ان کی گہری دلچسپی بے سود ثابت ہوئی کیونکہ فرانس اور جرمنی کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ ضرر رساں رنگوں کے خلاف جہاد میں فرانس کے ایجنٹوں کی خدمات کو بہتر طور پر یاد رکھا جائے گا۔ بیان کیا گیا ہے کہ ان رنگوں کے استعمال کے سبب یورپ میں کشمیری شالوں کی مقبولیت کو زک پہنچی۔

ان شالوں کی قیمت 150 سے 5000 برطانوی روپے کے درمیان تھی۔ اسلام آباد کے شال جو کشمیر کی کل پیداوار کا پانچواں حصہ تھے، نہایت ادنیٰ تھے اور ان کی قیمت کسی بھی طور پر 450 روپے فی جوڑا سے زائد وصول نہیں ہوئی۔ یہ شال تبت کی چیانگ تھانگ کے عامیانہ اُون سے تیار ہوتے تھے۔ 70-1862 کے برسوں میں 28-25 افراد شال بافی (3) کی صنعت میں برسرِ روزگار تھے۔ ان شال بافوں نے ہرگز کشتی رانی کا پیشہ اختیار نہیں کیا۔

الوند یا سپاٹ پشمینہ، جاموار اور بوٹہ دار شال فارس کی منڈیوں کے لیے تیار کیے جاتے۔ یورپ تک اب اس کی بالکل برآمد نہیں ہوتی۔ علمی کا یا ہاتھوں سے سوزن کاری شدہ شال بھی بھاری تعداد میں تیار کئے جاتے ہیں۔ اس الوند شال کے سارے ٹکڑوں پر تمام تر کام سوئی کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ چند ڈیزائن نہایت موثر تھے اور جلی راحت کے باعث رنگوں کے اثرات کا حصول آسان ہو گیا تھا جو نوربا ف شال میں قریباً ناممکن بات ہے۔ یہ شال بنوٹ کے معاملے میں سستے تھے اور ان سے کبھی دو سو روپے سے زائد حاصل نہیں ہو سکتے تھے۔ ریشمی اور سنہری سوزن کاری شال چکنی کار، کشنکار اور مور سا کار کے ناموں سے مشہور تھے۔ اول الذکر شال نہایت صاف تھا جس کی شکل وصورت دہلی کی سوزن کاری کی مانند جواہرات کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے۔ اوّل درجے کے جس کام کی اب بھی فروخت ہوتی ہے وہ ڈوبکار ہے جو سادہ پشمینہ الوند پر ریشمی سوزن کاری ہے۔

قالین

1877-79 کی قحط سالی سے جو لوگ بچ گئے ان میں سے کافی لوگوں نے اب قالین بافی کا پیشہ اختیار کر لیا ہے۔ یورپی افراد سرینگر میں قالین سازی کا دھندا چلا رہے ہیں۔ یہ کام اعلیٰ معیار کا ہوتا ہے اور یورپ ہندوستان کے موصول شدہ تقاضوں کو وہ پورا نہیں کر پاتے۔ میرے خیال میں اب قیمتی اور نفیس قسم کے وہ نمدے تیار کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی جن میں شال اُون کا استعمال ہوتا تھا۔ جو اُون مقامی طور پر تیار ہوتا ہے یا ہندوستان سے درآمد کیا جاتا ہے۔ اُس کا استعمال سرینگر کی کھڈیوں میں ہو جاتا ہے۔

سرینگر کا ایک طاقت ور حریف امرتسر ہے جہاں پر ایک بڑی کالونی میں کشمیری نوربا ف آباد ہیں اور قالین سازی میں اچھا خاصہ سرمایہ لگا ہوا ہے۔ جو قالین، شالبافی کے لیے بروئے کار لائے جاتے ہیں ان کی بابت بھی یہی طریقہ کار اپنایا جاتا ہے۔ شال یا قالین کا جو نمونہ فن کار تیار کرتا ہے اس کو کاغذ پر اُتارا جاتا ہے۔ اس کاغذ پر بہت سارے تصویری حروف ہوتے ہیں جو اس فن کے لیے قابل فہم ہوتے ہیں اور ان میں اعداد اور رنگوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔ جو شخص ان تصویری حروف کو پڑھ سکتا ہے وہ ان پژمردہ افراد کی قطاروں تک جاتا ہے جو کھڈیوں پر بیٹھے ہوتے ہیں۔

''پانچ اٹھاؤ اور سرخ رنگ کا استعمال کرو'' یا ''ایک اٹھاؤ اور سبز رنگ کا استعمال کرو'' مگر نہ تو اسے اور نہ ہی نور بافوں کو اس بات کا کوئی تصور ہوتا ہے کہ آخر یہ نمونہ کیا صورت اختیار کرے گا۔ اس کو نقاش کہتے ہیں اور یہ نمونہ کبھی فیکٹری تک نہیں جاتا۔

قالین سازی نے متعدد شال بافوں کو روزگار فراہم کیا ہے اور بہت سارے افراد نمدوں پر سوزن کاری کے لیے بھی برسرروزگار ہوتے ہیں۔ بہترین نمدوں کی یارقند سے درآمد ہوتی ہے اور قدرے عامیانہ ساخت کے نمدے کشمیر میں بھی تیار ہوتے ہیں۔ رنگین نمدوں پر سرینگر میں سوزن کاری کی جاتی ہے اور غالباً یہ کشمیری کپڑوں کی سب سے زیادہ فن کارانہ نوعیت کی مصنوعات ہیں۔ لکڑی سے چھپائی کا کام بھی سرینگر میں وسیع پیمانے پر ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لیے مقامی طور پر تیار کردہ کپڑا استعمال میں لایا جاتا ہے۔ یہ نمونے کشمیری شال کے ڈیزائنوں سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے بروئے کار لانے والے رنگوں میں نیل، گلوں کا رنگ، مجیٹھ، سرخ اور زرد رنگ ہوتے ہیں۔

پیپر ماشی

لاکھ کے روغن شدہ کام یا سرینگر کی پیپر ماشی کو کبھی اچھی خاصی شہرت حاصل تھی مگر اس وقت یہ صنعت قدرے خستہ حالی کی شکار ہے۔ کاغذ کے گودے سے جو حقیقی پیپر ماشی کا کام تیار ہوتا ہے اس کی تعداد نہایت قلیل ہے اور لاکھ کے روغن کا کام کرنے والے جو افراد یا نقاش اب ان ڈیزائنوں کا کام ہموار لکڑی پر کرتے ہیں۔ یہ ڈیزائن نہایت پیچیدہ نوعیت کے ہوتے ہیں اس کے خطوط ہاتھ سے کھینچے گئے ہوتے ہیں کیونکہ کاریگروں کے پاس ارضیاتی اوزار نہیں ہوتے یہ خطوط وضع کرنے میں نقاش جس کاریگری کا مظاہرہ کرتا ہے وہ نہایت معرکتہ الآراء ہوتی ہے۔ پیپر ماشی کے کام کو کارقلمدانی کہا جاتا ہے مگر اب مختلف النوع اشیا مثلاً میز، الماریاں اور طشتریاں تیار کی جاتی ہیں اور امیر طبقے کے افراد اپنی چھتوں اور دیواروں کی سجاوٹ کے لیے اب نقاشوں کی خدمات حاصل کرتے ہیں۔ غیر ملکی خریداروں کے ذوق کے سبب دوسری صنعتوں کی مانند پیپر ماشی کو بھی نقصان اٹھانا پڑا ہے۔

سیم گری

کشمیر میں سیم گری کا کام انتہائی خوبصورت ہوتا ہے اور مقامی ڈیزائینوں میں چنار اور کنول کے پتے نہایت خوشنما ہوتے ہیں۔ سیم گر ہتھوڑی اور چھینی کے ساتھ اپنا کام کرتا ہے اور جو ڈیزائن بھی اُسے دیا جائے اُس کی وہ من وعن نقل اُتار سکتا ہے۔ حالیہ برسوں تک کشمیر کے سیم گری کے کام کی مخصوص چمک دمک رہی ہے اور اس کے نمونے پہلی ہی نظر میں نہایت خوشنما معلوم ہوتے ہیں مگر کچھ عرصے کے بعد ہی یہ مسخ ہو جاتے ہیں۔ اس سفیدی کا سبب اُسے خوبانی کے رَس میں اُبالنے کے عمل سے بیان کیا جاتا ہے۔ اس کام میں استعمال شدہ چاندی کے بارے میں عام طور پر شکایتیں آتی ہیں اور اسے پرکھنے کا کوئی سہل طریقہ نہ صرف خریداروں بلکہ کاریگروں کے لیے بھی ایک عنایت کی مانند ہوگا یہ دھات یا تو اینٹ کی صورت میں یارقند سے یا روپوں کی صورت میں درآمد کی جاتی ہے۔

تانبہ سازی

سرینگر میں تانبہ سازی کا کام نہایت مؤثر اور پیسے کی قیمت کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک تانبہ ساز ہتھوڑے اور چھینی کے ساز پر کام کرتا ہے۔ موجودہ تانبہ ساز پہلے سیم گری کا کام کیا کرتے تھے۔ وہ پیتل کا کام بھی کرتے ہیں ان کے ڈیزائین نہایت عجیب نوعیت کے ہوتے ہیں اور جو بھی ڈیزائین انھیں دیا جائے وہ اسے اپنا لیتے ہیں۔ سرینگر میں تانبہ سازی کا کام برتی پرت کے لیے اپنایا جاتا ہے اور بہت سارے تانبہ ساز اب خاص طور پر برتی پرت کے لیے بہت ساری اشیا کی جانب مائل ہو گئے ہیں۔ تانبے کی طشتریوں کی بھاری طلب ہے جن کی گرد تراشیدہ اخروٹ کی میزوں کا چوکھٹا چڑھایا جاتا ہے۔ نجار بھی تانبہ ساز کا قریبی رفیق ہوتا ہے۔ جہاں تک میناکاری کے کام کا تعلق ہے میرے خیال میں پیتل پر میناکاری کا کام بہترین طور پر سرانجام دیا جاسکتا ہے۔ حالانکہ چاندی پر میناکاری کا کام بھی خوش نما ہوتا ہے۔ تانبے پر میناکاری کا کام بھی دلنشین ہوتا ہے۔ تانبے پر میناکاری کا کام ممکن نہیں ہوتا۔

لکڑی کا کام

سرینگر میں لکڑی کے کام کی حتمی صورت کا پنجاب کی نسبت فقدان ہے۔ مگر کشمیر میں لکڑی کا

کندہ کار ہنراور ڈیزائن کے معاملے میں کسی طور پیچھے نہیں ۔ وہ ہتھوڑے اور چھینی کے ساتھ کام کرتا ہے مگر اس میں کافی حد تک کھر درا پن ہوتا ہے اور پختہ کی گئی اخروٹ کی لکڑی حاصل کرنے میں وقت کے سبب اس ٹکڑے کے کھر درہ پن کا شکار ہوتے ہیں اس معاملے میں خاص طور پر کشمیر میں لکڑی کا کام قابل ذکر ہے۔ مکمل ڈیزائین کے خوبصورت چھت نہایت موثر ہوتی ہیں جنھیں چند نجار اپنی معرکتہ الآرا مہارت کی بدولت صنوبر کی لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو جوڑ کر نہایت سستی لاگت میں سرانجام دیتے ہیں۔ اس عمل کو ختم بند کہا جاتا ہے۔ نتیجے کے طور پر ایک جاذب نظر چھت تیار ہو جاتی ہے جس میں مختلف طرح کی صنوبر کی پیٹیوں کے امتزاج قائم کر کے انھیں نہایت ہم آہنگی کے ساتھ جوڑا جاتا ہے۔ ہاؤس بوٹ تعمیر کرنے والوں کی طرف سے اس صنعت کو بھاری فروغ حاصل ہوا ہے ان کی تعمیر میں اخروٹ کی لکڑی کے سیاہی مائل رنگوں کا صنوبر کے ہلکے رنگوں کیساتھ امتزاج کیا گیا ہے۔ کشمیر میں لکڑی کے کام (کشمیری چھتوں کا) اگر کسی کو عمدہ نمونہ دیکھنا مطلوب ہو تو اُسے مشہور درگاہ نقشبند جانا چاہیے جو سرینگر کی جامع مسجد سے زیادہ دور نہیں ہے۔ ختم بند طرز کی چند چھتوں کو انگلستان میں بھی ترویج کی گئی ہے۔ میرے خیال میں یہ مؤثر اور سستی چھتیں کشمیر کا خاصہ ہیں مگر ایم ڈاروائین کی اطلاع کے مطابق اسی طرز تعمیر کی چھتیں سمرقند، بخارہ، فارس، براعظم قبطی الجیریا اور مراکو میں بھی پائی جاتی ہیں۔

چمڑہ

کشمیر میں چمڑے کی تجارت وسیع پیمانے پر ہوتی ہے۔ دیہات میں واتل (چمار) کھالیں تیار کرتے ہیں اور اس کے بعد انھیں سرینگر لاتے ہیں یہاں پر ان کی نفیس کاری کی جاتی ہے، خام جلدوں کو بھی سرینگر لا کر تیار کیا جاتا ہے۔

کشمیر میں چمڑے کے کام کی مور کرافٹ نے کافی ستائش کی ہے۔ کشمیر میں خام مال کی فراوانی ہے اور کشمیر کے چمڑہ رنگنے والے اگر چاہیں تو وہ بہترین چمڑہ تیار کر سکتے ہیں۔ اگر کسی کو اپنے تجربے کی بنا پر فیصلہ کرنا ہو اسے لازمی طور پر یہ ماننا پڑے گا کہ چپلی سنڈیوں کا چمڑے کے موسم برسات میں پھیلنے کا احتمال ہوتا ہے مگر دوسری جانب Portmonteaux اور دیہات میں تیار کیا گیا چمڑہ کافی حد تک خراب موسم کو برداشت کر سکتا ہے جہاں انگریزی اور ٹھوس چمڑے سے تیار

کردہ بہت کم تھیلے بچ پاتے ہیں۔ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ سرینگر کا چمڑہ اور کاٹھیاں دیرپا ہوتی ہیں اور میرا تاثر یہ ہے کہ ایک شخص بخوبی طور پر جانتا ہے کہ سرینگر میں کس قدر اچھا چمڑہ دستیاب ہوسکتا ہے۔ اگر وہ اچھی قیمت ادا کرسکتا ہے تو اسے غیر معینہ عرصے تک انتظار کرنا ہوگا۔

پشم یافر

کشمیر کے پشم کاروں کے گذر بسر کا انحصار انھیں کھلاڑیوں کی طرف سے فراہم کردہ کاروبار پر ہوتا ہے جو انھیں چمڑہ کی اصلاح کرنے کے لیے دیتے ہیں۔ شکار کے تحفظ کے حالیہ قانون کے مطابق چمڑے اور سینگوں کی فروخت ممنوع قرار دی گئی ہے۔ اس امر کے سبب پشم سازوں کے کاروبار میں کمی واقع ہوئی ہے۔

پتھر پر کندکاری

پتھر پر کندکاری میں سرینگر کو اچھی خاصی مہارت حاصل ہے اور وہ مہر شکنوں کی مانند خاص طور پر اس میں ماہر ہیں۔ یہ لوگ زیادہ خوشحال نہیں مگر مہر شکنوں کو اگر ہندوستان میں کام کی تلاش ہو تو وہ بہتر اجرت حاصل کرسکتے ہیں۔

کاغذ

کسی زمانے میں کشمیر کو مقامی کاغذ کے لیے شہرت حاصل تھی اور قلمی نسخوں کے لیے ہندوستان میں اس کی بھاری طلب تھی اور جو لوگ اپنی خط وکتابت کو افتخار بخشنا چاہتے تھے وہ اس کاغذ کا استعمال کرتے تھے جس گودے سے یہ کاغذ تیار کیا جاتا ہے وہ چیتھڑوں اور بھنگ کے ریشے کے مرکب سے تیار ہوتا ہے جس کی پانی کے زور سے چلنے والی سیور مل میں کٹائی کی جاتی ہے۔ چونا اور ایک قسم کا سوڈا اس گودے میں سفیدی لانے کے لیے استعمال میں لایا جاتا ہے۔ یہ مواد وادیٔ سندھ اور داچھی گام نالے سے لایا جاتا ہے۔ اس گودے کو تب پتھر کے حوضوں میں رکھ کر پانی میں ملایا جاتا ہے۔ اس کے بعد اس سے بانسریوں کے چوکھٹے کے ذریعے گودے کو نکالا جاتا ہے، یہ تہہ کاغذ کی ہوتی ہے جس کو دھوپ میں دبایا اور خشک کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اس پر پالش کیا جاتا ہے اور چاول کے پانی سے اس میں چمک پیدا کی جاتی ہے۔ اس کے بعد اس پر سنگلاز کے ذریعے حتمی پالش کو چڑھایا جاتا ہے۔ اب کاغذ استعمال کے لیے تیار ہوتا ہے۔ میں نے کافی حد تک کشمیر میں

تیار کردہ کاغذ کو استعمال کیا ہے۔ یہ کاغذ پائیدار اور کئی لحاظ سے عمدہ ترین بھی ہے مگر یہ کاغذ ہندوستان میں تیار کردہ ملوں کے کاغذ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس کی انتہائی چماہٹ خطرناک ہوتی ہے۔ اس پر کیے گئے اندراجات کو پانی کے ساتھ مٹایا جا سکتا ہے۔ یہ صنعت اب زوال پذیر ہے اور حکومت کا حالیہ حکم کہ تمام دفاتر میں سرینگر کے قید خانے میں تیار شدہ کاغذ استعمال کیا جائے۔ اس طرح یہ تمام کاغذ کے خاتمے کا عمل تیز تر کر دے گا۔ جو کبھی ایک نادر شئے کے طور پر مشہور تھا۔ اب بھی قرآن شریف کا نسخہ حشیش کے ریشوں سے تیار کردہ کاغذ پر تحریر کیا جاتا ہے مگر طباعت کے عمل سے سرینگر کے خوش نویس کے قلم کو تباہ کر دیا گیا ہے عین اُسی طرح جس طرح ہندستانی ملوں سے تیار کردہ کاغذ نے کشمیر کے ہاتھ تیار کردہ فل اسکیپ کاغذ کو ختم کر ڈالا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ کاغذ سازی اور کتابوں پر جلد سازی کو عظیم بادشاہ زین العابدین نے سمرقند سے لاکر ترویج دی اور کاغذ سازی کی صنعت میں کام کرنے والے افراد کو سرینگر کے نوشہرہ ضلع میں آباد کیا۔ اب بھی نوشہرہ میں قریباً چھتیس کنبے آباد ہیں اور محنت اور قابلیت کے ساتھ کام کرنے والے ہر کنبے میں چودہ افراد ہیں۔ ایک اوسط کنبہ پانچ دستہ اچھا اور سات دستے کھردرا کاغذ ایک دن میں تیار کرتا ہے۔ ایک دستہ کاغذ میں چوبیس اوراق ہوتے ہیں۔ یہ کاغذ تین قسم کا ہوتا ہے۔

1- **فرمائشی:** اس کاغذ کو مہراپی یا شاہی کاغذ بھی کہا جاتا ہے۔ اعلیٰ قسم کا یہ کاغذ نہایت چمکدار ہوتا ہے جو ایسے قسم کے گودے سے تیار ہوتا جس میں دو حصے حشیش کا ریشہ ہر سولہ حصے کے چیتھڑوں میں شامل ہوتا ہے۔

2- **واہ ماشی:** یہ کاغذ تین حصے حشیش کے ریشے اور ایک سو تیرہ حصے کے چیتھڑوں سے تیار کیا جاتا ہے۔

3- **قملدانی:** کاغذ اب زیادہ تیار ہوتا ہے اس میں قطعی طور پر حشیش کا ریشہ نہیں ہوتا۔

حشیش کے ریشے کی قیمتیں بڑھ رہی ہیں اس کی قیمت 5 روپے سے 8 روپے فی خروار حاصل ہوتی ہے اور غریب کاغذ سازوں کے لیے ٹاٹ کی پرانی بوریوں کا کوئی استعمال نہیں ہوتا۔

یہاں تک کہ چیتھڑے لئہ فروش چیتھڑوں کے لیے 13 روپے فی خروار وصول کرتے ہیں تاکہ یہ مواد مہنگا ہو۔ ان پرانے دنوں کے بارے میں سوچ کر دل اُداس ہو جاتا ہے جب ان کی

اتنی قدر و قیمت تھی کہ ایک حصہ ریشم میں بانٹے چیتھڑے ہوتے تھے۔

رنگہ ٔ آ ز ایک رنگین کاغذ ہوتا ہے جسے سامان وغیرہ باندھنے کیلئے استعمال میں لایا جاتا ہے۔

کشتیاں

کشمیر میں کشتیوں کی صنعت کو بھاری اہمیت حاصل ہے کشتی رانوں کو ہانز یا ہانجی کہا جاتا ہے۔ان کی تعداد 33877 ہے اور ان کے کاروبار کے سبب ان افراد کا وابستہ آبادی کے مختلف طبقوں سے پڑتا ہے۔ کشتی رانی کشمیر کی ایک قدیم صنعت ہے اور آئین اکبری سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کشتیاں ہی ایک ایسا محور تھیں جن کے گرد تمام تجارت گردش کرتی تھی اور یہاں پر جہاز کا ایک ماڈل تھا جسے دیکھنے والا ہر شخص دنگ رہ جاتا تھا۔ کشتیاں کئی قسم کی ہوتی ہیں۔ یہ سب سپاٹ تلے والی ہوتی ہیں مگر پرانده اس ڈیزائن سے مختلف ہے۔ان میں سے کوئی بھی کشتی آج کے زمانے میں باعث حیرت نہیں ۔ سواریوں کی نقل وحرکت کے لیے اس کاروبار میں 2477 کشتیاں بروئے کار لائی گئی ہیں ۔ ان میں نجی افراد کے لیے ذاتی مقاصد کی خاطر استعمال ہونے والی کشتیوں کا شمار نہیں ہے۔ان میں 1066 کشتیاں بڑی جسامت کی ہیں۔سرینگر تک درآمد ہونے والے غلّے اور لکڑی کا بیشتر حصہ دریائی راستوں سے بڑی بڑی کشتیوں میں آتا ہے جو نہری کشتیوں سے کسی طور مختلف نہیں ہوتے ۔ دریائی راستے پرستونوں سے باندھ کر انھیں دریا سے بالائی علاقوں میں لایا جاتا ہے یا کشتی کی لہروں کی روانی پر نیچے کی جانب جانے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ان بجروں کی دو اقسام ہوتی ہیں ۔ بڑے بجرے کو بحو کہا جاتا ہے جس کا عقبی اور سامنے کا حصہ کافی مضبوط ہوتا ہے۔دو کمروں پر مشتمل ایک حصے کو عفت کہا جاتا ہے جس میں کشتی ران اور ان کا کنبہ رہائش پذیر ہوتے ہیں اور گھاس کی چھت کے نیچے جو غلّہ ہوتا ہے اسے سنبھال کر رکھا جاتا ہے۔ بحو میں 800 سے 1000 من تک اناج کی نقل وحرکت ہو سکتی ہے ۔ چھوٹے بجرے کو وار کہا جاتا ہے اور اس کا عقبی حصہ پست ہوتا ہے۔ وار 400 من تک مال کی ڈھلائی کر سکتا ہے۔ ڈونگا سب سے عام قسم کی ناؤ ہے ایک سپاٹ تلے والی کشتی ہے جس کی لمبائی 50 فٹ سے 60 فٹ اور چوڑائی 6 فٹ ہوتی ہے۔ یہ 2 فٹ پانی کی گہرائی میں رہتی ہے۔اس پر ٹاٹ کی ڈھلوانی چھت ہوتی ہے اور طرفین کی دیواریں بھی اسی مواد سے تعمیر شدہ ہوتی ہیں۔ کشتی ران ڈونگے کے اندر

ہی رہتے ہیں اوران کا باورچی خانہ خشک مٹی کا بنا ہوا ہوتا ہے۔ ڈونگا سوار کشتی کے اگلے حصے میں رہتا ہے۔گرم موسم کے دوران ڈونگا کی زندگی نہایت خوشگوار ہوتی ہے موسم سرما کے دوران جب سواریوں کی آمدورفت میں جمود طاری ہوجاتا ہےتو ڈونگوں کا استعمال اناج کی نقل وحرکت کے لیے کیا جاتا ہے۔ایک اچھا ڈونگا دوسومن تک مال ڈھوسکتا ہے۔دوسرے طبقوں کی مانند ڈونگا کشتی رانوں کوشکوہ ہے کہ جب یہ ٹیکس معاف کرایا گیا تو اس کاروبار میں ادنیٰ نسل کے افراد شامل ہوگئے۔اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ڈونگا والوں کی حالت نہایت غیراطمینان بخش ہے۔اس کے باوجود بھی چار کشتی رانوں کے عوض وہ 15 روپے ماہانہ وصول کرتے ہیں جوایک نہایت حقیر رقم ہے۔جس شدت کیساتھ ہاؤس بوٹ تعمیر کیے جارہے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ وقت دور نہیں جب ڈونگا والوں کے منافع میں کمی ہوکررہ جائے گی۔میرا یہ بھی خیال ہے کہ بارہمولہ سے سرینگر تک ٹھیلہ سڑک کی تعمیر سے ہاؤس بوٹ کی آمدورفت کو بھی زک پہنچنے کا احتمال ہے۔پھر چند لوگ ہی بےبسی کے عالم میں ایک ڈونگے میں بیٹھ کر جھیل ولر کوعبور کریں گے۔اور خوفناک جھیل میں متعین تاخیر کے شکار ہوں گے خاص طور اُس صورت میں جب تین گھنٹے کے سفر میں وہ بارہمولہ سے سرینگر پہنچ سکتے ہیں۔ڈونگا کا مختصر روپ ایک شکارہ ہے' چھوٹے سفر کے لیے شکارا نہایت مفید سواری ہے۔اس کو چپوؤں سے چلایا جاتا ہے۔بس ایک بھاری بھرکم کشتی ہوتی ہے جس کی چھت نہیں ہوتی۔اسے پتھروں اور گھٹیا ساز وسامان کی ڈھلائی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ اسے بارش کے سبب کسی قسم کی زک نہ پہنچنے پائے۔ڈیمب ناؤ ایک چھوٹی کشتی ہوتی ہے جس میں سبزیاں بازار تک لائی جاتی ہیں۔جھیل ڈل کے باشندے لگ بھگ ڈیمب ناؤ میں زندگی گذار دیتے ہیں۔ ژانوار بلا چھت کی ایک چھوٹی سی کشتی کو فقط جھیل ولر میں استعمال کیا جاتا ہے۔اس میں کشتی رانوں کی دو قطاریں ہوتی ہیں اور وہ ہر موسم میں جھیل عبور کرسکتے ہیں۔ ژانوار کشتی ران عام ہانجیوں کی نسبت زیادہ مضبوط جسم کے مالک ہوتے ہیں اور بعض اوقات زندگی بچانے والی کشتیوں کا کام بھی یہ لوگ سرانجام دیتے ہیں۔

اب پرندہ ،لارگ ناوءاور چک واری کے بارے میں عام طور پر ذکرنہیں ہوتا مگر کشمیری حکمرانوں کے لیے یہ باعث ثروت کشتیاں ہیں۔ پرندہ ایک چھوٹی قسم کی کشتی ہوتی ہے جسے

40-50 کشتی ران چلاتے ہیں اسکے اگلے حصے میں ایک اوپر کو اُٹھی نشست ہوتی ہے جس پر چار افراد بیٹھ سکتے ہیں ۔ اس نشست کو ایک سائبان سے ڈھانپا گیا ہوتا ہے ۔ دریائے جہلم پر دوڑنے والی کشتیوں میں پرندہ سب سے تیز رفتار ہے اور 50 کشتی رانوں کو ناؤ دوڑاتے ہوئے دیکھنا ایک خوشگوار منظر پیش کرتا ہے ۔ پرندہ چلانے والے تخلیاتی طور چپو چلاتے ہیں جنھیں سکھ گورنر دیوان کرپارام کے اعزاز میں کرپارامی چھپر کہا جاتا ہے۔ لاری ناؤ ایک کالج چھپرے کی مانند ہوتی ہے اور چکواری کی عقبی دیوان خانے تک کافی لمبائی ہوتی ہے۔

جب دریا کے پانی کی سطح اونچی ہو جاتی ہے تو کشتی رانی ایک سہل کام ہے مگر موسم سرما کے دوران جب پانی کی سطح کم ہو جاتی ہے تو بڑے بڑے بجروں کو اتھلے پانی میں اُتارنا محال ہو جاتا ہے۔ کشتی رانوں کو کافی محنت کرنا پڑتی ہے اور انھیں دل کی صورت میں چپوؤں سے وہ نہریں کھودنا پڑتی ہیں ۔ اگر پانی زیادہ بھی ہو تو کشتی باندھنے کے راستے کی عدم موجودگی سے کافی دقت اور تاخیر واقع ہوتی ہے ۔ دریا کو برجیوں سے ہو کر گزرنا اور ایک پاٹ کو عبور کرنا پڑتا ہے۔ کھینچنے والے رسے کو لازمی طور پر درختوں کے گرد باندھنا چاہیے، ابھری ہوئی سطح کو دریا کی سطح روانی سے اوپر سفر نہایت حساب لگا کر انجام دیا جاتا ہے اس کی وجہ سے وقت اور مزاج کا خیال رکھنا پڑتا ہے ۔ میں نے اکثر کھونٹوں کا راستہ تعمیر کرنے کی وکالت کی ہے شہر میں یہ امر خاص طور پر نہایت لازمی ہے ۔ خاص طور پر پلوں کے نیچے دریا کی لہریں کافی تند ہوتی ہیں اور بڑی کشتیوں کی آمدورفت میں بھاری دقّت پیدا ہوتی ہے ۔

مجھے اس بات کا خدشہ ہے کہ کشمیر کے کشتی رانوں کے لیے بُرے دن آنے والے ہیں ۔ تحفظ جنگلات کے سبب دیودار کے ان تختوں کو حاصل کرنا مشکل ہو جائے گا جن سے کشتیاں تعمیر کی جاتی تھیں اور دیودار کے وہ ڈنڈے جن سے کشتی رانی ہوتی تھی اب اوراق پارینہ بن کر رہ جائیں گے ۔ جب سرینگر اور بارہمولہ کے درمیان ٹھیلوں کی آمدورفت میں اعتدال پیدا ہو جائے گا اور اس کے فوائد کو سمجھ لیا جائے گا تو وادی کے دوسرے حصوں تک ٹھیلہ سڑکوں کی تعمیر میں دیر نہیں لگے گی ۔ بہت سارے ملکوں میں آبی نقل و حرکت کم لاگت سے ہوتی ہے مگر کشمیر میں یہ نقل و حرکت مہنگی ہے کیونکہ کشتی ران نہ صرف مال کا ایک حصہ چُرا لیتے ہیں بلکہ غیر قانونی ملاوٹ کے مرتکب

ہوکر بعض اوقات وہ غلّے کی کھیپ کو تباہ کر کے رکھ دیتے ہیں۔ اگر ڈھلائی کا دوسرا متبادل میسر ہو جائے تو کوئی بھی اپنا غلّہ کشتی رانوں کو نہیں سونپے گا۔ میں یہاں پر اضافہ کے طور پر اس بات کو دہراؤں گا کہ کامراج کے کشتی ران کشمیر کے دوسرے حصوں کے ہانجیوں کی نسبت زیادہ ایماندار ہیں۔

حوالہ جات

(1) خودرنگ سے مراد قدرتی رنگ ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کی غرض سے بھورے رنگ کی اون نہایت احتیاط کے ساتھ حاصل کی جاتی ہے۔

(2) کشمیر الاصل میں یہ مقولہ یوں ہے: یلہ باج گوو برکت تہِ گیہ،

3))94-1893 کے دوران شالوں کی برآمد 22850 روپے کی مالیت کی تھی۔

سولھواں باب

تجارت

ریلوے کی عدم موجودگی اور کشمیر ایک دور افتادہ علاقہ ہونے کی وجہ سے وادی کے لوگوں کی معیشت کا دارومدار خود اُن کے اپنے وسائل پر ہی رہا ہے۔ معمول کے دنوں میں یہاں کی غذائی اجناس مقامی باشندوں کے لیے کافی ہوتی ہیں۔ ملبوسات کے لیے عوام کو اون میسر ہے جس سے وہ اپنے لباس بُنتے ہیں۔ یہاں سُوت بھی اچھی قسم کا ہوتا ہے۔ ریشوں کی دولت سے کشمیر مالا مال ہے۔ لکڑی وافر ہے اور نمک کے سوائے کسی بھی اشیائے خوردنی کی درآمد کی ضرورت نہیں ہے۔ مقامی طور پر تیار کیا گیا لوہا آلات کشاورزی کی تیاری میں کام آتا ہے اور مٹی کے برتن گھروں میں تانبے اور پیتل کے برتنوں کے نعم البدل کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں۔

مگر پنجاب کے ساتھ آمد و رفت کی دشواریوں کے باوجود اور اس امر کے باوجود کہ کشمیر عملاً ایک خود کفیل علاقہ ہے یہاں کے لوگ طبعاً فضول خرچی سے بالاتر ہیں۔ مقامی تجارت کے پس پردہ یہ جذبہ کارفرما ہے کہ کشمیر کے چند تنومند لوگ ہر برس موسم خزاں کی فصل کٹائی کے بعد پنجاب چلے جاتے تھے جہاں وہ مقامی طور پر تیار کردہ مصنوعات اپنے ساتھ لے جاتے تھے اور یہ لوگ کبھی خالی ہاتھ واپس نہیں آتے تھے۔ بہت سارے لوگ قلی کا کام کرنے کیلئے موسم سرما کے دوران پنجاب چلے جاتے تھے اور مزدوری سے کمائی ہوئی دولت کو اشیا کی خرید پر صرف کردیتے جنھیں لے جانے میں آسانی ہو۔ ان اشیا کا مصرف یا تو ان کے اہل خانہ کرتے ہیں یا وہ دوسروں کو یہ اشیا

فروخت کر دیتے۔ کشمیریوں کے بل بوتے پر چلنے والی اس تجارت کے علاوہ مرکبان بھی تجارت کا کاروبار چلاتے تھے۔ یہ طبقہ ہمیشہ وادیٔ کشمیر میں موجود رہا ہے۔ پنجاب میں تجارت کا کاروبار ٹھیلہ گاڑی کھینچنے والے چلایا کرتے تھے۔

راستے

تجارت کے لیے اندرونی راستوں کا استعمال ہوتا تھا۔ ان میں سب سے براہ راست راستہ درّہ بانہال کو عبور کر کے جموں تک جاتا تھا۔ گھوڑے والوں کے لیے مقبول ترین راستہ قدیم شاہی سڑک تھی جو پیر پنچال سے ہو کر گجرات ریلوے اسٹیشن تک پہنچتی تھی اور تیسرا راستہ جہلم ویلی سڑک کے نام سے معروف تھا۔ یہ راستہ بارہمولہ سے کوہالہ تک دریائے جہلم کے کنارے کے ساتھ ساتھ چلتا تھا۔

جہلم ویلی بیل گاڑی سڑک

ستمبر 1890 میں بارہمولہ سے کوہالہ تک سڑک کو ٹھیلوں کی آمد و رفت کے لیے کھول دیا گیا۔ اس کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ بانہال اور پیر پنچال کے راستوں سے ہونے والی تجارت سے جو توقعات وابستہ تھیں ان کے بارے میں مایوسی ہوئی۔ یہ سڑک زمین کے کھسکنے کے باعث متواتر مہینوں تک بند رہتی ہے اور اس راستے میں گھاس کاروبار کی راہ میں ایک سدراہ ہے۔ جہلم ویلی سڑک کی تعمیر اور دیکھ بھال پر ہونے والے بھاری خرچہ کے سبب دربار کے لیے بانہال اور پیر پنچال راستوں کو اچھی حالت میں رکھنے میں مانع ہوئے ہیں عین ممکن ہے کہ جہلم ویلی سڑک کو مستقل اور محفوظ راستہ بنا دیا جائے اور بھاری ٹھیلوں کی آمد و رفت کے قابل بنانے کے لئے پلوں کی تعمیر کی جائے۔ اس کی تعمیر کی بدولت تجارت میں کسی طور خاطر خواہ اور بتدریج اضافہ نہیں ہوگا۔ مزید برآں جب تک متوازی راستوں کی مرمت کر کے اچھی حالت میں نہ رکھا جائے تب تک ممکن ہے کہ کشمیر اور پنجاب کے درمیان تجارت میں کمی واقع ہو جائے۔

تجارت کا میزان

اعداد و شمار کے مطابق کشمیر سے پنجاب تک ہونے والی برآمدات کی تفصیلات موجود ہیں جو پنجاب کی تجارتی رپورٹوں سے لی گئی ہیں کیونکہ ان رپورٹوں میں پنجاب سے کشمیر تک ریل مواصلات کے بارے میں کافی بحث کی گئی ہے۔ میں نے لداخ اور پنجاب کے مابین ہونے والی

تجارت کی اضافت کی ہے جس میں اس امر کا خلاصہ کیا گیا ہے کہ اگر سرینگر کے ساتھ ریل رابطہ قائم ہو جائے تو لداخ اور یارقند کے ساتھ ہونے والی تمام تر تجارت کشمیر یا زیادہ سے زیادہ گلگت سے ہو کر گذرے گی۔ پنجاب تجارتی رپورٹوں میں دیئے گئے اعداد و شمار میں نہ صرف وادیٔ کشمیر بلکہ جموں خطے کی تفصیلات بھی شامل ہیں۔ حساب لگایا گیا ہے اگر حکومت کشمیر کی مختلف ڈویژنوں کی آبادی کو ملحوظ خاطر لائیں تو مردم شماری کے اعداد و شمار کے مطابق وادیٔ کشمیر زیادہ حصے کی حقدار ہوگی۔ 1891 کی مردم شماری کے مطابق جموں خطے کی آبادی 14,39543 ہے جب کہ کشمیر خاص کی آبادی 8,41,242 ہے اگر اسکردو اور گلگت کے ساتھ ہونے والی تجارت کو شامل کر کے بھی 1,27,094 کی آبادی کا اضافہ کر دیا جائے تو آبادی 9,41,335 ہوگی جو نصف سے بھی کم ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ وادیٔ کشمیر کے بارے میں صحیح اعداد و شمار فراہم کرنا ممکن نہیں ہے۔

اگر 92-1891 کے اعداد و شمار پر نظر ڈالی جائے تو ظاہر ہوگا کہ جہلم ویلی سڑک کھلنے کے سبب تجارت میں بھاری اضافہ ہوا۔ کشمیر میں درآمدات کی کل مالیت 66,16,145 روپے تھی جب کہ برآمدات 65,05,088 روپے تھی اور تجارت کی مجموعی مالیت گزشتہ برسوں کے دوران زیادہ تھی اور یہ مالیت 89-1888 سے بہترین سال سے بھی تجاوز کر گئی تھی جبکہ یہ مالیت 40,734 روپے تھی مگر سال 93-1892 کے دوران تجارت کی درآمداتی مالیت کم ہو کر 48,68,247 روپے ہوگئی ہے جب کہ درآمدات 53,43,092 روپے تھیں جس سے تجارت کی مجموعی مالیت 1,20,01,339 روپے ہوگئی۔ سال 84-1883 کے دوران یعنی اس گوشوارے میں درج سال سے قبل پنجاب کو برآمدات کی مالیت 37,25,914 روپے تھی جس سے تجارت کی مجموعی مالیت 90,16,031 ہوگئی۔ اگر سال 93-1892 کی تجارت کو معمول کے مطابق تصور کیا جائے تو اس میں دس برس کے دوران 11,85,308 روپے کا اضافہ ہوا مگر 93-1892 کے دوران تجارت میں کمی کے چند خاص اسباب تھے۔ فصل نہایت بُری ہوئی کیونکہ پہاڑوں پر بہت کم برف باری ہوئی سرینگر میں زبردست آتش زدگی رونما ہوئی اور ہیضہ کی زبردست وبا پھوٹ پڑی جس کے سبب شہر اور وادی میں تجارت مفلوج ہو کر رہ گئی۔

مجموعی طور پر دستیاب اعداد و شمار سے کشمیر کی تجارت کی بابت کسی طرح مایوس ہونے کی

ضرورت نہیں۔ فی الحال یہ ملک ایک تغیراتی کیفیت سے گذر رہا ہے۔ جہلم ویلی سڑک پر ٹھیلوں کی آمدورفت نے بار برداری کے پرانے طریقوں میں خلل تو ڈالا ہے۔ مگر سڑک کے تشنہ تکمیل ہونے کی وجہ سے ابھی تک اس نے پورے طور پر جگہ نہیں لی۔ دریں اثنا قدیم طریقہ قدرے تعطل کا شکار ہوا جن کاشتکاروں کو موسم سرما کے دوران مزدوری کے لئے مجبور ہونا پڑتا تھا تاکہ مالیہ اراضی کی ادائیگی کے لیے روپے کا انتظام کرسکیں اب وہ زرعی پیداوار سے حاصل ہونے والی آمدنی سے ہی مالیہ اراضی کی ادائیگی کے قابل ہو گئے ہیں اور اب وہ پہلے کی مانند تعداد کے مطابق پنجاب تک نہیں جاتے۔ کشمیر میں ٹٹو برداری ایک منافعت بخش کاروبار بن گیا ہے اور انھیں گلگت کی سمت بار برداری کے لیے ایک کھلا میدان حاصل ہو گیا ہے۔ سال 1893 کے دوران گلگت سڑک پر دس ہزار ٹٹوؤں کو کام میں لایا گیا۔ آخری بات یہ کہ جہلم ویلی سڑک کی زیادہ لاگت کے سبب دونوں راستوں کو صحیح سلامت رکھنا ممکن ہو گیا ہے۔ ان تغیرات کی ظاہری علامات کے طور پر بانہال کے راستے پر اسلام آباد اور پیر پنچال راستے پر شوپیاں زوال پذیر ہوئے اور جہلم ویلی سڑک کے کھلنے پر بارہمولہ اور گلگت سڑک پر بانڈی پورہ خوشحال ہو گئے جیسے جیسے ان راستوں پر تجارت تبدیلی کی حالت سے گذر رہی ہے عین اسی طرح عوام کی حالت میں بھی انقلاب رونما ہو رہا ہے۔

میرے خیال میں یہ کہنا مناسب ہوگا کہ 90-1889 کے مقابلے میں زراعت پیشہ طبقہ اب زیادہ خوشحال ہے۔ کاشتکاروں کی بہبود کے معاملے کی تبدیلیوں کے موجب کشمیر میں رفاہ عام کے کاموں اور گلگت سڑک پر نقل و حمل کی کارروائی کے علاوہ کشمیر تک آنے والے سیاحوں کی تعداد میں اضافے کے سبب اب کافی پیسہ آ رہا ہے کیونکہ سیاح سرینگر اور وادی میں کافی پیسہ خرچ کرتے ہیں مگر دولت میں اچانک اضافے سے فوری تجارت میں اضافہ نہیں ہوسکتا۔ درحقیقت برآمداتی تجارت میں کمی واقع ہونے میں ابھی کچھ وقت لگے گا۔ پہلے جو افراد یہاں پر پیدا ہونے والی مصنوعات کی پنجاب تک بار برداری کے لیے مجبور تھے تاکہ وہ اس کمائی سے مالیہ اراضی ادا کرسکیں اب اپنی اجرتیں مقامی طور پر کما لیتے ہیں۔ شاید ہندوستان کی کسی دوسری نسل کی نسبت کشمیری زیادہ کوتاہ اندیش ہیں۔ اگر انھیں اپنے اور اپنے اہل خانہ کے گذر بسر اور آسائش کے لیے کافی دولت حاصل ہو جائے تو وہ بُرے وقت کے لیے کوئی روپیہ پیسہ بچانے کی کوشش نہیں کریں گے۔ چنانچہ

یہ بات ممکن ہے کہ زراعت پیشہ افراد کی خوشحالی میں اضافے کے ساتھ کچھ عرصے کے لیے برآمداتی تجارت میں کمی واقع ہو سکتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس خوشحالی کی بدولت جب تک نئے تقاضے اور نیا ذوق پیدا نہ ہو جائیں تب تک درآمدات میں بھی کوئی نمایاں اضافہ نہیں ہوگا۔

تجارتی مراکز

وادیٔ کشمیر میں تجارت کے چند مراکز ہیں۔ ان میں خاص طور پر سرینگر کے علاوہ بارہ مولہ، اسلام آباد، شوپیاں اور بانڈی پور قابل ذکر ہیں۔ پنجاب کے تاجروں نے ان مقامات پر اپنا کاروبار قائم کرلیا ہے۔ یہ لوگ تیار شدہ سوت اور پیتل، تانبہ اور فولاد کے علاوہ نمک، کھانڈ، چائے، تمباکو لاتے ہیں اور تجارت میں اب قدرے اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ تاجر پنجاب تک غیر منشیاتی ادویات، ریشے، پھل، کھالیں، گھی، السی، تلہن اور جنگلی اشیا کے علاوہ خام اور تیار شدہ اُون کی برآمد کرتے ہیں۔ لکڑی اور شالوں کی برآمدات دوسروں کے ہاتھوں میں ہے چنانچہ فی الحال اس پر غور کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

وانی

ہندستانی بنیا عملی طور پر کشمیر میں غیر معروف ہے مگر تمام بڑے دیہات میں ایک وانی یا بقال موجود ہوتا ہے جو مول تول کرنے والا ایک مسلمان ہوتا ہے جس کی تجارت کا اسٹاک بیس سے تیس روپے مالیت کا نمک، تیل، مصالحے، نسوار، کھانڈ، چائے اور بعض اوقات یورپی یا ہندستانی سوتی کپڑے کے چند تھان ہوتے ہیں۔ جب یہ مال ختم ہو جاتا ہے تو وانی قریب کے ڈپو کی جانب روانہ ہو جاتا ہے تاکہ وہ نیا مال بھر سکے۔ بعض اوقات وانی اپنے گاہکوں کو پیسہ اُدھار پر دیتا ہے۔ اس طریقۂ کار کو کشمیر میں وڈ کہا جاتا ہے۔ اس بارے میں باب اوّل میں ذکر ہو چکا ہے۔ حالانکہ اُدھار دینے والا اور لینے والا دونوں سود کے لین دین سے انکار کرتے ہیں مگر اس سودے سے جو منافع ہوتا ہے۔ اس سے وانی کو چوبیس سے چھبیس فیصد سود حاصل ہوتا ہے۔ وہ کسی قسم کا خطرہ مول نہیں لیتا اور برآمداتی تجارت کا کلیتاً شہر اور قصبات کے پنجابی تاجروں کے ہاتھوں میں جانے کی اجازت دے دیتا ہے۔ جنھوں نے اپنے گماشتے مقرر کیے ہوئے ہیں اور جو برآمداتی تجارت میں شامل تمام اشیا کے عوض پیشگی رقوم ادا کرنے کا طریقۂ کار مروّج کیے ہوئے ہیں۔

ادویات

جہاں تک زراعت پیشہ طبقوں کا تعلق ہے، ریشے، پھل، تلہن، اون اور ان سے تیار کردہ اشیا کی ان کے لیے کافی اہمیت ہے۔ موسم گرما کے دوران پیشہ ور چرواہوں کی تحویل میں بھیڑوں کو دورافتادہ پہاڑوں پر بھیجنے کا رواج موجود رہا ہے۔ دیہاتی خود بھی دو یا تین مرتبہ ان پہاڑوں پر جاتے ہیں اور واپسی پر اپنے ساتھ ایسی ادویات اور جڑیاں لاتے ہیں جن کی بھاری کاروباری قدرو قیمت ہوتی ہے۔ ان جڑیوں میں کلیدی جوب لوٹ ہوتی ہے جن پر حکومتی اجارہ داری ہے جو گاؤزبان اور Hyoscyamus اور Henbane کے پتوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ دیہاتی بہت ساری دیگر جڑی بوٹیوں کو جمع کر کے فروخت کرتے ہیں اور مقامی پودوں سے متعلق باب میں ان کا تذکرہ ظاہر کرتا ہے کہ منشیاتی جڑی بوٹیوں کی تجارت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ بنفشہ جمع کیا جاتا ہے اور بھاری مقدار میں بہی دانے بیجوں کو پنجاب برآمد کیا جاتا ہے۔ انگور کے پودے پہاڑی علاقوں میں اچھی خاصی آمدنی بخش ہوتے ہیں اور پنجابی تاجر برآمد کے مقصد سے انھیں فوری طور پر خرید لیتے ہیں۔

ریشے

ریشوں کی برآمد ابھی تک ابتدائی مراحل میں ہے مگر وادی میں بھاری مقدار میں نادر اور بیش قیمت ریشے موجود ہیں اور اگر اس جانب توجہ دی جائے گی تو ان کی برآمدات سے اچھا خاصا منافع ہو سکتا ہے۔

پھل

پھلوں کی تجارت خاصی ترقی کر چکی ہے اور باغبانی کے شعبے میں اصلاحات سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ کشمیر میں پھلوں کا کاروبار خاطر خواہ وسعت اختیار کرے گا۔ ماضی میں اخروٹ فقط تیل نکالنے کے لیے بروئے کار لائے جاتے تھے مگر اب بھاری مقدار میں ان کی برآمد ہوتی ہے جب کہ پنجابی تاجروں کے ہاں سیب اور اس سے کم مقدار میں ناشپاتی فوراً بک جاتے ہیں۔

تلہن

فی الحال تلہن کی تجارت معمولی سطح پر ہوتی ہے اور اب زراعت پیشہ افراد نے السی، سرسوں

اور تل جیسی اشیا کی برآمد پر توجہ دینا شروع کیا ہے۔ان کی کلیدی فصلوں کی کاشت کے لیے کشمیر کی آب وہوا اور مٹی نہایت سازگار ہے۔ زراعتی نقطۂ نظر سے آئندہ چند برسوں کے دوران تلہن کی تجارت اولین مقام حاصل کرلے گی۔ بہر حال اس امر کو یاد رکھنا لازمی ہے کہ کشمیری گھی سے احتراز کرتے ہیں' وہ اپنی غذا میں تیل بھاری مقدار میں استعمال کرتے ہیں چنانچہ مقامی طور پر تیل کی طلب وافر مقدار میں موجود رہے گی۔ پھر بھی اگر روشنی کے مقصد سے بناسپتی تیل کی جگہ پٹرولیم لے لے تو تاہم بھاری مقدار میں برآمداتی مقاصد کے لیے دستیاب ہوگا۔

اُون

کشمیر میں اچھی ساخت کی اون دستیاب ہے اور میری رائے میں اس کی پیداوار میں اضافہ ہو رہا ہے مگر موسم سرما کی خوراک کیلئے عمدہ ترین گھاس اور چارے کی دستیابی اور وادی کا گھیرا ڈالے ہوئے پہاڑوں پر موجود شاندار کاہچرائی میدانوں کے باوجود اس امر میں شک ہے کہ بھاری پیمانے پر بھیڑوں کی افزائش سودمند ثابت ہوسکتی ہے۔ان افراد کے لیے یہ سودمند ہوسکتی ہے جن کے پاس بیس سے پچاس بھیڑیں ہیں۔موسم سرما کے دوران گھروں کے نچلے تہہ خانوں میں ان کی موجودگی گھروں کو تمازت بخشتی ہے۔کھیتوں کو کھاد فراہم کرتی ہے اور مصرف یا فروخت کیلئے اون فراہم کرتی ہے۔ ہر کاشت کار کے اپنے بید کے درخت ہیں جن کے پتے بھیڑوں کیلئے بہترین خوراک فراہم کرتے ہیں لیکن اگر کوئی وسیع پیمانے پر بھیڑوں کی افزائش کی کوشش کرے تو اس کیلئے موسم سرما کے دوران بھیڑوں کے لیے چارہ فراہم کرنا مشکل ہوجائے گا اور اس سے زیادہ مشکل کام پہاڑوں پر کاہچرائی رقبہ جات میسر کرنا ہوگی۔ ہر کشمیری ایک جولاہا ہے اور موسم سرما کے دوران عورتیں دن رات اون کی کتائی کرتی ہیں جب کہ مرد ہلکے وزن کے عمدہ کمبل بنتے ہیں اور جب وہ گھس کے پھٹ جاتے ہیں تو ان سے پٹو تیار کیا جاتا ہے جس کی یورپی سیاح بھاری قدر و منزلت کرتے ہیں۔ کشمیری کمبل ہندوستان تک برآمدات میں ایک اہم شئے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ 90-1889 میں ان کی برآمداتی مالیت 7,17,741 روپے تک پہنچ گئی تھی۔اُون سے تیار کردہ اشیا کی بھاری مقدار کا اندراج نہیں ہوپاتا کیونکہ کشمیر کے لوگ ذاتی استعمال کیلئے جو کمبل لے کر جاتے ہیں وہ انھیں پنجاب میں فروخت کر کے کشمیر کیلئے واپسی سفر شروع کرتے ہیں۔

مقامی تاجروں کی تعداد

سرمایہ کاری اور بیرونی مہم بازی سے کشمیر کی برآمداتی تجارت میں تیزی پیدا ہوگی مگر کشمیریوں کے پاس سرمایہ کاری اور مہم بازی دونوں کا فقدان ہے۔ اس تجارتی کاروبار میں مصروف افراد کا ایک طبقہ پیدا ہونے میں کافی وقت درکار ہے۔ شہر میں جو چند پنجابی تاجر موجود ہیں ان کے پاس بھی ایسے گماشتے وافر تعداد میں موجود نہیں ہیں جو وادی کے وسائل سے استفادہ کرسکیں کیونکہ مقامی وانی اس قدر وسائل نہیں رکھتے جو جمع کرنے والے گماشتوں کے طور پر کام کرسکیں۔ اس قسم کی مہم بازی کے اسباب انتظامیہ سے متعلقہ باب میں زیر بحث لائیں جائیں گے۔ مگر یہاں پر ان کا مختصر تذکرہ لازمی ہے۔ تجارت پر حکومتی اجارہ داری مقامی تجارت کی ترقی کی راہ میں مکمل طور پر سدراہ ثابت ہوئی ہے۔ کشمیر کی کلیدی پیداوار یعنی چاول حکومتی ہاتھوں میں رکھی گئی ہے دھان رکھنے کا طریقۂ کار اور غلّے کو نہایت ارزاں داموں پر فروخت غلے کے مقامی تاجروں کے لیے مانع ثابت ہوئی ہے۔ دیگر کاروباروں کی مانند تجارت میں بھی خاص علم اور مہارت کی ضرورت ہوتی ہے اور حکومتی اجارہ داریوں کے نظام کار میں کشمیر کے ہر دیہاتی کا اپنا الگ طریقہ ہے اور ہندستانی بنیوں کے متوازی کوئی بھی طریقہ کشمیر میں موجود نہیں ہے۔ بندوبست کی یہ پالیسی ہے کہ حکومت کو غلے کے ذخیرے اور بعدازاں اسے غیر منافعت بخش شرحوں پر فروخت کرنے کے نقصان دہ کاروبار سے نجات دلائی جائے چنانچہ بہت ساری اجارہ داریوں کو ختم کیا گیا ہے۔ بہرحال سرینگر کے عوام الناس کے افلاس کے پیش نظر اس تبدیلی کو مرحلہ وار عمل میں لانا ہوگا چنانچہ جب تک غلے کے نجی تاجر ظہور پذیر نہیں ہوجاتے تب تک اجارہ دار تاجر کے طور پر اپنی پوزیشن سے سبکدوش نہیں ہوسکتے مگر یہ بات واضح ہے کہ حکومت کی طرف سے جنس کی صورت میں وصول کیے گئے مالیہ سے نجی تجارت کی متوازی طور پر وسعت ہوگی۔

1893-94 کے دوران 60,000 روپے مالیت کا جو غلہ مالیہ کے طور پر وصول کیا گیا ہے وہ سرینگر کے باشندوں میں فروخت کردیا جائے گا اور حکومت نے قصبات کے عوام کو بازاری شرحوں سے کم نرخ پر غلہ فروخت کرنے کی پالیسی کو ترک کرکے اور وادی میں مختلف مقامات پر مرحلہ وار صورت میں غلہ فراہم کرکے دانشمندی سے کام لیا ہے۔ مقامی تاجر اب میدان میں آگئے

ہیں اور اس طریقہ کار کی کامیابی کی بدولت حکومت کشمیر کے عوام الناس کو غلہ فروخت کرنے کے کاروبار سے سبکدوش ہونے کی طرف مائل ہو جائے گی۔ حکومت کا اس مؤقف سے انحراف کہ مقامی تجارت کی عدم موجودگی میں حکومتی تجارت لازمی ہے بہرصورت لازمی ہو جاتا ہے۔ اگرچہ مجھے صدق دلی سے اس بات کا یقین ہے کہ کشمیر میں تجارت کو فروغ حاصل ہوگا مگر مواصلات میں کی گئی وسعت اور زراعت پیشہ طبقوں کی حالت میں بہتری کی بدولت یہ فروغ ممکن نہیں ہوگا۔ مختصر اً بات کی جائے تو کسی تاجر پیشہ طبقے کی عدم موجودگی میں کشمیر کے دیہاتی تجارت کو اپنے ہاتھوں میں لینے کے لیے مجبور ہو گئے تھے۔ وہ اس سودا بازی ترک کر کے زراعت کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ اس وقفے کے دوران نجی مہم جوئی میں سست روی سے ہی سہی مگر پیہم اضافہ ہو رہا ہے اور اگر حکومت غلے کی تجارت میں درپیش مقابلے سے ہٹ جائے تو اجارہ داری اور قیمتوں پر یک طرفہ کنٹرول سے بے خطر ہو کر معقول طور پر تجارت کے لیے بہت سارے لوگ سامنے آئیں گے۔ جب تک یہ نہیں ہو جاتا تب تک اس بات میں شک ہے کہ کشمیر کی تجارت کو کبھی ٹھوس استحکام حاصل ہو سکے گا اگر کوئی ہندوستان کی طرف دیکھے تو اسے معلوم ہوگا کہ غلہ ہی تجارت کی اساس ہے اور جب تک بنیا طبقہ اور ضروریات اور آسائش کا سامان فروخت کرنے والے وانی، مصنوعات تیار کرنے والوں کے درمیانہ دار نہیں بن جاتے تب تک تجارت برائے نام رہے گی۔ ہوسکتا ہے کہ دیہی آبادی کی حالت غیر قدرتی ہو مگر مغربی نقطۂ نظر سے اس کی ستائش کی جانی چاہیے۔ ایک دیہاتی نمک کے سوائے اپنی تمام ضروریات پیدا کرتا ہے اور عیش وعشرت پر اپنا پیسہ برباد کر کے قرض کے دام میں نہیں پھنستا۔ مگر جیسے جیسے آبادی میں اضافہ ہوگا تو زمین پر پورے طور قبضہ ہو جانے سے بے زمینوں کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہوگا جو اپنی بہبود کے لیے دکانوں اور دکانداروں کے وجود پر انحصار کرے گا۔ بشرطیکہ قحط سالی کو ٹالا جا سکے اور ہیضے اور چیچک کی تباہ کاریوں کا سدباب ہو سکے۔ شہری آبادی کے نقطۂ نظر سے منطقی اور صحت مند بنیادوں پر تجارت کی تنظیم کافی حد تک تشنہ تکمیل ہے اور اس امر کی توقع کی جاتی ہے کہ سری نگر کے شہری تجارت کو پیشے کے طور پر اختیار کر لیں گے اور بے کار بیٹھ کر بیرون ممالک کے لوگوں کو وادی کی تجارت پر قبضہ نہیں کرنے دیں گے۔ مزید برآں جہاں تک کشمیر کی زمین کا تعلق ہے وہ مناسب کاشت کے لئے کافی اچھی ہے۔

اگران کی ذیلی تقسیم ہواور بنجر زمین کی کاشت کے لیے دستیاب ہو جائے تو زراعت سے پیدا شدہ ذرائع کی اعانت کے لیے کاشت کاروں کو برآمدات کا سہارا لینا پڑے گا۔ چاول ایک اہم ترین کلیدی پیداوار ہے مگر اس کی بہت بڑی مقدار میں برآمد کا کوئی امکان نہیں ہے مگر جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، تلہن کی برآمد کی بھاری گنجائش ہے۔ کشمیر میں پیدا ہونے والے گندم اور جو کو کسی طور پر برآمد کی اشیا کی حیثیت حاصل نہیں ہو سکتی مگر حال ہی میں جو کی کاشت کو ترویج دی ہے اور اس میں کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے توقع کی جاتی ہے کہ اسے کسی حد تک برآمد کیا جائے گا۔ اسی طرح رنگوں اور ریشوں، پھلوں اور اُون کی برآمد میں بھاری وسعت پیدا ہو گی جو کشمیر میں وسیع پیمانے پر پیدا ہوتی ہیں کیونکہ ان کی پیداوار کے لیے کشمیر کی آب وہوا نہایت موافق ہے۔

چمڑہ اور کھالیں

فی الحال چمڑے اور کھالوں کا کام واتل (چمار) طبقے کے ہاتھوں میں ہے اور مال مویشیوں کی پیداوار میں اس قدر مستعدی کیساتھ اضافہ ہو رہا ہے کہ ان کی وافر تعداد میں برآمد ہوتی رہے گی۔

گھی

کشمیر کی برآمداتی تجارت میں گھی ایک اہم شئے کی حیثیت رکھتا ہے۔ گھی عام طور پر دیہی گوجر اور خانہ بدوش بکروال تیار کرتے ہیں۔ کشمیر کے پہاڑ ان کیلئے ایک موزوں مسکن کی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ ہندوستان کے جنگلات تباہ کن بھینسوں اور بکریوں کیلئے ممنوع ہو رہے ہیں۔ گھی کی تجارت زیادہ تر درمیانہ داروں، خصوصاً پنجابیوں کے ہاتھوں میں ہے۔ اور گھی تیار کرنے والے ان کے رحم وکرم پر ہیں۔ اس تجارت کی وسعت کیلئے اور بھی زیادہ گنجائش موجود ہے اور کشمیر میں تحفظ جنگلات کے باعث کا ہچرائی رقبے میں کسی قسم کی کمی ہونے کا امکان نہیں ہے۔ اس بات میں شک نہیں کہ اپنی بھینسوں سے گوجر اور بکریوں سے بکروال جنگلات کو زبردست نقصان پہنچاتے ہیں۔ دودھ دینے والی ہر بھینس پر 1.40 روپے اور فی 100 بکریوں پر 5 روپے کاہچرائی ٹیکس جنگلات او درختوں کو ہونے والے نقصان کے مقابلے میں قطعی طور پر ناکافی ہے۔ مگر چرواہوں کیلئے کشمیر ایک دلپسند مقام ہے۔ اگر تحفظ جنگلات کے معاملے میں سختی برتی بھی جائے اور کاہچرائی فیس میں اضافہ بھی کیا جائے تو اس کے باوجود بھی بکریاں لائی جاتی رہیں گی۔

لکڑی

لکڑی کی تجارت عملی طور پر حکومت کے ہاتھوں میں ہے اور یہ کہنا ناممکن ہے کہ اس تجارت میں ترقی ہوگی یا یہ محدود ہو کر رہ جائے گی۔ عام رائے یہ ہے کہ کشمیر کے جنگلات سے اس قدر زیادہ کام لیا جا چکا ہے کہ آئندہ کئی برسوں تک یہ جنگلات بحال نہ ہو سکیں گے۔ اس بات کا امکان ہے کہ کشمیر میں لکڑی اور ایندھن کی ضرورت اور ہندوستان میں لٹھوں کی مانگ میں کمی کے باعث لکڑی کی تجارت میں کمی واقع ہوگی۔

درآمدات

اگر کشمیر کی درآمدات کے گوشوارے سے سوت سے تیار کردہ اشیا اور نمک اور غالباً پٹرولیم کو خارج کر دیا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ برآمدات کے زمرے میں آنے والی تمام اشیا کا شمار عیش وعشرت کی مدوں میں ہوتا ہے۔

کپڑا

جہاں تک زراعت پیشہ آبادی کا تعلق ہے ایسے یورپی کپڑے کو جس میں لباس سے نمایاں طور پر نمائش ہوتی ہے عیش پرستی کی حد تصور کیا جاتا ہے۔ یہ کپڑا خودنمائی کی علامت تصور کیا جاتا ہے۔ میرا تاثر تو یہ ہے کہ یورپی اور ہندستانی کپڑے کے تھان کا زیادہ حصہ درآمد کر کے شہر اور قصبات میں استعمال میں لایا جا سکتا ہے اور اس کا ایک حقیر حصہ ہی دیہات تک پہنچ پاتا ہے۔ حکومت نے کشمیر کے اندر ہی سوت کی تیاری کے سوال پر غور کیا ہے۔ کیونکہ اس کی درآمدات پر زیادہ لاگت آتی ہے اور جب کشمیر میں کپاس کی کھیتی کی تمام سہولیات موجود ہیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ مقامی طور پر سوت کے کپڑے کی تیاری میں کامیابی حاصل نہ ہو۔

دھاتیں

پیتل اور تانبے جیسی دھاتوں میں کسی طور پہ بہم اضافہ نہیں ہوا ہے مگر دیہات میں میسر ہونے والی عمدہ ترین مٹی جو کم دام اور کارآمد حیثیت میں حاصل ہوتی ہے۔ کھانا پکانے کے برتن تیار کیے جاتے ہیں۔ سرینگر کے تانبہ سازوں کو ہمیشہ کچھ مقدار میں تانبے اور پیتل کی ضرورت رہتی ہے مگر دیہاتی لوگ کافی عرصے تک کھانا پکانے کیلئے کسی بھی طور پر دھات کا استعمال نہیں کریں گے۔

لوہا

جہاں تک لوہے کا تعلق ہے تو اگر حکومت لوہے کی شاندار کانوں پر کام کرنے کی اجازت دے دے تو لوہے کی درآمدات میں کمی واقع ہوسکتی ہے۔ حالیہ وقتوں تک آلات کشاورزی کے لیے استعمال ہونے والے مواد کا ساف (SOF) اور اس لوہے کو جسے نرم فولاد سے موسوم کیا گیا ہے اب بھی ہندوستان سے درآمد شدہ آہن سے زیادہ مقبول ہے۔

نمک

نمک کو یہاں پر بھاری اہمیت حاصل ہے اور سال 89-1988 کے دوران اس کی درآمد میں بھاری اضافہ ہوا ہے۔ کچھ مقدار میں زمینی نمک لداخ سے درآمد کیا جاتا ہے جسے مویشیوں کی خوراک میں استعمال کیا جاتا ہے۔ لداخ سے اوسطاً 812 من نمک درآمد ہوتا ہے جس کی مالیت 2253 روپے ہے۔ کچھ گوشوارے میں جو اعداد و شمار درج ہیں ان کے مطابق نمک کی درآمد پنجاب سے کی جاتی ہے۔ لداخ سمیت ریاست کشمیر کی آبادی 25,15,678 تصور کرتے ہوئے اور اوسطاً 68.265 من نمک کی درآمد کے مطابق سالانہ فی کس نمک کی دستیابی 5 پونڈ ہے۔ مگر اس بات کو ذہن نشین کرنا بھی لازمی ہے کہ 168.265 من نمک میں سے مویشیوں اور بھیڑوں کی پرورش بھی لازمی ہے۔ ہندوستان میں بھی نمک کا مصرف کسی طور زیادہ نہیں ہے۔ عام اوسطاً اس کا مصرف آبادی کے مطابق فی کس 10 پونڈ ہے۔ چنانچہ یہ بات عیاں ہے کہ کشمیریوں کو اس معاملے میں فراوانی حاصل نہیں چونکہ نمک انسانوں اور مویشیوں دونوں کیلئے لازمی ہے۔ لہذا توقع کی جاتی ہے کہ حکومت نمک کی تجارت کو فروغ دینے کی ہر طرح حوصلہ افزائی کرے گی۔ جن دو طریقوں سے یہ حوصلہ افزائی ممکن ہے ان میں نقل و حمل میں بہتری اور نمک پر محصول میں رعایت دینا یا اسے ختم کرنا شامل ہے۔

کھانڈ

نمک کی مانند کھانڈ کی برآمد میں بھی برابر اضافہ ہو رہا ہے مگر کشمیر کے زراعت پیشہ لوگ اسے سیدھے سادھے الفاظ میں سامان عشرت قرار دیتے ہیں۔ چائے اور خوراک کے ساتھ کھانڈ ملانے کے کشمیری بھاری دلدادہ ہیں اور ممکن ہے کہ خوشحالی آنے کے ساتھ اس کے مصرف میں بھی

بھاری اور پیہم اضافہ ہوا اور اس بات کا امکان دکھائی دیتا ہے کہ کسی روز شکر کے درختوں کی توسیع سے ہی وادی کی طلب مقامی طور پر پوری ہو جائے گی مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان سے درآمدہ اشیا میں کھانڈ کو کشمیر کی تجارت میں ایک اہم مقام حاصل رہے گا اور توقع کی جاتی ہے کہ پھلوں کے تحفظ اور انھیں ڈبہ بند کرنے کی صنعت کے فروغ کے ساتھ کھانڈ کی تجارت کو مزید فروغ حاصل ہوگا۔

چائے

چائے اب سامان عشرت سے زندگی کی ایک ضرورت کا مقام حاصل کرتی جارہی ہے۔ چھوٹے سے بڑے دیہاتی تک سبھی چائے نوشی کرتے ہیں۔ شہروں اور قصبوں کے لوگ چائے کی دکان پر جاتے ہیں جہاں پرچینی کے پیالوں میں دودھ اور نمک ملی چائے سستے داموں میسر ہو جاتی ہے۔ 1890 سے 93-1892 کے برسوں کے دوران چائے کی درآمد میں کمی واقع ہوئی مگر حقیقت یہ ہے کہ مالیت میں کمی کے باوجود (2) درآمدات کی م مقدار 4806 من سے بڑھ کر 5,238 من ہوگئی۔ ظاہری طور پر بدیشی چائے میں اُتار چڑھاؤ آنے کا احتمال ہے۔ میرے خیال میں لداخ اور یارقند کی طرح یہاں کے لوگ بھی ہندوستان کی کم دام والی چائے پسند کرتے ہیں۔ جو لوگ سدابہار درخت یؤ (YEW) کے چھلکے یا سٹرابری کی جڑیں والی چائے کے نعم البدل کے طور پر استعمال کرتے تھے وہ اب چائے کی قسم کے بارے میں زیادہ پرواہ نہیں کرتے۔ وادی سے آسام کی چائے کی چند قسموں کی ترویج کے تجربات ہو چکے ہیں مگر میرے خیال میں کشمیر میں سستی مگر خالص چائے کی تجارت وسیع پیمانے پر کیے جانے کی ضرورت ہے۔ فی الحال اس کی پرچون فروخت وانی کرتے ہیں مگر کشمیر کے تاجروں میں توانائی کا فقدان ہے اور وہ چائے کی فروخت بڑھانے کی قطعی کوشش نہیں کرتے۔

تمباکو اور نسوار

کشمیری کسی حد تک تمباکو نوشی کے شکار نہیں مگر مرد اور عورتیں نسوار سونگھنے کے یکساں طور پر عادی ہیں اور زیادہ مقدار میں تمباکو کو اسی صورت میں استعمال کیا جاتا۔ عمدہ ترین نسوار پشاور سے آتی ہے۔ اس شہر میں نسوار تیار کرنے والے زیادہ تر کشمیری ہیں جو موسم گرما کے دوران وادی میں

واپس آتے ہیں تو اپنی مزدوری کی رقم سے نسوار خرید لاتے ہیں۔ ہر ایک وانی کی دکان پر شیشوں کے ڈبوں کی ایک قطار ہوتی ہے جس میں نسوار بھری ہوتی ہے اسے بھوج پتر کی چھال میں بند کر کے چھوٹی چھوٹی پڑیا بنا کر فروخت کیا جاتا ہے۔

پٹرولیم

پٹرولیم کو گوشوارے میں ہرچند شامل کیا گیا ہے مگر اس لیے نہیں کہ موجودہ وقت میں یہ تجارت کی ایک حد ہے بلکہ میرے خیال میں جس عمل نے روشنی کے مقصد سے بناسپتی تیلوں کی جگہ پٹرولیم کو نعم البدل بنالیا ہے وہ عمل کشمیر میں دہرایا جائے گا۔ بلند علاقوں میں صنوبر کے جنگلات کے قریب واقع دیہات کے لوگ اپنے گھروں کے اندر صنوبر کی مشعلوں سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ مجھے اس بات میں شک ہے کہ پٹرولیم وادی کے بلند خطوں میں کافی برسوں تک اپنا مقام حاصل کر سکے گا حتیٰ کہ محکمۂ جنگلات روشنی کے مقصد سے صنوبر کے درختوں کو تباہ کرنے کے قدیم رواج پر پابندی عائد نہ کر دے۔

کشمیر میں تجارت کا مستقبل

کشمیر میں تجارت کے مستقبل کے بارے میں کسی قسم کی پیشین گوئی ایک نادانشمندانہ بات ہوگی۔ شہروں اور قصبات کے لوگوں کی ضروریات اور صنعتوں کی نسبت زراعت پیشہ طبقے کے حسن ذوق پر اس کی وسعت کا دارومدار ہے۔ کشمیر کے شال کسی وقت کافی مشہور تھے مگر اب عملی طور پر مفقود ہو چکے ہیں۔ غلیچوں کی بنائی اور سوزن کاری کے لیے کچھ حد تک فنکارانہ انگلیوں والے جولاہوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ فن پارے تیار کرنے والے بہت سارے کاریگر غیر کاروباری مشین کے سہارے ترقی کرتے ہیں مگر درمیانہ دار منافع کما جاتے ہیں جو مشہور و معروف استحصال پسند ہوتے ہیں۔ غریب کارکنوں کو ان سے جو اُجرت حاصل ہوئی ہے وہ انھیں مشکل سے زندہ رکھنے کے کام آتی ہے۔ اُجرتیں کم ہو جاتی ہیں کیونکہ حکومت انھیں بازاری شرحوں سے کم نرخ پر کلیدی غلہ فروخت کرتی ہے۔ مختصراً یہ کہ سرینگر کے فن پارے تیار کرنے والے چند درمیانہ داروں کو ہی فائدہ دے رہے ہیں مگر کارکن طبقے کو کوئی دولت حاصل نہیں ہوتی۔ جب تک سرینگر کے لوگوں کی زندگی میں زبردست تبدیلی نہیں آتی، تب تک وہ درآمد شدہ اشیا حاصل کرنے کے قابل

نہیں ہوں گے۔ اگر حکومت شہر میں سستے چاول فراہم کرنے کے غلط طریقے کو ختم کردے تو درمیانہ داروں کو پچاس فیصد سے بھی کم منافع پر اکتفا کرنا پڑے گا اور وہ اجرتوں پر نظر ثانی کے لیے مجبور ہو جائیں گے۔ میرے خیال میں تب تک کشمیر میں صنعتوں کی صحت اور توانائی بحال نہیں ہو سکتی جب تک حکومت نیم فراخدلی کی پالیسی ترک نہ کردے۔ جس سے مالیہ کے معاملے میں کوئی فائدہ نہیں ہوتا اور فن پارے تیار کرنے والے کاریگروں کی موجودہ حالت سے نہ ہی مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جس سے کارکن طبقے میں اضافے کا اشارہ ملے۔ رؤسا اور امرا رفتہ رفتہ غریب ہوتے جا رہے ہیں اور ان میں عیش و عشرت پر خرچ کرنے کی توفیق کم ہو رہی ہے۔ ان کے تقاضے بدل چکے ہیں اور اب تفریق حکومت اور زراعت پیشہ طبقے کے درمیان ہے۔ ماضی قریب تک زراعت پیشہ طبقہ محض زندہ رہنے کے لیے کاشت کرتا تھا اور اگر کم سے کم دنوں تک فاقہ کشی کے باوجود ان کا سال گذر جاتا تو وہ اسی میں خوش رہتے۔ زراعت سے ہونے والا منافع سرکاری درمیانہ دار اُڑا جاتا اور کاشت کار اپنی کاشت کی توسیع کے لیے قطعاً کوشش نہیں کرتا اور نہ ہی وہ فاضل اناج پیدا کرتا جس کو فروخت کر کے وہ سامان آرائش مہیا کر سکتا۔ مگر اب حالات بدل چکے ہیں اور موجودہ وقت میں کسان لوگ فاضل اناج پیدا کرتے ہیں تاکہ ضروریات زندگی حاصل کر سکیں اور حکومت کو مالیہ ادا کرنے کے تقاضوں کو پورا کر سکیں اور یہ فاضل رقم تجارت پر صرف کی جانی چاہیے۔ مگر بدلتے ہوئے حالات کی نزاکت کو سمجھنے میں کشمیری قدرے سست ہیں اور وہ اس بات کو بھی مشکل سے سمجھ رہے ہیں کہ زندگی فقط فصل کٹائی اور موسم خزاں کی فصل کی تقسیم میں ہی محدود نہیں ہے۔ وہ نئے عقلی وسائل کو بھی اپنانے میں کاہل ہیں چنانچہ اگر زراعت پیشہ طبقہ خوشحال ہو تو اس سے نمک، کھانڈ چائے اور تمباکو کے مصرف میں بھی کئی گنا اضافہ ہوگا۔ برتنوں کے لیے دیرپا مواد اور پوشاک کے معاملے میں فیشن کی طرف مائل ہونے میں بھی انھیں کافی عرصہ درکار ہوگا۔ اخراجات کے معاملے میں وہ کفایت شعار ہیں اور ہندستانی عوام کی طرح وہ شادی بیاہ اور دعوتوں، ضیافتوں یا اسی نوعیت کی فضول خرچی کے مرتکب نہیں ہوتے۔ یہ قنوطی صورتحال بدل سکتی ہے۔ یہ ایک کشمیری کو اپنی کلیدی پیداوار کا فاضل حصہ ان آرائشوں پر خرچ کرنا ہوگا جو اسے درآمدی تجارت سے میسر آتی ہیں۔

اندرونی تجارت

میں نے کشمیر کی اندرونی تجارت کے بارے میں بہت کم بات کی ہے اور اس کا خلاصہ چند الفاظ میں ہی کیا جا سکتا ہے۔ سرینگر اور قصبات میں غلّے کے تاجر موجود ہیں جو دیہات سے غلّہ خرید کر اس غلّے کی ضروریات پوری کرتے ہیں جو حکومت کی طرف سے مہیا ہوتا ہے۔ اب تک وہ خستہ حالی کے شکار رہے ہیں کیونکہ انھیں یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ حکومت کس حد تک غلّہ شہر میں لائے گی اور انھیں یہ بھی معلوم نہیں ہوتا تھا کہ آیا آخری وقت پر حکومت وقت ایسا فرمان جاری کردے گی جس سے غلّے کی قیمتوں میں تغیر وتبدل ہو اور ان کا حساب کتاب چوپٹ ہو کر رہ جائے ۔یوں تو حکومت نے غیر درآمد شدہ چاول کے سوائے اب کسی بھی جنس کا کاروبار بند کردیا ہے تو تاجروں نے اب اپنی سرگرمیوں کو وسعت دے دی ہے مگر جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کہ سرمایے اور مہم جوئی کی عدم موجودگی میں کسی بھی حیثیت کے کشمیری دیہاتیوں سے براہ راست اناج خرید کر اپنے انتظامات خود کرتے ہیں۔ وہ دیہی کاشتکار اور شہری صارفین کے مابین درمیانہ داروں کے مناسب مقام کی راہ میں مانع ہوتے ہیں۔ شہر اور قصبات دیہاتی پیداوار کی درآمد کرتے ہیں اور نمک، کھانڈ، چائے، تمباکو اور کچھ مقدار میں سوتی کپڑے کے تھان برآمد کرتے ہیں۔

بیل گاڑی ٹھیلہ سڑک بارہ مولہ سے سرینگر تک

بارہ مولہ سے سرینگر تک ٹھیلہ سڑک سے اندرونی تجارت میں بھاری اضافہ ہونے کا امکان پیدا ہوا ہے۔ کشمیر کے کشتی ران بھی کافی بدنام ہو چکے ہیں اور سرینگر کے غلّہ دار اب اپنی سرگرمیوں کو شہر کے قریبی مضافاتی علاقوں تک ہی محدود رکھتے ہیں اور دیہات سے غلّے کی باربرداری کے لیے وہ قلیوں اور ٹٹوؤں کو کام میں لاتے ہیں۔ بیل گاڑی کی آمدورفت کے قابل سڑک کی تعمیر کے سبب اب وہ زیادہ دُور افتادہ علاقوں سے بھی اپنا غلہ خرید سکتے ہیں۔ اب ان کی تجارت میں فریب یا ملاوٹ ان کے لیے سد راہ ثابت ہوگی جس میں کشتی ران کافی مہارت رکھتے ہیں۔ کشمیر کی تجارت کے بارے میں کسی قسم کی پیشین گوئی کرنا ناممکنات میں شامل ہے۔ وادی جہلم کی سڑک ایک اہم گہوارے کے طور پر اپنا مقام حاصل کرے گی اور اسی طرح کا مقام بانہال سڑک پر رام بن کو حاصل ہوگا۔ اگر ہزارہ ضلع کو ریل رابطہ فراہم ہو جائے گا تو مظفر آباد ریل راستے سے صرف

دومرحلے دور ہے اور مظفرآباد سے سرینگر تک مال ٹھیلوں اور بیل گاڑیوں کے ذریعے جلدی سے پہنچے گا۔ اور مرّی تک چڑھائی کی جو دِقّت انھیں اُٹھانا پڑتی تھی اس سے بچا جاسکتا ہے۔ عام سردیوں کے دوران مرّی کی برفباری کی رکاوٹ کے بغیر آمدورفت جاری رہ سکتی ہے جہاں تک رام بن کا تعلق ہے تو جموں اسٹیشن سے رام بن تک ریل راستے کی تعمیر میں بھاری مصارف کا احتمال ہے۔ چنانچہ معمولی خرچے کے بعد جموں سے رام بن کی سڑک کو اونٹوں کی آمدورفت کے قابل بنایا جاسکتا ہے۔ رام بن سے کشمیر تک ٹٹوؤں کے لیے فقط تین مرحلوں کی مسافت ہے اور قلی بھی بھاری تعداد میں رسد وادی تک پہنچا سکتے ہیں۔ مگر اس کے لیے رام بن میں کافی ذخیرے کے لئے ڈپو قائم کرنا ہوگا۔ بانہال کے راستے میں گھاس اور پانی فراوانی سے میسر ہے اور پنجاب تک یہ سب سے زیادہ راست شاہراہ ہے۔ کافی لحاظ سے یہ ایک افسوسناک امر ہے کہ حکومت نے بیل گاڑی کے راستے کی تعمیر بارہ مولہ کے بجائے بانہال سے نہیں کی۔ توقع کی جاتی ہے کہ جموں سے سرینگر تک ایک ٹھیلہ سڑک کی تعمیر کرکے دربار عوام کی خوشحالی میں اضافہ کرے گا۔ اس معاملے میں کسی قسم کی انجینئرنگ کی مشکلات حائل نہیں ہیں۔

●✻✻✻●

حوالہ جات

(1) لداخ سے اوسطاً 812 من نمک درآمد کیا جاتا ہے جس کی مالیت 2253 روپے ہے۔
(2) 1894-95 میں چائے کی درآمد ایک لاکھ روپے سے زیادہ نہیں تھی۔

●❀❀❀●

سترھواں باب

قدیم انتظامیہ

اس عنوان کے تحت زندگی کے مختلف شعبے مثلاً عاملہ، عدلیہ، پولیس اور جیل خانہ جات مالیاتی محصولات، اندراجاتِ، تعلیم، طبی عملے اور شفاخانے شامل ہیں(1) ۔یہاں پر ان کا تفصیلی جائزہ بیان کیا جاتا ہے ۔ میں اس باب میں صرف محکمۂ مال کی اراضیات پر بحث کروں گا جو کشمیر کی انتظامیہ کا ایک اہم شعبہ ہے۔

اراضی مالیات

یہ ایک خوش آئند بات ہے کہ وادی میں بہت کم مقدمہ بازی کی خبریں ملی ہیں۔شعبۂ عدلیہ کا عوام پر زیادہ اثر نہیں ہے اور جرم سے تو شاید کوئی واقف ہو۔پولیس تعلیم اور شفاخانے ابھی ابتدائی مراحل سے گذر رہے ہیں۔دیگر ایسی ریاستوں کی طرح جہاں برطانوی ہندوستان کی طرح ابھی تہذیبی ترقی نہیں ہوئی ہے کشمیر میں بھی لوگوں کی خوشحالی اور بہبود کا دارومدار محصولات کے طرزِ عمل پر ہے۔شاید کشمیر میں انتظامیہ کی اپنی خصوصیات کی بدولت یہاں کا نظامِ مالیہ عوام کے ارتقا اور کردار پر کسی دوسری ریاست کی نسبت زیادہ اثر انداز ہوا ہے۔ بندوبست اراضی سے قبل نظامِ مالیہ پر بحث کرنے سے پہلے میں یہ کہنا چاہوں گا کہ ایک ایسے ملک میں جہاں اس امر کی نشاندہی کرنے والے نقشے موجود نہیں تھے کہ کسی شخص کے قبضے میں کل کتنی زمین ہے اور کس قدر مالیاتی ذمہ داریاں ہیں۔تعجب کی بات ہے کہ تنازعات اراضی اور مالیہ کے معاملے میں پورے طور پر

انصاف نہیں کیا جاتا ہے مگر نالش کرنے والوں کو جو بھی انصاف فراہم ہوتا تھا اس کے اسباب میں سے ایک اہلکاروں کی لاعلمی اور بے چارگی تھا۔ اب تک ہندوستان کے باقی حصوں کی بانند کشمیریوں کے لیے مقدمہ بازی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اس کے بعد جس نقطے پر میں توجہ دوں گا وہ یہ ہے کہ کشمیر میں انتظامیہ میں کبھی تسلسل قائم نہیں رہا۔ یہاں تک کہ ڈوگرہ حکمرانی کی شروعات سے جب موسم گرما کے اختتام پر مہاراجہ وادی سے چلا جاتا ہے تو ایک درمیانی مدت ایسی آتی ہے جب افسر شاہی عوام پر اپنی مطلق العنانی چلاتی ہے۔ کیونکہ دربار کی طرف سے ان پر کوئی روک ٹوک نہیں ہوتی۔ باتیں کرنے کے معاملے میں کشمیری کافی مہارت رکھتے ہیں۔ میں نے اپنے پڑاؤ میں جتنے برس گذارے ان کے دوران مجھے کسی ایسے شخص کی یاد نہیں ہے جس نے مہاراجہ کی تعریف کے سوائے کوئی دوسری بات کی ہو۔

افسر شاہی

جو بھی غلط کاریاں ہوتی ہیں لوگ ان کا الزام سرکاری اہلکاروں پر دھرتے ہیں۔ جنھوں نے اپنے آقاؤں کو مالیہ انتظامیہ کی بابت حقائق سے بے خبر رکھا ہوتا ہے۔ اس بات میں شک نہیں کہ کشمیر میں اچھے اور چاق و چوبند اہلکار بھی ہیں جنھوں نے دیہات کا معائنہ کر کے اپنے ماتحتوں کو قابو میں رکھا مگر وہ اشخاص جن کو وادی کے لوگ آج بھی احترام سے یاد کرتے ہیں، وہ پنڈت طبقے سے نہیں تھے بلکہ جموں کے علاقے سے آئے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ سخت مزاج رہے ہوں گے مگر وہ اس علاقے سے واقف تھے۔ انھوں نے کاشتکاری کی حوصلہ افزائی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تا کہ ہیرا پھیری کے ادنیٰ معاملے ٹالے جا سکیں۔ وہ اپنے آقاؤں کے وفادار تھے مگر اس بارے میں دانشمندی سے کام لیتے تھے کہ مہاراجہ اور عوام الناس کے مفادات میں یکسانیت لائی جا سکے۔ مگر بدقسمتی سے اس قسم کے افسروں کی تعداد نہایت کم تھی اور کشمیر جس خستہ حالی کا شکار ہو چکا تھا اس کے لیے مہاراجہ نے بندوبست اراضی کا فیصلہ کیوں کیا۔ اس کے پس پردہ یہ حقیقت تھی کہ اعلیٰ ترین سے نچلی سطح تک افسران مال ملی بھگت کر کے اپنے آقا کو لوٹ رہے تھے اور عوام کا خون نچوڑ رہے تھے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ پٹھانوں اور سکھوں کے عہد سے یہ بات عام طور پر مشترک تھی مگر غبن کے اس انداز میں اس وقت چابکدستی آ گئی جب کشمیر کی انتظامیہ عملی طور پر کشمیر

کے پنڈتوں کے حوالے کر دی گئی۔ مشرق کے معاملات حال میں ہمیشہ یہ بات صحیح ہوئی ہے کہ اس کے اولین اسباب کو تلاش کیا جائے۔

قدیم پٹواری

کشمیر میں مالیہ انتظامیہ کا آغاز پٹواری سے ہوتا ہے جو ایک دیہاتی محتسب ہوتا ہے اور وہ پنڈت ہے۔ وہ اپنے گریبان کی جیب میں کاغذ کے تڑے مڑے پرزے یا مرچ کے چھلکوں کو چھپائے رکھتا ہے جس پر ہر دیہاتی کے قبضے میں زمین کا اندراج ہوتا ہے۔ یہ امر بیان کیا گیا ہے کہ پٹواری کے پاس زیر زمین قبضہ کی تین شکلیں ہوتی ہیں۔ ایک قسم کی تفصیلات کو وہ اپنے پاس رکھتا ہے جو حقیقت کے قریب تصور کی جاتی ہے۔ دوسری تحصیلدار کے لیے اور دیگر قسم کی تفصیلات وہ فریقین کو خوش کرنے کے لیے تیار کرتا ہے۔ کیونکہ ہر ایک فریق کے ساتھ اس کو بہترین قسم کی سودا بازی کرنی ہوتی ہے۔ رقبہ چکداری کا تعین پیمائش کر کے نہیں کیا جاتا مگر اس نے اس کا حساب اس امر سے لگایا ہوتا ہے کہ ایک کھیت کے لیے کتنی مقدار میں بیج درکار ہوتا ہے۔ سروے کی کارروائیوں کے دوران حاصل کردہ تجربے سے معلوم ہوتا ہے کہ سربراہ اور بااثر دیہاتی اپنے غریب بھائیوں کی نسبت بہت کم بیج بونے کے قابل تھے۔ اور اس کے نتیجے کے طور پر ان کی چکداریاں پٹواری کے کاغذات کے مطابق بہت چھوٹی تھیں مگر ان کا مالیہ اراضی ان لوگوں کے مقابلے میں بہت زیادہ تھا جن کے قبضے میں گاؤں کے طاقتور افراد کے مقابلے میں بہت کم رقبہ تھا۔ پٹواری پنڈتوں کا ایک چھوٹا سا طبقہ جو محکمہ مال میں مختلف عہدوں پر ایک تحصیل میں ملازم تھا اور وہ افراد محصولات کے معاملے فروشی اور پھیری کے بجائے مجموعی طور پر دیہات کے ساتھ نمٹتے ہیں۔ ان پٹواریوں اور تحصیل پنڈتوں پر تحصیلدار اور ایک یا دو نائب تحصیلدار ہوتے ہیں۔ کشمیر کی پندرہ تحصیلوں کو تین اضلاع یا وزارتوں میں تقسیم کیا گیا ہے جس کی صدارت وزیر وزارت کرتے ہیں۔ یہ تینوں پنڈت ہیں۔ یہ وزیر ایک حاکم اعلیٰ یا گورنر کے ماتحت ہوتے ہیں۔ اس کے عملۂ مال کو دفتر دیوانی کہا جاتا ہے۔ یہ دفتر بھی تمام تر پنڈتوں پر مشتمل تھا۔

ایک ایسا ملک جہاں تعلیم عام نہیں ہے وہاں پر پنڈتوں کو ملازمت فراہم کیا جانا ایک فطری عمل ہے جو آسانی کے ساتھ پڑھ لکھ سکتے ہیں۔ وہ ایک مقامی ایجنسی کی حیثیت رکھتے ہیں اور وہ

گذشتہ کئی نسلوں سے اس عہدے پر اپنے ذریعہ معاش کے لیے فائز ہیں اور انھیں ملازم رکھنا ایک نہایت موزوں امر ہے۔ اسکے باوجود بھی یہ ایک افسوس ناک امر ہے کہ حکومت کے مفادات فقط ایک طبقے کے افراد کو تفویض کیے گئے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ اس طبقے کے لوگ حکومت کو دھوکا دینے کیلئے مل گئے ہیں۔ پنڈت ایک دوسرے کے تئیں وفادار ہیں اور جب انھیں پریشان کن سوالات کا سامنا ہوتو اس کے دوست تحصیل وزیر وزارت کے صدر مقام اور دفتر دیوانی میں بجا طور موجود ہیں۔ یہ ایک طاقتور آہنی پھندہ ہے جس کے اندر ٹیکس دہندہ پھنس جاتا ہے اور اگر وہ دانشمند ہے تو وہ خاموش رہتا ہے۔ اکثر کہا گیا ہے کہ ایک شخصی حکومت اپنے عوام الناس کے لیے بہت کم کام کرتی ہے اور مالیہ کا ایک حقیر حصہ تعمیرات عامہ، مادی ترقی اور تعلیم جیسی اخلاقی ترقی پر صرف کرتے ہیں۔ مگر یہ بات ذہن نشین کرنا لازمی ہے کہ حکومت دفاع پر خرچ کرنے کے معاملے میں نہایت فیاضی سے کام لیتی ہے۔ حالیہ برسوں کے دوران چند پنڈت جو حکومت کے تنخواہ دار نہیں تھے اور دفاتر کی تعداد بھی زیادہ نہیں تھی مگر حکومتی عملے کے معاملے میں فراخدلی پنڈت طبقے کے لیے بھاری سودمند ثابت ہوئی۔ مسلمان کے لیے یہ بدبختی اور لعنت کے مترادف تھی کیونکہ ایک پنڈت کے لیے کسی عہدہ پر تنخواہ کی قدر و قیمت نہیں ہوتی بلکہ اس کی بنیادی لوازمات اہم ہوتی ہیں۔ میری یہ قطعی خواہش نہیں کہ میں پنڈتوں کی مذمت کروں۔ میں نے ہمیشہ اس امر کو تسلیم کیا ہے کہ اگر کسی طبقے کے عوام کو وہی مواقع دیے جائیں جو پنڈتوں کو میسر ہیں تو وہ بھی سرکاری فرائض کے معاملے میں اسی قدر غفلت شعار ہوتے۔ مجھے اس امر کی پختہ اُمید ہے کہ جب دیانتداری اور جانفشانی کی مناسب طور پر حوصلہ افزائی ہوگی تو پنڈت بھی حکومت کے قابل قدر اور قابل ملازمین ثابت ہوں گے۔ مگر مال انتظامیہ کے بارے میں جو کیفیت میں نے بیان کی ہے اسے سمجھنے کے لیے اس امر کو ذہن نشین کرنا لازمی ہے کہ عام الفاظ میں سرکاری اخلاق کا سرے سے ہی کوئی وجود نہیں ہے۔

قدیم مالی انتظامیہ

ہندوستان کے دیگر حصوں کی مانند اس ملک کی بنیادی آمدنی زمین سے حاصل ہوتی ہے۔ اس مالیہ کو جمع کرنے کے مختلف طریقے مروّج رہے ہیں۔ قدیم ہندو عہد میں حکومت زمین کے

چھٹے حصے کی وصولی پر ہی اکتفا کر لیتی تھی۔ عہد سلاطین میں حکومت نصف غلہ لے جاتی تھی۔ ان کے جانشین مغلوں کو وادی کی خستہ حالی کی شکایت ملی۔ انھوں نے سوچا کہ شہری آبادی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے نصف پیداوار ناکافی ہوگی چنانچہ انھوں نے فرمان جاری کیا کہ کاشتکار طبقہ تین ماہ کا غلہ دے اور خود پھل کھا کر گذارہ کرے۔ چنانچہ حکومت کے لیے مالیہ اراضی کا حصہ زمین کی تین چوتھائی پیداوار کے مساوی تھا(2)۔ ان دنوں زمین کو حکومت کی ملکیت تصور کیا جاتا تھا اور ہر سال کاشتکاروں کے لیے زمین مخصوص کی جاتی تھی۔ اس کے بعد یعنی 1859 میں ملک کارداروں کی تحویل میں تھا جو حکومت کے ارضیاتی گماشتے تھے۔ اور ان کو وسیع اختیارات حاصل تھے۔ کارداروں نے اپنی تحویل کی زمین کو تین ضلعوں میں تقسیم کیا ہوا تھا۔ نچلے علاقے میں چاول کے سوا کچھ بھی پیدا کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ درمیانی حلقے میں چاول اُگانے کی اجازت تھی مگر بالائی حلقے میں چاول قطعی طور پر پیدا نہیں کیا جاتا تھا۔ یہ کاردار کا فرض تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ ممکنہ غلہ حکومت کے لیے جمع کرے اور وہ اس بات سے واقف تھا کہ بلندی پر واقع علاقوں میں چاول کی کاشت غیر منافعت بخش ہے۔

کاروار ہر برس املاک میں کاشت کا انتظام کرتا تھا۔ اس اکائی کو نفری کہا جاتا تھا جو ایک مرد کی بیوی اور ایک بالغ بیٹے پر مشتمل ہوتی تھی۔ اس نفری کو چار ایکڑ آبپاشی رقبہ دیا جاتا۔ نیم نفری یعنی ایک مرد اور اس کی بیوی کو دو ایکڑ آبپاشی زمین دی جاتی اور پاؤ نفری یعنی مجرد کو صرف ڈیڑھ ایکڑ آبپاشی زمین دی جاتی۔ زمین کی سالانہ تقسیم کرنے کے بعد کاروار گاؤں کی زمین کو شکدر کے حوالے کر دیتا جس کا کام گاؤں میں فصلوں کی نگرانی کرنا ہوتا تھا۔ بڑے دیہات میں ایک سے زیادہ شکدر ہوتے۔ ان میں ہر ایک ایک یا دو گاؤں کی فصلوں کا نگراں ہوتا۔ شکدار کو حکومت سے آٹھ خروار شالی حاصل ہوتی تھی اور بنیادی لوازم کے طور پر بارہ خروار شالی وہ گاؤں سے وصول کر لیتا۔ شکدر سے اوپر ایک افسر سزوال ہوتا جو سال کے دس مہینوں میں ڈھائی روپے ماہانہ حاصل کرتا۔ جب فصل کٹائی کا موقع آجاتا تو ایک لشکر نظامت پلٹن(3) دیہات میں وارد ہو جاتی تاکہ حکومت کا حصہ وصول کر سکے۔ اس لشکر کی مدد کے لیے ہمیشہ فوج کے سپاہی باقاعدہ ساتھ رہتے۔

حکومت چاول، مکئی، تل اور خورد گندم، تلہن، کپاس اور دالوں کا تین چوتھائی حصہ لے جاتی اور یہ حصہ 9/16 میں وصول کیا جاتا۔ یہ طریقہ کار 1860 تک جاری رہا۔ جب حکومت نے اپنا حصہ کم کر کے نصف سے قدرے زیادہ متعین کیا مگر اس رعایت کو ایک غلط طریقے سے تہس نہس کر دیا گیا جو مالیہ اراضی جمع کرنے کے لیے اپنایا گیا تھا۔ چکدار سٹے باز ٹھیکیدار اس موقعے پر آدھمکتے جو حکومت اور عوام دونوں کو لوٹتے تھے او جہاں چکدار بھاری منافع کمانے میں کامیاب ہوتے وہاں اس زمین کو امانی قرار دے دیا جاتا اور حکومت اپنا حصہ گاؤں کی حقیقی بنیاد پر وصول کرتی۔ چکداروں کو کھیتی کے لیے زمین دینے کا طریقہ کار 1873 تک جاری رہا۔ جب تین سالہ بندوبست کی سعی کی گئی اور یہ اقدام بلاشبہ ٹھیکیداروں اور درمیانہ داروں میں غیر مقبول ہوا جو قدیم طریقہ کار کے سہارے نہایت آرام کی زندگی گذار رہے تھے۔ اگر 79-1877 کی قحط سالی نے تمام ملک کو انفرادی بربادی کا شکار نہ بھی کیا ہوتا تو بھی اہلکاروں نے 1873 میں شروع کی گئی اس مفید رساں اداروں سے چلائی گئی اسکیم کو ناکارہ بنا دیا ہوتا۔

1880 کا طریقہ کار

سال 1880 میں چکداریوں کا ایک اندازہ لگایا گیا۔ درحقیقت یہ دیہات کا اندازہ تھا جسے اسامی وار کھیتوں سے کیا گیا تھا۔ جس کی اساس گزشتہ برسوں کی اوسط وصولیات پر تھی۔ اس سے اب بھی نقدی کا اندازہ کیا جاتا ہے مگر یہ ایک نقدی اندازہ تھا اور اس میں حاکم اعلیٰ کی چلتی تھی کہ سال بہ سال کس قدر رقم وہ نقدی کی صورت میں حاصل کرے۔ 1880 کا یہ اندازہ عملی طور پر واحد مالی بنیاد ہے جس پر مجھے کام کرنا پڑا اور جن کاشت کاروں کے نام کاغذات میں درج ہیں حق قبضہ پر ان کا مضبوط دعویٰ تسلیم کیا گیا ہے۔ بہ نسبت ان لوگوں کے جنھوں نے عظیم قحط سالی کے دوران اپنے دیہات کو ترک کر دیا اور اب واپس آ گئے ہیں۔ کشمیر کے پندرہ تحصیلوں کی بابت جو اندازہ پر مبنی رپورٹیں میں نے پیش کی ہیں ان میں 1880 کی مانند مختلف تفصیلات اور اس کے بعد کی ترامیم بھی پیش کی ہیں۔ میں نے جو کیفیت بیان کرنا ہے وہ عام نوعیت کی ہے اور ان کا اطلاق وادیٔ کشمیر پر ہوتا ہے۔ 1880 میں اندازہ لگانے کا کام مختصر انداز اور سرعت رفتاری کے ساتھ سرانجام دیا گیا۔ چند گنے چنے افسر کشمیر کے چند مراکز پر گئے اور ان دیہات سے جو اندازے

انھیں موصول ہوئے انھوں نے ان کا اعلان کر دیا۔ دیہات کے معائنے اور عوام کی حالت آبپاشی یا کاشت کا تعین کرنے کی قطعاً کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ گزشتہ برسوں کی اوسط وصولی کو ملحوظ خاطر رکھا گیا اور حکومت کے نقصانات کے کھاتے میں اچھی خاصی فیصد کی آمدنی کا اضافہ کیا گیا جو ہر صورت 30 فیصد سے زیادہ نہیں تھا اس کا یہ نتیجہ کہ جن لوگوں نے مل کر قحط سالی کا سامنا کیا تھا، انھیں بہت زیادہ رقوم دینے کے لیے مجبور کیا گیا اور جو دیہات تباہ ہو چکے تھے اور 1880 تک سنبھل نہیں سکے تھے وہ آسانی سے چھوٹ گئے۔ غیر مساوی محصولات کی ایک یہ بھی وجہ تھی کہ افسروں نے ضروری نہیں سمجھا کہ وہ دیہات کا معائنہ کریں اور آبادی کے اعداد وشمار جمع کریں۔ اس غیر مساوی طریقۂ کار پر تعجب کی چنداں ضرورت نہیں سمجھی گئی مگر اس کے سوائے اور بھی اسباب موجود تھے اور اسی وجہ سے بے قاعدگی بھی پیدا ہوئی۔

ایک گاؤں کا بااثر شخص اس امر سے بخوبی واقف تھا کہ اندازہ افسروں کو کس طرح رام کیا جاسکتا ہے تاکہ اپنے گاؤں کے محصول کا بوجھ اپنے کندھوں سے اُٹھا کر چھوٹے دیہات پر مائل کیا جائے۔ ویسے رسمی طور پر ہر گاؤں سے دریافت کیا گیا کہ آیا انھیں یہ اندازہ قبول ہے۔ چند دیہات نے اسے قبول کر لیا مگر جنھوں نے انکار کر دیا ان کی عقل جلدی ہی ٹھکانے لگا دی گئی۔ حکومت کے لیے زیادہ مالیہ وصول کرنے کی دوڑ میں ایک افسر دوسرے کو مات دینے لگا۔ بہت ساری صورتوں میں ان پر جوش اہلکاروں نے دیہاتیوں سے کہا کہ یہ مالیہ فقط برائے نام ہے اور اس کی وصولی نہیں کی جائے گی۔ انھوں نے اکثر معاملوں میں دیہاتیوں سے کہا کہ اس اندازے کا کم از کم نصف مالیہ بیج کی صورت میں واپس کر دیا جائے گا مگر ان چکنی چپڑی باتوں کے باوجود 1880 کے اندازوں کو بہت کم دیہاتی قبول کرنے کے لیے آمادہ تھے۔ اس کے بعد ایک دو دن تک کام کرنے کے بعد یہ اہلکار اپنی کشتیوں میں سوار ہو کر فوری طور پر سرینگر آگئے جہاں انھوں نے کاغذی گھوڑے دوڑا کر ہی حکام کے سامنے یہ نتائج نہایت فخر کے ساتھ پیش کر دیے۔ اپنی ادنیٰ حالت کے باوجود کشمیری نہایت ضدی اور ثابت قدم ہوتا ہے۔ جہاں اس نے سوچا کہ یہ اندازہ بہت زیادہ ہے اس نے فاضل مالیہ دینے سے انکار کر دیا۔ ایک چابکدست اور سخت مزاج اہل کار نے 1880 میں اندازہ شدہ مالیہ مکمل طور پر وصول کر لیا، اس کے لیے اس نے گاؤں کے مویشی اور بھیڑ فروخت

کر دیے مگر اگلے برس یہ گاؤں بالکل بنجر رہ گئے کیونکہ یہ لوگ ان دیہات کی طرف نقل مکانی کر گئے جہاں اس مالیہ کا منصفانہ اندازہ لگایا گیا تھا یا انھوں نے بارسوخ جاگیرداروں کے تحت زرعی مزدوروں کی ملازمت کر لی۔ 1880 میں اندازہ افسروں نے ان قصبوں پر مالیے کو تقسیم کرنے کی قطعی کوشش نہیں کی اور یہ مشکل کام پٹواری اور نمبردار پر چھوڑ دیا گیا۔ جس کا فطری نتیجہ یہ ہوا کہ پٹواریوں اور نمبرداروں کے ان قبضات پر بہت کم مالیہ حاصل ہوا اور بہت زیادہ مالیہ ان کے دشمنوں کے پاس چلا گیا۔ جب کشمیری مال انتظامیہ کی بات کرتے ہیں تو وہ بار بار کہتے ہیں کہ ان کا اعتماد قائم نہیں رکھا گیا اگر ایسا کیا گیا ہوتا تو 1880 کا اندازہ قائم رہتا مگر انھیں اہلکاروں کے اعتماد کے بارے میں قطعی طور پر کوئی شک نہیں۔ بہر حال اگر یہ کیفیت منصفانہ ہے تو 1880 کا اندازہ لگانا ناممکن ہے کیونکہ یہ ملک حال ہی میں قحط سالی کی مصیبتوں کے مرحلے سے گذر رہا تھا۔ کاشتکار دربدر بھٹک رہے تھے اور کاشت عدم استحکام کا شکار تھی مگر یہ ایک افسوس ناک امر ہے کہ جو افراد 1880 کے اندازے کے وقت موجود تھے انھیں سانس لینے کی زیادہ فرصت نہیں دی گئی اور اس سے زیادہ حیران کن بات یہ ہے کہ ایزادی مالیے کے بارے میں جو اقدامات کیے گئے ان میں عوام اور ملک کی خوشحالی کا بہت کم لحاظ رکھا گیا۔

بولی کی ایزادگی

1882 میں دیہات کی نیلامی (ایزاد بولی) کا راستہ اختیار کیا گیا جس کے نہایت تباہ کن اثرات برآمد ہوئے۔ افسروں نے مختلف تحصیلوں کا جلد بازی سے دورہ کیا جن کے ہمراہ ضرورت مند پنڈت کشتی ران، نسوار فروش اور شہر کی دوسری مہم باز تو تیں تھیں اور کشمیر کے دیہات کا بیشتر حصہ رسمی طور پر نیلام کر دیا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نیلام گر مذاقیہ مزاج کے مالک تھے انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ چند دیہات میں سایہ دار میدانی درخت ہیں اور کاشت کار نہایت فرماں بردار لوگ ہیں اور جو بھی شخص اس نیلامی میں زیادہ سے زیادہ بولی دے گا اُسے وہ خوشی خوشی مالیہ ادا کر دے گا۔ تمام تر کارروائی نہایت تمسخرانہ انداز میں انجام دی گئی اور اس معاملے میں جن فریقین کو پچھتانا پڑا وہ حکومت اور دیہاتی تھے۔ جن پنڈتوں اور کشتی رانوں نے ان دیہات کی بولی دی ان میں اتنی توفیق نہیں تھی انھوں نے اس بارے میں بہت کم پرواہ کی کیونکہ انھوں نے سال بھر کی

فصل پر سٹہ بازی کی تھی اور کشمیر میں کوئی بھی شخص بارہ ماہ سے زیادہ دُور تک نہیں سوچتا۔ ایسا ہوا کہ اس برس فصل اس قدر اچھی نہیں ہوئی اور تمام سٹے باز جو کچھ بھی دیہاتیوں سے وصول کر سکتے تھے وہاں سے چلے گئے اور حکومت کو ایک روپیہ بھی ادا نہ کیا۔ اپنی تشخیصی رپورٹوں میں میں نے نیلامی کے ذریعے فروخت کے بارے میں بہت ساری مثالیں پیش کی ہیں۔ ایک تحصیل میں آٹھ دیہات پر مشتمل گروپ کا انتظام ایک بارسوخ سربراہ کے پاس تھا جو حکومت کو 5500 روپے سالانہ ادا کرتا تھا۔ فروخت نیلامی کے دوران ایک جاہل کشتی ران نے ان دیہاتی کی بولی 13000 روپے دے دی مگر ایک ماہ کے تجربے کے بعد وہ فرار ہو گیا اور ان دیہات کے ذمہ 13000 روپے کا مالیہ قائم رہا۔ بہر کیف یہ مالیہ کبھی ادا نہیں کیا گیا اور فروخت نیلامی کے بعد 5500 روپے کی حقیقی رقم بھی کبھی وصول نہیں کی گئی۔ فروخت نیلامی کا بدترین پہلو یہ تھا کہ اگرچہ یہ لوگ مالیے کی خاطر اِدھر اُدھر دوڑتے پھرتے تھے مگر جب ادائیگی کا موقعہ آتا تو ان کا کہیں اَتہ پتہ نہیں ہوتا۔ کم سے کم عقل کا شخص بھی اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ زبوں حال دیہاتیوں سے نیلامی کے لیے بولی شدہ رقم ہرگز وصول نہیں ہو پاتی تھی اور یہ تمام تر معاملہ ایک ڈھکوسلہ تھا۔ اس کے باوجود بھی بولی شدہ رقم کو متعلقہ گاؤں کے لیے مستقبل کا مطالبۂ زر تصور کیا جاتا اور سال بہ سال اس ناممکن اور فرضی مطالبۂ مالیہ کو وصول کرنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا جاتا۔

کسرِ نرخ

شاید کسی کے دل میں یہ خیال ہو کہ نیلامی کی یہ اسکیم ایک برس کے لیے مکتفی تھی مگر محکمۂ مال کے افسروں کی طرف سے ایک اور ضرب اس وقت لگائی گئی جب 1880 میں منظور شدہ شرحوں میں مواصلاتی شرح کی تبدیلی کی گئی۔ 1880 میں فیصلہ کیا گیا تھا کہ شالی اور مکئی پر انھیں اس رقم سے 1.460 روپے فی خروار قرضہ حاصل ہو جو وہ مالیہ کی صورت میں حکومت کو ادا کرتے ہیں۔ 1880 میں شالی اور مکئی کی قیمت قریباً مساوی تھی مگر اس کے فوراً بعد مکئی کی قیمت میں کمی واقع ہونے لگی۔ نقل وحمل کیلئے حکومت کو وصول شدہ مالیے سے کچھ رقم ادا کرنا پڑی اور اہلکاروں کے ذہن میں یہ بات گھر کر گئی کہ لاگت کی یہ رقم دیہاتیوں کے ذمہ ڈال دی جائے۔ چنانچہ مواصلاتی شرحوں میں تبدیلی کر دی گئی۔ مکئی کے لیے ایک روپے چالیس آنے حاصل کرنے کی بجائے انھیں

مواصلاتی شرح تحفظ پانچ آنے ادا ہوتی جب کہ شالی کے لئے انھیں 17-16 آنے حاصل ہوتے۔ یہاں تک کہ مالیے کا زیادہ حصہ جنس کی صورت میں وصول کیا جاتا ہے۔ اس مواصلاتی شرح (کسر نرخ) میں تبدیلی کی وجہ سے دیہاتیوں کا بھاری نقصان ہوا۔ اہلکاروں نے مالیہ وصول کرنے کے لیے بہت سارے ہتھکنڈے استعمال کیے مگر یہ سبھی عامیانہ طریقے پر مبنی تھے جن میں تشخیص شدہ علاقے سے جائداد چھین کر کسی بارسوخ پنڈت یا محکمہ ترقیٔ اراضی (ترقیات) کے حوالے کردینا شامل تھا۔ بہت کم دیہات ایسے بچے تھے جو تکراری جامہ یا دیہاتیوں کی طرف سے متنازعہ مالیہ کے تحت نہیں آتے تھے اور قاعدے کے مطابق یہ رقم ان کے بقایاجات کے مطابق شامل ہوجاتی۔ 1880 اور 1887 کے دوران بندوبست کا جو آغاز ہوا کشمیر میں حکام مال کی کارگذاری کا مظاہرہ کرنے کے لیے میں ایک گاؤں کی تفصیل بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔ 1880 میں جس مالیے کی تشخیص کی گئی اس بنا پر حکومت موسم خزاں کی پیداوار کا 6/10 اور فصل بہاراں کا 9/16 لے جاتی۔ اس طرح حاصل ہونے والے مالیے سے 30 فیصد کا اضافہ ہوتا۔ اس کے دو برس بعد گاؤں کو نیلام کردیا گیا اور اسی برس مواصلاتی شرح کو 20 آنے سے کم کرکے 16 آنے کردیا گیا۔ 1880 میں مطالبہ مال دو ہزار روپے تھا جسے 1882 میں بڑھا کر 2939 روپے کردیا گیا۔ اس امر کا فیصلہ پٹواری اور نمبردار آپس میں کرتے کہ کس طرح ان 2939 روپیوں کی تقسیم گاؤں کے کاشتکاروں میں کی جائے مگر انھوں نے اس بارے میں اپنا حق جمالیا ہو کہ یہ تشخیص 600 روپے تک کافی زیادہ ہے اور ہر سال گاؤں نے معمول کا مالیہ 2939 روپے ادا کیا ہوتا اور ہر سال 600 روپے کا بقایاجات کا اندراج بھی ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ حاکم اعلیٰ سال بہ سال جس قدر بھی برائے نام رقم متعین کرے اس میں کافی حد تک ترمیم اور الٹ پھیر کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ پرانے طریقۂ کار کے مطابق حکومت مالیہ اراضی کے طور پر فقط شالی اور مکئی ہی وصول نہیں کرتی تھی بلکہ کپاس، تلہن اور دالوں (غلط فہمی) کو بھی قبول کرتی تھی اور چند پراسرار وجوہ کے طور پر اس مالیہ جنس میں ان اجناس کے لیے جو شرح مقرر کی گئی تھی وہ اس شرح سے دوگنا تھی جس پر یہ بازار میں لائی جاتی ہیں چنانچہ گاؤں کا اولین کام یہ ہوتا تھا کہ 2939 روپے کے مالیہ کے عوض جس قدر بھی ممکن ہو کپاس، تلہن اور دالیں حاصل کی جائیں تاکہ کم از کم شالی یا گندم دینی پڑے

کیونکہ اپنے اور بچوں کے گذر بسر کے لیے یہ شالی لازمی ہوتی ہے۔اگر وہ شکایت کنندہ ہوتے تو نہایت خاموشی کے ساتھ وہ تحصیلدار سے دیہی چوکیدار کو خوش کردینے اور کپاس اور تلہن کے معاملے میں ہزار روپے کا ''قرض'' حاصل کیا جاتا۔گاؤں میں نہ تو کپاس اور نہ ہی تلہن کی پیداوار ہوتی اور انھیں آسانی کے ساتھ سرکاری ذخیروں سے حاصل کیا جاتا اگر وہ غیر معمولی شکایت کنندہ ہوتے تو ان سے بقایا کا بیشتر حصہ 1339 روپے نقد وصول کیا جاتا اور اس خوش حال گاؤں کے پاس سال بھر کی خوراک کے لیے وافر مقدار میں شال یا مکئی موجود رہتی مگر اس برس تین تحصیلداروں کو تبدیلی کے باعث عوام قرض کے معاملے میں احمق اور عذردار ہوتے اور تیسرے تحصیلدار نے ان کی مثال قائم کی چنانچہ کپاس اور تلہن حاصل کرنے کی بجائے وہ شالی پر ٹوٹ پڑا۔اس برس یہ گاؤں بکھر گیا اور سروے کے موقعے پر یہ 1000 کا مالیہ ادا کرنے کے قابل نہیں تھا۔زمین کا بیشتر حصہ کاشت سے محروم تھا اور اگرچہ سابقہ کاشت اب بحال ہوچکی ہے اور یہاں کے لوگوں کو 2339 روپے کا مالیہ ادا کرنے کے قابل ہونے کیلئے برسوں کا عرصہ درکار ہوگا۔نقدی اور جنس کی صورت میں طلب کی فروخت کے نظام کو مجوزہ کہا جاتا ہے۔جہاں اہلکاروں کو اس طریقہ کار سے بھاری فائدہ ہوا وہاں حکومت کو نقصان اٹھانا پڑا ہے اور عوام کے حوصلے پست ہوئے ہیں اور انھیں مصیبت اٹھانا پڑی ہے۔

تخم غلہ کے لیے پیشگی

بندوبست اراضی کے آغاز سے قبل یہ لازمی تھا کہ عوام کو کاشت کے لیے مجبور کیا جائے کیونکہ موسم سرما اور موسم بہار کی بوائی کے لیے درکار کافی غلہ نہیں بچا ہے۔یہ رواج تھا کہ ہر گاؤں کو بیج کے مقصد سے کچھ مقدار میں غلہ فراہم کیا جائے۔اس پیشگی کو تخم مساوا کہا جاتا تھا مگر جیسا کہ میں نے زراعت کے باب میں دکھایا ہے کہ ہر دیہاتی اپنا ہی بیج اور غلہ بچا کر رکھے گا اور وہ کبھی آمیزش شدہ غلّہ استعمال نہیں کرے گا جو اسے سرکاری گوداموں سے حاصل ہوتا ہے۔بعض اوقات ہنگامی صورت حال میں عوام فاقہ کشی سے بچاؤ کے لیے سرکاری غلہ حاصل کرتے مگر قاعدے کے مطابق تخم غلہ کی پیشگی محض ایک غبن کا راستہ ہے۔یہ غلہ کبھی عوام تک نہیں پہنچ پاتا بلکہ اہلکاروں کے دیہی سربراہوں اور پٹواری کے درمیان تقسیم ہوتا ہے اور غلے کی اس قیمت کو ہر گاؤں کے خلاف بقائے

کے طور پر درج کر دیا جاتا ہے۔

بقایاجات

جب افسروں نے مجوزہ اور مُستدا کے تمام تر وسائل کام میں لائے توانھیں بنیادی بقایاجات کا اچھا حاصل مل گیا اور جب تک بندوبست کا آغاز نہیں ہوا تب تک سب کچھ تحصیلدار کے اختیار میں تھا کہ سال بہ سال کس قدر مالیہ بقایاجات کے طور پر موجود رہے۔ یہ ایک قابل فہم بات تھی کہ اگر کسی تحصیل میں چند دیہات کو غریب تصور کر کے مالیہ ادا کرنے کے ناقابل قرار دے دیا جائے تو ہر تحصیلدار چند دیہات کو اس فہرست میں شامل کر دیتا۔ مگر جب میں نے دیہات کے معائنے کا کام شروع کیا تو جلدی ہی میں نے دیکھا کہ جن دیہات کو سدھارنے کے لیے مشکل قرار دیا گیا تھا وہ بھی ان دیہات سے بہتر حالت میں تھے جنھیں اس فہرست میں شامل نہیں کیا گیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ بقایاجات کا یہ تمام تر طریقہ کار دیہات کے سربراہوں اور افسروں کے مابین ایک سازش تھی تاکہ حکومت سے دھوکہ اور فریب سے کام لیا جائے۔ یہ فریب نہایت سیدھا سادہ معاملہ تھا۔ ایک دیہاتی کو مالیہ کے طور پر 1000 روپے ادا کرنا ہوتے ہیں اور اس بات کے تمام امکانات موجود تھے کہ وہ آسانی سے یہ رقم ادا کر سکتا تھا مگر حل مشکل کی سند حاصل کرنے کے بعد وہ ہرگز 700 روپے سے زائد ادا نہیں کرتا۔ اس میں سے 150 روپے اہلکاروں کے پاس چلے جاتے، 50 روپے گاؤں کا سربراہ اور پٹواری آپس میں بانٹ لیتے اور باقی ماندہ 100 روپیہ کاشتکار باہمی طور تقسیم کر لیتے۔ 300 روپے کی رقم کا اندراج بقایا کے طور پر کیا جاتا اور اہلکار اس بات کو بخوبی سمجھتے تھے کہ یہ بقایاجات کبھی وصول نہیں کیے جائیں گے۔ اس صورت میں یہ امر ظاہر ہوگا کہ اس میں سودہ بازی تھی اور کاشتکاروں کو راہزنی کا شریک بننے دیا جاتا مگر اکثر اوقات دیہاتیوں سے مالیہ جمع کر لیا جاتا اور تین 300 روپے کی جو رقم اہلکار بقایا کی صورت میں درج کرتے وہ اہلکاروں کے مابین تقسیم ہو جاتی اور شاید گاؤں کے سربراہ اور پٹواری کو بھی ایک حقیر سا تحفہ اس سے مل جاتا۔

ہر ایک گاؤں میں مالیہ کے بھاری بقایاجات ہیں جن کا بیشتر حصہ قطعی طور پر فرضی ہے۔ 1877-79 کی قحط سالی نے قدرتی طور پر بھاری بقایاجات چھوڑ دیئے جنھیں نہ تو وصول کیا گیا اور

نہ ہی وصول کیا جانا چاہیے تھا۔ اس کے بعد 1882 کی نیلامی کا مرحلہ آگیا جس کے تحت مالیہ کا انتظام ان لوگوں کے ہاتھوں میں چلا گیا جو محض سٹے باز تھے اور کھیتوں سے وصول کردہ مالیہ سے جس رقم کی انھوں نے بولی دی تھی اُن کا وہ رقم ادا کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ جس ایزادی رقم کی ان لوگوں نے پیشکش کی تھی انھوں نے کبھی ادا نہیں کی حالانکہ اسے مطلوبہ تصور کیا گیا تھا اور ایسے ایمانداری کے ساتھ گاؤں کے بقا کے طور پر درج کیا گیا تھا۔

میں نے اپنی رپورٹوں میں ظاہر کیا ہے کہ کس طرح بقایا جات کی رقم میں اُچھال آتا رہا ہے اور اس بارے میں دیہاتیوں سے انصاف کی طلب ہرگز ممکن نہیں تھی۔ ہمیشہ تشخیص شدہ علاقے سے عوامی مقاصد یا اہلکاروں کے نجی مقاصد کے لیے زمین حاصل کی گئی مگر اس حساب میں کوئی مالیہ ادا نہیں کیا گیا۔ مالیہ کی جو رقم جنس کی صورت میں جمع کی جاتی تھیں وہ ہمیشہ افرادی خدمات کے لیے دے دی جاتیں اور ان کا دیہات کے ساتھ کسی قسم کا واسطہ نہیں ہوتا اور ان لوگوں کی طرف سے جو رقومات وصول ہوتیں انھیں دیہات کے کھاتے میں بقایا جات کے طور پر دکھایا جاتا حالانکہ بے چارے دیہاتیوں نے مالیہ کی رقم پورے طور پر ادا کر دی ہوتی۔ تشخیصی رپورٹوں میں بہت ساری ایسی مثالوں پر توجہ دی گئی ہے اور دربار نے عوام کے اس شوروغل پر کوئی کارروائی نہیں کی کہ اہلکاروں اور دیہاتیوں کے مابین ملی بھگت تھی اور یہ بقایا جات حکومت کے سوائے کسی کا کوئی نقصان نہیں کریں گے۔ مالی اعتبار سے یہ طریقہ کار جس قدر تباہ کن تھا اسی قدر یہ عوام کو راشی بنانے میں ممد ثابت ہوتا۔ ایک ایسا ایماندار گاؤں جس نے مالیہ کی مکمل طور پر ادائیگی کی ہوتی، جلدی ہی دل شکستہ ہو جاتا کیونکہ اس نے اپنے ہمسایوں کو سقیم الحل میں شامل ہوتے دیکھا کیونکہ مالیہ ذمہ داریوں کے کٹھن اور راست طریقے کی افسروں نے قطعی طور پر حوصلہ افزائی نہیں کی، اگر کوئی گاؤں ڈٹا رہا اور اس نے اس سازش میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تو اہلکار اسے فوراً اپنی غلطی اور حماقت کا احساس دلا دیتے۔ مگر ایسے گاؤں میں سیلاب یا خشک سالی یا کسی دیگر آفت کے سبب بقایا جات ہوتے تو مالیہ وصول کرتے وقت ان کے ساتھ قطعی طور پر کوئی رحم نہیں کیا جاتا۔

گرفتاری

گرفتاری کے نام تحصیلدار یہ فیصلہ کرتا کہ کس قدر رقم بقایا جات کے طور پر وصول کی جائے

اور اس اصولی میں گرفتاری کا جو دباؤ ڈالا جاتا وہ اس گاؤں کو تباہ کر کے رکھ دیتا۔ مختصر یہ ہے کہ جب کوئی مالی انتظامیہ کے ماضی پر غور کرتا تو اسے اس بات پر تعجب ہوتا کہ اس قدر رشوت ستانی کے ماحول میں ایک گاؤں کیونکر ایماندار ہوسکتا ہے۔' چنانچہ مالیہ اراضی میں پیہم کمی واقع ہوئی اگر چہ اس مالیہ کو خزانۂ عامرہ میں جمع ہونا چاہیے تھا۔ اس بات کو یاد رکھنا چاہیے کہ یہ طریقہ کار اس قدر پیچیدہ تھا کہ دربار کے روبرو مالیہ میں کمی کی وجوہ بتانے کے لیے لمبا چوڑا بیان داغ دیا گیا جس میں اصل حقائق پر پردہ پوشی کی گئی تھی۔ پٹواری سے لے کر اوپر تک کوئی بھی اہلکار اس بات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ مالیہ اراضی میں کمی واقع ہوئی ہے۔ اس مقصد کے لیے جو زمین عوامی مقاصد کے لیے حاصل کی گئی تھی اسے بھی مالیاتی کاغذات میں دکھایا جاتا اور دربار کے حکم کے تحت مالیہ کو الگ کر دیا جاتا اور عطیہ دہندہ کی خدمات کو گاؤں کے ذمہ بقایا دکھایا جاتا۔ میں نے اچھنا گام کی اپنی تشخیص کی رپورٹ میں ہر ایک مہانور کی مثال پیش کی جس کے حسابات مالیہ دفتر دیوانی میں موجود ہے۔ مہانور کی تشخیص کے وقت میں نے دیکھا کہ 89-1880 کے برسوں کے لیے دفتر دیوانی میں 8139 روپے کا بل موجود تھا۔ یہاں کی سالانہ طلب 801 روپے تھی اور میں نے پٹواری کے حسابات میں دیکھا کہ مہانور نے 52 روپے سالانہ مالیہ سے زائد ادا کیے تھے۔ میرے استفسار کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ اس گاؤں کا قبضہ کاشت کار مال کے پاس تھا جس نے مالیہ کی مکمل رقم خزانے میں ادا کی تھی مگر اتنی اس نے خزانے سے مسدّا کے طور پر وصول کی تھی۔ یہ کسان بھی دیگر مالیہ کسانوں کی طرح مہانور پر 9 برس قبضہ کرنے کے بعد مالیہ سسٹم سے حذف ہو گیا۔

تاریخی نقطۂ نظر سے یہ امر باعث دلچسپی ہوگا کہ ان طور طریقوں کا ذکر کیا جائے جو اہلکاروں کی طرف سے حکومت کو فریب دینے کیلئے بروئے کار لائے جاتے تھے۔ مگر متذکرہ بدعنوانیوں کو اب ختم کر دیا گیا ہے اور انھیں اب کسی طور بحال نہیں کیا جاسکتا۔ میں اب دیگر بدعنوانیوں کا احاطہ کروں گا۔ حالانکہ ان بدعنوانیوں میں بہت کمی واقع ہوئی ہے گو کہ یہ ابھی تک موجود ہیں۔

اجناس کی صورت میں وصولی

سرینگر شہر 1,18,690 کی آبادی پر مشتمل ہے۔ اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ جب تک سرکاری نرخوں پر غلہ فراہم نہ کیا جائے تب تک لوگ زندہ نہیں رہ سکتے جو تادم تحریر بازاری نرخوں کا

نصف ہیں۔شہر کی آبادی کا زیادہ تر حصہ شال بافوں پر مشتمل ہے۔جن دنوں کشمیری شالوں کی بھاری طلب تھی۔ان دنوں حکومت کو ان سے بھاری رقم ادا ہوتی تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ رقم 6 لاکھ سے 7 لاکھ روپے سالانہ تھی۔ مالی نقطۂ نظر سے ان دنوں حکومت کو شال بافوں کے سستے نرخوں پر غلہ فراہم کرنے میں فائدہ تھا۔ یہ امر اس کے باوجود بھی قائم تھا کہ اجناس کی صورت میں مالیہ اراضی وصول کرنے کے طریقہ سے کاشت میں رخنہ اندازی ہوتی اور کشمیر میں زرعی ترقی میں رکاوٹیں پیدا ہو جاتیں۔سستے نرخوں پر غلے اور بے گار سے استثنیٰ کا یہ انجام ہوا کہ بھاری تعداد میں لوگوں نے زراعت پیشہ ترک کر دیا اور شال بافی کے کام کے لیے بھاری تعداد میں شہروں تک رجوع شروع کر دیا۔مگر 1870 میں صنعت شال کو ضرب کاری لگی کیونکہ جرمنی اور فرانس کے مابین جنگ بھڑک اٹھی تھی اور اب شال باف حکومت کے مالیات میں اپنا حصہ ادا نہیں کرتے۔اس کے باوجود بھی کہ اگر اجناس کی صورت میں مالیہ وصول کرنے کا سبب موجود نہیں رہا۔ پنڈت اور دیگر بارسوخ افراد دربار پر اس امر کا دباؤ ڈال رہے ہیں کہ سابقہ طریقۂ کار کو برقرار رکھا جائے او رابھی تک حکومت نے 1,30,000 (4) افراد کو ارزاں شرحوں پر اناج فراہم کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہے(5)۔اس سوال پر میں کسی دوسرے باب میں بحث کروں گا اور یہاں فقط اس سسٹم کے اثرات زیر بحث لاؤں گا اور جنس کی صورت میں غلہ دینے پر کاشتکار اور اہلکارانِ مال دونوں کا نقطۂ نظر پیش کروں گا۔ بہت سارے حکام کی یہ رائے ہے کہ مشرقی حکومتوں کی طرف سے غلے کا اپنا حصہ وصول کرنے کے سابقہ طریقۂ کار میں لچکدار ہونے کا وصف موجود تھا۔نیک اور بد دونوں وجوہات کا باعث اس میں حکومت اور عوام دونوں کا یکساں نقصان ہوتا تھا۔مگر کشمیر میں اس قسم کی کوئی لچک موجود نہیں رہی کیونکہ موسم کی گونا گونیت کو ملحوظ خاطر رکھے بغیر مطالبہ مالیہ کا تعین کیا جاتا مگر ہندوستان میں مروّجہ مالیہ کی نقد ادائیگی کے بجائے کشمیری جزوی طور پر نقدی اور جزوی طور پر جنس کی صورت میں مالیہ کی ادائیگی کرتے اور یہ حاکم اعلیٰ کی مرضی پر منحصر تھا کہ سال بہ سال کس قدر غلہ جنس کی صورت میں وصول کیا جائے اور یہ بھی کہ آیا حکومت عوام الناس سے کلیدی اجناس یا کپاس، تلہن اور دالوں کی صورت میں مالیہ وصول کرے گی۔

میں نے اپنی طرف سے جس قدر ہو سکا ہے غبن کے امکانات کو ختم کرنے کی سعی کی ہے۔

جنس کی صورت میں مالیہ وصول کرنے کی طلب کو محض شالی اور مکئی تک محدود رکھا ہے اور بھاری تعداد میں مالیہ نقدی صورت میں وصول کرنے پر زور دیا ہے۔ میری رائے میں نقدی کی صورت میں مالیہ کی وصولیابی ہی منصفانہ ہوگی مگر دربار کو شہری عوام کے علاوہ کاشتکاروں کے مفادات کو بھی ذہن میں رکھنا ہوتا ہے۔ چنانچہ 1892 میں مجھ سے کہا گیا کہ میں 35,00,000 خروار شالی اور مکئی کی وصولیابی کروں تاکہ شہری عوام کو غلہ فراہم ہو سکے۔ اگرچہ میرے خیال میں مالیہ کا اس قدر حصہ جنس کی صورت میں وصول کرنا ایک غلطی ہے مگر میں شہروں کی لاچاری کو بھی تسلیم کرتا ہوں جس کی وجہ سے نجی مہم کاری، تجارت کی پسماندگی اور حکومت کے پاس اس امر کا فیصلہ لینے کیلئے ایک واجب جواز موجود ہے۔ حکومت کی طرف سے غلے کی صورت میں مالیہ وصول کرنے پر مجھے سب سے اہم یہ اعتراض ہے کہ اس سے غبن کے بے شمار مواقع فراہم ہوتے ہیں اور نقدی کی صورت میں غلہ وصول کرنے سے غیر قانونی اور جبری وصولی کی پیش بندی کی جا سکتی ہے۔ کاغذات بندوبست سے اس بات کا تعین ممکن ہو سکا ہے کہ ہر ایک کھیت سے حکومت کو کس قدر غلہ کی وصولیابی ہو اور مالیہ اراضی کی چاروں قسطوں کی صورت میں نقدی اور جنس دونوں صورتوں میں ادائیگی کے دستاویزات کاشتکار کے پاس موجود ہیں مگر چالاک ترازو دار میزان کے ایک ہی جھٹکے سے اس وزن میں خاطر خواہ اضافہ کر سکتا ہے اگر کوئی ادنیٰ قسم کے غلے کا نمونہ حکومت کو تھما دیا جائے تو اہلکاروں کو راضی کرنا پڑتا ہے۔ جب شالی اور مکئی کی وصولیابی کا وقت آتا ہے کاشتکار کو اس کا انبار اس قدر بڑا معلوم ہوتا ہے کہ سال بھر کے لیے اس کے پاس کافی غلہ ہوگا اور مٹھی بھر اہلکاروں اور ان کے حواریوں کے ساتھ حسد کرنا ایک بدتمیزی ہوگی مگر بہت سارے لوگ مالیہ دہندہ کو اس بات کے لیے بدگمانی پیدا کر دیں گے حالانکہ اس نے حکومت کو 15 ترک شالی یا مکئی دینی ہے مگر اس نے 17 ترک دے دی ہے چنانچہ وہ میرے پاس شکایت لے کر آتا ہے۔ میں نے ترازو کو ہٹا کر غلے کے پیمانے مروّج کرنے کی کوشش کی ہے مگر اس میں دقت یہ ہے کہ شالی اور مکئی کے مختلف اقسام وزن اور ہیئت کے معاملے میں مختلف ہوتی ہیں اور میری رائے میں جب تک حکومت کسی قسم کا مالیہ جنس کی صورت میں وصول کرتی ہے تب تک غبن کا سلسلہ قائم رہے گا اور اس بات کو ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے کہ ایک مرتبہ جب غبن کے مختلف طور طریقوں کو ختم کر دیا جائے تو یہ بات قدرتی

ہے کہ تب تک اہلکار ایک ہی پہلو کی طرف اپنی توجہ دیں گے کہ پیسہ کس طرح کمایا جائے اور اب تک یہی طریقہ باقی ہے چنانچہ جنس کی صورت میں مالیہ کی وصولی سے یہ موقع حاصل ہوتا رہے گا۔

بیگار

مجوزہ طریقے کے تحت اہلکاروں کو جو اختیارات حاصل تھے ان کی رو سے وہ ایک دیہاتی کو اس سے سال بھر کے لیے غلّے کے ذخیرے سے محروم کر سکتے تھے۔ مگر جبری مزدوری یعنی بیگار سے بڑھ کر ان کے پاس کوئی دوسرا اختیار نہیں تھا۔ ایک انسان اپنے غلّے کو خفیہ گڑھوں میں پوشیدہ تو رکھ سکتا تھا تا کہ جب تک پھل اور سبزیاں آ جائیں تب تک وہ اپنے آپ کو اور اپنے بچوں کو زندہ رکھ سکے۔ مگر جب بار برداری کے لیے انسانوں کی تلاش میں اہلکار نکل پڑے تو اسے خود کو چھپانا ناممکن ہو جاتا مگر کشمیر کی جبری بھرتی کرنے والے دیہاتی پناہ لینے کے لیے پہاڑوں کی طرف بھاگ جاتے کشمیریوں کے لیے بیگار کا مطلب جبری مزدوری سے زیادہ ہے کیونکہ بیگار کی آڑ میں نہ صرف اہلکار جبری طور پر مزدوری بلکہ جائیداد بھی لے جاتے اور اس کی قیمت ادا نہ کرتے۔ پہلے میں بیگار کے اس پہلو کا محاسبہ کروں گا جس کا تعلق مزدوری کے ساتھ ہے۔

یہ ایک بدقسمتی کی بات ہے کہ کشمیر میں مزدوری کے لیے کوئی مخصوص طبقہ موجود نہیں ہے۔ زمین کی مکمل کاشت کے لیے زراعت پیشہ آبادی بھی کافی نہیں اور اس سے اہم فصل یعنی چاول کا اس قدر نقصان ہوتا ہے کیونکہ کاشتکاروں کو کافی عرصے تک اپنے دیہات سے دور رکھا جاتا ہے۔ محنت کش طبقہ انتظامیہ کے دیگر شعبوں کے ماتحت ہوتا ہے جن کا قیام کافی عرصہ پہلے شہر میں کیا گیا تھا اور روایت یہ رہی ہے کہ سرینگر کے عوام کو بیگار سے مستثنیٰ قرار دیا جائے اور اس سلسلے میں تمام تر ضروریات کو دیہاتیوں کے کندھے پر ڈال دیا جائے اور اس قسم کے مزدور طبقے کے لیے کوئی فالتو وقت نہیں ہوتا۔ جن دوسرے طبقوں کو اس بیگار سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے ان میں پنڈت، سکھ اور پیرزادہ اور گوجر شامل ہیں اور جو کاشتکار اہلکاروں کے ادا کردہ جاگیروں میں کام کرتے ہیں اور دیگر افراد پکڑے جانے کے خوف وخطر کے بغیر کام کرتے ہیں۔ ان سے استثنیٰ کے نتیجے کے طور پر 8,14,241 کی کل آبادی سے 52216 افراد اس لیے آزاد ہیں کیونکہ وہ ہندو ہیں۔ 4,092 سکھوں کے علاوہ 1,14,477 افراد مسلمان اس لیے بیگار سے مبرا ہیں کیونکہ وہ شہروں اور

قصبات میں سکونت پذیر ہیں۔ پیرزادہ طبقے کی مجھے صحیح تعداد معلوم نہیں مگر جو مسلمان مراعات شدہ مالکان اراضی اور جاگیرداروں کے زمرے میں کاشت کرتے ہیں' ان کی آبادی 24,834 ہے۔ حکومت نے ان سبھی کو بیگار سے مستثنٰی قرار دیا ہے۔ اگر اس کا کم سے کم حساب لگایا جائے تو میرے خیال میں 8,14,214 افراد کی کل آبادی سے قاعدے کے مطابق 3,50,000 لاکھ افراد کو مستثنٰی قرار دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ 50,000 پر بیگار کی معافی کی مہربانی کی گئی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ سخت ترین بیگار کا بوجھ باقی ماندہ 4,14,941 افراد کے کندھوں پر آپڑتا ہے یا اگر عورتوں اور بچوں کی تعداد کو نفی کر دیا جائے تو وادی کے 1,48,080 مرد وادی بھر میں تمام تر باربرداری کے کام کے لیے کسی دقت یا دشواری کے بغیر کافی ہوں گے۔ شرط یہ ہے کہ بےگار حاصل کرنے کے جو انتظامات کیے جائیں وہ دیانت دارانہ اور منصفانہ ہوں۔ بعض اہلکاروں نے بیگار کے اس طریقۂ کار کو اپنی جیبیں بھرنے کا ایک خاص ذریعہ تصور کیا ہے۔ اس بدعت کے ناجائز استعمال کے جابرانہ اور راشی چلن نے کشمیر کو اور کسی دیگر معاملے کی نسبت زیادہ تباہ کیا ہے۔ میں اکثر اس وقت ایسے دیہات میں موجود ہوتا ہوں جہاں باربرداری کے لیے ضرورت سے آگاہ کیا جاتا ہے مندرجہ ذیل تفاصیل سے پورے طور پر عیاں ہو جائے گا کہ ہر روز وہاں پر کیا رونما ہوتا تھا۔ سرینگر میں کسی شخص کو ایک سے دوسرے مرحلے تک یا اس سے زیادہ اپنے سامان کی باربرداری کے لیے دس قلی درکار ہیں۔ جس افسر کو یہ ضرورت بتائی جاتی ہے وہ اس امر کی اطلاع ضلع افسر کو دیتا ہے۔ اس معاملے میں کسی قسم کی کمی پیش نہ آئے چنانچہ وہ قلیوں کو مراسلہ تحریر کرتا ہے۔ اسی قسم کا حساب لگا کر ضلع افسر تحصیلدار کو لکھتا ہے کہ 40 افراد درکار ہیں۔ اس کے بعد تحصیلدار گاؤں سے 80 قلی پکڑ لیتا ہے۔ یہ تمام تر 80 افراد شاید اپنے گاؤں میں چاول کے کھیتوں سے گھاس نکالنے اور ان کی نگہداشت میں جتے ہوتے ہیں اور انھیں یہ بھی معلوم نھیں ہوتا کہ انہیں کب تک سرینگر میں رکھا جائے گا اور انھیں اس دوران اسی بات کا خوف رہتا ہے کہ ان کی غیر حاضری میں کھیت خشک ہو کر رہ جائیں گے اور گھاس پھوس کے انبار سے ڈھک جائیں گے۔ انہیں چار آنے یومیہ مزدوری کا بھی لالچ نہیں ہوتا خواہ انہیں حاصل ہو یا نہ ہو۔ اگر اس کام پر مامور کوئی چالاک شخص ہو تو سودے بازی شروع ہو جاتی ہے تو وہ 77 دیہاتیوں سے 74 آنے وصول کرے گا اور اس کے باوجود بھی وہ

ان میں سے 10 افراد کو سرینگر روانہ کردے گا۔ آبادی کے تناسب سے بیگار کی تقسیم کے معاملے میں کبھی کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے اور نہ ہی یہ بیگار مختلف دیہات سے باری باری لی جاتی ہے اور بدقسمتی سے جو دیہات شہر کے قریب آباد ہیں یا جو خط مواصلات کے ساتھ رہتے ہیں انھیں ہر روز پریشان کیا جاتا ہے اور لمبے دور افتادہ دیہات جہاں کے باشندے اس خبر کے ملنے پر پہاڑوں میں فرار ہو سکتے ہیں کہ قلیوں کی ضرورت ہے، مقابلتاً اچھا وقت گذارتے تھے۔ میں نے جو مثال یہاں پر پیش کی ہے اس کا تعلق ایک یورپی سیاح کی طرف سے پیش کردہ ایک معمولی مطالبے کے ساتھ تھا اور اس معاملے میں چار آنے یومیہ کی مزدوری کو بلا حیل وحجت ادا کیا گیا مگر جب سرکاری کام کے لیے قلیوں کا مطالبہ ہوتا ہے تو کسی قسم کی مزدوری ادا نہیں کی جاتی۔ مہاراجہ نے جن اصلاحات کو عمل میں لایا ہے میری نظر میں شاید گلگت سڑک کی تعمیر اہم ترین حیثیت رکھتی ہے۔ ایک کشمیری کے لئے گلگت ایک مسلسل دہشت ہے اور جب یہ افواہ پھیل گئی کہ گلگت تک آنے جانے والی فوجوں کے ساز و سامان کی نقل وحرکت کے لیے بار برداری کی ضرورت ہے تو دیہات میں عام بھگدڑ مچ گئی۔ افراد جمع کرنے کے لیے تحصیل کے ایجنٹ وارد ہوئے۔ میں نے سارے کے سارے دیہاتوں کو پہاڑوں پر پناہ لیتے ہوئے دیکھا ہے اور میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ جن لوگوں نے اپنے گھروں کو دو یا تین ماہ کے لئے چھوڑنے میں حیل حجت کی انہیں سردی سے موت یا بھوکے مارنے کی انسانیت سوز سزا دی گئی۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ برفانی ہوائیں لگنے سے دیہاتی اپاہج ہو گئے یا سردی لگ جانے کے سبب مفلوج ہو کر رہ گئے اور اس بات میں کوئی حیرت نہیں کہ کشمیری گلگت (6) کے نام سے ہی سخت نفرت کرتے تھے۔ یہاں پر اس بات کا اضافہ کرنا ہوگا کہ ایک سہل مرحلے تک سامان کی بار برداری سے بچنے کیلئے اگر کوئی شخص چار آنے دیتا تو گلگت تک سفر سے خود کو بچانے کیلئے وہ اور بھی زیادہ رقم ادا کرنے پر راضی ہو جاتا۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ جب سے میں کشمیر میں موجود ہوں، مجھے معلوم ہے کہ اس معاملے میں اپنی معافی کی قیمت ادا کرنے کیلئے دیہاتیوں نے 90-70 روپے فی کس ادا کیے ہیں۔ گلگت سڑک کی تعمیر سے اب ٹٹوؤں اور خچروں کے ساتھ سفر کیا جاسکتا ہے اور اس سے گلگت کا خوف اب ختم ہو گیا ہے اور افسروں کو رشوت دینے کی ضرورت بھی اب نہیں رہی مگر جب تک وادی کے اندر اچھی سڑکوں کی

تعمیر نہیں ہو جاتی اور شہر میں بے کار بیٹھے رہنے کی وبا قائم ہے تب تک مزدور طبقے کا وجود رہے گا اور کسی نہ کسی صورت میں بیگار کا سلسلہ بھی چلتا رہے گا۔ ''ایماندار مزدور کا چہرہ بھی خوبصورت ہوتا ہے''۔ یہ مقولہ کشمیر پر صادق نہیں آتا ہے اور قطع نظر اس بات کے کہ بار برداری نہ ہی نہایت کارآمد اور عزت بخش کام ہے۔ اگر اس بارے میں تمام باتوں کو ملحوظ خاطر رکھا جائے گا کہ اس معاملے میں عوام میں بیزاری کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ نہایت سازگار حالات میں بھی چار آنے یومیہ کی مزدوری کسی طور پر کشش نہیں ہے خاص طور پر اس بات کے پیش نظر کہ قلی کو شاید ایک طویل فاصلے کے لیے ایک یا دو دن قبل بلایا جاتا ہے اور ایک دن کا مرحلہ طے کرنے کے بعد اسے واپس اپنے گاؤں پہنچنا ہوتا ہے جہاں پر اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ہمسایے نے اس کا پانی کاٹ دیا ہوتا ہے اور اس کے چاول یا مکئی کے کھیتوں میں کسی اجنبی کے مویشی چر رہے ہوتے ہیں۔

بیگار کا دوسرا پہلو بھی دیہاتیوں کے لیے دقت آمیز رہا ہے مگر اس کو ختم کرنا بھی سہل تر ہے۔ یہ طریقہ اہلکاروں کی طرف سے گاؤں کی پیداوار کو ڈھونے کا کام انجام دینے کے لیے افراد کے مطالبے پر مشتمل ہے۔ اس طریقہ کار کے مطابق اہلکار لکڑی، گھاس، دودھ، مرغیاں اور غلہ کمبل اور کبھی کبھار ٹٹو اور بھیڑ وغیرہ بلا قیمت وصول کرتے ہیں اور اعلیٰ افسر اس قسم کی بلا اجرت دیہی مزدوری کے ذریعے شہر میں اپنے مکانوں کی تعمیر عمل میں لاتے ہیں یا اپنی بنجر زمینوں کی کاشت کراتے ہیں۔ جب میں نے کشمیر میں اپنا کام شروع کیا تو اس قسم کی بے گار کی بہت ساری مثالیں میری دانست میں آئیں۔ میں نے ایک معاملے میں دیکھا کہ ان دیہات میں فروخت کیا گیا ایک گاؤں ایک نہایت معمولی رقم کے عوض حاکم اعلیٰ کو جا چکا ہے۔ یعنی چالیس روپے فی گاؤں کی قیمت ادا کی گئی تھی۔ اس معاملے میں استفسارات کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ دیہاتیوں کو اپنی زمین پر ایک تحریری حکم نامے کے ذریعے انھیں تمام قسم کی بیگار سے مستثنیٰ قرار دیا تھا۔ ان دیہاتیوں کی خوش حالی اور کاشتکاروں کی زبوں حالی کو دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے اس غیر قانونی سودے سے کافی دولت جمع کی ہے۔ اس قسم کی برائے نام قیمت پر بہت سارے دیگر دیہات فروخت کر دیے گئے۔ اس معاملے کے پس پردہ اصل تصویر یہ تھی کہ ان دیہاتیوں کو بیگار سے مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا۔ اس معاملے میں تحصیلدار نے ایک شاندار گاؤں 130 روپے کے عوض خرید اگر

اس نے اس رقم کی ادائیگی بھی نہیں کی بلکہ دیہاتیوں کو 130 روپے کا مالیہ معاف کیااور اس کا اندراج بقائے کی صورت میں کر دیا۔اب اس رقم کے لین دین کومنسوخ کر دیا گیا ہے مگر اس سے ایک بات ظاہر ہوتی ہے کہ اس ملک پر بیگار سسٹم کا بھاری اثر ورسوخ تھا اسی طرح جو اہلکار مراعاتی شرطوں کے طور پر بنجر زمین حاصل کرتے اور ان علاقوں سے کاشت کاروں کو راغب کر لیتے جہاں پر بیگار سسٹم اپنے پورے شدومد کے ساتھ موجود تھا اور ایک چکدار کو زرعی مزدوری حاصل کرنے کے معاملے میں قطعی طور پر کوئی دشواری پیش نہ آتی تھی کیوں کہ یہ لوگ براہ راست اس شخص کے ماتحت ہو جاتے اور انھیں اس جبری مزدوری سے معافی حاصل ہو جاتی۔بنجر اراضیات عطا کرنے میں حکومت کا منشا یہ تھا کہ پیداوار میں اضافہ ہو مگر اہلکاروں نے اس مقصد کو ناکارہ بنا کر رکھ دیا۔ہر شخص اپنے گاؤں سے مزدوروں کو چکداری کی جاگیر میں کام کرنے کیلئے آدمی لے گیا جہاں سے مالیہ حاصل ہوتا ہے اس کا سیدھا مطلب اس گاؤں کی کاشت میں کمی واقع ہونا اور حکومت کو مالیہ کا نقصان تھا۔مختصراً جس شخص سے بیگار لی جاتی وہ ایک غیر قانونی شخص تھا جسے کسی قسم کے حقوق حاصل نہیں تھے اور بیگار کو اہلکار ایک زرعی غلامی کا معاملہ تصور کرتے تھے جس سے انھیں یہ حق حاصل تھا کہ وہ دیہاتیوں سے بلا اُجرت مزدوری یا بلا قیمت تمام قسم کی اشیا حاصل کر لیں اس قسم کے طریقۂ کار نے لوگوں میں زبردست بددلی پیدا کر دی اور ماضی میں جو دیہات خاص قسم کے چاول یا پھلوں کیلئے مشہور تھے۔وہ افسروں کی مسلسل چھینا جھپٹی سے بچنے کیلئے عام قسم کے چاول پیدا کرنے لگے اور انھوں نے اپنے پھلوں کے درخت کاٹ ڈالے۔

رسوم

نظام مال کی طرف سے تسلیم شدہ طریقوں کے تحت فراہم کردہ غبن کے طور طریقوں کے علاوہ افسروں کو وہ شرائط اوّل حاصل تھیں جو رسوم کے نام پر معروف تھیں۔پٹواری ان شرائط اوّل کی فہرست رکھتا تھا اور جب اُسے اپنا مقصد پانا ہوتا تو وہ یہ فہرست مجھے دکھاتا۔ایک گاؤں سے جو سال بھر شرائط اوّل وصول کی جاتیں میں یہاں پر ان کی ایک سرسری فہرست پیش کرتا ہوں:

مدات	روپے	آنے	پائی
خریف اور ربیع فصلوں کا نصف حصہ	500	00	00

اخروٹ کے درختوں کی مد	63	12	00
سبزیوں کی کاشت کے تحت رقبوں پر	138	12	00
شال بافوں کی طرف سے یکمشت ادائیگی			
پنڈت کی طرف سے اصل تشخیص پر ادا کردہ واجب الادا پیشگی رقم ۔ اگر پنڈت یہ ادائیگی کرنے میں معذور ہوئے تو حکومت گاؤں پر پیشگی ادائیگی ایزاد بولی پر دیتی	300	12	00
جنگلی پیداوار کی مد	7	00	00
گھاس اور دیہی افسروں کی	9	00	00

ان مدوں کو مستقل تصور کیا جاتا اور انھیں کول کہا جاتا ہے مگر 1883 ان کے علاوہ مندرجہ ذیل اضافی ٹیکس عائد کیے۔

مدات	روپے	آنے	پائی
2 فیصد ٹیکس (2 خروار)	18	13	00
سالا ، جلوس (سالا ٹیکس سنسکرت اسکولوں اور جلوس انگریز سیاحوں سے وصول کیا جاتا ہے)	18	13	00
قانون گو ٹیکس	3	14	00
پٹواری ٹیکس	3	14	00
مہاراجہ کے مندر کے موجب ٹیکس	2	8	00
خدمت گار	2	4	00
عملے پر ٹیکس	77	3	00
چکدار کو عطیہ دی گئی زمین پر ٹیکس ۔ چکدار خود کاشت نہیں کرتا تھا اور دیہاتیوں کو چکدار کی زمین کا ٹیکس ادا کرنے کے لیے کہا جاتا۔	57	9	00

خوبانی کے درختوں پر ٹیکس (اس بات پر توجہ دینا لازمی ہے کہ یہاں پر خوبانی کے درخت نہیں پائے جاتے)	10	5	00
متفرقہ ٹیکس: 1-حکومت کی طرف سے ضبط کیے گئے ٹٹوؤں پر نقصان جو بازاری قیمت سے کم ادا ہوتی ہے۔2-نذرانہ 3-مندروں کی امداد کی لیے ٹیکس۔4-شاہی گھرانے میں شادی کے موقعہ پر ٹیکس۔5-شفاخانے کے لیے ٹیکس۔	99	00	00
میزان	*293*	*14*	*00*

مالیہ کے علاوہ سال بھر میں جو شرائط اوّل (رسوم) وصول کی جاتی ہیں ان کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

تحصیلدار	12	00	00
تحصیلدار کا معاون	8	00	00
نائب تحصیلدار	8	00	00
نائب تحصیلدار کا معاون	5	00	00
پرچہ نویس	5	00	00
میر چودھری	13	00	00
احد گنائی، میر چودھری کا معاون	11	00	00
میر ضلع دار	5	00	00
ضلع دار	10	00	00
رسد طالبہ	25	00	00
وصول شدہ کمبل ایک کمبل کی قیمت 20روپے تھی مگر اہلکار کمبل 6روپے میں وصول کرتے تھے	4	00	00

00	00	22	ٹٹو (ٹٹو کی قیمت 40 روپے تھی مگر اہلکار 18 روپے ادا کرتے تھے)
00	00	5	ایک خروار کپاس ادا کرنے کے لیے اجازت طلب کرنے کی حد
00	00	12	وصول کردہ گھی
00	00	6	وصول کردہ بھیڑ
00	00	4	بنفشے زیرہ اور گچھیاں
00	00	21	چوبِ کوٹ
00	00	12	اُون
00	00	8	گھاس
00	00	9	ضلع دار کی طرف سے وصول کردہ فصل کا حصہ
00	00	7	میر چودھری کی طرف سے وصول کردہ فصل کا حصہ
00	00	7	پٹواری اور نمبردار کی طرف سے وصول کردہ فصل کا حصہ
00	00	6	پولیس کی طرف سے وصول کردہ مد
00	00	7	تحصیل عملہ
00	00	10	واصل باقی نویس
00	00	3	سیاہ نویس
00	00	2	تحصیل خزانچی
00	00	5	تحصیل قانون گو

افسروں کیلئے 20 مرغوں کی قیمت	5	00	00
تحصیلدار کا جرمانہ جو سرکاری خزانے میں نہیں جاتا	10	00	00
متفرقات	4	00	00
میزان	*270*	*00*	*00*

جب کوئی شخص اس بات پر غور کرتا ہے کہ ہر تحصیل میں اوسطاً ایک سو پچاس سے دو سو دیہات ہیں اور دیکھا جائے گا کہ ان کے ماتحت لوگ شرائط اوّل سے کس قدر عالی شان زندگی بسر کرتے ہیں چنانچہ یہ بات حیران کن ہے کہ انھوں نے کبھی اپنی قلیل تنخواہ کا شکوہ نہیں کیا اور نہ ہی کبھی انھیں اس بات کی پرواہ ہوئی کہ ان کی تنخواہ زیادہ تر بقایا رہتی تھی۔

محصولات کی دیگر اقسام

رسوم کے عنوان کے تحت چند ایسی مدیں ہیں جن پر توجہ دینے کی ضرورت ہے اور جو محصولات کے قدیم طریقۂ کار پر روشنی ڈالتے ہیں۔ بہت سارے مصنّفین نے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ وادی میں ہر شئے محصولات کے دائرے میں لائی گئی ہے معمول کا طریقہ تو یہ تھا کہ ہر پیداوار پر سرکاری اجارہ داری قائم کر دی گئی تھی۔ ریشم، زعفران، چوب کوٹ، بنفشے، بھنگ، تمباکو، آبی گریاں اور کاغذ مختلف عہدوں میں حکومتی اجارہ داری کی مدیں ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ گورکن کے عہدے پر بھی محصول عائد کیا جاتا۔ طوائفوں پر بھی ٹیکس عائد کیے جاتے تھے اور تفصیلات میں جائے بغیر کہا جا سکتا ہے کہ ہوا کے سوا ہر شئے پر ٹیکس عائد تھا۔

کھیت

کھیتوں کو ٹھیکیداروں کے حوالے کر دینے کا طریقۂ کار عوام ہی کے لیے نہیں بلکہ حکومت کے لیے بھی اچھا نہیں تھا کیونکہ کشمیری عوام الناس محض ایک تنکے کی حیثیت رکھتے ہیں اور ایک چھوٹا سا کھیت حاصل کرنے سے قبل انھیں افسروں کو بھاری رشوت ادا کرنا پڑتی تھی اور جب انھیں سرکاری واجبات ادا کرنے کے لیے کہا جاتا تو ہمیشہ بقایا دار رہ جاتے۔ یہ بات حکومت کے لیے نقصان دہ تھی اور اس بات کا اندازہ بھی ہونا چاہیے کہ یہ امر عوام کے لیے بھی اسی قدر ضرر رساں

ہوگا۔ٹھیکیدار (7) کو ان پر بہت کم رحم آتا جب وہ اس کھیت سے اشیا جمع کرنے کے لیے آتے جنھیں انھوں نے ہی خود خریدا تھا۔ رسوم میں جن مدات کی فہرست ہے ان میں بنفشہ اور چوب کوٹ بھی شامل ہیں ایک ٹھیکیدار ان تمام اشیا کی خرید کے حقوق حاصل کرنے کے لیے کچھ رقم خرچ کرسکتا ہے۔اس معاملے میں تحریری حکم حاصل کرنے کے بعد وہ بنفشے کا ٹھیکیدار ہے وہ چند تنومند بار برداروں کو جمع کرے گا اور حکومت کی خاطر انھیں بنفشہ جمع کرنے کی ذمہ داری تفویض کرے گا۔بنفشے کے موقعے پر دیہاتی اپنے کھیتوں میں ہوتے ہیں اور ان میں پھول جمع کرنے کا بہت کم رجحان ہوتا ہے ٹھیکیدار کا آدمی تب تک انتظار کرے گا جب تک بنفشے بکھر جاتے ہیں اور اس کے بعد ان کا وزن گاؤں میں تیار کیے گئے بنفشوں سے دوگنا ہو جاتا ہے۔کافی تگ ودو کے بعد ٹھیکیدار کے کارندوں سے کسی بھی قیمت پر نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ایک شخص اس گاؤں میں مفت خوری میں دن گذارتا ہے اور دیہاتیوں کو یکمشت نقد ادائیگی کرنا ہوتی ہے۔تمام عملی زاویوں سے یہ امر یکساں طور پر ٹھیکیدار کے لیے آسائش کن ہے کہ اس نے تتلیوں کا کھیل حاصل کرلیا ہے۔وہ بنفشے نہیں چاہتا جو بہت سارے دیہات میں پیدا نہیں ہوتے۔اگر وہ دیہاتی اسے کوئی رقم ادا نہیں کرتا وہ اس کی قطعی پرواہ نہیں کرتا۔اس قسم کے کی محصولات کی کئی مثالیں روبرو آتی ہیں۔ گاؤں کے واتلوں پر ٹیکس عائد تھا اسی طرح مویشیوں کی کھالوں پر سالانہ ٹیکس عائد کیا جاتا تھا اور ان کے لیے راستہ تلاش کرلیا جاتا تھا۔ایک ایسے گاؤں میں جہاں پر میں خیمہ زن تھا ٹھیکیدار کے آدمی آدھمکے تاکہ اس گاؤں سے سالانہ محصول وصول کرسکیں۔واتل میرے پاس آئے اور کہا کہ سال بھر کے دوران کسی بھی مویشی کی موت واقع نہیں ہوئی ہے چنانچہ وہ ٹھیکیدار کا تقاضا پورا نہیں کرسکتے۔آخر کار معاملہ نقد ادائیگی کے بعد طے ہوگیا۔میں نے پتہ لگایا کہ واتل میری لاعلمی کا فائدہ اٹھارہے ہیں' درحقیقت وہ ہمیشہ نقدی ادائیگی کرتے ہیں اور کبھی کھالیں شاذونادر ہی دیتے ہیں چوب کوٹ اور Saussurea کی خوشبودار جڑوں پر بھی ٹیکس اسی حساب سے عائد کیا جاتا تھا مگر اس پودے کی جڑ کو وسیع پیمانے پر اُکھاڑ کر اس کی اچھی خاصی منافع پر برآمد کی جاتی۔اس ٹیکس کی 'دائیگی غیر مساویانہ تھی اور ٹھیکیدار اکثر حکومت کا حصہ جنس کے بجائے نقدی کی صورت میں وصول کرتا۔یہ پودا بلند پہاڑوں پر اُگتا ہے اور بھاری مسافت طے کرنے بعد ہی دیہاتی اس

معاملے میں اپنا حصہ ادا کر پاتے تھے۔ ہر سال دادانی کی صورت میں ایک رقم دیہاتیوں کو پیشگی ادا کرنا مقصود ہوتی مگر ایسے لین دین میں جہاں نقدی کو بھاری دخل حاصل ہے یہ رقم کبھی کاشتکاروں تک نہیں پہنچتی۔ مثال کے طور پر اس سلسلے میں ایک تحصیل کو لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ 1889 کے دوران پھاک تحصیل کے دیہاتیوں نے اڑتالیس خروار چوب کوٹ فراہم کی انھیں 4 روپے فی خروار قرضہ حاصل ہوا۔ مگر بہت ساری صورتوں میں دیہاتیوں نے خود ان جڑوں کو نہیں نکالا بلکہ پہاڑی دیہاتیوں یا چرواہوں سے 6 روپے فی خروار شرح پر اس کی خرید کی۔ انھیں اس سودے میں صرف 96 روپے کا نقصان ہوا۔ اس کے علاوہ انھیں اسے سرکاری ڈیپو تک ڈھونا پڑتا۔ 1890 کے دوران پھاک تحصیل سے 141 خروار چوب کوٹ کا تقاضا ہوا اور موسم یا اس جڑ کو حاصل کرنے کے لیے دیہاتیوں کی قوت کے قطع نظر اس تقاضے کو تبدیل کرنے کا اختیار حاکم اعلیٰ کو ہی حاصل تھا۔

یہی طریقۂ کار بھوج پتر کے معاملے میں اپنایا جاتا ہے۔ مکانوں کی چھت ڈالنے کے لیے اسی چھلکے کی بھاری طلب رہتی۔ پھاک تحصیل سے حکومت 39-18 خروار بھوج پتر کا سالانہ تقاضہ کیا کرتی تھی۔ جو دیہاتی اُن پہاڑوں سے دور رہتے ہیں جہاں پر بھوج پتر کا درخت پیدا ہوتا ہے وہ یہ بھوج پتر 3.20 روپے فی خروار کے حساب سے خرید کرتے اور جب وہ اس چھلکے کو اٹھا کر سرینگر تک لے جاتے تو انھیں فقط دو روپے فی خروار حاصل ہوتے۔ سال 1889 کے دوران کسی قسم کی وجہ بیان کیے بغیر پھاک تحصیل کے دیہاتیوں سے 200 خروار بھوج پتر کا تقاضا کیا گیا۔ چوب کوٹ یا بھوج پتر کا تقاضا کرتے وقت کسی بھی مقامی حالات کو ملحوظ خاطر نہیں رکھا گیا۔ 1889 میں یہ تقاضا شادی پور گاؤں سے کیا گیا جو دریائے سندھ اور دریائے جہلم کے سنگم پر واقع ہے یہ بھوج پتر انھیں گلمرگ میں مہیا کرنا تھا۔ اس تقاضے کی تکمیل کے لیے شادی پور کے کاشت کار کئی دن کی مسافت کے بعد وادی سندھ تک جاتے اور پرانی روایت کے مطابق ایک تحصیل چند پہاڑوں تک ہی محدود ہوتی۔ بھوج پتر حاصل کرنے کے بعد انھیں شادی پور واپس آنا ہوتا تھا اور دو دن کی مسافت کے بعد اسے گلمرگ پہنچانا ہوتا تھا۔ میرے ذہن میں ہمیشہ یہ بات آتی ہے کہ بہت ساری صعوبتوں کا سبب عوام کو جسمانی اور مالی طور پر زیر بار کرنا ہوتا۔ حکومت کے ہر ملازم کا یہ

مقصد حیات معلوم ہوتا ہے کہ وہ محصول حاصل کرنے کی کسی نئی مد کو تلاش کرے۔ اس بات کو قطعاً فراموش کر دیا جاتا ہے کہ دیگر مقامات کی مانند کشمیر میں بھی محصولات کی چند مشکلات ہیں اور کشمیر میں جب کوئی اہلکار بنفشوں کے ذرائع تلاش کرنے میں مصروف تھا تو حکام نے اس امر کو نظر انداز کر دیا کہ جہاں انھیں بنفشوں سے 10 روپے کا فائدہ ہوتا وہاں اسے 10 روپے یا شاید 20 روپے مالیہ اراضی کا نقصان ہوتا۔ محصولات کی ایک طویل فہرست سے شاید سری نگر میں حکام کو اطمینان تو ہوا ہوگا اس بات کا انھیں بلاشک تعین بھی ہوا ہوگا کہ سرکاری وسائل کا استحصال ہوا ہے مگر مالیہ کے مقصد سے فقط زمین پر ہی بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ زمین اب حکومت اور کاشتکاروں دونوں کیلئے کم آمدنی بخش ثابت ہو رہی ہے اور مالیہ میں ہر برس کمی واقع ہو رہی ہے اور اس حقیقت کو مہاراجہ سے نہایت احتیاط کے ساتھ پوشیدہ رکھا گیا۔

بندوبست کارروائیوں سے متعلقہ باب میں معلوم ہوگا کہ آمدنی کے یہ متفرق ذرائع اب ختم ہو چکے ہیں۔ ان میں سے بہت سارے لوگ تجسس سے اس بات کو دیکھ رہے تھے کہ حکومت کے لیے محصولات کے کسی ذریعے کو چھوڑنا آسان نہیں ہوگا کیونکہ اب سے کشمیر کے طریقۂ کار یا آئین میں مقام دے دیا گیا ہے۔

مالیاتی عملہ

ان افراد کے بارے میں کچھ واقفیت فراہم کرنا لازمی ہوگا جو مالیہ اراضی وصول کیا کرتے تھے اس سلسلے میں مستقل عملۂ مال، تقدیر کے سپاہیوں اور ایسے ٹھیکیداروں کے درمیان تمیز کرنا لازمی ہوگا جو ایک برس کی سٹہ بازی کے بعد غائب ہو جاتے ہیں۔ میں نے جب بندوبست کا کام شروع کیا تو کشمیر وادی پندرہ تحصیلوں میں منقسم تھی مگر بہت ساری تحصیلوں کی واضح حد بندی کے ذریعے نشاندہی نہیں کی گئی تھی۔ ایک تحصیل کے دیہات دوسری تحصیل کی حدود میں بکھرے پڑے تھے۔ اس ابہام کے موجب ریاست کے ساتھ فریب کاری ہو رہی تھی کیونکہ فصل کٹائی کی موسم کے دوران ایک گاؤں کی فصل کو دوسرے دیہات میں آسانی کے ساتھ چھپایا جا سکتا ہے اور یہ علاقہ دوسرے تحصیلدار کی حدود میں ہوتا ہے۔ تحصیلدار کو بہت کم تنخواہ ملتی تھی اور اس بات کی کوئی وجہ بیان نہیں کی گئی ہے کہ 30 روپے کی برائے نام تنخواہ حاصل کرنے والا ایک تحصیلدار کس طرح

300 روپے سے 500 روپے ماہانہ خرچ کرتا ہے۔ تحصیل کی عمارت بھی نہایت خستہ حال تھی۔ کچی اینٹوں سے تعمیر کردہ ایک بے ڈھب مکان تھا جس کی چھت گھاس کی ہوتی تھی۔ دیہاتی اس کی مرمت وغیرہ کا کام سرانجام دیا کرتے تھے۔ چونکہ تحصیلدار کی تعیناتی کا عرصہ غیر یقینی ہوتا تھا لہٰذا اسے موسم خزاں کی فصل جمع کرنے کا کام مکمل کرنے کی فکر ہوا کرتی تھی تاکہ اُسے بقایا جات کے معاملے میں کسی قسم کے ناگوار سوالات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ یہی وجہ ہے کہ تحصیل کی عمارتوں کے بارے میں زیادہ فکر نہیں ہوتی تھی۔ تحصیلدار کو کبھی دوستوں کی محبت کا فقدان نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ جب کبھی چاہے سرینگر چلا جاتا ہے اور ہمیشہ کئی عزیزوں اور دوستوں کو اپنے ہمراہ تحصیل میں ہی رکھتا ہے۔ جنہیں اس نے اپنے عہدے کے فرائض تفویض کیے ہوتے ہیں۔ ان افراد کو حکومت کی طرف سے کوئی تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ وہ یہ سب دیہاتیوں سے وصول کرتے تھے اس تحصیلدار کے جس قدر زیادہ عزیز و رفیق ہوتے۔ دیہاتیوں کی بدبختی میں اسی قدر اضافہ ہوجاتا۔ اختیار کا چلن ملازمتوں کی تمام سطحوں پر موجود تھا۔ میرے روبرو ایسی بھی مثالیں ہیں جہاں پر چوکیدار نے اپنے فرائض اپنے دوستوں کو تفویض کردیے ہیں۔ مالیہ قسطیں مقرر نہیں ہوتیں۔ اس کے نتیجے میں تحصیل کے پیادے جنہیں سپاہی کہا جاتا، ہمیشہ دیہات میں موجود رہتے اور عوام کی جبری مہمان نوازی پر اپنا گذارا کیا کرتے۔ تحصیلدار ماسوائے موسم خزاں کی فصلوں پر کھیتوں میں ہل چلانے کے اوقات کے سوا شاذونادر ہی کہیں باہر نکلتا تھا تاکہ دیہاتیوں کو کاشت کی ضروریات سے آگاہ کیا جاسکے اور چاول کی فصلیں پک جانے پر وہ پیہم جانچ کرتا تھا کہ کس قدر فصل خود کے لیے اور کس قدر حکومت کے لیے وصول کی جاتی ہے۔ تحصیلدار کے فرائض میں ایک بات یہ بھی شامل تھی کہ وہ ان مفرور افراد کو راغب کر کے واپس لائے جو اس کے پیش رو کے وقت وہاں سے بھاگ گئے تھے۔ بعض اوقات تحصیلدار کاشت کاروں کو واپس بلاتا اور دوسرا انہیں واپس کرنے سے انکار کر دیتا۔ مالیہ وصول کرنے اور جبر کو نفسی تشدد سے موسوم کیا جاسکتا ہے۔ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا جب ایک تحصیلدار نے ٹیکس ادا کرنے پر مزاحمت کرنے والے شخص پر موسم گرما کے دوران کوڑوں کا استعمال کیا اور موسم سرما کے دوران اسے ٹھنڈے پانی میں ڈبو دیا۔ جب ایک کاشتکار کی زندگی زیادہ اجیرن ہوگئی تو اس نے اس کا علاج فرار میں تلاش کرلیا چونکہ اجازت نامے

کے بغیر وادی سے باہر نہیں جا سکتا تھا مگر وہ ایسے گاؤں میں تو جا سکتا تھا جہاں پر تشخیص میں زیادہ رعایت ہو اور تحصیلدار زیادہ سخت مزاج نہ ہو، اگر وہ دانشمندی سے کام لیتا تو وہ شہر میں پناہ کی جگہ ڈھونڈ لیتا جہاں پر قلاشیوں کی بڑھنے والی تعداد کو حکومت کھانا فراہم کرتی تھی۔ اس بات کو یاد رکھنا لازمی ہے کہ ایک عام دیہاتی کے پاس اپنے کپڑوں اور بھیڑوں کے سوا بہت کم متاع ہوتی تھی مکان حاصل کر لینا نہایت آسان تھا اور معمولی سی مرمت کے بعد اسے قابل رہائش بنایا جا سکتا تھا چنانچہ سبزیوں کے سوائے کوئی بھی عزیز شے وہ چھوڑ کر نہیں جاتا۔ جب فرار کا یہ سلسلہ عام ہو جاتا اور تحصیلدار ایک برا افسر مال ثابت ہوتا تو اس کا تبادلہ کسی دوسری تحصیل میں کر دیا جاتا جہاں پر اس کی آمد کے اہتمام میں بھاری نذرانہ پیش کرنے کا جشن منایا جاتا۔

اپنے وسیع اختیارات کے باوجود تحصیلدار کو بہت کم عزت و وقار کا مقام حاصل تھا۔ دیہاتی اسے نیچی نظروں سے دیکھتے تھے کہ وہ بے اعتنائی اور بے ایمانی سے کام لیتا ہے اور باقی لوگ اس کے ساتھ اس لیے نفرت کرتے تھے کہ حکام اعلیٰ اس کے ساتھ اپنے جوتوں کی خاک جیسا سلوک کرتے تھے۔ میں نے دیکھا ہے کہ دیہاتیوں کی موجودگی میں ایک تحصیلدار کو کتوں کی مانند گالیاں دی گئیں میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ اب وزیر وزارت ادنیٰ ملازم کی مانند گورنر کا انتظار کرتا ہے۔ یہ بات بھی دیہاتیوں کی موجودگی میں رونما ہوئی۔ ایک مضبوط حکومت کے لیے یہ امر خراب تاثر رکھتا ہے اور میں نے اس کی تمام تر کوششیں کی ہیں کہ تمام افسران کے ساتھ ان کے عہدے کی رو سے عزت و احترام کا سلوک کیا جائے۔ میں نے بعض معزز خاندانوں کے ایسے حالات بھی دیکھے ہیں جہاں افراد کے پاس گذر بسر کا کوئی ذریعہ نہیں مگر وہ تحصیلدار کا عہدہ اس لیے ٹھکرا دیتے ہیں کیونکہ اس عہدہ کی کوئی عزت یا وقار نہیں ہے۔ کشمیر کے تحصیلداروں کی طرف سے یہ کہنا مبنی برحق ہو گا کہ ان کی قلیل تنخواہ میعاد عہدہ کی غیر یقینی حالت اور عالم پیری میں کسی پنشن کی عدم موجودگی اور اس عہدے کے ساتھ وابستہ عزت و احترام کا فقدان، یہ سب غبن کی ان کارروائیوں کے چند اسباب ہیں جو اب تک رونما ہوتے رہے ہیں۔

جاسوسی

حکومت کی ہمیشہ یہ پالیسی رہی ہے کہ محکمہ مال کی چھوٹی ڈویژنیں نہیں ہونی چاہئیں۔

بندوبست کے موقع پر 15 تحصیلوں کے وجود میں آنے سے قبل وادی میں 34 تحصیلات تھیں۔ اس سے پہلے بھی یہ ملک چھوٹے چھوٹے بلاکوں میں منقسم تھا۔اس پر کلکٹر مال مقرر ہوتے۔بعض اوقات چکداراور بعض اوقات کاردار مقرر کیے گئے ۔ایک پہلو سے یہ طریقہ جائز تھا کیونکہ جاسوسی کا کوئی جامع نظام موجود نہ تھا۔اس سے قبل یہاں پر رونما ہونے والے غبن کے معاملے کی تحقیقات ممکن نہیں ہوسکتی تھی اور وادی کے حالات بتانے کیلئے کوئی غیر جانبداراور ایماندار مخبر موجود نہیں تھے۔دوسرے ملکوں کے برعکس وادی میں جاسوس اپنے پیشے کو خیر خواہی سے تعبیر کرتا ہے اوراس کا مقصد حکومت کا بھلا کرنا ہے۔اگر وہ ایک چابکدست آدمی ہوتا ہےاوراس کے ذہن میں جاسوسی کا رجحان ہوتا ہےتو وہ افسروں کی طرف سے بلیک میل کی بابت وافر اطلاعات جمع کرسکتا تھااوراس بلیک میل سے اسے بھی اچھی خاصی آمدنی حاصل ہوتی۔جاسوسوں کی تعداد میں اب بڑی کمی واقع ہوئی ہےاور بہت کم معاملات میں اب جاسوسی کی ضرورت محسوس کی جاسکتی ہے۔مگر یہ طریقہ کاراب بھی موجود ہےاور بہت سارے اہلکاروں پراب بھی تسلیم شدہ جاسوس نظر رکھتے ہیں۔محکمۂ ڈاک کی طرف سے فراہم کردہ سہولیات کے سبب پیشہ ور جاسوسوں کو بھاری دھچکہ لگا ہےاور عوام اب رجسٹری خطوط کے ذریعے جاسوسی کا کام سرانجام دیتے ہیں۔انھیں رجسٹری خط کی رسائی پر کافی بھروسہ ہے۔افسروں کے لیے یہ بات شایان شان ہوگئی ہے کہ ایسے رجسٹری خطوط کا اندراج ہوتا ہے۔اس معاملے میں تحصیلدار نے حالات کا خلاصہ کرتے ہوئے کہا کہ ایک رجسٹری خط پر چار آنے خرچ کر کے ایک تحصیندار کواس کے دفتر سے نکال باہر کیا جاسکتا ہے۔میری رائے میں کشمیر کے مقابلے میں کہیں بھی رواج اتنی جلد ختم نہیں ہوئے اور جاسوسی کے پیشے کو جڑ سے اُکھاڑنے کیلئے برسوں کا عرصہ درکار ہوگا۔ فی الحال ایک شخص دوسرے پر اعتماد نہیں کرتا۔ جہاں تک مالیہ اراضی سے نمٹنے کا سوال ہے وہ یکساں ہوتے ہیں مگر جہاں ان کے مفادات کا ٹکراؤ ہوتا ہے وہاں انھیں فریب کاری کا احتمال رہتا ہے۔میں یہ حقیقت بیان کررہا ہوں کہ میں نے کبھی کسی اہلکار کو دوسرے کی تعریف کرتے ہوئے نہیں سنا اور اپنے ہم پیشہ افسروں کے بارے میں بات کرنے کا ان کا عام طریقہ یہ ہے کہ ان کی جھوٹی اور معمولی سی ستائش کی دل کھول کر مذمت کی جائے۔

اختتامیہ

میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ دور ماضی میں آدمی تحصیلدار کے عہدے پر کس طرح کام کرتا تھا۔ اپنی تحصیل کے ساتھ اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی ۔ وہ ایک سفری پرندہ تھا۔ چنانچہ وہ پیہم خوف ودہشت کا شکار رہتا جس کا جزوی طور پر اس کے افسروں کا وہ نازیبا طریقہ کار تھا جس کے تحت وہ اس کے ساتھ سلوک کرتے اور جزوی طور پر یہ احساس تھا کہ وہ چاروں طرف سے جھوٹے سچے الزامات سے گھرا ہوا ہے۔ بہرکیف کشمیری تحصیلداروں کی جو تصویر میں نے پیش کی ہے اس کے چند روشن پہلو بھی تھے۔ چند سابقہ افسر نہایت چابکدست بھی تھے اور انھیں شرائط کا اس قدر لالچ نہیں ہوتا تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ مالی معاملات میں وہ دربار کے وفادار تھے۔ کشمیری ان لوگوں کا احترام کرتے تھے اور دربار نے بھی ان کی قابلیت کی مجموعی طور پر ستائش کی ہے مگر ایک اوسط تحصیلدار راشی، کاہل اور غیر بے وفا ہوتا تھا۔ ایک حقیقت کا ذکر یہاں پر لازمی ہے کہ لیاقت اور ترجیح کی بنا پر ترقیاتی طریقہ کار کی عدم موجودگی میں یہ بات غیر معمولی نہیں تھی کہ دس یا بیس برس پہلے تحصیلدار کے عہدے پر تعینات ایک شخص اب ایک ضلع افسر تھا۔

ان حالات میں اب تبدیلی رونما ہو رہی ہے مگر انقلاب کا یہ عمل رفتہ رفتہ مکمل ہوگا۔ حکومت کے پاس سرینگر کے تیز طرار کشمیری پنڈتوں جموں کے چابکدست اور وفادار ڈوگروں اور پہاڑی اور وادیٔ جہلم کے مسلمانوں کی بھرتی کی بھاری گنجائش موجود ہے اس سمت میں ابتدا کی جا چکی ہے اور چند ایسے نوجوانوں کو محکمہ بندوبست کے لیے تربیت فراہم کی گئی ہے ۔ جنھوں نے سرکاری اسکولوں سے امتحانات میں کامیابی حاصل کی ہے ۔ ان کا اندراج نائب تحصیلداروں کی فہرست میں کیا گیا ہے ۔ ان میں سے جو چند لوگ کامیاب ہوں گے وہ قدیم دفتر شاہی کا ایک صحت مند جز ثابت ہوں گے اور یہ بات لازمی ہے کہ بہت ساری وجوہ کی بنا پر یہ دفتر شاہی اگلی نسلوں تک جاری رہے گی ۔ اس امر کو نظر انداز کرنا ناممکن ہوگا کہ قدیم سرکاری خاندانوں میں کشمیری کا خیال رکھا جاتا ہے اور رکھا جائے گا اور آئندہ چند عرصے تک افسروں کا تقرر ان کی لیاقت پر نہیں بلکہ ان کے خاندانی دعوؤں کی بنا پر ہوتا رہے گا۔ میں نے کشمیر میں اعلیٰ طبقے کے بچوں کی تعلیم کے لیے ایک اسکول قائم کیے جانے کی وکالت کی ہے ۔ میری رائے تو یہ ہے کہ کشمیر کی جیسی حکومت میں ایک

افسر ذات کی تلاش لازمی طور پر سابقہ افسروں کے خاندانوں سے کی جانی چاہیے۔ اس معاملے میں دقت یہ ہے کہ اعلیٰ خاندانوں کے افراد نے اب تک نائب تحصیلدار کے عہدے کو حقارت کی نظروں سے دیکھا ہے اور وہ فوراً ضلع افسر کا درجہ حاصل کر لینا چاہتے ہیں۔

تحصیلداروں اور پٹواریوں کے کردار کا محاسبہ کرتے وقت اس امر کو یاد رکھنا لازمی ہے کہ زراعت اور دیہی مالیہ کا قدیم طریقۂ کار ہی ان کے کام میں تمام تر جوش و ولولے اور دلچسپی کو ختم کرنے کے لیے کافی تھا۔ ایک تحصیلدار نے جب یہ دیکھا کہ اس کی تحصیل کو بلاکوں میں تقسیم کر کے کھیتی کے لیے دے دیا گیا ہے اور یہ لوگ اس کے عہدے کی پرواہ نہیں کرتے تھے تو یہ ایک قدرتی امر تھا کہ اس نے کاشت اور آبپاشی میں دلچسپی لینا چھوڑ دیا اور جب پٹواری نے یہ دیکھا کہ ایک کسان دیہات کے قدیم کاغذات کو نظر انداز کر رہا ہے تو رقبہ جات اور قدیم طلب مالیہ کے قطع نظر فصل پر قبضہ کر لیتا ہے جلدی ہی اُسے بھی محسوس ہو گیا کہ اس کا عہدہ بھی عبث فالتو ہے اور گاؤں کا محتسب ہونے کا تمام خیال اس نے دل سے نکال دیا اور اس نے اپنی توجہ اب فصلوں کا اپنا مقررہ حصہ حاصل کرنے پر صرف کر دی اگر وہ اس کے لیے ممکن ہوتا تو وہ دیہاتیوں کی طرفداری کرتا۔ اب پٹواری اور تحصیلدار دونوں کو اس بات کا احساس ہو چکا تھا۔ زراعت اور مالیہ کے اس چلن سے تمام فریقین کو نقصان ہو رہا ہے اور جمع کنندگان ٹھیکیداروں کا غیر مستحق طبقہ اس سے منافع کما رہا ہے اس نے حکومت کی املاک اراضی کو بہتر بنانے اور قائم رکھنے کی تمام تر کاوشیں ترک کر دیں۔ جب زراعت کے اس چلن کو ختم کر دیا گیا تو تحصیلداراور پٹواریوں کو معلوم ہوا کہ ملک اب قنوطیت کا شکار ہو چکا ہے اور مالیہ کے حسابات انتشار کے شکار ہو چکے ہیں تو تحصیلداراور پٹواریوں کی ذمہ داریوں پر زور دیا گیا تا کہ انھیں دیہی ریکارڈ فراہم کر کے کاشتکاروں کے حقوق اور ان کے واجبات مالیہ کا تعین کیا جا سکے اور آخر ان کے حقوق ان کی دین داریوں کو اس انداز سے محدود کیا جائے کہ ملک کا اعتماد بحال ہو سکے۔ بندوبست کی کارروائیوں اور اس کے نتائج کی تفصیل اگلے باب میں پیش کی جائی گی مگر اس امر کو یاد رکھنا چاہیے کہ مالی انتظامیہ کے بارے میں جو کیفیت میں بیان کر چکا ہوں وہ بندوبست اراضی سے قبل عرصے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس امر کو قطعی فراموش نہیں کیا جانا چاہیے کہ اس بندوبست کا ان اہلکاروں اور درمیانہ داروں کے ساتھ ٹکراؤ رہا ہے

جنھوں نے تحلیل ہوتے ہوئے مالیہ اراضی کے مضر اثرات پر خود کو مسلط کر دیا۔ انھوں نے پیشگی اندازہ کرلیا ہے کہ آخر اس کا انجام کیا ہوگا اور ملک اور درباران کی باز پرس کریں گے۔ اس پیشگی اندازے کی وجہ سے انھوں نے باقی ماندہ کم عرصے میں جس قدر وصول ہوسکتا تھا اسے باقی نہ حاصل کرنے پر مائل ہوئے مگر پیسہ کمانے کے ان ہتھکنڈوں کو انھوں نے زبردست اور طویل جدوجہد کے بنا پر ترک نہیں کیا اور وہ اس امید کے ساتھ حالات پر نظر رکھے ہوئے ہیں کہ اگر معمولی سا راستہ بھی کھل جائے تو وہ دولت کمانے کے نئے وسیلے تلاش کریں گے۔

●❁❁❁●

حوالہ جات

(1) ان موضوعات کی تفصیل نویں باب میں درج کی گئی ہیں۔

(2) سلطان شمس الدین شاہ میر کاشتکاروں سے صرف ایک چوتھائی پیداوار حاصل کرتا تھا۔ آئین اکبری۔

(3) 1884 میں نظامت پلٹن 7,429 افراد پر مشتمل تھی۔ ان میں سے زیادہ افراد کشمیر میں ہی موجود رہے۔

(4) اگر چہ شہری آبادی 118,860 ہے مگر حکومت شہر کے مضافات میں واقع چند دیہات کو موافق نرخوں پر غلہ فراہم کرتی ہے۔

(5) یہاں پر برک کے یہ الفاظ یاد آتے ہیں کہ پرورش کے لیے حکومت کا منہ تکنے کے بعد جب انھیں خوراک کی کمی کا احساس ہوگا تو وہ اس ہاتھ ہی کو کاٹ ڈالیں گے جس نے انھیں کھانا دیا ہو۔

(6) مئی 1888 میں ہیضے کی وبا کے سلسلے میں میں اسلام آباد میں تھا۔ جیسے جیسے یہ وبا پھیلتی جارہی تھی ہزاروں افراد لقمۂ اجل بن رہے تھے اور ہر طرف مصیبت کا عالم تھا۔ اُس وقت جبری آٹھ ہزار مزدوروں کی طلب ہوئی۔ ان جانے والوں میں اکثر زار زار رو رہے تھے پھر ایک مُلاّ نے نماز ادا کی اور خاص قسم کی حمد خوانی کی۔ ڈاکٹر اے نیو

(7) ڈاکٹر جانسن کہتے ہیں کہ اشیا پر عائد ایک حقارت آمیز ٹیکس جس کا تعین جائداد کا کوئی جج نہیں کرتا بلکہ اس کی طرف سے تعینات بدمعاش کرتے ہیں جنھیں یہ ٹیکس وصول کرنا ہوتا تھا۔

●❄❄❄●

اٹھارھواں باب

جدید بندوبست

ابتدا

کشمیر میں بندوبست کی شروعات مسٹر ونگیٹ آئی۔سی۔ایس،سی آئی ای نے 1887 کے دوران کیں جبکہ اپریل 1889 میں میرا تقرر اُن کے دست راست کے طور پر ہوا۔تب تک لال اور پھاک کی دو تحصیلوں کا سروے مکمل ہو چکا تھا۔بندوبست عملے کے لیے حسابات کا ایک انقلابی طریقۂ کار مروّج کیا جاچکا تھا اور تمام اہم نکتوں پر نہایت احتیاط کے ساتھ رولنگ درج کیے گئے تھے۔اپنی ابتدائی رپورٹ میں مسٹر ونگیٹ نے ان دشواریوں کا ذکر کیا ہے جنھیں ان کے پنجابی ماتحتوں کو برداشت کرنا پڑا اور اس نے اس سابق طریقۂ کار کی اہم بدعتوں کی جانب واضح طور پر اشارہ کیا ہے نیز اس جانب بھی اشارہ کیا ہے کہ کن خطوط پر اصلاحات کا عمل چلنا چاہیے۔مسٹر ونگیٹ کے دست راست کے طور پر جب مجھے 1890 میں مستقل طور پر سٹلمینٹ افسر مقرر کیا گیا تو انھیں خطوط کی پیروی کرتے ہوئے میں بہت ساری غلطیوں سے بچ گیا اور اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا پایا۔

مخالفت

1889 اور 1890 کے دوران مخالفت چلتی رہی مگر اسٹیٹ کونسل کی طرف سے پوری

حمایت کے باوجود اس مخالفت سے معمولی تاخیر اور ذرا سا غصہ ضرور پیدا ہوا مگر سال 1891 تک محکمہ بندوبست کو انتظامیہ میں اس حد تک تسلیم کیا جا چکا تھا کہ اس بات کا احساس تک اب ناپید ہو چکا تھا کہ 1889 کے دوران کس طرح ایک تحصیلدار نے غصیلے انداز میں سروے کی کارروائیوں کو بند کرنے کے لیے کہا اور میرے تمام تر ماتحتوں کو حکم دیا کہ وہ اس عمل سے باہر نکل جائیں۔ اہلکاروں کی طرف سے اس بندوبست کی مخالفت ایک قدرتی امر تھا اور وہ میرے ماتحتوں کا حقہ پانی بند کرتے۔

دیہاتیوں کا رویہ

مگر اس سلسلے میں سنگین رکاوٹ اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ دیہاتیوں میں خود بھی بندوبست کے لیے اعتماد کا فقدان تھا۔ 1887 سے قبل کافی برسوں تک دیہات کے سروے کا کام رد بہ عمل تھا مگر اس سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ بھوکے امین دیہاتیوں کو ہراساں کرتے مگر ایک فرضی سروے کے سوائے اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ کشمیریوں کا خیال تھا کہ 1887 میں مسٹر ونگیٹ کی طرف سے شروع کیے گئے سروے کا بھی وہی نتیجہ ہوگا اور اہلکاروں نے ان دیہاتیوں کو یہ باور کرانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا کہ کھیتوں میں نہایت محنت کے ساتھ جو تاربندی کی جارہی ہے اس سے بھی کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ میں نے سال 1889 میں فوری طور پر لال تحصیل کا معائنہ شروع کردیا تاکہ میں تخمیصات کو شکل دے سکوں۔ تحصیلدار نہ صرف خود غیر حاضر تھا بلکہ وہ دیہاتیوں کو بھی مجھ سے بات چیت سے دور رکھنے میں کامیاب ہوگیا۔ بہرحال کسی نہ کسی طریقے سے چند دیہاتیوں کے ساتھ میں نے شناسائی حاصل کرلی اور ان کے ذریعے دیہاتی عوام تک یہ اطلاع بہم پہنچادی کہ 1889 کے آخر تک میں سروے ریکارڈ پر مبنی ایک نئی تشخیص کو ترویج دینا چاہتا ہوں۔ اگرچہ زراعت پیشہ لوگ بہت سے مقامی حقائق سے واقف تھے جن کے باعث میں تشخیص میں غلطیوں سے احتراز کرسکتا تھا۔ دیہاتیوں کی طرف سے معاونت کی عدم موجودگی میں میرے لیے اراضی کی بابت مقامی تجربے کا فقدان ہوتا اور دیہاتی اب بھی بندوبست پر اعتماد نہیں رکھتے۔ حتیٰ کہ میں نے نومبر 1889 میں نئے بندوبست کا اعلان کردیا۔ اس وقت انھیں یقین یہ ہوا کہ یہ سروے اس سے پہلے کے سروے کی مانند فرضی تھا۔

تغیرات

نومبر 1889 میں ہر طرح سے انقلاب سا پیدا ہو گیا۔ جن دیہاتیوں نے ہمارے کام کو سرد مہری سے لیا تھا اور کھیتوں کی پیائش کے وقت وہ ٹس سے مس نہیں ہوتے تھے انھوں اب ان کارروائیوں میں دلچسپی لینا شروع کیا اور اب زمین کی قدر و قیمت محسوس کی جانے لگی۔ وادی میں دربدر بھٹکنے والے جو لوگ فرار ہو کر پنجاب چلے گئے تھے وہ اب اپنے دیہات کو لوٹ آئے اور تشخیص کا کام مستعدی سے روبہ عمل ہونے لگا جس میں کشمیریوں نے گہری دلچسپی لی۔ بندوبست کا چارج سنبھالنے کے فوراً بعد اسٹیٹ کونسل کی طرف سے بنجر زمینوں کے استعمال کی بابت قواعد وضع کیے گئے اور بنجر اراضیات طے کرنے کا کام مجھے سونپا گیا۔ اس کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ اراضی سے متعلقہ تمام مقدمات محکمہ مال کی عدالتوں سے لے کر محکمۂ بندوبست کے سپرد کر دیے جائیں۔ چنانچہ ہمارا کام بڑھ گیا اور ہمارا اثر و رسوخ بھی بڑھ گیا اور جو تحصیلدار اور دیگر افراد جنھوں نے ماضی میں بندوبست کے کام کی مذمت کرتے ہوئے رخنہ اندازی کی تھی اب وہ جنگ بندی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ محکمہ بندوبست میں کشمیریوں کو ملازمت فراہم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ تحصیلداروں اور دیگر افراد کے وہ اندیشے دور ہو گئے کہ ان کی جگہ پنجابیوں کو تعینات کیا جائے گا۔ کونسل کے سامنے پیش کردہ پندرہ تشخیصی رپورٹوں کا تعین زمین سے متعلقہ حقائق اور اس کی تشخیص کی قیمت سے تھا مگر یہاں پر اس کے اہم پہلو بیان کرنا ہی کافی ہوگا۔

بندوبست کے کلیدی نقطے

جب میں نے بندوبست کا کام ہاتھ میں لیا تو مجھے معلوم ہوا کہ کسی بھی چیز پر عوام کو اعتبار نہیں۔ زمین کے قبضے کی ان کے روبرو کوئی قدر و قیمت نہیں تھی اور جب لال تحصیل کی تشخیص کی رو سے مطالبے کو دس برس کے لیے محدود کر دیا گیا یعنی جنس کی صورت میں فصل کا ایک حقیر حصہ وصول کیا جائے گا اور ان کے لیے خوراک کی کافی رسد چھوڑ دی گئی۔ اس سے زراعت پیشہ لوگوں کے ذہن سے ہر جگہ موجود سیاہی کا خاکہ نکل گیا جو بیگار کی طلب سے زیادہ زراعت پیشہ لوگوں پر یہ زور دیتا تھا کہ زراعت کی ضرورت کو زیادہ اہم سمجھا جائے۔ لیکن کشمیریوں کو جلد ہی یہ احساس ہونے لگا کہ عارضی ہی سہی اب بندوبست سے کچھ فائدہ ہوگا، خستہ مکانوں اور ویران باغات کو بحال کیا

گیا، اب بھاگے ہوئے افراد واپس آئے اور آسانی سے زیادہ تیزی کے ساتھ بنجر اراضیات کے لئے درخواستیں آنے لگیں۔

زمین کی بابت اندراجات

زمین پر قبضہ جمانے میں اندراجات سے متعلق مسٹر ونکیٹ کی طرف سے ایک سیدھا قاعدہ وضع کیا گیا کہ جن مسلمانوں کے پاس زمین کی غیر متنازعہ ملکیت ہے ان کا اندراج آسامیوں کے طور پر کیا جائے۔ ایک تنازعہ پیدا ہونے کی صورت میں موقعے پر ہی شہادت درج کی جاتی اور معاملے کا فیصلہ سٹلمینٹ افسر کرتا۔ ہندوؤں اور سکھوں کے معاملات میں تب تک حتمی اندراجات ممکن نہیں ہوتے جب تک بندوبستی افسر کے احکامات حاصل نہ کیے جاتے۔

مراعات یافتہ مالکان اراضی

دیہی زمین پر قابض افراد کے علاوہ بہت سارے ایسے بھی مراعات یافتہ مالکان زمین تھے جنھیں چکدار یا مقرری کہا جاتا تھا۔ ان افراد نے سرکاری ملکیت کی زمین حاصل کی ہوتی تھی۔ ان تمام معاملات کی نہایت احتیاط کے ساتھ جانچ تحقیقات کی گئی اور اس معاملے میں مندرجہ ذیل قاعدہ اپنایا گیا۔

اقرارنامے کی رو سے جس زمین کی تصدیق ہو چکی ہے وہ زمین مالک کو اقرارنامے میں دی جائے گی۔ کسی تنازعے کی عدم موجودگی میں مالک کے پاس جو اراضی تجاوز ہے اسے دیہی تشخیص سرکل میں مروج نرخوں پر مراعاتی مالکِ زمین کو دے دیا جائے گا۔ ان میں سے بہت سارے عطیات زمین کے ان قطعات پر مبنی ہیں جو مختلف دیہات سے وضع کی گئی ہیں۔ مگر مراعات یافتہ طبقے نے اس بات کی زبردست کوشش کی ہے کہ ان کے عطیے کو ایک الگ تھلگ املاک کے طور پر الگ کیا جائے۔ بہرحال ہم نے اس تمام عمل سے احتراز کیا ہے۔ اب چکدار اور مقرری ان دیہات میں عام آسامی کی حیثیت رکھتا ہے جن میں ان کی زمین واقع ہے۔ اگرچہ اقرارنامے میں کوئی بھی ایسی مد نہیں ہے جس کی رو سے ان افراد کو مراعاتی شرحوں کو حق حاصل ہوتا ہے۔ میرے خیال میں حکومت کا یہ دانشمندانہ فیصلہ ہے۔ مراعاتی شرحیں دس برس کے عرصۂ تشخیص کے دوران نافذ العمل رہیں گی اور یہ مدت ختم ہونے پر اس کی تشخیص عام زرعی زمین کی

شرحوں پر کی جائے گی اور چکدار ایسے دیہات کی ایک عام کہانی بن کر رہ جائیں گے، جہاں ان کے اراضیات موجود ہیں۔

بنجر زمین

عرصۂ دراز سے کشمیری دیہاتیوں کو بنجر اراضیات پر کسی قسم کا حق حاصل نہیں تھا۔ انھیں فقط اتنا ہی حق تھا کہ بنجر اراضیات میں جو شخص درخت لگائے یہ درخت اُسی کی ملکیت ہوں گے۔ مسٹر ونگیٹ نے اس نظام اراضی کو رعیت داری قرار دیا۔ اگر لازمی ہو تو اس کو کشمیر کی ملکیت سے موسوم کیا جائے مگر کشمیر کے چکدار نظام کو تباہ حال رعیت داری کہنا ہی زیادہ موزوں ہوگا۔ میرے خیال میں مغل دور سے قبل یہاں پر خاص رعیت داری نظام تھا۔ مگر ٹوڈر جیسے عام لوگ جسے ٹوڈرمل کہتے ہیں، نے نمبردار اور پٹواری کے عہدوں کو ترویج دی اور ان کے ساتھ ہی مالیہ اراضی کی مشترکہ ذمے داری نے رفتہ رفتہ اپنا مقام کرلیا۔ کسی بھی طور پر یہ فلسفہ کہ رعیت داری طریقے کے مطابق ایک آسامی زمین پر قابض رہ سکتا ہے مگر اس نظام میں ایسی خامیاں موجود ہیں جن کے سبب وہ ان ثروت سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اگر کوئی آسامی فرار ہو جاتا یا بقایا دار ہو جاتا ہے تو نمبردار فوراً مالیہ بقایا جات کو دیگر آسامیوں کے پلے باندھ دیتا، مگر اس سسٹم کا نام رعیت داری ہے اور ایک آسامی کو بنجر اراضی پر کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ چنانچہ سروے کے وقت ہم نے فقط اُن کاشت شدہ زمینوں کے اندراجات کیے جن پر آسامیاں قابض ہیں اور ہم نے بنجر اور قدیم غیر کاشت زمین کو خالصہ کے طور پر درج کیا ہے لیکن وہ سرکاری ملکیت کی زمین ہے اور ان پر آسامیوں کے انفرادی حقوق کا کوئی دخل نہیں ہے۔ چنانچہ بنجر اراضیات کے انتظام کو ہمارے کام کا ایک اہم حصہ تصور کیا جانا چاہیے کیونکہ مالیہ اراضی کے انتظام کے مستقبل پر یہ امر کافی اثر انداز ہوگا۔ بنجر اراضیات مسئلہ حل کرتے وقت ہم نے اس امر کو تسلیم کیا ہے جس گاؤں میں ایسی زمین موجود ہو وہاں پر بیرونی افراد کی نسبت آسامیوں کو پہلا حق حاصل ہوگا۔ اگر آسامیاں بنجر زمین حاصل کرنے کے معاملے کو نظر انداز کردیں تو حکومت اسے کسی بیرونیفر و کے حوالے کرسکتی ہے۔ پہلے میں نے ہندوستان میں کاہچرائی کی اہمیت پر غور کیا۔ بہتر ہوگا کہ ہر گاؤں میں کاہچرائی کی نشاندہی کی جائے اور کسی بھی حالت میں ایسی زمین کو کاشت کے لیے کاٹا نہیں جانا چاہیے مگر مزید تجربے سے مجھے یہ سبق حاصل

ہوا ہے کہ کشمیر کے مویشیوں اور بھیڑوں کے لیے یہاں کے پہاڑ قدرتی کاہچرائی کے لیے میدان فراہم کرتے ہیں اور وہاں پر گھاس اور چارہ اس قدر بکثرت موجود ہوتا ہے کہ دیہی رقبے پر کاہچرائی کے کوئی سخت قواعد وضع کرنا غیر ضروری ہو جاتا ہے۔ بنجر زمین کو مختص کرنے کی بابت فقط ایک ہی قاعدے پر عمل کیا گیا ہے کہ بنجر رقبے کی حد دس فیصد تک ہو اور کاشت شدہ زمین میں دیہی استعمال کے لیے رقبہ چھوڑ دیا جائے۔

جنگلات پر استعمال کنندہ کا حق

میں نے تشخیصی رپورٹوں میں اس امر کو واضح کیا ہے کہ دیہاتیوں سے وصول کردہ مالیہ کے سبب ان کو عرصۂ دراز سے موجود ان جنگلات پر حق حاصل ہو جاتا ہے جو وادی کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ اب تک زراعت پیشہ طبقوں کو ان کے مکانات اور آلات کشاورزی تیار کرنے کے لیے بلا قیمت لکڑی حاصل کرنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ میں یہاں پر زور دوں گا کہ جنگلات کے ان استعمال کنندگان پر کسی قسم کی پابندی عائد نہ کی جائے۔ اگر یہ حقوق اس کے بعد تحفظ جنگلات کے لیے سدراہ ثابت نہ ہوں، کو میری طرف سے مقرر کی گئی اراضی شرحوں پر دوبارہ غور کیا جا سکتا ہے۔ میری دانست میں لکڑی اور ایندھن پر میں نے اس قدر زیادہ محصول حاصل نہیں کیا تھا جو حکومت کی طرف سے وصول کیا جائے گا۔ جنگلات سے حاصل کردہ ان مراعات کی تخفیف میں کوئی سخت گیر اقدام مالیہ اراضی کی وصولی کے معاملے میں سنگین مشکلات کا حامل ہوگا۔ میری رائے یہ ہے کہ کشمیر جیسے چھوٹے ملک میں کاشت کی حوصلہ افزائی ایک صحیح پالیسی ہوگی اور دیہات کا وہ تمام تر علاقہ، جس میں پہاڑوں کی ڈھلوانیں اور جنگلات کی سرحدیں بھی شامل ہیں، گھاس، لکڑی اور ایندھن کے زیر کاشت لائی جائیں تاکہ سرکاری جنگلات کو کسی قسم کی زک نہ پہنچے۔ چند برسوں سے محکمۂ جنگلات کا وجود عمل میں لایا گیا ہے مگر تادم تحریر ان کی حفاظت کی بابت کسی قسم کے قوانین جاری نہیں کیے گئے اور یہ امر نہایت اہم ہے کہ جب تحفظ کا کام شروع ہو زرعی لوازمات پر احتیاط کے ساتھ غور کیا جائے۔

آسامی

لازمی ہے کہ اس رپورٹ میں استعمال کردہ لفظ آسامی کی تعریف وضع کی جائے۔ کشمیر میں

اس لفظ کی قدیم ساکھ ہے۔ آسامی سے مراد کشمیر میں حکومت کی طرف سے زمین کے قانونی قابض سے ہے۔ مغل عہد اور اس کے بعد سرکاری نقطۂ نظر سے فلسفے کے مطابق آسامی مرضی پر منحصر کرایے دار سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی مگر دیہات میں آسامی وہ شخص ہے جسے میراث یا اجدادی حقوق حاصل ہیں۔ جو کسی گاؤں میں واقع اچھے قطعات اور آبپاشی رقبے پر مشتمل ہے اور بہت سارے ایسے معاملات جن پر مجھے اپنا فیصلہ صادر کرنا ہے۔ زمین کی بابت حقوق سے متعلق فیصلہ میراث کے وجود پر مشتمل ہے۔ ایک گاؤں میں اس امر کا تعین کبھی مشکل نہیں ہوتا کہ دعویدار حقیقی میراث دار ہیں یا نہیں خاندان یا زلزلوں، سیلابوں یا قحط سالیوں کے نام بھی اس موروثی اصول کو مٹانے میں ناکام رہے ہیں جبکہ مغلوں، پٹھانوں، سکھوں اور ڈوگروں نے اجدادی حقوق کے وجود سے واضح طور پر انکار کیا ہے اور ان حقوق کو دیہات نے زندہ رکھا ہے۔

1877-79 کی تباہ کن قحط سالی کی وجہ سے وادی کی تین چوتھائی آبادی کا صفایا ہو گیا اور ملک افراتفری کا شکار ہوا مگر اس سے جو صحت مند لوگ بچ گئے وہ اپنی میراث اراضیات پر قابض ہو گئے اور جب 1880 کا بندوبست عمل میں لایا گیا ہے تو ان کا اندراج گاؤں کی آسامی کی صورت میں کیا گیا۔ میرے بندوبست کے مطابق آسامی حقوق سے بڑھ کر حقوق انھیں حاصل ہیں۔ اگرچہ ان معذور افراد کو زمین فراہم کرنے کی گنجائش بھی رکھی گئی ہے جو اپنے دیہات واپس آ گئے ہیں۔ کوئی بھی شخص اس بات کو ثابت نہیں کر سکتا کہ 1880 میں کسی تشخیص کے دوران چند دیہات کو باہر رکھا گیا تھا۔ بہت ساری صورتوں میں 1880 کی آسامی نے خود ہی اپنی مرضی سے اپنے کھیت چھوڑ دیے ہیں اور انھیں ایسے مفرور افراد کے حوالے کر دیا گیا ہے جو واپس آ گئے ہیں۔ اس معاملے میں اس امر کا لحاظ نہیں رکھا گیا کہ آیا وہ میراث دار ہے یا نہیں۔ بدنیتی کے معاملے میں کشمیری بہت بدنام ہیں مگر مفرور میراث داروں کو قبول کرنے کے معاملے میں ان کا کردار قابل ستائش ہے۔ اس سروے کے مطابق غیر متنازعہ کاشت شدہ زیر قبضہ رقبہ جات میں ہر شخص اس زمین کا آسامی کے طور پر اندراج کیا گیا۔ مگر گاؤں میں جب نئی تشخیص کی گئی تو اس کے مطابق مختلف رقبہ جات میں ایسی آسامیوں کو آزادانہ طور پر اجازت دی گئی جو اپنے رقبہ جات کے حصے کو ترک کرنا چاہتے تھے۔ جب آسامی نے ان قبضوں پر اس تشخیص مالیہ کو تسلیم کر لیا جو اندراجات کی رد

سے مقرر کی گئی تھی۔ ہر ایک تشخیصی رپورٹ میں جسے دربار کی منظوری کے لیے ارسال کیا گیا مندرجہ ذیل الفاظ تحریر کیے گئے تھے۔ ''موروثی قبضے کے مستقل حقوق ہر اس شخص کو تفویض کیے جائیں گے جو تشخیص کے موقع پر اور تشخیص کی بنا پر بندوبست کاغذات میں درج مالیہ ادا کرنا منظور کر لیتے ہیں''۔

جب تک آسامی زمین کو الگ نہیں کر سکتے اور جب تک اس تشخیص کے مطابق ادائیگی ہوتی رہی تھی انھیں بے دخل کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ قبضے کا حق اگرچہ موروثی ہے مگر اسے نہ تو رہن رکھا جا سکتا ہے اور نہ ہی فروخت کر کے الگ کیا جا سکتا ہے۔

زمین کے ساتھ ناوابستہ ایک عمر رسیدہ مسلمان، جس نے ہمیشہ کشمیری مسلمانوں کے مفادات کے لیے کام کیا ہے، اکثر اوقات اس امر پر زور دیتا رہا ہے کہ کشمیریوں کو زمین پر اگرچہ کچھ حقوق حاصل نہیں اگر برطانوی حکومت نے کشمیر کو مہاراجہ گلاب سنگھ کے حوالے نہیں کیا ہوتا تو انھوں نے ان حقوق سے بجا طور پر استفادہ کیا ہوتا۔ اس نے کہا کہ ملکیتی حقوق سے کم کوئی بھی شئے لینے سے کشمیری انکار کر دیں گے۔ اگر میں اپنے اس نظریے پر قائم رہتا کہ موروثی قبضے کے حقوق حاصل ہونے چاہئیں اور رہن فروخت کے ذریعے انھیں الگ نہیں کیا جا سکتا اس سے عام بداطمینانی پھیل سکتی تھی۔ چونکہ یہ سوال بھاری اہمیت کا حامل ہے۔ لہذا میں اس کیفیت کو بیان کرنا چاہتا ہوں جس کا خلاصہ میں نے ان نقطوں کو سرکاری احکامات کے لیے پیش کیا ہے۔

ان کاشتکاران اراضی کے ان حقوق کی بابت قواعد مرتب کرنے میں مجھے خود اعتمادی کا فقدان محسوس ہو رہا ہے۔ اتنا ہی یہ احساس مسٹر ونکیٹ کو رہا ہے جس نے اس سوال کے حل کی بابت قواعد کا ایک تفصیلی مسودہ پہلے ہی پیش کیا ہے۔

ان قواعد کا مسودہ پیش کرنے سے قبل حقوق اراضی کی بابت مسٹر ونکیٹ کا یہ نظریہ رہا ہے کہ حقوق کاشتکاروں کو دیے جانے چاہئیں۔ اپنی ابتدائی رپورٹ کے پیراگراف 52 میں وہ رقمطراز ہے۔ ''دربار نہ تو کاشتکاروں کی معاونت کے بغیر اپنی حفاظت کر سکتا ہے اور نہ ہی سرکاری پالیسی کی حمایت میں زراعت پیشہ آبادی کی ہمدردی بندوبست دائمی ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ حمایت اور ہمدردی کی صورت میں حاصل کی جا سکتی ہے جب انھیں اس زمین کے ملکیتی حقوق دیے جائیں جس پر وہ

ہل چلاتے ہیں''۔ پیراگراف 57 میں ان حقوق کوتفویض کرنے کے حق میں وہ زوردار اسباب بیان کرتا ہے۔اس رپورٹ کے پیراگراف بہتر72 میں مسٹرونگیٹ رقمطراز ہے:''میں نے غور کیا ہے کہ اگر بندوبست کے موقعے پر یاطویل تر مدت کے لیے پٹے کاشتکار کواستحکام دینے کے لیے کافی نہیں ہوں گے اور اس کی عدم موجودگی میں بندوبست ناممکن ہے۔اگر اس کو اپنی پیداوار کو فروخت اور مویشیوں اور بیج کی خرید کے وقت اسے بنک کاری کے ساتھ معاہدہ اور اسے یومیہ مزدور کے ساتھ کھاتہ کھولنا پڑتا ہے جب اس شخص کو باہر نکال دیا جاتا ہے تو وہ اپنے ہاتھوں میں عرضی لیے مہینوں تک دربدر بھٹکتا ہے۔''

اپنے مسودہ قواعد (1) میں مسٹرونگیٹ حق قبضہ کی وضاحت کرتا ہے۔ مجھے ان کے ساتھ اتفاق ہے کہ ہر ایسے شخص کوحقوق قبضہ دے دیے جانے چاہئیں جو اپنے کھیتوں پرمقررہ تشخیص شدہ مالیہ ادا کرنا منظور کر لیتا ہے۔اس کا نام بندوبست کاغذات میں درج ہے اور جب تک یہ قابض تشخیص شدہ مالیہ ادا کرتا ہے تب تک اُسے بے دخل نہیں کیا جاسکتا۔

میں یہ تجویز پیش کروں گا کہ مسٹرونگیٹ کے قاعدہ نمبر10 میں یہ جملہ''ان شرائط کے تحت قابض شخص کوفروخت، رہن یا انتقال کا حق حاصل ہوگا''۔فی الحال قاعدہ34 کی پیش بندی کے باوجود خطرناک ثابت ہوگا۔ سب سے پہلے یہ بات یاد رکھنا لازمی ہے کہ قابضوں کو ان کی اراضیات کی فروخت یا رہن کے حقوق تفویض کرنا ایک جدید عمل ہوگا اور یہ کہ ہمارے روبرو بہت سارے ایسے مسائل آتے ہیں جہاں زمین کی فروخت واقع ہوچکی ہے۔مگر فروخت کے حق کو حکومت نے کبھی تسلیم نہیں کیا اور نہ ہی کاشتکاروں نے اس حق کا دعویٰ کیا ہے۔خود میرے سامنے چند ایسے معاملات آئے ہیں جہاں تمام تر گاؤں 50 روپے یا60روپے کے عوض فروخت کردیے گئے اور کشمیر میں یہ عام رائے پائی جاتی ہے کہ ابھی تک کاشتکار حقوق اراضی کی اہمیت کو بھی سمجھ نہیں سکے ہیں۔ چنانچہ مجھے یہ خدشہ ہے کہ فروخت یا رہن کے حق سے وسیع پیمانے پر انتقالات کا اشارہ ملنے لگے گا یعنی چند برسوں کے اندر ہی اہلکاروں یا زیادہ تر اثر ورسوخ کے مالک مسلمان نمبرداروں کی طرف سے بڑی بڑی جائیدادیں حاصل کی جائیں گی۔میری یہ رائے ہے کہ جہاں تک ممکن ہو حکومت درمیانہ داروں کے جنم کو روکے اور میں سمجھتا ہوں کہ جاہل اور ناتجربہ کار کاشتکار کوفروخت یا

رہن کے حقوق دینے سے درمیانہ دار پیدا کرنے کا یہ ایک یقینی طریقہ ہے۔

قاعدہ 34 میں مسٹر ونگیٹ نے رہن اور انتقال کے حق کو محدود کیا ہے۔ مکمل بندوبست شرحوں کے تحت زمین پر قابض مدت کے دوران کسی بھی ایسے شخص کو زمین بلا منظوری فروخت کر سکتا ہے جس کا تعلق کاشتکار طبقے سے ہو یعنی جو جائز کاشتکار ہو۔

قاعدہ 35 کے تحت غیر کاشتکاروں کے حق میں کیا گیا ایسا رہن یا انتقال موجود نہیں ہے جس کو دربار کی منظوری حاصل نہ ہو۔ یہ منظوری اس امر کی وساطت سے حاصل کی جا سکتی ہے جسے اس مقصد کے لیے خاص طور پر مقرر کیا گیا ہو۔

''میرے ذہن میں پہلے یہ بات آتی ہے کہ دفعہ 34 کی پیش بندیوں کے باوجود ہمارے چابکدست اور تنومند نمبردار در کار ہیں جو معمولی رقوم پر تمام سمتوں میں زمین کی خرید کرتے رہیں اور شہری پنڈت جلد ہی ان اراضیات پر کاشتکاروں کو اپنا ایجنٹ مقرر کریں اور ان کے لیے زمین خرید لیں۔

دوئم، میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ خاص مقصد کے لیے قاعدے پیلٹی 35 مقرر کیا گیا افسر اراضیات کی خرید، رہن یا انتقال کا نپٹارا کون سا افسر کر سکتا ہے؟ اس افسر کو کشمیر کے تمام دیہات سے متعلق گہری واقفیت حاصل کرنا ہوگی اور رشوت کے تمام فرائض سے دور رکھنے کے لیے اسے بھاری تنخواہ دینا پڑے گی۔

میں نے مسٹر ونگیٹ کی ابتدائی رپورٹ سے پیراگراف 72 کا حوالہ دیا ہے کیونکہ اس کی رو سے فروخت اور رہن کے تمام تر حقوق دیے جانے مقصود ہیں۔ اس پیراگراف کا مفہوم ہے کہ ایک کاشت کار کو مناسب طور پر زرعی کارروائیاں جاری رکھنے کے لیے فروخت یا رہن کے ذریعے روپیہ حاصل کرنے کی اجازت ہونی چاہیے، بہ الفاظ دیگر ''اگر اسے اپنی پیداوار کو فروخت کرنا ہو، مویشی اور بیج فروخت کرنا ہو اور بنک کاری ضابطوں کو پورا کرنا ہو، تو اس کے پاس کچھ قرضہ موجود ہونا چاہیے''۔

یہ بات مبنی بر حقیقت ہے کہ فی الحال کاشتکار کسی نہ کسی طور پر ساہوکار کے پاس گئے بغیر بھی اپنی زمین کی کاشت کر لیتا ہے۔ بیگار اور دیگر امور کو ملحوظ خاطر رکھنے کے باوجود بھی کاشت اچھی

خاصی ہے۔ مویشیوں کی تعداد بھی بہت ہے گھروں میں آرام وآسائش ہے اور خانگی تعمیرات بھی بہتر ہے۔ چنانچہ اس فلسفے کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں کہ جب تک کاشتکار زمین فروخت یا رہن رکھ کر اپنے لیے سرمایہ حاصل نہ کرے تب تک پیداوار اور معیار کم رہے گی اور میرا اعتقاد ہے کہ اگر منصفانہ طور پر بندوبست عمل میں لایا جائے تو قابض اپنی سال بھر کی پیداوار کے بل بوتے پر اچھا خاصا قرض حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

''میری تحریر میں مسٹر ونکیٹ سے بہت کم تجربہ شامل ہے مگر کشمیر میں مجھے مختصر سا دورہ کرنے سے معاملہ ذہن نشین ہوا کہ کشمیری انتہائی فضول خرچ اور اگر اُسے مواقع فراہم کیے جائیں تو وہ اپنے فضول اخراجات کے لیے دیگر مسلمان طبقوں سے سبقت لے جائے گا۔ ایک مثال پیش ہے، حکومت اس وقت شالی اور دیگر اجناس کی صورت میں بیج دے رہی ہے۔ قاعدے کے مطابق کاشتکار پہلے ہی بیج ڈال چکا ہوتا ہے اور بیج وہ خوراک کے لیے لے جاتا ہے۔ اگر حکومت یا کوئی دیگر ایجنسی قرض دیتی ہے تو خواہ ضرورت ہو یا نہیں کشمیری قرض اُٹھا لے گا۔ مجھے کونسل کو اس امر کو یاد دلانے کی ضرورت نہیں کہ فروخت یا رہن کے حقوق عطا کرنے سے ہندوستان میں گذشتہ سال سے مسلمان مالکان اراضی ہندو بنیوں کے غلام بنتے جا رہے ہیں۔

اس بات کو جانتے ہوئے کہ ہندوستان میں فروخت اور رہن کے حقوق کے بدولت مسلمان طبقوں کو زبردست تباہی کا شکار ہونا پڑا ہے، میں دربار کو اس امر کا مشورہ دوں گا کہ اس بات پر نہایت احتیاط کے ساتھ غور کیا جائے کہ آیا کشمیری مسلمانوں کو یہ حق دینا ضروری ہے۔ وہ جاہل اور تنگ نظر ہیں۔ وہ غریب ہیں اور یقینی طور پر وہ اس دولت کو فضول خرچی میں لٹا دیں گے جو ان کے حوالے کی جائے گی، میرا یہ عقیدہ ہے کہ فروخت اور رہن کا حق مسلمانوں کے لیے ضرب کاری کے مترادف ہوگا اور مجھے یقین ہے کہ اسی قدر یہ حق حکومت کے لیے بھی مضر ہوگا اس سے درمیانہ داروں کے ایک طاقتور طبقے کی ترویج ہوگی جو دربار کو واجب الادا مالیہ اراضی کی وصولی میں رخنہ اندازی پیدا کرے گی۔

کوہالہ تک سڑک کی تعمیر کے سبب عین ممکن ہے کہ کشمیر میں زمین کی قیمت میں اچھا خاصہ اضافہ ہو اور زمین کے معاملے میں سٹے باز فوراً نمودار ہو جائیں گے۔ چنانچہ میں دربار کو مشورہ دوں

گا کہ وہ تب تک فروخت، رہن یا انتقال کا حق زمیندار کو نہ دے جب تک اس کو یہ تسلی نہ ہو جائے کہ قابضان اس حق کے مناسب استعمال کے اہل ہیں اور جب تک آبادی میں اس حد تک اضافہ نہ ہو جائے کہ انتقال لازمی محسوس ہو۔ میرے خیال میں فی الحال کشمیر کا کاشتکار مستقل اور موروثی حقوق قبضہ حاصل ہو جانے سے ہی مکمل طور پر مطمئن ہو جائیں گے۔

میں یہاں پر اس امر کا اضافہ کرنا چاہوں گا کہ اب تک کسی بھی شخص نے ان حقوق سے زیادہ کچھ بھی نہیں مانگا ہے یہ حقوق حکومت نے انھیں تفویض کیے ہیں اور تمام لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ زمین کو رہن رکھنے کے حق سے تباہ کن نتائج پیدا ہوں گے حکومت کی طرف سے آسامیوں کو جو حق تفویض کیے گئے ہیں ان کے سبب دیہات میں بھاری اعتماد پیدا ہوا ہے۔ اس کی شہادت مفرور دیہاتیوں کی واپسی میں اضافہ اور کاشت پر دی جانے والی زیادہ توجہ کے علاوہ آسامی کے حق حاصل کرنے کے کیے اور یہاں تک کہ آسامی کے تحت مستقل حقوق مزرعہ حاصل کرنے کے لیے زبردست خواہش سے ملتی ہے۔

رہ نوردوں کی آبادی

کشمیر میں آسامیوں کی آبادکاری کا کام افراد کو شطرنج کی بساط پر رکھنے کے مترادف ہے۔ نہ صرف پنجاب تک کے مفرورین کو ان کے دیہات میں بحال کرنا مقصود ہے بلکہ ان افراد کو بھی واپس آنے کے لیے راضی کرنا ہے جو اپنی آبائی زمینوں کو چھوڑ کر ان علاقوں میں چلے گئے جہاں تشخیص کم تھی اور دیہی سربراہ اثر ورسوخ کے مالک تھے۔ یہ کام اب مکمل ہو چکا ہے اور دیہات میں اب کافی آسامیاں موجود ہیں، پیداوار بہت زیادہ تو نہیں ہوگی مگر اس قدر ضرور حاصل ہوگی کہ کھیتوں سے جو فصل حاصل ہوگی اس سے وہ آرام سے زندگی گذار سکتے ہیں اور حکومت کو مالیہ ادا کر سکتے ہیں۔ زراعت پیشہ افراد کی آبادی اب اس قدر کم نہیں جس قدر مجھے اس وقت محسوس ہوئی جب میں نے اپنا کام شروع کیا۔ اگرچہ 1892 میں ہیضے سے کافی جانیں تلف ہوئیں مگر مالیہ مکمل طور پر وصول کیا گیا۔

تشخیص

آسامیوں کی ان کے دیہات میں آبادکاری کے بعد آئندہ قدم اس امر کا فیصلہ کرنا تھا کہ

دیہات پر کس قدر مالیہ کی تشخیص کی جائے اور تشخیص کی مدت کس قدر طویل مقرر کی جائے۔ مناسب غور وخوض کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ تشخیص کی مدت دس برس مقرر کرنا دانائی ہوگی اور زیادہ عرصے کے لیے حکومت کے ہاتھ باندھے رکھنا اچھا نہیں ہوگا۔ زمین کی وافر کاشت کے لیے کشمیری آبادی اب بھی کافی نہیں ہے۔ جب آبادی میں اضافہ ہوتا ہے اور قحط سالی، ہیضہ اور چیچک اس معاملے میں سدراہ نہیں ہوتے اور جب وسیع پیمانے پر کاشت کا چلن انحراف کے بجائے قاعدے کی صورت اختیار کر جائے، اسی صورت میں کشمیر میں زمین کی حقیقی قیمت کا تعین کیا جاسکتا ہے۔ مجھے اس بات کو بھی ذہن نشین رکھنا تھا کہ حکومت اپنا سرمایہ ہندوستان تک ریل گاڑی سڑک اور گلگت کی سڑک کی تعمیر پر صرف کر رہی ہے اور یہ بھی یاد رکھنا ہوگا کہ اول الذکر سے قیمتوں میں تبدیلی واقع ہوگی جب کہ موخر الذکر کے سبب زراعت پیشہ طبقات خطرناک بیگار سے نجات حاصل کریں گے۔ میرے خیال میں دس برس کی اس مدت کے دوران جس کے لیے نئی تشخیص کو منظوری حاصل ہوئی زراعت پیشہ طبقہ کے لیے وسائل اراضی پیدا کیے جائیں اور ان کے قبضوں کے تئیں ان میں رغبت پیدا کی جائے اور اگر دس برس کے بعد تشخیص میں اضافہ کیا جاتا ہے تو اس سال کے بعد وہ قبضے کو چھوڑنے کے بجائے اس اضافے کو منظور کرلیں گے۔

یہ خیال اچھا معلوم ہوتا ہے مگر گزشتہ چند برسوں کے دوران جب سے یہ تشخیص نافذ العمل ہوئی ہے آسامیوں کے وطیرے میں بہت تبدیلی آگئی ہے۔ چنانچہ میں محسوس کرتا ہوں کہ کشمیر میں بھی زمین کے تئیں مستحکم اور توہم پرستی کی حد تک رغبت پیدا ہوجائے گی۔ کسی اور مقام پر اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ کس قدر آسانی کے ساتھ ایک آسامی اپنی زمین کو چھوڑ کر دوسرے دیہات میں رہ نوردی کرے گی اور ایک کشمیری کی قوت برداشت کی حد مقرر کی گئی ہے۔ ایک مرتبہ جب یہ حد گزر جاتی ہے اور توقعات بہت زیادہ بڑھ جاتی ہیں تو ایک کشمیری اپنے کنبے کے بھیڑوں کے ساتھ نکل پڑتا ہے اور اپنے پیچھے وہ سبزیوں کے کیاریوں کے سوا ایسی کوئی شئے نہیں چھوڑتا جس کا اسے افسوس ہو۔ اس کے رہ نوردی کے مزاج کو تبدیل کرنا نہایت مشکل ہے اور جب میری طرف سے کی گئی تشخیص بہت زیادہ ہوتی تو خدشہ تھا کہ دیہاتی اجتماعی نقل مکانی کر جائیں گے 7۔ یہ ایک خوش آئند امر ہے کہ اس قسم کی کوئی نقل مکانی نہیں ہوئی ہے۔ تحصیلدار اب مفرورین کا

تعاقب نہیں کرتے اور اس معاملے میں اپنے برادر تحصیلدار کے ساتھ سودے بازی نہیں کرتے کہ مفرور شخص پر کس کا حق ہے۔ زمین پر موروثی حقوق کا تقدس برابر قائم ہے مگر بدانتظامی اور استحصال نے آسامیوں کو منتشر کر کے انھیں آوارہ گرد بنا کے رکھ دیا۔ اس معاملے میں آسامیوں کو اپنی زمینوں پر قبضہ برقرار رکھنے کے لیے دیہاتیوں کے اعتماد کو بحال رکھنے کا مقصد حاصل کرنا ہوگا۔ میری رائے یہ ہے کہ اس مقصد کو حاصل کرلیا گیا ہے مگر بندوبست کے دوران جو وعدے کیے گئے تھے ان کی عدم تکمیل کے سبب فرار کا سلسلہ پھر شروع ہو جائے گا اور ملک افراتفری کا شکار ہو جائے گا۔

تشخیص کی اساس

مجھے تشخیصی رپورٹوں میں اس طریقۂ کار کی وضاحت کرنا پڑی ہے جو دیہات کی تشخیص کی بابت اپنایا گیا تھا۔ یہ ایک ذمہ داری کا کام تھا اور سنجیدگی کا حامل تھا۔ نواحی دیہات کی ناقابل تصحیح پیداواری تفاوتیں جو ظاہراً یکساں مٹی اور آبپاشی اور تربیت جیسی یکساں سہولیات سے اس انداز میں موجود تھیں کہ جب تک میں نے جمع آسامیوں کے روبرو اپنی تشخیصات کا اعلان نہیں کر دیا ان کی بابت یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ آیا میں صحیح ہوں یا غلط۔ زمین کی قیمت کے تعین کی بابت دوسرے علاقوں کی مانند ہم نے چند طریقے اپنائے۔ ہر گاؤں کی حقیقی پیداوار کے تخمینے ہمیں حاصل ہوئے جو ان فصلی تجربات سے حاصل کیے گئے تھے یہ تجربے ہر سرکل میں کیے گئے تھے جہاں پر یہ دیہات واقع ہیں اور موجودہ مالیہ کی شرحوں پر مبنی اب ہمارے پاس مالیہ کے اچھے خاصے اندازے تھے۔ مگر یہ اندازے مجھے اس حد تک فائدہ مند ثابت ہوئے کہ وہ خطرے کا اشارہ تھے اور اس تشخیص کے دوران میری اہم ترین رہبری ان دیہات کے اکثر دوروں سے حاصل ہوئی ہے۔ میرا تجربہ ہے کہ اگر تشخیص قدرے زیادہ ہے مگر عوام اس کو قبول کر لیں گے کیونکہ دیہات کا نہایت احتیاط کے ساتھ معائنہ کیا گیا ہے اور متعدد شکایتوں کی سماعت ہو چکی ہے۔ کشمیر میں بہت سارے ایسے افراد ہیں جنھوں نے ماضی میں کشمیر کا مالیہ اراضی ٹھیکیداروں کو دیا تھا۔ یہ افراد قیمت متعین کرنے میں ماہر ہیں اگر ان افراد پر اعتبار کرلیا جائے تو وہ ایک گاؤں کی حقیقی پیداوار کے بارے میں مکمل تفصیل فراہم کر سکتے ہیں۔ اگرچہ میں ان افراد کی منصفانہ رائے پر اعتبار نہیں کر سکتا کہ مالیہ انفرادی طور پر ایک گاؤں پر مقرر کیا جانا ہے۔ مجھے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ وہ مجھے مختلف دیہات کے تقابلی مالیے

کے بارے میں نہایت اعلیٰ رائے دے سکتے ہیں اوران کی حمایت نے میری کافی مدد کی ہے۔

ایک ایسے ملک میں جہاں مالیہ حساب میں اس انداز ے سے ہیرا پھیری کی گئی ہے کہ 1880 سے مالیہ کے جو حسابات سرینگر کے مرکزی مالیاتی افسر نے فراہم کیے تھے ان پر بہت کم انحصار کیا جاسکتا ہے ۔ان اعداد وشمار کا پٹواریوں اور نمبرداروں کی طرف سے فراہم اعداد وشمار کے ساتھ موازنہ کیا گیا اس سے مجھے ہر گاؤں کی طرف سے دیے گئے حقیقی اوسط مالیے کی بابت اندازہ ہوا اور میں دیہاتیوں کے چہروں، کاشت اور ضلع کی مجموعی حالت سے یہ دیکھ سکتا تھا کہ یہ تشخیص کافی زیادہ ہے ۔دوسرا سراغ مجھے اس امر سے حاصل ہوا کہ ایک گاؤں سے مالیہ کے علاوہ چندوجوہ اور بقایا جات کی بنا پر اضافی رقم وصول کی جاتی تھی ۔اس سے یہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ گاؤں کی حقیقی تشخیص بہت زیادہ تھی ۔ایک گاؤں کی تاریخ میں یہ اہم وجہ آسامیوں کے فرار میں مضمر تھی۔ بہت ساری آسامامیاں 1880 سے فرار ہو چکی تھیں کیونکہ یہاں پر مالیہ بہت زیادہ تھا یا بیگار بہت سخت تھی ان امور سے فائدہ مند رہبری حاصل ہوئی اور گاؤں کی متعینہ قیمت کی تصحیح جیسے معاملوں کا تعین ایک اہم معاملہ بن گیا۔ پہلی بات یہ تھی کہ آب پاشی کے پہلو کی احتیاط کے ساتھ جانچ کی جاتی تھی اور آبپاشی کے پہلو سے ہی زمین کی قیمت کا تعین کیا جاتا تھا۔ وادی میں ہونے والی کاشت میں چاول کی فصل کو ایک نہایت اہم مقام حاصل ہے بلندی پر واقع دیہات میں پانی کی فراوانی ہے مگر یہاں پر سردی ہونے کے باعث ادنیٰ ساخت کا چاول اُگایا جاتا ہے۔ یہ فصل ہمیشہ نہایت نازک حالت میں ہوتی ہے اور پہاڑوں پر برفباری اور سردی کے سبب فصل ختم ہو جاتی ہے۔ پہاڑوں کے قدرے نیچے بھی پانی کی فروانی ہوتی ہے اور یہاں کا درجۂ حرارت چاول کی فصلوں کے لیے کافی تمازت رکھتا ہے اس سے مزید نیچے جب پہاڑوں پر بہت کم برف باری ہوتی ہے تو ان برسوں کے دوران پانی کی قلت پیدا ہو جاتی ہے ۔ زیریں اور بالائی دیہات کے درمیان تمیز کو بھاری اہمیت حاصل ہے بلند دیہات میں ادنیٰ قسم کے چاول اُگائے جاتے ہیں اور ان دیہات میں جو بلندی پر واقع ہیں مگر جہاں پر موسم گرما ہوتا ہے ۔اعلیٰ ساخت کے چاول اُگائے جاتے ہیں ۔ نقشے پر اس قسم کا خط کھینچنا کافی نہیں ہے ۔ ہر دیہات کو بار بار دیکھنا بھی نہایت اہم ہے۔ پہاڑوں کے سایے کے سبب چاول کی پیداوار پر کافی اثر پڑتا ہے اور کشمیریوں کی طرف سے اس

سلسلے میں جو تقسیم کی گئی ہے میں اس پر غور کرتا ہوں۔اس کی رو سے ملک کے چند حصوں کو دائیں طرف اور دیگر کو کشتی راستے کے ساتھ بائیں طرف دکھایا گیا ہے۔میں نے اکثر اس تقسیم کو متجسس پایا ہے، دائیں ہاتھ پر واقع دچھن دیہات کے مقابلے میں بائیں ہاتھ پر واقع کھوور دیہات میں بلاشبہ چاول کی بہتر ساخت پیدا کی جاتی ہے۔ہوسکتا ہے کہ ایک دچھن گاؤں کی نسبت کھوور گاؤں قدرے زیریں سطح پر واقع ہو مگر مؤخر الذکر میں اچھے چاول پیدا کر کے کاٹے جاتے ہیں جب کہ اول الذکر میں ادنیٰ قسم کے چاول پیدا ہوتے ہیں۔ایک اور بات اگر کوئی گاؤں جغرافیائی نظر سے زیرآب ہے مگر علاقے کی تربیت کے سبب بالائی دیہات سے جو بھی پانی لبالب ہونے کے بعد واپس آتا ہے وہ اس طرف نکلتا ہے چنانچہ اس قسم کے دیہات کی تشخیص بالائی علاقے میں واقع آبپاش گاؤں کی نسبت زیادہ ہوگی۔ بہت ساری آبی گذرگاہیں ہیں جو دشوار علاقوں سے ہوکر نکلتی ہیں اور یہاں پر مسلسل شگاف پیدا ہونے کے سبب لکڑی کی آبی سرنگیں تعمیر کرنا ضروری ہے اور اس کی مسلسل مرمت درکار ہوتی ہے۔جن دیہات کی ان آبی گذرگاہوں کے ذریعے آبپاشی ہوتی ہے ان کی حالت اُن دیہات کی نسبت بدتر ہے جہاں پر آسان اور مسلسل آب رسانی ہوتی ہے۔بعض اوقات نہر کے تلے میں نقص کے سبب پانی بالکل غائب ہوکر رہ جاتا ہے اور پہاڑوں سے آنے والے پانی کی رفتار سست ہوکر رہ جاتی ہے۔زمین کی قیمت کے تعین کے معاملے میں اس علاقے کی تربیت نہایت لازمی امر ہوتی مگر کشمیر جیسے ملک میں اس کی خاص اہمیت ہے کیونکہ یہاں کی زمین پہاڑوں پر واقع ہے اور ندی نالوں اور کریوہ جات کے امتزاج ہیں۔اگر پہاڑی محل وقوع کے سبب ایسا قطعہ آراضی مل جائے جہاں پر ہوائیں داخل نہیں ہوسکتیں تو ایک شخص اس امر کی تصدیق کرسکتا ہے کہ یہاں پر چاول کی فصل کا واسطہ ریقسم کی مٹی سے پڑا ہے۔اس کے علاوہ ایک پہاڑی علاقہ کنڈی کہلاتا ہے۔اس پہاڑی کی طرف ایک عمدہ قسم کی مکئی پیدا ہوتی ہے جب کہ دوسری طرف مشکل سے بیج بھی حاصل نہیں ہوتا۔اس کے بعد جب کوئی دریائے جہلم کی طرفین کی طرف آتا ہے تو اسے سیلابوں اور ایسے جوہڑوں کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا ہوگا جہاں پر پانی جمع ہوجاتا ہے۔جنگلات کے نواحی علاقوں میں ریچھ اور سور بکثرت پائے جاتے ہیں اور وہ فصلوں کو نقصان پہنچاتے ہیں جو دیہات ندی نالوں کے کناروں پر واقع ہوتے ہیں وہ بہت ساری پہاڑی

چوٹیوں سے اپنے ساتھ ہواؤں کا بہاؤ بھی لاتے ہیں، ان کے سبب بھی فصلوں کا نقصان ہوتا ہے کیونکہ فصلیں پک نہیں پاتیں۔ تشخیصی رپورٹوں میں اس قسم کی متعدد مثالیں دی گئی ہیں جہاں نواحی دیہات کی تفاوتیں درج ہیں۔ یہاں پر ان سے چند معاملوں کا ذکر کیا جارہا ہے جہاں تشخیص کے معاملے میں چند دیہات کو ایک گروپ میں شامل کیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ طریقہ کار کامیاب رہا لیکن مقامی حالات کو معلوم کرنے کے لیے ان دیہات کا بار بار معائنہ کرنا پڑا۔ میں یہاں پر اس امر کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ تشخیص کے معاملے میں ایک گاؤں خود بھی ایک بڑا اور خطرناک اخذ عام ہے اگر میرے پاس وقت ہوتا یا میں عملے کو یہ کام تفویض کرسکتا تو میں زمین کی قیمت کے تعین کے معاملے میں ایک گاؤں کے بجائے کھیت کو اکائی تسلیم کرتا۔ اس امر کا تعین کرنے کے لیے ایک گاؤں کتنا مالیہ ادا کرسکتا ہے، یہ بات اہم ہوگی کہ آبپاشی سے متعلقہ تمام امور کا پتہ لگایا جائے مگر یہ بھی لازمی ہے کہ تعداد معلوم کی جائے اور رقبہ جات کی کیفیت بیان کی جائے۔ کئی استفسارات اور ذاتی مشاہدے کے بعد میں نے یہ رائے قائم کی ہے کہ ایک اسامی بیلوں کی جوڑی کے ساتھ دو ایکڑ آبی زمین اور چار ایکڑ خشک زمین سے زیادہ رقبے پر کاشت نہیں کرسکتا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ چاول اُگانے والی بہترین تحصیل میں کھیت کا سائز اس سے بڑا اور کشمیر کے دوسرے حصوں میں اس سے بھی زیادہ ہے۔ بعض اوقات ایک گاؤں میں آسامیوں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے اور رقبہ جات اس قدر وسیع ہوتے ہیں کہ ایسے معاملات میں وافر کاشت مانع ہوتی ہے۔ یہاں کس قدر زمین پر حقیقی کاشت ہوتی ہے، اس امر کا اندازہ لگانا ممکن نہیں۔ اس قسم کے دیہات کی تشخیص چیک کی جانچ کے مترادف ہوتی ہے جہاں مقامی حالات کی واقفیت کارآمد ثابت ہوتی ہے۔ دس برس کے بعد اس قسم کے دیہات کی فی ایکڑ شرحوں پر تشخیص محال ہوجائے گی۔ میں ایسا نہیں کرسکا اور مجھے زمین کا رقبہ نہیں بلکہ اس قسم کی آراضی کے لیے دستیاب مزدوروں کی تعداد کو ملحوظ خاطر رکھنا پڑا۔ جب میں نے اپنا کام شروع کیا تو مجھے بہت سارے ایسے دیہات کا نپٹارہ کرنا پڑا مگر جیسے ہی آسامیاں دھڑا دھڑ دیہات تک واپس آنے لگیں تو آبادی کا سوال مجھے پریشان کرنے لگا۔ مگر میں نے ہمیشہ یہ بات دیکھی ہے کہ ایک زیادہ آباد گاؤں، کم آبادی والے چھوٹے گاؤں کی نسبت زیادہ مالیہ ادا کرسکتا ہے۔

کاشت والی زمین کے علاوہ ایک گاؤں میں واقع دیگر اثاثہ جات مثلاً اخروٹ، پھلوں اور خوبانیوں، تیل خوبانی اور شہد پر بھی ٹیکس عائد کیا جاسکتا تھا۔ ان مدوں کو میں نے مالیہ اراضی میں شامل کیا ہے جن میں ٹٹوؤں اور بھیڑوں پر ٹیکس کے سوائے تمام تر زرعی محصولات شامل ہیں، اس سے پٹواری کو مالیہ پر دو فیصد اور لمبردار کو پانچ فیصد بچت ہوتی ہے۔ کئی دیہات میں اخروٹ کے درخت ایک اہم اثاثے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ عہد ماضی میں مونگ پھلی سے تیل نکالا جاتا تھا اور یہ تیل مالیہ کے طور پر وصول نہیں کیا جاتا مگر تیل اب بھی نکالا جاتا ہے جسے پنجاب تک برآمد کر کے فروخت کیا جاتا ہے۔ ایک گاؤں کی آمدنی میں پیوند شدہ سیب کے درخت بھی ایک کارآمد ذریعہ ثابت ہوتے ہیں۔ شہتوت اور خوبانی سے لوگوں کو اچھی خاصی خوراک حاصل ہوتی ہے اور خوبانی کی گریوں سے ایک تیل حاصل ہوتا ہے۔ شہد بہت زیادہ مقدار میں فروخت نہیں ہوتا مگر جس علاقے میں کھانڈ زیادہ مہنگی ہوتی ہے وہاں اسے سامان عشرت تصور کیا جاتا ہے۔ دیہات میں شہد کی پیداوار کی جانب میں نے زیادہ توجہ نہیں دی مگر اپنی تشخیص کے دوران میں نے ہمیشہ اس بات کو یاد رکھا ہے کہ چند دیہات میں اخروٹ اور پیوند شدہ پھلوں کے درخت بکثرت موجود ہیں۔ کشمیر میں دولت کا ایک اہم ذریعہ بھیڑوں کی افزائش ہے۔ ایک آسامی جس کے پاس بھیڑوں کا اچھا ریوڑ ہے وہ اپنے گھر کو گرم رکھ سکتا ہے۔ اس کے پاس اچھی خاصی اون ہوتی ہے، جسے وہ استعمال کرسکتا ہے یا بیچ کرسکتا ہے۔ نیز موسم بہار کے دوران اس کے کھیتوں کے لیے کھاد حاصل ہوتی ہے۔ پہاڑی چراگاہوں میں کا ہچرائی کے لیے دو آنے فی بھیڑ کے حساب سے ادائیگی کرنا پڑتی ہے مگر وہ بید کی شاخوں اور پتوں کے عوض کچھ بھی ادا نہیں کرتا جس سے بھیڑوں کے لیے چارہ حاصل ہوتا ہے۔ جس شخص کے پاس بھیڑ ہوتے ہیں وہ نہ صرف اپنی ذات اور اپنے بچوں کے لیے اونی کپڑے بُنتے ہیں بلکہ اچھی خاصی قیمت پر ایک یا دو کمبل فروخت کرتے ہیں اور ان قیمتوں میں اضافے کا رجحان جاری ہے۔ میری رائے میں جن دیہات میں بید کے درخت بھاری تعداد میں پائے جاتے ہیں ان کی تشخیص کے اس پہلو پر بھی غور کیا جانا منصفانہ ہوگا۔ میں کبھی اخروٹ اور پھلوں کے درختوں یا بھیڑوں یا بید کے درختوں کو مالیہ میں اضافہ کا جواز نہیں بناتا مگر میں ان کی موجودگی کو مالیہ میں کمی نہ کرنے کا ایک پختہ جواز مانتا۔

نئی تشخیص کا اعلان

کسی گاؤں کا مالیہ دس برس کے لیے متعین کرنے کے بعد اور مجوزہ مالیہ پر حکومت کی منظوری حاصل کر لینے کے بعد میرا آئندہ قدم یہ تھا کہ مجمع شدہ دیہات میں نئی تشخیص کا اعلان کر دیا جائے۔ پہلے پہل محکمہ کے مال کے اہلکاروں، نمبرداروں اور پٹواریوں نے دیہاتیوں کو قائل کیا اور لوگوں پر زور دیا کہ وہ مالیہ سے انکار کر دیں چنانچہ دیہات نے تشخیص کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا مگر اس وقت چھ برس کے بعد جب نئی تشخیص کو تقسیم کیا گیا ہے اور سہ ماہی قسطوں کے نئے طریقۂ کار کو ترویج دی گئی تو مزاحمت کنندہ دیہاتیوں نے گذارش کی کہ انھیں بندوبست کے فائدوں میں داخل کر لیا جائے۔ تشخیص کے اعلان کا کام ہمیشہ پر تشویش ہوتا ہے، عوام کو باور کرانے کے لیے طاقتور مفادات بروئے کار لائے جاتے مگر پانچ تحصیلوں کے بعد مجھے بہت کم دقت محسوس ہوئی، میں ان دیہات کی بنا پر اب اپیل کر سکتا تھا جہاں تشخیص کا کام مکمل کیا جا چکا تھا۔

نقدی اور جنس کے مالیے کی رقم کا تعین

تشخیص کا اگلا نقطہ یہ تھا کہ اس امر کا تعین کیا جائے کہ کس قدر مالیہ جنس کی صورت میں ادا کیا جائے۔ میری ہمیشہ یہ رائے رہی ہے کہ تمام تر تشخیص نقدی کی صورت میں ہونی چاہیے اور میرا تصور یہ تھا کہ ہر تحصیل جب زیر تشخیص آجاتی ہے تو حکومت کی مالیہ کی رقم میں جنس کی صورت میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ حکومت کی طرف سے شہر کے عوام کو اب تک سستے داموں پر غلّہ فروخت کیا جاتا ہے چنانچہ اب انھیں کھلے بازار سے غلّہ خریدنے کا انتظام کرنا چاہیے جس کے لیے نجی تاجر نمودار ہو جائیں گے۔ بہر حال مجھے یہ بتایا گیا کہ دیہاتی خود بھی تمام مالیہ نقدی کی صورت میں ادا کر سکتے ہیں، چنانچہ مجھ پر اس بات کے لیے زبردست دباؤ ڈالا گیا کہ میں مکمل طور پر نقدی ادائیگی کا خیال ترک کر دوں اور یہ داستان دیگر افراد کو بھی بیان کی گئی کہ عوام نہ تو نقدی ادا کر سکتے ہیں اور نہ ہی ادا کرنا چاہتے ہیں۔

سر رچرڈ ٹمپل کو اس امر کی اطلاع 1871ء میں دی گئی (2) اور کشمیر کے اہلکاروں سے اس امر پر زور دینے کا موقع ہاتھ سے چلا گیا کہ نقد ادائیگی عوام میں غیر مقبول ثابت ہو گی۔ 1874ء میں مہاراجہ گلاب سنگھ اور لیفٹیننٹ ریٹیل ٹیلر کے مابین یہ طے پایا تھا کہ سرینگر کے نواح کے تمام

اضلاع اپنا مالیہ آراضی نقدی کی صورت میں ادا کریں اور چاول کی فروخت کو کلیتاً زمینداروں کے اختیار اور ان کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے۔اس میں اس امر کی اضافت کی گئی کہ جو اشخاص ایک روپیہ فی خروار سے زیادہ قیمت پر اسے فروخت کریں گے وہ حکومت کے سامنے جوابدہ ہوں گے مگر پنجاب تک غلے کی برآمد کی کوئی حد مقرر نہیں کی گئی۔ 1873 میں یہ اطلاع دی گئی کہ نقدی کی صورت میں تشخیص کی گئی ہے اور زمینداروں کو اس بات کی آزادی دی گئی کہ وہ جس نرخ پر بھی چاہیں اناج فروخت کر سکتے ہیں۔

اس بات میں شک نہیں کہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کی خواہش تھی کہ نقدی تشخیص کی ترویج کی جائے۔اسے اس امر کا بخوبی احساس تھا کہ جنس کی صورت میں وصولی سے جہاں حکومت کو نقصان ہوتا ہے وہاں دیہاتیوں کو زک پہنچتی ہے۔ 1873 میں نقدی تشخیص کی ایک کوشش کی گئی مگر اہلکار اور درمیان دار اس میں مانع ثابت ہوئے۔سابقہ طریقہ کار کے مطابق یہ کشمیر کے گورنر کے اختیار میں تھا کہ ایک برس کے دوران کس قدر غلّہ جمع کیا جائے اور جب تک نئی تشخیص نہیں ہو جاتی یہ طریقہ کار نافذ العمل رہتا۔

نقدی تشخیص کی مخالفت کے اسباب

نقدی کی صورت میں تشخیص کی کشمیری اہلکاروں اور بااثر طبقات کی طرف سے شدومد سے مخالفت کے دو اسباب تھے۔اوّل یہ کہ جنس کی صورت میں وصولی سے بھاری تعداد میں شہری پنڈتوں کو روزگار حاصل ہوتا ہے اور اس سے شرائط اوّل اور غبن کے بھاری مواقع بھی حاصل ہوتے، یہاں پر یہ بھی بیان کیا جائے کہ غیر گہائی شدہ چاول کی حقیقی بازاری قیمت، سرکاری فروخت سے دوگنی ہوا کرتی تھی۔ یہ ایک قدرتی امر تھا کہ اس قدر منافع دکھائی دینے کی صورت میں ہر کوئی یہ چاہتا تھا کہ یہ غلّہ اس کے ہاتھ لگ جائے۔جن اشخاص کو غلہ جمع کرنے کی ملازمت حاصل ہو جاتی انہیں دیہات میں پہلا فائدہ حاصل ہوتا ہے جہاں وہ حکومت کی حقیقی طلب سے بعض اوقات پانچواں حصہ زیادہ غلّہ وصول کرتے ہیں۔سرینگر تک غلہ پہنچاتے وقت جب وہ غلّے میں آمیزش کرتے ہیں تو ان کو مزید فائدہ حاصل ہوتا ہے۔اگر ادنیٰ غلّے کے نمونے حاصل کر کے اچھا غلّہ آسامیوں کے پاس رہنے دیا جائے تو یہ آسامیاں اچھی خاصی رقم ادا کرتی ہیں مگر مالیہ جمع

کرتے وقت منافع کمانے کا سہل ترین طریقہ یہ ہے کہ غلہ چار روپے کے حساب سے کھلے عام فروخت کرکے سرکاری حساب میں دو روپے دکھائے جائیں۔ جب یہ غلہ شہر تک پہنچتا تھا تو غلے سے بھری کشتیوں کے انچارج اہلکار اعلیٰ قسم کے غلے سے بھری کشتی سے تمام تر غلہ اپنے رفقا یا رشتے داروں کے حوالے کر دیتے۔ خراب قسم اور مشتبہ قسم کا غلہ شہری عوام کو سرکاری نرخوں پر فروخت کر دیا جاتا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ سرینگر شہر ایسے بہت سارے افراد پر مشتمل ہے جو انتہائی غریب ہیں جن افراد کو درمیانہ داروں اور خون چوسنے والوں سے فاقہ کشی سے اجرتیں حاصل ہوتیں ان کے لیے سرکاری نرخوں پر بلا گہائی کے اناج حاصل کرنا لازمی بن جاتا۔ یہ لوگ اس صنعت شال کے یادگاری نشانات ہیں جو کسی وقت اپنے عروج پر تھی۔ سال 1871 کے دوران جنس کی صورت میں 16,93,077 روپے مالیہ وصول کیا گیا۔ جب کہ نقدی کی صورت میں صرف 9,62,057 روپے مالیہ وصول ہوا۔ مگر حکومت نے شال پر ٹیکس سے 6 لاکھ روپے اور شہری دکانداروں سے 1,13,916 روپے وصول کیے تھے۔ مالی نقطۂ نظر سے جنس کی صورت میں مالیہ کا اس قدر زیادہ تناسب وصول کرنے کا کوئی جواز موجود نہیں تھا۔ حکومت کو جو خسارہ جنس کی صورت میں مالیہ کی وصولی سے اٹھانا پڑا اُسے شالباف کارکنوں سے اچھی خاصی آمدنی سے پورا کر لیا گیا مگر 1873 کے دوران یہ طریقہ قائم نہیں رہا کیونکہ تب شال کی صنعت کی موت واقع ہو چکی تھی اور مہاراجہ رنبیر سنگھ کے پاس نقدی وصول کرنے کے لیے ٹھوس مالی و دیگر ذرائع موجود تھے۔ مگر اُسے ایسا کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ میں نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ میرا تصور نقدی وصولیابی کو بتدریج مستحکم بنانا تھا جو اب تک کلیدی طور پر جنس کی صورت میں جمع کی جاتی تھی اور میں نے جن پہلی سات تحصیلوں میں تشخیص کی ان میں مندرجہ ذیل منصوبے پر عمل کیا۔ میں نے جنس کی صورت میں مالیہ کی وصولی کو اہم کلیدی اجناس یعنی چاول اور مکئی تک محدود رکھا اور میں نے تلہن، کپاس اور دالیں وصول کرنے سے انکار کر دیا۔ تشخیص کا اعلان کرتے وقت میں نے ہر گاؤں کو یہ اختیار دیا کہ وہ یہ مالیہ نقدی یا جنس کی صورت میں ادا کریں۔ مزید برآں، نقدی کی صورت میں ادائیگی کی رضامندی میں وہ جنس کی رقم بھی شامل کر لیں۔

نقدی کی صورت میں تشخیص کی ترویج کی میری اسکیم تب تک بلاکسی دقت کے روبہ عمل رہی جب تک میں نے سات تحصیلوں کا بندوبست مکمل کرلیا اور 1891 میں موسم سرما کے دوران میری عدم موجودگی میں کشمیر کے گورنر نے اس وقت بحران پیدا کردیا جب اس نے غیر تشخیص شدہ آٹھ تحصیلوں سے مالیہ کا بیشتر حصہ نقدی کی صورت میں وصول کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہر تک غلہ نہیں پہنچا۔ گورنر کشمیر نے اپنے ارادوں کی بابت حکومت کو قطعی طور پر متنبہ نہیں کیا تھا مگر نجی افراد نے بھاری مقدار میں غلّہ درآمد کرلیا تھا۔ کیونکہ انھیں گورنر کے مقاصد کا پتہ چل چکا تھا۔ اس اچانک تبدیلی کے لیے گورنر نے جس وقت کا انتخاب کیا تھا وہ نہایت موزوں نہیں تھا۔ پہاڑوں پر برف باری ہوچکی تھی۔ جب برفباری کم ہوتی ہے تو کشمیریوں نے ہمیشہ قلیل فصل کی پیش گوئی کی ہوتی ہے۔ 1892 میں شہر میں تباہ کن آگ نمودار ہوئی جس میں غلّے کا بھاری اسٹاک تباہ ہوگیا۔ اس کے بعد ہیضہ کی شدید وبا پھوٹ پڑی۔ کاروبار ٹھپ ہوکر رہ گیا اور دکانیں بند ہوگئیں۔ دیہاتیوں نے غلہ اور رسدات کی شہ تک فراہمی نہیں کی۔ غلّے کی قیمتوں میں بتدریج اضافہ ہوتا گیا۔ اگرچہ چند اقدامات کی وجہ سے شہر میں قحط سالی ٹل گئی مگر یہ ایک قدرتی امر تھا کہ نقدی اور جنس کی صورت میں اچانک وصولیابی سے سرینگر میں مشکلات پیدا ہوں۔

جنس کی صورت میں وصولیابی کا سوال محکمہ بندوبست کے رُوبرو

اس وقت تک میں نے غلّے کی وصولیابی اور اسے ذخیرہ کرنے میں قطعی حصہ نہیں لیا تھا۔ مگر جب حکومت نے 1882 کے واقعات کے بارے میں خطرے سے آگاہ کیا تو یہ فیصلہ کیا گیا کہ مالیہ کا کچھ حصہ جنس کی صورت میں وصول کیا جائے۔ چنانچہ غیر تشخیص شدہ تحصیلوں کے معاملے میں جنس کی صورت میں مالیہ کی طلب کی تقسیم کے معاملے میں رعایت کرتا میں نے منظور کرلیا۔ جنس کی صورت میں مالیہ جمع کرنے کے کام سے دور رہنے کی میری اہم وجہ یہ ہے کہ مجھے یقین تھا کہ یہ سلسلہ اپنی موت خود مرجائے گا مزید برآں میں نے ان معاملات میں دخل اندازی سے احتراز کیا تھا جو گورنر کے دائرہ اختیار میں ہیں مگر جب حکومت نے اس امر کی اطلاع دی کہ کچھ عرصے کے لیے مالیے کا ایک خاطر خواہ حصہ جنس کی صورت میں وصول کیا جائے گا تو میں نے لازمی طور پر یہ

سمجھا کہ جنس کی صورت میں جو مالیہ حاصل کیا جاتا ہے اس کی وصولی اور نپٹارے میں میرے انسپکٹر سرگرم حصہ لیں گے۔

جنس کی صورت میں مالیہ وصول کرنے کے انتظامات

پہلے سال کے دوران جنس کی صورت میں مالیے کی مانگ 3,60,000 خروار مقرر کی گئی۔ جنس کی صورت میں مالیہ وصول کرنے کی وکالت کرنے والوں کے روبرو یہ طلب بہت کم تھی اور یہ طلب کم از کم 5 لاکھ خروار ہونی چاہیے، اس پر آسانی سے عمل کیا جاسکتا۔ بہرحال ہم نے دیکھا کہ سرینگر کے عوام کو کھلے طور پر فروخت کے بعد اور فوج و دیگر محکمہ جات سرکاری تقاضوں کو پورا کرنے کے بعد ہمارے پاس سال کے آخر تک 68,315 خروار غلّہ بچ گیا تھا۔ غلے کی منڈیوں میں قیمتیں کم تھیں اور شہر سے ایک بھی شکایت موصول نہیں ہوئی۔ وصولیابی کے معاملے میں بھی اقدامات کیے گئے، کشتیوں کی درازوں کو مناسب طور پر بند کیا گیا اور جن کشتی رانوں کو آمیزش کا قصوروار پایا گیا، انھیں سزا دی گئی۔ سرکاری گوداموں کی مرمت کی گئی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گوداموں میں جگہ کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔ ایک لاکھ خروار غلہ جمع کیا گیا اور پنڈتوں کی طرف سے 7 لاکھ خروار کی جو تجویز پیش کی گئی تھی وہ سراسر فرضی تھی۔ اگر 7 لاکھ خروار غلہ جمع کیا جاتا تو یہ غلہ شہر کے لوگوں کو فروخت کر دیا جاتا۔ پرانا طریقہ یہ تھا کہ بااثر لوگوں کو کشتی بھر غلہ دے دیا جاتا تو اسے دریا کے کنارے تک جانا پڑتا۔ جہاں اُسے اپنے کنبے کے ہر فرد کے لیے 21 سیر گوہائی شدہ چاول یا مکئی حاصل ہوتی۔ سرکاری غلہ جمع کرنے اور اس کی فروخت کے معاملے میں ان اختلافات کی راہ میں آئی دشواریوں کا بیان نہایت طویل ہوگا۔ اگرچہ امیروں اور بااثر لوگوں نے اس تبدیلی کی مخالفت کی مگر اس کی بدولت سرینگر کے غریب عوام اب سرکاری قیمتوں پر صاف اور غیر آمیزش شدہ غلّہ خرید سکتے ہیں۔ حکومت کی پالیسی کے لیے مستقبل میں جو بات مشعل راہ ہونی چاہیے اس کے مطابق ہر برس طلب میں کمی ہونی چاہئے۔ 1893 میں اس طلب کو کم کرکے 3 لاکھ خروار کر دیا گیا اور میرا خیال ہے کہ ایک لاکھ تک لانا ایک صحیح قدم ہوگا (3)۔ سرکاری طلب میں بھاری کمی کے ساتھ غلے کی نجی تجارت میں متوازی توسیع ہوگی مگر جب تک کشمیر میں تجارت زیادہ صحت مند بنیادوں پر نہ ہو اور قیمتوں پر وہی دوسرے ملکوں کی مانند امور ہی غالب رہیں چنانچہ 1 لاکھ خروار کا

سرکاری تحفظ قائم رکھنا دانشمندی ہوگی۔ اس تحفظ سے وہ گھیرا جزوی طور پر رک سکے گا جو غلہ تاجروں اور جزوی طور پر ایسے بیجوں کی رسد سے تھا جن کے سبب فصل ناکام ہوسکتی تھی۔ دیگر غیر ضروری ضرررساں مروجات میں میں نے وہ طریقۂ کار ختم کردیا جس کے تحت غلّے کا ایک کثیر حصہ چھوٹے قصبات، مقامات، مرحلے کے استعمال کے لیے مخصوص رکھا جاتا ہے۔ ان قصبات کی 60,000 کی بہت بڑی مانگ پیش کی گئی تھی جبکہ مقامات مرحلہ کے لیے قریباً 20,000 خروار غلّہ طلب کیا گیا۔ میں اس بات کو ظاہر کرنے کے قابل ہوگیا کہ یہ غلّہ کبھی قصبات تک نہیں پہنچ پاتا تھا۔ جہاں تک مقامات مرحلہ کا تعلق ہے میں نے نجی تاجروں کو غلّے اور دیگر اشیا کی فراہمی کے لیے مائل کیا۔ انتظامات خوش اسلوبی سے چلتے رہے اور سرینگر کے سوائے کشمیر کے اہلکاروں کو اب رسدات پر چوں کرنے کے کام سے فارغ کردیا گیا۔ اسی اثنا میں انھیں ایک شرط اوّل سے محروم کردیا گیا۔ بہرحال اس کو ان کی تنخواہوں میں اچھا خاصا اضافہ کرکے پورا کردیا گیا ہے۔

وصولیابی کے سلسلے میں جنس کو نقدی کا نعم البدل بنائے جانے کے معاملے میں ایک دلیل کشمیر میں تجارت کی موجودہ حالت تھی۔ اکثر اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ ایک کشمیری دیہاتی کبھی اپنا فاضل غلّہ فروخت نہیں کرے گا۔ اس بات کو فراموش کردیا گیا کہ جب بندوبست کا سلسلہ شروع ہوا یا اس کے بعد بھی جس کشمیری کاشتکار کے ہاں بلا گہائی غلّہ ہوا اس پر سرسری مقدمہ چلا کر سزا دی جائے گی۔ اہلکار غلّے کے معاملے میں اجارہ داری اور تاجروں کو مقابلے کی اجازت دینے کی قدروقیمت سے بخوبی واقف تھے۔ چنانچہ اب بھی قدیم طرز کے دیہاتی اپنی پیداوار چوری چھپے فروخت کرتے ہیں۔ یہ صورتحال اب مسلسل بدل رہی ہے اور جہاں تک فروخت کا سوال ہے اس کے بارے میں میرا خیال ہے کہ کاشتکار فروخت کے طور پر غلہ دینے میں کسی قسم کی حیلہ بازی نہیں کرے گا۔ کشمیری کافی ذہین ہوتا ہے اور وہ بجا طور پر جانتا ہے کہ دو برس گذرنے کے بعد غلہ خراب ہوجاتا ہے یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ایک برس کے لیے رسد محفوظ رکھے مگر وہ اسے اس سے زیادہ اپنے پاس نہیں رکھے گا۔

جہاں تک اس مقدار کا تعلق ہے جس کی حد تک جنس کی صورت میں وصولیابی کی طلب کو کم کیا گیا ہے چنانچہ میں نہیں سمجھتا کہ 3 لاکھ خروار غلہ زرعی مفادات کو زبردست نقصان پہنچائے گا مگر

حکومت کو اس کی وجہ سے کئی طرح کا نقصان ہوگا اس سے محکمہ مال کے افسروں پر غیر ضروری بوجھ پڑے گا۔ تعمیرات عامہ کے بڑے کاموں اور کشمیر میں آنے والے سیاحوں میں بتدریج اضافے سے اب ماضی کے مقابلے میں دولت کی قدرے فراوانی ہے اور مجھے یقین ہے کہ اب مالیہ نقدی کی صورت میں ادا کیا جاسکتا ہے۔ ان متعدد گذارشات جن میں نقدی کی صورت میں مالیہ ادا کرنے کی اجازت مانگی ہے۔ میں صرف اتنا کہوں گا کہ اب ایسی بہت کم آسامیاں ہیں جو نقدی تشخیص کا خیر مقدم نہیں کریں گی۔

جس قدر بھی نگرانی ہو جنس کی صورت میں وصولیابی میں ہونے والی چوری کا خیال رکھنے کے علاوہ حکومت کو ہائی فرش سے شہر تک غلہ لانے میں بار برداری اور غلے کا ذخیرہ کرنے کے لیے ایجنسی اور گوداموں کی دیکھ بھال پر خرچ اٹھانا پڑتا ہے۔ ان تمام معاملات میں حکومت کو خسارہ اٹھانا پڑتا ہے۔ یہ ایک قدرتی بات ہے کہ درمیانہ دار اور استحصالی عناصر بہت منافع کما رہے ہیں۔ سرینگر کے مفلوک الحال طبقے کو چھوڑ کر غلے کی صورت میں مالیہ وصول کرنے میں بتدریج کمی سے سبھی طبقوں کو فائدہ ہوگا جو درمیانہ دار ماضی میں شرائط اول پر گذارہ کرتے تھے جو جائز تجارت کا یکساں صحت مند اور فائدہ بخش طریقہ ہے۔ زراعت پیشہ افراد کا یہ دیرینہ احساس جلد ختم ہو جائے گا کہ وہ محض زرعی غلام ہیں جو محض شہریوں کے مفادات کے لیے کاشت کر رہے ہیں۔

سال 1891 کے آخر میں حکومت کی طرف سے کیے گئے اقدامات میں وہ اقدام بھی شامل تھا کہ کشمیر میں چاول کی برآمد پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اس پابندی نے ابھی تک قیمتوں کو متاثر نہیں کیا ہے۔ مگر چاول کی پیداوار میں کسی بھی طرح اضافہ نہیں ہوا ہے۔ مگر نئے رقبے زیر کاشت آنے کے ساتھ چاول کی پیداوار میں بلاشبہ اضافہ ہوگا اور عین ممکن ہے کہ پیداوار میں اضافے کے ساتھ غیر گوہائی شدہ ایک خروار چاول کی قیمت کم ہو کر ایک روپیہ 80 پیسہ یا اس سے بھی کم ایک روپیہ 80 پیسہ ہو جائے گی۔ میں نے حکومت کو مشورہ دیا ہے کہ جب گوہائی کے بغیر چاول کی قیمت ایک روپیہ 80 پیسہ ایک خروار تک آ جائے تو برآمد کی اجازت دے دی جائے۔

مالیات کی اندرونی تقسیم

ہر گاؤں کا مالیہ طے کرنے کے اور یہ تعین کرنے کے بعد کہ کس قدر مالیہ جنس یا نقدی کی

صورت میں ادا کیا جائے، اب میرے لیے آئندہ قدم مختلف کھیتوں کے درمیان مالیہ کی تقسیم تھا۔ ماضی میں گاؤں کے لمبرداراور بارسوخ لوگ فقط برائے نام مالیہ ادا کرتے تھے اور سرکاری واجبات کی ادائیگی کمزور اور بے زبان آسامیوں کو ادا کرنا پڑتی تھی۔ میری تقسیم کے نتیجے میں کھیتوں کے رقبے متعین تھے مگر ساتھ ہی ساتھ اس کی ساخت اور آبپاشی کو بھی ملحوظ نظر رکھا جاتا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آسامیوں پر بوجھ ہلکا ہو گیا جبکہ لمبرداروں، پٹواریوں اور دیگر بارسوخ افراد کو اپنے حصے کا مالیہ ادا کرنے کے لیے کہا گیا۔ اس بارے میں مخالفت کی گئی مگر اس پر غلبہ پالیا گیا۔ جب ممکن ہوا تو یہ تقسیم عوامی خواہشات اور گاؤں کی بیشتر آسامیوں کی رائے سے کی گئی۔ جہاں کہیں اتفاق رائے کی کوئی گنجائش نہیں رہی وہاں مالیہ کے سلسلے میں نئی شرحیں مٹی کی ساخت کے مطابق مقرر کی گئیں۔ ایک کشمیری گاؤں کے کھیتوں میں مٹی کے مختلف اقسام ہوتی ہیں۔ اگر ایک طرف چند صورتوں میں کھیتوں کی زائد تشخیص کی گئی جبکہ دوسرے کھیتوں کے معاملے میں تشخیص کم تھی مگر مجموعی طور پر، ایک گاؤں میں کھیتوں کے بکھرے پڑے ہونے کی وجہ سے مالیے کی تقسیم منصفانہ ہو سکی ہے۔ اگر چہ محصولات کی وصولی کے معاملے میں یہ مکمل نہیں ہے۔

پٹواری

کچھ حد تک لمبرداروں کو اس سے خوش کیا گیا تھا کہ انھیں مجموعی وصولیابی کا پانچ فیصد حاصل ہوتا تھا مگر پٹواریوں اور دیگر افراد کا دل رکھنے کے لیے میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ مغل عہد سے لے کر پٹواریوں کی حیثیت خواہ کچھ بھی رہی ہو مگر جب کھیتوں کو ٹھیکہ پر دینے کا طریقۂ کار شروع کیا گیا تو وہ کسی طرح سے بھی ایک کارآمد نہیں رہا۔ جب بندوبست کا کام شروع ہوا تو مسٹر ونگیٹ نے سروے کے کام میں پٹواریوں کی خدمات کو بروئے کار لانے کی قطعی طور پر کوئی کوشش نہیں کی کیونکہ انھوں نے سمجھا کہ یہ سب ناکارہ اور فضول تصور کیا۔ میں نے پٹواری اسکول شروع کیے جہاں سے میں نے چند بہترین جائزہ کار حاصل کیے مگر دیہات میں میرے تجربے نے مجھے دکھایا کہ پٹواریوں کے قدیم طریقۂ کار میں زبردست اصلاح کی ضرورت ہے۔ پٹواری کی تقرری اور برطرفی کا کام دیہاتی کرتے تھے۔ نہ ہی تحصیل حکام کو پتہ ہوتا اور نہ ہی وہ پٹواری ایجنسی کی پرواہ کرتے۔ پرانا تصور یہ تھا کہ پٹواری کا عہدہ موروثی ہے جو اب ختم ہو کر رہ گیا۔ نہ صرف دوسال

کے بعد ایک پٹواری کو نکال دیا جاتا ہے بلکہ گاؤں میں دھڑے بندی ہو جاتی اور ہر دھڑا اپنا پٹواری منتخب کر لیتا۔ پٹواریوں کے پاس بہت کم کاغذات ہوتے اور انتہائی حالات میں ان کے پاس کاغذات میں تسلسل کا فقدان ہوتا۔ مقامی حکام کی طرف سے عملی طور پر اس عہدے کو تسلیم نہیں کیا جاتا ہے کہ وہ اس خام خیالی میں رہتے کہ پٹواری کی ایجنسی کا واقعی وجود ہے اور وہ حقیقی مالیہ حسابات کو برقرار رکھتا ہے۔ پٹواریوں کی تعداد کافی زیادہ تھی اور ان کی تنخواہ وہی تھی جو وہ دیہاتیوں سے وصول کر سکتے تھے مگر ہمیں ان کی تعداد میں بھاری تخفیف کرنا پڑی اور ہم نے کشمیر کے پٹواریوں کو تین زمرات میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے دو زمرات میں وہ پٹواری آتے ہیں جنھوں نے بندوبست آراضی کا کام کیا ہے اور جو دیہات کے مالیاتی حسابات رکھ سکتے ہیں، ان کی تقرری کی جاتی۔ جن دیہات میں سیلابوں کا احتمال رہتا ہے یا جہاں پر بھاری تعداد میں مالیہ وصول ہوتا ہے وہ پہلے اور دوسرے زمرے کے پٹواریوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ تیسرے زمرے میں زیادہ قابل اور مستحق سابقہ پٹواریوں کو منتخب کیا جاتا ہے۔ ایسے پہاڑی دیہات میں جہاں مالیہ خاطر خواہ نہیں اور ان کی توسیع بھی ممکن نہیں، وہ تیسرے زمرے کے پٹواریوں کی تعداد میں تبدیلی پر کف افسوس ملتا ہے۔ اسی قدر زیادہ پٹواری فقط عارضی عہدے دار تھے مگر ان میں سے بیشتر افراد کے پاس زمینیں ہوتیں جن پر ان کے گزر بسر کا دارومدار تھا۔ بندوبست میں تیار کردہ کاغذات اور نقشوں کی دیکھ بھال کے لیے یہ لازمی ہے کہ جو بھی پٹواری تعینات کیے جائیں وہ سب کشمیری ہوں اور ان میں سے بیشتر سابقہ پٹواریوں کے بیٹے اور رشتے داروں کا تقرر کیا گیا۔ گزشتہ 13 برسوں کے تجربے سے معلوم ہوتا ہے کہ جن پٹواریوں کا تقرر دیہاتیوں کی مرضی پر تھا وہ حکومت کے مفادات کا تحفظ نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ یہ بات حکومت اور مالیہ دونوں کے مفادات میں ہے تاکہ متعدد دیہات کے ریکارڈ کو محفوظ رکھا جا سکے۔ نئے پٹواری تربیت یافتہ افراد ہونے چاہئیں وہ دیہاتیوں کے نہیں بلکہ حکومت کے ملازم ہوتے ہیں۔

لمبردار

عین اسی طرح جیسے پٹواریوں کی تقرری اور برطرفی دیہاتیوں کے ہاتھ میں تھی لمبرداروں کو بھی اُسی صورت میں ہٹایا جا سکتا تھا جب وہ طاقتور دھڑے کو ناراض کر لیتے یا مالیہ آراضی کی وصولی

میں بہت زیادہ جوش اور ولولے کا مظاہرہ کرتے ،لمبردار کا تقرر حتمی طور پر ہز ہائینس مہاراجہ کرتے ہیں ۔اور وہ ان ہی کے ماتحت براہ راست کام کرتا ہے ۔یہ عہدہ موروثی ہوتا ہے ۔میں نے اکثر اس سوال پر غور کیا ہے کہ آیا ایک گاؤں کی آسامیاں مالیے کے لیے مشترکہ طور پر ذمہ دار ہوں گی مگر میرا خیال یہ نہیں کہ کشمیر کے دیہات کی حالت ایسی ہے کہ وہ اس طریقۂ کار کی اجازت دیں ۔ایک گاؤں کی آسامیوں کے مابین نہ کوئی اتحاد اور نہ ہی تعاون ہے ۔ہر شخص اپنے ہمسایے سے بدگمان ہے ۔کوئی شخص ایک دیوالیہ کے لیے ضمانت نہیں دے گا یا گاؤں کا ناعاقبت اندیش رکن نہیں بنے گا ۔لمبردار حکومت کی طرف سے مالیے کا پانچ فیصد تنخواہ کے طور پر حاصل کرتا ہے اور مالیہ آراضی کی وصولی کے لیے ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے ۔یہ اس کا فرض بنتا ہے کہ وہ آسامی کو فرار ہونے سے روکے اور اگر آسامی فرار ہو جاتا ہے تو اس کھیت میں کاشت کا انتظام کرنا اور مالیے کی ادائیگی کے لیے اسے ذمہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا ۔اور جن کھیتوں پر مالیے کی ادائیگی نہیں ہو پاتی اس کا نام قبل الوصل کرایہ سے ہٹا دیا جا سکتا ہے ۔مختصر یہ کہ قدیم طریقۂ کار کو بحال رکھا گیا ہے ۔لمبردار کے عہدے کو اب مستحکم بنیادوں پر لایا گیا ہے ۔ان کے فرائض کی وضاحت کی گئی ہے اور اس پر عملدرآمد ہوگا ۔مستقبل کے حالات کا بھاری انحصار لمبرداروں پر ہوگا اب گاؤں کی آسامیاں اپنے مالیہ کی حد سے واقف ہیں ۔لمبردار اگر بندوبست میں متعینہ مالیہ سے زیادہ وصول کرنے کی کوشش کرتا ہے تو دیہی عوام اس کے خلاف احتجاج پر آمادہ ہو جاتے ہیں ۔ماضی میں بھاری اثر ورسوخ رکھنے والے لمبردار عوام کے لیے وبال جان ثابت ہوئے ہیں مگر ان کے اختیارات اور راہزنی اور لوٹ کھسوٹ کے مواقع کو اب عام طور پر کم کر دیا گیا ہے ۔

دیگر مشرقی علاقوں کی مانند لمبردار اب اپنے شرائط اوّل وصول کرے گا مگر کسی طور پر راشی اہلکاروں کا وصول کنندہ نہیں بنے گا ۔میں اس بات کا دعویٰ نہیں کرتا کہ چند برسوں کے اندر افسر ایماندار بن جائیں گے مگر مجھے اس بات کا یقین ہے کہ چند برسوں کے اندر شرائط اوّل (رسوم) کا سابقہ رواج ختم ہو کر رہ جائے گا ۔کشمیر کے آسامیوں نے اس بات کو سمجھ لیا ہے کہ جب تک وہ نہیں چاہیں انھیں رسوم ادا کرنے کی ضرورت نہیں اور ایک کشمیری فضول میں کچھ بھی ادا نہیں کرتا ۔

چند وجوہ کی بنا پر گلگت بیگار کے معاملے میں متعلقہ لوگ رسوم اور سنگین قسم کی زورزبردستی ،

مالیہ کی کپاس، تلہن وغیرہ کی صورت میں وصولی سے مستثنیٰ قرار دیے گئے۔ چنانچہ دیہاتی عوام کے پاس غلّہ اپنے گذارے کے لیے وافر مقدار میں موجود رہ سکتا تھا اور انھیں سرکار کے بقایا کا ایک حصہ رکھنے کی اجازت بھی تھی۔ تحصیلدار یہ رعایتیں اب نہیں دے سکتا۔ تکلیف دہ قسم کا بیگار اب ختم ہو چکا ہے۔ اب ہر آسامی نقدی یا جنس کی صورت میں ادائیگی کرتا ہے جس کا تعین پہلے ہی سے کیا جاتا ہے اور بقایاجات کو زیادہ دیر تک التوا میں نہیں رکھا جا سکتا حتیٰ کہ حکام کو اس امر کا اطمینان نہ ہو کہ مالیہ پورے طور پر ادا نہیں کیا جا سکتا۔

بقایاجات

بقایاجات کے سوال پر میں نے مختلف تشخیصی رپورٹوں میں مفصل بحث کی ہے۔ یہ ایک قدیم روایت ہے کہ جب ایک شخص خزانۂ عامرہ کا باقی دار ہوتا تو وہ نہایت اطاعت پذیر ہوتا' بہت سارے اہلکار بھی باقی دار ہیں اور تمام دیہات کا اندراج بقایاجات کی فہرست میں کیا جا چکا ہے۔ بقایاجات کے طریقۂ کار کا تذکرہ میں انتظامیہ کے باب میں کر چکا ہوں۔ اب میں اس تشخیصی رپورٹ کا حوالہ دوں گا جس کے بعد ہز ہائنس مہاراجہ نے لمبرداروں اور ان کے بیٹوں کے اجتماع میں مالیہ آراضی کے بقایاجات کو معاف کرنے کا اعلان کیا۔ حکومت کا یہ ایک دانش مندانہ فیصلہ تھا۔ سابقہ اہلکاروں نے اس اقدام کی مخالفت کی مگر میری رائے تو یہ تھی کہ اگر ان بقایاجات کو درست تسلیم کر لیا جائے تو بے ایمانی اور فریب کاری کے سبب ان کی مذمت کی جا چکی تھی۔ قدیم روایات اس پر زور دے رہی تھیں کہ دیہاتیوں پر گرفت قائم رکھنے کے معاملے میں یہ ایک خطرناک انحراف تھا اور حکومت کی مالی حیثیت یا یہ تقاضا تھا کہ ان اثاثہ جات کو وصول کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جانی چاہیے۔ دوسرے اقدامات کی مانند اس اقدام کو بھی ہز ہائنس مہاراجہ اور اس کے کونسل کی منظوری حاصل تھی اور اس بارے میں اس شہادت کی ضرورت تھی کہ دیہاتیوں نے فریب کاریوں کے چلن سے استفادہ نہیں کیا ہے جو 'بقایاجات' کی صورت میں دائمی صورت اختیار کر چکا تھا۔

تشخیصی رپورٹ تحصیل رنبیر سنگھ پورہ، پیراگراف 6: مختصر یہ کہ محکمہ مال کے افسروں کی یہ پالیسی رہی ہے کہ ملک کی توثیق کے مالیہ کے بیان کے معاملے میں مبالغہ آمیزی سے کام لیا جائے

اور حقیقی آمدنی کے بارے میں دربار کے ساتھ دھوکہ دہی کی جائے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ صدر مقام پر مالیہ میں کاغذی اضافے سے خوش آئند تصور کیا جائے گا۔ اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک تحصیل کا برائے نام مالیہ مضحکہ خیز اور بھاری بقایا جات فرضی ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس تحصیل کی بابت میں متعدد مثالیں بیان کر کے اس بات کو ثابت کر سکتا تھا کہ یہ برائے نام مالیہ کس قدر گمراہ کن ہے۔ تحصیل نور پورہ میں برائے نام مالیہ 2141 روپے ہے۔ سموت 1848 کے دوران بقایا جات 15611 روپے تھے۔ سموت 1947 میں صرف 7 روپے وصول کیے گئے۔ اس بات کا تصور مضحکہ خیز ہوگا کہ نور پورہ جیسی وسیع تحصیل میں تحصیلدار کی کاشوں کے باوجود صرف 7 روپے وصول کیے جا سکے مگر رنبیر سنگھ پورہ میں سموت 1937 کی غلطیوں کے سبب مالی انتظام اس قدر بری حالت میں تھے کہ دیہاتی کسی قسم کا مالیہ ادا کرنے کے معاملے میں خود کو پابند نہیں سمجھتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ برائے نام مالیہ محض فرضی ہے جس کا حساب محض دربار کو فریب دینے کے لیے لگایا گیا ہے اس قسم کے حالات میں منصفانہ بندوبست کی ترویج ایک مشکل کام ہے۔ یہ بات سمجھنا بھی آسان ہے کہ نور پورہ جیسے گاؤں میں ایک تحصیلدار سال بھر کے لیے 7 روپے کی ادائیگی سے ہی مطمئن ہے اور ایسے نظام کے تحت جہاں مالیہ ادا کرنے میں ناکامی کے بعد جبر سے کام لیا جاتا ہے۔ اس گاؤں میں صرف اور پھلوں کے درختوں کی مالیت 100 روپے ہے مگر اخروٹ، پھلوں اور کاشت شدہ 195 ایکڑ آراضی سے صرف 7 روپے وصول ہوتے ہیں۔ مجھے شاید یہ کیفیت بیان کرنے کی ضرورت نہ ہو کہ سموت 1947 کے دوران 29 آسامیوں نے جو مناسب مالیہ ادا کیا اس کی مالیت 7 روپے سے کافی زیادہ ہوگی مگر بقایا رقم خزانہ عامرہ تک نہیں پہنچی۔

اس بات کو سمجھنا محال ہے کہ مالیہ حسابات کا یہ تاریک اور مبہم طریقہ کار شروع کرنے کی اجازت کیوں کر دی گئی۔ مثال کے طور پر جب ہز ہائنس مہاراجہ گلاب سنگھ نے نوگام کے مالیہ سے 710 روپے کی گذارش عطا کی تو یہ تصور کیا گیا کہ اس کی مراد اس رقم کو مالیہ اراضی سے الگ کرنا ہے اور یہ تمام مالیہ آراضی کی علاحدگی تھی مگر دفتر دیوانی نے یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ مالیہ آراضی کو ختم نہیں کیا گیا ہے۔ نوگام کے حساب میں ہمیں 710 روپے بقایا دکھا۔ اس گاؤں میں رواج ہے اور 1947 تک رنبیر سنگھ پورہ تحصیل کے کل بقایا جات کی رقم 5,69,644 روپے تھی۔ جیسا کہ

میں نے دوسری تحصیلات کی تشخیص کی ہے اس کے مطابق میں نہایت مکمل تشخیص کی تجویز کروں گا اور میری یہ رائے ہے کہ آئندہ چند برسوں تک نئی تشخیص سے زیادہ دیہاتی کچھ بھی ادا کرنے کے قابل نہیں ہوں گے۔ اگر کونسل کو یاد ہوگا کہ جس انداز میں حسابات رکھے گئے ہیں۔

اس کے مطابق ایک گاؤں میں مہارلجہ کی طرف سے دی گئی گذارش کو کس طرح بقایا کی صورت میں درج کیا جا سکتا ہے۔ اگر کونسل کو یاد ہو تو سموت 1937 کی تشخیصات شروع کرنے کے اعلان سے ہی بھاری رقوم سے عملی طور پر معافی دے دی گئی تھی اور یہ اقدام تکرار جمع کے تحت کیا گیا۔ اگر اسے حتمی صورت میں یاد ہو تو 1937 میں متعینہ مالیہ پر نہ تو تحصیلدار اور نہ ہی دیہاتیوں نے کبھی عمل کیا۔ مجھے توقع ہے کہ نئی تشخیص کے اعلان سے قبل بقایا جات کی معافی کا اعلان کر دیا جائے گا۔ جب لال اور پھاک تحصیلات کی تشخیصی رپورٹوں کی منظوری دی گئی تو یہی راستہ اختیار کیا گیا تھا مگر چند مخصوص اسباب کی بنا پر دیگر تحصیلات کے بارے میں واضح احکامات صادر نہیں کیے گئے۔ معاملے کو مختصر طور پر بیان کرنے کے لیے میں فقط اتنا ہی کہوں گا کہ اگر بقایا جات وصول کرنے کی کوشش کی گئی تو کچھ بھی حاصل نہیں ہو سکے گا اور بندوبست عملی طور پر بے مقصد ہو کر رہ جائے گا۔ بندوبست کا ایک اہم مقصد یہ رہا ہے کہ ایک منصفانہ اور مکمل تشخیص کا تعین کر کے دربار کے ہاتھوں میں دے دیا جائے اور اس کے اہلکاران مال ریکارڈ کو واضح کر دیں کہ کشمیر میں ایک آسامی کو کیا دینا ہے۔ ان کاغذات کی بدولت تحصیلداروں اور ان کے اہلکاروں کی طرف سے غبن کرنے کی کوشش دور کی جائے گی اور ملک کی خوشحالی کو یقینی بنایا جا سکے گا۔ اگر یہ بقایا جات اب دیہی سربراہوں کے پاس رہیں اور تحصیلدار کے پاس مخمصہ پیدا کرنے کے اختیارات موجود رہیں تو تحصیلدار کے مجوزہ گرفتاری کا وہ قدیم فریب کاری کا طریقہ دوبارہ پھلنے پھولنے لگے گا۔ اس نقصان کے سبب دربار کی بدنامی ہوگی اور کاشتکاروں کی رشوت کے سبب بربادی ہوگی۔ اگر میرے خیال میں حقیقی اور فرضی بقایا جات میں تمیز ہو سکے اور یہ ممکن ہو کہ حقیقی بقایا داروں کا پتہ لگا کر ان سے کچھ نہ کچھ وصول کیا جائے تو مجھے یہ سفارش کرتے ہوئے قطعی عار نہ ہوگا کہ ان بقایا جات کا کچھ حصہ وصول کیا جائے مگر بقایا دار تاجر اب غائب ہو چکے ہیں، تحصیلداروں کو تبدیل کیا جا چکا ہے یا وہ ترکِ ملازمت کر چکے ہیں اور ان کے پاس کوئی بھی جائداد قابل ضبطی نہیں ہے۔

چنانچہ وصولیات کی کوئی بھی کوشش آسامیوں کے لیے فرار عام کے اشارے کے مترادف ہوئی اور اسی بنا پر میں سفارش کرتا ہوں اور میں اپنے تجربے کی بنا پر کہتا ہوں کہ نئی تشخیصات کے اعلان سے قبل تمام بقایاجات کو معاف کر دیا جانا چاہیے۔ میں اس مسودہ کے بقایاجات شامل نہیں کرتا جو تشخیص سے قبل برس میں عطا کیا گیا ہے۔

اختتامیہ

تشخیص کے یہ اہم نقطے ہیں کہ انصاف پروری اور نرم روی کے سبب حکومت نے زرعی طبقوں کا اعتماد حاصل کر لیا ہے اور انسانی یادداشت کی نسبت کشمیر اب زیادہ خوشحال اور کاشت شدہ علاقہ ہے 1892 کے مہلک ہیضے اور 1893 کے تباہ کن سیلابوں نے ان پر زبردست اثر ڈالا مگر متاثرہ گاؤں بچ گئے وہ تباہ شدہ اور شکستہ حال ہیں اور کرایے کا قبض الوصول صحیح سلامت ہے۔ جو زراعت پیشہ لوگ منصفانہ سلوک کی تلاش میں ایک سے دوسرے گاؤں تک دربدر گھومتے تھے اب آباد ہو گئے ہیں اور اپنے آبائی دیہات کے ساتھ ان کی مستقل وابستگی ہے۔ مالیہ اب مقررہ تاریخ سے قبل ادا کر دیا جاتا ہے جب کہ 1884 میں مالیہ جمع کرنے کی خاطر 7,729 افراد کی ایک فورس رکھنا پڑتی تھی مگر اب تحصیل کا چپراسی شاذونادر ہی گاؤں کا دورہ کرتا ہے۔ ٹھیکیدار اب منظر سے غائب ہو چکا ہے۔ دیہاتیوں کا واسطہ اب تحصیلداروں کیساتھ پڑتا ہے اور وہ اپنی تنخواہ کے سبب باعزت طور پر گذر بسر کرتے ہیں۔ ہر آسامی کو اب نقد اور جنس کی صورت میں واجب الادا ذمہ داریوں کی بابت معلوم ہے اور جو مقدار اس کی مالیہ کتاب میں درج ہے اس سے زیادہ اینٹھنے کی وہ زبردست مزاحمت کرتا ہے۔ بیگار کی زیادہ سنگین بدعت کو اب ختم کر دیا گیا ہے اور ایک کاشت کار کے پاس کھیتوں کی دیکھ بھال کے لیے کافی وقت ہے۔ اب اس کا یہ خوف بھی ختم ہو گیا ہے کہ اس کے کنبے کے گذارے کے لیے وافر مقدار میں غلہ نہیں بچے گا۔ میرے خیال میں کشمیر کا زرعی طبقہ اب دنیا کے کسی بھی زرعی طبقے کی مانند روٹی اور کپڑے کے معاملے میں فارغ البال ہے۔

اگر بندوبست کی شرائط پر ایمانداری سے عمل کیا گیا تو اعتماد میں اضافہ ہوگا اور کاشت اور ترقی کے معاملے میں نہ صرف بہت بڑا انقلاب رونما ہوگا بلکہ عوام کے کردار اور ایمانداری کا رتبہ بھی بلند ہوگا۔ اب تک ان پر کبھی بھروسہ نہیں کیا گیا ہے۔ جب سے بندوبست کی ابتدا ہوئی

تب سے شروع کیے گئے دوسرے اقدامات سے زراعت پیشہ اور کاشت کار سماج پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ کشمیر میں رونما ہونے والی صحت وصفائی کی اصلاحات کے سبب ہیضہ کی تباہ کاریوں کا تدارک ہوگا اور زرعی آبادی کو مسلسل نقصانات سے نجات حاصل ہوگی۔ 1893 کے اواخر میں ٹیکے لگنے میں جس جوش وخروش کا مظاہرہ کیا گیا تھا اس کے سبب اہم اعداد وشمار میں بھاری انقلاب آئے گا۔ کشمیر کو دنیا میں نہایت زرخیز اور خوشحال ترین خطہ بنانے کے لیے دو باتوں کی اشد ضرورت ہے۔ ایمانداری اور مضبوط اور دوسری بات آبادی میں بتدریج اضافہ ہو۔

بندوبست میں وقت کا مصرف

سروے کا کام 1887 میں شروع کیا گیا اور 1893 میں یہ اختتام پذیر ہوا۔ کشمیر میں کھیتی کا موسم مئی سے اکتوبر تک بیان کیا گیا ہے مگر اس معاملے میں تاخیر اس وجہ سے واقع ہوئی کہ ہمارے سروئیروں کو نہ صرف وادی بلکہ علاقہ جموں کی چند تحصیلوں کا سروے بھی کرنا تھا۔ جموں اور کشمیر کے درمیان نقل وحمل کے باعث بہت وقت ضائع ہوا۔ 1890 اور اس کے بعد میں دوبارہ 1892 میں موسم سرما کے دوران کشمیر میں رہا۔ اس نقل مکانی کے دوران ہونے والی تاخیر کے علاوہ کشمیر میں جہاں چاول کے کھیت چھوٹے ہیں سروے کا کام نہایت پیچیدہ اور دشوار ہے۔ اگر میں نے سروے کے عمل میں بھاری اضافہ کیا ہوتا تو سروے کا کام زیادہ سرعت کے ساتھ مکمل کرلیا ہوتا۔ مگر چند وجوہات کی بنا پر میں نے اس معاملے میں بتدریج عمل کرنا مناسب سمجھا۔ تشخیص کا کام اور اس کی تمام تر تفصیلات کو میں نے اپنے ہاتھوں میں ہی رکھا۔ اس دشواری اور کوشش کے ساتھ میں نے سروے کی رفتار قائم رکھی۔ اس کے علاوہ کشمیر میں میری حیثیت ایک معمولی سٹلمینٹ آفیسر جیسی نہیں تھی۔ حکومت میرے ساتھ تمام مالی انتظامیہ کے بارے میں مشورہ کرتی اور زمین کے مقدمات کو عام عدالتوں سے نکال کر میرے دائرہ اختیار میں دے دیا کرتی۔ عام حالات میں یہ فرائض ایک گورنر اور اس کے ماتحت کو سرانجام دینا ہوتے تھے مگر اب مجھے تفویض کر دیے گئے۔ 1892 میں دیہات کے معائنے کا کام سیلابوں کی وجہ سے متاثر ہوا جس نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں بندوبست کے کام کو بالائے طاق رکھ دوں۔ اسی برس کے گلگت تک سفر کرنے کے لیے میرا ایک ماہ کا وقت صرف ہوا۔ بنجر زمینوں کو منتقل کرنے کے لیے بھی میرے دفتر کو کافی محنت کرنا پڑی جب کہ لوگوں

کے باغات ،بنفشے کی کیاریوں کے باغات اور اس سے قدرے کم ابریشم کے ساتھ میری وابستگی کے کام کی سرعت میں مانع ثابت ہوئے مگر میں نے جو تجربہ حاصل کیا اس سے مجھے یہ بات سوچنی پڑی اگر میں بندوبست کے کام جلد بازی میں کرتا تو یہ ایک بھاری غلطی کے مترادف ہوتا۔ ہر سال گزرنے کے ساتھ جہاں میری معلومات میں اضافہ ہوا وہاں اہلکاروں اور عوام پر مجھے زیادہ اختیارات حاصل ہوئے ۔ پہلے پہل تو ہمارا کام محض تجرباتی نوعیت کا تھا اور ہم اپنی بنیاد کے معاملے پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ مجھے اس امر میں شک ہے کہ جلد بازی میں کوئی کفایت شعاری ہوتی مگر میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ صحت اور پائداری کے معاملے میں یہ مہلک ہوتا۔

بندوبست کارروائیوں کے مالی نقطۂ نظر سے فوری مالی نتائج کو ملحوظ خاطر لانا پڑتا ہے۔ سال بہ سال مالیہ اراضی کی رقم میں اضافہ ہو۔ اگر اس امر کو بھی نظر انداز کر دیا جائے کہ مالیہ اراضی کی اضافہ مانگ ایک حقیقت ہے بلکہ یہ اس سے قبل ایک مفروضہ تھی ۔ مالیہ اراضی کی وصولی کے لیے اب شکر درکار نہیں ۔ اب رقوم درمیانہ داروں کی جیب بھرنے کی بجائے خزانہ عامرہ تک آتی ہیں اور ہمیں معلوم ہے کہ حسابات مندرجہ ذیل ہیں۔

بندوبست پر کل اخراجات 3,37,010 روپے بندوبست کے نتیجے مالیہ میں ہونے والا سالانہ اضافہ 1,85,103 روپے یعنی یوں کہا جاسکتا ہے کہ بندوبست پر ہونے والے اخراجات دو برس سے بھی کم عرصے کے دوران پورے کر لیے جائیں گے۔

بندوبست میں ملازم افسروں کو نوٹس

میں نے ایک دوسری رپورٹ میں اپنے کام کی تفصیلات بیان کی ہیں اور میں نے اس میں محض ذکر کیا ہے جن میں عام لوگوں کی دلچسپی ہے مگر بندوبست سے متعلق یہ باب تب تک نامکمل رہے گا اگر میں ان حضرات کے نام حذف کروں جنھوں نے یہ کام سرانجام دیا۔ ان حضرات میں مسٹر ایچ۔ ایل۔ ریویٹ، لالہ نرسنگھ داس اور سیّد عالم شاہ شامل ہیں۔ مسٹر ایچ ایل ریویٹ آبپاشی اور عام معاون کے طور پر میرے ساتھ 1891 کے موسم گرما میں شامل ہوا۔ عوام کی بابت اس کی معلومات اور ان کے تئیں مروّت نے جلد ہی کشمیریوں کا اعتماد جیت لیا جبکہ اس کی محنت اور قابلیت نے میرے کام کو کافی حد تک بچایا۔ نرسنگھ داس میرے ساتھ کام کی شروعات کے وقت شامل ہوا

اور سال 1893 کے اوائل میں وہ ضلع جموں میں سٹلمنٹ آفیسر کے عہدے پر کام کرنے کے لیے چلا گیا۔ ایک پختہ تجربہ کار نہایت چابکدست اور غیر معمولی طور پر مشفقانہ اوصاف کے مالک اس شخص نے بندوبست کشمیر کو روبہ عمل لانے کے معاملے میں وہ سب کچھ کیا جو بھی ممکن تھا۔ کشمیر میں وہ اپنی بہترین نیک نامی اور شہرت چھوڑ گیا۔ نرسنگھ داس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔ بندوبست کے نام میں سید عالم شاہ 1890 میں شامل ہوا اور 1893 میں سروے کی تکمیل کے وقت تک ہمارے ساتھ رہا۔ اس نے نہایت محنت اور گہری ہمدردی کے ساتھ کام کر کے مفرور کشمیریوں کی بازآبادکاری کے لیے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ اس نے کشمیر میں شدید سردی کے دو موسم گذارے۔ اس دوران اس کی بینائی کو نقصان ہوا مگر وہ دل شکستہ نہیں ہوا۔ اس تمام عرصے کے دوران کشمیر کے ہندوؤں نے اس کی مخالفت کی اور اسے گالیاں دیں مگر اس نے اپنا کام کیا۔ ان تمام افراد کا میں ممنون ہوں۔ لوئیر گریڈ بندوبست میں بہت سارے بہترین کارکن شامل تھے۔ کشمیریوں کو اپنے ملک میں ہی ملازمت حاصل ہوگئی مگر پنجابیوں نے مکمل معلومات کے ساتھ کام کیا۔ ان کی خدمات کے باعث بندوبست کا کام مکمل ہو جانے پر انھیں کشمیر میں ہی ملازمت حاصل ہو جائے گی۔ ان میں سے بہت سارے لوگ بھاری ستائش کے مستحق تھے مگر یہاں پر خاص طور پر ڈپٹی سپرانٹنڈنٹوں گوراش مل اور امر سنگھ قابل ذکر ہیں۔ گوراش مل بہترین ڈپٹی سپرانٹنڈنٹ تھا اور وہ اپنے فرائض سرانجام دیتے ہوئے 1891 میں راہی ملک عدم ہوا۔ اس کے جوش اور محنت کے سبب پٹواری اسکول نے کامیابی حاصل کی۔ اس کا کام نہایت اچھا اور محتاط قسم کا تھا۔ اس کی موت بھی اپنے کام کے تئیں تندہی کے سبب واقع ہوئی۔ کشمیر میں اس کا کام بھرپور اور اطمینان بخش تھا۔ کشمیر کا بندوبست عملہ اب منتشر ہو چکا ہے۔ حکومت ان کی ممنون ہے اور اس بات کو یاد رکھے گی کہ اس عملے کو مسٹر ونگیٹ نے تربیت دی جس کی بھرتی پنجاب کے مالیاتی کمشنر آنجہانی لیفٹیننٹ کرنل ولس نے سرانجام دی۔

●❁❁❁●

حوالہ جات

(1) اسٹیٹ کونسل نے ان قواعد کو منظوری نہیں دی۔

(2) جہاں تک مالیہ کا تعلق ہے آراضی کے ٹیکس کی تشخیص نقدی ہی کی صورت میں ہوا کرتی تھی۔ دوسری طرف جو حکام قیمتوں میں باقاعدگی قائم رکھتے تھے وہ ان کے لیے کافی ارزاں تھیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ عمل لوگوں کے لیے آرام دہ ہو مگر اس سے وادی کی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہوئی تھی۔ عمل کے یہ جرائد حیدرآباد، کشمیر، سکم اور نیپال میں موجود ہیں۔

(3) اس تحریر کے بعد دس برسوں کے دوران مانگ کم ہو کر 1,75,000 خروار رہ گئی ہے۔

●❁❁❁●

اُنیسواں باب

زبان اور لسانیات

لسانیات

کشمیریوں کی زبان کاشُر ہے اور بیان کیا جاتا ہے کہ یہ خالص اور حقیقی سنسکرت پراکرت (1) کی صورت ہے اور چند لوگوں کا بیان ہے کہ یہ شاردا حروف میں ایک تحریری زبان تھی اور دیوناگری کی ایک صورت تھی۔ بہرحال اس بارے میں شک ہے کہ آیا یہ کبھی تحریری زبان تھی۔ چنانچہ اس وقت جو کوئی بھی کاشُر زبان میں لکھنا چاہتا ہے وہ فارسی رسم الخط کا استعمال کرتا ہے اور جن ارکان تہجی سے فارسی حروف تہجی نا آشنا ہے ان کی اضافت کی گئی ہے۔ کشمیری چہ کا استعمال ''ژ'' کے طور پر کرتے ہیں اس لفظ کا استعمال عام مگر بول بول چال میں نہایت مشکل ہے۔ حتمی طور پر ل م ن ر کو اس طور بیان کیا جاتا ہے کہ گویا ان میں صرف علت شامل کی ہو واو اور ب کو بھی تبدیل کیا جاسکتا ہے جس قصبے کو ہم بارہ مولہ کے طور پر جانتے ہیں وہ زیادہ تر کشمیریوں کے لیے وَرُل ہے۔

بہت سارے کشمیری عالموں کا بیان ہے کہ کاشُر خزانۂ الفاظ کثیر لسانی ہے اور ہر سو الفاظ میں 25 سنسکرت، 40 فارسی اور 15 ہندوستان اور 10 عربی ہوں گے۔ باقی 10 الفاظ میں تبتی، ترکی، ڈوگری اور پنجابی شامل ہیں۔ کاشُر زبان کا ایک اپنا صرف ونحو ہے جس سے سنسکرت صرف ونحو کا دھندلا عکس عیاں ہوتا ہے۔ یہ بات نہایت قابل تعریف ہے اس سے نہ صرف تردید کی

صورتیں فراہم ہوتی ہیں بلکہ اس کی جڑوں میں بھی تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ کشمیری زبان کے بارے میں میری معلومات فقط عام بول چال کی واقفیت اور دیہات میں زرعی اور ثقافتی زندگی میں عام الفاظ کی اصطلاحات تک محدود ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ بھی میں نے سیکھا ہے اس کے لیے میں ایک کشمیری عالم پیر حسن شاہ کا ممنون ہوں جس کا کام کلیتاً دیہاتوں کے درمیان موجود ہے۔ یہ امر بھی دلچسپی کا حامل ہے کہ ہندوستان کے دور افتادہ علاقوں تک نقل مکانی کرنے والے کشمیری اپنی قدیم زبان کو برقرار رکھے ہوئے ہیں اور وادی سے ترک سکونت کے باوجود بھی یہ زبان ایک نسل سے دوسری نسل تک سونپی جاتی رہی ہے۔

کسی مقام پر میں نے شال بافوں کے بارے میں "تعلیم" کا بیان کیا ہے۔ یہ تحریر فقط ہتھ کھڑی چلانے کے مقاصد سے استعمال ہوتی ہے اور روزمرہ کی زبان کے طور پر شال باف کاشُر بولتے ہیں۔ اس تعلیم کو پہلی نظر میں دیکھ کر موسیقی میں استعمال علامات کی یاد آتی ہے۔

میں نے فرہنگ میں زیادہ عام الفاظ دیے ہیں جو دیہاتیوں کی بول چال میں استعمال ہوتے ہیں۔ میں نے پودوں، درختوں اور اقتصادی مصنوعات کے فارسی یا ہندوستانی نام حذف کر دیے ہیں جو میری رپورٹ کے اس متن میں درج ہیں۔ ارکان تہجی اور ناک کے ذریعے نکلنے والی آوازوں کے سبب کاشُر کی دوسری زبان میں ادائیگی ناممکن ہو جاتی ہے اور میرا خیال ہے کہ جن الفاظ کو میں نے درج کیا ہے وہ ان افراد کے لیے قابل فہم ہوتے ہیں۔ جو ا۔آ۔ اور اُ، اور اُو کے فرق کو سمجھتے ہیں۔ میں نے ہر صورت میں لفظ کو فارسی رسم الخط میں لکھوایا۔ یہ ان لوگوں کے لیے کارآمد ثابت ہو سکتا ہے جن کو دیہات میں کاروبار سرانجام دینا ہوتا ہے۔ کشمیر ایک چھوٹا سا علاقہ ہے مگر اس معاملے میں بہت بڑا ہے کہ یہ دو یا تین بولیوں (2) کی موجودگی پر فخر کر سکے۔ سرینگر کے عوام اور زراعت پیشہ لوگوں کے بول چال میں کافی فرق ہے۔ یہ ایک قدرتی بات ہے کہ سرینگر کے شہریوں کی زبان پر ان مختلف غیر ملکی خاندانوں کا اثر ہو جنھوں نے کشمیر پر حکمرانی کی ہے۔ دیہاتیوں کی نسبت مختلف ہو۔ سرینگر میں ہر لفظ کا فارسی ہم معنی موجود ہے۔ دیہات میں کشمیری بولی جاتی ہے۔ اگر چہ لمبردار اور دوسرے باحیثیت لوگ اُردو میں بات چیت کرتے ہیں۔ یہ بات عام طور پر سنی جاتی ہے کہ دیہاتی لوگ اپنے میں سے ہی ایک ایسے شخص پر اعتراض کرتے ہیں جو

اُردو ، پنجابی اور ڈوگری کی ملی جلی صورت میں بات کرتے ہیں اور ان پر کشمیری میں بات چیت کرنے پر زور دے کر کہتے ہیں کاشر پانٹھی۔

غیر ملکی لوگوں نے کشمیری کو کبھی مطالعے کے قابل نہیں سمجھا حالانکہ بہت سارے ایسے لوگوں نے کئی نسلوں تک اسے استعمال کیا۔ مگر پنڈتوں کے سوائے عملی طور پر کوئی ایسا اہلکار نظر نہیں آیا جو سہل پسند حکام کو کشمیری میں دینے سے زیادہ کچھ کر سکے۔ یہ ایک افسوس ناک امر ہے کیونکہ اس زبان کے مطالعے سے فائدہ ہی ہوتا (3)۔ لوگ اس شخص کو دیکھ کر نہایت خوشی اور فخر محسوس کرتے ہیں جو اُن کی مادری زبان سمجھ سکے۔ مشنریوں نے سرینگر کی زبان کا مطالعہ کیا ہے۔ ایک گرامر اور ایک چھوٹی ڈکشنری بھی تحریر کی گئی ہے جو ایک مبتدی کے لیے مددگار ثابت ہو سکتی ہیں مگر وادی کی زبان پر اب تک تحقیق نہیں کی گئی ہے اور ایک ماہر لسانیات کا کشمیری گرامر اور ڈکشنری تیار کرنا خوشی کا باعث ہوگا، اپنے اعتقاد اور نامکمل مطالعے کے سبب میں اس امر کا قائل ہو گیا ہوں کہ اس زبان میں الفاظ کا صحیح سرمایہ ہے، براہ راست مقولات ہیں اور بیشتر اصطلاحات شعری تخیل سے بھر پور ہیں۔ مقولات کا ایک مجموعہ تیار کیا گیا ہے ان میں سے بیشتر کا استعمال دیہات میں ہوتا ہے جو یہاں کے عوام کی بذلہ سنجی اور حاضر جوابی کی آئینہ دار ہیں۔ کشمیریوں کے گیت بنیادی طور پر عاشقانہ ہیں اور خیالات کے ایسے ہی پہلو فارسی شاعری میں ملتے ہیں۔ اس زبان کا لب ولہجہ انگریزی سے یکسانیت رکھتا ہے اور اکثر اوقات جب میں کشمیریوں کو بات کرتے ہوئے سنتا ہوں تو مجھے گمان ہوتا ہے کہ گویا کوئی انگریز بات کر رہا ہو۔ جو اصطلاحات شاعرانہ معلوم ہوتی ہیں ان میں گہری نیند کے لیے لفظ شوگُن کا استعمال ہوتا ہے جس سے موت کا بھی احساس ہوتا ہے۔ جن مقولات کا استعمال دیہاتی لوگ کھلے عام کرتے ہیں، میں ان میں سے مندرجہ ذیل کا تذکرہ کرتا ہوں:۔

ژ زہن کھتن نہ سُود
ژ زہن گگراین نہ رُود
ژ زبن ژونگن نہ دود
(زیادہ باتیں کرنے میں کوئی فائدہ نہیں ہوتا

زیادہ گرج میں کوئی بارش نہیں ہوتی

زیادہ جھکنے سے کوئی دودھ نہیں ملتا)

یلہہ رُودہیۂ مپلہ دوتھہ رب

(جب بارش ہوتی ہے تب ہی کیچڑ جمع ہوتا ہے۔)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زرعی طبقوں کی بابت بہت سارے مقولات کو شہروں میں آباد لوگوں کی طرف سے تحریر کیا گیا ہے۔ ایک مقولے کے مطابق زراعت پیشہ شخص ایک ایسے ہاتھی کے مترادف ہے جسے کسی لذت کا احساس نہ ہو، وہ ایک جھوٹا دوست اور بزدل دشمن ہے۔

گریستؤ ہُستو

(زراعت پیشہ شخص ایک ہاتھی ہے)

گریستو یار کائیر نار

(ایک کسان کی دوستی صنوبر کے ایندھن کی مانند ہے یعنی یہ جلدی جل جاتا ہے)

گریوس یعنی زراعت پیشہ لوگ بھی اس انداز میں جواب دیتے ہیں اور شہر کے پنڈتوں کے لیے ان کا جوابی مقولہ ہے۔

اس مقولے کے مطابق اگر پنڈت آپ کا دوست ہے تو وہ کسی چیز کا طلب گار ہے۔ وہ سیاہ فام ہے اور انداز ظالمانہ ہیں:

ہٹہ یار۔ بے روزگار

(پنڈت آپ کا اس وقت دوست ہے جب اس کے پاس روزگار نہیں)

ہٹہ کار گٹہہ کار

(پنڈت کا کام۔غلط کام)

ہٹہ چھٹہ گز ہٹہ

(پنڈت ایک چکی کی طرح ہے)

گبہ بُتھہ رامہ ہون

(بھیڑ کے لباس میں بھیڑیا)

اَلَن پچھ پھل ننبد ن پچھ دانہ
(ہل چلانے سے فصل حاصل ہوتی ہے، گھاس پھوس سے چاول حاصل ہوتا ہے)
یہ ایک فطری صداقت ہے مگر بے پرواکاشت کار کو اس بارے میں یاددلانا لازمی ہے۔
بہت سارے مقولات سے ملک کی سابقہ حالت سے متعلق اچھی خاصی واقفیت حاصل ہوتی ہے)۔

کینہہ مہ دِتم
کنس تل نتم
(مجھے کوئی مزدوری مت دیجیے مگر مجھے اپنے کان تک رسائی دیجیے)
یہ اس امر کی یاددلاتا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب اقتدار میں ایک شخص کے ساتھ اثر ورسوخ کو دولت میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔

خدایہ سنز کھر
تہ نایدہ سُنز ژپھ
(خدا گنج دیتا ہے اور حجام سر کو ضرب لگا کر سر بگاڑ دیتا ہے)
اس مقولے کے بارے میں ایک تجربہ کار اہلکار نے مجھے بتایا یہ مقولہ اکثر اوقات اس عورت پر صادر کیا جاتا ہے جس نے اپنا بچہ دریا میں کھو دیا ہو اور پولیس اُسے قتل کے غلط الزام میں گرفتار کرلے۔

آرمن کڈ مُج
فقیرن دأرِ س کش
(مالی نے ایک مولی تک نہیں اکھاڑی مگر گداگر نے اپنا کشکول نکال لیا)
کشکول (کشت) لیے گداگر کشمیر میں عام طور پر پائے جاتے ہیں اور وہ کسی بھی شخص کو نہیں بخشتے خواہ اس کے پاس کس قدر متاع کیوں نہ ہو۔

رووُمت پلہ ہوٗ رستھ موٗہرہ
(اس نے اپنے گھاس کے جوتے کھو دیے اور دعویٰ کرتا ہے کہ ان کی قیمت سات مہروں

کیہر ابرتھی۔)

کشمیر میں مشرقی ملکوں کے دوسرے عوام اپنے نقصانات کے بیان کے معاملے میں مبالغہ آمیزی سے کام لیتے ہیں حالانکہ وہ اپنی متاع کو بہت کم کر کے بتاتے ہیں۔

مُولَن درووت تہ پَترن سگ

(وہ جو اپنی جڑیں کاٹتا ہے مگر پتوں کی آبیاری کرتا ہے)

فریب کار اور سازشی شخص کے لیے یہ محاورہ استعمال ہوتا ہے۔

اُکہ ڈُٹ نُم تہ ساس گوکو ولہِ

(ایک شخص جب پل توڑ دیتا ہے تو ہزاروں کی تعداد میں افراد اس میں ڈوب جاتے ہیں)

کشمیری دیہاتوں کے نام بھی عجیب وغریب معلوم ہوتے ہیں اور یہ بات ممکن ہے کہ سنسکرت کی واقفیت رکھنے والا کوئی بھی شخص ان ناموں کے منبع کو تلاش کر لیتا ہے۔ بہرکیف کشمیری اس بات سے منکر ہے کہ ان کے کوئی معانی ہیں۔ دیہات کے نام کے ساتھ یہ عام اضافتیں قابل ذکر ہیں۔ بگ، ہامہ، شتر، مولا، لتر، نگری، انگو، ہل، نور، گنڈ، بالہ پتھر، وامہ، گل، ٹو، تھن، بیرا، واجی، زو اور زر۔ بیان کیا جاتا ہے کہ دیہات کے جو عجیب اور ایسے نام ہیں کہ جن کے ہجے بھی بیان نہیں ہو سکتے مگر وہ بھی موجود ہیں۔ ٹوڈرمل نے اس وقت سنسکرت کے ناموں کو مسخ کر دیا جب اس نے اپنے آقا اکبر کے لیے کشمیر کے گاؤں کی فہرست مرتب کی۔

●❁❁❁●

حوالہ جات

(1) ڈاکٹر بُوہلر کا بیان ہے کہ ''میں محسوس کرتا ہوں کہ شاردا حروف تہجی کا شمار گپتا عہد یا اُس سے پہلے کے زمانے میں قدیم حروف تہجی میں نہیں ہوتا۔ کشمیری پراکرت کی شکل ہے اور سنکرت کی اضافی زبانوں میں سے ایک زبان ہے یا ایک ایسی بولی ہے جس سے کلاسیکی سنسکرت کی تشکیل ہوتی ہے۔ بہر حال ہندوستان کی دیگر ہمعصر بولیوں سے یہ زیادہ مختلف ہے اور سندھی زبان کے قریب لگتی ہے۔

(2) شمالی کشمیر کمراز کی بولی جنوبی کشمیر یعنی مراز سے مختلف ہے اور یہ دونوں بولیاں سرینگر کے یمراز (وسطی کشمیر) علاقے سے مختلف ہیں۔

(3) ڈاکٹر بوہلر کی رائے ہے کہ ہندوستان کی مقامی بولیوں میں صرف ونحو کے تقابلی مطالعے میں کشمیری کو اہم مقام حاصل ہے۔

●❁❁❁●

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

قدیم ہندوستان کی تاریخ



مصنف : رام شنکر ترپاٹھی
مترجم : سید یحییٰ حسن نقوی
صفحات : 581
قیمت : -/138 روپے

دکن کے بہمنی سلاطین



مصنف: ہارون خاں شیروانی
صفحات 352
قیمت -/88 روپے

تحریکِ خلافت



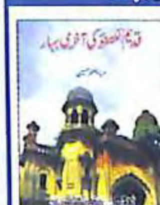
مصنف : محمد عدیل عباسی
صفحات : 282
قیمت : -/72 روپے

جامع تاریخِ ہند



مصنف : محمد حبیب، خلیق احمد نظامی
صفحات : 1000
قیمت : -/222 روپے

قدیم لکھنؤ کی آخری بہار



مصنف : مرزا جعفر حسین
صفحات : 560
قیمت : -/134 روپے

ظہیر الدین محمد بابر



مصنف : ایل۔ ایف۔ رش بروک ولیمز
مترجم : رفعت بلگرامی
صفحات : 223
قیمت : -/63 روپے

₹ 217/-

ISBN: 978-93-5160-023-7
9 789351 600237

राष्ट्रीय उर्दू भाषा विकास परिषद्
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
National Council for Promotion of Urdu Language
Farogh-e-Urdu Bhawan, FC- 33/9, Institutional Area,
Jasola, New Delhi-110 025